میں یا میں
جون ایلیا پر تحریریں اور مُلاقاتیں
ترتیب و انتخاب
خالد احمد انصاری
DANISH
RAZA
2019

میں یا میں

جون ایلیا پر تحریریں اور ملاقاتیں

مؤلف

خالد احمد انصاری

الحمد پبلی کیشنز®

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انارکلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

☎ 37231490 - 37310944

اِشاریہ

تحریریں

ملاقاتیں

* حروفِ تہجی کے اعتبار سے

سخن نژاد

شکیل عادل زادہ

اِس کتاب کا موضوع ہے، جون ایلیا، ایک شاعر، ایک ادیب اور ایک شخصیت۔ اپنی منفرد شاعری اور نثر سے اُنھوں نے ایک اہم شخصیت کی حیثیت حاصل کی ہے۔ برصغیر کے بے شمار قلم کاروں نے تخلیقی کارنامے سرانجام دیے ہیں، لیکن ذکر عموماً اُنھی کا ہوتا ہے، جنھوں نے کوئی نئی سمت، کسی نئی راہ کی جانب اشارہ کیا ہو، کوئی نیا لہجہ، رنگ، آہنگ اور تیور عطا کیا ہو۔ نقش طراز جون ایلیا کو وقت نے زیادہ مہلت نہیں دی۔ ایسے نادرہ کار، نادرِ روزگار کو تو بہت وقت ملنا چاہیے تھا کہ وہ بڑی دل آویز شاعری اور نثر تخلیق کر رہے تھے۔ اُن کے جانے کتنے اشعار اور نثر کے جانے کتنے فقرے اور فکر پارے زباں زدِ خاص و عام ہیں۔

اپنے کسی امتیاز ہی سے کوئی شخص حُرمت و مَنزلت کا سزاوار ہوتا ہے، اور ساری دنیا میں علم و فن کے مختلف شعبوں سے وابستہ نام وروں کے روز و شب، بُود و باش، حال احوال جاننے کا اشتیاق بھی غالباً فطری ہے۔ اِس جُست جُو میں افواہوں اور مبالغوں کا بازار بھی خوب گرم رہتا ہے۔ جون ایلیا کے بارے میں بھی طرح طرح کی داستانیں گردش کرتی رہتی ہیں۔

وہ دِق اور دمے کے عارضوں میں گرفتار، کم قامت، سانولے اور عام سی شکل و صورت کے آدمی تھے مگر اُن کے نحیف و نزار جسمی وجود میں کیسا طاقت ور، بلند قامت، پُر مایہ، کیسا تیشہ بردار اور عشق شعار، جمال آفریں، جلال آگیں شخص چھپا ہوا تھا۔ یہ اُن کے فن پاروں سے آشکارا ہے۔

محقق نہ ہونے کے باوجود برادرم خالد انصاری کو خاصے پیچیدہ تحقیقی مراحل سے گزرنا پڑا۔ جون ایلیا سے کیے گئے انٹرویو، اُن سے متعلق بہت سی اوجھل تحریروں کی تلاش میں دوڑ دھوپ کی ایک کہانی ہے۔ اَن گنت سخن فہموں سے رابطے کیے گئے، جون کے رشتے دار، مستقل احباب، معاصرین، شناسا اور وقفے وقفے سے اُن کے ساتھ وقت گزارنے والے۔ کسی نے لکھنے کی ہامی بھری، کسی کی مصروفیت آڑے آ گئی، کسی نے وقت مانگ لیا۔ انکار کسی نے نہیں کیا۔ جو کچھ جمع ہوا، وہ اتنا زیادہ تھا کہ خالد کو سوچنا پڑا، کسے شامل کیا جائے، کِسے موقوف۔

یہ پہلی کتاب ہے۔ بہت سے ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور دوستوں نے وعدہ کیا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ ایک اور کتاب کی صورت ممکن ہو جائے۔ اِس مجموعے میں بھی اتنا کچھ ہے کہ جون ایلیا کی شخصیت آئینہ ہو جاتی ہے، مگر کسی حد تک...... ستم کش اور ستم کیش جون تو بڑے رنگا رنگ اطوار و کردار کے حامل تھے۔ کانچ کے بنے اور بہت پتھر۔ زباں پر ہر وقت کوئی حرفِ شکایت اور ملامت، اور بڑے سے بڑے حادثے پر بے جنبش۔ لمحہ لمحہ رنگ بدلتے تھے اور تماشے کیا کرتے تھے، پر ایک تماشا......! اُن کی زندگی کے بعض پہلو کتنے ہی غیر شاعرانہ ہوں، وہ تو سراپا، سرتاپا ایک شاعر تھے۔ اُن کا سب سے بڑا تماشا یا شعبدہ تو اُن کی شاعری ہے۔

ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

خالد احمد انصاری

جون ایلیا ایک واقعہ ہی تو تھے۔ ایک ایسا واقعہ جو صدیوں میں کہیں وقوع پذیر ہو، جو عرصۂ دراز سے قائم جمود توڑ کر رکھ دے اور لگے بندھے پیرائے اور روایات کی تراش خراش کر کے اپنا رنگ، اپنا سکہ جما دے۔

2008ء میں 'گویا' کے پیش لفظ کا عنوان 'جانے کیا ہو' اپنے وجدان کی تاکید پر رکھا یا یوں کہیے، جون کا کلام بیاضوں کی صورت دیتے وقت کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اگر یہ سب شائع ہو جائے تو جانے کیا ہنگامہ برپا ہو لیکن واقعی ایسا ہوگا، یہ تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اسی زمانے میں سوشل میڈیا کی آمد ہوئی تو فیس بک پر جون ایلیا کا پہلا پیج بنا کر چھوڑ دیا۔ ایک ہفتے بعد ہی پیج پر لگ بھگ کوئی 100 افراد موجود تھے اور ستائشی جملوں سے نواز رہے تھے۔ اس قبولیت نے ہمت بندھائی اور اشعار، تصاویر، ویڈیوز شیئر کرنا شروع کر دیے۔ تھوڑے ہی عرصے میں مداحوں کا ایک جمِ غفیر اُمڈ آیا۔ جون کے نئے پیج اور گروپ تشکیل پانے لگے اور ایڈمن یہ یقین دلاتے محسوس ہوئے کہ جون کے اصل ورثا وہی ہیں۔ یہ دعوے اس حد تک پہنچ گئے کہ 'جون ایلیا آفیشل پیج' پیش کیے جانے لگے، ممبران کی تعداد لاکھوں میں جا پہنچی اور مسابقت میں نت نئے آرٹ ورک کے ساتھ ان کے اشعار نقش کیے جانے لگے۔

اسی ہجوم سے 'جونیت' کا علم اُٹھائے 'قبیلۂ جون' سامنے آیا اور جون ایلیا، جون اولیا، حضرت جون، مرشد اور سرکار ہو گئے۔ 'جانی' کا استعمال بڑھنے لگا۔ اپنے ناموں کے ساتھ

جون یا ایلیا کے لاحقے چسپاں کیے جانے لگے۔ شاید، یعنی، گویا، خیر مگر کوئی بات نہیں اور اسی قبیل کے الفاظ اور جملے گفت گو کا حصہ بن گئے۔ جون کے شعر اظہار کا وسیلہ ہو گئے۔ دیگر شعرا کے شعروں، یہاں تک کہ حلیے میں بھی جون جھلکنے لگے۔ اسی رَو میں ایک نوجوان شاعر نے جون ایلیا کی محبت میں اُن کے بیٹے کے نام سے خود کو منسوب کرلیا۔ یوٹیوب نے الگ رنگ دکھایا، جو اُردو پڑھ نہیں سکتے تھے وہ جون کی پڑھت اور انداز ہی سے متاثر ہو کے اس میں شامل ہو گئے۔

2012ء میں 'فرنود' کی اشاعت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ انشائیوں کے جملے اقوال کی صورت میں جگہ جگہ پھیل گئے۔ جون کے کلیے سوچتے ذہنوں کی زبان بن گئے، نئی بحثیں چھڑنے لگیں کہ یہ شخص تو شاعر ہی نہیں، ایک منفرد نثر نگار اور فلسفی بھی ہے، کیسی فکر خیز، خیال انگیز باتیں کرتا ہے، جون کے شیدائیوں نے اُسے ڈھونڈنا شروع کردیا اور اُنھیں ایسی مشکل پیش نہیں آئی کہ جون اپنے شعری و نثری کلام میں ہر طرح موجود تھے اور ہیں۔

فارہہ کون تھی؟ اس پر جون نے اتنی شاعری کیوں کی؟ فروزینہ کون تھی؟ جون کے مذہبی عقائد کیا تھے؟ اُن کی شاعری میں خون کا اتنا ذکر کیوں ہے؟ وہ کیوں چاہتے تھے کہ کوئی لڑکی اُن کے عشق میں خودکشی کرلے؟ اُن کی علیحدگی کیوں ہوئی؟ غرض سوالوں کا ایک ہجوم ہے اور لوگ سچ ہو یا جھوٹ، جاننا چاہتے ہیں جیسے کسی دیومالائی کہانی میں جون مرکزی کردار ہوں۔ دیومالائی کرداروں کا دل دادہ اکیسویں صدی میں خود اساطیر بن گیا اور وہ بھی ایسے معاشرے میں جہاں کتاب پڑھنا کارِضیاع سمجھا جائے، اُس کی کتابیں 'بیسٹ سیلر' ہو جائیں۔

یہ بھی ہوا کہ مجھ جیسا کم مایہ شخص نگاہوں میں آنے لگا۔ لوگ ملنے کا اشتیاق ظاہر کرنے لگے اور تھوڑی بہت ادبی حیثیت کا سزاوار سمجھنے لگے۔ میں جانتا ہوں، کسی کے کلام کو کتابی صورت دے کر شایع کردینا کون سا ادبی کارنامہ ہے۔

اسی دوران 2016ء میں جون ایلیا کی الواح پر مشتمل مجموعہ 'راموز' شایع ہو گیا۔ ایسا ایک کام سامنے آیا جس کا علم جون ایلیا کے خاص احباب تک محدود تھا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس پہ بات ہوتی، جون کے فن کی نئی جہتیں موضوع بنتیں لیکن صرف اس قدر ہی سنا گیا کہ 'یہ تو کچھ آگے کا کام ہے۔'

اب جون ایلیا روایتی اور جدید اُردو شاعری میں ایک برانڈ کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اس برانڈ پر اسٹیج پلے ہو رہے ہیں، فلم/ڈرامے بنانے کے منصوبے بن رہے ہیں، اُن کی تحریروں کی اشاعت کے لیے ناشرین چشم بہ راہ رہتے ہیں، دیوناگری رسم الخط میں کتابیں ترجمہ ہو رہی ہیں، ایم فل، پی ایچ ڈیز کی جا رہی ہیں اور کچھ یوں ہے کہ لوگ مرحوم جون ایلیا کی طرف اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔

سارے رشتے تشنہ ہیں
کیا میں دریا لگتا ہوں

یہ ہے وہ دل چسپ منظر نامہ کہ یہ کتاب مرتب کرنے کا خیال آیا۔ ایک ایسی کتاب جو جون کے پرستاروں سے جون کی ملاقات کرا دے، جس میں ان سب معتبر لوگوں کی تحریریں شامل ہوں جنھوں نے جون ایلیا کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ جو کبھی جون سے نہیں ملے، صرف اُن کے کلام سے متاثر ہوئے، جون کی محرومیاں اور مرتبہ سمجھنے والے۔ کوئی ایسی کتاب جو جون کی زندگی کے رنگ، پرچھائیاں سمیٹ کر سامنے لے آئے اور اُن کے بارے میں ابہام و سوالات کی کسی قدر تشفی کر سکے۔

کوئی دو سال قبل اس آئیڈیا پر بھائی عقیل عباس جعفری سے بات ہوئی۔ وہ جون پر لکھے خاکے مرتب کرنا چاہتے تھے۔ میرا خیال تھا، خاکوں کے ساتھ جون پر لکھی تحریریں بھی مرتب کی جائیں۔ بہ ہر کیف کام شروع کرتے وقت بھائی عقیل سے رابطہ کیا، اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب انھیں وقت نہیں مِل پا رہا تھا، چاہتے تھے، یہ کام اب میں ہی سرانجام دوں، انھوں نے اپنے پاس موجود کچھ خاکے اور جون کی یاد میں جرمنی سے شایع ہوا ادبی جریدہ سہ ماہی 'گفتگو (دسمبر 2002ء تا فروری 2003ء) بھی ازراہِ نوازش فراہم کر دیا۔ خود میرے پاس جشنِ جون ایلیا (1990ء) کے موقع پر شایع کیا گیا مجلّہ اور پھر سادات امروہہ کراچی کی جانب سے ان کی وفات پر مرتب کیا گیا مجلّہ 'بہ یادِ جون ایلیا' موجود تھے، دونوں رسالوں میں بہت کچھ موجود تھا۔ اپنے پاس موجود برسوں سے جمع رسائل واخبارات دیکھنا شروع کیے جنھیں جون بھائی سے متعلق کسی خبر یا مضمون کی وجہ سے محفوظ کرتا رہا تھا۔ اِس کام کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب ان پر شایع کیے گئے جریدے 'شعر و سخن' (مارچ تا مئی 2002ء)، ماہ نامہ 'دنیائے ادب' (جولائی 2003ء) نیز مختلف اخبارات

میں چھپی تحریریں اور ماہ نامہ 'دستک' (2001ء) میں محترمہ فوزیہ شاہین کا انٹرویو دست یاب ہوا اور میرے خیال کو وسعت ملی کہ کیوں نہ اس کتاب میں انٹرویوز کا گوشہ بھی شامل کردیا جائے۔ بعد ازاں جنگ اخبار کے سربراہ ریسرچ ،سلیم اللہ صدیقی نے جنگ (1996ء) میں نیاز الدین خاں، روزنامہ نوائے وقت (2001ء) میں عباس نقوی اور ماہ نامہ غازی (2001ء) میں ابنِ آس کے لیے ہوئے انٹرویو فراہم کیے۔ عقیل عباس جعفری کا روزنامہ حریت (1981ء) کے لیے لیا گیا نایاب انٹرویو، لیاقت لائبریری کراچی، کے ریکارڈ سے ڈھونڈ کر حاصل کیا۔ کینیڈا میں مقیم ڈاکٹر خالد سہیل کی 2013ء میں شایع ہونے والی کتاب 'ادھورے خواب' میں بھی جون صاحب کا انٹرویو شامل تھا۔ یہ تحریریں بھی زیرِ نظر کتاب کا حصہ ہیں۔ محترمہ نسیم سیّد کی مرتب کردہ کتاب ''خوش گزراں گزر گئے'' سے بھی چند مضامین ان کی اجازت سے شامل کیے گئے ہیں۔ جون کے کئی قریب ترین اعزا اور احباب سے بھی کچھ لکھنے کی عاجزانہ درخواست کی اور کسی حد تک کام یابی ہوئی۔ ان صاحبان کا شکریہ۔

اور یوں کمپوزڈ صفحات ایک ہزار سے زائد ہو گئے۔ انھیں پڑھنا، کم زور تحریریں الگ کرنا، اور کتابت کی غلطیاں درست کرنا ایک جان لیوا مرحلہ تھا۔ اور ہوا یہ کہ 6 ماہ تک اسے دیکھ نہ سکا لیکن میں نہ کرتا تو کون آگے آتا۔ آخر کار ہمت کی، نتیجے میں 800 صفحات کے لگ بھگ رہ گئے۔ برادرم محمد عرفان نے زبان و بیان، الفاظ کی درستی اور پروف ریڈنگ (عیب جوئی) میں جون ایلیا سے اپنی محبت کا حق ادا کیا۔ خرم سہیل نے بھی خوب اُن کا ساتھ دیا۔ سیّدہ تحسین علیم نے بھی دیدہ ریزی سے پروف ریڈنگ کی اور ممکنہ حد تک غلطیوں کا امکان کم کیا۔ لیکن اُردو کی وہ کتاب ہی کیا جس میں پروف کی غلطیاں نہ رہ جائیں۔

محترم شکیل عادل زادہ اور سلیم ساجد کرن کی رہ نمائی ہر مرحلے میں ساتھ رہی۔ دانش رضا نے اپنے آرٹ ورک اور بھائی بلال عاجز اور محمد مختار علی نے خطاطی سے کتاب کا سرورق منفرد بنادیا اور اپنے جناب مجتبیٰ حسین کاظمی کی بندہ پروری کا کیا ذکر...... وہ میرے دوست بھی ہیں، ادارے کے سربراہ بھی۔ میرے ان شعری و ادبی قسم کے مشاغل پر انھوں نے کبھی کوئی تعرض نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ انھی کی کشادہ دلی کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ میں ان سب دوستوں کا دل سے شکر گزار ہوں۔

فرمایشیں کرنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ پہلی، دوسری ملاقات میں کسی اجنبی سے''

کوئی بھی فرمایش کر سکتے تھے، اس خوب صورتی، خوش اسلوبی، اور ایسے پُرشوق، حسرتی لہجے میں کہ تعمیل کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہ جائے۔ وہ اپنے کسی دوست کی بیوی سے جس سے اُن کا سلام دعا سے زیادہ کوئی تعلق نہ ہو، سامنے آ جانے پر، فرمایش کر دیتے۔ ''ارے بٹیا! ٹو اپنے ہاتھ سے بناہری مرچ قیمہ ایک بار اور کھلا دے۔'' پھر کہتے۔ ''تُو امرو ہے کی تو نہیں؟''

ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے ایک ایسی فرمایش کی جس کا میں قطعی اہل نہیں تھا۔ کہنے لگے۔ ''جانی! تُو میرے اتنے قریب رہتا ہے۔ میرا تجھ سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں۔ تُو اپنے بھائی جون پر کتاب لکھنا اور کتاب کا نام رکھنا ''یادگارِ جون ایلیا''۔ ایسی ایک کتاب جو حالی نے غالب پر لکھی تھی۔ میری تمام کج رَویاں، خوش باشیاں، ہذیان، ہیجان، سیاہ سفید، ساری دیوانگی فرزانگی کا تُو چشم آشنا ہے۔ تُو میرا آئینہ ہے، لیکن اسے لکھنے سے پہلے تجھے دو کتابیں پڑھاؤں گا، مرزا فرحت اللہ بیگ کی ''دلّی کا ایک یادگار آخری مشاعرہ'' اور محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات''۔

خیر میں حالی بن سکا نہ وہ مذکورہ کتابیں پڑھ سکا لیکن میں جون ایلیا کا خالد انصاری ضرور بن گیا۔ میرے لیے یہ اعزاز ہی بہت ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اُن کے احوالِ دروں اور زندگی کے بے شمار معاملاتِ دگر کے بیان کے لیے ایک ہنرِ بلاغت چاہیے۔ شبہ ہے کہ ہمارا سماجی شعور بلوغت کی اُس سطح پر نہیں کہ یہ سب کچھ آسانی سے قبول کر سکے۔ بہ ہر حال کوئی کتاب نہ سہی، اپنی توفیق کے مطابق مضمون کی صورت میں جون ایلیا، ایک شاعر، ادیب، فلسفی اور بے حد یگانہ شخص کے حال احوال پر چند واقعات ہی مرتب کر سکا۔ یار زندہ رہا نہ صحبت باقی رہی، لیکن جون ایلیا تو جانے کے بعد روز بہ روز مجھ سے اور قریب، اور نزدیک ہوتے جا رہے ہیں۔

اور اُن کی فرمایش کا احساس بھی فزوں تر۔

وہ شخص کیا ہوا جو تیری داستاں کا تھا

آذر بارہ بنکوی

یکم فروری 1976ء پُر نور سویرا آہستہ آہستہ سردی کی بانہوں سے کھلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سنہری کرنیں پیلی پڑتی جارہی ہیں۔ دھوپ بے پاؤں دیواروں سے نیچے اُترنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ عجیب موسم ہے، رات میں کافی سردی، دن اچھا خاصا گرم۔ اچھی چائے میری کم زوری ہے۔ عصمت (میری اہلیہ) مجھ سے بھی زیادہ چائے کی دل دادہ ہیں۔ عصمت نے داہنے ہاتھ سے مجھے چائے کا کپ دیا ہے۔ بائیں ہاتھ میں خود اُن کا کپ ہے جو اُن کے ہونٹوں سے لگا ہوا ہے۔ میں نے بھی اپنا کپ ہونٹوں سے لگا لیا ہے۔ کال بل نے ہم دونوں کو چونکا دیا ہے۔

'کون'...... عصمت نے سوال کیا ہے۔

'میں ہوں صبا' میں چائے کا کپ لیے ہوئے باہر کمرے میں صبا کے پاس آگیا ہوں۔ صبا امروہوی خوب صورت بھی ہیں خوب سیرت بھی۔ بعض سرزمین ہی ایسی ہوتی ہے جہاں خوب سیرتی عمومیت اختیار کر لیتی ہے امروہہ ایک ایسی ہی بستی ہے، یہاں خوب صورتی نسبتاً کم اور خوب سیرتی زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف کہیں خوب صورتی زیادہ اور خوب سیرتی گاہے گاہے ملتی ہے۔ صبا بارہ بنکی میں صبا امروہوی کی حیثیت سے متعارف اور مقبول ہیں لیکن خود اُن کے وطن میں صبا امروہوی کا ذکر لوگوں کے چہروں پر ایک سوالیہ نشان بن کر اُبھر آتا ہے...... 'اچھا سلطان رضوی'...... اور اس طرح ایک شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہے۔ صبا کی مزاج پرسی کے بعد میں نے سویرے سویرے

آنے کا سبب پوچھا ہے۔ صبا مجھ سے مخاطب ہیں۔

'بھئی یہاں جون ایلیا آئے ہوئے ہیں'...... 'جون ایلیا؟' میں نے برجستہ دہرایا ہے۔ چند لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کر لی ہے اب میں ہوں اور میرے خیالات کی دنیا...... 'جون ایلیا...... بارہ بنکی...... کراچی؟ میں نے برق رفتاری کے ساتھ خیالات کے سہارے پرواز کر کے کراچی تک کا سفر کر لیا ہے......' یہ کیسے ہو سکتا ہے بارہ بنکی اور جون ایلیا......؟'، میں نے مسئلہ خود حل کر لیا ہے۔ عصمت نے چائے صبا کو پیش کر دی ہے۔

'اچھا' زیرِ لب تبسم کے ساتھ اب میں نے صبا کو جواب دیا ہے۔ میرے زیرِ لب تبسم پر صبا بھی مسکرائے ہیں غالباً یہ سمجھ کر کہ اُن کی لائی ہوئی خبر کا میں نے خیر مقدم کیا ہے حالاں کہ دراصل میں اُن کی 'غلط فہمی' یا 'لاعلمی' پر مسکرایا ہوں۔ جون بارہ بنکی کیسے آ سکتے ہیں؟ میں اپنے اس یقین کو بدلنے پر تیار نہیں ہوں۔ لیکن اخلاقاً اس کا اظہار بھی صبا سے نہیں کر رہا ہوں اور اس بات کو سمجھ کر وضاحت بھی نہیں کر رہا ہوں۔ ابھی مجھے یہ علم نہیں ہے کہ صبا اور جون ہم وطن ہیں اور یہ کہ جون سخاوت نقوی صاحب (ڈسٹرکٹ لائیو اسٹاک آفیسر) کے عزیزِ خاص ہیں۔

شام کے پانچ بجے ہیں، وکالت کا جامہ اُتار کر میں مطمئن ہو چکا ہوں۔ عصمت حسبِ معمول چائے کا کپ اپنے ہونٹوں سے لگائے ہیں، میں بھی چائے پی رہا ہوں، کال بیل پر ہم دونوں چونک گئے ہیں۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں اس لیے اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ باہر نکلا ہوں۔ صبا امروہوی سامنے موجود ہیں۔

'رام لعل صاحب آئے ہوئے ہیں'...... رام لعل کا نام سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں دن بھر کی تھکن بھول گیا ہوں۔ رام لعل صرف ممتاز افسانہ نگار اور اُردو کے محسن ہی نہیں بل کہ وضع داری اور شرافت کا مجسم بھی ہیں۔ محبت اُن کا شیوہ ہے۔

'ڈاکٹر رضوی کی گاڑی میں'...... آپ بھی چلیے جون سے ملنے چلنا ہے۔

'جون سے ملنے......؟' جون میرے لیے پھر ایک مسئلہ بن گئے ہیں، کپڑے بدل کر میں بھی گاڑی میں آ گیا ہوں۔ گاڑی میں ڈاکٹر رضوی کے علاوہ رام لعل صاحب اور حضرت خمار بارہ بنکوی بھی موجود ہیں۔ اخبار میں لپٹے ہوئے کپڑوں کا ایک بنڈل بھی

خمار صاحب کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ لانڈری جاتے ہوئے راستے میں رام لعل کو مل گئے ہیں اور اُسی طرح جون سے ملنے کے لیے چل پڑے ہیں۔ بہترین غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک عظیم انسان بھی ہیں۔ گاڑی نقوی صاحب کے دولت کدے پہ رُک گئی ہے۔ ہم سب کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ نقوی صاحب اور ہر بندر سنگھ وقت وہاں پہلے سے موجود ہیں۔ مجھے ابھی تک جون سے شخصی ملاقات کا شرف نہیں حاصل ہے۔ میری مشتاق نگاہیں جون ایلیا کو تلاش کر رہی ہیں۔ رام لعل تعارف کرا رہے ہیں۔

'آپ ہیں جناب خمار بارہ بنکوی۔'

'آپ ہیں آذر بارہ بنکوی'

'اور یہ' اور اس کے بعد ایک شخص مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ میانہ قد، دُبلا پتلا، کِھلتا ہوا گندمی رنگ، بندہ نواز گیسو دراز کی طرح بڑے بڑے بال، کشادہ پیشانی، آنکھیں غیر معمولی ذہانت کی آئینہ دار، متبسم لب، تھکن کے باوجود چہرہ شگفتہ اور پُر کشش۔ مجھے جون کی سادگی میں بھی عجیب سی آراستگی نظر آ رہی ہے۔ اُن سے انتہائی غیر متوقع طور پر مل کر میں اب بھی متحیر ہوں، اسی عالم میں میری نظر صبا کی طرف اُٹھ گئی ہے۔ مجھے اُن کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں فتح مندی کی چمک نظر آ رہی ہے۔ مجھے احساسِ شکست ہے مگر احساسِ شکست غیر معمولی مسرت کی نشان دہی کر رہا ہے۔ سرزمینِ بارہ بنکی پر جون ایلیا ایک عظیم انسان، ایک عظیم صحافی، ایک عظیم محقق و ادیب اور ایک عظیم شاعر نے پہلی بار قدم رکھا ہے۔ فضا سرشار۔ خمار صاحب نے آنکھوں آنکھوں میں جون کا استقبال کرتے ہوئے پوچھا ہے۔

'آپ کب تشریف لائے؟'

'کل رات میں حاضر ہوا ہوں' پھر گفت گو کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے، گھر کا ماحول شادمانی میں ڈوبا ہوا ہے، خوشی لہریں مار رہی ہے۔ بات چیت کا سلسلہ جاری ہے کبھی معاشیات کبھی سماج اور کبھی اُردو زیرِ بحث ہے۔ ابھی جون کی شخصیت پر تکلف کی نقاب پڑی ہے، چند لمحوں میں کوئی سنجیدہ آدمی بے تکلف بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ گفت گو آگے بڑھ رہی ہے اور تکلف ختم ہوتا جا رہا ہے۔ تمام تر لطافتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے بے تکلفی کا ماحول پھیلتا جا رہا ہے۔ تبسم، ہنسی میں اور ہنسی، زور دار قہقہوں میں ڈھلتی جا رہی

ہے۔ ہم لوگوں کی پشت پر نقوی صاحب میزبانی کے اہتمام میں مصروف ہیں۔ اب موصوف کے حکم پر ہم لوگ چائے کی میز پر پہنچ چکے ہیں۔ خوب صورت پلیٹیں کئی قسم کے بسکٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ رام لعل چائے بنا رہے ہیں۔ اُن کے بال قبل از وقت بالکل سفید ہو گئے ہیں جون اس خوش گوار ماحول کو لطیف تر بنانے کے لیے رام لعل کو چھیڑ رہے ہیں۔ 'یار رام لعل! تیرا چہرہ تو معشوق کی طرح حسین ہے مگر تیرے بال بالکل تیرے باپ کی طرح ہیں۔ 'محفل میں قہقہہ پڑا ہے۔ لیکن احترام کے پیشِ نظر جون نے خمار بھائی کی طرف کپ بڑھانا چاہا ہے۔

'پہلے تم پیو' رام لعل نے کہا ہے۔

'پہلے میں کیوں؟'

'اس لیے کہ تم پاکستانی مہمان ہو' رام لعل نے بھی جون کو انتقاماً چھیڑا ہے۔

'رام لعل! پاکستانی تو تم بھی ہو۔'

'اس طرح کہ صرف تمھارا جسم ہندوستان میں ہے۔ تمھاری روح دراصل پاکستانی ہے' رام لعل ایک لمحے کے خاموش ہو گئے ہیں جیسے انھیں اُن کا بھولا ہوا وطن یاد آ گیا ہے۔

ڈاکٹر رضوی ادب نواز بھی ہیں اور ادیب نواز بھی اس لیے چائے کے بعد انھیں کی فرمائش پر اب شعر و سخن کا دور شروع ہوا ہے۔ ہر بندر سنگھ وقت اور میں اپنی اپنی غزلیں پڑھ چکے ہیں، اب حضرت جون سے گزارش کی گئی ہے۔ جون نے اپنی غزل کا آغاز بڑے خوب صورت مطلع سے کیا ہے، سبھی جھوم رہے ہیں۔ جون کی غزل کے تقریباً سب اشعار آب دار موتی کی طرح ہیں اور اب جانِ تغزل حضرت خمار بارہ بنکوی غزل سرا ہیں۔ اُردو شاعری میں عصرِ حاضر میں کیسے کیسے انقلاب آئے ہیں کیسی کیسی تحریکوں نے زور پکڑا ہے مگر خمار نے تغزل کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ حضرت خمار نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں مطلع پڑھا ہے، داد و تحسین کی فضا میں خمار صاحب نے غزل ختم کی ہے اس کے بعد سب لوگ منتشر ہو رہے ہیں۔ رام لعل اور ہر بندر سنگھ وقت ڈاکٹر رضوی کے ساتھ لکھنؤ واپس جا رہے ہیں، میں اور خمار بھائی بھی واپس ہو رہے ہیں اور اس طرح یہ خوب صورت نشست ختم ہو رہی ہے۔

2 فروری تا 7 فروری جون ایلیا کی شخصیت اتنی ہمہ گیر اور پر کشش ہے کہ بار بار ملنے

کو بی جا ہتا ہے۔ بارہ بنکی اور لکھنؤ کے درمیان صرف 17 میل فاصلہ ہے جو صرف تیس منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ اس قربت کی وجہ سے بارہ بنکی شہر، لکھنؤ کا ایک محلہ معلوم ہوتا ہے، اس لیے بارہ بنکی کی طرح لکھنؤ میں بھی جون ایلیا کے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہے۔ میرے وطن میں اور کوئی خوبی نہ ہو تو نہ سہی لیکن مہمان کا خاطر خواہ استقبال کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ جون جیسی عظیم ادبی شخصیت کا شایانِ شان استقبال کرنا ہے۔ اب میری اور جون کی ملاقات روزانہ دو دو بار تین تین بار ہو رہی ہے۔ یہ نشستیں بہت دل چسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔ جون صرف مایہ ناز شاعر ہی نہیں بل کہ ایک صحافی، ایک مفکر اور ایک محقق بھی ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادب پر بھی اُن کی بڑی گہری نظر ہے۔ مطالعہ نہایت وسیع اور عمیق ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر ہر وقت بات کر سکتے ہیں۔

8 فروری میں لکھنؤ میں رام لعل کے گھر پر بیٹھا ہوا ہوں میرے ساتھ رام لعل اور ہر بندر سنگھ وقت بھی جون کے اعزاز میں ہونے والے ادبی سیمینار اور مشاعرے کے دعوت نامے تیار کر رہے ہیں۔ اس سیمینار اور مشاعرے میں ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کرنے کے لیے ہم لوگ رام لعل کے گھر سے روانہ ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلے ہم لوگوں نے شمس الرحمان فاروقی کے دولت کدے پر حاضری دی ہے۔ فاروقی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فنِ تنقید بھی اُن کا میدان ہے اور شاعری بھی۔ باتیں دل چسپ کرتے ہیں لیکن بولتے بہت زیادہ ہیں یہ سوچے بغیر کہ اُن کا مخاطب کون ہے۔ میری اور رام لعل کی گزارش پر وہ ادبی سیمینار اور مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے بڑی خوشی سے تیار ہو گئے ہیں۔ اُن کا یہ خلوص میرے لیے بڑا حوصلہ افزا ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ چونکے ہیں۔ 'جون کہاں ہیں؟'

'بارہ بنکی میں'

'چلو اسی وقت بارہ بنکی چلیں'

'مجھے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کو بھی مدعو کرنا ہے۔'

'یہ سب کل ہو جائے گا'

رام لعل اور ہر بندر سنگھ وقت نے بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے ساری ذمے داری

تقریباً پچیس منٹ کے سفر کے بعد فاروقی کی گاڑی جون کے دروازے پر
اپنے سر لے لی ہے۔ تقریباً پچیس منٹ کے سفر کے بعد فاروقی کی گاڑی جون کے دروازے پر
کھڑی ہوگئی ہے۔ جون جوشِ مسرت سے فاروقی سے گلے ملے ہیں۔ چائے کے بعد دل چسپ
گفت گو ہو رہی ہے ذاتی گفت گو بڑھتے بڑھتے شعروادب کے موضوع تک پہنچ چکی ہے۔
فاروقی حسبِ معمول زیادہ بول رہے ہیں اُن کی گفت گو میں مواد ہوتا ہے اس وقت
ڈاکٹر اقبال زیرِ بحث ہیں، ٹھنڈک اچھی خاصی ہے کمرے کے دروازے بند ہیں۔ سگریٹ
کا دھواں پھیلا ہوا ہے۔ فاروقی ڈاکٹر اقبال کی شاعرانہ عظمت ثابت کرنے میں مصروف
ہیں۔ دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس وقت تک باقی لوگ فاروقی کو سن رہے ہیں۔ اب
جون گفت گو کا رُخ بدل رہے ہیں۔

'وہ شاعر عظیم شاعر کیسے ہوسکتا ہے جس نے متضاد کرداروں کی مدح سرائی کی ہو'

'مثلاً......؟' فاروقی نے وضاحت چاہی ہے۔

'مثلاً ڈاکٹر اقبال کا ہیرو بہ یک وقت اورنگ زیب بھی ہے اور سرمد بھی......ایک
ہی شاعر قاتل اور مقتول دونوں کو بلند کردار سمجھے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟' فاروقی ڈاکٹر اقبال کو
Defend کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بات آگے بڑھ رہی ہے کچھ دیر کے بعد جون
پھر لب کشا ہیں۔

'مسولینی میں عظیم انسان کی کون سی خوبیاں ہیں......؟ وہ ڈاکٹر اقبال کا ہیرو کیسے
ہوگیا۔ برٹش امپائر کے شہنشاہ کے سامنے ڈاکٹر اقبال نے سرِ تسلیم کیسے خم کر دیا......؟
کیا عظیم شاعر کا کردار ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ ہر طبقے کے لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش
کرے......؟ اس کے علاوہ شاہین ایک ایسا خوں خوار طائر ہے جس میں رحم کا جذبہ ہرگز
نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اقبال نے شاہین کا تصور پیش کر کے اور اُسے علامت بنا کر انسان کو
خوں خوار بننے کی تعلیم کیوں دی......؟'

اس گرما گرم بحث کے بعد محفل میں کچھ دیر کے لیے خاموشی ہوگئی ہے۔ اس
خاموشی کو ہربندر سنگھ وقت نے پھر توڑا ہے۔

'فاروقی صاحب! فراق کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'

'آپ کا سوال غیرواضح ہے۔'

'میرا مطلب ہے فراق کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔؟'

'فراق شاعر ہیں لیکن عظیم شاعر ہرگز نہیں۔' فاروقی سنجیدہ ہیں۔

'کیوں......؟' وقت فاروقی کی اس برجستگی اور بے باکی پر تڑپ کر بولے۔

'اس لیے کہ دیگر باتوں کے علاوہ فراق کے اچھے اشعار میں بھی ایسے غیر ضروری الفاظ ملتے ہیں جن کے بغیر شعر کا مطلب پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔' فاروقی مثالیں بھی پیش کر رہے ہیں لیکن اس بنا پر کسی شاعر کا پورا کلام کیسے رَد کیا جا سکتا ہے؟ سمجھنے سے کم از کم میں قاصر ہوں۔ فاروقی گفت گو سے بہت زیادہ اینٹی فراق معلوم ہوتے ہیں۔ وقت اپنے محدود مطالعے کی وجہ سے فراق کو ڈیفنڈ کرنے میں بری طرح ناکام ہو رہے ہیں۔ فاروقی سخت لہجے میں تنقید کر رہے ہیں۔ رام لعل کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ بتا رہا ہے کہ انھیں فاروقی کی تنقید پسند نہیں آ رہی ہے مگر وہ رواداری برت رہے ہیں۔ یہ رواداری مجھے بری لگ رہی ہے۔

'کلام اگر چاندی ہے تو خاموشی سونا ہے۔' میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کی تعمیل میں چپ ہوں۔ اب رات کے بارہ بجے ہیں فاروقی رام لعل اور ہربندر سنگھ وقت لکھنؤ واپس جا رہے ہیں۔

11 فروری آج بارہ بنکی کے ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے جون ایلیا کے اعزاز میں بارہ بنکی کے خوب صورت اور وسیع سہون ہال میں ایک ادبی سیمینار اور مشاعرہ ہونے جا رہا ہے۔ ڈائس کافی کشادہ اور سجا ہوا ہے جس پر تقریباً سو آدمی بہ یک وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ ڈائس کے بالکل سامنے سامعین کی نشست کے لیے خوب صورت صوفے اور پیچھے دُور تک کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ داہنی طرف کی نشستیں اخبار نویسوں کے لیے اور بائیں طرف کی نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔ باذوق سامعین جن میں معزز شہری، ڈاکٹر، وکلا، پروفیسر اور ذمے دار اعلیٰ افسران شامل ہیں، وقتِ مقررہ پر پہنچ کر اپنی اپنی نشستیں لے رہے ہیں، خوش پوشاک اور خوش مذاق خواتین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جن کے نقرئی قہقہے ہال کی مہکی ہوئی فضا میں اور سرمستیاں بکھیر رہے ہیں۔ لکھنؤ سے رام لعل، شمس الرحمان فاروقی، محترمہ داراب بانو وفا، محترمہ زیبا علوی اور ہربندر سنگھ وقت بھی پہنچ

چکے ہیں۔قریب قریب سبھی نام ور مقامی شعرا بھی آ چکے ہیں۔جن میں حضرت خمار بارہ بنکوی،
رضوان بارہ بنکوی، نگار بارہ بنکوی، شمیم دردائی، مراد بارہ بنکوی، اختر موہانی اور قدیر تابانی
وغیرہ شامل ہیں۔ ہال بھر چکا ہے، سامعین کی بے چینی بڑھ رہی ہے، اچانک ہال میں
داہنی طرف سے ایک شخص پر وقار انداز میں چند آدمیوں کے ساتھ داخل ہوا اور خواتین کی
صفوں سے گزرتا ہوا ڈائس کی طرف بڑھا۔سب کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا 'جون ایلیا'
اب حضرت جون ایلیا ڈائس پر تشریف لا چکے ہیں، ڈائس بھر چکا ہے۔اس ادبی جلسے کی
صدارت حضرت خمار بارہ بنکوی کر رہے ہیں۔نظامت کے فرائض جناب رضوان بارہ بنکوی
انجام دے رہے ہیں۔حضرات خمار بارہ بنکوی، رام لعل اور میں نے جون کی گل پوشی کی ہے۔
محبت کے مضبوط ڈورے میں پروئے ہوئے اور عقیدت کی خوش بو سے مہکے ہوئے
رنگا رنگ پھول جون کے گلے کا ہار بنے ہوئے ہیں۔ ٹیلی ویژن یونٹ بھی مصروف کار ہے۔
فلیش لائٹ ہال میں دوڑ رہی ہے۔جون کا استقبال کرتے ہوئے میں عرض کر رہا ہوں۔

'اودھ کی دھرتی بالعموم اور بارہ بنکی کی سرزمین بالخصوص خوش نصیب ہے کہ
سرحد پار کے ایک ایسے دانش ور کا استقبال کرنے کے قابل ہو سکی ہے جس نے اپنی شاعری
اور صحافت دونوں کے ذریعے محبت اور انسان دوستی کا درس دیا ہے۔' ان الفاظ کا استقبال
تالیوں کی گونج میں ہو رہا ہے۔اب سیمینار شروع ہو رہا ہے جس کا موضوع ہے 'ہمارا ادب
اِس پار، اُس پار' سب سے پہلے ملک کے ممتاز افسانہ نگار رام لعل گہر افشاں ہیں اور
'تقسیم وطن کے اثرات اُردو افسانے پر' کے عنوان کے تحت ایک پر مغز تقریر کر رہے ہیں۔
ٹیلی ویژن یونٹ میں اور تیزی آ گئی ہے، فلیش لائٹ رام لعل کے چہرے پر مرکوز ہے۔
کیمرہ مین بھی مشغول ہے۔روشنی سب کے سروں سے گزرتی ہوئی اب اگلی صف میں بیٹھے
ہوئے سامعین کے چہروں پر جمی ہے۔رام لعل نے اپنا مقالہ ختم کیا جو بہت زیادہ پسند کیا
گیا۔اس کے بعد شمس الرحمان فاروقی کا نام پکارا گیا ہے وہ مائیک کے سامنے آ گئے ہیں
اور تقسیم وطن کے بعد اُردو شاعری اور اُردو زبان کا جائزہ بڑے حقیقت پسندانہ اور موثر انداز
میں کر رہے ہیں۔اُن کی پُر مغز تقریر کو اُن کی ذاتی وجاہت اور زیادہ موثر کر رہی ہے۔
ٹیلی ویژن والے ایک لمحے کے لیے بھی رُکے نہیں ہیں۔ لیجیے اب آج کے مہمانِ خصوصی

حضرت جون ایلیا مائیک کے رُوبہ رُو ہیں۔ ہال سامعین سے بھرا ہوا ہے مگر ایسی مثالی خاموشی ہے کہ سانسوں کی آواز بھی سنی جاسکتی ہے۔ ٹیلی ویژن یونٹ اب ہال میں تقریباً دوڑ رہا ہے، کبھی اِس گوشے میں، کبھی اُس گوشے میں، کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ فلیش لائٹ میں جون ایلیا کا چہرہ اور دمک گیا ہے، جون کے چہرے پر ہزاروں نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ سامعین ہمہ تن گوش ہیں، جون گہر بار ہیں۔

'پاکستان کے لوگ محبت کے لوگ ہیں، محبت سے رہنا چاہتے ہیں۔ ادب اور شاعری بھی عوام کے ساتھ ساتھ محبت کے پیاسے ہیں۔ امن آشتی اُن کا نصب العین ہے'

اور اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کی عام فضا کا جائزہ لے کر انھوں نے اپنی تقریر ختم کی ہے۔ سامعین بے حد محظوظ ہو رہے ہیں۔ خواتین کی تعداد اتنی بڑھتی جارہی ہے کہ وسیع ہال کو بھی تنگ دامانی کا احساس ہو رہا ہے۔ خوش رنگ اور بیش قیمت لباس کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ گویا یہ کوئی ادبی جلسہ نہیں بل کہ بیوٹی شو ہے۔ اب مشاعرہ شروع ہو رہا ہے۔ اختر موہانی، مراد بارہ بنکوی، صبا امروہوی، قدیر تابانی، شمیم مدوالی، رضوان بارہ بنکوی، نگار بارہ بنکوی، داراب بانو وفا، فاروقی اور میں اپنا کلام پیش کر چکے ہیں۔ ٹیلی ویژن والے پروگرام کو برابر کور کر رہے ہیں۔ اب شعری دور میں پھر شمعِ محفل حضرت جون کے سامنے ہے۔ جون غزل سرا ہیں۔

ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں
دھوپ تھے، سائباں کے تھے ہی نہیں

مطلع پر سامعین جھوم رہے ہیں۔ جون غزل پڑھ رہے ہیں اور داد و تحسین کی فضا میں 'مکرر ارشاد' کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ جون نے پڑھتے پڑھتے یہ شعر پڑھا۔

اُس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

اب سامعین کو جون کے کرب کا احساس ہو چکا ہے، اس شعر پر تقریباً ہر شخص تڑپ گیا ہے۔ خواتین کے مجمع میں بھی عجیب سی لہر ہے۔ ٹیلی ویژن والوں نے بھی موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنا رُخ اسی طرف موڑ دیا ہے۔ برقع پوش خواتین کے کھلے ہوئے چہروں پر اُن

کی نقاہیں تیزی سے واپس آگئی ہیں۔اس کے بعد صدرِ محفل حضرت خمار بارہ بنکوی کا نام نامی پکارا گیا ہے۔سامعین کا دل بہت پہلے جیت چکے ہیں۔مشاعروں میں اُن کی غیر معمولی مقبولیت اسی حقیقت کی دلیل ہے۔وہ جھوم جھوم کر اپنی غزل کا مطلع مرحمت فرما رہے ہیں۔

موجوں سے نہ طوفانوں سے اللہ بچائے
کشتی کے نگہبانوں سے اللہ بچائے

مطلع پر بے حد داد مل رہی ہے۔اس کے بعد اگلا شعر پڑھ رہے ہیں۔اب مشاعرہ اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ ٹیلی ویژن یونٹ بھی سمت بدل بدل کر تصویر کشی کر رہا ہے مگر اس طرح کہ جون کیمرے کی زد میں برقرار رہیں۔روشنی سامعین اور شعرا کے سروں کے اوپر سے بار بار گزر رہی ہے۔خمار کے کلام سے سامعین مسحور ہو رہے ہیں۔خمار کی غزل کے ساتھ اس یادگار ادبی جلسے کا اختتام ہو گیا ہے۔جون خواتین اور مردوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہیں۔کوئی ہاتھ ملا رہا ہے کوئی آٹو گراف حاصل کر رہا ہے۔تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد جون 'اہلِ خلوص' کے نرغے سے رہا ہوئے ہیں۔اب بھی مہمان شعرا، ادیب اور مقامی شعرا غریب خانے کو رونق بخشنے کے لیے گاڑیوں میں سوار ہو رہے ہیں۔

13 فروری تا 13 اپریل جون ایلیا امروہہ اور دہلی ہوتے ہوئے بمبئی جا چکے ہیں۔ ہر جگہ اُن کا شایانِ شان خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔جون کے آنے سے ہندوستان کے کم از کم تین صوبوں یوپی، دہلی اور بمبئی میں ادبی سرگرمی اپنے عروج پر آگئی ہے۔جگہ جگہ ادبی نشستیں ہو رہی ہیں۔

14 اپریل جون ایلیا بمبئی سے پھر بارہ بنکی آگئے ہیں۔ جون کے جانے کے بعد بھی اُن کا ذکر یہاں ہر ادبی محفل میں ہوتا رہا تھا۔اُن کے واپس آنے پر پھر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ہندوستان کے مختلف مقامات سے لوگ جون سے ملنے بارہ بنکی آرہے ہیں۔ اب میری اور جون کی روزانہ نشست رہتی ہے۔ جب فرصت ملتی ہے دونوں مل بیٹھتے ہیں۔ دن گزر رہے ہیں۔ جون کے دل کا سکون لٹتا جا رہا ہے۔خوش گفتاری اضطراب میں ڈھلتی جا رہی ہے، چہرہ بجھتا جا رہا ہے، دونوں پر ہنسی آتی ہے مگر مضمحل سی۔27 اپریل کو فلائٹ مل رہی ہے، یہی احساس کرب مل کر جون کو کھائے جا رہا ہے۔وطن کی محبت جزوِ ایمان ہے۔

ترکِ وطن کے باوجود جون اب بھی مردِ مومن ہیں۔ امروہہ پہنچ کر ایک روز جون سرِ بازار زمین پر لیٹ گئے تھے۔ اُٹھنے پر رئیس نجمی نے اُن کے کپڑوں کی مٹی جھاڑی تھی جون نے عجیب کرب کے ساتھ کہا تھا 'رئیس اسے نہ جھاڑو یہ میرے وطن کی خاک ہے۔'

22 اپریل وہاں سے شریف صاحب بھی آ چکے ہیں۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ بک ہو چکا ہے۔ جون کو الوداع کہنے کے لیے آج پھر غریب خانے پر ایک ادبی نشست منعقد ہونے جا رہی ہے، دن کے نور پر رات کی تاریکی غالب آ چکی ہے۔ برقی قمقموں سے فضا پرنور ہے مگر ماحول کی اُداسی نہیں جاتی۔ سامعین کافی تعداد میں جمع ہو چکے ہیں۔ نامور مقامی شعرا کے علاوہ جوان فکر شاعر ساغر مہدی اور ماہ نامہ 'پرواز' پٹنہ اور اور 'عظیم آباد ایکسپریس' کے مدیر رضوان احمد بھی آ چکے ہیں۔ مقامی وغیر مقامی شعرا جون کے ساتھ کھانے کے میز پر ہیں، بڑی پیاری گفت گو ہو رہی ہے۔ کھانے کے بعد مشاعرے کا آغاز ہو رہا ہے۔ صدارت ٹریژری افسر جناب مرزا صاحب فرما رہے ہیں۔ جون بھی صدرِ محفل کے پاس ڈائس پر آ گئے ہیں جون کی جدائی کا احساس سب کو ہے۔ اکثر شعرا حالات سے مطابقت رکھنے والے اشعار جون کو مخاطب کر کے پیش کر رہے ہیں۔ ہر بار جون کی آنکھیں آب دیدہ ہو رہی ہیں۔ فرطِ غم سے وہ سر جھکا لیتے ہیں اور اب خود جون کے سامنے شمعِ محفل ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں مگر بھرا ہوا دل اور رندھا ہوا گلا اُن کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ سامعین کی فرمایش پر کئی قطعات اور غزلیں سنانے کے بعد وہ ایک غزل اپنے انتخاب سے پیش فرما رہے ہیں۔

مِل کر تپاک سے نہ ہمیں کیجیے اُداس
خاطر نہ کیجیے، کبھی ہم بھی یہاں کے تھے

جون کی آنکھوں کے آنسو چھلک کر رُخسار تک آ گئے ہیں۔ سامعین اپنا دل تھام کر رہ گئے ہیں۔ سب کی آنکھیں نم ہیں، ماحول سوگ وار ہے۔ جون پھر دردناک لہجے میں شعر پیش کرتے ہیں۔

کیا پوچھتے ہو نام و نشانِ مسافراں
ہندوستاں میں آئے ہیں ہندوستاں کے تھے

یہ شعر جون کے کرب ناک احساس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ سامعین بھی جون

کے ساتھ ساتھ کراہ اُٹھے ہیں۔

24 اپریل ویزا پر روانگی کا اندراج اور سامان وغیرہ باندھنے میں گزرا ہے۔ اب شام کے پانچ بجے ہیں، جون پابہ رکاب ہیں۔ مختصر سا سامان گھر سے باہر لایا جا چکا ہے، درودیوار سے حسرت ٹپک رہی ہے، ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔ بہن نجفی (جون کی حقیقی بہن) اور بھانجیوں ہما، نغمہ اور حنا کی دبی دبی سسکیاں اب گریہ بن کر بلند ہو رہی ہیں۔ بہن نجفی جون کے گلے میں بانہیں ڈالے رو رہی ہیں۔

بھانجیاں جون سے لپٹی ہوئی ہیں، مفارقت کی جان لیوا گھڑیاں ہیں، مدت کے بعد بہن بھائی میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ملاقات چند لمحوں کے بعد اب پھر خواب بننے والی ہے۔ بہن بھائی سے چھوٹ رہی ہے۔ بھائی اور ایسا پیارا بھائی۔ جون خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں مگر بہن نجفی کو تسلی دے رہے ہیں 'بہن رومت میں پھر بہت جلد آؤں گا' مگر یہ تسلی، حقیقتاً جھوٹی تسلی آگ پر تیل کا کام کر رہی ہے۔ جانے والے جا کر جلدی کہاں واپس آتے ہیں؟ جون کو لکھنؤ تک ٹیکسی لے کر جانا ہے۔ میں اور جون ایک رکشے پر اور نقوی صاحب اور شریف صاحب دوسرے رکشے پر بیٹھ گئے ہیں۔ بہن نجفی، ہما، نغمہ اور حنا وغیرہ کمرے میں سامنے وہیں بیٹھی رو رہی ہیں جہاں جون بیٹھا کرتے تھے۔ اب ہم لوگ ٹیکسی اسٹینڈ کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ بہن نجفی کی طرح میرا بھی حقیقی بھائی جدا ہو رہا ہے۔ فرطِ غم سے سانس رُک رہی ہے۔ میرے، جون دونوں کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ کر نقوی صاحب نے جون کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا ہے اور پیار سے بوسہ دیا ہے۔ جون گلے مل کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے اور جون نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے کو 'خدا حافظ' کہا ہے، بڑی صبر آزما ساعتیں ہیں۔ ٹیکسی کے انجن کی جھرجھراہٹ کے ساتھ پہیوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے اور ٹیکسی چل پڑی ہے اور اب ٹیکسی سڑک پر تیز بھاگتے بھاگتے نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ میں نقوی صاحب کے ساتھ اُسی جگہ خاموش کھڑا ہوں جہاں سے ابھی ابھی چند لمحے پہلے جون کو رخصت کیا ہے۔ میرا احساس سسک رہا ہے، ماحول کی اُداسی مجھ کو پُرملال کر رہی ہے۔

وہ شخص کیا ہوا جو تری داستاں کا تھا؟

جون ایلیا

ڈاکٹر آغا سہیل

جون ایلیا کی شخصیت اور ان کی شعری متاع اگر اوستا (The Avesta) ہے تو اس کی تفہیم کی ژند اور پاژند اُن کے پہلے مجموعۂ کلام 'شاید' کے ابتدائیے میں بہ عنوان 'نیازمندانہ' موجود ہے۔ اپنی سہل انگاری کی بنا پر جون کے اور ان کے شعری مجموعے کے مطالعے سے پہلے اگر قارئین ان کے ابتدائیے سے صرفِ نظر کرتے ہیں تو یقیناً انھیں جون کی شخصیت پیچیدہ اور ژولیدہ نظر آئے گی جس میں جون کا ہرگز کوئی قصور نہیں ہے کیوں کہ اپنی شخصیت میں تعمیرِ فکر اور تہذیب کے جملہ مراحل پر انھوں نے بہ تفصیل وضاحت اور صراحت کر دی ہے، انکسار اور خاک ساری کے ساتھ امروہے کے مردم خیز خطے میں اپنے خانوادے کے ذی علم اور ہنرمند افراد کا تعارف بھی کرادیا ہے جس سے عمرانی ماحول اور فضا پر بہ خوبی روشنی پڑتی ہے۔ جون ایلیا نے اپنی تخلیقی نثر کے حرف حرف میں معانی اور مفاہیم بہ تشریح بیان کر دیے ہیں کہ انسان اور کائنات کے رشتے پر مفکرین کی آرا اور نظریات نے ان کی ذہنی نشو و نما پر کیا کیا اور کیسے کیسے اثرات مرتب کیے اور جون کسی نظریے سے مرعوب نہیں ہوئے بل کہ ان نظریات کا معروضی اور منطقی تجزیہ کرتے رہے اور اگر ان کے ذہن نے کسی نظریے کے کلی یا جزوی اثر کو مفید مطلب پایا تو اس سے متاثر ضرور ہوئے تاہم متناقص نظریات کا تفحص بھی جاری رہا اور انھیں بھی دانش و بینش کی کسوٹی پر گھستے رہے۔ اوائل عمری سے پایانِ عمر تک جون تعمیرِ فکر کے اس وظیفے سے فارغ نہیں ہوئے۔ اصل میں ہماری اسلامی مابعد الطبیعات میں بعض زعما نے منقولات سے سمجھنے کی سعیٔ لاحاصل میں

ابہام پیدا کر دیا ہے جب کہ معقولات پر دانش وری اور دیدہ وری کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ ناقص اور ضعیف احادیث کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے علم الرجال سے رجوع نہیں کیا گیا۔ جون ایلیا کا خانوادہ بالخصوص ان کے والد مرحوم و مغفور معقولات کے علوم متداولہ کے جزئیات اور کلیات کے رموز و نکات کی تشریحات کی جُست جو میں رہا کرتے تھے اور ذی جون ایلیا اور ان کے دیگر افرادِ خاندان بھی علومِ معقولات سے رجوع کرتے رہے مگر جون ایلیا بہ طورِ خاص تاریخ، ادب، سیاست اور فلسفے کی تحصیل کے شغف میں جی جان سے لگے رہے، جب کہ ان کے ہم عمر معاصرین لہو و لعب میں سر کھپاتے ہوں گے۔ جون فلسفیانہ نظریات کی گتھیوں کو سلجھانے اور ان سے دست و گریبان رہنے میں منہمک رہتے تھے۔ جس میں ملک کے بیش تر نوجوان عموماً حتیٰ کہ مرغ و ماہی تک اپنے اپنے آشیانوں میں محوِ استراحت ہوتے ہوں گے۔ جون کسی لاینحل مسئلے کی گرہ کشائی میں لگے ہوتے تھے کہ جون کے نزدیک شرعی، قانونی اور طبعی لحاظ سے وہ اس کے مکلّف تھے یعنی اشرف المخلوقات۔ خلافتِ ارضی کی تکلیفِ شرعی یہی ہے کہ خود اور کائنات کے رشتے کو سمجھے اور دوسروں کو سمجھائے۔ جون کے اندر یہ جوہرِ قابل تھا اور بہت کچھ سمجھ لینے کے بعد جون نے نہ کوئی دعویٰ کیا اور نہ نفیٔ خودی کی راہ اختیار کی جو تصوف کے ایک مدرسہ فکر کی پسندیدہ راہ تھی اور جو قنوطیت یا راہبانہ زندگی کی طرف جاتی تھی بل کہ ہر دور اور ہر زمانے میں انسان کے وجود اور اس کے شرف کے جواز اور اپنے انفرادی وجود کے تعین کرنے کا شغل جاری رکھا۔ جون فلسفے کے طالب علم ہی نہیں، نابغہ تھے اور تاریخ کو تاریخ کے مآخذ اور سرچشموں سے اُجالتے اور نکھارتے تھے اور جس طرح پلیخانوف نے مادی جدلیت میں کارل مارکس کی تشریح، توضیح اور تفسیر کی ہے وہ انگریزی زبان میں Art & Social Life کے 1953ء سے پہلے موجود نہیں تھی۔ بلادِ عرب میں خصوصاً اور ایشیا میں عموماً علوم و فنون کے خزانے مقامی زبانوں میں مخفی تھے۔ اولاً خلفائے عباسیہ کے دور میں اور بعد کے دیگر ادوار میں یونان اور دنیا کے دوسرے گوشوں کے علما کے تراجم عربی، عبرانی، فارسی میں ہوئے اور سنسکرت کے علما نے ان خزانوں کو اپنی زبان سے دوسری زبانوں میں منتقل کرنا شروع کیا اس لیے عربی اور سنسکرت زبانوں اور دیگر یورپی زبانوں، بہ شمول لاطینی، فرانسیسی اور

انگریزی کے علم میں آگہی پیدا کرنے کو کلیدِ علم سمجھا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ برصغیر میں ذی علم خانوادوں میں دانش گاہیں قائم تھیں اور جو ذہنی تربیت وتہذیب ان خانوادوں میں ہوتی تھی وہ عام درس گاہوں میں ممکن نہیں تھی۔ جون کے والدِ محترم اسی ماحول اور فضا کے تربیت یافتہ تھے اور عربی، سنسکرت، عبرانی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے ذریعے کسبِ علم کرتے رہے تھے اور ہیئت و نجوم میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے جون میں بہ طورِ خاص اس جوہر کو دریافت کیا تھا کہ اپنی تصانیف و تالیف کی طباعت کے لیے ان سے وصیت کی تھی (جو جون اپنے نامساعد حالات کی بنا پر پوری نہ کر سکے اور تا دمِ واپسیں اس جرم پر ملول اور نادم رہے) خود جون نے نہایت مستعدی، خاک ساری اور انکسار کے ساتھ تاریخ، فلسفہ، ادب اور شعر کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور جملہ فنونِ منطقیہ میں افضل ترین شعر کی تخلیق کا وظیفہ اختیار کیا تھا۔ تعمیرِ فکری، تخلیقِ شعر کی محرک بنی اور ایسی بنی کہ 'آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے' کا مترادف بن گئی۔ جون شاعر تھے، فلسفی تھے، مفکر اور صاحبِ بصیرت نابغہ تھے، روایتی شاعر نہیں تھے اور یہی وجہ ہے کہ روایتی مذاق اور مزاج کے حلقے میں نہ متعارف تھے اور نہ مقبول تھے کہ وہ ان کے قد و کاٹھ کی سطح پر نہ تو پورے اُترتے تھے اور نہ اُترنا چاہتے تھے (اگرچہ بعض ستم ظریف جون کو فلک الافلاک سے گھسیٹ کر اپنی سطح، یعنی تحت الثریٰ میں لانا چاہتے تھے کہ وہ خود غبی اور الغابلین کی سطح پر قائم تھے، جون نے ان سے سمجھوتا نہ کیا اور اپنے پیڈسٹل سے نیچے اُتر کر ان کے سر سے اپنے سر کی ہم آہنگی نہ کی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جون ایلیا کی شاعری کی ڈکشن نے جنم لیا اور جون کی متخیلہ کی بلند پروازی کی کسی کو ہوا بھی نہ لگی کہ جون نے پیش پا افتادہ سطحی اور از کار رفتہ بل کہ بعض اوقات مجہول اور فرسودہ خیالات اور نظریات کو اپنا موضوعِ شعر نہیں بنایا، تاہم جون نہ تو غیر عمومی انسان تھے اور نہ غیر معمولی شاعر تھے۔ وہ غیر معمولی انسان بن رہے تھے اور غیر معمولی شاعر بنتے بنتے اور ایک عہد ساز شخصیت بنتے بنتے رہ گئے۔ جس طرح ہماری نسل کے بہت سے لوگ نامکمل اور ادھورے ہیں اور یہ ستم ظریفی ہمارے ساتھ کچھ تاریخی محرکات اور عوامل نے کی، ہمارے عمرانی اور معاشرتی اور معاشی حالات نے کی، تاہم جون کو محض حالات' تاریخی حالات پر ایک مختلف اور منفرد انسان اور شاعر سمجھنا مناسب ہوگا۔ بہ قول میر۔

مت سہل ہمیں سمجھو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

جون کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے والد محترم کی جلالتِ قدر ان کے مبلغ علم کی وجہ سے مسلط رہی۔ میرؔ کے والد میر علی متقی صوفی درویش تھے اور بیٹے (میر تقی میرؔ) کو تصوف کا پہلا سبق یہ پڑھایا کرتے تھے، اے پسر عشق بورز کہ بے عشق زندگانی وبال است۔ جون کے والد محترم تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کے باوصف اپنی ذات کی گم راہی کے بجائے کائنات میں آدم کی خلافت کے جواز پر زور دیتے تھے، جو کائنات میں نہ گم ہونے کے قائل تھے اور نہ کائنات کو خود میں گم کرنے کے بل کہ انی جاعل" فی الارض خلیفه کے رموز و نکات کو اپنے عہد میں سمجھنے اور سمجھانے پر خود بھی مائل رہے اور جون کی تربیت میں بھی اسی جوہر کو اجاگر کیا۔ علم و عمل کی جلالتِ قدر جون کو جو اپنے والد کی شخصیت اور شفقت میں میسر آئی وہ امر و ہے سے نکلنے کے عرصۂ دراز کے بعد پروفیسر کرار حسین کی علمی وجاہت میں دریافت ہوئی کہ جون نے موصوف کا ذکر نہایت احترام سے کیا ہے اور ان سے فیض رسانی کا اعتراف خاک ساری اور انکسار سے کیا۔ ہماری نسل کے بعض معاصرینِ جون تھوڑے سے سطحی علم کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے بل کہ تمرد اور تکبر میں بہک جاتے ہیں اور اول فول بکنے لگتے ہیں۔ جون بد نفس اور کم ظرف نہیں خوش فکر، خوش نفس مگر عزتِ نفس کے حامل ہمہ صفت موصوف تھے اور ان اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ کا اظہار جون کے متاعِ شعری کے حرف حرف سے ہویدا ہے۔ ان اوصاف کی تفسیر الفاظ کے بجائے جون نے عملاً بھی کی اور خوب کی کہ جون کی لغت میں افراط تو ہے تفریط نہیں ہے۔ جون نے دوستوں پر تن من دھن وار ابل کہ بسا اوقات زندگی کا بہترین لمحہ بھی وار دیا کہ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے کچھ بچا کے نہ رکھا اور اس صورتِ حال کا خمیازہ خود بھی بھگتا۔ اس معاملے میں اپنے اجداد کی تاسّی کی، میں جون کا دوست ہوں جون کا نوحہ گر نہیں ہوں مگر اپنے پایانِ عمر میں جون جس صورتِ حال سے دوچار ہے اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ جون کے اردگرد احباب کا جو حلقہ بنا تھا اس سے کچھ بھی جون نہ بچا سکے۔ جون کو مادرانہ شفقت جو طبعی ہوتی ہے اگر ہجرت کے بعد میسر آجاتی تو غالبًا نہ خاندان بکھرتا اور نہ

عائلی زندگی کے المیے کے نتیجے میں غیر منضبط اور غیر مربوط زندگی کے صدمے سہنا پڑتے۔ جون کی غیر متوازن زندگی میں ان گنت چھوٹے چھوٹے خلا اسی اساسی خلا سے جنم لیتے رہے۔ جون کی غیر متوازن زندگی میں ان کی غیر معمولی نرگسیت اور انا کو بھی دخل ہے جسے غیر متوازن اور بر خود غلط اور ناشائستہ احباب نے ہوا دی۔ محمد علی صدیقی، حسن عابد، راحت سعید اور بزرگانہ شفقت میں پروفیسر کرار حسین کے علاوہ بھائی رئیس، بھائی تقی کی رہبری جب تک جون کو حاصل رہی جون کسی قدر متوازن چال چلتے رہے مگر جوں ہی یہ شیرازہ بکھرنا شروع ہوا اور ناپسندیدہ حلقۂ احباب نے اس خلا کو پُر کرنا شروع کیا، جون ہتھے سے اکھڑنے لگے۔ بچپن کے ساتھی قمر رضی اور عزیزانِ قریب جون سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے اور حتی الامکان ان کی دل جوئی اور تسکینِ نخوت اور دل بستگی کا سامان فراہم کرتے تھے مگر اس کے باوجود ناپسندیدہ احباب گروہ اپنے ڈھرے پر لگا کر بہ دستور استحصال کرتا رہتا تھا، جس کا قلق ہم سب کو رہا۔ یہی وہ المیہ ہے جو اکثر ہمارے ناہموار معاشرے کے شعرا اور دانش وروں کو درپیش رہا۔ من جملہ جون جیسا نابغہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں لُٹ گیا۔ جون کو جو غیر طبعی اور غیر متوازن 'چھریرا' چھٹا نک سا جسم ملا تھا اس میں غیر معمولی ذہن کی امانت سے غیر معمولی شاعری، ایک بڑی شاعری میں ڈھلنے کی توقع کی جا رہی تھی، جون کی شخصیت اور شاعری منفرد بھی تھی، کسی قدر غیر معمولی بھی تھی مگر بڑی حد تک غیر معمولی اور عظیم بننے کے مراحل میں داخل ہو رہی تھی۔ جون کا لہجہ جون کی شاعری میں اسلوبِ بیان شروع سے آخر تک تر و تازہ، شگفتہ، دل نشین تھا کہ متخیلہ جس دلکشی میں ظاہر ہوتی تھی، معنوی لحاظ سے اذہان میں گھر کر لیتی تھی۔ معرب، مفرس اور مہند الفاظ کی معنوی جہات سے جون جس طرح کام لیتے تھے وہ ہمیشہ سے اچھوتا اور نرالا تھا۔ جون لفظ کو پارس بنا دیتے تھے مگر الفاظ کے لیے معانی اور مفاہیم کو اذہان تک پہنچانے کے لیے انتخاب کرتے تھے۔ اس ضمن میں وہ غالبؔ کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے مگر غالبؔ کے خوشہ چین نہیں تھے، ہم سفر تھے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

خود غالب نے فارسی گویان کا تتبع نہیں کیا تھا بلکہ ان کے مضامین سے آگے زمین فکر کی جولانیاں دکھائی تھیں۔ جون نے مشرق اور مغرب کے علما سے بغیر کسی تعصب کے ذہنی رابطہ قائم رکھا مگر مرعوب کسی سے نہیں ہوئے۔ اپنے ان افکار و نظریات کے تعین میں صریحہ فکر سے کام لیا۔ معیشت کے سرمایہ دارانہ اور استعماری نظام سے اجداد کی طرح متنفر رہے اور سوشلسٹ نظام اور کمیونزم سے ذہنی ہم آہنگی قائم رہی۔ آمریت اور ملوکیت کو استعماریت اور سامراجیت قرار دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور نثری مجموعے دونوں ان کی فکری پریشاں خیالی سے مبرا ہیں۔ اگر جون کے ذہنی اور فکری ارتقا کا مرحلہ وار جائزہ لیا جائے تو نتیجہ واضح اور شفاف ہے۔ تاریخی، معاشرتی، عمرانی محرکات اور عوامل کی پرچھائیاں اس ارتقا کے راستے میں ضرور پڑتی رہیں لیکن ارتقا کا یہ عمل رکا نہیں۔ معمولات کی نجی زندگی میں اس نے رخنہ اندازی ضرور کی جو فطری تھی۔ فکری ارتقا میں مشرقی اور مغربی نظریہ سازوں سے مرعوب ہوئے بغیر کہیں کہیں جزوی طور پر وہ مصافحہ کرتے ضرور نظر آتے ہیں لیکن اس سے بہتر اور افضل استدلال مل جائے تو اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ اس مختصر سے مضمون نما شذرے میں تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے ورنہ اشاروں کے بجائے تفصیل سے کام لیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے۔

گزشتہ ۸ نومبر سے ۱۵ نومبر کے ہفتے میں میرے تین عدد یاران عزیز مجھ سے بچھڑ گئے جن کا بدل اور متبادل ممکن نہیں (میری رفیقہ حیات، دوسرے جون اور تیسرے شاہد نقوی) جون سے لاہور، کراچی اور دہلی میں پے بہ پے یادگار ملاقاتیں ہوتی رہیں، ٹوٹ کر ملتے اور اپنے ذہن کی اس سطح سے بات شروع کرتے جو ان کی متخیلہ میں کوئی صورت گری اختیار کرتی ہوتی۔ جون ایلیا کی نظم و نثر اور شعر دراصل ان کا نفس ناطقہ تھا جو سوتے جاگتے شعر میں ڈھل کر ان کی ذہنی کیفیت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ یو کے، امریکا اور کینیڈا کے مشاعروں میں جون جن دوستوں کے ہم راہ رہے ان میں شہزاد احمد نے ان کے ماکولات اور مشروبات پر روشنی ڈالی کہ جون کی معصومیت اور شرافت نفس پر رطب اللسان رہے کہ بالعموم کم ظرف اور بے نفس اول فول بکنے لگتے ہیں کہ ان کی فوق الانا (Super Ego) کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ شہزاد خود بھی نفسیات کے ماہر ہیں اور ان کا تجزیہ جون کی

خوش نفسی اور شرافت اور معصومیت کی تصدیق پر بہترین دلیل فراہم کرتا ہے۔ جون ایک بار میرے غریب خانے پر مہمان رہے۔ میری اہلیہ مرحومہ طہارت اور پاکیزگی میں ہی نہیں صوم وصلوٰۃ میں بھی ان کا بس چلتا تو ہمہ وقت مصلے پر بیٹھی اور اللہ میاں سے رجوع رہتیں (میں مخلی بالطبع ہو کر کہتا بی بی کبھی میاں سے بھی رجوع ہو جایا کرو اللہ میاں سے کب تک رجوع رہوگی تو جھڑک کر فرماتیں، جاؤ شیطان کا کام نہ کرو)۔ ہمارے یار رجائی جون کی دواؤں کی اشیا اور مظروف جگہ جگہ بکھرے پڑے رہتے تھے۔ اہلیہ ناک بھوں چڑھاتی رہتی تھیں مگر منھ سے بھاپ نہیں نکالتی تھیں۔ بچوں سے جون کہتے۔ 'بیٹے یہ میری دوائیں ہیں' بچے بہ خوبی جون کی عادات و اطوار کی معرفت رکھتے کہ چچا جون کو کون کون سے امراض لاحق ہیں۔ بالآخر جون نے واپسی کا اعلان کیا جس کا مجھے برسوں اس لیے افسوس رہا کہ غالباً جون نے یہ سمجھا ہوگا کہ طاقت مہماں نداشت خانہ بہ مہماں گذاشت اور جون کو مجبوراً سفر کرنا پڑا۔ جون کا اعتماد جو مجھ پر برسوں سے قائم تھا مجروح ہوا ہوگا۔ جون نے میرے اس تاثر کو ہوا نہیں دی اور اپنے حسنِ ظن سے میری بدظنی کو پنپنے نہ دیا۔ اعلیٰ اخلاقیات اور فطرتِ صالح کا یہ بھی ایک ثبوت ہے جو جون کی طینت اور تربیت وتہذیبِ نفسی کے ذیل میں آتا ہے۔ مجھے جون کی ہمہ وقت کی گفت گو، شعر گوئی اور نثر نگاری بہ ہمہ وجوہ اور بہ ہمہ جہات ایک مقام اور جگہ سے محسوس ہوتی تھیں۔ ان کا مخرج اور معدن جون کا بیدار ذہن تھا جو ہمہ وقت جاگتا رہتا تھا اور جون ایک ایسی شخصیت کے حامل تھے جن کے شعور، لاشعور، تحت الشعور، قبل شعور اور ماقبل شعور میں کوئی کمی اور پیچ نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ جون کا ہر شعر بھی صادق القول تھا اور گفت گو کا ہر ہر حرف بھی ایک نقش گر ہوتا تھا۔

اگر جون ایلیا بیسویں اور انیسویں صدی سے قبل کے دور میں نزول فرماتے تو کیا تعجب کہ حلقۂ یاراں میں ولی اللہ قرار پاتے کہ زمانہ شناس تو تھے مردم شناس عمداً نہ بن سکے اور جان بوجھ کر قدم قدم پر دھوکے اور فریب کھاتے رہے۔ ذہن سے سوچتے اور دل کے کہنے پر چلتے۔ نظم گوئی میں جون نے اپنی درونی کیفیتوں کا جس طرح محاکمہ کیا ہے شعر کی زبان میں ان کی تحلیلِ نفسی بن جاتی ہیں اور تشبیہ واستعارے کی ندرت سے مالا مال ہوتی ہیں۔ بعض اوقات پیش پا افتادہ مگر متحرک اور نمو پذیر اشیا سے تشبیہ واستعارے کا کام لیتے ہیں،

تلمیحات بھی کم ہوتی ہیں، نایاب نہیں۔ نظموں میں شاید، ادھر تو اے دروغ، شرم تجھ پر دوسری نظموں کا مخرج اور معدن وہی ذہن رسا ہے جو ہمہ وقت بیدار رہتا ہے۔ جونؔ ایلیا کی غزل کا ہر شعر بجائے خود اس قدر جامع ہوتا ہے کہ ہر رخ سے نئی معنوی جہت سے آشنا کرتا ہے، کیا نوحہ ہے۔

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کرلیا اور ملال بھی نہیں

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

نہیں دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دُنیا کی پروا کیوں کریں ہم
یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

یوں تو حسرتؔ، جگرؔ اور فیضؔ نے غزل کی صنف میں اپنا اپنا منفرد لب و لہجہ دریافت کیا بل کہ اختراع کیا اور اس پر کاربند رہے مگر جونؔ نے لہجہ ہی نہیں لسانی تشکیل سے اپنا لہجہ تراشا اور اس پر کمالِ فن کا ثبوت بھی دیا۔ ان چار مصرعوں میں متذکرہ اوصاف کے ساتھ یہ تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔

جو رعنائی نگاہوں کے لیے فردوسِ جلوہ ہے
لباسِ مفلسی میں کتنی بے قیمت نظر آتی
یہاں تو جاذبیت بھی ہے دولت ہی کی پروردہ
یہ لڑکی فاقہ کش ہوتی تو بدصورت نظر آتی

آدمی کا وکیل

ابوبکر

فریڈرک نطشے نے خبردار کیا تھا کہ عفریت کا مقابلہ کرتے ہوئے ہوشیار رہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم خود بھی عفریت میں بدل جاؤ۔

چناں چہ اب وہ دَور گزرا کہ جون ایلیا سے پسندیدگی کا اظہار آپ کے منفرد ادبی ذوق اور مخصوص طرزِ وجود کا آئینہ دار ٹھیرتا اور آپ کو یہ طعنہ سننا پڑتا کہ درحقیقت آپ باقیوں سے الگ دکھنے کی خواہش میں جون کو پڑھتے ہیں۔

اب تو حال یہ ہے کہ جون ایلیا کی مخالفت بل کہ بیش تر اوقات مذمت کر کے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ جون ایلیا دراصل معمولی سے بھی کم تر شاعر تھا جس کے ہاں ایک بھی بڑا شعر نہیں ہے نیز یہ کہ جون سے پسندیدگی دراصل ایک خاص ادبی مفہوم میں نابالغ ذہن رکھنے کی علامت ہے۔

قبل ازیں سمجھا جاتا تھا کہ نئی نسل کے سوشل میڈیائی لونڈے جنھیں اُردو شعر و ادب سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ ہی انھیں کسی اور شاعر کو پڑھنے کا موقع ملا ہے اپنی کم علمی اور سطحیت پسندی کے سبب جون ایلیا کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اسے مشہور کر رہے ہیں۔ چناں چہ بتایا جاتا تھا کہ اُردو شعر و ادب کی روایت سے آشنا اور سلجھے ہوئے نفیس الطبع قارئین تو جون ایلیا کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ لیکن اب کوئی دن نہیں گزرتا کہ کہیں کوئی معروف نقاد، کوئی ممتاز شاعر یا کوئی نابغۂ عصر اُٹھتا ہے اور جون ایلیا کے فکر و فن کا خوردبینی جائزہ لینے لگتا ہے۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ اکثر ایسے حضرات جب جون ایلیا پر اظہارِ خیال

کرتے ہوئے لاشعوری طور پر اپنے اخلاقی و مذہبی تعصبات سے باہر نہیں نکل پاتے جس کا نتیجہ غیر معروضی تنقید اور دور از کار قسم کے اعتراضات کی صورت نکلتا ہے۔ چناں چہ کسی کو شکایت ہے کہ جون خدا سے کشتی لڑنا چاہتا تھا مگر اتنا بد ذوق تھا کہ چنے کی بجائے کچھا پہن کر چلا تھا تو کسی کا اعتراض یہ ہے کہ جون معمولی سے بھی کم تر شاعر تھا جو فارمولا غزل اور سہلِ ممتنع میں لفظی چھیڑ چھاڑ سے زیادہ کی سکت نہ رکھتا تھا۔ ادھر آیئے ہم آپ کو ارفع شاعری دکھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

الغرض جون ایلیا پر ہر طرف سے آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ ان میں سنجیدہ اور تجزیاتی بیان کم ہیں اور طعنہ و دشنام سے لبریز چیخیں زیادہ۔ یہی لوگ کہتے تھے کہ جون ایلیا جذباتی لونڈوں کی اشتہاری مہم ہے اور اب یہی حضرات جگہ جگہ جون مخالف جذباتی اشتہار بنے پھرتے ہیں۔ جون وہ عفریت نکلا جس سے یہ سب بھی نہ بچ پائے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انفارمیشن کلچر بدلنے اور آن لائن سوشل پلیٹ فارمز کے جدید ہو جانے کے بعد عامتہ الناس اور ادب کا رشتہ بھی بدلا ہے۔ سیاست و معاشرت، مذہب، فلسفہ نیز تصوف اور سائنس سمیت ان گنت موضوعات پر مباحث اور علمی سرگرمیاں عوامی سطح تک پہنچنے لگی ہیں اور ان کا دائرہ کار بھی گلوبل ہو گیا ہے۔ چناں چہ جدید نسل کا ایک بڑا طبقہ فکری موضوعات اور نظری مباحث کی طرف از سرِ نو مائل ہوا ہے۔ اس طبقے کی نوجوان اکثریت نے خوش کن حیرت کے ساتھ جون ایلیا کو ایسے شاعر کے طور پر دریافت کیا جس کے ہاں ان متنوع موضوعات کو عالمانہ مہارت اور شاعرانہ کمال کے ساتھ شعر میں برتا گیا ہے۔ وہ شاعری جو فلسفہ و نفسیات، تہذیب و تاریخ، اور تصوف و مذہب سمیت فکرِ انسانی کے مرکزی دھاروں کو جدید فرد کے حسی تناظر سے اپنا موضوع بناتی ہے اور ان علوم و فنون سے جا بہ جا علامات، مسائل اور سوالات اخذ کرتی ہے۔ جدید اُردو شاعری میں یہ علمی رویہ بہ وجوہ متروک ہوتا جا رہا ہے جس کے کئی اسباب ہیں۔ یہ اسلوب ہمیں اقبال، جوش اور راشد کے ہاں ملتا ہے۔ ترقی پسند روایت میں یہ رویہ موجود تو تھا تاہم اپنے سیاسی اہداف سے مشروط تھا اور شاید اسی سبب اقبال و راشد سا تخلیقی بھی نہ تھا۔ جون ایلیا کے شعری تجربے میں یہ علمی رویہ آزاد رو اور طبع زاد تخلیقی برتاؤ کی صورت ملتا ہے جو اپنی شورانگیزی اور

پہلو میں اقبال اور راشد سے مماثل ہے جب کہ دوسری طرف اپنے جدید ترحسّی وانفرادی تناظر کے سبب پوسٹ ماڈرن بھی ہے۔ حالیہ شعرا میں تو یہ علمی اسلوب اور مسائل و موضوعات یک سر غائب ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو جدید نسل کے لیے ان موضوعات کے اُردو شاعری میں متبادلات ہی بہت کم ہیں یوں جون ایلیا کی پذیرائی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ جون نے اُردو شاعری کے روایتی اسلوب کی چاشنی برقرار رکھتے ہوئے اسی عالمانہ اسلوب میں جدید نسل کو اس کی پیچیدہ تر صورت حال سمیت اپنا موضوع بنایا ہے۔ دوسری طرف انفارمیشن کے ان جدید ذرائع کی وجہ سے اختصار پسندی اور راست ابلاغ کا رجحان بھی بڑھا ہے۔ غیر ضروری بھرتی کے بغیر حاصلِ مدعا کو موزوں ترین اور کم از کم الفاظ میں ادا کرنا جدید طرزِ اظہار کی اہم شرط بن گئی ہے۔ اسی وجہ سے نثر میں مائیکروفکشن کی مقبولیت بڑھی ہے۔ فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو اظہار کا یہ جدید ماحول غزل کے لیے نہایت موزوں ہے۔ جس کا ہر شعر ایک منفرد اکائی ہے اور کسی بھی موضوع پر ایک مکمل بیان بھی۔ اُردو غزل کی روایت اور اس کی کلاسیکی شعری جمالیات کی رو سے غزل کا شعر لطیف اور ایک سے زیادہ معنوی پرتوں پر محیط ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے روایتی طور پر غزل کے اشعار اور ان کے موضوعات بھی نازک خیالی پر مبنی ہوتے ہیں۔ جدید اُردو شاعری میں انھی وجوہات کے سبب غزل کی طرف رجحان کم ہوتا گیا اور نظم کے تجربات بڑھتے گئے تا کہ موضوعات کی جدّت اور تنوع کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان سے حقیقی اور براہِ راست تعلق پیدا کیا جا سکے تا کہ راست ابلاغ ممکن ہو سکے لیکن نظم میں ان گونا گوں تجربات کا ایک ضمنی نقصان یہ ہوا کہ قاری تک معنی کی ترسیل اور ابلاغ کے پیمانے بھی بدل گئے یہاں تک کہ بعض اوقات قاری کے لیے یہ جدید نظمیں سمجھنا بالکل ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ گویا نظم نے ابہام کی طرف واپسی اختیار کی ہے۔ جون ایلیا کی ایک انفرادیت ان کی غزل پسندی ہے۔ جون نے نظم کے دَور میں بھی غزل سے روایتی لگاؤ برقرار رکھا لیکن جون کی غزل اپنے موضوعات اور طرزِ احساس میں محض روایتی نہیں ہے۔ جون نے غزل کو علمی مسائل پر آرا دینے، سماجی حقائق پر طنز کرنے نیز بوقلموں باطنی و نفسی مظاہر کے بیان کے لیے جدید انداز میں استعمال کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ رومان اور دیگر روایتی احساسات کو بھی ترک نہیں

کیا۔ جون نے اس عہد میں ان موضوعات کو دوبارہ زندہ کیا جب اُردو شاعری اپنے لیے کئی
عظیم سماجی واخلاقی نصب العین طے کر کے سرپٹ دوڑے جا رہی تھی۔ جون کے نزدیک
ان روایتی موضوعات کے احیا کا اصل مقصد بھی یہ تھا کہ مہابیانیوں اور نام نہاد عظیم
موضوعات کے مدِ مقابل فرد کے نہایت حقیقی محسوسات کو زندہ کیا جائے جنھیں اس دَور میں
ثانوی و غیر ضروری سمجھا جانے لگا تھا۔ زبان پر مہارت اور شاعرانہ قادرالکلامی کے سبب
جون ایلیا کے ہاں بھرتی اور غیر ضروری بناوٹ بھی نہیں ہے۔ الغرض جدید طرزِ اظہار کی رو
سے غزل کی اس صورت کو ازسرِ نو مقبولیت حاصل ہوئی ہے جس کے اشعار میں ایہام کی
بجائے واضح بیان ہو، موضوعات نہایت حقیقی اور متنوع ہوں نیز طرزِ احساس بھی جدید ہو
لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ شعری لطف بھی متاثر نہ ہو۔ غزل کے اشعار دراصل سمندر کی
لہروں کی طرح ہوتے ہیں۔ ہر لہر ایک الگ اکائی ہے مگر ایک ہی سمندر سے اُبھرتی اور پھر
اسی میں ضم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح غزل کے اشعار اپنی انفرادی ہیئت میں منفرد اکائی تو
ہوتے ہیں تاہم پوری غزل کے پسِ پردہ ایک واحد لیکن مسلسل طرزِ احساس رواں رہتا
ہے۔ یہی انفرادیت شاعر کے ڈکشن کا اہم حصہ ہوتی ہے۔ جون کی غزل میں یہ ڈکشن جدید
بل کہ مابعد جدید ہے اور جون کی شعری عظمت کا ایک پہلو یہی ہے کہ اس نے غزل کی
روایتی شعریت اور ملائمت کے تقاضوں کو جدید طرزِ اظہار کی کھردری اور سنگین کلیرٹی اور
واضح بیانی کی شرائط کے ساتھ ساتھ برقرار رکھا ہے۔ عہدِ حاضر میں اُردو شاعری کا روایتی
طرزِ اظہار بھرتی اور تکرار کا سبب بن کر رہ گیا ہے۔ ایک تو وہ روایتی اندازِ زندگی باقی نہیں رہا
جس کی وجہ سے شاعری کے روایتی موضوعات جن میں رومانس اور تصوف سرِ فہرست ہیں
محض بوجھل جگالی بن کر رہ گئے ہیں اور دوسری طرف جدید مسائل سے نظرپوشی نے ایسی
شاعری میں عام دل چسپی کا پہلو مفقود کر دیا ہے۔ قاری کی دل چسپی واپس حاصل کرنے
کے لیے معاصر شعرا دقتِ نظری اور ریاضت کے بجائے پاپولر شاعری اور بازاری اسلوب
اپناتے چلے گئے اور دراصل شاعری کی قیمت پر شاعر بنے رہے۔ جون ایلیا کو یہی بات ان
شعرا سے ممتاز کرتی ہے کہ وہ عام انسانی واقعات اور احساسات کو پاپولر اور سطحی نظر سے نہیں
دیکھتا بل کہ ان کا جائزہ بھی فرد کے وجودی سانچے میں رکھ کے کرتا ہے۔ چناں چہ جون کی

شاعری نے اس تناظر میں قدرتی طور پر وہ پذیرائی اور مقام حاصل کرلیا ہے جو ان عناصر سے محروم شعرا کوششوں کے باوجود نہ کر پائے۔

مندرجہ بالا سطور کا مقصد جدید انفارمیشن عہد اور اس کے تشکیل کردہ تصورِ انسان اور اس کے طرزِ اظہار کے تناظر میں جون ایلیا کی مقبولیت اور مناسبت کا جائزہ لینا تھا کیوں کہ جون کے قائلین اور مخالفین ہر دو کے نزدیک جون ایلیا کی شہرت میں ان جدید اسباب کا اہم کردار رہا ہے۔ تاہم ہمارے روایتی نقاد ایسے تجزیہ جات میں اس لیے بھی نہیں پڑتے کیوں کہ اس ضمن میں سماجی احوال اور عہدِ حاضر کے بنتے مٹتے وجودی تشکیلات کا باریکی سے جائزہ لینا پڑتا ہے۔ لیکن ایسے تجزیے بعض اوقات ناگزیر ہوتے ہیں اور جون ایلیا کے ادبی مقام پر مباحث میں لامحالہ ہمیں ایسے پہلوؤں کا سامنا رہے گا۔

جون ایلیا کی شاعری اپنی فرد پسندی اور باطنی حقیقت پسندی کے سبب نسلِ حاضر کی ترجمان ہے۔ وہ اس عہد کے اقداری بحران، اس کی سماجی شکست و ریخت، کئی صدیوں کے تاریخی تنزل سے پیدا ہوتے تہذیبی احساسِ لاچارگی، رشتوں میں گھرے فرد کی تنہائی، اس کے باطنی احساسات اور نفسی مظاہر کی بوقلمونی، فرد اور انبوہ کے ٹکراؤ میں فرد کی طرف داری، خدا اور انسان کی جنگ میں آدمی کی دیدہ دلیری سے وکالت اور تمام اتھارٹی کے رُو بہ رُو شاعرانہ اور قلندرانہ جرأت کی شاعری ہے۔ سوویت یونین کے خاتمے اور ترقی پسندی کے عالمی بلاک کے انہدام کے بعد ورلڈ آرڈر کی تبدیلی نے تیسری دنیا کے معاشروں کو بھی گہرائی سے متاثر کیا ہے۔ پاکستان میں اس تبدیلی کا اثر بہت دُور رس سطح پر ہوا کیوں کہ افغان جنگ میں طویل مدت تک ایک فریق کے رہنے کے سبب یہاں کا معاشرہ ان عالمی واقعات سے براہِ راست جڑا ہوا تھا۔ مذہبیت اور شدّت پسندی کا فروغ، لاقانونیت میں ہوش رُبا اضافہ، انفرااسٹرکچر کی تبدیلیاں اور دیہی آبادی کی بڑے پیمانے پر شہروں کو ہجرت، روایتی کلچر کے سالم سانچوں کی شکست و ریخت، آزادیِ اظہار و احساس پر پابندیاں، مفاد پرستی کی سیاست اور اس سے جنم لیتا منافق طرزِ زندگی اور ان سب کے نتیج فرد کی خود پسند تنہائی اور زمینی و تاریخی جدوجہد کا وہ سفر جو فرد کا طرزِ احساس تک بدل دیتا ہے۔ جون اسی فرد کا شاعر ہونے کے ناتے بکھرے ہوئے افراد کی اس نسل کا نمائندہ شاعر

بن جاتا ہے۔ وہ نسل جس کے پاس نہ الہامی نجات کا یقین سلامت بچا ہے اور نہ سماجی بہتری کا کوئی خواب باقی ہے۔ وہ نسل جو اپنے آپ کو مکمل اندھیرے میں پاتی ہے۔ مہابیانیوں کے انہدام کے سماجی ملبے میں جنم لینے والی اس پوسٹ ماڈرن اور گم کردۂ معنی نسل نے جون ایلیا کے کلام میں اپنا اظہار پایا ہے۔ اس مابعد جدید اظہار کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ یہ پوری طرح 'روایت آشنا' بھی ہے۔ اقبال کے عرفانی مفہوم سے قطعِ نظر ایک دوسرے رُخ سے دیکھا جائے تو جون ایلیا 'کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادارک' کی تصویر ہے۔

جون ایلیا پر ایک تعزیتی نظم 'ایلیا کو کون جانتا ہے' میں انور سن رائے نے کہا تھا کہ

'زود بسیار نویس، جون ایلیا کے لیے
خود انہدامی پر یقین رکھنے والے انارکسٹ جون ایلیا کے لیے
اب تعزیتی جلسے ہوں گے'

کیا عجب ہے کہ جون ایلیا صرف اتنا نہیں تھا۔ اس کی مثال تو اس وبا سی ہے جو اپنے گرد و پیش کو بھی مرض و موت سے دو چار کرتی ہے۔ وہ ایسی میت ہے جو اپنے نوحہ گروں کو بد دعائیں دیتی ہے۔ جون ایلیا بہ طور شخص ایک استثنائی صورتِ حال ہے جسے صرف شاعرانہ کمال کے اتفاق کی صورت برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم میں سے ہر تیسرا شخص جون ایلیا بن جائے تو چوتھے دن ہی قیامت آ جائے، نظامِ دنیا پامال ہو جائے۔

جون ایلیا نے زندگی کو ابتدائی صورت میں ہندوستان کے ثقافتی مرکز لکھنؤ اور امروہہ میں دیکھا۔ ان کا خاندان عالمانہ پس منظر رکھنے کے باعث ایک مخصوص تہذیبی شعور اور ذوق کا حامل تھا۔ تاہم جون کی پیدائش کے وقت یہ ثقافتی مراکز تیزی سے اپنے انجام کو پہنچ رہے تھے۔ اس سماجی ادھیڑ نے جون کو ایک مریضانہ ناسٹلجیا میں مبتلا کیا جس سے وہ عمر بھر آزاد نہ ہو سکے۔ ان کے بڑے بھائی تحریکِ پاکستان کے کارکن تھے۔ ایک اور بھائی کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ آزادی کے بعد یہ سب لوگ پاکستان ہجرت کر گئے لیکن جون اپنے والدین کے پاس امروہہ میں ہی مقیم رہے۔ ان کی طبیعت بھائیوں کی طرح محض تعمیری نہ تھی۔ وہ بغاوت اور انکار کی بھٹی میں جلتے ہوئے شاعر تھے جو ماضی کے

ملبے پر حساب سود وزیاں کرتا ہے۔ والدین کی وفات کے بعد جون نے کراچی ہجرت کی تو ایک اور مرض میں مبتلا ہو گئے۔ دیار بدری کا یہی مرض لاہور میں منٹو اور ناصر کاظمی کو بھی لاحق تھا۔ امروہہ کے ماحول نے جون کو جنم دیا تھا لہٰذا اس کو برداشت بھی کرتا تھا۔ پاکستان آ کر جون کو اپنا پس منظر تخلیق بھی کرنا تھا جو بہ وجوہ ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ جون کو ماحول نہ مل سکا اور وہ ایک تاریخی مذاق بن کر رہ گئے۔

جون پُر شور تضادات کا ایسا مجموعہ تھے جس کا کیفیتی اظہار صرف شاعری میں ممکن ہے۔ انھوں نے چُن چُن کر اپنے آپ میں وہ سب جمع کر لیا تھا جس کا بار شعر تو اُٹھا سکتا ہے لیکن زندگی نہیں اُٹھا سکتی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جون نے اپنی زندگی کا سودا کر کے شاعری خریدی۔ اس المیے کا انھیں خود بھی شعور تھا چناں چہ انھوں نے جتنے سانس لیے پردۂ سخن میں لیے۔ وہ جانتے تھے کہ شاعری کی پناہ سے نکل کر زندگی سے سامنا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ بہ طور شاعر اُن کے کلام میں زندگی کی ان گنت کیفیات اپنی پوری شدّت سے موجود ہیں لیکن بہ طور فرد اُن کی زندگی میں کوئی آہنگ موجود نہ تھا۔ وہ نسباً شیعہ تھے لیکن دیوبند سے منسلک ایک مدرسے میں پڑھے اور عمر بھر علمائے دیوبند کی وطن پرست سیاست کے گن گاتے رہے۔ مرتے دم تک ایک ایسی محبوبہ کی تلاش میں تھے جو اُن کے عشق میں خودکشی کر لے۔ جون اپنے معیارات میں بیمار شخص تھے بل کہ یوں کہا جائے کہ انھوں نے بیماری کو ایک معیار کی صورت پیش کیا۔ اس معیار کو شعر میں پوری شدّت سے بیان کرنے کا فن انھوں نے خدائے سخن میر تقی میر سے سیکھا تھا جو اُردو ادب میں اس مریضانہ خود پسندی کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ اپنے عہد کی ترقی پسندوں کے عمومی چلن کے برعکس جون نے ادب میں روایت پسندی اختیار کی اور غزل کو اپنے ذاتی معیار کی حیثیت پر از سرِ نو ایجاد کیا۔ پرانے موضوعات کی صورت بدلی اور نئی کیفیات کا راستہ نکالا۔ تاہم یہاں بھی ان کی نفی پسندی غالب رہی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جا بہ جا اعتراف کیا کہ وہ بڑے نہیں ہو سکے اور رائگاں گزر گئے۔ وہ ایک بچہ تھے جو اپنی روایت میں منجمد ہو گیا تھا۔ ان کی رائگانی بھی اس روایت کے شکست کا شخصی اظہار تھی۔ جون وہ بچہ تھا جو پُرنیت انہماک سے اپنے شکستہ گھر کی بنیادوں میں بارود بھرتا رہا۔ وہ اس گھر کو تو اتا دیکھنا چاہتا تھا جب سب

کچھ ملیامیٹ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

وہ اعلانیہ ملحد اور نہلسٹ ہونے کے باوجود مذہب کے ساتھ ایک تہذیبی رشتہ رکھتے تھے۔ان کا الحاد بھی محض الحاد نہیں بل کہ جون ایلیا کا الحاد تھا۔طبعاً پیکار طلب تھے لہٰذا ایک مخصوص کائناتی منظر کے اندر ہی زندہ رہنا چاہتے تھے تاکہ ہر لمحہ کسی سے گتھم گتھا رہیں۔ وہ خدا کے قائل نہ تھے لیکن اسے چھوڑ بھی نہ سکتے تھے۔وہ سینے میں بغض پالنے، رنج رکھنے اور شکوہ کرنے کے خوگر تھے۔وہ خدا کو اتنی آسانی سے نفی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ایسا ہو جاتا تو ان کو کوسنے کے لیے صرف انسان باقی بچتے۔ جون ایلیا انسان پسند بھی نہ تھے بل کہ نطشے کی طرح انسان سے مغائرت رکھتے تھے۔شاید اسی وجہ سے وہ تمدن کے جبر کے منکر تھے۔ لکھنوی فضا میں سانس لیتے جون ایلیا کو فرد کے مقابل تہذیب اور تاریخ سے نفرت تھی۔وہ اسے بے کار کا کھیل سمجھتے تھے لیکن اس کھیل میں بھی بہ طور کھلاڑی ایک منفرد مقام چاہتے تھے۔وہ سرتاپا مجموعۂ اضداد تھے لیکن اس جہت سے انسان کے فطری روپ وہ اظہار تھے جو اپنی حقیقت کے خام ہونے کا شعور رکھتا ہے۔انھوں نے اس فطری خامی پر مذہب، تمدن، روحانیت اور جاہ طلبی کا میک اپ نہ کیا بل کہ 'جیسا ہے جہاں ہے' کی بنیاد پر پیش کیا۔ وہ نہایت معیار پسند تھے لیکن اس بات کو جان گئے تھے کہ معیار وجود نہیں رکھتے۔ وہ تصور کو بے مایہ اور حقیقت کو لاچار تسلیم کرتے تھے۔ شاعری کے اس شخصی تناظر میں انھوں نے حسّی تجربیت سے کام لیا اور نفسِ انسانی کی عمیق کیفیات کو متصادم صورت حال میں ہی پیش کیا۔

جون ایلیا کی بیش تر شاعری خود جون ایلیا کے گرد گھومتی ہے۔کسی بھی شائستہ کلام کی طرح اس شاعری میں بھی انسان کا جو تصور ہے وہ دراصل شاعر خود آپ ہے۔جون ایلیا کے ضمن میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ اس نے جس طرح اپنے آپ کو دیکھا اور محسوس کیا اسی طرح بیان کر دیا۔اس نے کسی نام نہاد اخلاقی و مذہبی تاویل کی آڑ لے کر خود سے چھپنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اس انسان کے محسوسات ہیں جو خود کو اپنی تمام حشر سامانیوں سمیت قبول کر چکا ہے۔ ہمارا شاعر یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے جو ہر آن کسی تازہ حالت میں ہے۔شاعر خود آشنائی کے اس پُر ملال مقام تک پہنچ چکا ہے جہاں اسے نظر

آتا ہے کہ کچھ بھی سالم اور حتمی نہیں ہے۔یہاں تک کہ اس کی اپنی ذات بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ایک حصہ جس سے وہ واقف ہے اور دوسرا حصہ جو اس سے اجنبی ہے۔شاعر اپنی ذات کا یہ بنیادی تضاد اپنی زندگی کے ہر منظر میں دیکھتا ہے۔کبھی وہ خوش تو کبھی اُداس ہے اور کبھی کبھی تو وہ خوشی سے ملال اور اُداسی سے انبساط ڈھونڈنے لگتا ہے۔وہ ہر نیا وعدہ کرتے ہوئے یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسے ایفا کی عادت بھی نہیں ہے۔اپنے گھر سے شدید محبت رکھتے ہوئے بھی اس کا دل وہاں نہیں لگتا۔وہ خدا کا قائل نہیں ہے لیکن اکثر اسے یاد بھی کرنے لگتا ہے۔وہ جب کسی انسان سے متاثر ہوتا ہے تو اس سے دُور ہونے لگتا ہے۔وہ جس لڑکی سے اظہارِ محبت کرنا چاہتا ہے اس سے منہ پھیر کر گزرتا ہے۔ہمارا شاعر کسی بھی معاملے میں یک طرفہ نہیں ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ بھی غلط ہو سکتے ہیں۔ہمارا شاعر سچ اور جھوٹ سے آگے گزر کر اشیا تک پہنچنا چاہتا ہے اور انھیں ایسے دیکھنا چاہتا ہے جیسے وہ ہیں۔شاعر سمجھتا ہے کہ سچ اور جھوٹ دراصل ہماری توجہ حقیقت سے ہٹا دیتے ہیں۔شاعر بتاتا ہے کہ ہماری نظر کو تربیت کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ چیزوں کو اس صورت میں دکھاتی ہے جس صورت میں یہ خود انھیں دیکھنا چاہے۔ اس کے نزدیک نظر کی تربیت ہے کہ آنکھیں پھوڑ لی جائیں۔شاعر دل سے بھی مطمئن نہیں ہے۔وہ اسے جھوٹے گمانوں کا قیدی کہتا ہے۔شاعر اپنے کانوں سنے پر اعتبار بھی نہیں کرتا کیوں کہ کانوں کو وہی بھلا لگتا ہے جو یہ سننا چاہتے ہوں۔شاعر مشورہ دیتا ہے کہ ہمارے لیے بہترین آواز وہ ہے جو ہماری سماعتوں میں زہر گھول دے۔اپنی اسی حقیقت پسندی کے باعث ہمارا شاعر شدید اذیت پسند بھی ہے۔وہ جان چکا ہے کہ جہاں حقیقت کو دیکھنے کے لیے ہمیں اپنے آرام بخش تعصبات سے دُور جانا پڑتا ہے وہیں حقیقت جاننے کے بعد ہماری کوئی آسایش باقی نہیں رہتی۔کیوں؟ کیوں کہ حقیقت خود بھی نہایت تلخ ہے اور وہ اس لیے کیوں کہ وہ ہم سے بے نیاز ہے اور اسے ہماری خواہش اور جستجو کی کوئی پروا نہیں۔کوئی عام انسان اگر اس نتیجے تک پہنچے تو وہ بوکھلا جائے لیکن ہمارا شاعر جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کسی بھی معاملے میں یک طرفہ نہیں ہے اور دوسرے رُخ سے بھی آگے دیکھنا چاہتا ہے۔وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے تو خوش ہوتا ہے کیوں کہ یہ نتیجہ اس کی ذات کے بنیادی تضاد کو دُور کر دیتا ہے۔

اس کی ذات کا بنیادی تضاد یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں ہاں اور نہیں کے درمیان رہتا تھا۔ اب جب شاعر کو علم ہوا کہ حقیقت اس سے بے نیاز ہے تو وہ خود اپنی ذات کی دوئی کی تکلیف سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ سچا یا جھوٹا ہونے سے، وفادار اور بے وفا ہونے سے، مخلص یا کینہ پرور ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے کیوں کہ حقیقت ان سب سے ہوا ہے۔ اب شاعر کی روزمرہ عادت یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر تضاد کو پوری شدّت سے محسوس کرتے ہوئے یہ سوچتا رہتا ہے کہ کسی بھی حالت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شاعر 'بیڈ فیتھ' سے آگے گزر چکا ہے لیکن اسے کوئی نئی مصروفیت میسر نہیں آسکی۔

جون ایلیا انھی نسبتوں سے بحران کے اس عظیم دَور کا شاعر ہے، وہ بحران جو اس عہد کی شناخت بن کر رہ گیا ہے۔ شناخت کے بحران کا یہی سوال جون کی شاعری کا مرکزی موضوع بھی ہے اور یہی رشتہ حساس قاری کو جون کی طرف مائل کرتا ہے۔

جون ہی تو ہے جون کے در پے

اجمل صدیقی

یہ وہ شمع تھی جس کو معلوم تھا کہ لوگ اس کے بجھنے کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ جون ایلیا نے کبھی کوشش بھی نہیں کی سماج کی اس رسم کو نباہنے کی جس میں اپنے زخموں کو چھپایا جاتا ہے، ان کی سر عام نمائش نہیں کی جاتی۔ رویا تو بیچ محفل رو دیا، ماتم کیا تو قہقہوں کے شور میں ماتم کی صدا گونجی، خون تھوکا تو اس مہذب معاشرے کے سفید اُجلے کپڑوں پر تھوکا اور یہ سب اعلانیہ کیا۔

آج ہندوستان، پاکستان میں بہت بڑی تعداد ایسوں کی ہے جو جون کے شیدائی ہیں، اس کی شاعری کو کسی آسمانی صحیفے سے کم نہیں مانتے۔ اس کی تصویر، اس کے پوسٹر، اس کے طرزِ تکلم کی نقل، اس کی طرح بال بنانا، یہ مرتبہ شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوا ہو۔ یہ سب جون کے اسی انداز کا ثمرہ ہے اور جون کی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

جون کی شاعری اور اس کی زندگی میں تضاد نہیں تھا، یہی وہ چیز تھی جو اسے باقی شعرا سے ممتاز کرتی تھی۔

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

یہ شعر اور اس جیسے بہت سے اشعار اپنی کرافٹ، اپنی سادگی اور اپنے اثر کی وجہ سے تو نمایاں ہیں ہی لیکن اگر یہی اشعار جون کے بجائے کسی اور نے کہے ہوتے تو شاید کچھ

کم تاثیر رکھتے۔ سخن کی شمع کو جون کی زندگی کی شکل میں اظہار کا وہ آئینہ خانہ نصیب ہوا جس کی مثال دُور تک نظر نہیں آتی ۔ ہر شعر اُن کی زندگی اور زندگی کے کرب کا ایسا عکاس اور ترجمان بنا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی افسانے کے الگ الگ باب آپ کے سامنے پیش کیے جا رہے ہوں۔

'درختِ زرد' جیسی شاہ کار نظم کو بھی جب جون کی زندگی کے کونٹکسٹ میں پڑھا جاتا ہے تو قاری اس زہر آگیں قلم کی تیزی سے خود کو محفوظ نہیں رکھ پاتا۔ عالمی ادب، مذہب، فلسفہ، فارسی تہذیب و تمدن، نفسیات، عربی شاعری، ہندوستانی ثقافت اور تاریخ جیسے تمام علاقے اِس ایک نظم میں جمع ہونے کے باوجود اور جون کے علمی مرتبے کا مظہر ہونے کے باوجود، جب قاری یہ ملحوظ رکھ کر پڑھتا ہے کہ اک باپ جو اپنے بیٹے کے ساتھ اپنی زندگی نہیں گزار پایا وہ سوچ رہا ہے کہ اگر بیٹا اس کے ساتھ ہوتا تو کیسے وہ اس کے لیے لوری گاتا، کیا کیا باتیں بتاتا۔ اپنا علم، اپنی شناخت، اپنی وراثت کیسے سینہ دَر سینہ منتقل کرتا، کیسے اسے اپنی پیٹھ پہ بٹھاتا، اور کیسے اس کی تربیت کرتا۔ یہ تمام باتیں اس عالمانہ تحریر میں اک سوز جگا دیتی ہیں اور قاری اپنے جذبات پر قابو رکھنے سے قاصر رہتا ہے۔

وہی عالم جو زمانے بھر کا علم اپنے بیٹے تک پہنچانے کی حسرت لیے ہے، اچانک اک مجبور باپ بن جاتا ہے۔

تم اپنی مام کے بے حد مرادی منتوں والے
مرے کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں بالے
مگر پہلے کبھی تم سے مرا کچھ سلسلہ تو تھا
گماں میں میرے شاید اک کوئی غنچہ کھلا تو تھا
وہ میری جاودانہ بے دُوئی کا اک صلہ تو تھا
سو، اُس کو ایک 'ابو' نام کا گھوڑا ملا تو تھا

یہی نظم ہے جس میں کہیں جون لوری گا رہا ہے تو کہیں کہتا ہے۔

'لدوا للموت وابنوا للخراب' سن خراباتی

(یہ غالباً حدیث کا ٹکڑا ہے اور شاید نہج البلاغہ میں بھی ہے جسے بعد میں عربی کے

عظیم شاعر ابو عتاہیہ اور مولانا جامی نے بھی شعر میں نظم کیا ہے) کہیں کہتا ہے۔

الا یا ایھا الا بجد، ذرا یعنی ذرا ٹھیرو

There is an absurd I in absurdity shaayad

کہیں اپنے سوا، یعنی کہیں اپنے سوا ٹھیرو

تم اِس absurdity میں اک ردیف، اک قافیہ ٹھیرو

یعنی لفظ کی دنیا بے معنی ہے، ہر لفظ Absurd ہے، اِس Absurd دُنیا میں جہاں کسی چیز کے وجود کی کوئی وجہ نہیں، تم اک ردیف اور قافیے کی طرح ہو جاؤ جس کی کچھ اور غرض نہیں سوائے نغمگی کے اور حسن کے۔

وہ زبان و کلام کا آخری پیغمبر جو ابو عتاہیہ سے مراقبہ کرتا تھا، جو نیتشے اور کانٹ سے باتیں کرتا تھا، جس کی بکواس اک اقانیمی ہدایت تھی، جو سرِ طور تھا، جو ایسا کلیم تھا جس میں ہارون اور موسیٰ یک جا تھے، جو بدھ کو جانتا تھا، جو افلاطون کا یار تھا، جو فردوسی کا دوست بھی تھا اور اس کا نقاد بھی، جو شیکسپیئر کا محرم راز تھا، وہ اچانک بچہ سا بن کر آپ کے سامنے آجاتا ہے، اک ایسا بچہ جو اپنے بیٹے کی گود کو ترس رہا ہے۔

کہیں 'سفر کے وقت' نظم میں وہ اپنی یاد کے سفر میں اپنے قاری کو شاملِ حال کر لیتا ہے، کہیں وہ 'شاید' کے دیباچے میں اپنے باپ سے جب یہ کہتا ہے کہ 'بابا میں بڑا نہ ہوسکا' تو اس کا قاری بھی اس کے ساتھ اس احساسِ ندامت سے بھر جاتا ہے جو جون کی شخصیت کا اک اہم عنصر بنا۔

سماج کے پروردہ جھوٹ، فرضی شرم و حیا، نقلی تہذیب کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھنے والا وہ درویش جس نے کبھی کوئی لابی نہ بنائی، نہ کسی دھڑے میں شامل ہوا، آج خود ایک مذہب بن گیا ہے۔

اس کو سوال کے دائرے سے مستثنیٰ مانا جا رہا ہے جس نے ہر شے پر سوال اُٹھایا، جس نے ہر اسٹیبلشڈ یقین کو الگ زاویے سے دیکھنے کی ہمت کی، جو اہرمن کو ایسا با اصول بتاتا تھا کہ جو انکارِ سجدہ کے بعد بھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ نتیجہ کیا رہے گا، اپنے انکار پر ڈٹا رہا۔

جون ایک ہیرو بنا عوام میں وہیں نقصان یہ ہوا کہ جون کے چاہنے والوں نے جون کو ایک مذہب بنا لیا اور باقی سب کو رد کر دیا، جون کی ہر بات حرفِ آخر ہو گئی۔ ادیبوں اور ناقدوں کو شاید اس وجہ سے جون کھلنے لگا کہ جون پر تنقید کرنا ایسا سمجھا جانے لگا جیسے پاکستان میں بالشیمی۔

جون سے عشق کا تقاضا تو یہ تھا کہ جون پر تنقید کا جواب دلائل سے دیا جاتا کہ علم ہی تو جون کی وراثت تھا لیکن ہوا اس کے برعکس۔

جون نے خوب رعایتیں لیں لیکن جون کے بہت سے مداحوں کی نظر میں جون کی زبان اور جون کی شاعری ہر قسم کے عیب یا گنجائش تنقید سے ماورا ہے۔ کسی سے سن لیا کہ جون نے فلاں چیز کے بارے میں یہ فرمایا تھا تو بنا چوں چرا کے اسے تسلیم کر لیا۔ مجھے یاد ہے اک مرتبہ کسی نے کہا تھا کہ جون کا قول ہے 'محبت کی جمع محبتیں استعمال کرنا جائز نہیں'۔ اب ان صاحب کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ جون نے ایسا کیوں کہا، کس سلسلے میں کہا۔ انھیں بس ایک قاعدہ کلیہ مل گیا کہ کہیں بھی محبتیں لکھا دیکھیں گے تو فوراً بولیں گے کہ محبت گنی نہیں جا سکتی تو اس کی جمع بھی نہیں ہو سکتی۔

کاش غور کرنے کی صلاحیت ہوتی اور جون پرستی کا حق ادا کرتے جو غور و فکر ہے، تو پاتے کہ خود جون کا شعر ہے۔

داستاں ختم ہونے والی ہے
تم مری آخری محبت ہو

جون خود محبت کو آخری کہتا ہے تو ظاہر ہے کہ پہلی اور دوسری بھی رہی ہوگی، تو جمع کیوں نہیں آ سکتی؟

مزید غور کرتے کہ محبت، نفرت، غم، خوشی یہ تمام جذبے ہیں جن کی جمع واقعی نہیں آ سکتی لیکن کبھی کبھی ان الفاظ کا اطلاق ان جذبوں کے علاوہ بھی ہوتا ہے، ان کی ظاہری صورت یا ان کے سبب یا ان کی غرض کے لیے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً محبوبہ سے یہ کہنا کہ 'مجھے تم سے محبتیں ہیں' یہ غلط ہے لیکن یہ کہنا کہ 'میری تمام محبتوں میں تمھارا الگ مقام ہے' یہ درست ہے۔ کیوں کہ یہاں محبت سے مراد وہ جذبہ نہیں ہے بل کہ جس کے لیے دل میں محبت ہے وہ شخص مراد ہے۔ ایسے ہی یہ کہنا کہ 'ایک دن میں کتنی خوشیاں ملیں' صحیح ہے کہ

یہاں بھی خوشی اس جذبے کے لیے نہیں ہے بل کہ جو چیز خوشی کا سبب بنی اس کے لیے استعمال ہوا ہے۔

جون نے غلط العوام سے بھی پرہیز نہیں کیا، کہیں کہا 'اس ہندنی نے ایسی جفائیں کریں کہ بس' جب کہ 'کرنا' مصدر کے ماضی مطلق میں کاف کے بعد رے نہیں آ سکتی۔ کہیں ناکام یابیاں لفظ استعمال کیا جب کہ صحیح ناکامی ہے۔ پوئیٹک لبرٹی کوئی انوکھی چیز نہیں ہے، مسئلہ تب ہوتا ہے جب یا تو نہ جاننے والے اپنے ہر عیب کو پوئیٹک لبرٹی کی نقاب میں لپیٹنا چاہتے ہیں، یا پھر جون یا کسی اور شاعر کے پرستار یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ جون نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ فصیح نہیں ہے۔ یہاں یہ ہونا چاہیے کہ سمجھا جائے کہ ضرورتِ شعری کی بنا پر کتنی اور کیسی رعایات لی جا سکتی ہیں۔ جون ہی نہیں مومن جیسے استاد شاعر نے بھی ناکام یابی لفظ باندھا ہے اور دونوں نے قافیے میں باندھا ہے یعنی جہاں مجبوری تھی کہ ناکامی لایا ہی نہیں جا سکتا وہاں یہ لبرٹی لی۔

جون کا بہت سا کلام ایسا ہے جہاں جون کو اپنے قاری سے بہت اُمید ہے، وہ اپنے قاری کا فہم بہت بلند چاہتا ہے۔ وہ توقع کرتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے نے خوب مطالعہ کیا ہو لیکن افسوس اس کی شخصیت اور اس کی زندگی نے جہاں جون کو شہرت دی وہیں بہت سوں کو دُور بھی کر دیا۔

وہیں اک گروہ وہ ہے جو صرف بغض کی بنا پر جون کو رَد کر دیتا ہے، جو اس کو پڑھے بنا اور سمجھے بنا ہی اس کے متعلق رائے قائم کرتا ہے۔ کوئی دلائل کے ساتھ جون کو ریجیکٹ کرے تو کیا ہی اچھا ہو لیکن کوئی اس کے اشعار میں موجود فلسفے، فارسی اور عربی روایتوں کے حوالوں سے یک سر نا آشنا ہو اور پھر وہ بے شرمی سے جون کو رَد کرے تو کیا کیا جائے؟ کوئی جون کو دلائل سے رَد بھی کر دے تو یہ بھی جون کی جیت ہوگی کہ جون سراپا دلیل تھا، سراپا علم، یا ایک دھڑکتا دماغ۔ علم کی کوئی ذات نہیں ہوتی، جون کی ذات ہار بھی گئی تو جون کی وراثت جیتے گی۔

جون کی علمی صلاحیت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ کئی مذہبی علما، اِس چیز کی پروا کیے بغیر کہ لوگوں کے درمیان ان کے امیج پر کیا فرق پڑے گا، جب عوام یہ دیکھیں گے کہ

ہمارے مولانا ایک 'شرابی' اور 'دہریے' کی مجلس میں بیٹھتے ہیں، نہ صرف جون کی صحبت سے مستفیض ہوتے تھے بل کہ فخر بھی کرتے تھے۔ سلام ان پر کہ وہ علم کے طالب تھے جنھیں اس رند کی 'یاوہ گوئیاں' ہی وہ درس دے دیتی تھیں جو کہیں اور نہیں مل سکتا تھا۔

ہم جو باتیں جنوں میں بکتے ہیں
دیکھنا جاودانیاں ہوں گی

جون تو آج بھی اس متشکک قاری کی تلاش میں ہے جو اس کے ہر حرف پر اُنگلی اُٹھائے، جو جون پر سوال اُٹھائے، جون کو سمجھے، جون کی پوجا نہ کرے اور اگر پوجا کرے تو جون کے مذہب کے طریقے پر پوجا ہو۔ جہاں کسی کا بھی رَد ملکھنا روا ہو، کوئی ذات اختلاف اور تنقید سے ماورا نہ ہو۔ یہ ہے وہ مثالی قاری اور وہ مثالی معاشرہ جو ایسے قاری کی تربیت اور پرورش کرے، بہ قول جون 'آؤ کہ اختلافِ رائے پہ اتفاق کریں'۔

یہی کنجی ہے اس جون کے معاشرے کی، ورنہ وہ معاشرہ جو جون کی پرستش میں جونیت سے ہی منحرف ہے یا وہ قاری جو جون کے خلاف اک لفظ برداشت نہیں کر پاتا، اس سے بڑا سنگِ گراں کون ہوگا جو اس کی مثالی دُنیا کی راہ میں حائل ہے؟ المیہ یہ کہ یہ سب جون کی شخصیت سے متاثر ہونے کے سبب ہو رہا ہے اور اس کی محبت کے نام پر ہو رہا ہے، حتیٰ کہ جون کے اہلِ خانہ کو بھی جون سے عشق کے نام پر ہدف بنایا جاتا رہا ہے۔ عشق کرو لیکن انداز وہ ہو جو محبوب چاہتا ہے، جس رنگ میں وہ اپنے عاشق کو دیکھنا چاہتا ہے اس رنگ میں ہو۔

جون ہی تو ہے جون کے درپے
میر کو میر ہی سے خطرہ ہے

انکار کی لذّت کا دل دادہ

احفاظ الرحمان

دیوانہ مر گیا اور مملکتِ شعروسُخن کی گلیاں اُداس ہیں۔ اس نے بڑی لگن کے ساتھ اپنے جنوں کی کرشمہ سازیوں سے بازارِ عقل روشن رکھنے کی تدبیر کی تھی۔ علم و دانش کو اطاعت پرستی کی دُھوپ سے بچانے کے لیے وہ انکار کے پودے کو اپنے لُہو سے پروان چڑھا رہا تھا۔ ایک عجیب وارفتگی اس کے وجود میں رقص کرتی تھی۔ اُس نے اپنا دامن چاک رکھا اور دامنِ یزداں بھی سلامت نہیں رہنے دیا۔ وہ محراب و منبر کی فضیلت کو بھی تار تار کرتا رہا اور اقتدار کے قلعے کی فصیلوں پر بھی کمندیں ڈالتا رہا۔ اپنے محبوب کو پرچانے اور رجھانے کے لیے تمام مروّجہ اور غیر مروّجہ ترکیبیں آزماتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی ہنگامہ خیز نرگسیت کا نشانہ بناتا رہا۔ یہ ایک چومُکھی لڑائی تھی لیکن اس نے مُشکل سے مُشکل مرحلے پر بھی اپنی توانائیوں کو سپر انداز ہونے کی اجازت نہیں دی۔ یہ ہنگامہ خیز بازی اس کی آخری سانس تک جاری رہی اور پھر اسی کش مکش کے دوران ایک دن وہ اپنے چاہنے والوں کو اپنی پُر ماجرا یادوں کے انبوہ میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

جون ایلیا کی ہُنروری داخلی اور خارجی، ہر دو رنگ کی منظر کشی کرتے وقت جمالیات کی ایک انوکھی چھب میں ڈھل کر ہمارے احساسات پر حزن و طرب اور نشاط و ملال کے گہرے تاثرات نقش کرتی ہے۔ ان کے کلام میں گفت گو کے رُموز اس قدر تہ دار ہیں کہ ان کے اندر جھانکتے ہوئے سانس اُکھڑنے لگتی ہے۔ میری بساط ہی کیا، اس لیے ابتدا ہی میں اقرار کرتا چلوں کہ مجھ جیسا کم علم اپنی منجمد یانہ نظر کے ساتھ محض پیش پا اُفتادہ تاثرات تک محدود رہ سکتا ہے۔

بھائی جون زندگی بھر ہمیں اپنی تحریر اور گفت گو سے انسپائر کرتے رہے۔ میں ان سے

طالب علمی کے زمانے میں متعارف ہوا۔ اُس دور میں ہم سب دوست نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پلیٹ فارم سے معاشرے میں انقلاب لانے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ ہمارے جذبے بے کھوٹ تھے اور ہم ایسے سارے لوگوں سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے جو ناداروں اور مظلوموں کی دادرسی اور اس خوں خوار طبقاتی نظام کی بیخ کنی کے لیے آواز اُٹھاتے تھے۔ سو، جون ایلیا اور خالد علیگ بھی ہمارے محبوب شاعر تھے۔ جون ایلیا انقلاب کی، لاطبقاتی نظام کی باتیں کرتے تھے اور ایسے سخن وروں پر سختی سے تنقید کرتے تھے جو ادب کو درونِ ذات کی تفسیر تک محدود رکھنے کے حامی تھے۔

فن جو جُز فن کچھ بھی نہ ہو، وہ اک مُہلک خوش باشی ہے
کارِ سخن پیشہ ہے تمھارا جو خونی عیاشی ہے

ان کی انقلابی اور رومانی نظمیں ہم نوجوانوں کے لیے بے پناہ کشش رکھتی تھیں۔ جب وہ اپنے مخصوص رجزیہ آہنگ میں، مشاعروں اور مزدور تنظیموں کے جلسوں میں اپنی نظمیں اور غزلیں سُناتے تو ہم مسحور ہو جاتے اور ظالم طبقات کے خلاف ہماری نفرتوں کی بھٹی میں غیظ و غضب کے انگارے دہکنے لگتے۔

مفاہمت ختم ہو چکی ہے، مفاہمت ختم ہو چکی ہے
ستم گروں سے ستم کشوں کی معاملت ختم ہو چکی ہے
اور
جو ظالموں کو پناہ دے گا، وہ ظالموں میں شمار ہو گا

یہ تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے میعادِ ستم
جُز حریفانِ ستم کس کو پکارا جائے
وقت نے ایک ہی نکتہ تو کیا ہے تعلیم
حاکمِ وقت کو مسند سے اُتارا جائے

پھر ان کی طویل، معرکہ آرا انقلابی نظم 'نئی آگ کا عہد نامہ' سننے والوں پر سحر طاری

کر دیتی تھی۔ آج بھی پڑھیے تو اس کا ذائقہ منفرد محسوس ہوگا۔ یہ نظم کائنات کے تاریخی تسلسل کے ساتھ پہاڑ سے پھوٹنے والے پُرشور اور مترنم چشمے کے مانند سفر کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ ہزاروں مصرعے مکمل ہو چکے تھے، بدقسمتی سے یہ نظم نامکمل رہی۔

اُس دور میں بھائی جون سے مراسم محض مشاعروں، جلسوں اور دوستوں کی بیٹھکوں تک محدود تھے، ایک سامع کی حد تک۔ پھر جب 'امیرالمومنین' ضیاء الحق کے دور میں صحافیوں کی انجمن کے پلیٹ فارم سے آزادیٔ صحافت کے لیے جدوجہد کرنے کے جرم میں قید و بند اور پھر بے روزگاری کی سوغات نصیب ہوئی تو بھٹکتے بھٹکتے 'عالمی ڈائجسٹ' میں امان ملی، جہاں ڈھائی تین سال تک ان کی رفاقت حاصل رہی حتیٰ کہ 1985ء میں ایک بار پھر چین کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر سے بُلاوا آ گیا۔

اُس دور میں روزانہ صبح سے شام تک سارا وقت بھائی جون کے ساتھ گزرتا تھا۔ گویا، اس طرح انھیں اور زیادہ قریب سے دیکھنے، سننے، محسوس کرنے اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ کبھی کوئی نئی غزل وجود میں آتی تو سُناتے اور اس پر بہ اصرار رائے طلب کرتے۔ یہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کا ایک انداز تھا جو وہ ہر ایک سے روا رکھتے تھے۔ اس دور میں ان کا فن نئی بلندیاں سَر کر رہا تھا۔ نظم کے ساتھ غزل کے میدان میں بھی وہ اپنے انوکھے، سحر انگیز استعاروں اور تراکیب کے ساتھ ایک نئے ڈکشن کی داغ بیل ڈال چکے تھے، اور ان کی مقبولیت چاروں سمتوں مُحیط ہو چکی تھی۔ لیکن تمام مقبولیت اور شہرت کے باوجود ان کی رُوح بے چین ہی رہی۔ وہ بہت دردمند دل رکھتے تھے۔ اکثر بیٹھے بیٹھے اُداس ہو جاتے تھے۔ اخبار میں کسی غم زدہ کے بارے میں پڑھتے تو شام تک بار بار اس کا تذکرہ کرتے۔ کائنات کے بے ڈھب نظام کے بارے میں ان کے ذہن میں بڑے کٹھن اور کٹیلے سوالات اُبھرا کرتے تھے اور چوں کہ ان کا جواب نہیں ملتا تھا اس لیے ان کے ذہنی انتشار میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ غصے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ نرگسیت کا آزار پہلے ہی سوا تھا۔ کائنات کی ماہیت کے بارے میں ایسے سوالات پر اصرار کرنے والا تنہا رہ جاتا ہے، وسوسوں اور اندیشوں میں گھر جاتا ہے۔ یہی کچھ بھائی جون پر بھی گزرا۔ بے خوابی نے ایسا گھیرا کہ آخر تک چین نہ لینے دیا اور اس بے خوابی نے دیگر عوارض سے

ہم کنار کیا۔ اس مرض پر قابو پانے کے لیے وہ ایک طویل عرصے تک ہر طرح کا علاج کرتے رہے لیکن کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ طبیعت میں بے اطمینانی اور ناآسودگی کا غلبہ تھا۔ افاقے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ایک بار ایک حکیم صاحب سے رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے حسب دستور نسخے پر 'ھوالشافی' لکھ دیا۔ وائی پر کہنے لگے ایسے حکیم سے علاج کرانے کا کیا فائدہ جسے اپنے پر بھروسا نہ ہو۔ ایک بار میں نے بھی ان کے لیے آکوپنکچر سے علاج کا بندوبست کیا۔ کچھ عرصے تک علاج ہوتا رہا۔ آدھے گھنٹے کا سیشن ہوتا تھا۔ لمبی لمبی باریک سوئیاں سر کے مختلف حصوں میں پیوست کی جاتی تھیں۔ شروع میں بہت خوش نظر آئے لیکن رفتہ رفتہ طبیعت اس سے بھی اچاٹ ہوگئی اور جب افاقے کی تمام صورتیں دھندلاتی چلی گئیں تو چاروناچار انھوں نے اس موذی مرض سے مفاہمت استوار کرلی۔ ویسے اس ابتلا کے بارے میں ان کا کہنا تھا۔

دوا سے فائدہ مقصود تھا ہی کب کہ فقط
دوا کے شوق میں صحت تباہ کی میں نے

تاہم، ان عذابوں کے حصار میں ہونے کے باوجود وہ پہلے کی طرح شدّومد کے ساتھ اپنی چاک دامنی اور دیوانگی کی صداقت پر اصرار کرتے رہے اور ان کے نظریات میں ذراسی بھی تبدیلی نہیں آئی۔ اپنے مجموعۂ کلام 'شاید' کے مقدمے میں، جو اُردو ادب کا ایک شاہ کار نثر پارہ ہے، انھوں نے خود لکھا ہے، 'میری آنکھیں دکھتی ہیں، لیکن میں اب بھی اپنے خوابوں کو نہیں ہارا ہوں۔'

ان کی ذات کے اندر ایک سادہ سا، معصوم اور شوخ بچہ چھپا ہوا تھا جو شرارت کرنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ ایسے میں وہ اپنے سے کم عمر لوگوں کے درمیان بھی تکلف کا حجاب اُتار پھینکتے تھے۔ بعض اوقات ان کے تاثرات ایک دل چسپ جہت کے ساتھ فکر کو انگیخت کرتے تھے۔ 'شاید' کے مقدمے میں انھوں نے لکھا ہے اور اس سے پہلے وہ زبانی طور پر میرے اور شاید دوسروں کے سامنے بھی یہ سوال رکھ چکے تھے۔ 'اگر آپ تاریخ کے کسی ہیرو یا دیوی کا مجسمہ دیکھ کر یہ سوچیں کہ زندگی میں اس شخص کے جسم میں معدہ بھی ہوگا اور انتڑیاں بھی ہوں گی تو آپ کے ذہن کو دھچکا لگے گا یا نہیں؟'

ظاہر ہے کہنا یہ مقصود تھا کہ کائنات نامعقولات (Absurdities) کا مجموعہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

تحریر کے معاملے میں جون ایلیا ایک پرفیکشنسٹ تھے۔ انشا، املا اور لسانیات کے رموز پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ ان سے جب بھی گفت گو ہوئی، کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا۔ ہر رنگ، ہر ذائقے اور ہر وضع کے الفاظ گویا قطار در قطار، دست بستہ ان کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ انھیں تراش خراش کر ان کی نشست و برخاست میں، ان کی ہیئت میں ایک باریک سی تبدیلی لاکر ان کے تاثر میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیتے تھے۔ نئی نئی، دل کش زمینیں وضع کرنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ نئی تراکیب، نئے استعارے انھوں نے اس کثرت سے وضع کیے کہ حیرت ہوتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ وہ صحیح معنوں میں ایک صاحب اُسلوب شاعر تھے۔ یہ الفاظ ہمیں ہر دوسری کتاب کے فلیپ پر نظر آئیں گے، جو بدقسمتی سے کسی جید ناقد کی جنبشِ قلم سے وجود میں آتے ہیں لیکن جون ایلیا کبھی کسی سَند کے محتاج نہیں رہے۔ ان کے مصرعے تو ایک انوکھے اور انتہائی کشش انگیز رنگ میں ڈوب کر طلوع ہوتے ہیں، یہ اعلان کرتے ہوئے کہ وہ کس جادوگر کی خلاقی کے آئینہ دار ہیں۔

مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جون ایلیا کا ڈکشن عرب اَرضِ فلسطین اور ایران کی علمی اور ثقافتی روایات اور یونانی اساطیر کی آمیزش سے وجود میں آیا ہے اور یہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں، بل کہ عربی، فارسی اور عبرانی ادب اور لسانیات کے گہرے مطالعے کا ثمر ہے۔ جب وہ کہتے ہیں۔

اے خداوند، میں تجھ سے معمور تھا

تو ہمیں ان الفاظ میں عہد نامۂ عتیق کا لب و لہجہ جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی نظم میں اس قسم کے مصرعے آتے ہیں۔

میں بھی کچھ کہوں تم سے جانِ من نگارینا
رشکِ سرو سیمینا
اے بہ ناز کی مینا
اے بہ جلوہ آئینہ

تو ان سطروں میں ہمیں فارسی نظم کی گھلاوٹ تیرتی محسوس ہوتی ہے۔ اُردو، عربی اور فارسی ادب اور لسانیات کے گہرے مطالعے نے ان کو یہ اعجاز بھی عطا کیا ہے کہ ان کی تراشیدہ تراکیب بھرپور مفہوم اور بھرپور تاثر کے ساتھ قاری کو منتقل ہوتی ہیں، اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں۔ مثال کے طور پر، جب وہ حریفانہ انداز اختیار کرتے ہیں تو الفاظ جیسے تلوار کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔ جب وہ محبوبہ کو رام کرنے کے لیے دام بچھاتے ہیں تو ان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ موم کی طرح پگھلتے محسوس ہوتے ہیں اور جب وہ ایک باغی کے قالب میں نمودار ہوتے ہیں تو شیخ و برہمن اور ان کے اتحادی اہلِ حکم کے سروں پر ان کے اشعار گُرز بن کر برستے ہیں اور یہ سب اس خوب صورت انداز میں کہ ہر رنگ اور ہر کیفیت میں جمالیاتی عنصر اُن کے اشعار میں اُمڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

آج کل، مشاعروں کی مروّجہ فضا میں کام یاب ہونے کے لیے بہت سے داؤ پیچ آزمائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ، بھائی جون اس فن میں بھی طاق تھے اور اپنی خاص ڈھب کی غزلیں پیش کر کے بے تحاشا داد سمیٹتے تھے۔ لیکن محض ان غزلوں کی بنیاد پر ان کے اصل رنگِ سخن یا اسلوبِ سخن کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ صادر کرنا درست نہیں ہوگا۔ گزشتہ دنوں ان کے انتقال کے بعد ایک تجزیہ یہ سامنے آیا کہ جون سرشاری و سرمستی کے شاعر تھے۔ دوسرا تبصرہ یہ تھا کہ وہ سہلِ ممتنع کے شاعر تھے۔ میرے خیال میں وہ سرشاری اور سرمستی یا سہلِ ممتنع کے شاعر قطعاً نہیں تھے۔ انھوں نے یقیناً سہلِ ممتنع میں، بالخصوص آخری دور میں بہت خوب صورت غزلیں کہی تھیں لیکن یہ ان کا اصل رنگ نہیں ہے۔ جون ایلیا کا دوسرا مجموعۂ کلام 'یعنی' زیرِ ترتیب ہے۔ میں بھی ان چند لوگوں میں شامل ہوں، جنھوں نے اس کا مسودہ پڑھا ہے۔ میری تو بساط ہی کیا لیکن دیگر حضرات اس رائے پر متفق ہیں کہ اس میں جون ایلیائی اور تحیّر خیز بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ 'یعنی' میں شامل نظمیں اور غزلیں پختہ کاری اور تہ داری سے پُر ایسی انوکھی وارداتوں کا سُراغ دیتی ہیں جن سے جون ایلیا جیسا حسّاس فن کار ہی انصاف کر سکتا تھا۔ اس میں شامل متعدد غزلیں اور نظمیں اُردو ادب کا بے بہا سرمایہ ثابت ہوں گی۔ خاص طور پر 'درختِ زرد'، 'ولایتِ خائباں'، 'سفر کے وقت'، 'کاش، اے کاش' اور 'تمھارا فیصلہ جاناں' جیسی فکر انگیز نظموں کا شمار اُردو کی چند سب سے

پُرمایہ نظموں میں ہوگا۔

'درختِ زرد' ایک حیرت ناک اور الم ناک نظم ہے. جس کی ایک ایک سطر، بل کہ ایک ایک لفظ شاعر کے فُسوں گر اسلوب اور کمالِ فن کی داد طلب کرتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی مُنفرد، نرالی اور حیران کُن تراکیب ایک ایسا سحر آفریں منظر نامہ ترتیب دیتی ہیں کہ پڑھنے والا دم بہ خود رہ جاتا ہے۔ یہ مُکالمہ واقعی خونِ دل سے کشید کیا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں اس پائے کی نظمیں خال خال ہی نظر آئیں گی۔ یہ اپنے قاری سے مطالبہ کرتی ہے، بل کہ اُس کے اندر اس شوق کو مہمیز کرتی ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے کیوں کہ ہر بار اس کے الفاظ کی بندش میں فنی رُموز اور مفاہیم کے نئے آئینے جھلملاتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ مکالمہ بہ ظاہر مدہوشی اور جَذب کی ایک ارفع کیفیت کا سُراغ دیتا ہے۔ شاعر جُرعہ بہ جُرعہ مئے گُل فام کی پُراسرار گہرائیوں میں بھٹکتا ہوا داخلی وارداتوں کا زینہ طے کرتا ہے، جس پر خارجی حقائق کی چُھوٹ پڑ رہی ہے۔ اس کیفیت میں مدہوشی بھی ہے ہشیاری بھی، اذیت کوشی بھی ہے اور خود بینی بھی، ذات کا آئینہ بھی ہے اور دنیا کی بے ثباتی کی جھلکیاں بھی۔ یہ پڑھنے کی چیز ہے، اس لیے میں یہاں صرف چند سطروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

تو میں کیا کہہ رہا تھا، یعنی کیا کچھ سہہ رہا تھا میں
اماں 'ہاں' میز پر یا میز پر سے بہہ رہا تھا مَیں
رُکو، مَیں بے سروپا اپنے سر سے بھاگ نکلا ہوں
مرا 'میں' لاگ میں تھا، اُس سے مَیں بے لاگ نکلا ہوں
الایا ایہا الابجد، ذرا یعنی، ذرا ٹھیرو

There as an absurd I in absurdity shaayad

کہیں اپنے سوا، یعنی کہیں اپنے سوا ٹھیرو
تم اس absurdity میں اک ردیف' اک قافیہ ٹھیرو

'ولایتِ خائباں' بھی ایک انوکھے ذائقے کی نظم ہے، جس میں تاریکی اور ماضی میں رہنے والوں کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ گویا، یہ پاکستان کے تاریکی پسندوں کا قصہ ہے۔ زُبیرابنِ سلامہ اور جُندب ابنِ یاسر ساکنانِ شہرِ صیدا اٰسف آباد کا یہ عالم ہے کہ وہ مسلسل

ایک خواب عمیق و جاوداں میں غرق رہتے تھے۔ شہر میں ہر طرف خراٹوں کی زبان میں گفت گو ہوتی تھی۔ گویا تمام لوگ غفلت کے نشے میں مبتلا تھے۔ ایک قہوہ خانے میں ان دونوں کی ملاقات زندہ بے دار جاودانی اور سرمدار کانی سے ہوتی ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خوابیدہ گردی کی کیفیت سے محفوظ ہیں کیوں کہ کسی فخرِ جالینوس نے انھیں ایک اکسیر عنایت کردی تھی۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شہر کا کوئی آدمی خود میں زندہ نہیں ہے، ان سب کی خواہش ہے کہ وہ درخشاں تر، فروزاں تر ماضی میں بٹ جائیں، ماضی جو لافانی ہے۔ وہ دونوں سیاحوں کو بتاتے ہیں کہ۔

'یہاں اجناس کے سرمحکمے کے حکم کی رُو سے
ہر اک ماکول اور مشروب میں
خواب آور ادویہ کی آمیزش ضروری ہے، نہیں تو پھر سزا ہے
الغرض، مقصد جو ہے، یہ ہے کہ سارے لوگ
اپنے ہوش سے عاری رہیں
اور صرف بے ہوشی میں سرگرم اور طُرفہ کار، پُراحوال، پُراطوار ہوں
اس ماجرا آگیں ولایت کی تمامی دانش و بینش، تمامی فرخی فرہنگ ہر فرو فروزانی، فزائش کا جو سرچشمہ ہے، وہ خوابیدہ روزی اور بس خوابیدہ گردی ہے
بُرمیا ابن ...... بُرمیا ابن ...... تو اب ہم بھی
تو اب ہم بھی ...... تو جندب ابن یملیخا ...... خراخر ہا ...... خراخر ہا ......

گویا وہ دونوں بھی، یعنی زندہ بیدار جاودانی اور سرمدار کانی بھی اپنے تمام تر دعووں کے باوجود خوابیدہ گردی کی لت سے محفوظ نہیں تھے اور شہر والوں کی حکایت بیان کرتے کرتے اُن کی زبانیں لڑکھڑانے لگتی ہیں اور وہ خود بھی خراٹے بھرنے لگتے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ جون ایلیا کے ہم دم دیرینہ، شکیل عادل زادہ کے مطابق ان کا چودہ مجموعوں کے بہ قدر کلام ہنوز اشاعت کا منتظر ہے۔ ظاہر ہے، مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلیں (یا نظمیں) تمام کلام کے محض ایک جزو پر مشتمل ہیں، اس لیے محض ان کی بنیاد پر کوئی حتمی فیصلہ صادر کرنا درست نہیں ہوگا۔ ہمارے عہد کے ممتاز ناقد محمد علی صدیقی صاحب

جون ایلیا کے بہت قریب رہے ہیں اور ان کے تمام کلام پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ایک تازہ مضمون میں لکھتے ہیں، 'میں انھیں جدید اُردو شاعری کے صفِ اول کے چند شعرا میں (اور وہ چند بھی دو تین سے زیادہ نہیں) منفرد لب و لہجے کا شاعر سمجھتا ہوں اور اب جب کہ وہ اپنے ادبی قد و قامت کی نفی کرنے کے لیے موجود نہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ اس مختصر فہرست میں بھی پہلی جگہ پائیں گے۔'

دراصل اپنی عمیق فکری اور علمی بصیرت کے تناظر میں جون ایلیا مجموعی طور پر خرد افروزی، تفکر اور تعقل کے شاعر ہیں۔ یہی ان کا فطری رنگ ہے۔ ان کی شاعری کا تجزیہ کرنے اور ان کا بنیادی موضوعِ سخن متعین کرنے کے لیے 'شاید' کے مقدمے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ انتہائی خوب صورت، انتہائی پُراثر اور انتہائی فکر انگیز نثر پارہ ان کے نظریۂ حیات کو مجسم ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ 'شاید' میں انھوں نے اپنے نظریات پر ایک بہت طویل گفت گو کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ نظریات بچپن ہی سے ان کے اردگرد کے ماحول میں تیر رہے تھے۔

جون ایلیا ایک سیکولر اور روشن خیال آدمی تھے۔ مجموعی طور پر ان کے اشعار ایک مخصوص فکری اور بنیادی سانچے کے زیرِ اثر تشکیل پاتے ہیں، تاہم وہ یہ نشان دہی بھی کرتے ہیں کہ شاعری کو پُر اثر بنانے کے لیے اس میں احساس، تخیل اور جذبے کی آمیزش بھی ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں 'شاعری ہی وہ فن ہے، جو ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو ہم عصر بناتا ہے۔ ذہن کی یہ خلافِ معمول اور غیر معمولی طور پر پردازی ذہن کے مہذب ترین اختلال اور دانش مندانہ جنون کا نتیجہ ہوتی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فن کے تعلق سے ہر وہ اخلاقیات نہیں' بل کہ عقیدہ ہوتی ہے اور عقیدوں کا حُسن اور فن سے کوئی غیر مشروط تعلق نہیں ہوتا۔ میں ایک شاعر کی حیثیت سے عقیدوں کی مجموعیت کو رَد کرتا ہوں۔ مابعد الطبیعی حقائق کے شاعر، شاعر سے بلند تر مرتبے کے حق دار تو ہو سکتے ہیں، مگر شاعر نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ شاعر کا سب سے گہرا رشتہ 'جمال' سے ہوتا ہے، اور جمال غیر زمانی اور غیر مکانی نہیں ہوتا۔'

جون ایلیا کی اس تعقل پسندی کے سبب دراصل ان کی شاعری تشکیک اور انکار کی شاعری ہے۔ شاید سچا دانش ور اس منزل سے ضرور گزرتا ہے۔ بعض آدھے راستے سے واپس چلے جاتے ہیں مگر بھائی جون آخری سانس تک اپنے نظریے پر قائم رہے۔ گزشتہ دنوں

ان کی یاد میں منعقد ہونے والی ایک نشست میں اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہوئے کہ جون ایلیا محض ایک شاعر نہیں بل کہ جید عالم بھی تھے، ان کی فقہی معلومات کے بارے میں شاید یہ تاثر دیا گیا کہ انھیں مابعد الطبیعی فلسفے سے کوئی رغبت رہی ہو لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ کسی زمانے میں عالم اس شخص کو کہا جاتا تھا جو بہ یک وقت متعدد بنیادی علوم پر عبور رکھتا تھا۔ بدقسمتی سے آج کل یہ اصطلاح مذہبی حلقوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اس دائرے میں ایک عام پیش امام بھی عجلت اور بے تابی کے ساتھ عالم اور 'علامہ' کی دستارِ فضیلت اپنے سر پر سجالیتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے، وہ بھی عالم اور 'علامہ' ہے۔ گویا یہ لفظ اس قدر ارزاں ہو گیا ہے کہ شاید اب اسے 'ع' کے بجائے الف ممدودہ سے لکھنا مناسب ہوگا اور علم و فن سے وابستہ اکابر کے لیے کوئی اور اسم وضع کرنا ہوگا۔

جو لوگ جون ایلیا کو قریب سے جانتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ مابعد الطبیعی فلسفے سے انھیں کوئی نسبت نہیں تھی۔ وہ تو بغاوت اور انکار کی لذت کے دل دادہ تھے۔ انھوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی منظوم اور نثری تخلیقات میں اپنا یہ موقف بیان کیا ہے۔ 'شاید' کے مقدمے میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: 'میں اپنی شدید ارتیابیت کے باوجود یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کرۂ ارض بل کہ ہماری کہکشاں کے کسی بھی سیارے پر کسی ایسے ذہن کا وجود فرض کرنا ممکن نہیں، جو لفظ 'خدا' کے مفہوم کی تشریح کر سکے۔' اسی مقدمے سے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن میں انھیں چھوڑ کر منظومات کی طرف آتا ہوں۔

ہم نے خدا کا رَد لکھا، نفی بہ نفی، لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے

اے خدا ساز بندگانِ خدا
خود سبب بن گیا مسبّب کیا

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تُو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

تجھ سے بڑھ کر وہم ہے تیرا خدا
ہشت اے انسان، اے انسان ہشت

مُنکرانِ خدائے بخشندہ
اس سے تو اور اک خدا مانگو

بڑا بے آسرا پن ہے سو چُپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نہیں

نظم 'شہرآشوب' سے۔

ستم کیا عجب منجنیقِ منبر نے
حریمِ دل کی سلامت نہیں رہی دیوار
یہ عہد وہ ہے کہ دانش ورانِ عہد پہ بھی
مُنافقت کی شبیہوں کا خوف طاری ہے
نمازِ خوف کے دن ہیں کہ ان دنوں یارو
قلندروں پہ فقیہوں کا خوف طاری ہے
گزشتہ عہد گزرنے ہی میں نہیں آتا
یہ حادثہ بھی لکھو معجزوں کے خانے میں
جو رَد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

اب ایک طویل نظم 'رمزِ ہمیشہ' سے ایک اقتباس۔

اور پھر میں نے
موجود کے دائرے کی نہایت پہ تالا کیا
اے یقیں کے گماں
اے گماں کے یقیں
اے ازل آفریں
اے ابد آفریں
اے خدا، الوداع
اے خدایانِ خدا
الوداع، الوداع

اب ایک مختصر نظم 'برجِ بابل' ملاحظہ ہو۔

بُرجِ بابل کے بارے میں تو نے سُنا؟
بُرج کی سب سے اُوپر کی منزل کے بارے میں تُو نے سُنا؟
مجھ سے کلدانیوں، کاہنوں نے کہا
بُرج کی سب سے اُوپر کی منزل میں
اک تختِ خوابِ قداست ہے
جس پر خداوند آرام فرما رہا ہے
خداوند، اُن کا خدا
حضرتِ اقدسِ کبریا
اور سَر تا سرِ ارضِ بابل میں یعقوب کے مرد و زن
جاں کنی کی اذیت میں
زندہ رکھے جا رہے ہیں
یہی ان کا مقسوم تھا
اور ازل سے خداوند آسودہ ہے

جون ایلیا کے نظریے کی دوسری بنیادی جہت سرمایہ دارانہ نظام سے ان کی شدید نفرت سے جنم لیتی ہے۔ 'شاید' کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں، 'اگر حضرت عیسیٰ موجود ہوتے تو کیا وہ سرمایہ دارانہ نظام کو برداشت کر سکتے تھے؟ کیا آں حضرت ﷺ اور ان کے برگزیدہ صحابہ کسی سرمایہ دارانہ معاشرے میں ایک پل بھی سانس لینا پسند کر سکتے تھے۔' اور اس عبارت کا اختتام وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں، 'اشتراکی معاشرہ شرفائے تاریخ کا خواب رہا ہے۔'

اب جب کہ گلوبلائزیشن اور نیو ورلڈ آرڈر کے پُرفریب نعروں کی آڑ میں کم زور اور غریب ممالک کے عوام کو معاشی استحصال کے نئے اور زیادہ مُہلک ہتھیاروں سے ذبح کیا جا رہا ہے تو بھائی جون کے یہ آخری الفاظ اور زیادہ پُرمعنی محسوس ہوتے ہیں اور پاکستان کے درونِ ذات محوِ خواب دانش وَروں کی جمعیت کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ پوری قوت کے ساتھ یہ سازش بے نقاب کریں اور اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔

'شاید' میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں، 'جرمنی کے ایک غریب اور فاقہ کش مفکر نے جو اپنے مرتے ہوئے بچے کا علاج تک نہیں کر سکا، جو اس کے مرنے پر کفن تک خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا، اس نے جب انسانوں کے بنیادی مسئلے کی سائنسی نشان دہی کی تو سرمایہ داروں کی تمام اقلیموں میں مذہب اور اخلاق کا باغی ٹھیرا۔ یہ شخص مارکس تھا، یہ وہ شخص تھا جو نیم فاقہ کشی کی حالت میں ساری دنیا کے انسانوں کے دُکھ کا مداوا سوچا کرتا تھا اور ایک دن اپنے عظیم اور قابلِ تمجید استغراق کی حالت میں بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ ہم جب تاریخ کے اس محبوب اور برگزیدہ بوڑھے اور اس کے زندگی پرور حکیمانہ نظریے کا ..... کمیونزم کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنے عوام کی نیم جاں زندگی کا مداوا چاہتے ہیں تو ہم نئے مغربی سامراج اور اس کے مقامی دلالوں کے نزدیک اپنے ملکوں کے باغی اور غدار ٹھیرتے ہیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں جیسے میں فریادی ماتم کرنے لگا ہوں اور انفعالیت کا شکار ہو گیا ہوں۔ نہیں جناب، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سرمایہ داری نظام کے قحبہ خانوں کا گریبان پکڑ کر انھیں سرِ عام کھینچ کے لانا ہمارے فنون اور ہماری دانش کا فرض ہے۔ امریکا اور مغربی یورپ کی ڈیرے دار سرمایہ داری کا وجود تہذیبی شعور اور عمرانی احساسِ جمال کی توہین ہے۔'

جون ایلیا کی جمالیات کوئی چھوئی موئی کا پودا نہیں تھی کہ وہ اپنی شاعری کو داخلیت

کے اہرام میں محفوظ رکھنے کا جتن کرے، جیسا کہ بعض حضرات کا نظریہ ہے۔ اس موضوع پر جون ایلیا کا موقف یہ ہے کہ۔

فن جو بُجز فن کچھ بھی نہ ہو، وہ اک مُہلک خوش باشی ہے
کارِ سخن پیشہ ہے تمھارا جو خونی عیاشی ہے

اسی لیے ان کے کلام میں اس قسم کے اشعار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

یہی پوچھا کیا میں آج دن بھر
ہر اک انسان کو روٹی ملی کیا

یہاں تو جاذبیت بھی ہے دولت ہی کی پروردہ
یہ لڑکی فاقہ کش ہوتی تو بدصورت نظر آتی

اور

برہنہ ہیں سرِ بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم
چبالیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

کل ایک قصرِ عیش میں بزمِ سخن تھی جون
جو کچھ بھی تھا وہاں وہ غریبوں کا مال تھا

گویا، سماجی مسائل کے معاملے میں جون ایلیا کی فکر مغالطوں کی دھند سے کبھی آلودہ نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی دانش انھیں بلند حوصلگی کی ارفع ترین منزلوں سے ہم کنار رکھتی ہے۔ نظریات پر مفاہمت اور مصالحت کے وہ قائل ہی نہیں تھے۔ تاریخ کے گہرے مطالعے نے انھیں درس دیا تھا کہ اصل انقلابی تہی دست لوگ ہی ہوتے ہیں۔ وہ کبھی حُبِ جاہ اور حُبِ زر کی ہوس میں مبتلا نہیں ہوئے بل کہ اس کے برعکس وہ تو زندگی بھر دوسروں کو ناراض کرتے رہے، خود کہتے ہیں۔

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اُسے خفا کیجے
ہے تقاضا مری طبیعت کا
ہر کسی کو چراغ پا کیجے

اس کا بھی ایک خاص پس منظر ہے۔ دانش وراس کائنات میں سوال کرنے اور اس کا جواب تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ بھی سوال کیے جاتے تھے اور جب جواب سائنسی صداقت سے تہی ہوتا تھا تو وہ اسے تسلیم نہیں کرتے تھے اور ان کا یہ انکار دوسروں کی ناراضی کا سبب بن جاتا تھا۔

غزل کی حشر سامانیوں میں جون ایلیا نے بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ ان کے مخصوص لب ولہجے سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے ان کا انداز اختیار کرنے کی ٹھانی لیکن یہ خوشہ چینی خوشہ چینیوں کے کلام میں پُر اثر رنگ قائم نہ کرسکی کیوں کہ جون ایلیا کے پاس ماضی اور حال، گہرے مطالعے اور گہری ریاضت کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص وضع کا انا پرست، چھیل چھبیلا، شوخ، اکھڑ، نرگسیت زدہ، جمال پرست اور ایذا پسند رومانی مزاج اپنی پوری شدتوں کے ساتھ موجود ہے، جو فطری طور پر ان کے وجود میں شامل ہے۔ ان کا رنگ اخذ کرنے کے لیے زبان کی وہ گھلاوٹ اور وہ بے ساختگی کہاں سے آئے گی جو اُن کے مزاج کے بطون سے پھوٹتی ہے۔

جون ایلیا نئی نئی زمینیں ایجاد کرتے ہیں، نئی نئی تراکیب وضع کرتے ہیں تو ایسا کسی میکانکی عمل کے ذریعے نہیں ہوتا۔ ان کو قریب سے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنی عام گفت گو میں بھی عام گفت گو نہیں کرتے تھے۔ روانی کے ساتھ عجیب عجیب دل کش الفاظ اور تراکیب وضع کرتے جاتے تھے۔ دوسروں سے الگ اور منفرد نظر آنے کی خواہش بچپن سے ان کے دل میں جاگزیں تھی۔ خوش قسمتی سے انھیں ابتدا ہی سے علمی ماحول میسر رہا۔ اس لیے پیش پا اُفتادہ روش اور فرسودہ استعاروں اور تراکیب سے بیزاری پیدا ہونا لازم تھا۔ ان کے عجوبۂ روزگار تخیل کا جادو انھیں عجب عجب مناظر کی سیر کراتا تھا اور وہ وہاں سے رنگ رنگ کے استعاروں اور تراکیب سے اپنا پیمانہ پُر کر کے واپس آتے تھے۔ پھر یہ کہ

الفاظ کو ایک شوخ ادا کے ساتھ موم کی طرح لوچ دے کر ایک دل کش رنگ اور آہنگ پیدا کرنے میں بھی انھیں کمال حاصل تھا، جیسے عشق خوں خوارہ، نار پستاناں، صندلیں راناں، مژگاں شماراں، گریباں تارتاراں، یاد کے بے یادگاراں۔ یا پھر نگار سے نگارینا، سیمیں سے سیمینا، فُسوں کارا' انگارا' نو بہارا' آرزو آرا، جنبشی، زرّیں سے زرّینا، اور رنگ سے رنگ رنگ رنگینا۔ یہ سارے اشارے ان اشعار کی نسبت سے ہیں جو غمِ جاناں کی ترجمانی کے ذیل میں آتے ہیں اور خوش ذوق قارئین کو ایک انوکھی، کیف آور امیجری سے آشنا کراتے ہیں۔ اس کے برعکس، جون ایلیا کے جن اشعار میں غمِ دوراں دھڑکتا ہے، وہ شدّتِ احساس کے ایک دوسرے پُر تمکنت رُخ کا سراغ دیتے ہیں۔

آخر میں ہم ان دونوں ذائقوں کے چند اشعار دہرا کر جون ایلیا کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

اک رنگ سی کمان ہو، خوش بو سا ایک تیر
مرہم سی واردات ہو اور زخم کھاؤں میں
شکوہ سا اک دریچہ ہو، نشہ سا اک سکوت
ہو شام اک شراب سی اور لڑکھڑاؤں میں

کتنے عیش سے رہتے ہوں گے، کتنے اتراتے ہوں گے
جانے کیسے لوگ وہ ہوں گے، جو اُس کو بھاتے ہوں گے
شام ہوئے خوش باش یہاں کے میرے پاس آ جاتے ہیں
میرے بجھنے کا نظّارہ کرنے آ جاتے ہوں گے
وہ جو نہ آنے والا ہے نا، اس سے مجھ کو مطلب تھا
آنے والوں سے کیا مطلب، آتے ہیں، آتے ہوں گے

یہ پیہم تلخ کامی سی رہی کیا
محبت زہر کھا کر آئی تھی کیا
محبت میں ہمیں پاسِ انا تھا
بدن کی اِشتہا صادق نہ تھی کیا

اے صبح! میں اب کہاں رہا ہوں
خوابوں ہی میں صَرف ہو چکا ہوں
سب میرے بغیر مطمئن ہیں
میں سب کے بغیر جی رہا ہوں

بن تمھارے کبھی نہیں آئی
کیا مری نیند بھی تمھاری ہے

تیرا ستم بھی تھا کرم، تیرا کرم بھی تھا ستم
بندگی تیری تیغ کو اور تری ڈھال پر سلام
اپنا کمال تھا عجب، اپنا زوال تھا عجب
اپنے کمال پر درود، اپنے زوال پر سلام

ہے وہ بےچارگی کا حال کہ ہم
ہر کسی کو سلام کر رہے ہیں

تُو نے کبھی سوچا تو ہوگا، سوچا بھی اے مست ادا
تیری ادا کی آبادی پر کتنے گھر برباد ہوئے

اب دوسرا رنگ۔

اب نغمہ طرازانِ برافروختہ اے شہر
واسوخت کہیں گے غزل انشا نہ کریں گے

یادیں ہیں یا بلوا ہے
چلتے ہیں چاقو مجھ میں
آدم، ابلیس اور خدا
کوئی نہیں یک سُو مجھ میں

نسبتِ علم ہے بہت حاکمِ وقت کو عزیز
اس نے تو کارِ جہل بھی بے علما نہیں کیا
جس کو بھی شیخ و شاہ نے حکمِ خدا دیا قرار
ہم نے نہیں کیا وہ کام، ہاں باخدا نہیں کیا

پڑے ہیں ایک گوشے میں گماں کے
بھلا ہم کیا، ہماری زندگی کیا

کوئی معنی نہیں کسی شے کے
اور اگر ہوں بھی تو میاں تب کیا

وہ درویشی جو تج کر آگیا ٹو
یہ دولت اس کی قیمت ہے؟ نہیں تو

میں تمھیں خاطر میں لاتا ہی نہیں
ہشت اے دشوار، اے آسان، ہشت

جون ایلیا کی یاد میں ہونے والی ایک گزشتہ نشست میں کچھ ذکر بشری خامیوں کا بھی ہوا۔ اس انداز میں کہ بشری خامیاں سب میں ہوتی ہیں، جون ایلیا میں بھی تھیں۔ کچھ ایسے جملے ادا کیے گئے جن سے کچھ منفی اور ناگوار تاثر اُبھرتا تھا۔ مجھے صرف یہ سوال کرنا ہے کہ کیا کسی شاعر پر گفت گو کرتے وقت یا اس کے فنی مقام کا تعین کرتے وقت اس کی ذاتی یا بشری کم زوریوں کو کلیدی حیثیت دی جاسکتی ہے؟ پھر یہ بھی ہے کہ شیر افگن بننے کے لیے بھی شیر کا جگر درکار ہوتا ہے۔ جنگ کا لطف اس وقت آتا ہے، جب دونوں حریف آمنے سامنے ہوں اور انھیں ایک دوسرے کو لہو لہان کرنے کے یک ساں مواقع حاصل ہوں۔ ہاں، یہ دُرست ہے کہ کوئی بھی بشر کم زوریوں سے مبرا نہیں۔ خدائے سخن، میر تقی میر، نجم الدولہ، دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں غالب، اور حکیم الامت، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال بھی مبرا نہیں تھے۔ یاد کیجیے، کیسے کیسے ناقابلِ یقین واقعات

اُن سے منسوب ہیں لیکن اس کے باوجود سب ہمارے لیے محترم ہیں۔
سب کو اپنے اپنے دامن میں جھانکنا چاہیے۔ جون ایلیا میں بھی اتنی ہی کم زوریاں رہی ہوں گی جتنی دوسروں میں ہوتی ہیں۔ دراصل، بھائی جون مصلحت پسند آدمی نہیں تھے۔ ان کی راست گفتاری نے بھی انھیں نقصان پہنچایا۔ پھر اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ جون ایلیا کی زمانے سے بیزاری میں زمانے کی معاندانہ یا حریفانہ چالوں کا کتنا دخل تھا، بہ قول بھائی حسن عابد۔

ہم نے چاہا تو نہ تھا اس سے اُلجھنا لیکن
اس کو کیا کہیے، وہ ہر چال حریفانہ چلے

یہ ایک عجیب قلم رو ہے۔ بدگوئی، حسد اور غیبت یہاں سکہ رائج الوقت ہے۔ خود پسندی اور تعلّی کا اس قدر غلبہ ہے کہ ہر ایک بہ زعم خود مَلک الشعرا کی مَسند پر فائز ہے۔ ستایشِ باہمی اور پبلک ریلیشنگ کے ذریعے شہرت 'کمانے' کا رواج عام ہے۔
ایک دیوانہ جون ایلیا تھا کہ اُلٹا لوگوں کو ناراض کرتا رہتا تھا۔ یہ دیوانہ مصلحت پسندانہ خردمندی سے محروم تھا۔ میں اس دیوانے کو محبوب رکھتا ہوں اس لیے کہ وہ بے سمت سخن وری کا قائل نہیں تھا۔
اس لیے کہ وہ کائنات کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں گردش کرنے والے سوالات اشعار کی زبان میں بیان کرتا تھا۔
اس لیے کہ وہ ناانصافیوں اور دُکھوں سے بھرے اس جہانِ خراب میں بے کس اور تہی دست لوگوں کا ہم نوا تھا۔
اُس نے یہاں آکر اپنی جنون خیزیوں کی دُھن پر والہانہ رقص کیا اور ایک دن اپنے سوالوں کا بوجھ اُٹھائے زمین کے اندر جا سویا۔ اُس کے احساسات میں مجھے اپنے احساسات کا عکس نظر آتا ہے، اس لیے میں اُسے محبوب رکھتا ہوں۔

ایک عظیم شاعر

احمد حسین صدیقی

کس قدر دکھ ہے کہ آج ہم جون ایلیا کو مرحوم کی حیثیت سے یاد کر رہے ہیں۔ موت تو برحق ہے، جس نے اس دارِ فانی میں قدم رکھا ہے اسے ایک دن اس سے واپس بھی ضرور جانا ہے۔ دنیا تو ایک مسافر خانہ ہے جس میں عدم کے مسافر کچھ دیر ستانے کے لیے ٹھیر جاتے ہیں، جن کی جدائی کا احساس انتہائی غم ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ان ہی لوگوں میں ہمارے جون ایلیا بھی تھے جو ہزاروں چاہنے والوں کو سوگ وار چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ یہی مشیتِ ایزدی تھی، انسان یہیں آ کر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب جون ایلیا ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ انھیں اب صرف یادوں کی بستی میں دیکھا اور تلاش کیا جا سکتا ہے۔

جون ایلیا نے امروہہ کی چھوٹی سی مردم خیز بستی میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ وہ بستی ہے جہاں صوفیائے کرام نے اسلام کی روشنی پھیلانے میں اہم خدمات انجام دیں۔ اسی بستی کو صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ کہلانے کا اعزاز حاصل ہے، اس بستی نے ہر شعبۂ زندگی کے باکمال لوگ پیدا کیے اور اس کے چپے چپے پر اولیائے کرام کے مزار پُر انوار ہیں۔ ان ہی مزارات میں ایک مزار پُر انوار حضرت شرف الدین شاہ ولایت کا ہے۔ جون ایلیا کا سلسلۂ نسب ان ہی بزرگ صوفی حضرت شرف الدین شاہ ولایت سے ملتا ہے۔ ایک طرف ان بزرگانِ دین اور یہاں کے دارالعلوم کی وجہ سے امروہہ کا نام روشن ہوا تو دوسری طرف یہاں کے ادیبوں، شاعروں، مصوروں، مجسمہ سازوں اور شعبۂ حیات کے دوسرے دانش وروں نے امروہہ کا نام روشن کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں کے مختلف دارالعلوم کو

فارسی، عربی ادب اور حدیث کی تعلیم کے لیے منفرد مقام حاصل رہا ہے۔ برصغیر کے بے شمار علما یہیں سے فارغ التحصیل ہوکر آج بھی بنگال، آسام، پنجاب، سرحد میں اور برصغیر سے باہر تشنگانِ علم کی پیاس بجھا رہے ہیں۔

جون ایلیا 14 دسمبر 1931ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ جون، کا تعلق امروہہ کے ایک ایسے خاندان سے تھا جو کئی پشتوں سے دادِ سخن وری دے رہا تھا۔ ان کے والد علامہ شفیق حسن ایلیا ایک عالمِ باعمل تھے اور فارسی، عربی، عبرانی، سنسکرت اور انگریزی پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی اولاد کی ایسی پرورش کی اور انھیں ایسی اعلیٰ درجے کی تعلیم سے روشناس کرایا کہ آج ان کے فرزند بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ جون ایلیا کے ایک بھائی سیّد محمد تقی ایک نام ور فلسفی تھے، دوسرے بھائی رئیس امروہوی جو صحافی بھی تھے، شاعر بھی تھے، محقق بھی تھے اور معروف دانش ور بھی۔ جون ایلیا نے جب ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تو وہ کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔

جون ایلیا نے ابتدائی تعلیم محلے کے مدرسے میں حاصل کی۔ دارالعلوم ملانہ سے منطق اور فلسفے میں فضیلت کی اور دارالعلوم چلہ سے آداب اللغتہ العربیہ کا درس لیا۔ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام میں لکھا ہے کہ وہ عربی ادب اور فلسفے میں امروہہ کے علمائے دیوبند کے شاگرد ہیں۔ اتنا پڑھنے کے بعد بھی جون ایلیا کی علمی پیاس نہ بجھ سکی تو دارالعلوم سیّدالمدارس میں منقولات سے فراغت پائی اور سیّدالافاضل کی سند حاصل کی۔ اسی دوران انھوں نے الٰہ آباد بورڈ سے کامل فارسی اور مولوی عالم کے دو امتحانات پاس کیے۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ پاکستان آئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔

جون، نے جو کچھ بھی علم حاصل کیا انھوں نے اس کا مصرف درس و تدریس کے مہذب پیشے کو بہتر سمجھا۔ تعلیم سے کچھ فراغت ملی تو انھوں نے امروہہ میں عربی اور فلسفے کا درس دینے سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ کراچی میں انھوں نے 'ادارۂ ذہنِ جدید' قائم کیا اور ایک علمی ماہ نامہ 'انشا' جاری کیا۔ اُردو ترقی بورڈ کی دعوت پر وہ آٹھ سال تک ترقی بورڈ میں لغت نویس کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ جون ایلیا نے اسماعیلیوں کے عالمی مرکز میں باطنی فلسفے، تاریخِ مذاہب اور تاریخِ عرب قبلِ اسلام پر بھی کام کیا۔

جون ایلیا نے بہت سی کتابوں کے ترجمے مختلف اداروں کے لیے کیے جو چھپ بھی چکے ہیں۔ ان کی تقریباً بیس بائیس کتابوں میں 'مسیح بغداد، حلاج'، قاطیغوریاس (Categories)، 'مطالعہ طواسین'، 'جوہرِ عقلی'، 'عدد (Number)'، 'مسائل تجرید' شامل ہیں۔

جون ایلیا ایک بہترین ڈراما نگار اور نثر لکھنے والے تھے۔ ان کے انشائیے اُردو زبان و بیان اور علم و فکر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اگر چہ ان کی زندگی میں صرف ایک ہی شعری مجموعہ 'شاید' شایع ہوا مگر ان کی غزلوں اور نظموں کی اتنی تعداد ہے کہ کئی شعری مجموعے شایع ہو سکتے ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ 'یعنی' کے عنوان سے طباعت کے مراحل میں تھا لیکن زندگی نے وفا نہیں کی اور ان کا یہ مجموعۂ کلام جون ایلیا کی زندگی میں نہ چھپ سکا۔ جون بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ بیسویں صدی کے عظیم اور معتبر شاعروں کا جب جب تذکرہ لکھا جائے گا جون ایلیا کے عہد ساز تذکرے سے صرفِ نظر ممکن نہیں ہوگا۔ جون ایلیا ہمارے عہد کے اعلیٰ علمی، شعری اور ادبی روایات کے ورثہ دار تھے۔

دبئی میں جون ایلیا کا جشن بھی بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ اس موقع پر ایک مجلّہ بھی شایع ہوا جس میں سیکڑوں تنقیدی مضامین جون پر لکھے گئے۔ چند سال قبل انجمن ساداتِ امروہہ پاکستان نے ایک انوکھے انداز سے ایک ادبی عدالت قائم کر کے جون پر مقدمہ چلایا جس میں جون کی شاعری پر مختلف اعتراضات کے بارے میں پاکستان کے بڑے بڑے ناقدین اور مفکرین نے جون کا دفاع کرتے ہوئے تمام الزامات کو غلط ثابت کیا اور جون کو اس عہد کا بڑا شاعر قرار دیا۔

جون نے شعر و سخن اور ادب میں جو خدمات انجام دیں اس کا صلہ انھیں وہ نہ مل سکا جس کے وہ حق دار تھے۔ ان کی زندگی کا سارا سفر نشیب و فراز طے کرتے گزر گیا۔ اکتوبر 1970ء میں جون ایلیا کی زاہدہ حنا سے شادی ہوئی۔ یہ شادی دونوں کی پسند سے ہوئی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکی اور آخر 1990ء میں دونوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ اس علیحدگی کے بعد تو ان کے رہنے کا کوئی ٹھکانا رہا اور نہ انھیں کوئی پوچھنے والا رہا، وہ بالکل لاوارث ہو کر رہ گئے تھے۔ جون کے چاہنے والے بھی ایک ایک، دو دو کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ پہلے ان کے برادر بزرگ رئیس امروہوی اور

پھر سیّد محمد تقی کا ساتھ چھوٹ گیا۔ زندگی کے آخری دنوں میں یہ غم رسیدہ شاعر اپنی حسین یادوں کو یاد کر کے زار و قطار روتا رہا، تنہائی کی کرب ناک اذیتوں سے گھبرا کر دوستوں کو دادرسی کے لیے بلاتا رہا اور سب اس کی داستان تو سنتے رہے لیکن دلاسا دینے کے لیے کوئی آگے نہ بڑھا۔

رہ گزرِ خیال میں دوش بہ دوش تھے جو لوگ
وقت کی گرد باد میں جانے کہاں بکھر گئے
شام ہے کتنی بے تپاک، شہر ہے کتنا سہم ناک
ہم نفسو! کہاں ہو تم، جانے یہ سب کدھر گئے

ان کی بے بسی دیکھیے، کہتے ہیں۔

آپ میں جون ایلیا سوچیے اب دھرا ہے کیا
آپ بھی اب سدھاریے آپ کے چارہ گر گئے

ناگہانی دکھ اور پریشانیوں میں جون کی صحت نے جواب دے دیا۔ دوسرے تنہائی ان کے لیے عذابِ جان بن کر رہ گئی تھی۔ آخر میں سانس کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور اسی مرض میں 8 نومبر 2002ء کی شب دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

جون ایلیا سے میری سرسری ملاقاتیں پچاس کی دہائی میں امروہہ کے پر فضا مقام بانواڑی تالاب کے کنارے ہوا کرتی تھیں۔ یہ تالاب جس کی تصویر میں نے اپنی کتاب 'کشورِ اولیا امروہہ' کے سرورق پر دی ہے، مراد آباد سے بجنور جانے والی شاہراہ کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اس کے مغرب میں آموں کے گھنے باغات ہیں۔ اس روڈ کے دونوں طرف دو دو فرلانگ کے فاصلے پر برساتی پانی کی نکاسی کے لیے چھوٹی چھوٹی پلیائیں بنی ہوئی ہیں۔ برسات کا پانی انھی پلیوں سے گزرتا ہوا تالاب میں چلا جاتا تھا۔ جون کا معمول تھا کہ ہر روز شام کو ٹہلتے ہوئے اس تالاب کے کنارے پر آ کر ایک پلیا پر بیٹھ جاتے تھے۔

جون، کو ہمیشہ سے قدرتی مناظر سے بڑا لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے امروہہ کی بان، کرولا سوت اور متعدد ندیوں کو بھی اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ امروہہ کے زمانے میں ان سے میری یہ چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ملک تقسیم ہوا تو رشتے بھی تقسیم ہوئے،

عزیز واقارب واحباب بھی بچھڑ گئے اور کچھ پتا نہ چل سکا کہ کون کہاں گیا اور کون کس جگہ جا بسا۔
اس کے بعد میں کراچی آ گیا۔ یہاں آنے کے بہت عرصے بعد معلوم ہوا کہ جون
بھی کراچی آ گئے ہیں لیکن بہت دنوں تک ان سے ملاقات کا موقع میسر نہیں آیا۔ پاکستان
آنے کے بعد میری ان سے پہلی ملاقات اسّی کی دہائی میں اس وقت ہوئی جب میں
محکمہ بلڈنگ کنٹرول میں کنٹرولر آف بلڈنگ تھا۔ ایک دن وہ میرے پاس سلطان
(صادقین مرحوم کے بھتیجے) کے ساتھ میرے دفتر آ گئے۔ سلام دعا کے بعد انھوں نے مجھے
ایک رسالہ 'علامت' ستمبر 1987ء کا شمارہ دیا۔ اس رسالے میں صادقین مرحوم کے اپنے
ہاتھ سے لکھی ہوئی خودنوشت جوں کی توں قسطوں میں چھپ رہی تھی۔ اس خودنوشت میں
بھائی صادقین نے میرے بڑے بھائی محمد حسین اور میرے دادا دادی کا بھی ذکر کیا ہے۔
میرا خیال ہے کہ خودنوشت میں بھائی صاحب کا ذکر دیکھ کر شاید انھوں نے سلطان سے
میرے متعلق پوچھا ہوگا۔ سلطان میرے پاس آتا جاتا رہتا تھا لہٰذا اسی کے ساتھ وہ میرے
پاس آئے تھے۔ اس کے بعد گاہے بہ گاہے ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ، جو برسوں سے منقطع
ہو چکا تھا پھر شروع ہو گیا۔ جون صاحب کو میں ہمیشہ بھائی جون کہہ کر مخاطب ہوتا تھا اور وہ
مجھے کبھی کبھی پیار میں بالے کہہ کر پکارتے۔ میری خودنوشت 'سیاحتِ ماضی' کے بعد تو
ملاقاتوں کا یہ سلسلہ پھر ہفتوں سے دنوں میں ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ گاندھی گارڈن
کے قریب پرانے بنگلے میں رہتے تھے۔ میں ہفتے میں ایک دو بار ان کے پاس ضرور جاتا تھا۔
ان کے قریب تر ہونے کے بعد آہستہ آہستہ مجھے ان کے نجی حالات کا بھی علم ہونے لگا جن
کا ذکر کبھی کبھی وہ خود ہی کیا کرتے تھے۔ ان حالات سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ اب
ان سے دلی محبت اور خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ بیوی بچوں سے ناتا برائے نام تھا۔
بھائی جون کو یہ علم تھا کہ زاہدہ حنا سے بھی میری اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

دکھوں، پریشانیوں کے لامتناہی سلسلے سے بھائی جون کی صحت روز بہ روز گرتی چلی
جا رہی تھی۔ گارڈن کا یہ بنگلا سیّد محمد تقی، رئیس امروہوی، عباس اور جون ایلیا ان چاروں
بھائیوں کی ملکیت میں تھا۔ یہ بنگلا جہاں رات دن ادبی چرچے ہوتے اور محفلیں جمتی تھیں
دیکھتے ہی دیکھتے ویران ہو گیا۔ پہلے اسی بنگلے میں رئیس امروہوی کو شہید کیا گیا۔ پھر اس

بنگلے کو فروخت کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تقریباً ڈھائی کروڑ روپے میں اسے فروخت کر دیا گیا۔ رقم کی ادائیگی کے لیے یہ طے پایا کہ جتنے حصے کا قبضہ دیا جائے تو اس حصے کی رقم ادا کی جائے گی۔ اصولاً تو پورے بنگلے کا قبضہ دیا جاتا ہے اور اس کی رقم چاروں بھائیوں میں تقسیم ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پہلے سیّد محمد تقی نے اپنے حصے کا قبضہ دیا اور کچھ رقم لے کر ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں مکان لے لیا اور اور اپنے ایک بھائی عباس کو لے کر وہیں رہائش اختیار کر لی۔ اب آدھا مکان خالی پڑا تھا اور آدھے مکان میں جون، رئیس امروہوی کی بیوہ اور ان کا غالباً ایک داماد اور اس کے بیوی بچے رہ گئے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد سب نے ہی گھر کا قبضہ دے دیا اور باقی ماندہ رقم وصول کر لی۔ اس رقم میں سے جون ایلیا کو غالباً پچاس لاکھ ملے تھے۔ قمر رضی جون ایلیا سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اور ان کے قریب جتنا قمر رضی تھے اور کوئی نہیں تھا۔

قمر رضی اور میں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جون ایلیا کا پیسا کہیں غتر بود نہ ہو جائے۔ چناں چہ ہم دونوں نے مل کر بھائی جون کو مشورہ دیا کہ وہ اس رقم کا کچھ حصہ فکسڈ ڈیپازٹ کر دیں اور باقی کے ڈیفنس سرٹیفکیٹ لے لیں۔ بات سمجھ میں آ گئی تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ابتدا میں یہ سرٹیفکیٹ قمر رضی نے اپنے پاس رکھے لیکن تھوڑے دنوں بعد قمر رضی نے میرے سامنے یہ سارے سرٹیفکیٹ جون کے حوالے کر دیے۔ اب وہ بالکل تنہا ہو چکے تھے، رہائش مسئلہ بھی تھا۔ ان کے ایک شاگرد نے بفرزون میں ایک کمرا کرائے پر لیا اور بھائی جون وہاں منتقل ہو گئے۔ میں اور قمر رضی انھیں دیکھنے ان کے پاس گئے۔ کمرا کیا تھا کوئی اندھیری کوٹھری تھی جس کے فرش اور دیواروں پر سیلن، ٹین کا ٹوٹا پھوٹا دروازہ، نہ بیٹھنے اُٹھنے کی ڈھنگ کی جگہ تھی۔ ایسا حال دیکھ کر مجھے اور قمر رضی کو بے حد دکھ ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ فیڈرل بی ایریا بلاک 10 میں علی کرار صاحب کے گھر آ گئے۔ علی کرار صاحب نے انھیں ایک کمرا دے دیا جس کا کرایہ اور اپنی خوراک کا خرچ بھائی جون برابر دیتے رہے۔ رہنے کا ٹھکانا تو مل گیا لیکن سکون میسر یہاں بھی نہ آیا۔ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو تنہا رہ کر زندگی گزار سکے۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا کوئی ساتھی، کوئی ہم درد ایسا ہو جس کے سہارے زندگی کا سفر طے کر سکے۔ بھائی جون بھی یہی چاہتے تھے لیکن انھیں ایسا

کوئی ساتھی نہ ملا۔ جو ملا تھا وہ ساتھ چھوڑ گیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے سب ملنے جلنے والوں سے دوسری شادی کرانے کے لیے کہنے لگے۔ میں نے ایک دن صرف اتنا ہی کہا تھا بھائی جون اب اس عمر میں شادی کیا کرو گے۔ تمھارے پاس بہت پیسا ہے، آرام سے رہو۔ اتنا کہنا تھا کہ اول فول بکنے لگے۔ بار بار کہتے تو نہیں چاہتا کہ میری شادی ہو جائے۔ اگر تو چاہے تو چوبیس گھنٹے میں میری شادی ہو سکتی ہے۔ وہ میرے بڑے بھائی تھے، ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔

ان باتوں کا آج بھی خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں بھائی جون کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس دکھوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ چند روزہ زندگی میں کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرلیا جائے تو کم از کم یہ پچھتاوا تو نہ ہو کہ ہم نے قدر ہی نہیں کی۔ آج بڑی ملامت محسوس ہوتی ہے کہ ہم ان کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا غافلؔ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

جون ایلیا کا مقدمہ

احمد عقیل روبی

جون ایلیا کی شاعری نے علم، مذہب، تاریخ، منطق، فلسفے کی مدھم، سریلی اور دل نشین سرگوشیاں سُن کر آنکھ کھولی۔ اس نے ایک ایسے گھر میں پرورش پائی ہے جہاں عطارد، مریخ اور مشتری کے ذکر سے ناشتا ہوتا تھا اور انکسا گورا، پیتھا گورا، سقراط اور افلاطون کھانے کے دستر خوان پر آمنے سامنے بیٹھ کر گفت گو کرتے تھے۔ جون ایلیا ان مباحث کے نتائج چن چن کر اپنا پیٹ بھرتا تھا اور اپنی ذات کے اردگرد نرگسیت کا ایک حاشیہ بناتا رہتا تھا۔ فلسفہ، تاریخ، منطق، علم باطن اور علم ظاہر نے جو اثرات اس کی شخصیت پر مرتب کیے اُن کا عکس اُس کی شاعری پر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان علوم وفنون نے بچپن ہی میں اس کے تخلیقی شعور کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیا تھا۔ پلوٹینس نے اپنے جسم میں اپنے ہونے کو ندامت قرار دیا تو جون ایلیا معدے کو انسانی جسم میں غیر رومانی شے سمجھنے لگا۔ اطالوی شاعر دانتے کی طرح اسے بھی آٹھ سال کی عمر میں افلاطونی عشق کا جھٹکا لگا۔ دانتے اپنے والدین کے ساتھ آٹھ سال کی عمر میں اپنی ایک ہم سن کلاس فیلو کی سال گرہ پر گیا، اس پر مرمٹا۔ جون ایلیا آٹھ سال کی عمر میں ایک لڑکی پر عاشق ہوگیا، جب وہ اس کے گھر آئی تو یہ کھانا کھا رہے تھے، فوراً لقمہ نگل لیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس لڑکی کو یہ پتا چل نہ جائے کہ جون ایلیا کے جسم میں معدے جیسی غیر رومانی چیز بھی ہے۔ فلسفے کے جن زہریلے بچھوؤں نے جون کو ڈسا۔ منطق اور دلائل کے جو جو لہجے اس کی رگ و پے میں اُترے وہ اس کی شاعری میں الفاظ کا جامہ پہن کر جلوہ نما ہوئے۔ لیکن جون ایلیا نے اس سارے تہذیبی، فلسفیانہ، منطقی اور استدلالی پس منظر کو اپنی شاعری پر بوجھ نہیں بننے دیا۔ مشہور شاعر Horace نے اپنے

ایک دوست کے شاعر بیٹے کو ایک خط میں مشورہ دیا تھا کہ۔

'دیکھو فلسفہ ضرور پڑھو مگر دھیان رہے اسے اتنا سر نہ چڑھاؤ کہ وہ ابلاغ کا راستہ روک لے۔'

جون ایلیا، پلوٹینس کو سرہانے رکھ کر سوتے ہیں مگر جب شاعری کرتے ہیں تو انداز سلیس اور سادہ ہوتا ہے۔ شعر کی پشت پر فلسفے کا بارِ گراں نہیں لادتے۔ قبلِ مسیح پیریکلیز کے زمانے میں پیریکلیز کی بیوی کے پاس بیٹھ کر انکسا گورا نے اس زمانے کی مذہبی رسوم، عبادت گاہوں اور دیوتاؤں کے بارے میں انٹ شنٹ باتیں کی تھیں۔ اب یہی انکسا گورا، جون ایلیا کے اندر بیٹھا ہے۔ رقعے لکھ لکھ کر باہر بھیج رہا ہے مگر جون کا کمال یہ ہے کہ وہ شعر اور فلسفیانہ عناصر کا یوں مرکب تیار کرتے ہیں کہ ابلاغ کی پگ ڈنڈی پر فلسفہ اور شاعری یک جا نظر آتے ہیں۔

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

جون ایلیا کا لکھا ہوا اپنے دیوان 'شاید' کا دیباچہ شاید اُردو کا ایک منفرد اور تاریخی اہمیت کا دیباچہ ہے۔ جس میں ایک شاعر کی ذہنی اور فکری تربیت اور شخصیت کی ارتقائی صورتِ حال سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ دیباچہ جون ایلیا کی علوم وفنون سے مکمل آگاہی اور فلسفہ وفکر پر گرفت پر روشنی ڈالتا ہے۔ دیباچے کے بعد جون ایلیا کا دوسرا اہم ترین نثری شاہ کار اُن کے انشائیے ہیں جو جون ایلیا ایک مدت سے لکھتے آرہے ہیں۔ جون ایلیا کے انشائیے کا اہم ترین وصف ان کا فلسفیانہ اسلوب ہے۔ ان کا استدلالی طرزِ نگارش، قدیم علوم کے تناظر میں عہدِ جدید کے مسائل کی گرہ کشائی، فکرِ قدیم اور فکرِ جدید کا تال میل، سادہ، سلیس زبان، بے ساختہ پن اور ہر جملے کی کاٹ ہے۔ وہ تمام فلسفیانہ موضوعات جو شاعری میں جگہ نہیں پا سکتے انشائیے میں گھر بنا لیتے ہیں۔ ان کے انشائیے 'لکیریں'، 'رات'، 'زمان'، 'یاوہ گوئی'، 'چھٹا دن'، 'رائگاں'، 'لکھت' اور 'برزخ' میں جملوں کی کاٹ اور تیکھا پن فرانسیسی نثر نگار والٹیئر کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ مثلاً 'فاقہ کشوں کی بستی میں جو آدمی فربہ دکھائی دے اس کے سلام کا جواب نہ دینا کہ اس کا وجود پوری بستی کے لیے ایک بدترین بداخلاقی ہے۔'

دحسن اور تناسب کو انسان کی سب سے بڑی کم زوری ہونا چاہیے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ لوگ خراب ہورہے ہیں، مسخ ہورہے ہیں۔ جس نے انھیں خراب کیا ہے، اس کا نام بھی سن لو۔ اس عیار کسبی کا نام دولت ہے۔'

جون ایلیا کی شاعری کو صرف فلسفے تک محدود کرنا انواع واقسام کے کھانوں سے سجے دستر خوان سے صرف ایک Dish کا لطف لینا ہے۔ مملکتِ شاعری کے ہر صوبے میں جون ایلیا کی عمل داری ہے۔ غزل، نظم، حمد، مرثیہ، نوحہ، قصیدہ، ایپک، قوالی، نعت، قطعہ، انشائیہ، شہر آشوب کی کون سی صنف ہے جس میں جون ایلیا نے اپنی منفرد حیثیت کو نہیں منوایا اور اختراع، تجربے، جدّت اور نئی جہت کی نشان دہی نہیں کی۔ ان کا فکری اجتہاد اور اختراع پسندی انھیں اپنے ہم عصروں سے منفرد اور ممتاز حیثیت دلاتی ہے۔

غزل میں جون ایلیا کا لہجہ چونکا دینے والا اور حیران کن ہے۔ وہ غزل کے روایتی سانچے میں رہتے ہوئے اپنے فکری اور لسانی تجربات سے ایک نئے اور اچھوتے Diction کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ باتیں جو اَب تک نہیں کہی گئیں، یا جن کے اظہار پر سماجی اور تہذیبی بندشیں تھیں۔ جون ایلیا نے ان کا کمال جرأت سے اعلان کیا۔ انسانی نفسیات کے کچھ وہ روّیے جو ذہن میں سرسراتے تھے اور باہر آنے سے گریزاں تھے، جون ایلیا انھیں بے باکی اور بے تکلفی سے صفحۂ قرطاس پر لے آئے۔ کم سنی کا الھڑ پن، مستی، شوخیاں۔ جذبوں کے کچے پکے ترش شیریں پھلوں کا ذائقہ عجیب لطف دیتا ہے۔ جون اپنے جمالیاتی، کلاسیکی رومانوی اور تہذیبی اسلوب کو ان جذبات کے اظہار میں بڑی ہنرمندی اور اُستادانہ سلیقے سے بروئے کار لاتے ہیں۔ پُر گوئی اور زود نویسی کی عادت کے باوجود ان کی لفظی اور فنی کاری گری پر کوئی اُنگلی نہیں رکھ سکتا۔

جون ایلیا کا تعلق اس خاندان سے ہے جو زبان کی تشکیل و تکمیل میں سال ہا سال سے مصروفِ کار ہے۔ بہ قول جون ایلیا زبان دانی کا دعویٰ کرنے والے ہماری چوکھٹ سے الفاظ کی بھیک مانگتے ہیں۔ جون ایلیا نے اپنی شاعری میں زبان کی تراش خراش کا کام جاری رکھا ہے۔ متروک الفاظ کا وقار بحال کرنے میں جون پیش پیش ہیں۔ غیر مانوس لفظوں کا شاعری میں استعمال، نئی نئی ردیفوں کا اجرا۔ نئی نئی تراکیب بنانا ان کی شاعرانہ

طبیعت کا معمول ہے مثلاً 'اللہ ہی دے گا، مولیٰ ہی دے گا' 'تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے۔' 'چل نکلے۔' 'شام بخیر شب بخیر۔' زبان کی سلاست اور سادہ پن اس کی شاعری کو مقبولِ عام بنانے میں بڑا مددگار ثابت ہوا ہے۔ عام طور پر جون ایلیا کے شعر کی زبان 'سنتے ہی دل میں جو اُتر جائے' والی زبان ہے۔

شرم، دہشت، جھجک، پریشانی
ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں
آپ، وہ، جی، مگر، یہ سب کیا ہے
تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں

شہر کا کیا حال ہے پوچھو خبر
آسماں کیوں لال ہے پوچھو خبر
یہ جو سناٹا ہے سارے شہر میں
کیا نیا جنجال ہے پوچھو خبر

رومانوی شعرا کی طرح جون بھی کلاسیکی ادبی روایات، زبان اور قدیم Epics کرداروں کا عاشق ہے۔ پرانے تاریخی کرداروں میں بیٹھ کر خوش ہوتا ہے۔ شیلے کو Street Fight بہت پسند تھی۔ جون ایلیا، دُکھ درد کی لذت میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ کہتے ہیں گوئٹے کا چہیتا شیلر اپنی کلائی پر زخم لگا کر نمک مرچ چھڑکتا تھا تا کہ درد کی لذت سے آشنا ہو سکے۔ جون ایلیا دن رات خون تھوک کر یہ لذت محسوس کرتا ہے۔

جون ایلیا کی ساری کی ساری شاعری گزری تہذیبوں، گئی رُتوں اور بچھڑے لوگوں کی یاد میں کہے ہوئے نوحے ہیں۔ وہ ایسا شاعر ہے جو وقت کی تپتی اینٹوں پر ایک بے چین بلی کی طرح گئے دنوں کی تلاش میں پاؤں سہلاتا پھر رہا ہے۔ وہ ایسا جہاں گرد ہے جسے اپنے کھوئے جزیرے کی تلاش ہے اور نئے جزیرے کی فضا میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔

اے وحشتو! مجھے اسی وادی میں لے چلو
یہ کون لوگ ہیں، کہاں آ گیا ہوں میں

امروہے کی حویلی اس کی گم شدہ کائنات ہے حویلی کے دالان کے کمرے، غلام گردشیں، دربارِ شاہ ولایت، عیدگاہ، شاہ ولایت کی وہ دیوار جہاں رئیس امروہوی اسے بھول آئے تھے جب جون ایک سال کا تھا۔ یہ سب کچھ، یہ سب یادیں، اس کی تاریک اور اندھی زندگی میں جلتی قندیلیں ہیں جن کی روشنی میں وہ باقی زندگی کا سفر طے کرتا رہا۔ اُس کی گفت گو، اس کی نثر، اس کی شاعری میں یہی یادیں، یہی تصویریں رقص کناں ہیں۔ وہ جاگتا، سوتا، اُٹھتا، بیٹھتا انھی سے ہم کلام رہتا۔ ولی سے لے کر آج تک شاعروں میں جون ایلیا واحد شاعر ہے، زندگی جس کے سینے پر بیٹھ کر پتھر کوٹ رہی ہے۔ پتھر کوٹ کوٹ کر تھک جاتی ہے تو پیاس بجھانے کے لیے اس کا خون پیتی ہے اور پھر کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جون اس کے سامنے بے بس ہے، اکیلا ہے۔ درد والم کے شکاری کتے اس کے تعاقب میں ہیں اور وہ معصوم بدحواس خرگوش کی طرح جان بچاتا پھر رہا ہے اور زندگی کے موجودہ روّیے سے ڈر کر اکثر ان یادوں کی چادر اوڑھ کر چند لمحے ستا لیتا ہے۔ اس نیند میں وہ خواب گھیر کر اسے گم شدہ وادیوں میں لے جاتے ہیں جنھیں وہ حقیقت کی زندگی میں ڈھونڈتا ہے۔

شاعر، فلسفی، انشا نگار، مترجم، کہانی کار اور گفت گو کو جادو اثر بنانے والے انگریزی شاعر کولرج کے بارے میں انگریزی شاعری Hazillit اپنے ایک مضمون 'شاعروں سے میری پہلی ملاقات' میں کہتا ہے کہ جب کولرج باتیں کرتا ہوا پہاڑی راستے سے گزرتا تھا تو بادل اس کے کاندھے پر جھک کر اور Harmer پہاڑ قریب آ کر اس کی باتیں سنتا تھا۔ جون کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، وہ بھی جب بولتا تھا تو اس کی باتیں سبھی منظر سنا کرتے تھے۔ جون ایلیا آج ہم میں موجود نہیں لیکن وہ موجود نہ ہوتے ہوئے بھی ہم میں، ہمارے دل میں رہتا ہے۔ اس کی باتیں، اس کی شاعری، اس کی عجیب و غریب زندگی ہمیں اس کے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

جون ایلیا

احمد ندیم قاسمی

جون ایلیا اپنے معاصرین سے نہایت درجہ مختلف اور انتہائی منفرد شاعر ہے۔ اس کی شاعری پر یقیناً اُردو، فارسی، عربی شاعری کی روشن روایات کی چھوٹ پڑ رہی ہے مگر وہ ان کی روایات کا استعمال بھی اتنے انوکھے اور رسیلے انداز میں کرتا ہے کہ بیسویں صدی کے آخری نصف میں ہونے والی اُردو شاعری میں اس کی آواز نہایت آسانی سے الگ پہچانی جا سکتی ہے۔ صرف صاف ستھرے اور منجھے ہوئے ذوقِ شعر اور بے داغ بے تعصبی کی ضرورت ہے۔

میرے سامنے اس وقت جون کی صرف غزلیہ شاعری ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس کی نظم 'شاید' کے اُن الفاظ پر بھی کچھ کہوں کہ۔

تمھارے اس طرح ہر لمحہ یاد آنے سے
دل سہما ہوا سا ہے

یا نظم 'شہر آشوب' کے اس نوع کے خیالات و جذبات کو بھی اپنا موضوع بناؤں کہ۔

جو رَد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اِس زمانے میں

یا پھر جون کی نظم 'دو آوازیں' کی ہمہ جہتی انقلابی گونج کا تجزیہ کروں مگر اس وقت مجھے جون کی غزل نے اس شدت سے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ میں اس کی صرف غزل پر نہایت مختصر اظہارِ خیال کرنے پر اکتفا کرتا ہوں اور اس کی تنقید و تحسین سے زیادہ اس کے

بے شمار منتخب اشعار سے آٹھویں دسویں بار پھر سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔
صرف اس نکتے پر غور کرنے سے بہت دل چسپ نتائج سامنے آئیں گے کہ اُردو شاعری کی سہ صد سالہ تاریخ میں کسی نے اس لہجے کے، اس مفہوم کے، اس نشتریت سے مملو شعر کم ہی کہے ہوں گے۔

کل دوپہر عجیب سی اک بے دلی رہی
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں

صبح اس کو وداع کر کے میں
نصف شب تک پھرا ہوں آوارہ

میں کہ رہتا ہوں بصد ناز گریزاں تجھ سے
تُو نہ ہوگا تو بہت یاد کروں گا تجھ کو

اس سراپا وفا کی فرقت میں
خواہشِ غیر کیوں ستاتی ہے
کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

نہ کرو بحث ہار جاؤ گی
حسن اتنی بڑی دلیل نہیں

سر ہی اب پھوڑیے ندامت میں
نیند آنے لگی ہے فرقت میں

میں آپ سے نہیں پوچھتا، خود اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا اس طرح کے تیوروں کی کوئی مثال موجود ہے؟ یقیناً ہوگی مگر اس تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔
اس کا مطلب یہ نہیں کہ جون ایلیا صرف فلسفہ و منطق کی باتیں کرتا ہے اور 'تغزل'

سے دست کش ہو گیا ہے۔ اس الزام کی نفی ان اشعار میں موجود ہے جو ابھی عرض کیے گئے ہیں اور ذرا اِن اشعار کی لذت بھی محسوس فرمائیے۔

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

تیرے جانے کے بعد بھی میں نے
تیری خوش بو سے گفت گو کی ہے

پھر اس گلی سے اپنا گزر چاہتا ہے دل
اب اس گلی کو کون سی بستی سے لاؤں میں

خوب ہے شوق کا یہ پہلو بھی
میں بھی برباد ہو گیا تُو بھی

جون کی غزل کے اتنے بے شمار پہلو ہیں اور ہر پہلو اتنا جان دار ہے کہ ہر شعر پر ذرا ڈوب کر غور کیجیے تو دماغ و دل کی نسیں تن جاتی ہیں۔ جون کے بعض اشعار تو ناقابلِ برداشت حد تک بے چین کر دیتے ہیں مثلاً۔

آپ اپنے سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں! سانس پھول جاتی ہے

مستقل بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

ہم نے جانا تو ہم نے یہ جانا
جو نہیں ہے وہ خوب صورت ہے

اتنا خالی تھا اندروں میرا
کچھ دنوں تو خدا رہا مجھ میں

حاصلِ 'کُن' ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

آج کا غزل گو قدیم اسلوبِ غزل سے کسی درجہ مختلف رُخوں سے مسائلِ ذات وحیات وکائنات کا جائزہ لیتا ہے۔ جون کے یہ چند اشعار ایک بلیغ مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

کیسے کہیں کہ تجھ کو بھی ہم سے ہے واسطہ کوئی
تُو نے تو ہم سے آج تک کوئی گلہ نہیں کیا

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اِک چیز ٹوٹ جاتی ہے

میں اور پاسِ وضعِ خرد کیا ہوا مجھے
میری تو آن ہی مرے دیوانہ پن میں تھی

اور پھر جون ایلیا کا وہ مرصع دوغزلہ جس نے کتنے ہی مشاعروں کو لوٹا اور کتنے ہی اہلِ ذوق کی تنہائیوں کا وظیفہ بن گیا۔ میں اس دوغزلے کے صرف چھ اشعار سے لطف اندوز ہونا اور لطف اندوز کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں متعدد بار دہرایا گیا ہے مگر کیا حرج ہے جو میں بھی دہراؤں۔

عمر گزرے گی امتحان میں کیا
داغ ہی دیں گے مجھ کو دان میں کیا
میری ہر بات بے اثر ہی رہی
نقص ہے کچھ مرے بیان میں کیا
مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا

بولتے کیوں نہیں مرے حق میں
آبلے پڑ گئے زبان میں کیا
یوں جو تکتا ہے آسمان کو تُو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا؟
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

اس دوغزلے کا ہر شعر استفہامیہ ہو یا استعجابیہ ہو، میری رائے میں نہایت درجہ ڈرامائی ہے۔ یاد آیا کہ جون نے تو اپنے بعض اشعار میں پورا ڈراما بھر دیا ہے، مثلاً ماحول کی ویرانی کا یہ منظر۔

تھی جو وہ اک تمثیلِ ماضی آخری منظر اس کا یہ تھا
پہلے اک سایہ سا نکل کے گھر سے باہر آتا ہے
اس کے بعد کئی سائے سے اس کو رخصت کرتے ہیں
پھر دیواریں ڈھے جاتی ہیں، دروازہ گر جاتا ہے

میں آخر میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ میرے پیارے جون! تم نے ایک شعر میں یہ بھی کہا ہے۔

خراشِ نغمہ سے سینہ چھلا ہوا ہے مرا
فُغاں کہ ترک نہ کی نغمہ پروری میں نے

اور میں دعا کرتا ہوں کہ تم نغمہ پروری کبھی ترک نہ کرسکو اور اگر ترک کرو گے تو یاد رکھو کہ قدرت نے تمھیں تخلیقِ فن کی بے پناہ صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں اور تم ناشکرے پن کا ارتکاب نہیں کرسکو گے اور میری دعا ہے کہ تمھارا سینہ خراشِ نغمہ سے ہمیشہ چھلا رہے۔

یوحنّا ایلیا
اور اُس کے چار ہم دَم

اسد محمد خاں

پگڑی کی طرح اپنے سر سے ہرے ہرے نرم کانٹوں کا دائرہ لپیٹے' سوکھے بدن پر ارغوانی رنگ کا ٹاٹ اوڑھے' پیروں سے مُونجھ کی سینڈلیں باندھے' بالسا وُڈ[1] کی لمبی صلیب گھسیٹتا ہوا اب جو وہ اپنے گھر سے نکلا ہے تو ایک ایک رفیق کے دروازے پر دستک دیتا چلا جائے گا کہ اے رفیق! 'الاسد'[2] اپنے مکان سے باہر آ اور اے 'جاننے والے'[3] کچھ قدم میرے ساتھ چل اور اے 'ایلی پاک دامن'[4] اے 'کشادہ دل حبیب' میری پیشانی کو بوسہ دے اور اے 'جانِ برادر'[5] الوداع کہہ اور واویلا کر کہ میں اپنی صلیب اُٹھائے اپنے مقتل کو جاتا ہوں۔

اس وقت صبح کے نو بجے ہوں گے۔

سو اس کی آواز کے اسیر' اس کے یہ چاروں ہم دَم اس کے ہم راہ ہولیں گے۔ وہ گریہ وزاری کرتا' نو بجے کی شاہ راہوں سے گزرتا ہر چورستے میں ان رفیقوں کی پیشانیوں کو بوسے دے گا اور بغل گیر ہوتے وقت صحیح ٹائمنگ سے لڑکھڑائے گا۔ بازار میں پہنچ کر وہ ہر بقال' ہر آہن گر' ہر جفت ساز کو دیکھ کر سینہ زنی کرے گا پھر اُن کے لفظوں پر اعراب لگاتا آگے بڑھ جائے گا۔

---

[1] Balsa Wood استوائی امریکا کے جنگلوں سے حاصل ہونے والی لکڑی جو بہت ہلکی ہوتی ہے۔ اس سے کھلونے بنائے جاتے ہیں۔ گویا یہ صلیب جعلی ہے۔ [2] یہ عاجز جو بیان کر رہا ہے۔

[3] عبیداللہ علیم۔ [4] کنور اطہر علی خان اطہر نفیس جو اس تمثیل میں کشادہ دل دوست کا گویا یسوع ناصری کے رفیق پطرس (Peter) کا کردار ادا کر رہا ہے۔ [5] بھائی بچھن' جون ایلیا کے برادر بزرگ' سیّد محمد عباس۔

صبح کے دس بجنے والے ہوں گے......

کہ وہ شہیدوں کے چوک میں پہنچ کر دیوقامت کرونوگراف[1] کے سائے میں دم لے گا اور ٹھیک دس بجے جب کہ کرونوگراف Beeps سنا تا ہوگا' وہ اپنی لنگوٹی سے شیشے کے ٹکڑے نکال کر منھ میں بھر لے گا۔ پھر اپنی 'شیشہ چباتی ہوئی آواز'[2] میں پکارے گا کہ ہلاکت ہو' تم پر ہلاکت ہو۔ اے بے مہر ساعتو اور واویلا مچے اور اے ان ساعتوں میں زندگی کرنے والو' تمھارے گھر بے چراغ ٹھیریں اور تمھارے تاکستانوں پر سرخ چونٹیوں کی یلغار ہو کہ وہ غول غول ہو کر آئیں اور تمھارے نخلستانوں کو بادِ سموم جھلس دے اور تمھارے گلّے ریگستانی بھیڑیوں کی خوراک بنیں اور تمھاری گابھن اونٹنیوں کے پستان خزاں رسیدہ پتوں کی مانند خم ہو جائیں۔

لفظ 'پستان' کو وہ شیشے کے ساتھ چبا چبا کر دیر تک منھ میں گھولتا رہے گا' پھر کہے گا کہ ہلاکت ہو اور تم پر واویلا مچے کہ میں' یوحنا ایلیاہ...... آنسوؤں سے بپتسمہ دینے والا' اپنی صلیب کے بوجھ سے کراہتا ہوا آج اپنے مقتل کو جاتا ہوں۔

یہاں وہ کراہ کر دکھائے گا یا آہ بھرے گا' پھر کہے گا کہ:

ہلاکت ہو' تم سب پر ہلاکت ہو کہ میرے آئندہ میں تم اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے کس لیے کہ آج کے بعد سے تم چوتھی ڈائمینشن میں زندہ رہو گے۔ واویلا ہو کہ آج مَیں تمھارے سوگ میں ہوں۔ پھر 'جاننے والے' سے کہے گا کہ اے بھائی سُن! میرے سر پر تھوڑی خاک ڈال دے کہ میں تو اب ہر موجود کے سوگ میں ہوں۔ تس پہ 'جاننے والا' اپنی جیب سے صندل کے برادے کا شیشہ نکال کر چٹکی بھر سفوف اس کے سر پر چھڑکے گا اور کہے گا کہ

یوحنا! خاک تو فنا بھی ہے اور نمو کا وعدہ بھی اور وہ دوہتڑ مار کر گریہ وزاری کرے گا۔ پھر نقلی صلیب والا کہے گا' اے الاسد! تُو دوکوہان کے اونٹ کی طرح بخیل کیوں ہے؟ تیرے رفیق تیرا ماتم کریں' تُو میری چھاتی سے لگ کر بین کیوں نہیں کرتا؟ اور اے 'ایلی پاک دامن!' اے فتنہ قامت! میری پیشانی پر بوسے دینا بند کر دے کہ تیرے لعابِ دہن کی ٹھنڈک

---

[1] Chronograph (وقت نگار) وہ آلہ جو واقعات/حادثات کے ہونے کا صحیح وقت بتائے اور رکارڈ کرے۔

[2] خود جون کی نظموں سے مستعار لی ہوئی Expression ہے۔

میرے غم کی آگ کو کہیں بُجھا نہ دے اور ' اے جانِ برادر!' تو یہ گریہ وزاری لپیٹ ہی لے اور بہتر دریچوں والے گھر[1] کو لوٹ جا کہ آج ہول ناک داستانیں رقم ہونے کا دن ہے۔

سو جانِ برادر، خوشی خوشی گھر لوٹ جائے گا۔

اس وقت دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور وہ سب کے سب سائے میں ٹھیر جائیں گے۔

(وہ لمبی صلیب والا اور اس کے تینوں رفیق سائے میں ٹھیر جائیں گے۔)

(وہ سائے میں ٹھیر جائیں گے۔)

دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے کھدیڑے ہوئے گروہ کرونوگراف کے مہیب سائے سے بچتے' کتراتے ہوئے گزرتے ہوں گے۔ وہ اس کی صلیب کو چھوتے ہوئے گزریں گے' مگران کے لیے اس کی آواز کی کمندیں کوتاہ ٹھیریں گی۔ وہ اسے ہونٹ ہلاتے اور جبڑوں کی ہڈیاں کٹکٹاتے ہوئے تو دیکھیں گے مگر اس کی آواز نہیں سُن پائیں گے' سو بڑی بیزاری سے منھ پھیر کر اپنے اپنے 'مٹھی بھر جَو' سنبھالتے ہوئے تیزی سے گزر جائیں گے۔ ان کو تو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ لمبی صلیب والے کی بددعائیں اور بشارتیں اُنھی کے لیے ہیں۔ ان کو جاننے کے اس عذاب سے پناہ ملے گی۔ مگر اس ایک عذاب کے سوا ان کے گروہ' پیٹ کی بھوک اور برہنگی اور شہوت کی چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے سب عذاب سہیں گے۔

تو پھر یوں ہوگا کہ لمبی صلیب والے کی ساری بددعائیں اور تمام بشارتیں بے ہدف بومرینگ[2] کی طرح ہوا میں سنسناتی اور سیٹیاں بجاتی واپس لوٹ آئیں گی اور خود اُس پر اور اُن پر آن گریں گی جو اُس کے قریب سائے میں کھڑے ہوں گے۔

مگر وہ تینوں تو اس کے رفیق ہوں گے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ اس نقلی صلیب والے کی مخبری کر دے اور اسے پکڑ وا دے۔

ہر چند کہ وہ کفر پہنے ہوگا اور کفر بکتا ہوگا اور کفر سوچتا ہوگا۔

---

[1] بہتر دریچوں والا گھر' جو گارڈن ایسٹ میں تھا' جہاں کبھی جون رہتا تھا۔

[2] Boomerang آسٹریلیا کے باشندوں کا قدیم ہتھیار جو پھینکنے والے کے پاس لوٹ آتا ہے۔

(وہ کفر سوچتا ہوگا۔)

اُس وقت وہ اپنی صلیب سے ٹیک لگائے' سر نیہوڑائے سائے میں کھڑا ہوا اپنے دل کی اُمنگ میں سوچتا ہوگا کہ ارے یہ سب کچھ تو ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا کہ ناصرہ کے آسماں شکوہ نجار[1] کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اذیت طلب' اپنے اس خواب کی سرشاری میں لرزتا ہوگا اور سوچتا ہوگا کہ دیکھنا' ابھی میرے اِنھی رفیقوں میں سے ایک اپنے سائے سے نکل کر ادھر کو جائے گا جہاں صلیب پر چڑھانے والے کھڑے ہیں۔ وہ انھیں بُلا کر لائے گا اور تیسرا پہر شروع ہونے سے پہلے مجھے مضبوط کیلوں سے لکڑی پر ٹھونک دیا جائے گا۔ مگر اس سے پہلے شاید میرا رفیق 'ایلی پاک دامن' تین بار میرے ہونے سے انکار کرے گا اور بعد کو میرا رفیق 'جاننے والا' ایک سبز شاخ پر سرکے میں بھیگا ہوا اسفنج رکھ کر مجھے چسائے گا اور شاید وہ میرا رفیق الاسد ہوگا جو فی الاصل میری مخبری کرے گا اور صلیب پر چڑھانے والوں کو بُلا کر لائے گا۔

'تو اے مخبر...... الاسد! میرے یہودا' تجھے جو کچھ کرنا ہے جلد کرلے!'

درشت لہجے اور کرخت چہرے والا الاسد اپنے خیال کی معصومیت میں بڑھ کر اُس کے ارغوانی ٹاٹ کو بوسہ دے گا اور کہے گا کہ یوحنا ایلیاہ! میں تیری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں خیال میں بھی تجھ سے دغا کرنے سے باز رہا تو پھر تُو مجھے یہودا کہہ کر کیوں پکارتا ہے؟

تس پہ نقلی صلیب والا جھڑکی کھائے ہوئے بچے کی طرح ایک ایک رفیق کا منہ تکے گا اور سہمی ہوئی کم زور آواز میں پوچھے گا کہ کیا تم میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں کہ میری مخبری کر دے اور مجھے صلیب پر چڑھوا دے؟

وہ تینوں باری باری سر ہلا کر انکار کریں گے اور کہیں گے کہ نہیں یوحنا ایلیاہ، ہم تیری مخبری نہیں کرنے کے' یہ سُن کر وہ دوہتڑ مارے گا اور ذبح ہوتی بھیڑ کی طرح آواز کرے گا پھر بین کرتا ہوا عظیم چورستے کے تاریک پر لوٹیں لگائے گا اور قابو میں نہیں آئے گا۔ ہر چند کہ 'جاننے والا' روتا ہوا اُس کے ساتھ ساتھ پھرے گا اور الاسد اس کے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے مارے گا اور 'ایلی پاک دامن' محبت سے دلاسے دے گا' پھر عاجز ہو کر بیٹھ رہے گا اور جماہیاں لے گا۔

[1] نو عمری میں جناب یسوع نے بڑھئی کا کام سیکھا تھا۔

اس وقت سہ پہر کے تین بجے ہوں گے۔
تین بجے کی Beeps سُن کر حد درجہ نڈھال یوحنا رینگتا ہوا دوبارہ کرونوگراف کے سائے میں چلا جائے گا۔ تیسرے پہر کی اُداسی میں اس کا کانٹوں کا تاج مسل مسلا کر بھوسا ہو چکا ہوگا۔ ٹاٹ کا لبادہ نالی میں اس طرح پڑا ہوگا کہ اس کا کچا ارغوانی رنگ گدلے پانی میں بدرنگ لکیریں بنا کر بہتا ہوگا اور بالسا وُڈ سے تراشی ہوئی اس کی صلیب' مٹھی مٹھی بھر جُڑ لے جانے والوں کے پیروں تلے آ کر لگدی بن چکی ہوگی۔ بلاشبہ یوحنا ایلیاہ' یسوع ناصری کے کاسٹیوم کے بغیر جس قدر ننگا ہوگا' اتنا تو وہ پیدا ہوتے وقت بھی نہ تھا۔
تب سسکیاں لیتے ہوئے' جاننے والا' اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھا لے گا۔
الاسد اس کے تاج کا بھوسا اور اس کی صلیب کی لگدی پولی تھین کے ایک تھیلے میں بھر لے گا۔
'ایلی پاک دامن' نالی میں ہاتھ ڈال کر اس کا ٹاٹ اُٹھا لے گا' اور ٹاٹ سے بدبودار پانی نچوڑتا ہوا سب کے پیچھے پیچھے چل پڑے گا۔
اور وہ لوگ اُسے' جو صبح کو مصلوب ہونے کی اُمنگ میں گھر سے نکلا تھا' شام ہوتے ہوتے بُہتر دریچوں والے مکان کے ایک حجرے میں رکھ آئیں گے۔
(وہ اُسے اُس کے حجرے میں رکھ آئیں گے۔)
(اُسے حجرے میں رکھ آئیں گے۔)
'ایاہ درازا' ایاہ پہنا' ایاہ ژرفا' ایاہ بالا[1]'
حجرے کی اُونچی چھت سے ٹکرا ٹکرا کر اس کی آواز اسی کے لاغر بدن پر کنکریوں کی طرح گر رہی ہوگی۔ وہ اپنی پسلیوں میں اپنی لانبی نوک دار انگلیاں گڑائے بنکارتا ہوگا کہ تیرے سورج نے تو میرے ساتھ آج بھی دغا کی۔ میں تو خجالت کی گرد میں اَٹ گیا کہ یہ سورج بھی رخصت ہوا اور میں زندہ ہوں۔

---

[1] جون ایلیا کی طویل نظم 'راموز' سے ایک سطر۔
[اوپر لکھی سطروں میں ہمارا یوحنا گویا موسیٰ نبی کی یادداشت کا بھی بکھان کرتا' اُسے پھیلاتا ہے: مثلاً 'تیرے پہاڑ کا شعلۂ مستعجل' اور 'جلتی پہاڑی' اور 'اِلہ کی لوحیں' اور 'سونے کا بچھڑا' اور لوحوں کا زمین پر مار کر ٹکڑے کرنا' یعنی اس طرح ہمارا یوحنا' سامی اَدیان کے دو یا دو سے زیادہ کرداروں کی لیلا دکھا رہا ہے۔]

تُو مجھے مرنے کیوں نہیں دیتا اور مجھے جینے کیوں نہیں دیتا۔ اے میرے دشمن! اے میرے دوست! مجھے جینے دے، مجھے مرنے دے۔ کہ میں جیتا رہوں تو تیرے پہاڑ کا شعلۂ مستعجل میرے بدن سے ایندھن لیتا رہے اور مر جاؤں تو چٹان پر پھینکے ہوئے طشت کی طرح تیری صدیاں میری نزع کی چیخ سے جھنجھناتی رہیں کہ الوہی۔ الوہی۔ الوہی۔

تُو مجھے مرنے کیوں نہیں دیتا؟ اور بتاتا کیوں نہیں کہ کیا وہ میرا وہم تھا جو میں جلتی پہاڑی پر اُترا تھا اور اپنے الٰہ کی لوحیں اُٹھائے بستی میں پہنچا تھا جہاں سب کے سب سونے کے بچھڑے سے جفتی کھاتے تھے اور مجھے اور میرے الٰہ کو پہچانتے نہ تھے؟

تو کیا میں بار برداری کا جانور تھا کہ ان حرام زادوں کی خاطر اپنی جان کو عذاب دیتا رہا؟
تو کیا میں غصہ بھی نہ کروں اور اپنے الٰہ کی لوحیں زمین پر مار کر ٹکڑے ٹکڑے بھی نہ کروں؟

تُو مجھے جینے کیوں نہیں دیتا؟ میں تو خیال کی لطافت میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ مگر ہلاکت میرے ہونے پر کہ میں نسل کشی کے مہیب اعضا لے کر پیدا ہوا اور اپنے بدن میں رہنے پر مجبور ہوں۔

یہ تُو نے کیسی زندگی میرا مقسوم کی ہے؟ اور اُلسر کی موت اور پیچش اور مینین جائیٹس کی موت میرے لیے کیوں بچا رکھی ہے؟

ہلاکت ان آنکھوں پر کہ میں صحرا کی عذاب ناک راتوں میں گھر گیا اور بے ثواب گریہ وزاری کی مشقتیں جھیلتا ہوں۔

واویلا نورِ باطن پر کہ میں چوبِ خشک کی طرح جلتا ہوں اور مجھ سے حرارت اور روشنی لینے والا کوئی نہیں!

'کٹ! شاٹ او کے! کل دا لائٹس۔ کل دا ساؤنڈ!! (کِل ایوری تھنگ)'
'کِل ایوری تھنگ! ایوری تھنگ!'

بعل زبوب[1] کے بے شمار سائے تالیاں بجاتے ہوئے اسے اپنے گھیرے میں لے لیں گے اور اس کے ساتھ ٹھٹول کریں گے۔ وہ اس کے سر پہ چھڑیاں ماریں گے اور اس پر تھوکیں گے۔ وہ اپنے ساتھ نئی مے اور جو کی روٹیاں لائے ہوں گے، سو وہ اُسے اوندھا

[1] بعل Baal: آشوریوں فنیقیوں کا دیوتا اور زبوب Zebub: سانڈ ناد یا بیل..... بعل زبوب: گویا معبودِ باطل۔

گرالیں گے اور اس کے بدن میں روٹیاں داخل کریں گے اور مے کے شیشے اُس پر اُلٹ دیں گے اور اُسے حد درجہ ستائیں گے۔

وہ کھونٹی پر ٹنگے ہوئے شہید کی طرح سب کچھ سہتا رہے گا' کہ بدن کی اذیت میں اُسے مزہ ملے گا اور ان باتوں کی پبلسٹی ویلیو ہوگی۔

جب وہ زمین پر پڑا ہوگا تو بعل زِبوب کے سائے اس سے پوچھیں گے کہ تُو اُٹھ کر کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟ اور جب وہ دیوار کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوگا تو وہ سوال کریں گے کہ تُو جاتا کہاں ہے' آرام کیوں نہیں کرتا؟ اور وہ اُسے ٹھوکر مار کر گرا دیں گے۔ پھر اُن میں سے ایک یوں کہے گا کہ تُو تو حد درجہ نکما ہے اُٹھ اور خداوند کی ہیکل میں جا اور ایک تپائی بچھا کر اپنے سکے پھیلا دے اور کاروبار کر۔

پھر وہ منہ چھپا چھپا کر ہنسیں گے اور آپس میں مشورت کریں گے کہ اس سے اس کے مقدس خریطے چھین لو اور اس کی ژند اور اس کی اوستا پانی میں تر کر کے اس کے حلق میں ٹھونس دو اور کتاب الطواسین سے اس کے ٹخنوں پر ضرب لگاؤ اور شیخ اکبر کو اور اگستین ولی کو اور ملک چین کے دیوزاد کو اس کے قریب نہ آنے دو۔

وہ ہنستے ہوں گے مگر ان کی ہنسی خوف و دہشت کی ہنسی ہوگی اور ان کا ٹھٹول خود انھی پر رجعت کرے گا اور یوحنا' کہ جس کے بدن پر نوحہ و ماتم اور آہ و فغاں مرقوم ہوگا' وہ اگرچہ ٹوٹے ہوئے برتن کی مانند زمین پر پڑا ہوگا مگر سب دیکھیں گے کہ اس کا چہرہ تو سالم ہے اور اُس کی پیشانی آبِ رواں کی طرح لشکارے مارتی ہے اور وہ کلام کرتا ہے۔ اور اپنے پھیپھڑوں کی قوت سے رب الافواج کو پکارتا ہے کہ:

'اے گرج دار آواز والے! تیری آواز بادلوں پر ہے اور تیری آواز میں قدرت و جلال ہے اور تیری آواز دیوداروں کو توڑ ڈالتی ہے اور آگ کے شعلوں کو چیرتی ہے اور بیابانوں کو ہلا دیتی ہے اور تیری آواز سے ہرنیوں کے حمل گر جاتے ہیں اور تیری آواز جنگلوں کو بے برگ کر دیتی ہے۔' (عہد نامۂ قدیم)

تو اے گرج دار آواز والے! مجھے بھی پکارتے ہوئے سُن کہ میں گونگا نہیں' آواز والا ہوں۔ ہر چند کہ میں نے تیرا رَد لکھا اور تیری نفی کی اور تجھے 'لا' کہا اور تجھ سے سوا اپنی

روحِ ناطق کو اپنا الٰہ گردانا اور صبح دم میں پھر ایسا ہی کروں گا کہ اپنے ایقان میں راسخ ہوں اور بے دلی سے ماننے والوں کے اس قرن میں ہمیں اکیلا انکار کرنے والا ہوں۔

تب ایک عجیب بات رونما ہوگی کہ اس کے حجرے کی چھت بڑی آواز کے ساتھ شق ہو جائے گی اور چھت کے ٹائل اُڑ اُڑ کر دُور دُور تک جا گریں گے اور سورج سنسناتا ہوا اُس کے حجرے میں دَر آئے گا اور اس کی پسلیوں پر آن رُکے گا اور آوازہ پڑے گا کہ براوو! براوو! 'حنا بی بی'[1] اس کتے کا منھ دُھلا اور اس کے بالوں میں کنگھی کر اور اسے نئی پوشاک پہنا۔

(پوشاک پہنا)

نئی پوشاک پہن کر زَوفے کی ایک سبز شاخ ہاتھ میں اُٹھائے وہ اپنے حجرے سے یوں برآمد ہوگا جیسے دن طلوع ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل میں یہ گمان کرتا آئے گا کہ اب کے شاید اسے زندگی کرنے کی مہلت ملی ہے۔ سو وہ انجیر کے درخت کے نیچے کھجور کے پتوں سے بنا ہوا اپنا سجادہ بچھا دے گا اور بَرُو کے قلم کو قط دے کر صندل کے قلم دان پر رکھ دے گا اور مخمل کے بستے کی گرہ ڈھیلی کر دے گا پھر پتھر سے ٹیک لگا کر کھنکارے گا اور 'کوچہ ُورّاقاں'[2] کی سمت منھ کر کے پکارے گا کہ قال' قال' یوحنا ایلیاہ۔ تو اُٹنگے پاجامے پہنے' کھجور کے پتوں کی ٹوپیاں اوڑھے' استفسار کرنے والے' گروہ در گروہ اپنی بستیوں سے روانہ ہوں گے۔ ان میں سے بعض اپنے ناقوں پر سوار ہوں گے۔ بعضے اصیل گھوڑوں کو ایڑ لگاتے آئیں گے۔ بعضے پیادہ پا ہی چل پڑیں گے۔

وہ تعداد میں اتنے ہوں گے جتنے نخیلۂ بنی قیدار[3] کے نخل۔ وہ 'لبیک یا استاذنا' کہتے ہوئے اس پر ہجوم کریں گے یہاں تک کہ اس کا دَم اُلٹنے لگے گا۔ تاہم وہ سجادے سے اُٹھ کر شکر گزاری میں رقص کرے گا۔ پھر پتھر سے ٹیک لگا کر اُن کے سوال سننے کو ہمہ تن گوش ہو بیٹھے گا۔

---

[1] حنا Hanna: یہ یوحنا کے صوتی تاثر سے بہرہ مند ایک افسانوی کردار ہے۔

[2] اُن مقتدر صوفیوں کی گلی جنھوں نے چاندی کے ورق کوٹنے کے آہنگ پر رقص کیا۔

[3] میں نے یہ تحریر تکمیل کے دوسرے دن جون کو دکھائی تھی۔ بھائی جھوم اُٹھا۔ میں نے لکھا تھا' استفسار کرنے والے بے شمار تھے۔ جون نے کہا' اسے یوں لکھ کہ بنی قیدار کے باغ کے درختوں کی طرح بے شمار لوگ تھے۔ میں نے اُسی طرح لکھ دیا۔ بہت بعد میں انگریزی لفظ Cedar لغت میں دیکھا۔ ظاہر ہے یہ دیودار یا صنوبر کا نام ہے۔ پر اس لفظ Cedar اور اُس 'قیدار' کی صوتی قرابت داری حیران کُن ہے۔ یہ اب کس سے کہوں؟ جون تو ہے نہیں! (اسد محمد خاں)

توناقوں پر آنے والے اور اصیل گھوڑوں کو ایڑ لگاتے آنے والے اور پیادہ پا آنے والے اس سے غسلِ جنابت اور حیض اور موئے زیرِ ناف کے مسائل پوچھیں گے اور یوحنا ایلیاہ یرقان زدہ مریض کی مانند زرد پڑ جائے گا اور مشکِ کاہ لرزہ کرے گا۔

وہ کم زور آواز میں کہے گا کہ لوگو! میں طاہر نہیں ہوں۔ میں تو تشکیک کا درس دینے بیٹھا تھا۔ تم مجھ سے یہ استفسار کیوں کرتے ہو؟ سنو کہ میں حیض کی بابت کچھ نہیں جانتا اور غسلِ جنابت کے باب میں منہ نہیں کھول سکتا کہ مباشرت کے بستر سے اُٹھ کر سیدھا سجادے پر آن بیٹھا ہوں اور دیکھو...... یہ کہتے ہوئے وہ حیانا آشنا' جھک کر اپنے تہ بند کے گوشے تھام لے گا' پھر انھیں اپنے کانوں کی لوؤں تک پہنچا دے گا اور تا دیر اسی بے ستری میں رقص کرے گا۔

وہ رقص کرتا ہوگا اور آنسوؤں سے روتا ہوگا اور پکار پکار کر اُٹنگے پاجامے والوں سے کہے گا کہ 'لوگو! تم نے تو میرے کلام کو بے حیثیت ٹھیکریوں کی کھنکھناہٹ سے ملا دیا اور میرے سکوت کو بنجر زمین کی خاموشی بنا دیا اور میرے جاننے کو اپنے نہ جاننے کے برابر سمجھا'۔

'تو لوگو! کیا مجھے اس نئی پوشاک میں بھی برہنگی ہی ملی؟'

(نئی پوشاک میں بھی برہنگی ہی ملی۔)

سو برہنگی اس کا لباس اور خموشی اس کا ورثہ اور چراغ کی لَو اُس کا مسکن قرار پائیں گے۔

اور جو سچ کبھی اس نے کمایا' وہ ہوا کے پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ٹھہرے گا۔

اور اس کا جھوٹ سیہ منجنیقوں پر پڑا دہکتا رہے گا...... کہ جب بھی زمین ایک دائرہ مکمل کرے گی' وہ اسے اس کرۂ باد میں اُچھال دیا کریں گی۔

سو یہی اُس کا جینا اور یہی اُس کا مرنا کہلائے گا۔

اور جسے اس نے تلاش کیا اور نہ پایا وہ دوام اب اس کی پلکوں پر آشیانہ کرے گا کہ اس کی پلکیں اِستوائی سورج کی سفاک برچھیاں ہوں گی۔

اور اِستوائی سورج کی سفاک برچھیوں پر خداوند کی تقدیس اور اس کے سناٹے کا منتر ہوگا۔

اور ایک سفید پرواز کے نچے ہوئے پر......
اور ایک اندھے کبوتر کی بیٹ پڑی ہوگی۔

جون ایلیا

اسلم فرخی

جناب جون ایلیا ہمارے عہد کے بڑے خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کے یہاں جذباتی وفور کے ساتھ ساتھ گہرے شعور کی جو پر چھائیاں ملتی ہیں ان کی وجہ سے جناب جون ایلیا کی شاعری بڑی قابلِ قدر اور اہم ہوگئی ہے۔ وہ تاریخ اور فلسفے کے بڑے زیرک طالب علم ہیں، علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ زندگی اور معاشرے کے بارے میں ان کا ردعمل بڑا حقیقت پسندانہ اور مثبت ہے۔ اگر چہ فنونِ لطیفہ میں وراثت کا کوئی تصور نہیں تاہم ہماری شاعری میں اس کلیّے کے جو استثنا نظر آتے ہیں ان میں جناب جون ایلیا بھی شامل ہیں۔ شاعری اور ادب انھیں ورثے میں ملے ہیں بل کہ یہ کہنا بجا ہے کہ انھوں نے ادب وشعر کی آغوش میں آنکھیں کھولی ہیں اور ادب وشعر کی گود میں پرورش پائی ہے لیکن جو کچھ انھوں نے بزرگوں سے حاصل کیا اسے اپنی انفرادیت کی چھاپ اور اپنے ذاتی رنگ وآہنگ سے بہت زیادہ پرکشش اور اثر انگیز بنادیا ہے۔

جناب جون ایلیا غزل اور نظم دونوں پر یک ساں دست رس رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں رندانہ سرخوشی، تازگی اور ندرتِ خیال ہے۔ نظمیں گہری فکر کی حامل اور پر اثر ہیں۔ ان کے کلام کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ رندانہ جوش وخروش کی تہ سے اُبھرنے والی فکر ہے جو قاری کے دل ودماغ دونوں کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔

شاید ترے جینے کی ادا لے گئی تجھ کو

پروفیسر اظہار حیدری

جون ایلیا ذہنِ جدید کا متحرک، متلون، متواتر، مسلسل ماضی، حال، مستقبل کا مستقل ادارہ تھے۔ وہ اُمنڈتی ہوئی جدیدیت کا بپھرا ہوا طوفان تھے۔ وہ علم الکلام میں بولتا آسمان تھے۔ وہ کل جگ میں کلیمِ عجم تھے۔ وہ لحنِ ایلیا میں توریت تھے۔ وہ نغمگی میں زبور تھے۔ وہ کتابوں میں کتاب در کتاب تھے۔ علوم میں بائبل تھے۔ فنون میں انجیل تھے۔ وہ سیفو کی زبان تھے۔ فلسفہ و فلاسفہ کی اکادمی تھے۔ جون ایلیا فیثا غورث، ارشمیدس، سقراط اور ڈیکارٹس کے محسوسات وحسیات کا استعارہ ہے! میں نے جون جیسا لکھنے والا نہیں پڑھا، میں نے جون جیسا سنانے والا نہیں سنا، جون ایلیا محسوس کرنے کی چیز تھے اور وہ محسوس ہوتے ہیں۔

میں نے جون ایلیا کو جب کبھی مسکرانے یا ہنسنے کی کوشش کرتے دیکھا تو میرے محسوسات میں شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کا شعری استعارہ ترازو ہو گیا۔

گل دان میں پھول ہنس رہا تھا
رحل پر قرآن دھرا تھا

جون ایلیا ایک زمانے کے تسلسل میں مجھ سے بہت قریب تھے اور میں ان کے قریب تھا اور پھر ان کا قرب محسوسات میں ڈھل گیا اور وہ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتے رہے اور آج تک میرے ازل سے میرے ابد تک محسوس ہوتے رہیں گے۔

جون ایلیا میرے قدر دان تھے اور میں ان کا قدر شناس ہوں۔ جون ایلیا نے

فرمایش کر کے مجھ سے عالمی ڈائجسٹ انشا کے لیے مضامین، فیچر، انٹرویو لکھوائے اور پھر تالیفِ قلب کے لیے میری تحریر و تالیف کی تعریف میں اپنے قلب و نظر سے اپنا ضمیر کھول کر رکھ دیا اور اپنی زبان سے مجھے جو بشارتیں دی ہیں وہ ناقدر شناسوں کے اس جنگل میں آج تک میری ڈھارس ہیں، میرا حوصلہ ہیں۔ ایسے کئی مواقع پر میرے ہم دمِ دیرینہ جناب سحر انصاری، انور شعور، س م صولت، شکیل عادل زادہ وغیرہ بھی موجود رہے ہیں۔

جون ایلیا جب میرا کوئی آرٹیکل ایڈٹ کرتے تھے اور اس میں ان سے کوئی تلخیص یا کتر بیونت سرزد ہو جاتی تھی تو اکثر اپنے مذکورہ احباب کے ساتھ میرے گھر میں تشریف رکھے بغیر ناظم آباد میں کراچی سرکلر ریلوے لائن کے متوازی چہل قدمی کے دوران اپنی مذکورہ کتر بیونت اور تلخیص کی مجھ سے معذرت کرتے تھے اور احبابِ ادب سے میری انشا آفرینی کی تحسین و آفرین کہتے تھے اور میں جون ایلیا کی اس اعلیٰ ظرفی، بے باکی اور اخلاقِ عالیہ پر نادم اور ششدر و حیران رہ جاتا تھا۔

جون ایلیا نے افلاطون اور ارسطو کی 'اکادمی' کے طرز پر عروس البلاد کراچی میں 'ادارۂ ذہنِ جدید' کی طرح ڈالی تھی اور ذہنِ جدید کا ترجمان مجلّہ پندرہ روزہ 'انشا' بھی جاری کیا۔ ادارۂ ذہنِ جدید اور 'انشا' کے وسیلے سے انھوں نے اپنی فکر و نظر سے کتنے ہی ناتراشیدہ ہیروں کو تراش خراش کر گوہرِ یک دانہ بنایا اور زاہدہ حنا کو تو 'شمع بنی' کی نفسیاتی حاجت اور علت و ذلت سے نجات دلائی اور نسوانی شوقِ ناتمام میں بکھرنے سے بچا کر جون ایلیا نے اپنی اُلفتِ حنائی اور رفاقت کا نور بخش دیا۔ لیکن وہ جون ایلیا کے لیے 'نپولین کی کیتھرائن' جیسی نہ بن سکیں اور جون ایلیا کی زندگی بکھر کر رہ گئی۔ انجم اعظمی، احمد ہمیش، عبید اللہ علیم، انور شعور، سحر انصاری، طہیر نفسی، نسیم نیشوفوز، شکیل عادل زادہ اور دیگر بہت سے وغیرہ وغیرہ جون ایلیا کے 'ادارۂ ذہنِ جدید' اور 'انشا عالمی ڈائجسٹ' کے آسمان پر جگمگا کر فکر و نظر کے منصۂ شہود پر آئے۔

جون ایلیا، جانِ اولیا علی اور آلِ حسین کی مزاحمتی علامت اور حسینیت کا انقلابی استعارہ ہیں۔ جون ایلیا ولایتِ فقیہ اور ولایاتِ اولیا کے قافلہ سالار شاہ ولایت کے مدینۃ العلم امروہہ کے امر ناطقہ علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا کے فرزندِ حقیقی و معنوی اور

آدابِ فرزندی کے وہ شناور ہیں کہ۔

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند......!

جون ایلیا اپنی ذات وصفات اور علوم وفنون میں اتمامِ کمالات جدی و پدری کا پرتو نہیں ارتقا ہیں!

جون ایلیا ریسرچ اسکالروں کے لیے چلتا پھرتا تھیس ہیں اور ان کے اپنی تھیس پر ریسرچ کرنا گھاٹے کا سودا نہیں۔ ان کی شخصیت احتجاجی اور ان کی شاعری مزاحمتی ہے!

اسرائیلیات کا ماہر اور عبرانی علوم کا غواص، برِعظیم جنوبی ایشیا کی گزشتہ صدیوں سے اب تک جون ایلیا کے علاوہ اور اُن سے سوا شاید کوئی باز یافت نہیں ہوا۔ عبرانی، آرامی، عربِ عاربہ اور عربِ باعدہ اور برکی علوم وفنون کی فطری مہارت میں عبدالعزیز خالد بھی جون ایلیا کی تب وتاب اور توانائی کی شاید ہی تاب لاسکیں اور لکنت میں گنگ رہ جائیں۔

جون ایلیا ذہنِ جدید کے جذب وسلوک میں ارتقا کے سالک ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُردو کے بین الکائناتی یا آفاقی ادب میں اسرار الحق مجاز لکھنوی جون ایلیا کا پرتو ہیں اور جون ایلیا مجاز کے عشقِ مجازی کا حقیقی سایہ ہیں۔

تو مری زندگی کا پرتو ہے، میں تری زندگی کا سایہ ہوں
پھر بھی تجھے میں حدِ امکاں تک احتیاطاً پکار آیا ہوں

مجاز، مجذوب ہیں تو جون ایلیا، سالک ہیں۔ مجاز، منصور حلاج کا آتشیں مزاج ہیں تو جون ایلیا اس کا شبنمی علاج ہیں۔ جون ایلیا بھی تیکھے شاعر ہیں اور مجاز بھی تیورائے ہوئے شاعر تھے اور۔

دلِ شاعر پہ جو گزرتی ہے
شاعرِ انقلاب کیا جانے

تاہم بین اللسانی شاعری میں بائرن ایک ایسا شاعر ہے جس میں جون ایلیا کا رنگ ڈھنگ رچا بسا محسوس ہوتا ہے۔ جون ایلیا کی شاعری اور کردار و گفتار میں لارڈ بائرن انھیں کلام و پیام اور سلام کرتا محسوس ہوتا ہے۔ اُردو کی جدید رومانی شاعری میں فراق گورکھپوری،

مجاز لکھنوی، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، ناصر کاظمی، سلیمان اریب، حمایت علی شاعر اور احمد فراز مسندِ گل پر منزلِ شبنم میں شگفتگی نغمگی اور آشفتگی گھولتے محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن جون ایلیا سر تا سر محبت اور حرارت ہیں اور اُن کی رومانی شاعری کے وجدان میں نہاتی ہوئی کرنوں سے آشفتہ سروں کے خوابوں کے جزیروں میں سحر کا عالم ہوتا ہے۔ جون ایلیا کی رومانی شاعری میں زندگی کی حرارت وتمازت کے وہ رود بار بہتے ہیں جو بنی نوع انسان کی محرومیوں اور مجبوریوں کو زندگی کے جوار بھاٹوں میں بے کسی، معذوری، محتاجی اور اپاہجی میں تبدیل نہیں ہونے دیتے بل کہ القا و ارتقا کی توانائیوں سے ہم آغوش کرتے ہیں۔ برصغیر جنوبی ایشیا اور بین اللسانی عالمی ادب میں جون ایلیا کی یہی انفرادیت بل کہ یک تائی ہے۔ ویسے بھی وہ مجلسوں میں، جلوتوں میں یکہ وتنہا نظر آئے۔

وہ یوں نزدیک بیٹھے ہیں کہ تنہائی نہیں جاتی

لیکن یکہ وتنہا جون ایلیا کی تنہائی ان کی یک تائی کی گویا قوت وحرارت بن گئی، بہ ہرحال جون کی یک تائی کی یہی قوت وحرارت برصغیر جنوبی ایشیا اور بین الاقوامی ادب کو سدا حرارت ومعنویت بخشتی رہے گی۔

جون ایلیا کا آغاز بھی غالبؔ و میرؔ کے انجام سے ہوا ہے مگر اُن کے قرب کے دعوے دار 'مغ بچوں' نے یہ قبیح روایت جانے کیوں ان سے منسوب کر دی ہے کہ وہ عیاذ باللہ میرتقی میرؔ کو اُردو شاعری کا 'آئی جی' اور مرزا غالبؔ کو اُردو سخن کا 'ایس ایچ او' کہتے تھے۔ جون ایلیا کو بھلا پولیس رینکوں سے بازاری بولی میں میر و غالب کا سنگین جھٹکا کرنے اور زبانِ چمرئی سے سرِ بازار رسوائی کا جرم کرنے کی حاجت کیا ہے جب کہ لطیف وشریف جون ایلیا کا یہ مزاج ومعیار ہی نہیں۔

جون ایلیا روایتی سہلِ ممتنع کے شاعر نہیں ہیں بل کہ انھوں نے اپنے شعر میں جس سہلِ ممتنع کی تجدید کی ہے وہ اس کے تیور کے بلا فصل موجد و مجتہد بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُردو کے ان جدید اور تازہ وارد شعرا میں جون ایلیا کا سہلِ ممتنع سرایت کر گیا ہے کہ جن میں مبینہ طور سے شاید بیش تر نہیں جانتے کہ سہلِ ممتنع کیا ہے، تاہم انور شعور، عبیداللہ علیم، باسط عظیم، پروین شاکر، شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، ذوالقرنین شاہد، پروین حیدر، پروین جاوید،

ریحانہ روحی، عنبرین حبیب عنبر اور دیگر بہتیروں نے شعوری یا لاشعوری طور پر جون ایلیا کی پیروی کی ہے۔ بھلا جون ایلیا کے اس طرزِ سخن اور سہلِ ممتنع کی تاب کون لا سکتا ہے۔

جانِ جاناں میں سخت نادم ہوں
پیٹ پالوں کہ تجھ سے پیار کروں

جون ایلیا مزاجِ عشق میں مجاز ہیں۔ رومانی شاعری میں ساحر ہیں، جوش میں فراق ہیں۔
جون ایلیا کے نثری کمالات نے بھی گیسوئے اُردو کو مہ و ماہ و نجوم اور ثابت و سیار کی گردشوں اور آفاقی کاشانوں پر سایہ فگن کر دیا ہے۔ ان کے انشائیوں نے اُردو کے لب و رخسار کو سرخ رو کیا ہے۔ خلیل جبران کا لہجہ اور وہ بھی اس اُردو ترجمے کے اثر و رسوخ اور وثوق کے ساتھ جو حبیب اشعر نے کیا ہو۔ حکیم حبیب اشعر 'شریف خانی' خاندانِ حکیمانہ میں حکیم مومن خان مومن ثانی سمجھے جاتے ہیں۔ حبیب اشعر بھی عربی و فارسی، سنسکرت اور اسرائیلیات کے عالم اور خیام الہند سیّد حیدر دہلوی کے فرزندِ معنوی اور حکیم ہاشم جان کیف دہلوی کے 'برادرِ خورد' تھے۔ لیکن جون ایلیا کے نثری مجموعوں میں خلیل جبران کے ملکوتی لہجے میں سقراط، ڈیکارٹس، آسکر وائلڈ اور والٹیر بولتے محسوس ہوتے ہیں۔ شاذ ہی کوئی تمکنت میں جون ایلیا کا مثالیہ ہو۔

آئینہ ہے جوابِ حسن اُن کا
سامنے کی مثال دی جائے

اگلے وقتوں میں میر اور مصحفی امروہوی شاید و باید ہی جون ایلیا کی سی تمکنت، نازک مزاجی، نازک خیالی اور آتشِ زیرِ پا جبلت رکھتے ہیں۔
یاس یگانہ چنگیزی، نہال سیوہاروی اور سیّد حیدر دہلوی آتشِ بر سرِ سخن اور آتشِ زیرِ پا پگ ڈنڈیوں کی مسافرت میں رقصیدہ ولغزیدہ تھے۔ مگر جون ایلیا تنک مزاجی میں دہکتے تلووں کے ساتھ کوندتے ہوئے برقی راستوں پر اپنے تپتے ہوئے مثالیے کی تلاش میں آتشِ نور کے برق کش جھروکوں کی جانب غلطیدہ و رقصیدہ سبک خرام تھے۔
اپنے لہو میں ناچتی حرارت و تمازت اور تاب کاری میں جون ایلیا اپنی آب و تاب کے ساتھ وہ 'سورج بنسی' تھے جن کے ہونٹوں کی آتش بار نغمگی سے کیسے کیسے 'چندر بنسی'

چندر مکھی لذتِ زندگی پاتے تھے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوانِ جہان جون ایلیا کی آفاقی شاعری بھی ان کی ابدی زندگی میں سما گئی ہے اور انھوں نے اپنی فنی ذات وصفات سے ارض وسما کا حجاب اُٹھا دیا ہے۔
جون ایلیا اب اتنے بلند ہو چکے ہیں کہ بہ قول خیام الہند سیّد حیدر دہلوی۔

حریفِ تسکین و مستقر ہوں، بلندیوں سے بلند تر ہوں
میں آج کل جس مقام پر ہوں، ضرورتِ بال و پر نہیں ہے

بے پناہ شاعر

افتخار عارف

گزشتہ صدی کے عالمی ادبی منظرنامے پہ ایک بڑا نام ایزرا پاؤنڈ (Ezra Pound) کا ہے۔ بڑے شاعر، بڑے نقاد، بڑے مترجم اور شاید بیسویں صدی کے سب سے متنازعہ ادیب جنھوں نے فاشسٹوں (نازیوں) کا ساتھ دیا، مسولینی (Mussolini) کی ہم نوائی کی مگر یہ ساری باتیں ان کے ادبی قد و قامت پر بہت زیادہ اثرانداز نہیں ہو سکیں۔ وہ جدیدیت کی تحریک کے علم برداروں میں سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی منگیتر اور خاتون دوست ہیلڈا ڈولیٹل (Hilda Dolittle) کے خط میں انھوں نے متیس (Mattisse) کا ایک قول نقل کیا۔ ''ہمیں تنقید و تحسین کی منزلوں سے گزرتے وقت اپنی ساری توجہات فن پارے پر مرکوز رکھنی چاہیے، فن کار پر نہیں۔'' مجھے اس سے کلی طور پر اتفاق ہے مگر یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ فن کار کے زمانے کو سمجھے بغیر، فن کار کی شخصیت کو سمجھے بغیر، اس کی تہذیبی اور معاشرتی صورتِ حال کو جانے بغیر، کلی طور پر فن پارے کی تفہیم ناممکن نہ بھی ہو تو بھی بہت مشکل نظر آتی ہے۔

جون ایلیا پر بات کرتے وقت یہ بات اور زیادہ اہم اس لیے ہو جاتی ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں ان کی ذاتی اور شخصی زندگی کی جہتیں مسلمات میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ مذہب کے بارے میں ان کے باغیانہ فقرے، زندگی کے معمولات سے انحراف اور بے نیازی، ان سب باتوں کا تذکرہ زیادہ ہوتا ہے مگر ان کے فن کی خوبیوں اور کمالِ ہنر سے انصاف نہیں کیا جاتا۔ جون کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی ان کی شاعری پر اکا دکا

مضامین ان کے حلقۂ احباب میں شامل نقادوں کے تو دیکھنے میں آتے ہیں مگر ادبی دنیا کے قابلِ ذکر نقادوں نے ان پر ویسا اظہارِ خیال نہیں کیا جیسا ان کا حق بنتا تھا۔ دوست احباب جو اُن کی فضیلت سے آشنائی بھی رکھتے ہیں، ان کا وظیفہ بھی یہی ہے کہ فوری طور پر جون ایلیا کے ان بے مثال اشعار کو دہرانے لگتے ہیں جو عصری شاعری کے اجتماعی حافظے کا حصہ ہیں۔ ''شاید 1990ء''، ''یعنی 2003ء''، ''گمان 2004ء''، ''لیکن 2006ء'' اور ''گویا 2008ء'' پانچ شعری مجموعے شایع ہوئے مگر کوئی مضمون ایسا نظر نہیں آتا جس میں اس پورے تخلیقی سفر کا احاطہ کیا گیا ہو۔ غزلیہ مجموعوں کے علاوہ ''راموز 2016ء'' ایک اور اہم تخلیق ہے جو اس بات کا بجا طور پر استحقاق رکھتی ہے کہ اس کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔

مجید امجد بیسویں صدی کے ایک اہم شاعر تھے مگر اپنی فنی تخلیقی عظمتوں کے باوجود ان کے زمانے میں انھیں وہ مقام میسر نہ آسکا جس کا وہ بجا طور پر استحقاق رکھتے تھے۔ ان کا تخلیقی سفر کم و بیش فیض، راشد، میرا جی، مختار صدیقی، ظہیر کاشمیری، قیوم نظر اور سرحد پار مخدوم، مجاز، ادھر سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی جیسے شعرا کے آگے پیچھے شروع ہوا تھا مگر ''شب رفتہ'' کی اشاعت تک ان پر ہمارے بڑے نقادوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ترقی پسند تحریک کے نقاد اپنے شاعروں کے قد و قامت بلند کرنے میں لگے ہوئے تھے اور تحریکِ جدیدیت والوں کو اپنے گروہ کی ستایش اور مخالف گروہ کے انکار سے فرصت نہیں تھی۔ کس کو دماغ تھا کہ وہ ایک گوشہ گیر درویش صفت اور گروہ بندی سے بے نیاز اپنے تخلیقی سفر میں منہمک شاعر پہ توجہ دیتا۔ بھلا ہو خواجہ زکریا کا کہ انھوں نے مجید امجد کے کام کو روشناس کرانے میں ایک تحقیقی نوعیت کی خدمت سر انجام دی۔

جون کا شعری سفر پچاس برسوں سے زیادہ عرصے کو محیط ہے۔ وہ ساری زندگی سنجیدہ تخلیقی کاموں میں مصروف رہے۔ ان کا کام بکھرا ہوا تھا۔ غزلیں، نظمیں، نثری تحریریں سب رجسٹروں، بیاضوں، کاغذوں اور حافظوں میں محفوظ تھیں۔ ساٹھ برس کی عمر تک ان کی کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آسکی۔ سبب کیا، صرف ان کی بے نیازی تھی یا کسی نوعیت کا عدم اطمینان یا اندیشہ، رَد کیے جانے کا خوف۔ وہ بے پناہ شاعر تھے، ساری دنیا میں مشاعروں کے کام یاب ترین شاعر، حافظوں میں محفوظ شاعر مگر کیا سبب، ہوسکتا تھا کہ انھوں

نے کتاب کی اشاعت سے گریز کیا۔ جون کے اطراف بڑی معتبر و مستند آوازوں کا ایک ہجوم تھا۔ کیسے کیسے صاحبانِ طرز و اسلوب شاعر، ملک کے ادب میں نمایاں نظر آتے تھے۔ جوش، فیض، راشد، رئیس امروہوی، حفیظ جالندھری، آل رضا، حفیظ ہوشیار پوری، ظہیر کاشمیری، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، جمیل الدین عالی، سلیم احمد، عزیز حامد مدنی اور ہم عصروں میں احمد فراز، حمایت علی شاعر، رسا چغتائی، محشر بدایونی، محبوب خزاں، رضی اختر شوق، احمد ہمدانی اور بعد والوں میں عبیداللہ علیم، فہمیدہ ریاض، عدیم ہاشمی، امجد اسلام امجد، پروین شاکر، ثروت حسین۔ اس پُر رونق محفل میں کسی ایک شخص کا نمایاں ہو جانا معجزے سے کم نہیں تھا۔ جون ایلیا کی شاعری اسی اعجاز کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔

کراچی، لندن، نیویارک، اسلام آباد، تہران، لکھنؤ سے پاکستان آنے کے بعد زندگی سفر میں گزر گئی۔ میں کوئی مرتب آدمی نہیں ہوں۔ کاغذات سنبھال کر رکھ نہیں سکا۔ کتابیں مختلف شہروں کے کتب خانوں کو نذر کر دی گئیں۔ خطوط دفتروں میں محفوظ رہ گئے۔ کچھ تصویریں اور خط بچ رہے سو اُن میں جون ایلیا کی دو تحریریں محفوظ ہیں۔ مبادا یہ کہ چند دنوں بعد یہ خط بھی معدوم ہو جائیں، انھیں پس منظر کے ساتھ محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے زمانے میں میرے وظائف کار میں دنیائے ادب کے ممتاز اہل قلم کے نام قومی اعزازات کے لیے حکومت کو پیش کرنا ہوتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ جون کی شاعری کا یہ حق ہے کہ اس کا قومی سطح پر اعتراف کیا جائے۔ متعلقہ شعبے نے بتایا کہ کتابوں میں ان کے بارے میں معلومات کافی نہیں ہیں۔ میرے متعدد بار اصرار کرنے پر انھوں نے مجھے جو خط لکھا ہے اس میں آپ کو بھی شریک کر رہا ہوں۔

افتخار دعائیں، دعا یہ ہے۔۔۔

مجھے اُمید ہے۔ نہیں یقین کہ تم وہی کرتے رہے ہو گے جو قبیلۂ سادات مودّت و ولایت کے شایانِ شان ہے۔ لیکن تُو نبود و بود کے بیچ گا ہے گا ہے صرف حصارِ متوسلین کی حد تک جو شوخی و شنگی کرتا رہتا ہے اس پر میں تپ جاتا ہوں۔

صورت امر یہ ہے کہ جب میں نومبر 1999ء میں کینیڈا، قطر، امارات اور بحرین

سے واپس آیا تو مجھے میرے ماموں زاد (یہ ترکیب غلط ہے) بھائی کے صاحب زادے علامہ سیّد علی کرار نقوی نے بتایا کہ اکادمی ادبیات پاکستان کی شاخ سندھ کے نگران اعلیٰ دو تین بار مجھے فون کر چکے ہیں کہ انھیں آپ کے کوائف درکار ہیں۔ میں نے سنا اور حسبِ دستور قبلِ مسیح سونٹھ ہو گیا (یہ امروہے کا محاورہ ہے) کیسے کوائف اور کہاں کے کوائف۔

آج شکیل عادل زادہ نے کسی توجہ دہانی کے نتیجے میں مجھے فون کیا اور کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اکادمی ادبیات کا سربراہ کون ہے؟ میں نے کہا وہی ناجی پا جی۔ شکیل نے کہا کہ آپ کس عالم میں رہتے ہیں؟ میں نے کہا عالمِ غیب میں جہاں حضرت حجت رہتے ہیں۔

اس عزیز نے کہا کہ عالمِ ظہور میں آئیں اور سُنیں کہ خلافت غاصبوں کے تغلب سے حق داروں تک پہنچی۔ میں نے کہا کہ وضوح اور صراحت کو کام میں لایا جائے۔ جواب دیا گیا کہ اب مسندِ خلافت پر سیّد سادات عشق افتخار عارف بٹھائے گئے ہیں۔ جاء الحق وزھق الباطل۔ ان الباطل کان زھوقا۔

میاں تُو بھی عجیب آدمی ہے اور میں بھی عجیب آدمی ہوں۔ جب میں حساب کتاب کے بعد جہنم کی طرف لے جایا جا رہا ہوں گا تو حضرت علیؑ، تیرے مولا تجھے دوڑائیں گے کہ اس نا ہنجار اور نابکار کو اپنے ساتھ لے کر آ ؤ۔ اس کا ایک ہی گناہ ہے اور وہ یہ کہ وہ شراب پیتا ہے۔ ہمارا بندہ غالبؔ بھی قبل از ظہر جہنم کی طرف گھسیٹے جانے کی حالت میں ہماری شفاعت کا حق دار قرار پایا جب کہ وہ ہمارے فرزند ملعون جونؔ سے کہیں زیادہ بدشراب تھا اور علی ہٰذالقیاس شبیر حسن خاں جوشؔ بھی۔

سو، جانِ عزیز! میں اپنی میٹرک کی سند کے مطابق 14ویں دسمبر 1931ء کو عالمِ تجرید سے عالمِ تفضید میں آیا۔ یہ حادثہ امروہہ میں حدوث پذیر ہوا۔ میرے بابا کا نام علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا ہے۔ وہ فارسی، عربی، عبرانی، سنسکرت اور انگریزی کے عالم اور بد بخت ترین موجود اور مصنف واقع ہوئے۔ فیہ ما فیہ۔ میری تعلیمی اسناد (یہاں تعلیم کا استعمال غلط ہے یا شاید غلط نہ ہو، امر یہ ہے) حسبِ ذیل ہیں۔

(1) ایم اے اُردو، (2) ایم اے فلسفہ، (3) کامل فارسی، (4) مولوی عالم،

(5) فاضل عربی، (6) سیّد الافاضل، (7) فاضل فلسفہ، (8) فاضل فقہ، (9) منتہی المنطق والفلسفہ (دارالعلوم دیوبندیہ ملّانہ)۔

بارہ برس تک اسماعیلی آغا خانی ایسوسی ایشن کے عالمی ادارۂ تصنیف و تحقیق سے وابستہ رہ کر تاریخ عرب قبلِ اسلام اور فلسفہ باطنیت کے شعبے کا نگراں رہا۔ اس دوران میں نے متعدد تاریخی، فلسفیانہ، ریاضیاتی اور منطقی کتابوں کے ترجمے کیے جن کے نام میرے مجموعۂ کلام شاید کی پشت پر درج ہیں۔ ان میں سے دو کتابیں شایع ہوئیں (1) جوہرِ صقلی اور (2) حسن بن صباح۔

1967ء یا شاید 1968ء کے اوائل میں اُردو ترقی بورڈ سے جوشؔ صاحب کے ہٹائے جانے (یا ہٹنے کے بعد، بہتر طرزِ تعبیر یہی ہے) کے بعد مجھے تدوینِ لغت کے کام کی دعوت دی گئی، جہاں میں نے آٹھ یا نو برس کام کیا۔ پھر مجھ سے مولانا نسیم امروہوی اور حقی صاحب سے باحسن وجوہ نجات حاصل کی گئی۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر ہادی حسن مرحوم کو ان کی لغوی غلطی پر بُری طرح ڈانٹا اور بے طرح اودھم مچایا تھا۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ میں نے دوسرے دن سے خود ہی جانا ترک کر دیا تھا۔ یہ 1976ء کے اواخر کی بات ہے۔ گزشت الخیر گزشت۔

میں نے اپنی عادت اور معمول کے یکسر برخلاف تمھاری نسبت کے باعث یعنی اکادمی ادبیات سے تمھاری نسبت کے باعث یہ ژاژ خائی کی ہے۔

میں ان دنوں علامہ علی کرار سلمہ اللہ کے یہاں مقیم ہوں۔ میرا پتا یہ ہے۔

سی۔40۔ بلاک نمبر 10، فیڈرل بی ایریا، فون نمبر 6362006

تمھارا جون بھائی

چھٹی جولائی 2000ء

ان کے لیے جب اعزاز کا اعلان کیا گیا اور تقریب میں ایوانِ صدر کی جانب سے شرکت کی دعوت دی گئی تو وہ اس میں اپنی علالت کے سبب شریک نہیں ہو سکے اور اپنی جگہ عزیزم عقیل عباس جعفری کو اعزاز وصول کرنے کے لیے نام زد کیا۔ انھوں نے اجازت نامہ لکھا۔

اجازت نامہ

میں سیّد جون ایلیا ولد سیّد شفیق حسن ایلیا اپنی علالت کی وجہ سے 23 مارچ، 2001ء کو ایوانِ صدر میں منعقد ہونے والی تقریبِ اعزازات میں شرکت سے معذور ہوں۔ اپنے بجائے میں اپنا اعزاز حاصل کرنے کے لیے جناب عقیل عباس جعفری، مدیر مجلّہ اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کو نامزد کر رہا ہوں۔

والسلام

نیازمند

سیّد جون ایلیا

میں 1965ء میں مستقل طور پر پاکستان آنے سے پہلے بھی متعدد بار کراچی آ چکا تھا اور ریڈیو پاکستان کراچی میں بعض بزرگوں سے نیازمندی میرے لیے ہمیشہ باعثِ طمانیت رہی۔ سیّد یاور مہدی ریڈیو پاکستان کے ان بزرگوں میں تھے جو میرے لیے برادر بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے توسط سے میں اس وقت کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں شاعروں، ادیبوں اور صداکاروں سے متعارف ہوا۔ 1965ء کے بعد یاور بھائی ہی کے توسط سے میں نے ریڈیو پاکستان کی بیرونی نشریات میں دس روپے فی بلیٹن کے حساب سے خبریں پڑھنے کا کام اور خبریں ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا۔ یہیں یاور بھائی کے توسط سے عبیداللہ بیگ (جنھیں میں بھائی حبیب کہتا تھا)، قریش پور، سلیم احمد، قمر جمیل، رضی اختر شوق، احمد ہمدانی، انعام صدیقی، آغا خالد سلیم، یونس احمر، شاہ حسن انتدا، محمد خلیل عرب، مولانا اصلح الحسینی اور دیگر کرم فرماؤں سے ملاقات ہوئی۔ سلیم گیلانی مرحوم و مغفور میرے ان محسنوں میں ہیں جنھوں نے روزِ اوّل سے میری تربیت فرمائی۔ انھی کے توسط سے مجھے ذوالفقار علی بخاری، حفیظ ہوشیار پوری، عمر مہاجر، شمس الدین بٹ، حمید نسیم اور ریڈیو پاکستان کے دوسرے اکابر سے تعارف کا شرف حاصل ہوا۔ عبیداللہ بیگ کا تعلق مرادآباد سے تھا چناں چہ کراچی میں مقیم اکثر بریلی، مرادآباد اور رام پور سے آئے ہوئے مہاجرین سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ جون ایلیا اس زمانے میں سعید منزل آتے

جاتے رہتے تھے اور کبھی کبھار بھائی حبیب کے پاس بھی تشریف لاتے مگر جون سے میری ملاقات عبیداللہ علیم کے توسط سے ہوئی۔ یارِعزیز دیرینہ نصیر ترابی اور ان کا خانوادۂ محترم میرے لیے ہمیشہ ایک مثالی علمی حوالہ تھا۔ نصیر میاں کی گاڑی ہمیں لیے پھرتی تھی۔ ناظم آباد کا کیفے الحسن، عدیل لاری، خواجہ رضی حیدر، احمد عمر، ندیم، یونس شرر، نیر سوز اور دو ایک ادبی دنیا سے باہر کے دوست تقریباً ہر شام کیفے الحسن میں گزارتے تھے۔ یہیں سے علیم مجھے مارٹن روڈ، جی الائنس، جی اسٹریٹ، سولجر بازار والے گھر میں سیّد محمد تقی مرحوم سے ملانے لے گئے۔ کیا عجیب اپنی وضع کا دولت کدہ تھا۔ سیّد محمد تقی، حضرت رئیس امروہوی، جون ایلیا، بھائی عباس اپنی اپنی طرح کے چاروں بھائی مگر سب تہذیبی نشست و برخاست اور آداب و اسلوب کے حامل لوگ صبح سے شام تک علمی ادبی سیاسی گفت گو عزیز از جان یارِ دیرینہ شکیل عادل زادہ، بھائی سحر انصاری، بھائی محمد علی صدیقی، قمر ہاشمی، انجم اعظمی بھی وہاں کے مستقل آنے جانے والوں میں تھے۔ الحاد کی اعلیٰ ترین علمی بحثوں کے ساتھ ساتھ متعصب ترین تاریخی مباحث تک ہر طرح کی گفت گو سننے کا موقع میسر آتا تھا۔ میری علمی حیثیت اور مطالعے کی بے مائگی ہمیشہ مجھے ان مجلسوں سے مرعوب کرتی رہی مگر میں کبھی ان کا حصّہ نہیں بن سکا۔ غروبِ آفتاب کے بعد کی نشستوں سے محرومی فاصلے پیدا کرتی تھی۔ یہ بھی کہ میں خُردھونے کے سبب حد درجہ ان بزرگوں کا ادب کرتا تھا۔ جون ایلیا جون بھائی تھے۔ رئیس امروہوی، بھائی رئیس تھے۔ سیّد محمد تقی صاحب کا ایک اور مقام تھا۔ مغربی فلسفہ اور حالاتِ حاضرہ دونوں پر ان کی دست رس اور ان کی شخصیت بے حد مرعوب کن تھی۔ رئیس بھائی کی شخصیت میں ایک مونی تھی جو ہر آنے والے کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔ بھائی جون کی شخصیت کا والہانہ پن اور ایک نوع کی کج کلاہی مجھے اچھی لگتی تھی۔ بہ ظاہر وہ اُلجھے ہوئے مشکل آدمی لگتے تھے اور کوشش بھی کرتے تھے کہ وہ پُر پیچ نظر آئیں مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ ایک سطح پر بہت معصوم اور بہت بھولے آدمی تھے۔ انھوں نے اسماعیلیہ مرکز میں بہت دن تک لکھنے پڑھنے کا کام کیا۔ مضامین لکھے، اسماعیلی لٹریچر کے تراجم کیے۔ ان کی شخصیتوں پر علمی مطالعے قلم بند کیے پھر اُردو ڈکشنری بورڈ میں طویل عرصے تک لغت نگار کے طور پر کام کرتے رہے مگر طبیعت کا اضطراب اور تلون اور بے ترتیبی انھیں کسی ایک جگہ ٹِک کر کام کرنے پر مجبور نہیں

کر سکی۔ زاہدہ حنا سے تعارف بھائی جون کے وسیلے سے ہی ہوا مگر شادی سے ذرا پہلے، اُن کا تعلق اہلِ سنت کے مسلک سے تھا اور جون ایلیا اعلانیہ الحاد کے باوجود اندر سے متعصب شیعہ سیّد بہ ظاہر روشن خیال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مرحوم و مغفور حضرت علامہ شفیق حسین ایلیا کے خانوادہ علمی کے تربیت یافتہ افراد دین کے دائرے سے کتنے باہر جا سکتے تھے۔ اس کا اندازہ ان لوگوں کو بہ خوبی ہوتا تھا جو اُن کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ زاہدہ حنا زمانہ طالب علمی میں بھی ایک صاحبِ مطالعہ بی بی کے طور پر جانی جاتی تھیں۔ شائستہ، ادب آداب اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ میں نے ہمیشہ انھیں کم آمیز پایا۔ جون ایلیا کے گھرانے اور شکیل عادل زادہ کی عالمی ڈائجسٹ سے وابستگی نے زاہدہ حنا کی علمی اور تخلیقی جہتوں میں یقیناً بڑا کردار ادا کیا۔ مجھے اس بات پر اطمینان ہے کہ جون بھائی سے زاہدہ بی بی کے تعلق کے منقطع ہونے سے پہلے اور اس کے بعد بھی میں نے ہمیشہ انھیں رشتوں کا احترام کرتے اور گفت گو میں احتیاط کرتے دیکھا۔ یہ بات میں بھائی جون کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔

جون ایلیا لکھتے ہیں۔

"یہ سال ہا سال پہلے کی بات ہے کہ میرے گرد و پیش ایک پُر خیال وقوعہ ظہور پذیر میں آیا۔ وہ میری بچھڑی ہوئی تہذیب کا وقوعہ تھا، وہ میری بچھڑی ہوئی تہذیب کا خُرسند ترین وقوعہ۔ اس کا نام تھا افتخار عارف۔ افتخار عارف ایک شگفت آور شخص ہے۔ اُس نے زندگی کو سمجھا اور جو زندگی کو نہیں سمجھتا وہ مارا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ اس۔۔۔ زندگی کو خودکشی نہیں بنانا چاہتا۔ وہ برصغیر کی سب سے خیال انگیز، خیال آمیز اور ماجرا خیز شائستگی کا مظہر ہے۔

۔۔۔ میں تو کوئی بڑا شاعر نہیں ہوں۔ میرا بنیادی تعلق تو فلسفے سے ہے لیکن اگر مجھے اپنی پیڑھی کا کوئی قابلِ ذکر شاعر سمجھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ میری پیڑھی کے بعد سب سے نام دار شاعر افتخار عارف ہے۔ مجھ عاجز کا حاصلِ کلام یہ ہے کہ افتخار عارف اس دور کا نادر ترین شاعر ہے۔ اب رہے اور شاعر تو وہ تاریخِ فن کا وقت ضائع کرتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔"

تحریر میں چند جملے میں نے حذف کر دیے ہیں جو ہمارے مشترکہ دوستوں کی مذمت میں تھے وہاں میں نے جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔ بقیہ تحریر اس لیے ہے کہ ایک بہت بڑے شاعر کو اپنے بہت جونیئر نیاز مند کے ساتھ حوصلہ افزائی کا یہ رویہ بہت کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔

نہ جانے کیوں جب بھی بھائی جون کا خیال آتا ہے ایک واقعہ مجھے بہت آزردہ کرتا ہے۔ کراچی کے ایرو کلب میں انکم ٹیکس کمشنر شوکت زیدی نے ایلیٹ گروپ اسکول اینڈ کالجز کے زیرِ اہتمام ایک عالمی مشاعرہ منعقد کیا۔ مظفر حسین شاہ اور مرحوم عظیم طارق مہمانانِ گرامی کے طور پر شریک تھے۔ ہندوستان سے بھی کچھ شعرا مدعو تھے اور پاکستان کے تمام شہروں سے تقریباً سارے قابلِ ذکر شاعر مدعو کیے گئے تھے۔ میں جب مشاعرہ گاہ میں داخل ہوا تو میری نظر بھائی جون پر پڑی جو خاموشی سے ایک گوشے میں مرکزی اسٹیج سے قدرے فاصلے پر خاموش بیٹھے تھے۔ میں اپنے میزبانوں کو چھوڑ کر بھائی جون کی طرف گیا اور میں نے انھیں اپنی بانہوں میں بھرلیا۔ وہ مجھے پیار کرنے اور شفقت فرمانے لگے اور میرے بارے میں کچھ تہنیتی کلمات کہے جن کا نقل کرنا بہ وجوہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے اظہارِ ممنونیت کے ساتھ ان کی خُردنوازی پر احسان مندی کا اعتراف کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ میں انھیں خاموش کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے ازراہِ لطف قدرے مبالغے سے مزید فقروں سے نوازا۔ میں اس گفت گو کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے بات کا رُخ اور طرف موڑ دیا۔ اتنی دیر میں میزبانِ مشاعرہ میرے پاس تشریف لائے اور انھوں نے کہا کہ مشاعرہ کے سیاسی دونوں مہمانانِ گرامی ذرا سی دیر کے بعد مشاعرے سے رخصت چاہتے ہیں اور یہ کہ ان کے جانے سے پیش تر شعر پڑھنے کے لیے مجھے بلایا جائے گا اور ایک شاعر ہندوستان سے ہیں، میں نے کچھ نام تجویز کیے کہ ان کی موجودگی میں مجھے کیوں بلایا جارہا ہے۔ کہا گیا کہ وہ بزرگ کسی ضروری کام سے سٹیج سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اسی اثنا میں بھائی جون نے مجھ سے کہا کہ ذرا مجھے پنڈال سے باہر لے چلو مجھے واش روم تک جانا ہے۔ میں ان کو لے کر پنڈال سے باہر آیا۔ دیوار سے اُدھر منتقل ہوئے، واپس آئے تو میں نے دیکھا کہ ان کے قدم سیدھے نہیں پڑ رہے۔ اسٹیج پر آنے کے بعد میرا نام پکارا گیا

اور میں نے جا کر شعر پڑھے۔ ابھی میں شعر پڑھ کر مائکروفون سے ہٹا تو مرحومہ شبنم شکیل نے مجھ سے کہا کہ انتظار میں بھی جلدی پڑھ کے جانا چاہتی ہوں۔ ابھی میں اُٹھا ہی تھا کہ یکے بعد دیگر دونوں مہمانانِ خصوصی محترم مظفر حسین شاہ اور عظیم طارق مرحوم اُٹھ کر اسٹیج سے جانے لگے۔ شاعر اور دونوں مہمانانِ خصوصی کی سیکورٹی کے افراد ادھر اُدھر ہوئے اور ہڑبونگ مچ گئی۔ ابھی یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ کسی نے بھائی جون کو اسٹیج سے نیچے پھینک دیا یا وہ گر گئے یا کیا ہوا۔ میں نہیں بتا سکتا مگر یہ بات سنی گئی کہ جاتے ہوئے مہمانوں کی وجہ سے افراتفری پر بھائی جون نے کوئی ایسی بات کہہ دی جو ایک جماعت کے حامیوں کو ناگوار گزری اور انھوں نے اُردو کے ایک بہت بڑے شاعر کے ساتھ وہ سلوک کیا جو ہمیشہ کے لیے ادبی دنیا میں ہمارے لیے باعثِ ندامت رہے گا۔ بعد میں کیا ہوا، اس کی بڑی کہانیاں ہیں مگر کہا یہ جاتا ہے کہ عزیزم عباس نقوی پولیس وین میں لے کر ان کو مشاعرے سے بہ حفاظت نکال لے گئے تھے۔ یہ صاحبِ ہنر کی اہانت کا پہلا واقعہ نہیں ہے۔ عزیزم اجمل سراج کا واقعہ بھی ابھی ذہنوں میں محفوظ ہوگا۔

اُردو کے شعرا میں احساسِ ہجرت کے موضوع پر بہت یادگار شعر کہے گئے۔ ناصر کاظمی اور منیر نیازی نے پنجاب میں اور سندھ میں رئیس امروہوی، اقبال عظیم، محشر بدایونی، اُمید فاضلی، سرشار صدیقی، قاسم پیرزادہ نے بہت یاد رہ جانے والے شعر کہے۔ مجھے بھائی جون کی وہ غزل یاد آتی ہے جس میں انھوں نے انتہا درجے کی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ شاید میں اس غزل کے اولین مخاطبین میں رہا ہوں گا۔

اب بکھرنے کو ہے عالم رنگ و بوتم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے
شہر میں ہر طرف ہے یہی گفتگوتم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے
ہم ہیں رسوا کنِ دلّی و لکھنؤ، اپنی کیا زندگی کیا آبرو
میر دلّی سے نکلے، گئے لکھنؤ، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

یاد آیا سقوطِ مشرقی پاکستان کا مرحلہ تھا، ابھی باضابطہ زوالِ ڈھاکا کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ مجھے اسلام آباد کے پاکستان ٹیلی وژن کے دفتر سے براہِ راست ہدایت دی گئی کہ ٹیلی وژن کے ذریعے عوام کو کسی بڑی بُری خبر کے لیے آمادہ کیا جائے۔ اسلم اظہر صاحب

کراچی ٹیلی وژن کے جنرل منیجر تھے۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے زمان علی خاں پروگرام منیجر تھے اور میں ان کے نائب کی حیثیت سے اسکرپٹ کے شعبے کے نگراں کے طور پر خدمات سرانجام دیتا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری مرحوم اور مرحوم علامہ رشید ترابی سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی خطابت کے ذریعے عوام کے جذبات کو مکمل مایوسی سے محفوظ رکھ سکیں۔ میں کمرے میں آیا تو عبیداللہ علیم اور عبیداللہ بیگ موجود تھے۔ مجھ کو بے حال دیکھ کر ان دونوں نے بھی آواز کے ساتھ گریہ کرنا شروع کردیا۔ آوازیں کمرے سے باہر چلی گئیں۔ اسلم اظہر صاحب رونے کی آواز پر کمرے میں آئے اور انتہائی مشفقانہ انداز میں ڈانٹتے ہوئے ہمیں تحمل سے رہنے کی ہدایت کی۔ طے پایا کہ بھائی صہبا اختر اور جون ایلیا سے اس سانحے کے پس منظر میں قومی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی گزارش کی جائے۔ دونوں کے ناموں کے انتخاب کی بنیاد اُن کے ادبی مقام اور مرتبے کے ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ بہت کم وقت میں ارتجالاً شعر کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔ براہِ راست پروگرام میں جب ان دونوں کی نظمیں اور ان دونوں بزرگوں کے خطابات نشر ہوئے تو ایک بہت ہی بڑے المیے کو سہارنے اور صورتِ حال کا مقابلہ کرنے اور نئے حالات سے نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ واضح لفظوں میں اس المیے کے ذمّے داروں پر بھی گفت گو کی گئی تھی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ریکارڈنگز پاکستان ٹیلی وژن کے ذخیرے میں اب موجود نہیں ہوں گی۔ میں نے سال ہا سال عبیداللہ بیگ اور قریش پور کے ایک خُرد کی حیثیت سے ''کسوٹی'' کے پروگرام میں شرکت کی۔ پاکستان ٹیلی وژن کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسرا ذہنی آزمائش کا پروگرام اتنی مقبولیت حاصل کرسکا ہوگا مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن کے ریکارڈ میں سیکڑوں پروگرام میں نمونے کے طور پر بھی ''کسوٹی'' کی ایک منٹ کی ریکارڈنگ موجود نہیں ہے۔ کرم فرماؤں کی عنایتوں کے ساتھ ساتھ اس میں دوستوں کی مہربانیوں کا بھی دخل تھا۔

جون بہت جلدی آزردہ ہو جاتے تھے۔ زود رنج تھے اور بدگمانی میں انھیں کسی سبب کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ذرا سی بات انھیں آزردہ کرسکتی تھی مگر جلد ہی صورتِ حال بحال ہوجاتی تھی۔ میں نے بھی تقریباً پچاس برس کے عرصے پر محیط تعلق میں

انھیں آزردگی کا ایک موقع فراہم کیا۔ سرتاسر غلطی میری تھی۔ میں نے ان کی زمین میں شعر کہے اور بیاض کی صورت میں جب یہ شعر نقل ہوئے تو اس میں استفادے کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ برادرِ عزیز سلیم کوثر اور کراچی ٹیلی وژن کے شعبۂ خطاطی کی طرف سے مجھ کو لندن کے لیے رُخصت ہوتے وقت جو سائکلو سٹائل کاپیاں فراہم کی گئیں۔ اس میں بھی استفادے کا ذکر تھا۔ بعد میں دوست عزیز مدبر رضوی، عزیزم قاضی سلیم اور دوست عزیز نسرین پرویز نے ''مہر دونیم'' کی اشاعت کا بندوبست کیا تو اس میں وہ حوالہ درج نہیں تھا کہ یہ جون کی زمین میں کہے گئے اشعار ہیں۔ ''مہر دونیم'' کی اشاعت کے وقت میں لندن میں تھا تو اس کی تقریبِ رونمائی فیض صاحب کی زیرِ صدارت ہوئی۔ کشور ناہید نے لاہور میں تقریب کا اہتمام کیا۔ صفدر میر صاحب نے صدارت فرمائی۔ انتظار حسین، سجاد باقر رضوی اور اصغر ندیم سیّد نے اظہارِ خیال فرمایا۔ محترم احمد ندیم قاسمی، محترم اختر حسین جعفری اور ہمارے دوستوں امجد اسلام امجد اور عطا الحق قاسمی نے اظہارِ خیال سے بہ وجوہ معذرت چاہی۔ کراچی میں سیّد سبطِ حسن صاحب کی زیرِ صدارت تقریب منعقد ہوئی جہاں دوستوں کے ساتھ جون ایلیا بھی شریک ہوئے۔ بہت بعد میں مجھے بھائی جون کی آزردگی سے مطلع کیا گیا۔ مجھے ہمیشہ اس پر تکدّر بھی رہا، شرمندگی بھی، آزردگی بھی۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں میں مشاعروں میں مجھ سے ملاقات رہی اور مجھ سے انھوں نے ہمیشہ خردوں کا سا برتاؤ کیا۔ میں نے کبھی بھی ان کی شاعری کے محاسن اور ان کے مقام اور مرتبے سے احترام میں بخل سے کام نہیں لیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بہت سے سینئر شعرا کی حیات میں یہ بات کہی تھی کہ کلاسیکی غزل کی روایت میں جون ایلیا ہمارے زمانے کے سب سے مستحکم شاعر ہیں۔ وہ محفلوں میں میرے ایک ایسے انٹرویو کا ذکر بھی کرتے تھے جس میں انٹرویو کرنے والے نے مجھے ناموں کے ساتھ میرے اس مؤقف کو گھیرنے کی کوشش کی تو میں نے واضح طور پر جون ایلیا کی غزل پر اپنی پسندیدگی کا اعلان کیا تھا۔

مجھے جون کی شاعری کیوں پسند ہے۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ مجھ کو میر پسند ہیں، مجھ کو سودا پسند ہیں، مجھ کو آتش پسند ہیں، مجھ کو یگانہ پسند ہیں، مجھ کو غالب پسند ہیں، مجھ کو اقبال پسند ہیں، مجھ کو انیس پسند ہیں۔ یہ سب شاعر ایک دوسرے سے بہت

مختلف ہیں مگر اُن سب شاعروں میں کچھ عناصر ایسے ہیں جو مشترک ہیں۔ یہ سب شاعر جذبے کی شدت پر یقین رکھتے ہیں۔ زبان کے تخلیقی استعمال کے ہنر سے کامل واقفیت رکھتے ہیں۔ کثیر المطالعہ ہونے کے باوجود ان میں سے کسی کا شعر کسی دوسرے کے شعر سے متاثر نظر نہیں آتا۔ جون کی دنیائے شاعری اُردو ادب کی تاریخ میں تمام ہم عصر اور بزرگ شعرا سے مختلف ہے۔ شدت ہے، شورش ہے، اضطراب ہے، حیرت ہے، سوالات ہیں، زندگی ہے، اپنی تلخیوں کے ساتھ اپنی بوقلمونیوں کے ساتھ جون ایلیا نے ایک مصرع بھی ایسا نہیں کہا جس پر ان کے دست خط ثبت نہ ہوں۔ جون سادہ، رواں اپنے لحن میں بہت مختلف۔ اور ایک بات، یگانہ کے بعد جون ایلیا واحد شاعر ہیں جن کے ہاں لہجے کا استعمال اعجاز کی منزلوں کو پہنچا ہوا ہے۔ اُردو کے کسی شاعر نے لہجے سے ایسے یاد رہ جانے والے شعر تخلیق کیے ہوں جیسے جون نے کیے ہیں۔

اُس کی گلی سے اُٹھ کے میں، آن پڑا تھا اپنے گھر
ایک گلی کی بات تھی، اور گلی گلی گئی

جسم کی صاف گوئی کے با وصف
روح نے کتنا جھوٹ بولا تھا

عہدِ رفاقت ٹھیک ہے لیکن، مجھ کو ایسا لگتا ہے
تم تو میرے ساتھ رہو گی، میں تنہا رہ جاؤں گا

کتنی وحشت ہے درمیانِ ہجوم
جس کو دیکھو، گیا ہوا ہے کہیں

ہے عجب کچھ معاملہ درپیش
عقل کو آگہی سے خطرہ ہے

تُو ہے پہلو میں پھر تری خوش بو
ہو کے باسی کہاں سے آتی ہے

اپنے سبھی گِلے بجا، پر ہے یہی کہ دل رُبا
میرا ترا معاملہ عشق کے بس کا تھا نہیں

شفقِ شامِ ہجر کے ہاتھوں
اپنی اُتری ہوئی قبا بھیجو

شہروں میں ہی خاک اُڑا لو شور مچا لو بے حالو
جن دشتوں کی سوچ رہے ہو وہ کب کے برباد ہوئے

مجھ میں خواہش ہی ڈھونڈنے کی نہ تھی
مجھ میں کھویا رہا خدا میرا

میں دیکھتا ہوں، آئے دن مشاعروں میں، سوشل میڈیا پر، رسالوں میں جون کے اتباع میں غزلیں چھپتی ہیں، ان کی زمینوں میں شعر کہے جاتے ہیں، اُن کی طرح سے اسٹیج پر بے چینی اور بے سکونی اور نشست و برخاست میں بے سکونی کا جو رنگ رچایا جاتا ہے مگر سب بے سود۔ بالوں سے کھیلنا اور ہاتھوں کو شانوں اور فرش پر مارنے سے اگر جون کے مصرع کی گرد بھی میسر آ جاتی تو بھی کچھ کام بن جاتا۔ یاد آیا، اُردو شاعری کے ایک بڑے شاعر شیخ امام بخش ناسخ کا انتقال ہوا تو جنازے میں میر انیس تشریف نہیں لے جا سکے۔ چھیڑنے والے نے میر کو زچ کرنے کے لیے نہ جانے کا سبب پوچھا۔ میر صاحب نے فرمایا، یہ صحیح ہے کہ فیض آباد سے جب میں نیا نیا لکھنؤ آیا تھا تو والد صاحب کے ایما پر میں نے اپنی غزل استاد کو دکھائی تھی مگر بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ فرمایا، زبان و بیان پر اُستاد ناسخ کی دست رس تمام و کمال مگر دل میں خاک ہوتی تھی۔ ہمارے زمانے میں بے شمار شاعر ہیں جو شعر کہہ رہے ہیں مگر دلوں میں خاک اُڑتی ہے۔ جون کی شخصیت بھی

اور شاعری بھی ہمہ وجود دل سے عبارت تھی۔ ایسا دل جس کا مرکز و محور عشق تھا۔ اپنی ذات سے عشق، اپنے تصورِ زندگی سے عشق، اپنے رشتوں سے عشق اور یہی عشق تھا جس پر ان کی زندگی بھی عبارت تھی اور شاعری بھی۔ جون ایلیا غروب ہونے کے بعد از سرِ نو طلوع ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ابھی ان کی روشنی میں اور اضافہ ہوگا اور آنے والی نسلیں جون کے مقام و مرتبے سے آشنا ہو سکیں گی۔

مشتاق احمد یوسفی اور سلیم احمد، دونوں میرے بزرگ مربی اور اساتذہ کی منزل میں اپنے اپنے طور پر ایک بات کا اعادہ کرتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ شاعری کی مقبولیت کو معیار نہیں قرار دیا جانا چاہیے۔ وہ اشعار جو بہ یک وقت سیکڑوں، ہزاروں سامعتوں کی سمجھ میں آجائیں، وہ اور کچھ ہو سکتے ہیں، شاعری نہیں۔ انگریزی میں Verse اور Poetry کے درمیان کبھی کبھی ایک فرق قائم کیا جاتا ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات کلی طور پر درست نہیں ہے۔ بہت سے شاعر ایسے ہیں اور رہے ہیں، جو خالص سکہ ادبی حلقوں میں بھی لائقِ توجہ تھے اور عوام کے دلوں میں بھی ان کی شاعری نے گھر کر رکھے تھے۔ پھر یہ بھی کہ ہمارے اجتماعی حافظے میں بے شمار اشعار ہیں جن میں مشکل اور تہ دار شاعری بھی ہے اور سادہ، رواں اور سہلِ ممتنع کے نمونے بھی۔ سہلِ ممتنع کی تعریف درسی نصابی کتابوں میں اوّل اوّل جو بیان کر دی گئی تھی، وہی راسخ ہوگئی ہے۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ سہل ممتنع کا تعلق رواں زبان میں سامنے کے مضامین بیان کر دینا ہے۔ میر، غالب، انیس، نظیر، حالی، حسرت کے یہاں کیسے کیسے تہ دار اور پُرمعنی اشعار اور کیسی سلاست و روانی کے ساتھ نظم کر دیے گئے ہیں۔ ہمارے زمانے میں جون ایلیا کی غزلیں اس کی بہترین مثال ہیں۔ جون کی نظموں کا مزاج مشکل پسندی کی طرف ہے۔ ظاہر ہے تہذیب اور مباحث کے بیان میں فلسفیانہ رنگ اختیار کرتے ہوئے لغت کا مشکل ہو جانا سمجھ میں آتا ہے۔ دو ایک کتابوں میں جون کی فرہنگ بھی فراہم کی گئی ہے مگر اس میں بھی نامانوس الفاظ کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ جون جس روایت کے آدمی تھے اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ اور فلسفیانہ روایتوں کی لغت مجلسوں، محفلوں میں عام استعمال ہوتی تھی مگر انگریزی ذریعۂ تعلیم سے گزری ہوئی نسل ہی نہیں، اُردو میڈیم طلبہ و طالبات ہی نہیں اساتذہ کے لیے

بھی بہت سے الفاظ مشکل نظر آتے ہیں۔ اب اس المیے کا کیا تذکرہ کیا جائے۔

ایک واقعہ یاد آیا ہمارے اُردو شعرا چاہے وہ ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں، مشاعرے میں اپنے مقام و مرتبہ کے تعین میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ ہمیشہ مشاعرے کے میزبان اور شعرا اس الجھن میں مبتلا رہتے ہیں کہ کون سا شاعر کس شاعر سے پہلے اور کس کے بعد پڑھ رہا ہے۔ مجھے بھی مشاعروں میں شریک ہونے کا موقع میسر آیا اور میں نے دیکھا کہ اچھے اچھے معقول شعرا اس مقام کے چکر میں گرفتار نظر آتے ہیں، اور مگر مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ کراچی کے شعرا میں یہ مسئلہ بہت زیادہ پریشان کن نظر آتا ہے۔ بہت کم شاعر ہیں جنھیں اپنی عظمت و فضیلت کا احساس نہ ہو۔ جون خبطِ عظمت کے اس مرض سے بالکل محفوظ تھے۔ کراچی کے شہرِ قائد کے مشاعروں میں کئی بار میں نے اپنے آپ کو مشکل میں پایا۔ بعض سینئر شعرا اپنے معمولاتِ شبانہ کے سبب مشاعرے میں دیر سے تشریف لاتے یا پھر یہ کہ مشاعرے کے درمیان میں اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔ مشاعرے کے مندوبین میں میرے ایک جانب دار دوست اظہر عباس ہاشمی مرحوم جو دراصل اس مشاعرے کے روحِ رواں تھے، مجھے آگے بڑھانے میں کوشاں رہتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ خود میرا بھی جی چاہتا تھا مگر میں نے کبھی کسی بھی مرحلے میں اپنے بزرگ اور صاحبِ کمال و منزلت شعرا کے حضور سرتابی نہیں کی۔ عمر میں بڑے لکھنے والوں کا احترام ہمیشہ واجب جانا مگر معیارِ شعر پر ہمیشہ احتیاط برتی۔ اظہر نے جب بھی مجھے صدارت کے لیے کہا تو میں نے اپنے سینئر شعرا کی نشان دہی کرتے ہوئے معذرت چاہی اور خاص طور پر جون ایلیا کی موجودگی میں صدارت سے انکار کیا۔ انھوں نے بھائی جون سے ذکر کیا تو وہ میرے پاس آئے اور مجھے گلے لگا کر پیار کرتے رہے اور کہنے لگے، جانی میری موجودگی میں یہ کام شروع کر دے ورنہ بعد میں یہ تیری جان کو آ جائیں گے۔ میں کیا شاعر ہوں مگر جون ایلیا جیسے مشکل شاعر کی ایک تھپکی مجھے عمر بھر ایک غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لیے کافی ہے۔

میری خالد انصاری سے شناسائی جون ایلیا کے دوسرے مجموعوں کے حوالے سے ہوئی۔ اُردو دنیا کو خالد کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے عہد ہی کے نہیں اُردو کے

بہت اہم شاعر کی بکھری ہوئی تحریروں کو یک جا کیا اور یکے بعد دیگرے شایع کیا۔ اُردو ادب کی تاریخ میں شاعر سے اتنی محبت، ایسی بے لوث عقیدت کرنے والے کم از کم اُردو دنیا تک تو نظر نہیں آتے۔ بکھرے ہوئے سامان کو یک جا کرنا خالد انصاری کے لیے ہمارے حرفِ سپاس کو لازم کرتا ہے۔

اور آخر میں جون ایلیا کا ایک بیان۔

میرے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے میرے پاس اگر ایک ثانیہ بھی رہ گیا ہے تو وہ الیکٹرونی گھڑی کے مطابق ہزاروں آنات کا اثاثہ ہے جو میرے لیے بہت سے نئے خوابوں کی ضمانت بن سکتا ہے۔ اور میں خواب دیکھنے کے سوا کوئی ہنر جانتا بھی تو نہیں۔

ہم نادیدہ افقوں سے اُٹھنے والے بادلوں کا انتظار کرتے رہے کہ ہمیں سمتوں کو دھونا تھا، آبشاروں کے ہزاروں سے چھتنار پیڑوں اور پودوں کو دھونا تھا جو تاریخ کی گردافشانی سے گرد آلود ہیں۔ تمھارے اور اپنے آنسوؤں سے بے سود گلہ مندیوں کے چہروں کو دھونا تھا...... شاخوں اور...... ان کی جنبشوں کے آہنگ پر چہچہانے والے پرندوں کو اور ان کے پروں کو، ان کی منقاروں کو دھونا تھا۔ ہواؤں اور بادلوں...... اور بادلوں میں کوندتی ہوئی بجلیوں کو دھونا تھا۔ ہمیں اس دنیا کو دھونا تھا جس میں ہماری آج تک کی نسلیں سانس لیتی رہی ہیں۔ ہمیں یزداں، اہرمن اور انسان کو دھونا تھا مگر ہم کچھ بھی نہیں کر سکے......

میں اپنے بعد آنے والوں کے پہلے پرے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری، میرے ساتھیوں کی آنکھیں، ایک عمر سے سلگ رہی ہیں، جل رہی ہیں۔ میں ان آنے والوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنا، اُن کے ماتھے چومنا اور پھر اپنی پلکیں بند کر لینا چاہتا ہوں۔

وہ آگئے ہیں...... تم آگئے! میں جون ایلیا ہوں، اچھا اب میں چلتا ہوں، تم نے بہت انتظار کرایا، اور ہاں تمھاری ایک امانت میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہ میرے خام اور ناتمام لفظ ہیں یعنی میرے اشعار۔ میرے وہ اشعار جو میں نہیں کہہ سکا۔ انھیں شاید ڈیوڈ کہے گا یا احمد، یا کیلاش یا شاید منوچہر...... اور اب میں تمام ہوتا ہوں۔"

جونِ سوختہ جاں

اقبال حیدر

کہا جاتا ہے کہ جون ایلیا کو مرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔ جی ہاں جون کو مرے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ شاید یہ سچ بھی ہے کہ گوشت پوست کے بنے ہوئے اپنے وجود کی جسمانیت پر نالاں اور رشتوں میں جکڑے ہوئے جذبوں کی سطحیت پر پشیماں اس آدمی کو مرے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا مگر کیا وہ ارتیابیت گزیدہ اور اپنی حالت خیزی، رمزیت آمیزی اور دل انگیزی کے سبب واماندہ و درماندہ شاعر اور کیا وہ نفی پسندی و نوضویت انگیزی کے باعث وجود کی جسمانی ناگزیریت پر برہم فطانت مآب بھی فنا ہو گیا اور وہ تخلیقیت سے سرشار زمانی و مکانی قید سے مملو جمال کا صورت گر بھی مر گیا؟ نہیں، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا......ایک ایسا عمیق 'مثالیہ پسند' شاعر اور خیال و وجدان کا فسوں گر، جس کے نفس نفس میں احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ یک سر ہم آہنگ ہو کر ایک تخلیقی وحدت کی شکل اختیار کر لے، کیا وہ بھی فنا ہو سکتا ہے؟ جی نہیں۔ جو زندگی کو جواز فراہم کرے اور جو وجود کی شنویت کا اقرار کر کے اسے خارج اور باطن میں ہمہ وقت پائندگی دے، وہ کیسے مر سکتا ہے؟ جون نے اپنے مخصوص انداز میں جمالیاتی اور اخلاقی نوعیت سے بحث کرتے ہوئے فن کے تعلق سے جمالیات کو عقیدے اور اخلاقیات کا حدِ فاصل بتایا ہے اور 'مابعد الطبیعیاتی حقائق' کے شعرا اور اصل شعرا میں امتیاز کرتے ہوئے جمال کو غیر زمانی و غیر مکانی ماننے سے انکار کیا ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب شاعر اپنی فطرت کی ارتقائی حالت میں جمالیات کی آہنگ سازی اور صورت گری کرتا ہے تو وہ خود غیر زمانی اور غیر مکانی ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے فن کے ساتھ خود بھی امر ہو جاتا ہے اور جون بھی امر ہے بل کہ 'امرتر' ہے کیوں کہ اس کے یہاں جمالیاتی تفہیم اپنی خوب صورت ترین صورتوں میں آشکار ہوتی ہے۔ جون نہیں مر سکتا، جون زندہ ہے اور زندہ رہے گا بل کہ جون ہی کیا اُس کی قبیل کے تمام خدا شعار، تخلیق کار زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

اب اس دنیائے فانی کی سفا کی دیکھیے کہ جون جیسا نابغۂ روزگار، اپنی تمام تر خلاقیت کے باوجود موت کی پناہوں میں زندگی کی تمازتوں اور بے اعتنائیوں سے محفوظ ہے اور کیوں نہ ہو، جون جیسا Social Misfit، سماجی باغی، اپنی تمام تر خلاقانہ فطانت، تہ داری اور Charismatic رعنائیوں کے ساتھ عام تخلیق کاروں کو متاثر کرسکتا ہے اور بہتر بنا سکتا ہے مگر ان میں مقبول نہیں ہوسکتا۔ گویا مربی تو ہوسکتا ہے مرکزِ نگاہ نہیں۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے ان تمام لوگوں کو جو زندگی کے کسی بھی موڑ پر اور تاریخ کے کسی بھی دور میں آئے ہیں، اپنے زمانے میں بدحال اور ناآسودہ رکھا ہے۔ یہ ایک Social Behavior کی بات ہے جو ضروری نہیں کہ ہر شاعر، ادیب یا فن کار میں ہو۔ اس کا تعلق براہِ راست آپ کے Conviction اور Commitment سے ہے، فن جس کا اظہار ہوسکتا ہے مگر مدار نہیں۔

جون جیسا انا پرست، عالمِ فوضویت کا شکار ہوسکتا ہے مگر مصلحت کا نہیں۔ یہ مزاج کا خاصہ نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر چیز اپنی ضد کی صورت میں وقوع پذیر ہے۔ جو ہے وہ نہیں ہے اور جو نہیں تھا، وہ ہے۔ اس معکوس رویے کی بنا پر تخلیق میں پہلوداری، درایت اور ایک ابدی کشش تو پیدا ہو جاتی ہے مگر خالق اندر ہی اندر پارہ پارہ ہوتا رہتا ہے۔ جون کے ساتھ بھی یہی ہونا تھا اور یہی ہوا۔ جون نے جس کا انکار کیا، اس کے حصار سے نہیں نکل پائے، چاہے وہ شخصی سطح پہ ہو یا ماورائی سطح پر۔ اور ایسا نہیں ہے کہ جون اس قبیل کے لوگوں میں اکیلے ہیں۔ یہ تاریخ ساز، معاشرہ خیز اور انسانیت شعار لوگوں کا وتیرہ رہا ہے۔ آج بھی، کل بھی اور آئندہ بھی۔

جون کی شاعری پر گفت گو کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ اُن کے بارے میں کچھ اور بات کی جائے۔ جون تو مجلسی اور معاشرتی آداب سے اپنے آپ کو مبرا کیے ہوئے تھے۔ وہ بالکل بے خبر نہیں تھے۔ Social Norms برتنے کی چیز ہے اور جس معاشرے

میں منافقت رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو، وہاں اس ظاہری اخلاق کو تج دینا ہی بہتر ہے۔ جون نہ صرف اس کلیے سے واقف تھے، بل کہ اس بات پر مُصر تھے، عملی اور فکری دونوں لحاظ سے، جب ہی تو کہا تھا۔

میں بے ہوشی میں بھی بے ماجرا نہیں

ایک عالمِ بے پروا میں گم اور قلندرانہ بے نیازی کے باوجود انھیں غافل یا منفعل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر جون کہیں پر موجود ہوں تو فضا ان کی حیثیت کا اور منصب کا مژدہ لیے خاموشی سے زینتِ گوش سناتی رہتی تھی۔ جن لوگوں کو جون شب زندہ دار کے ساتھ شب باشی کا موقع ملا ہے، وہ بہ خوبی واقف ہیں کہ پچھلے پہر کے گداز اور عالمِ سرخوشی میں جون انتہائی شدّت کی اذیت ناکی جھیلنے کے باوجود علم و دانش کا ایک ایسا جیتا جاگتا پیکر ہوتے تھے کہ ان سے نہ صرف سننے اور دیکھنے والوں کو عقیدت ہو جاتی تھی بل کہ یہ انکشاف بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنے 'ہم عصروں' نہیں 'عصر' سے کتنے آگے ہیں۔ یہ صرف تعریفی جملے اور منقبتی اصراف نہیں بل کہ دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہوا ایک ایسا ابدی تاثر ہے جو زندگی بھر ساتھ رہتا ہے۔ جون کے انتہائی ذاتی اور منفرد لب و لہجے اور اسلوب پر گفت گو کرنا اتنا آسان نہیں ہے، اس میں ان کا کوئی مربی نہیں، نہ اس دور میں نہ اس سے پہلے۔ یہ بات پوری ذمے داری سے کہی جا رہی ہے اور اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جانا چاہیے کہ ان کا اسلوب اور اسٹائل کسی سے یا سب سے بہتر تھا۔ یہاں تقابلی گفت گو نہیں ہے بل کہ صرف اتنا کہ ان کا اسلوب جتنا ذاتی (Personal) تھا، اتنا اُردو میں کسی اور کا نہیں سوائے میر کے۔ جون کے یہاں بھی Evolution تھا مگر Creation بہ تدریج زیادہ تھا۔ ان کے سابقین میں کوئی بھی اُن کے اسلوب کا براہِ راست منبع یا Source نہیں تھا۔ یہ ان کے ذہن کا کرشمہ تھا۔ اس ایجاد و اختراع، ژولیدہ بیانی اور ژرف نگاہی میں اگر کوئی دوسرا نام اُردو میں آتا ہے تو وہ ہے خدائے انفرادیت و ژرف نگاہی اسد اللہ غالبؔ کا۔ جون غالبؔ سے زیادہ میرؔ سے متاثر و معترف تھے اور کیوں نہ ہوں، انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور فراقؔ اپنی اپنی جگہ یقیناً ایک اسلوبِ سخن کے موجد کہے جا سکتے ہیں، مگر اتنا Original کوئی بھی نہیں جتنے میرؔ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ میرؔ ہی صحیح معنوں میں موجد کہے جا سکتے، باقی تمام لوگ

موجد سے زیادہ مجدد ہیں کیوں کہ انھوں نے کسی سابقہ یا رائج الوقت اسلوب کو جداگانہ انداز دے کر اپنے آپ سے مختص کرلیا ہے۔ جون بھی ان معنوں میں موجد نہیں ہیں مگر ان کا مقابلہ وہی غالب والا ہے کہ سابقین میں سے کوئی بھی ان کے اسلوب کے علامتی جہاں کا براہِ راست منبع نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ بات اس لیے اتنی تفصیل سے کہی جارہی ہے کہ اب کے لوگ (Form) ہیئت اور اسلوب کو مدغم کرتے جارہے ہیں۔ کسی بھی شاعر کے لیے یہ بات باعثِ فخر وطمانیت ہوسکتی ہے کہ اُس نے کچھ تخلیقات ایسی پیش کیں جو مواد یا ہیئت یا دونوں اعتبار سے بالکل نئی یا نادر تھیں۔ اس کے کل اثاثے کی نسبت ایسی تخلیقات کا تناسب ہی اس کی عظمت کی دلیل ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ عظمتِ فن خصوصاً عظمتِ شعری اس بات کی متقاضی ہے کہ اس وحدت کو تلاش کرے جو قلزمِ عقل اور بحرِ بے کنارِ حسیات کے اتصال یا سنگم سے وجود میں آتی ہے۔ اس آفاقی توازن (Universal Equilibrium) کے مؤثر ترین اظہار ہی کا نام شاعری ہے۔ غازہ کاری، محدودیت اور عجز، عظمتِ فن کے ازلی مخالف ہیں۔ منفی اور مثبت اقدار یا خیالات کی تقسیم یا فرقہ بندی، ادب کی معروضیت اور افادیت کو ختم کرتی ہے اور اس Unison کو مجروح کرتی ہے جس کی بنیاد پر یہ کائنات اور انسانیت زندہ ہے۔ جون ایلیا ہی نے ایک جگہ 'شاید' کے بے مثل نثر پارے میں لکھا ہے کہ 'شاعر کا رشتہ صرف جمال سے ہوتا ہے۔' اور جمالیات کی تعریف میں انھوں نے اخلاقیات کو بھی ضم کردیا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اگر اخلاقیات، جمالیات سے کم یا زیادہ ہے تو پھر وہ عقیدہ ہے جس کا تعلق شاعری سے نہیں۔ یہ ایک بڑی دل چسپ اور منطقی تعریف ہے۔ اصل میں تو جون کا یہ دیباچہ بہ ذاتِ خود ایک نادر و نایاب اور کم از کم اس زمانے کی حد تک Unique نثر نگاری اور تعقل آمیز جمالیاتی اظہار کا بے مثل شاہ کار ہے۔ اس کے جملے اور مفاہیم اپنی ساخت اور اپنی شناخت کے لحاظ سے اتنے نئے ہیں کہ شاید اُردو کے بیش تر قاری صرفِ نظر کی آزمودہ، دیرینہ اور انا گزیدہ پناہوں کی آڑ میں بیٹھ کر صرف غزل اور سہل غزل سے لطف اندوز ہونا مناسب سمجھیں۔ جون کی شاعری سے پیش تر جون کی نثر اور انتہائی فلسفیانہ فکر کی دھوم رہی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ایک اقتباس اس نثر پارے کا اور نقل کیا جائے مگر مِن و عَن تا کہ لوگ اس وحدتِ تخلیق

کے پیچھے جو ذہن کارفرما ہے، اُس کا براہِ راست مشاہدہ کرسکیں۔ ایک انتہائی غیر معمولی شاعر اور اُس سے بھی زیادہ غیر معمولی انسان نفسِ شاعری کے بارے میں یوں رقم طراز ہوتا ہے۔

'شاعر کی ذات میں فطرت کے ارتفاع کا جمالیاتی بروز ہوتا ہے۔
یہاں شاعر سے ایک ایسا متنفس مراد ہے جس کے نفس میں احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ ہم آہنگ ہوکر ایک تخلیقی وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ تخلیقی وحدت، بامعنی صوتی وحدتوں (لفظوں) کی غنائی تالیفات میں صورت پذیر ہوکر شاعری کہلاتی ہے۔
اب رہا خیال یا شعر کا موضوع......تو اس سلسلے میں منطق کا ذکر ناگزیر ہے۔ منطق شعور کی اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ کسی بھی حالت میں اور شعور منطق کے اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ غرض کسی بھی درجے میں۔ یہ گفت گو اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے میں بل کہ تمام معاشروں میں شروع ہی سے شاعری کو الہام یا کہانت سمجھا گیا ہے۔ شاعری کا تعلق اگر پیڑو اور پنڈے سے نہیں ہے بل کہ دماغ سے ہے، ذہن سے ہے تو ذہن کی سب سے اعلیٰ حالت یعنی منطقی حالت کا ذکر ناگزیر ہے۔
منطق جب انتاج اور استنتاج کے متدرّج عمل میں غیر متدرّج ہو جائے تو مابعد الطبیعیات وجود میں آتی ہے۔ منطق جب انتاج اور استنتاج کے استخراجی اور استقرائی عمل میں متدرّج رہے تو سائنس وجود میں آتی ہے۔ اور منطق جب احساس کی مکانیت اور زمانیت میں تخیل اور جذبے کے جمالیاتی آہنگ کے ساتھ صورت پذیر ہو تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ یعنی شاعری کے چار عناصر ہیں، تعقل، احساس، تخیل اور جذبہ۔ جب کہ سائنس بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر صرف احساس سے تعلق رکھتی ہے، مذہب تخیل سے تعلق رکھتا ہے، فلسفہ صرف تعقل سے تعلق رکھتا ہے اور شاعری احساس، تخیل، تعقل اور جذبے (چاروں عناصر) کی جامع ہے۔'

ان اقتباسات کو ویسے تو ایک انتہائی خوب صورت نثر کے طور پر پڑھ کر ہی انبساطِ فکر حاصل کیا جا سکتا ہے مگر یہاں پر اس کے نقل کرنے کی اصل غایت یہ ہے کہ لوگ جون کے

جوہر تخلیق کی منطقی حالت کو سمجھ سکیں۔ یہ محسوس کر سکیں کہ جس وحدتِ تخلیق یا تخلیقی وحدت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ جون کے یہاں اور ان کے قبیل کے تمام شعرا کے یہاں کتنی شفافیت (Transparency) کے ساتھ جلوہ فرما ہے اور ایک منضبط فکری رویے کی طرح شاملِ عمل تخلیق ہے۔ چاہے اظہار نثر میں ہو یا نظم میں، یہ رویہ خونِ رگِ جاں کی طرح جاری وساری ہے۔

جون نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ دوآبۂ گنگ وجمن کے حالت خیز، رمزیت آمیز اور دل انگیز شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ یہ حالت خیزی، رمزیت آمیزی اور دل انگیزی ان کی شاعری اور تخلیقی کاوشوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چاہے غزل کہہ رہے ہوں یا نظم، "Originality" کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ کچھ مثالیں۔

نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو، وہاں اکثر نہ رہیو
ہر اک حالت کے بیری ہیں یہ لمحے
کسی غم کے بھروسے پر نہ رہیو

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

آپ اپنی گلی کے سائل کو
کم سے کم پُرسوال تو رکھیے

ہے عجب فیصلے کا صحرا بھی
چل نہ پڑیے تو پاؤں جلتے ہیں

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا نئیں

کوئی دم چین پڑ جاتا مجھے بھی
مگر میں خود سے دم بھر کو جدا نئیں

تھے عجب دھیان کے در و دیوار
گرتے گرتے بھی اپنے دھیان میں تھے

ہے جو پُرخوں تمھارا عکسِ خیال
زخم آئے کہاں کہاں جاناں

خود نگرانِ دل زدہ، دل زدگانِ خود نگر!
کوچۂ التفات سے خود نگراں گزر گئے
کیا وہ بساط اُلٹ گئی، ہاں وہ بساط اُلٹ گئی
کیا وہ جواں گزر گئے، ہاں وہ جواں گزر گئے

حیف درازی اس قصے کی اس قصے کو ختم کرو
کیا تم نکلے اپنے گھر سے، اپنے گھر سے ہم نکلے

کتنی آنکھیں ہوئیں ہلاکِ نظر
کتنے منظر نہیں رہے آباد

کیا ہوئے آشفتہ کاراں کیا ہوئے
یادِ یاراں یارِ یاراں کیا ہوئے
سو رہا ہے شام ہی سے شہرِ دل
شہر کے شب زندہ داراں کیا ہوئے
اس کی چشمِ نیم وا سے پوچھیو
وہ ترے مژگاں شماراں کیا ہوئے
کیا ہوئے صورت نگاراں خواب کے
خواب کے صورت نگاراں کیا ہوئے

کہاں تک لکھا جائے، کہاں تک مثال دی جائے۔ غزل کی غزل انتخاب اور نظم کی نظم گنجینۂ افکار ہے۔ جون ایلیا جہاں جمالیات اور اخلاقیات کی گفت گو کرتے ہیں اور منطقی حوالوں سے مختلف علوم اور شاعری کی درجہ بندی کرتے ہیں، وہاں وہ یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں، 'شاعری ایک دُہرا انسان چاہتی ہے'، 'شاعری ہی وہ فن ہے جو ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو ہم عصر بناتا ہے' یا 'مابعد الطبیعی حقائق کے شاعر، شاعر سے بلند مرتبے کے حق دار تو ہو سکتے ہیں مگر شاعر نہیں ہو سکتے۔' 'شاعر کا سب سے گہرا رشتہ جمال سے ہوتا ہے اور جمال غیر زمانی اور غیر مکانی نہیں ہوتا۔' اب اگر شاعری ایک ایسا فن ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو ہم عصر بناتا ہے اور شاعر کا سب سے گہرا رشتہ جمال سے ہے اور جمال زمانی و مکانی ہے تو کیا یہ دوسرے لفظوں میں اس بات کا اعادہ نہیں ہے کہ مابعد الطبیعیاتی نظام یا فکر ہی جمال کی اولین، ازلی یا ابدی حالت ہے۔ مگر وہ اس سے گریز نہیں کرتے بل کہ جہاں وہ مابعد الطبیعیاتی شاعری کو ماسوا شاعری کوئی اور چیز کہتے ہیں، وہ غالباً عقیدہ پرستی، اثباتی اور منطقی اثباتیت کی ادعائی شاعری سے گریز کرتے نظر آتے ہیں اور اس شریفانہ اعتراف اور تہذیبِ نظر کے حامی ہیں کہ دلیل وِلیل شاید کچھ نہیں، وہ تو ایک تاریخی، سماجی اور نفسیاتی تکیف (Conditioning) ہوتی ہے جو کسی رائے اور مسلک کو اختیار کرنے کا رجحان پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک بہت صحت مند اور مہذب اندازِ فکر ہے۔ وہ شاعری کے حوالے سے اس کو بدتہذیبی یا بددیانتی گردانتے ہیں جہاں اپنے اختیار کردہ اندازِ فکر کو یا رائے کو اوروں پر تھوپنے کی کوشش کی جائے یا اس بنیاد پر تخصیص و تقسیم کی جائے، ورنہ ان کی شاعری کا سارا کا سارا خمیر ہی ان ازلی اور ابدی غیر معمولی اور نامحسوس تو جیہات سے اُٹھا ہے مگر وہ بشریت اور ارضیت کے قائل ہیں۔ اس کا اظہار جا بہ جا ان کے اشعار میں موجود ہے۔ جا بہ جا انھوں نے حق اور خدا کے تفاوت کو موضوع اور ادعائیت کو ہدف بنایا ہے۔

کون سا قافلہ ہے یہ، جس کے جرس کا ہے یہ شور
میں تو نڈھال ہو گیا، ہم تو نڈھال ہو گئے

سایۂ ذات سے بھی رَم، عکسِ صفات سے بھی رَم
دشتِ غزل میں آ کے دیکھ ہم تو غزال ہو گئے

مجھ سے میرا سراغ کیوں کہ یہ کام
میں ترے نقشِ پا کے سر چاہوں
اب تو اس سوچ میں ہوں سرگرداں
کیا میں چاہوں بھلا اگر چاہوں

پہنائی کا مکان ہے اور در ہے گم یہاں
راہِ گریز پائیِ صرصر ہے گم یہاں
ہیں صفحۂ وجود پہ سطریں کھنچی ہوئی
دیوار پڑھ رہا ہوں مگر در ہے گم یہاں

خدا نہیں ہے تو کیا حق کو چھوڑ دیں اے شیخ
غضب خدا کا ہم اپنے امام کے نہ رہیں

ہم نے خدا کا رَد لکھا نفی بہ نفی، لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں
اے خدا (جو کہیں نہیں موجود)
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نئیں

جون ایلیا پر کوئی گفت گو سیر حاصل اور کوئی تحریر معتبر نہیں ہو سکتی جب تک ان کی غیر معمولی کاوش، 'رمزِ ہمیشہ' کا ذکر نہ ہو۔ مجھے یاد ہے جب جون بھائی گزشتہ مرتبہ کیلگری آئے تھے اور ہماری بہت ساری One on one رات گئے کی محفلوں میں اس نظم کا

تذکرہ چھڑ گیا تھا۔ میں نے تعریف کی تو بہت خوش ہوئے اور کہا، 'تجھے یہ نظم پسند ہے تو بتا کیوں پسند ہے؟' میں نے عرض کیا، 'یہ آپ کے نظامِ فکر کی نمائندہ تخلیق ہے، کم از کم 'شاید' کے حوالے سے۔' مزید خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ 'نظم نکالو۔' میں نے 'شاید' میں وہ صفحات نکالے۔ قلم لیا اور نظم کے مختلف حصوں کو انڈر لائن کرنے لگے (جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔) اس کے بعد کہا، اس نظم میں میں نے بہت سے ایسے ٹکڑے اور بندشیں استعمال کی ہیں جو آج سے پہلے کسی نے اُردو میں استعمال نہیں کیں۔ یہ تو خیر ایک بات تھی جو اچانک یاد آ گئی مگر اس نظم کی حد تک یہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ جون ایلیا کے اس بیان کی واضح تصدیق ہے کہ جب احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ ہم آہنگ ہو کر ایک تخلیقی وحدت بن کر بامعنی ہوتی وحدتوں میں صورت پذیر ہوتے ہیں تو یہ شے شاعری کہلاتی ہے۔ میں اپنے اس مضمون کو اسی اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔

اور پھر

وہ زمانہ بھی آیا کہ جب
میں ترے باب میں مضمحل ہو گیا
بادِ یغما گرِ نفی و انکار نے
اُن فرحناک اَسرار کے
عالمِ خواب آگیں کو زیر و زبر کر دیا
وہ خجستہ وہ خوش ماجرا روز و شب
وہم و خواب و خیال و گماں ہو گئے
وہ معانی وہ احوالِ جاں آفریں
بے اماں ہو گئے
فیضِ توفیق کی
وہ رسد رُک گئی
وہ یقیں کے اُفق
بے نشاں ہو گئے

جو بھی آسان تر تھا وہ دشوار تر ہوگیا
میری حالت یہ تھی
جیسے میں اک سفر کردۂ دور افتادہ ہوں
اور ایقانِ فرخندہ و برگزیدہ کی وہ سرزمیں
میرے لمسِ کفِ پا سے
قرنوں کی دُوری میں
گم ہو چکی ہے
میں تنہا ہوں
بے چارہ ہوں
تب میں نے گزرے زمانوں میں
اور آنے والے زمانوں میں فریاد کی
اے خدا!
اے خداوند!
اب مرا باطنِ ذات ویران ہے
اب درونِ دروں
اور بیرونِ بیروں
فقط اک خلا ہے
فقط ایک لا
دہر دہر اور دیوّم دیوّم میں
اب عدم در عدم کے سوا کچھ نہیں
اے خداوند تو کیا ہوا
مجھ کو تیرے نہ ہونے کی عادت نہیں
وائے بر حالِ ژرفا و بالا و پہنا!
دریغا! سبب ہر مسبّب سے اپنے جدا ہوگیا
حسرتا! کہکشاؤں کے گلّوں کا چوپان کوئی نہیں

اور پھر میں نے
موجود کے دائرے کی نہایت پہ نالہ کیا
اے یقیں کے گماں
اے گماں کے یقیں
اے ازل آفریں
اے ابد آفریں

اے خدا الوداع
اے خدایاں خدا
الوداع، الوداع

'رمزِ ہمیشہ' صرف ایک نظم نہیں، یہ ایک ازلی اور دائمی کیفیت کا اظہار ہے۔ یہ نہ انکار ہے، نہ اقرار...... اگر کچھ ہے تو بہ یک دونوں ہے۔ تلاش، جست جو اور ناگزیریت کی ایک رمساتی ہوئی جمالیاتی تجسیم ہے۔ یہ انسانی شعور کی اُس ابدی خلش سے فرار پانے کی خواہش ہے جس کے نہ ہونے کی ہمیں عادت نہیں ہے اور وہ شاید ضروری بھی نہیں ہے جیسا کہ ہیگل نے کہا کہ حقیقت اور اس کے پرتو کی تقسیم صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ ہم نے خارجی مادے اور تصور کرنے والے ذہن کو دو الگ الگ اکائی تصور کرلیا۔ حالاں کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ 'شعور' حقیقتِ کبریٰ ہے اور مادہ و خارج وغیرہ اس کے مختلف مدارج۔ فی الحقیقت وجود صرف شعور ہی کا ہے، چاہے آپ اسے 'پرتو' جان لیں یا 'حقیقت'۔ یعنی اب جس سے فرار مقصود ہے، وہی عینِ نسب ہے۔ یہ 'ہونے' اور 'نہ ہونے' کی بحث نہیں ہے، یہ سراسر 'ہونے' پر اصرار ہے مگر اس کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ شعور کے ملگجے اُجالوں کی طرف لے جانے کے ساتھ شعور کے بالذات ہونے اور شعور کے متغیر ہونے کے اثرات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ شعور کا مسئلہ انسانی فکر سے ازل سے اُلجھتا رہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے، چاہے شعور مادہ ہو یا روح، حیات کی مقدس ترین اکائی ہے اور اس کا تحرک دائرائی ہے مگر شعور کو بالذات اکائی ماننے والے کائنات کی روحانی یا روحانیاتی تعبیر کرتے ہیں اور مادی تعبیر کرنے والے اس کو ایک تغیر آمیز شکل قرار دیتے ہیں۔ بہ ظاہر

دیکھیں تو اس کا واسطہ ہماری زندگیوں سے نہیں معلوم ہوتا اور یہ ایک طرح کی مکتبی بحث ہے۔ مگر دراصل اس کا بہت گہرا تعلق ہماری زندگیوں سے ہے اور زمانے سے رہا ہے، کم از کم اس زمانے سے تو ہے جب سے باقاعدہ منظم مذاہب کا دور دورہ ہوا۔ اب ان مذاہب اور ان کے اثرات نے کیا کیا گل کھلائے اور کھلا رہے ہیں، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ دراصل تاریخِ عالم کی سب سے بڑی استحصالی اکائی یا قوت یہ مذاہب ہی رہے ہیں اور انھی کا سہارا لے کر دیگر استحصالی قوتوں نے اپنے تسلط کا جواز پیدا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔ جون ایلیا یا اس قبیل کے تمام لوگ جو اس تقدس مآب تصور کو زیرِ بحث لاتے ہیں، وہ اس کی ناگزیریت کی بیخ کنی کر کے زندگی اور انسان کے مدارج بلند کرتے ہیں۔ اوتاریت (Dogmatic) طرزِ فکر کا خاصہ یہ ہے کہ چیزوں کو تقدس سے سرفراز کر کے دائرۂ کلام سے خارج کر دو۔ خوشا ہیں وہ لوگ وہ ہستیاں جو ہر معنی کو لفظ کے سانچے سے سرفراز کرتے ہیں اور فکر کو ناطق بناتے ہیں۔ یہ خوف زدہ حصار اگر ٹوٹے گا تو انھی کوششوں سے ٹوٹے گا اور یہ گھٹاٹوپ اندھیرا چھٹے گا تو اسی فیضانِ نظر سے چھٹے گا۔ اب چاہے غالبؔ ہوں یا جوشؔ، اقبالؔ ہوں یا فراقؔ، جون ہوں یا راشدؔ...... سب نے اپنے اپنے انداز میں اور اپنی اپنی ہمت کے لحاظ سے چیزوں کو برتا ہے اور ادراک کی تہوں کو کریدا ہے اور نطق کو سرفراز کیا ہے۔ علت العلل کو تسلیم کر لینا بھی تعلیل کی ہمہ گیری کو منوا لینا ہے۔ اب اس کو متشخص کرنا نہ کرنا ایک ترجیحاتی رجحان ہے، چاہے کائنات حادث ہو یا قدیم، وہ اپنے اعتبار اور اثبات کے لیے شعور کی مرہونِ منت ہے۔ ظاہر ہے، ہر شے اور رجحان ساز فکر اپنی عبوریت پہ دلالت ہے۔ علمائے یونان نے قبلِ مسیح اس بات کو پالیا تھا کہ صرف تغیر کو ثبات حاصل ہے اور اس کو اقبالؔ نے اپنے مشہورِ زمانہ مصرعے میں اپنا لیا۔

جون اور اس کی قبیل کے تمام تخلیق کار، فن کار، صورت گر اور عالمِ معانی کے وارث اپنی تخلیقی جوہریت کی ہمہ گیریت میں زندہ ہیں، یہی زندگی کا شیوہ ہے اور یہی مبہوتیت ہر پائندگی کا قرینہ۔ اقرار و انکار ایک ذیلی اور فروعی بحث ہے جو قدرے اضافی ہے۔

میں کثرتِ ظہور سے نادیدنی ہوں جوشؔ\
میں شدّتِ وجود سے نا آفریدہ ہوں

پراگندہ طبع شاعر

انتظار حسین

پراگندہ طبع لوگ آگے بھی کم یاب تھے، اب نایاب ہیں۔ وجہ بھی ظاہر ہے۔ کمرشلائزیشن کا دور ہے۔ اس کے ساتھ آدمی کا برانڈ ہی بدل گیا۔ وہ مخلوق جسے میر نے پراگندہ طبع بتایا تھا پیدا ہونی بند ہوگئی۔ سو، اب صورت یہ ہے کہ دشت میں قیس نہیں، کوہ پہ فرہاد نہیں اور کراچی میں جون ایلیا نہیں۔

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی۔ گھڑی دو گھڑی کی ملاقات بھی کوئی ملاقات ہوئی۔ وہ صحبت کے ذیل میں نہیں آتی۔ مگر صحبت تو ہماری میر سے بھی نہیں رہی، نہ غالب سے، نہ یگانہ سے۔ بس ان کی شاعری کو پڑھتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں۔ تو شاعری تو جون ایلیا کی بھی موجود ہے۔ توفیق ہو تو پڑھو اور سر دُھنو۔ 'شاید' کی حد تک تو میرا بھی اس شاعر سے تعارف ہے۔ مگر شاعری کی نوبت تو بعد میں آئی، مجھے تو اس کا دیباچہ ہی لے اُڑا۔ شاعر سے پہلے آدمی سے تعارف ہوگیا۔ کیا آدمی تھا! کیا اس کے شوق و شغف تھے! کیسی کیسی مخلوق کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ عطارد، مریخ، زہرہ اور مشتری خود موصوف کے حساب سے گھر کے افراد میں شامل تھے۔ افلاطون اور ارسطو لنگوٹیا یار تھے۔ فلسفہ دال روٹی تھا۔ میں نے سوچا کہ پھر تو یہ شخص اپنی شاعری میں عرش سے تارے توڑ کر لایا ہوگا اور فلسفے کی گتھیاں سلجھائی ہوں گی مگر وہاں تو کھیل ہی دوسرا نظر آیا۔ میں حیران کہ یہ معما کیا ہے! دیباچے کو دوبارہ احتیاط سے پڑھا پھر وجہ سمجھ میں آئی۔ عطارد، مریخ، زہرہ، مشتری اپنی جگہ، افلاطون، ارسطو اور ملا صدرا اپنی جگہ۔ مگر جس واقعے نے جون ایلیا کی کایا پلٹ دی اور شاعری کا رُخ

متعین کیا وہ اور ہی طرح کا ہے۔ ہوا یوں کہ جون ایلیا نے ابھی منہ میں نوالہ رکھا ہی تھا کہ وہ لڑکی جس سے عشق چل رہا تھا نمودار ہوئی۔ محبوبہ کے سامنے نوالہ چبانا واقعی بہت غیر رومانی حرکت ہے۔ جون ایلیا نے بس فوراً ہی وہ بڑا نوالہ نگل لیا۔ بس یہ نوالہ ہی جون ایلیا کی شاعری کی کلید ہے۔ اب اس واقعے کو خود جون سے سنیے۔

'ایک دن کا ذکر ہے، وہ لڑکی ہمارے گھر آئی۔ میں اُس وقت کھانا کھا رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی فوراً لقمہ نگل لیا۔ محبوبہ کے سامنے لقمہ چبانے کا عمل مجھے انتہائی ناشائستہ، غیر جمالیاتی اور بے ہودہ محسوس ہوا تھا۔ میں اکثر یہ سوچ کر شرمندہ ہو جایا کرتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر کبھی کبھی سوچتی ہوگی کہ میرے جسم میں، مجھ ایسے لطیف لڑکے کے جسم میں بھی معدے جیسی کثیف اور غیر رومانی چیز پائی جاتی ہے، اگر آپ تاریخ کے کسی ہیرو کا یا کسی دیوی کا مجسمہ دیکھ کر یہ سوچیں کہ زندگی میں اس شخصیت کے جسم میں معدہ بھی ہوگا اور انتڑیاں بھی تو آپ کے ذہن کو دھچکا لگے گا کہ نہیں۔'

جون ایلیا کے ذہن کو تو بہ ہر حال دھچکا لگا۔ اس دھچکے کے بعد وہ اس طرح کی غزل نہیں کہہ سکتا تھا جو ہم پڑھتے اور سنتے چلے آئے ہیں۔ دیکھیے معدہ اور انتڑیاں تو دُور کی بات ہے، غزل میں تو محبوبہ کا جسم ہی نظر نہیں آتا۔ لب و رخسار، چشمِ نیم وا، زلفِ سیاہ۔ غزل والی محبوبہ بس یہی کچھ ہے۔ مگر جون نے تو محبوبہ کے روبہ رو نوالہ نگل لیا تھا۔ سوائے پتا چل گیا تھا کہ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

صندل کی تختی ایسا پیٹ بھی ہے اور ناف کا پیالہ بھی ہے۔

وہ جسم موج خیز، پیالہ وہ ناف کا
گرداب، درمیانۂ دریا درست ہے

دیکھا آپ نے یہاں خالی زلفِ سیاہ اور چشم و ابرو نہیں ہے، نہ خالی لب و دنداں۔ یہاں تو زندگی سے چھلکتا ہوا ایک پورا جسم ہے۔ ایسے جسم کا دیدار غزل میں بھلا کب ہوا

تھا۔ مگر نہیں، مجھے جرأت وانشا کو نہیں بھولنا چاہیے۔ مگر جرأت نے تو لب و عارض سے گزر کر بس اُبھرے ہوئے سینے اور گات کی بات کی تھی۔ جون ایلیا کو دیکھو زقند لگا کر پیالۂ ناف تک پہنچ گئے۔ اب ذرا اس نقشے کو بھی دیکھیے۔

جی ہی جی میں وہ جل رہی ہوگی
چاندنی میں ٹہل رہی ہوگی
چاند نے تان لی ہے چادرِ اَبر
اب وہ کپڑے بدل رہی ہوگی
سو گئی ہوگی وہ شفق اندام
سبز قندیل جل رہی ہوگی
نیلگوں جھیل ناف تک پہنے
صندلیں جسم مَل رہی ہوگی

یہ کوئی خیالی محبوب نہیں ہے، نہ کوئی شاعرانہ پیکر ہے۔ جیتی جاگتی عورت ہے جو اپنے گورے بدن کا بھی احساس دلا رہی ہے اور کیا بیان ہے کہ ایک پوری تصویر نظروں میں گھوم جاتی ہے۔

جسم کا احساس اس غزل میں بہت ہے۔

ہائے وہ اُس کا موج خیز بدن
میں تو پیاسا رہا لبِ جو بھی
یاد آتے ہیں معجزے اپنے
اور اُس کے بدن کا جادو بھی

اور خالی دیدار پر قناعت نہیں ہے بل کہ یوں ہے کہ۔

حسن کہتا تھا چھیڑنے والے
چھیڑنا ہی تو بس نہیں چھو بھی

اور اس مرحلے میں آ کر یہ مقام بھی آتا ہے۔

محبت کچھ نہ تھی جز بدحواسی
کہ وہ بندِ قبا ہم سے کھلائیں

مطلب یہ کہ جون ایلیا کی غزل عشقیہ تو ہے مگر یہ عشق خیالی اور تخیلاتی نہیں اور نہ افلاطونی ہے۔ نہ عاشق محبوبہ کے عشق میں عرش سے تارے توڑ کر لاتا ہے۔ عرش تو یہاں نظر ہی نہیں آ رہا، فرش ہی فرش ہے۔ عجب بات ہے، ویسے تو جون ایلیا کی غزل کلاسیکی غزل سے بغاوت کا تاثر نہیں دیتی، لگتا یہ ہے کہ اسی تسلسل میں چل رہی ہے۔ مگر اس کے اندر سفر کر کے دیکھو پھر نقشہ مختلف نظر آتا ہے۔ جون ایلیا نے کس خوب صورتی سے اور کس دھیرج سے اپنی غزل کو غزل کی پرانی روایت سے چھٹکارا دلایا ہے اور ہمارے زمانے کے اس طرزِ احساس سے اسے پیوست کیا ہے جس میں زمینی حقیقتوں کے ادراک کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں تخیلاتی رنگ سے زیادہ حقیقت نگاری کی کارفرمائی ہے اور صرف عشق و محبت کے معاملات تک نہیں۔ لیکن دوسرے معاملات کی طرف جانے سے پہلے ذرا ایک نقشہ اور دیکھ لیجیے۔ ہم آپ نے مولانا حسرت موہانی کی غزل کو اس بات پر بہت داد دی ہے کہ وہاں معشوق شاعرانہ دنیا میں سانس نہیں لیتا، حقیقت کی روزمرہ زندگی سے اس قدر قریب ہے کہ عاشق سے آنکھ لڑانے کے لیے ننگے پاؤں دوڑ کر کوٹھے پر پہنچ جاتا ہے۔ اب ذرا محبوب کی یہ ادا بھی دیکھ لیجیے۔

پیڑ کی چھال سے رگڑ کھا کر
وہ تنے سے پھسل رہی ہوگی

یہ محبوبہ بھی حسرت موہانی کی محبوبہ سے کم ہُڑونگی نہیں ہے۔ وہ کوٹھے پر دوڑی دوڑی پھرتی ہے، اسے درختوں پہ چڑھنے اور تنے سے پھسلنے کا شوق ہے۔ ایسی محبوبہ میر و غالب کے یہاں کہاں نظر آئے گی۔

ہاں تو میں یہ کہنے لگا تھا کہ عشق و محبت کے معاملات سے ہٹ کر یہاں زندگی کے اور معاملات بھی نظر آتے ہیں اور وہ بھی روزمرہ کی سطح پر ہی بیان ہوئے ہیں۔ گھر کی ویرانی جون ایلیا کا خاص مضمون معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس میں کچھ آپ بیتی کا بھی عکس ہے۔

بہرحال شاعر یہ نہیں بتاتا کہ وہ کون لوگ تھے جو اس گھر سے رخصت ہوگئے ہاں یہ بتاتا ہے کہ۔

وہ جو کبوتر اس موکھے میں رہتے تھے کس دیس اُڑے
ایک کا نام نوازندہ تھا اور اک کا بازندہ تھا

اور اب یہاں کون رہ گیا ہے۔

آنگن میں اِک اوندھے گھڑے پر بس اِک کوّا زندہ تھا

ایک مصرعے میں گھر کی ویرانی کی مکمل تصویر پیش کردی ہے اور کتنے گھریلو انداز میں گھر کی ویرانی کی دوسری تصویر بھی دیکھتے چلیے۔

ایک ہی مژدہ صبح لاتی ہے
دھوپ آنگن میں پھیل جاتی ہے
فرش پر کاغذ اُڑتے پھرتے ہیں
میز پر گرد جمتی جاتی ہے
کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اِک چیز ٹوٹ جاتی ہے

اُجڑے گھر کا کیسا زندہ نقشہ ہے اور کتنے گھریلو رنگ میں اور پھر کتنے پر معنی انداز میں کہ بات گھر سے نکل کر دُور تک جاتی نظر آتی ہے۔ مگر یہ تو ہونا ہی تھا۔ آخر اتنا فلسفہ جو گھوٹ کر پی رکھا ہے اور زہرہ و مشتری سے جو اتنی انکھیلیاں کی ہیں اس کے بعد کائنات کے معاملات سے چشم پوشی تو نہیں برتی جا سکتی۔ اقبال تو خیر فلسفی شاعر ہوئے، فکرِ جہاں ان کے یہاں تو نظر آنی ہی چاہیے۔ مگر فکرِ جہاں کا ایک انداز ہے کہ بس طعنے دیے جا رہے ہیں کہ خوب کائنات بنائی ہے کہ اونٹ کی کوئی کل سیدھی ہی نہیں ہے۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

جون ایلیا کا انداز بس تھوڑا سا ہی مختلف ہے یہ روٹھے ہوئے بندے کا انداز ہے۔

میں کیوں بھلا قضا و قدر سے بُرا بنوں
ہے جو بھی انتظام خدایا درست ہے

مگر اس ذیل میں زبردست شعر دوسرا ہے۔

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

مثل تو یہ مشہور تھی کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ جون ایلیا کی جسارت دیکھو، خلقِ کائنات کے کام کو جلدی کے کام میں شمار کر لیا۔ شعر میں دونوں امکانات ہیں۔ شاعر پر داد کے ڈونگرے بھی برس سکتے ہیں اور شعر سمجھ میں آ جائے تو جوتے بھی پڑ سکتے ہیں۔

یہ قطعہ بند ہے ذرا آگے کے شعر بھی سن لیجیے۔

پھر بنایا خدا نے آدم کو
اپنی صورت پہ ایسی صورت میں
اور پھر آدمی نے غور کیا
چھپکلی کی لطیف صنعت میں

اور اب تذکرۂ غوثیہ سے ایک حکایت سن لیجیے۔ حضرت موسیٰؑ کے سر پہ ایک چھپکلی گر پڑی۔ وہ بہت جز بز ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے کہنے لگے کہ اے خالقِ کائنات تُو نے اپنی مثال پر انسان کو پیدا کیا اور اشرف الخلق بنایا، خوب کیا مگر چھپکلی کو کس خوشی میں خلق کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اے موسیٰؑ کل چھپکلی نے بھی مجھ سے یہی استفسار کیا تھا کہ اے رنگ رنگ کی مخلوقات پیدا کرنے والے، میں تیرے صدقے واری جاؤں۔ تُو نے قسم قسم کی مخلوق پیدا کی، سب سے بڑھ کر چھپکلی کو خلق کیا، سبحان اللہ۔ مگر تُو نے موسیٰؑ کو کس خوشی میں پیدا کیا ہے اور اب پھر ذرا وہ شعر پڑھیے جو حضرت موسیٰؑ کے سرِ مبارک پر گرنے والی چھپکلی کے نقطۂ نظر سے کہا گیا ہے۔

اور پھر آدمی نے غور کیا
چھپکلی کی لطیف صنعت میں

یعنی یوں ہے کہ۔

جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

آدمی نام کا ذرّہ تو آفتاب ہے ہی بہ شرطے کہ اپنے جامے میں رہے۔ لیکن چھپکلی بھی جب تک وہ دیوار پر چپکی ہوئی ہے اور حضرت موسیٰؑ کے سر پر نہیں گرتی اپنی جگہ پر آفتاب و ماہتاب ہے۔ یہ راز پہلے ایک صوفی نے پایا تھا اور پھر ایک شاعر نے پایا اور لیجیے مجھے حضرت علیؑ کا وہ خطبہ یاد آ گیا جہاں انھوں نے چمگادڑ کو پاک پروردگار کی صنعت کا ایک حسین نمونہ قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ 'خدائے بزرگ و برتر کی لطیف صنعتوں اور عجیب حکمتوں میں سے ایک وہ ہے جو اس نے ہمیں چمگادڑوں کی صورت میں دکھائی ہے۔' پھر فرمایا کہ 'پاک ہے وہ خدا جس نے چمگادڑ کو گوشت کے ایسے بازو عطا کیے کہ انسان کے کان کی لو کی طرح نرم ہیں۔ ان میں ہڈی ہے نہ پر مگر انھیں کے زور پر وہ بلندیوں میں پرواز کرتی ہے۔'

اور پاک ہے وہ خدا جس نے ہمارے آپ کے پراگندہ طبع شاعر کو وہ آنکھ عطا کی جس نے کائنات کی کوتاہیوں کو بھی شناخت کیا اور روشنی کے اس نقطے کو بھی دیکھا اور پہچانا جس کا نام چھپکلی ہے اور جو چمگادڑ ہی کی طرح صنعتِ الٰہی کا حسین و جمیل نمونہ ہے۔

پچھلی صدی کی کچھ قابلِ بیان باتیں

انور سن رائے

بہت دیر تک مسلسل کوشش پر بھی یاد نہیں آ رہا کہ جون بھائی سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی لیکن یہ ملاقات پچھلی صدی کی چھٹی دہائی کے آخر اور ساتویں کی ابتدا پر ہی ہوئی ہوگی۔ بالکل، اسی زمانے میں مجھے انجمن ترقیِ اُردو سے پینتیس روپے ماہانہ کے وظیفے، وفاقی اُردو کالج میں تعلیم کے لیے داخلے اور کتابوں کے اخراجات کی پیش کش ہوئی تھی۔ یہ ترغیب نہ ہوتی تو میں یقیناً میٹرک کے بعد پڑھنے کا بھی نہ سوچتا۔ تب میں اومنی بس سروس کراچی میں فٹر کی نوکری کرتا تھا۔ یہ نوکری بڑی اہم تھی۔ اسی پر ہمارا گھر چلتا تھا۔ اسی نوکری کے دوران میری ثروت حسین سے ایک عرصے بعد ملاقات ہوئی اور اس ملاقات کے دوران ثروت نے مجھے علیم درانی سے ملایا۔ علیم راولپنڈی سے کراچی آ بسے تھے اور روزنامہ جنگ کے نیوز روم میں کام کرتے تھے۔ ثروت حسین نے میرا تعارف کراتے ہوئے علیم درانی کو بتایا کہ ''یہ انور ہیں۔ یہ اسکول کے زمانے میں شاعری کیا کرتے تھے اور ہم ملیر میں ہونے والے ایک مشاعروں میں ملا کرتے تھے، پھر یہ غائب ہو گئے اور اب ملے ہیں۔'' اس ملاقات کی تفصیل میں پہلے بھی کئی جگہ بیان کر چکا ہوں کیوں کہ اسی ملاقات کے سبب میں پھر سے ادب اور شاعری کی طرف راغب ہوا۔ تب تک میرے لیے شاعری کا مطلب صرف غزل گوئی تھا۔ میری غزل گوئی کی ابتدا پانچویں جماعت سے ہوئی، کیوں ہوئی یہ تو میں اب تک نہیں جان سکا، خیر میرا جاننا کیا، میں تو اب تک یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ شاعری کیوں کرتا ہوں، کہانیاں اور ناول کیوں لکھتا ہوں،

جو کچھ دوسری زبانوں کا پڑھتا ہوں اُسے اُردو میں کرنے کی کوشش کیوں کرتا ہوں؟ روزگار صحافت میں لے گیا تو صحافیوں جیسا کیوں نہ بن سکا، ہمیشہ صحافی رہنے پر ایک طرح کی شرمندگی سی کیوں رہی اور رہتی ہے؟ ثروت حسین سے ملاقات ہوئی تو پڑھنے کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک کتاب ختم کرتا تو ثروت دوسری تھما دیتے۔ شاعروں اور شاعری کے بارے میں باتیں کرتے، ہمیشہ اچھے شعر سناتے۔ ثروت سے ہی میں نے ان سارے نئے شاعروں کے نام بھی سنے جن کے مجموعے نہیں آئے تھے۔ ان شعرا میں جون بھائی اور انور شعور کے بھی نام تھے۔ اُردو کالج میں داخلہ ہوگیا تو ثروت حسین نے کالج کی طرف سے مشاعروں میں جانے کی ترغیب دی۔ بین الکلیاتی مشاعروں میں جانے کا سلسلہ شروع تو ججوں میں جون بھائی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کالجوں کے مشاعروں کے بعد جج شعرا سے بھی ملنے کا اتفاق ہونے لگا، بس اِسی دوران کہیں انھوں نے کسی شعر پر کہا تھا 'بچۂ شعر کہتے رہنا' یہ بات تو تمام سینئر کہتے تھے پر اُن کے کہنے میں کچھ اور تھا، اُسی دن کے بعد میں انھیں اور وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔

اومنی بس سروس کے کورنگی ڈپو سے میرا تبادلہ ملیر ڈپو ہوا تو جادہ عتیق سے ملاقات ہوئی۔ جادہ کلرک کے طور پر کام کرتے تھے۔ پتا نہیں کیسے ہماری دوستی ہوگئی۔ جب میری ڈیوٹی دن کی ہوتی تو ہم لنچ ہمیشہ اکٹھے کرتے۔ ایک دن انھوں اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ وہ سعید منزل کے آس پاس، ایک پرانی بلڈنگ کی دوسری منزل پر دو ڈھائی کمروں کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ جادہ کی تقلید میں جوتے اُتار کر میں بھی ڈرائنگ روم نما کمرے میں داخل ہوا پورے کمرے میں دیوار تا دیوار بچھے قالین یا قالین نما دری کے نصف پر بچھی سفید چاندنی پر دو تکیوں کے سہارے، ہلکے سے لحاف کو پیٹ تک اوڑھے جون بھائی دراز تھے۔ میں عجیب بے یقینی کی کیفیت میں تھا کہ یہ جون ایلیا صاحب یہاں کیا کر رہے ہیں اور جادہ عتیق سے ان کا کیا تعلق ہے؟ جادہ کے بارے میں مجھے اتنا تو معلوم تھا کہ وہ والدہ کے ساتھ رہتے ہیں اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کر رہے ہیں لیکن گھر کے دوسرے افراد کے بارے میں کبھی زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔ جادہ سلام کے بعد سامنے سے ہٹے تو جون بھائی کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے بھی انھیں سلام کیا۔ مجھے اپنی

دبی ہوئی آواز کہیں دُور سے آتی لگی۔

'ارے! بھئی تم، تم کیسے، خیریت سے ہو، آؤ، بیٹھو، کیسے آنا ہوا؟' جون بھائی نے تکیوں کے سہارے ذرا سیدھا ہوتے ہوئے نیم خود کلامی کے انداز میں پوچھا۔

'جون بھائی، یہ انور ہیں، میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا جادہ نے میرا تعارف کرانے کی کوشش کی۔

'ہاں...... ہاں جانتا ہوں، انور...... اچھا تمھارے ساتھ کام کرتے ہیں، آؤ میاں، بیٹھو، کھڑے کیوں ہو۔' جون بھائی نے رسمی اپنائیت سے کہا اور میں جس طرف جادہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا بیٹھ گیا۔

اس کے بعد ہم نے چائے وغیرہ پی۔ بات چیت خیر خیریت سے آگے بس اتنی ہوئی کہ میں کہاں رہتا ہوں، کس کالج میں پڑھتا ہوں اور بس۔ میں جادہ کی امّی سے مل کر چلا آیا۔ اس ملاقات کے بعد ہی جادہ نے زاہدہ اپّی (زاہدہ حنا) کے بارے میں بتایا۔

تو اسی کو پہلی ملاقات کہنا چاہیے کیوں کہ اس کے بعد ساری ملاقاتوں پر اس ملاقات کے رشتے کا سایہ رہا۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے جون بھائی کو کبھی الگ سے شعر سنانے کی کوشش کی ہو یا انھوں نے ہی کبھی کہا ہو۔

جون بھائی سے دوسری قدرے طویل ملاقات گارڈن والے گھر میں ہوئی۔ اس ملاقات کے لیے لے جانے والے علیم بھائی (عبیداللہ علیم) تھے۔ ساری بات چیت علیم اور جون بھائی کے درمیان ہوتی رہی اور میں خاموش دبکا بیٹھا رہا۔

اس کے بعد جون بھائی سے ملاقاتیں کم سے کم ہوتی چلی گئیں۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ ایک تو میں قمر بھائی (قمر جمیل) اور نثری شاعری کا اسیر ہو گیا مزید یہ کہ کچھ عرصے بعد اخبار میں ملازم ہو گیا جہاں مجھے ڈیسک پر بھیج دیا گیا یعنی دفتر بند کر دیا گیا۔

اب ملاقاتوں کی نوعیت یہ رہ گئی تھی کہ کسی آڑے وقت جون بھائی کا فون آتا۔ 'پریس کلب میں ہوں، آجاؤ' اور میں سمجھ جاتا۔ بالعموم وہ کہیں سے سیر ہو کر آئے ہوتے اور انھیں ٹیکسی کی ضرورت ہوتی۔ ٹیکسی بھی ایسی جو انھیں اور ان کے ساتھ جو بھی ہو اُسے مطلوبہ

مقام تک پہنچائے۔ ان کے پہنچنے کی خبر دینا بھی ٹیکسی والے کے فرائض میں شامل کیا جاتا۔
تین چار بار سے زیادہ ایسا نہیں ہوا کہ جون بھائی نے ٹیکسی کے انتظام کے سوا کچھ کہا ہو۔
ایسا تبھی ہوتا جب وہ کہیں جا کر بدمزہ ہو جاتے۔ تب وہ کچھ دیر پریس کلب ہی میں بیٹھتے
اور کچھ بہتر ہونے کے بعد باقی شب کے لیے سینہ سوزی کا سامان کر کے رخصت ہوتے۔

آج اور ابھی خیال آیا ہے کہ یہ سلسلہ تو کئی دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے، دہائیاں کیا
تب سے آج اور آج سے کل تک پر، کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ یہ قربت کیسی ہے جو فاصلے اور
دوری کے ساتھ کہیں دل کے اندر سے شروع ہوتی لیکن غیر نہیں ہونے دیتی۔

شکریہ خالد انصاری، ایک بار پھر آپ کا جون بھائی سے ملانے کے لیے۔

جون ایلیا کا خط

عالمِ بالا سے براہِ راست

انور مقصود

میرے نام جنت سے جون کا خط آیا ہے۔ انور جانی تمھارا خط ملا، پاکستان کے حالات پڑھ کر کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ یہاں بھی اسی قسم کے حالات چل رہے ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں نے مرمر کے یہاں کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ مجھے یہاں بھیوں کے ساتھ رہنے کے لیے کہا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں زمین پر بھی بھیوں سے دُور رہنا پسند کرتا تھا۔ آپ مجھے کوئی کوارٹر الاٹ کر دیں۔ مصطفیٰ زیدی نے یہ کام کر دیا اور مجھے کوارٹر مل گیا۔ مگر اس کا ڈیزائن نثری نظم کی طرح ہے۔ جو سمجھ میں تو آجاتی ہے مگر یاد نہیں رہتی۔ روزانہ بھول جاتا ہوں بیڈروم کدھر ہے۔ اس کوارٹر میں رہنے کا ایک فائدہ ہے، میر تقی میر کا گھر سامنے ہے۔ سارا دن انھی کے گھر رہتا ہوں ان کے ڈھائی سو اشعار جن میں وزن کا فقدان ہے نکال چکا ہوں۔ مگر میر سے کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ کوچۂ شعر و سخن میں سب سے بڑا گھر غالب کا ہے۔ میں نے میر سے کہا آپ غالب سے بڑے شاعر ہیں آپ کا گھر ایوانِ غالب سے بڑا ہونا چاہیے تھا۔ میر نے کہا دراصل وہ گھر غالب کے سسرال کا ہے، غالب نے چکر چلا کر اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ میر کے گھر کوئی نہیں آتا۔ سال بھر کے عرصے میں صرف ایک مرتبہ ناصر کاظمی آئے وہ بھی میر کے کبوتروں کو دیکھنے کے لیے۔ ایوانِ غالب مغرب کے بعد لبالب بھرا رہتا ہے۔ جس کی وجہ تم جانتے ہو۔ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔ یہاں آکر یہ مصرعہ میری سمجھ میں آیا۔ اس مصرعے میں بار

انگریزی کا ہے۔ دو مرتبہ غالب نے مجھے بھی بلوایا مگر منیر نیازی نے یہاں بھی میرا پتّا کاٹ دیا۔ سودا کا گھر میرے کوارٹر سے سو قدم پر ہے۔ یہاں آنے کے بعد میں ان سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے میاں تم میرا سودا لا دیا کرو۔ مان گیا سودا کا سودا لانا میرے لیے باعثِ عزت تھا۔ مگر جانی جب سودا حساب مانگتے تھے تو مجھ پر قیامت گزر جاتی تھی۔ میاں جنت کی مولی اتنی مہنگی لے آئے۔ کریلا کیا نیاز فتح پوری کی دکان سے لے آئے، تمھیں ٹینڈے کی پہچان نہیں ہے؟ ہر چیز پر اعتراض، مجھے لگتا تھا کہ وہ شک کرنے لگے ہیں کہ میں سودے میں سے پیسے بنا رہا ہوں۔ چار دن پہلے میں نے ان سے کہہ دیا میں اُردو ادب کی تاریخ کا واحد شاعر ہوں جو 80 لاکھ کیش چھوڑ کر یہاں آیا ہے۔ آپ کے ٹینڈوں سے کیا کماؤں گا...... آپ کو بڑا شاعر مانتا ہوں اس لیے یہ کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے آپ کی شاعری سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اُٹھایا۔ آپ کی کوئی زمین استعمال نہیں کی۔ آئندہ اپنا سودا فیض احمد فیض سے منگوائیں تاکہ وہ آپ کا تھوڑا بہت قرض تو چکائیں۔ میرے ہاتھ میں بینگن تھا وہ میں نے سودا کو تھما دیا اور کہا بینگن کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔

ایک شام نہر کے کنارے احمد فراز سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا میرے بعد آئے ہو اس سے خود کو بڑا شاعر نہ سمجھنا۔ فراز نے کہا مشاعرے میں نہیں آیا ہوں۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے امراؤ جان کہاں رہتی ہیں؟ میں نے کہا رسوا ہونے سے بہتر ہے گھر چلے جاؤ۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں رہتی ہیں۔ پھر کہنے لگے مجھے امراؤ سے نہیں ملنا ہے۔ احمد مقصود حمیدی وہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ جانی ایک حور ہے جو میرے گھر ہر جمعرات کی شام آلو کا بھرتا پکا کر جاتی ہیں۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ خود بھی لکھتی ہیں مگر جانی جتنی دیر وہ میرے گھر رہتی ہیں، صرف مشتاق احمد یوسفی کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ ان کو صرف مشتاق احمد یوسفی سے ملنے کا شوق ہے۔ میں نے کہا خدا ان کو لمبی زندگی دے پاکستان کو ان کی بہت ضرورت ہے۔ اگر ملنا چاہتی ہو تو زمین پر جاؤ۔ جس قسم کی شاعری کر رہی ہو کرتی رہو وہ خود تم کو ڈھونڈ نکالیں گے اور پکنک منانے تمھیں سمندر کے کنارے لے جائیں گے۔ ابنِ انشا، سیّد محمد جعفری، شوکت تھانوی، دلاور فگار، زرین جبل پوری اور ضمیر جعفری ایک کوارٹر میں رہتے ہیں۔ ان لوگوں نے 9 نومبر کو علامہ اقبال کی پیدائش کے سلسلے میں ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔

علامہ اقبال، فیض، قاسمی، صوفی تبسم، فراز اور ہم وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے۔ کوارٹر میں اندھیرا تھا
دروازے پر پرچی لگی ہوئی تھی۔ 'ہم لوگ راجہ مہدی علی خان کے گھر جہنم کی بھینس کے پائے
کھانے جا رہے ہیں۔ ڈنر اگلے سال 9 نومبر کو رکھا ہے۔' اگلے دن علامہ نے ایک
پریس کانفرنس کی اور ان سب پر ادبی محفلوں میں شرکت کی پابندی لگا دی۔ تم نے اپنے خط
میں مشفق خواجہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ یہاں اکیلے رہتے ہیں کہیں نہیں جاتے۔
مگر حیرت کی بات ہے جانی میں نے ان کے گھر اُردو اور فارسی کے بڑے بڑے شاعروں کو
آتے جاتے دیکھا ہے۔ یہاں آنے کی جلدی مت کرنا کیوں کہ تمھارے وہاں رہنے میں
میرا بھی فائدہ ہے۔ تم بھی یہاں آ گئے تو پھر وہاں مجھے کون یاد کرے گا۔ جیتے رہو اور کسی نہ
کسی پر مرتے رہو۔ ہم بھی کسی نہ کسی پر مرتے رہے۔ مگر جانی جینے کا مزہ نہیں ملا۔

تمھارا جون

شاعرِ البیلا

انیس دہلوی

بعض شخصیتیں بڑی پر وقار ہوتی ہیں لیکن ان کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں اُن سے ہر خاص و عام واقف نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس چند ایک ہی اپنے آپ میں گم اور بحرِ پُر خار میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ اُن سے کوئی بھی مکمل طور پر آگاہ نہیں ہوتا حتیٰ کہ ہر پل ساتھ رہنے والے بھی اس سے خال خال ہی واقفیت رکھتے ہیں۔ یوں اگر انسانی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو آج کے دور میں ہر فرد دہرے روپ (Double Personality) میں نظر آتا ہے۔ زندگی کی گہما گہمی نے انسانیت کے چولے کو بھی بدل دیا ہے۔ یہ ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے لیکن میر کے ساتھ ایسا نہیں تھا، اقبال بھی ظاہر اور باطن میں ایک تھے اور غالب تو ان سب میں سوا تھے۔ ان تین بڑے شاعروں کا نام راقم نے خواہ مخواہ نہیں لیا ہے، اس کی وضاحت بھی میں آگے کروں گا۔

خاندانی وراثت سے سب ہی استفادہ نہیں کرتے، یہ بھی کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے اور جن کی گھٹی میں علمیت ہوتی ہے ان کا دامن خاردار ہوتے ہوئے بھی شگفتہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی امروہہ کا ایک خاندان عربی فارسی زبان میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ یہ مسلک کے لحاظ سے اہلِ تشیع تھے اور امروہہ کی شیعہ برادری میں مجتہد العصر تھے، میری مراد جون ایلیا کے والد بزرگ وار سے ہے۔ اُن کا یہ فرمانا تھا کہ ایلیا تورانی یا سورانی زبان کا لفظ ہے اور ان زبانوں کے بیش تر الفاظ عربی میں آگئے ہیں۔ یہاں پر عرض کرتا چلوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی پیار میں ایلیا کہا جاتا تھا۔ لفظ ایلیا کا سلسلہ یہاں تک محدود نہیں ہے، یہ لفظ یورپ کی

بیش تر زبانوں میں بھی مل جائے گا، روس کا مشہور ناول نگار اور شاعر ایلیا ایروم بورا تھا۔ اُردو دنیا میں یہ نام یقیناً نیا ہے اور انفرادی ہے۔ آج بھی جون ایلیا کا نام سن کر بعض پڑھے لکھے پہلے نام کے بارے میں سوچتے ہیں جب سمجھ میں نہیں آتا تو دریافت کرتے ہیں۔ لیکن جون ایلیا کا یہ نام پیدائشی نہیں ہے۔

ناموں کا ایک ہجوم سہی دل کے آس پاس
دل ایک نام سن کے دھڑکتا ضرور ہے

یہ نام جون اصغر ہے۔ جون ایلیا کو بچپن میں جون اصغر کہا جاتا تھا۔ پہلے زمانے میں نام حفظِ مراتب کا خیال کرتے ہوئے رکھے جاتے تھے۔ جون اصغر اس لیے ہے کہ اپنے بھائیوں میں جون ایلیا کا نمبر چوتھا ہے۔ علم دوست خاندان کے اس چشم و چراغ کے حقیقی بڑے برادر حضرت رئیس امروہوی تھے جو استادِ سخن تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی سیّد محمد تقی بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہ وہی محمد تقی صاحب ہیں جنھوں نے کارل مارکس کی مشہور کتاب داس کیپیٹل کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ دنیا کی سات آٹھ بڑی معرکہ آرا کتابوں میں سے ایک ہے۔ ایسی کتاب کے ترجمے کی جانب قلم اُٹھانا خود اپنے آپ میں بہت بڑی بات ہے۔ اس ترجمے کے کچھ حصے مختلف رسائل میں شایع ہوئے ہیں۔ ترجمہ مکمل ہوا یا نہیں اس بارے میں اس وقت وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ فلمی دنیا کے مشہور ہدایت کار کمال امروہوی ان کے چچا زاد بھائی ہیں۔ یہ سب علم دوست، سخن گو اور سخن نواز ہیں۔ ظاہر ہے ایسے خاندان کا ذی عقل ہونا لازمی بات ہے۔

خاندانی روایت فرد کو انسان ہی نہیں انسانِ کامل بناتی ہیں۔ دہلی میں خاص دوستوں کی ایک محفل میں آج سے تقریباً سولہ برس قبل جون ایلیا نے کہا تھا:

'پچھلی بار جب میں امروہہ میں تھا تو میں نے دیکھا کہ میرے خاندان میں جو تین باتیں مشہور تھیں ان میں سے شاید اب ایک رہ گئی ہو دو باتیں کافی تیزی سے کافور ہو گئیں۔' جون ایلیا نے کہا تھا کہ 'ہمارے ہاں پشتوں سے ایک روایت چلی آ رہی ہے کہ ہمارے خاندان کا کوئی شخص بے وقوف، احمق، کم پڑھا لکھا، جاہل نہیں ہو سکتا اور اگر ہو گا تو میں اسے اپنے خاندان سے عاق کر دوں گا اور کہوں گا کہ یہ میرے خاندان سے نہیں ہے۔

دم میرے خاندان کے جو لوگ ہیں ان میں کوئی نہ کوئی وصف ضرور ہوتا ہے۔ وہ کسی ہنر کو سیکھتے ہیں تو اس حد تک سیکھتے ہیں کہ اس کو کمال کی سرحدوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ سوم میرا خاندان خوش عقلی، خوب صورتی یا حسن و جمال میں بھی ممتاز رہا ہے۔'

دانشی وصف اور جمال کی روایت جون ایلیا کی شخصیت اور ان کی شاعری میں موجود ہے۔ جون ایلیا کو علم کی جو ہدایت ملی ہے اس میں انھوں نے فضیلت حاصل کی ہے۔ امروہہ میں آج بھی وہ مدرسہ قائم ہے، جس کو 'سیّد المدارس' کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ وہاں کے فارغ التحصیل ہیں۔ یہ اسی مدرسے کا فیض ہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کا برجستہ، برمحل استعمال ان کی شاعری میں نظر آتا ہے اور معنی و مفہوم کو انفرادیت بخشتا ہے۔ اس کے بعد امروہہ میں ایک بات پر کہرام مچ گیا۔ امروہہ میں ایک بہت بڑا دار العلوم ہے، جون ایلیا نے اس دار العلوم میں مولانا قدوس سے زانوئے تلمذ طے کیا۔ ہوا یوں کہ مولانا قدوس کا تعلق اہلِ سنت جماعت سے ہے، شیعہ اور سنی بیر ایک عرصے سے چلا آرہا تھا۔ بعض حاسدوں نے اس بات پر کہرام مچایا کہ ایک شیعہ لڑکا ایک حنفی عالم کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرے۔ ظاہر ہے برسوں پرانی بات ہے لیکن جون ایلیا کے دوستوں کا یہ کہنا ہے کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا دنیا کا ایسا کون سا موضوع ہے جن پر خلوت یا جلوت میں ان سے گفت گو نہ کی ہو لیکن ہم نے جون کو بنیادی طور پر ایک مخلص انسان پایا۔ کیسا شیعہ کیسا سنی اور کیسا مسئلہ۔ انھی دنوں جون ایلیا نے ایک اور انکشاف کیا انھوں نے کہا کہ 'میں مولانا قدوس کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ دوستوں کے اصرار پر انھوں نے بتایا کہ 'جب میں نے امروہہ چھوڑا اس وقت تک ایک خاص بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ کراچی میں آباد ہوا تو بہت سے علما کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت جس بات نے مجھے سب سے زیادہ سکون اور چین عطا کیا وہ یہ تھی کہ مولانا شبلی نعمانی کی روایت اگر کسی شخص نے امروہہ میں قائم کی تو وہ مولانا عبدالقدوس ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور میں کھلے دل و دماغ سے اس کا اعتراف کرتا ہوں۔' یہ تھی خاندانی شرافت، روایت اور وقار جو جون ایلیا نے اپنے مرشد عبدالقدوس کو پیش کیا۔ درسی تعلیم جس کو فارمل ایجوکیشن کہتے ہیں وہ تو جون نے حاصل نہیں کی لیکن ذہانت اور ذکاوت کے بل پر انگریزی میں کوئی بھی کتاب آپ جون کو دے دیں

وہ اس کو پڑھ کر چند منٹ میں اس کا لب لباب آپ کے سامنے پیش کر دیں گے۔ اُردو تو ان کے گھر کی لونڈی ہے لیکن وہ اس کے ساتھ عزت و احترام کا رویہ رکھتے ہیں۔ باتیں کرنے بیٹھتے ہیں تو پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں۔ دیوانوں کی سی وضع قطع اختیار کرتے ہیں لیکن ان کی دیوانگی میں بھی فرزانگی ہے۔ کوئی نو وارد اگر جون ایلیا کو دیکھے تو پہلی نظر میں یہی خیال کرے گا کہ یہ تو کچھ کھسکا ہوا آدمی ہے لیکن آپ قریب جا کر بیٹھیں تو محسوس کریں گے کہ یہ شخص جلدی جلدی پہلو بدل رہا ہے، ایک پہلو میں ان کو قرار نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مزاج میں سیمابیت ہے اور یہ سیمابی کیفیت آج سے نہیں ان میں بچپن سے ہے۔ ایک مچلتا ہوا کرب ان میں ایسا لگے گا کہ معلوم نہیں یہ شخص کیا چاہتا ہے کس چیز کو تلاش کرتا ہے۔ تلاش کا راستہ جون نے علم و فن کی دنیا میں بھی کھوجا ہے۔ انھوں نے عربی اور فارسی شاعری کا ٹوٹ کر مطالعہ کیا۔ اُردو میں شعری روایت نیز اقبال اور غالب کی کلیتاً شاعری کو اپنے اندر جذب کیا اور آج کیا بہت پہلے شعر میں کہنا شروع کیا جب ان کے ہم عمر شاید تختی بھی صحیح طرح نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس وقت بھی ڈھلے ہوئے شعر اور مصرعے نکلتے تھے جب لوگوں کو اسکول جانے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ کلامِ موزوں کی مثالیں گیارہ بارہ برس کی عمر سے ہی ملنی شروع ہو جاتی ہیں۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے یوں ہی اسکول جاتے جاتے مصرع کہہ دیا اور واپسی میں دو مصرعوں پر ایک لمبی غزل کہہ دی۔ چناں چہ شاعری کا آغاز یہ کراچی جانے سے کئی برس پہلے امروہہ میں کر چکے تھے۔ امروہہ بہ ہر حال امروہہ ہے، ایک قصبہ جس میں ایسے عالم بہت، دانش، زبان، ادب سب کچھ ہے لیکن محدود۔

جون ایلیا کی شاعری میں بہت بڑا موڑ کراچی جانے کے بعد آیا۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی سیاسی تہذیبی اور سماجی تبدیلیوں سے ان کو کافی فائدہ ہوا۔

کراچی ایک بہت بڑا شہر ہے، امروہہ اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔ یہ صرف ایک قصبہ ہے جہاں جاگیرداری کا دور دورہ رہا ہے لہٰذا جون کا تعلق جاگیرداروں سے تو ہے ہی زمین داروں سے بھی رہا۔ اچھی یا بری اقدار اس سماج میں دیکھی جا سکتی ہیں اور پہلے بھی دیکھی جاتی تھیں۔ کراچی میں قیام پذیر ہونے کے بعد یہ اقدار کا تصادم بھی انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جو انھیں امروہہ کے جاگیرداری سماج نے دی تھیں۔ اخلاقی،

مذہبی، تہذیبی، علمی وہ قدریں جون ایلیا کو کراچی میں میسر نہیں آئیں۔ کراچی تجارتی شہر ہے۔ حمایت علی شاعر نے لکھا ہے۔

'کراچی ایک تجارتی شہر ہے اس لیے یہاں کے عوام کا رشتہ زمین سے ٹوٹ گیا ہے۔' اس میں بڑی صداقت ہے۔ کراچی میں جو قدریں جون ایلیا کے سامنے آتیں جون انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے، ان کا تجزیہ کرتے مشاہدے کی باریکی اور فکر کی اساس پر ان کا موازنہ کرتے۔ ان کے اندر کے شاعر میں ایک تصادم برپا ہوتا تو لفظوں کے ذریعے اس ہیجان کو، بحران کو، قیامتِ صغرا کو جو اُن کے اندر ہوتا، نحیف و نزار جسم رکھنے والا حساس شاعر الفاظ کا جامہ پہنا کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔

ہم کو سودا تھا سر کے مان میں تھے
پاؤں پھسلا تو آسمان میں تھے

ہے ندامت جو نہ رویا دل
زخم دل کے کسی چٹان میں تھے

میرا خود پر سے اعتماد اُٹھا
کتنے دعوے مری اُٹھان میں تھے

نزاکتوں نے نچوڑا ہے محنتوں کا لہو
نگار خانۂ شہر و دیار کیا ہے

بولتے کیوں نہیں مرے حق میں
آبلے پڑ گئے زبان میں کیا

دھرم کی بانسری سے راگ نکلے
وہ سوراخوں سے کالے ناگ نکلے

وفا اخلاص قربانی محبت
اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم

انجمن میں یہ میری خاموشی
بردباری نہیں ہے وحشت ہے

متذکرہ بالا اشعار جون ایلیا کے کلام میں سے غیر دانستہ چن لیے گئے ہیں، جن سے ان کی شاعرانہ خصوصیات کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کراچی میں جون ایلیا نے ایک ادارے کی بنیاد رکھی۔ یہ مکتبۂ ذہنِ جدید کے نام سے موسوم ہے۔ اس ادارے نے تین چار کتابیں بھی شایع کی ہیں۔ پھر انھوں نے کراچی سے ہی ماہ نامہ 'انشا' نام کا رسالہ شروع کیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ شاعر اور وہ بھی جون ایلیا، کہاں تک رسالہ نکالنے میں کام یاب ہوتے اس کا اندازہ اس رسالے کے معیار سے لگایا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس رسالے میں اعلیٰ مضامین، عمدہ غزلیں اور اچھے افسانے شایع ہوئے اور اُردو کے حلقے میں اس رسالے کا باقاعدہ استقبال کیا گیا لیکن جون ایلیا اپنے سیمابی مزاج کے باعث اسے جاری نہیں رکھ سکے۔ لیکن اس میدان میں بھی وہ کام یاب رہے۔

پچھلے سال جون ایلیا عالمی اُردو کانفرنس کے تحت عالمی مشاعرے میں شرکت کرنے ہندوستان تشریف لائے تھے تو علی گڑھ بھی تشریف لے گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنا مجموعۂ کلام شایع کرنا چاہتے تھے اور اُردو کے مستند، مشہور نقاد پروفیسر خورشید الاسلام سے اس کا مقدمہ لکھوانا چاہتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرنا، رسالوں میں شایع ہونا اس سے کسی بھی چھوٹے یا بڑے شاعر کا معیار قائم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہ آ جائے۔ گزشتہ دنوں ایک صاحب نے بتایا کہ جون ایلیا کا مجموعۂ کلام شایع ہو چکا ہے۔ میں اس مجموعے کا استقبال کرتا ہوں، اس لیے کہ کسی ایسے شاعر کو جس کو ترقی پسند اپنا شاعر کہتے ہوں، جدید اپنا اور جدید تر بالکل اپنا سمجھتے ہیں، ایسے شاعر کو سمجھنے کے لیے مجموعہ شایع ہونا ازحد ضروری ہے۔ یہاں مجھے خاص طور پر یہ بات عرض کرنی ہے کہ اچھی شاعری اور اچھے شاعر کے لیے کسی لیبل کی ضرورت نہیں ہوتی اگر کسی شاعر کے

کلام میں شعریت کے ساتھ شعری روایت ہے، روحِ شعر ہے، جدّت ہے، فکر ہے تو وہ یقیناً اچھا شاعر ہوگا۔ اس کی شاعری متاثر کرے گی۔ پچھلے پچاس برسوں میں برصغیر ہند و پاک میں جو کچھ ہوا ہم سب نے سنا۔ بعض نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، برداشت کیا اور جھیلا۔ اس کو جون ایلیا نے اپنی غزلوں اور نظموں میں پیش کیا ہے۔ اقدار کا تصادم اور نئے صنعتی معاشرے نے جو ہلچل پیدا کی وہ جون ایلیا کی شاعری کا ناگزیر حصہ ہے۔ اُردو میں یہی انفرادیت جون ایلیا کی شاعری سے مخصوص اور منسوب ہے۔

بس یہ کہو کہ جون ہے

ایک تازہ گفت گو کا خلاصہ

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

جون ایلیا کے بارے میں یہ بات نہایت وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جون کا نام اور اُن کی شاعری ساری اُردو دنیا میں نہایت ہی معتبر، پسندیدہ اور کشش رکھنے والی شاعری سمجھی جاتی ہے۔ ایک پورا دور اس وقت ایسا آیا ہوا ہے جسے 'جون ازم' کہا جارہا ہے۔ ہم جب جون ازم کہہ رہے ہیں تو ایک وقیع پیراڈائم کے طریقے سے جون کا نام سامنے آرہا ہے۔ یقیناً وہ لوگ کہ جن کا تعلق جون سے رہا، ان نیازمندوں میں ایک میں بھی ہوں، ان کی اس قدرومنزلت سے ان کے احباب بہت خوش ہیں لیکن کیا خوشی سبھی کچھ ہے؟

اطمینان کی بات آتی ہے تو جو صاحبان جون کی فکر سمجھتے ہیں، ان کی پوری شاعری کے ماحول اور منظر سے واقف ہیں، اس وقت کتنے ہیں؟ جون کے ہاں جو تعملات (Interaction) تھے، معدوم ہوتے ہوئے معاشرے کی وہ ساری باتیں جو اُن تک وراثتی طور پر پہنچی تھیں۔ اُن سب کو جون کس طور سے محسوس کرتے تھے، اس کا پارکھ اور اس کو سمجھنے والا اس وقت موجود نہیں ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ عام طور پر جو بالکل سامنے کے موضوعات ہیں، جو جذباتی طور پر کھٹ سے دل پر جا لگتے ہیں، اس طرح کے تمام اشعار جون کی شہرت کا سبب بن گئے۔ آج وہ لوگ جو اُردو زبان و ادب کو اچھی طرح سمجھتے بھی نہیں ہیں، وہ جون کے گرویدہ ہیں، ان کے اشعار ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اور اپنے طور پہ گفت گو کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

مقصد یہ ہے، اگر جون کو اصل میں تلاش کریں گے تو اس طریقے سے تلاش کیا جائے گا کہ جون محض ایک شاعر نہیں ہے، جو لوگ جون کی زندگی کو اور اُن کی فکر کو جانتے ہیں، جن کی اُن سے ملاقاتیں رہتی تھیں، وہ جانتے ہیں کہ جون کا ایک بہت اہم اور وقیع پس منظر ہے، اُن کا خاندانی پس منظر۔ اس خاندان میں علم کی ترویج ہوتے ہوتے جون تک پہنچی ہے۔ جون کو پوری زندگی یہ فکر رہی کہ یہ ورثہ ہم کس طرح آنے والے زمانوں میں لے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ خود اس وراثت کا حق ادا کر سکیں گے۔

دوسری بات یہ کہ زبان اور شعری زبان کے جتنے ماخذ ہیں، جون اُن سے کما حقہ واقف ہے۔ اس کے ساتھ ان کے اندر ایک عالمانہ شان موجود ہے۔ جب میں کہتا ہوں 'عالمانہ'، تو اس سے مراد وہ تہذیبی وراثت ہے، جو ماضی سے ہم تک آئی ہے، جون کے یہاں اس کا بہت گہرا مطالعہ ہے۔ یہ عالمانہ شان، جسے ہم ان کا فکری پس منظر کہہ سکتے ہیں، یہ ان کے اشعار میں جا بجا موجود ہے، اور اُن کے انشائیوں میں تو بہت شدّت سے موجود ہے۔ اگر یہ تحریریں تجزیاتی طور پر دیکھیں اور معلوم کریں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں تو یہ بات بہت اچھے طریقے سے سامنے آسکتی ہے اور ان کی انفرادیت سمجھی جا سکتی ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ جون کو اُس لحاظ سے بھی تلاش کریں، یہ جو آج کے لوگ جون کے گرویدہ ہیں اور جون ازم میں مبتلا ہیں، وہ اس طرح سے جون کو پڑھ نہیں پا رہے، سمجھ ہی نہیں پا رہے کہ انھوں نے کتنے گہرے معنوں میں گفت گو کی ہے، انھوں نے شاعری کی پردہ داریوں میں رہتے ہوئے، کن کن حقیقتوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ اُن کی سطح بالکل مختلف تھی، ہم جون پر بات کرتے ہیں، تو پھر یہ بھی ذکر آتا ہے کہ جون کے ہاں زندگی کو کس طرح دیکھا گیا، ایک عام شعر کہنے والا اپنے وقت اپنے زمانے یا اپنے ماضی میں رہتے ہوئے سوچے گا کہ میں اپنی فکر کو ان زاویوں سے آگے لے جا سکتا ہوں۔ مگر جون کے یہاں یہ نہیں ہے، وہ کہتے ہیں۔ ''زندگی کی تمامیت'' اب یہ جو اصطلاح Coin کی ہے انھوں نے، اس میں بڑی معنیٰ آفرینی ہے، پھر وہ کہتے ہیں، ایک ہے'' مجموعیت'' مجموعی زندگی یعنی Totality جسے کہتے ہیں، اور ایک ہے'' کلیّت'' یعنی Universality۔ اگر آپ زندگی کو دیکھ رہے ہیں تو یہ ان حدوں میں رہی کہاں جن حدوں میں عام لکھنے والے رہ کر

اسے لکھتے ہیں، تلاش کرتے ہیں۔ یہ عالمانہ وصف خوبی ہے جو جون کو دوسروں سے ممتاز بنا رہی ہے۔

جون کے یہاں جو بات خاص طور سے اُن کی پوری کی پوری شاعری میں نکلتی چلی آئے گی، وہ یہی ان کا ایک بڑا وصف ہے، جو عام طور پر نہیں ملتا، اتنی توانائی اور Potential کے ساتھ۔ وہ فکر کو جذبے میں ڈھال لینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک تو فکر ہے جو الفاظ کا لباس پہن کر ظاہر ہو جائے گی، لیکن اس میں گہرائی، گیرائی اور تاثر اس وقت پیدا ہوگا جب جذبہ بھی ساتھ موجود ہوگا، ہمارے بہت سارے شاعر اس سے خالی خالی ہی گزر جاتے ہیں۔ فکر کو جذبے میں ڈھال لینا جون کا بہت بڑا وصف تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ جو کیفیت ہے، اس کیفیت کو جون مزاج اور شخصیت کا حصہ بنا لینے پر قادر تھے۔ انھوں نے کیفیت کو ''معاملت'' بھی کہا ہے۔

اب جو شخص کیفیت کو مزاج اور شخصیت کا حصہ بنا لے، وہ اظہار کے ایک نئے انداز میں سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ جب ان کا شعر دیکھیے تو ایک تو وہ ہے جس تک ہر کوئی پہنچ رہا ہے، وہ ایک ظاہری معنویت ہے، جو سامنے ہے، جس پر وہ سر پیٹ لیتے تھے یا سینہ کوٹ لیتے تھے، اُن کے اس انداز کو لوگوں نے بہت ہی زبردست طریقے سے لیا! لوگ اسے معنویت کی طرح سمجھنے لگے مگر بات یہ ہے کہ اس سے ہٹ کے، ایک تو سخن ہے اور ایک ہے ماورائے سخن، تو سخن میں سخن کی جو بات ہے وہ تو ہے ہی مگر ماورائے سخن بھی بہت کچھ ہے، یہ لوگوں کے ہاں نہیں ملتا ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں، وہ ایک عظیم اور بڑے شاعر ہیں، اگر آپ انھیں اُن حدوں میں رہ کر تلاش کریں اور انھیں پہچانیں۔ جون کے اشعار میں جو چیز فکری طور پر ملتی ہے وہ یہی زبردست ماورائے سخن ہے۔ دوسرے یہ کہ جون کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ کلیت کے ساتھ اگر شاعری ہو رہی ہے، تو شاعری کے لیے جو لوازم ہیں، سارے کے سارے اس میں پورے ہوتے نظر آنے چاہییں۔ مثال کے طور پر اس میں بڑا حصہ احساس کا ہے۔ کم و بیش ہر کہنے والا احساس تو رکھتا ہے۔ Initiation لازمی ہے، تخیل لازمی ہے اور ان دونوں کے ساتھ تعقل بھی لازمی ہے، یہ نہ ہو تو شعر میں وہ کلیت جس کی تلاش جون کرتے تھے، آ سکے گی۔ ان سب کے ساتھ جذبے

کا شامل ہونا لازمی ہے، جیسا کہ جون اپنے اشعار میں ان سب کا خیال رکھتے تھے۔ وہ جذبے کو فکر میں ڈھال لینے کی بڑی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں۔ احساس، تخیل اور تعقل یہ سب عناصر جب اس میں ہوں گے تو کوئی حاوی آئے گا، کوئی کم رہے گا، جسے آپ Blending کہہ سکتے ہیں یعنی اسے آمیزہ بنانے میں اگر کسی ایک طرف چلے گئے تو وہ بھی ایک قسم کی خامی ہو جائے گی، کسی ایک کو بالکل چھوڑ دیا تو وہ بھی ایک قسم کی خامی ہے۔ جون کی پوری شاعری کا تجزیہ کیجیے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام عناصر یعنی احساس، تخیل اور تعقل جذبے کی چھاپ کے ساتھ کچھ اور ہی بن جاتے ہیں۔ گویا جذبے کے تڑکے کے ساتھ جون کے شعر کا ذائقہ اور اس کا مزاج کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ جون کی شاعری کو اس طریقے سے بھی دیکھنا چاہیے۔ جون کے سارے شعر اس کسوٹی پر ڈال کر دیکھتے رہیں تو یہ سب نظر آتا رہے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جون کا اپنا فکری پس منظر کہاں آ کے ٹھیرتا ہے۔ جون کی پوری شاعری کا جائزہ لیں تو جو بات نکل کے آتی ہے وہ یہ کہ وہ کسی چیز کے کلی حل کو نہیں مانتے، کوئی بھی شے اگر ہے تو وہ کہیں گے کہ یہ کیوں ہے؟ اور اگر وہ نہیں ہے تو وہ سوال اُٹھائیں گے کہ کیوں نہیں ہے؟ جون کی پوری شاعری کھنگال ڈالیے اس میں سوال در سوال جون موجود ہیں، وہ ایک سوال نکالتے ہیں پھر اس کی نفی کر دیتے ہیں پھر وہ نفی سے ایک اور سوال نکالتے ہیں پھر اس کی نفی کر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ ان کی شاعری میں آگے بڑھتا ہے اور پھر اس میں تشکیک شامل ہو جاتی ہے، کوئی چیز اُن کے یہاں شک و شبہ کے بغیر ہے ہی نہیں، جب تشکیک شامل ہو گئی تو پھر حتمی بات کہنے میں انھیں تذبذب ہوتا ہے، یہ تذبذب جو ہے، یہ خود شاعری میں ایک کیفیت پیدا کرتا ہے۔ 'ہے کہ نہیں ہے' اب اس میں وہ کوئی حتمی بات نہیں کہتے مگر اتنا کہہ کہ چھوڑ رہے ہیں تو وہ تذبذب ایک عجیب سی خوبی اور ایک عجیب سا بانکپن ان کی شاعری میں پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں جو ایک وسیع پس منظر ہے وہ ہے گمان کا۔ یہ گمان کہاں کہاں لے کے جاتا ہے اور کیسے کیسے شاعری کی تفہیم کی جاتی ہے۔ وہ پورا پس منظر جو گمان سے نکلا ہے وہ جون کی شاعری میں ہے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام کا نام دیکھ لیں ''شاید'' کیا نام رکھا ہے ''شاید''۔

شاید یہی ہے کہ وہ تو کسی جگہ ٹھیرے ہی نہیں۔ یعنی کسی سوال کا حتمی جواب انھوں نے نہیں دیا، اور کسی حتمی جواب کو کلیّت کے ساتھ قبول نہیں کیا، یہی سوال در سوال اُن کی نمو ہے، نمو ہے۔ یہ نمو پذیری ان کی شاعری میں خاصے کی چیز ہے، اب دیکھیے، یہ ساری کتنی کیفیتیں ہیں جن کے لیے اب وہ ایک اور چیز لازم کر دیتے ہیں، ایک تخلیق کار جو ان ساری کیفیتوں سے گزر رہا ہے، وہ یہ کہہ رہا ہے کہ ان سارے معاملات کو واقعہ پرور ہونا چاہیے، ان سب سے کوئی واقعہ نکلنا چاہیے ہے۔ اس کے لیے ان کی اپنی اصطلاح تھی ''طورِ احوالِ ذات''۔ ذات کا احوال جو ہے اس کے بیان کا طور کیا ہونا چاہیے؟ یہ ہم جو زندگی گزار رہے ہیں، اس کا طور کیا ہونا چاہیے؟ یہ جو ساری کیفیتیں جون کے یہاں ہیں، یہ تو عالمانہ باتیں ہیں، یہ ڈھب اگر کسی کی شاعری میں ہے اور آپ اسے پسندیدہ اور ناپسندیدہ کے خانوں میں رکھیں گے تو بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ یہ تو بہت اچھا ہے کہ جون پہچانے گئے۔ شعر موجود ہوں تو انھیں پڑھنے والے بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور ان کی تفہیم کرنے والے بھی مگر ہوا یوں کہ جون اپنے سامنے کے شعروں سے پہچانے جا رہے ہیں، مثال کے طور پر۔

آپ، وہ، جی، مگر، یہ سب کیا ہے
تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں

یہ ایک کھٹکے والا شعر ہے، فوری طور سے دل پر لگ جاتا ہے، Romanticism کے دور میں ایسے اشعار پسند کرنے والی ایک نسل تیار ہوتی ہے، وہ اسے بہت پسند کرے گی۔ لیکن جون کے یہاں جو معنویت ہے جس کا درجہ سفاکیت سے جا کر مل جاتا ہے، جسے چاہے ان کے ہاں انقلابی کے ذیل میں رکھ لیجیے یا احتجاجی کے۔۔۔ وہ کہتے ہیں۔

چبالیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

اب دیکھیے، سوال بھی کیا جا رہا ہے، کیوں؟ دوسری طرف اس میں سفاکیت کیا ہے؟ عام آدمی تو شاید یہیں تک سمجھے گا کہ وہ جو دوسروں کے چبانے کے لیے، کھانے کے لیے ہے، ہم اپنا ڈھانچا خود ہی کھا کر ختم کر دیں۔ مگر غور طلب یہ ہے کہ یہ دوسرے کون

ہیں؟ اُن کوتو انھوں نے کم تر درجے پر رکھ دیا ہے۔ راتب ہوتا ہے، کتوں کا، جون دوسروں کو اُس درجے میں لے آئے۔ کس کو کس درجے میں رکھنا ہے، وہ خوب جانتے تھے۔

اسی غزل کے دوسرے اشعار میں بھی پھر ایک سوال۔

کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے
تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم

اس سوال کا کسی اگلے شعر میں وہ خود ہی جواز بھی پیدا کریں گے اور انکاری بھی ہو جائیں گے۔ یہ جو سوال در سوال کی خوب صورتی اور کشش ہے یہ جون کے یہاں بہت عمدہ طریقے سے آئی ہے۔

ساتھ ساتھ ان کے یہاں تہذیبی عمل کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس بات کو تو ہم سب محسوس کرتے ہیں کہ نسلاً بعد نسل بہت کچھ ہمارا نقصان ہو چکا ہے۔ ہم اپنی تہذیب کی ترسیل میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اپنے بعد کی نسل کو ہم وہ سب کچھ نہ پہنچا سکے جس طرح وہ ہم تک پہنچا تھا۔ ہم سب کو اس کا دکھ ہے۔ جون بھی یہ دکھ اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسا راستہ نکلنا چاہیے کہ یہ ورثہ آنے والی نسلوں تک بھی پہنچایا جائے۔ زبان، ادب، آداب ہیں، نئی نسل تک پہنچنے چاہییں۔ جون نے اس کے لیے کوشش کی اور کامیاب رہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا

اب اس شعر میں پوری ایک تہذیب کے ختم ہونے کا نوحہ ہے، کہاں گئی وہ نگہ داری، رکھ رکھاؤ اور بزرگوں کا کردار۔ یہ بات ایسے نہیں کہی جاتی، کہاں دو زانو بیٹھنا ہے، کیا بات کرنی ہے۔ بزرگ نوجوانوں کو ٹوکتے تھے، لیکن اب ایسا نہیں ہوتا، اس روایت کی بات بھی وہ کرتے ہیں۔ یہ پورا پس منظر اور روایت جون صاحب کے یہاں موجود ہے۔

میرا تعلق جون صاحب سے بہت رہا ہے۔ مجھے شروع ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ جب جون پچاس کی دہائی میں پاکستان آئے، شاید سن 1957ء تھا، رِگن بوکورٹ وائی ایم سی میں مشاعرہ ہو رہا تھا، میں کم عمر تھا مگر مشاعرے سننے پہنچ جاتا تھا۔

جون کا نام تو میں نے سنا ہوا تھا مگر میں نے پہلی مرتبہ مشاعرے میں وہاں انھیں سنا۔ انھوں نے مشاعرے میں زبردست پرفارمنس دی۔ پھر اس وقت انھوں نے ایک نظم پڑھی، یہ رواج مشاعروں میں نہیں تھا۔ نظم تھی۔ ''دوستو اک ذرا دیر ٹھیر جاؤ یہاں رونا ہے۔'' ایک بالکل الگ، بالکل جدا تاثر، ایک ایسی کیفیت میں انھوں نے وہ نظم پڑھی پھر اس کے بعد ان کے قطعات چلے۔ انھوں نے ماحول ہی تبدیل کر دیا، یوں ہمارا پہلا تعارف ہوا اور تعلقِ خاطر بھی۔ پھر یہ بھی رہا کہ جون کا کلام کہیں چھپتا یا وہ کہیں پڑھتے تو ہم اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ پھر ہم بھی مشاعرے پڑھنے لگے تو ملاقاتیں بھی ہونے لگیں، میری خاندانی وراثت میں جو لوگ، میرے جو بزرگ تھے، جون کے انڈیا ہی سے ان سے روابط تھے۔ جیسے میرے ماموں مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، جمیعۃ العلمائے ہند کے صدر تھے۔ جون نے ان کے ساتھ بھی کوئی پروجیکٹ کیا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ یوں میری ان سے زیادہ قربت تھی، مگر میں ان کی سرِ شام شروع ہونے والی دل چسپیوں کا شریک نہیں رہا، لیکن ان بیٹھکوں سے ہٹ کر ویسے ہماری جب جب ملاقاتیں ہوتی تھیں تو قربتیں بڑھتی ہی رہیں، بارہا مجھے یہ احساس ہوا کہ جون کی گفت گو کس قدر اہم ہوتی ہے، تاریخ پر ان کی بڑی دست رس تھی۔ تہذیبوں کے ارتقا پر وہ ایسی عالمانہ بات کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ان موضوعات پر وہ گھنٹوں بے تکان گفت گو کرتے تھے۔ ایک بار مشاعرے میں عرب امارات گئے، تو راستے میں سلطنتِ اومان کے ایک نخلستان میں رُکے، اُس کا نام نخلستان بریمی تھا۔ وہاں ہمیں کچھ گھنٹے رُکنا پڑا تو جون نے وہاں نخلستان پر گفت گو کی اور بتایا کہ کیسے کیسے تہذیبیں نخلستانوں سے پھیلیں۔ اس موضوع پر علمی طور سے، تاریخی طور سے ہم ڈھائی گھنٹے گفت گو کرتے رہے۔ اگر وہ سب چیزیں ریکارڈ ہو جاتیں تو جون کی عالمانہ شخصیت کا کیسا اظہار ہوتا۔ جون اپنی گفت گو میں اپنے مطالعے کے حوالے دیتے تھے، جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ کن کن مفکرین کو انھوں نے پڑھا اور پھر وہ یہ سارا علم اپنی گفت گو میں بہت خوبی سے پیش کرتے تھے۔

جون ایلیا نے دوسرے لوگوں پر کم کم لکھا، مگر مجھے ایک یہ بھی افتخار حاصل ہے۔ انھوں نے میری شاعری پر ایک بہت عمدہ مضمون لکھا۔ جو ایک رسالے میں چھپا بھی ہے۔

جون سے اُن کی شاعری پر بھی بات ہوتی تھی، وہ مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کرلیا کرتے تھے، مجھ سے بات کر کے انھیں ایک تھوڑی تسلی سی ہو جاتی تھی اور اُن سے یہ قربت مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔
اُسی تعلقِ خاطر کے حصار میں رہتے ہوئے میں نے جون کے لیے ایک غزل کہی، جون اُس وقت حیات تھے اور ہمارے ساتھ تھے، وہ غزل ایک طویل ردیف والی غزل تھی ''آپ بہت عجیب ہیں''۔ وہ غزل میں نے اُن کے جیتے جی پیش کی اور پھر تو ایسا ہوا کہ جہاں جہاں انھیں موقع ملتا تھا، وہ اکثر بڑے بڑے ادبی اجتماعات میں مجھ سے فرمائش کر کے وہی غزل سنتے تھے۔ کہتے تھے۔ ''تم نے میرے لیے جو کہا ہے وہ سناؤ۔''
سو میں وہ سناتا تھا۔

غم سے بہل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
درد میں ڈھل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
سایۂ وصل کب سے ہے آپ کا منتظر
ہجر میں جل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
اپنے خلاف فیصلہ خود ہی لکھا ہے آپ نے
ہاتھ بھی مل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
وقت نے آرزو کی لو، دیر ہوئی بجھا بھی دی
اب بھی پگھل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
دائرہ وار ہی تو ہیں عشق کے تمام راستے
راہ بدل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں

اور پھر وہ دکھ جب وہ ہم میں نہیں رہے، تو میں نے کہا۔

کون گماں یقین بنا، کون سا گھاؤ بھر گیا
جیسے سب گزر گئے، جون بھی کل گزر گیا
اس کے سخن کا معجزہ اس کی نہیں میں دیکھیے
ہاں بھی ہے ماجرا مگر جون کہاں اُدھر گیا

اس کے خیال کی نمود عہد بہ عہد ہے جاوداں
بس یہ کہو کہ جون ہے، یہ نہ کہو کہ مرگیا

ایسے زندہ لوگ ہمارے سامنے سے گزر گئے، ہم کچھ نہیں کر سکتے، وہ چلے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود جون اپنی شاعری کے بل بوتے پر موجود ہیں، کہیں نہیں گئے، ان کی شاعری پر بہت بات ہوگی کہ وہ زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ جون کی نثر بھی بڑے کمال کی نثر ہے، انھوں نے اپنی اصطلاحات خود وضع کیں، جیسے ماجرا اُن کے یہاں بہت آتا ہے، جیسے معاملت ہے وغیرہ، وہ جو لائن لکھتے تھے وہ بڑے کمال کی ہوتی تھیں۔ چناں چہ یہ تمام نثر کی خوبیاں ان کے انشائیوں میں نظر آتی ہیں۔ تبھی میں کہتا ہوں ان میں ایک عالمانہ شان تھی۔ عالمانہ سطح پر تجزیہ، تبصرہ اور نتائج اخذ کرنا بالکل جداگانہ بات ہے۔ عام سطح پر ایک دوسری چیز ہے، معلوم ہی نہیں کہ کن کن چیزوں کی ہم رشتگی شعر سے ہے۔ انھیں عبرانی اور اس کی تاریخ اَز بر تھی، اس پر وہ بہت مفصل بات کرتے تھے۔ عبرانی پر تو اُن کی نظر بہت ہی گہری تھی۔

ادب کے بارے میں جون ایلیا کی بہت واضح فکر تھی، جیسے جدیدیت کے بارے میں انھوں نے سخت الفاظ میں محاسبہ کیا، میری شاعری کے بارے میں مضمون لکھتے ہوئے بھی انھوں نے ایسی کچھ باتیں کیں۔ مثال کے طور پر یہ حوالہ دیکھیں۔ جون لکھتے ہیں۔

''میں جب کراچی آیا تو حلقۂ اربابِ ذوق اور اس کے بدذوق اور نافرجام وارثوں یعنی جدیدیت پسند شاعروں اور ناقدوں سے جو ہرزہ سرائی اور یاوہ بافی سنی، تو وہ یہ تھی کہ کوئی شریف آدمی بڑا شاعر یا اچھا شاعر نہیں ہوسکتا۔ اس طائفے کی ژاژ خائی اور یاوہ اندیشی آج بھی وہی ہے۔ میں اس طائفے کو ابدائی سیرت اور تخلیقی ادب سے اشتعال انگیز تک میں محروم پاتا ہوں۔''

آگے وہ کہتے ہیں۔ ''یہ لوگ انیسویں صدی کے فرانسیسی شاعر 'ملارمے'، انگلستانی شاعر 'بائرن' اور بیسویں صدی کی فرانسیسی شاعر 'ژاں ژینے' سے بری طرح متاثر ہیں۔ ذہنی طور پر یہ جنایت کوش، جرائم پیشہ اور جاہل مطلق غول، فکری فعل وانفعال اور فنی نظامِ جمال کے ادراک سے الم ناک حد تک محروم ہے۔''

مزید لکھتے ہیں۔ ''میرا بس چلے تو میں اُن کے سر منڈوا دوں اور ان کے چہروں پر

کالک مل کے ان کو گدھوں پر بٹھاؤں اور وہ بھی اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک کی پیٹھ
گدھے کے منھ کی طرف ہو اور ان کا منھ گدھے کی دُم کی طرف۔ میں نے ان جان داروں
سے اکثر یہ پوچھا ہے کہ کیا مہا کوی کالی داس اور شاعرِ شاعراں رودکی کیا غیر شریف آدمی
تھے؟ کیا فردوسی ایک شریف ترین اور نفیس ترین کردار کا مالک نہیں تھا؟ وہ غریب فردوسی جو
محمود غزنوی جیسے قاہر سلطان کی بدعہدی پر برافروختہ ہو کر دیناروں کے بجائے اس کے
بخشے ہوئے درہموں کو حمامیوں اور فقاہیوں میں لٹا کر غزنی سے خالی ہاتھ رخصت ہو گیا تھا،
شریف آدمی نہیں تھا؟ کیا شیخ سعدی، حافظ، عرفی، نظیری، تلسی داس، رحیمن، ولی دکنی، میر،
نظیر، غالب اور انیس، بائرن، ملارمے اور ژاں ژینے کی طرح بے حس اور لوفر تھے؟۔''
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح معاملات کو دیکھتے تھے۔ اس گفت گو سے جون کی
قوتِ مطالعہ کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اب جوان کی شخصیت بہ ظاہر نظر آتی تھی تو اس کی وجہ یہ
ہے کہ انھیں زیادہ تر غیر سنجیدہ گفت گو کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے ویسی ہی باتیں کیں،
اس لیے زیادہ تر لوگوں کو اندازہ نہیں ہے کہ اصل میں جون کیا تھے۔

اب انھیں دوسری جانب دیکھیے اتنا کام یاب، اتنا ہمہ گیر، اتنی وسعتوں اور فکری
بلندی کے ساتھ، اتنا معاملت سے اور زندگی کے ساتھ جڑا ہوا شخص، انسانی نفسیات سے
آگاہ اس شخص کی اپنی بھی تو کوئی ایک زندگی ہوگی، ذاتی، گھریلو زندگی، مگر اس میں وہ ناکام
رہے، کیوں کہ زندگی کے معاملات گھرداری، بیوی بچے، رشتے دار اِن سب میں معاملت
کرنا ہوتی ہے، اس کے لیے مستعد بھی رہنا چاہیے، کچھ وقت بھی دینا چاہیے، جون وہ نہ
کر پائے۔ شاید اس کا سبب ان کے شام کے شغل اور بیٹھکیں تھیں، جو انھیں تادیر جگائے
رکھتیں، پھر اس کے بعد اگر انھوں نے لکھنا لکھانا شروع کر دیا تو دیر تک جاگتے رہے، دوپہر
کو جاگتے تو بیوی بچوں کے لیے کہاں سے وقت نکالتے؟ یوں وہ اپنے روزمرہ کے امور کو
وقت نہیں دے پاتے، جس سے انھوں نے اپنا خاصا نقصان بھی کیا۔ پھر ایک اور بات تھی
انھیں روشنی سے اُلجھن ہوتی تھی، وہ رچاؤند میں مبتلا تھے، کھڑکیوں سے پردے نہیں
ہٹائے جا سکتے تھے، شام ہوتی تو اس کے معاملات کی فکر لاحق ہو جاتی۔ ایسے میں وہ
گھریلو زندگی کے لیے کہاں وقت نکال پاتے۔ تو یہ زیاں تو ہونا تھا۔ پھر شام کی محفل شروع

ہو جاتی، اس وقت پھر شعر کہنے کا بھی سلسلہ شروع ہو جاتا، خود بھی لکھ رہے ہیں، دوسروں کو اپنی شاعری لکھوا رہے ہوتے، اسی کی بنیاد پر ان کی پھر بہت سی کتابیں آئیں۔

جون کی طبیعت میں نا آسودگی کا عنصر بہت تھا۔ ویسے بھی کوئی بھی شخص مکمل آسودہ تو ہو نہیں سکتا اور وہ تو جس طرح کا مزاج رکھتے تھے، وہ جیسے تھے انھیں ویسے کا ویسا کلی طور پر قبول کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ نہ ان کے گھر والے، نہ ہی احباب۔ جیسے جون کی ایک ردیف ہے 'مشین'، انھوں نے اس پر بہت غور کیا۔ ایک خاص بات اور دھیان میں رہے، وہ پرفیکشنسٹ بھی تھے، اسی لیے ان کا پہلا مجموعہ 'شاید' جو آیا، شکیل عادل زادہ اس میں بہت کوشش کر رہے تھے۔ مگر اسے چھپوانے والوں میں تو سرگرم سلیم جعفری تھے۔ اس کا دیباچہ جو جون نے لکھا ہے، اس مشکل سے لکھا ہے کہ وہ مکمل ہوتا ہی نہیں تھا۔ کتاب کمپوز ہو گئی، چھپنے کے لیے تیار تھی مگر دیباچے کے بغیر کیسے جاتا۔ اتنی دیر لگائی، اتنی دیر لگائی انھوں نے، مگر اس پہ بھی انھیں تسلی و تشفی نہیں تھی، کیوں کہ وہ پرفیکشنسٹ تھے۔ وہ تو شاید کے آدمی تھے۔ وہ تو گمان میں ہیں، نفی و اثبات میں ہیں، ایک طرف یہ اچھا بھی ہے جو تسلی و تشفی نہیں ہوتی ہے تو وہ جو کہنے والا ہے اس کی شاعری میں ایک نکھار آتا چلا جاتا ہے۔

شہزاد احمد نے ان کے لیے لکھا ہے، جون ایلیا ان چند لوگوں میں سے ہیں، جن کے کلام کی مشہوری اور قبول عام ان کی زندگی میں کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی مل چکی تھی۔ اپنی شاعری کی کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی وہ مقبول و معروف ہو چکے تھے۔

لیکن اتنا وقت گزرنے کے بعد اب بھی جو نکات میں نے سمیٹے ہیں اگر کوئی عالم یا ناقد اس پر لکھے تو کیا اچھا ہو۔ میں تو ناقد نہیں ہوں، ناقد ہی جون کے مزید نئے پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کر سکے گا۔ مگر ضروری ہے کہ وہ اپنے وقت اور زمانے سے واقف ہو، عالمی سطح پر کیا ہو رہا ہے، مقامی سطح پر کیا ہو رہا ہے، وہ جون کی شاعری سے ہم رشتگی کو سمجھے۔ ان پر پی ایچ ڈی وغیرہ بھی ہوں گے، لیکن جتنا جم کر کام اُن کی شاعری پر ہونا چاہیے وہ ابھی تک نہیں ہوا۔ نئی نسل کے لیے ان کی شاعری بہت پرکشش ہے، نفسیاتی طور پر غالب آنے والی شاعری۔

جون بھائی ہم سے رُوٹھ گیا

تنویر ظہور

جون صاحب! میں 'صاحب' نہیں ہوں۔ مجھ سے دوستی چاہتے ہو تو 'جون بھائی' کہہ کر مخاطب کرنا۔ وہ واقعی جگت بھائی تھا۔ وہ جو اس کے بیٹوں کی عمر کے تھے اُسے 'جون بھائی' کہہ کر مخاطب کرتے۔ چند برس قبل لاہور میں انھوں نے کچھ عرصے قیام کیا تو الحمد پبلی کیشنز کے دفتر میں ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں۔ ان کی گفت گو اور کلام سننے کا موقع ملتا رہا۔ وہ مجھے 'تنو' کہہ کر مخاطب کرتے تو اِسے میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا کہ اتنا عظیم شاعر مجھ سے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لاہور میں ان کا قیام وزیر علی روڈ مال پر مقیم اس کے بھتیجے اداکار منور سعید کے ہاں ہوتا۔ میں اور صفدر حسین اکثر جون صاحب کو منور سعید کے گھر پہنچانے جاتے۔ ایک روز میں نے جون بھائی سے کہا 'آپ کا کسی سے 'آمنا سامنا' کرایا جائے؟' ان کا جواب تھا۔

'کسی حسین چہرے سے کرانا' میں نے کہا کہ 'اس کا نہ صرف چہرہ حسین ہے بل کہ آواز بھی حسین ہے۔'

بہت خوش ہوئے، 'اتنا 'حسین آمنا سامنا' تو آج ہی ہو جائے'...... 'نہیں جون بھائی صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اس میں میرا بھی مفاد ہے کہ میں اپنی صحافتی ذمے داری بھی پوری کروں۔' 'کیا مطلب؟' 'مطلب یہ کہ آپ دونوں کی گفت گو ریکارڈ کروں گا۔ فوٹوگرافر آپ دونوں کی تصویریں بنائے گا۔ یہ سب کچھ جنگ سنڈے میگزین میں شایع ہوگا۔' 'تو یوں کہو ناں تنو! اصل میں تمھارا اپنا مفاد ہے نہ کہ مجھے کسی حسین چہرے سے ملاقات

کرانا۔' میں نے اس سلسلے میں ملک کی نام ور گلوکارہ ثریا خانم سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئیں کہ نام ور شاعر جون ایلیا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوگا۔ یہ مکالمہ ثریا خانم کی کوٹھی (فیصل ٹاؤن) میں ہوا۔ میرے ہم راہ اس مکالمے میں پروفیسر احمد عقیل روبی اور صفدر حسین (الحمد) نے بھی شرکت کی۔ اس کے علاوہ ایک یادگار محفل حماد غزنوی کے گھر ہوئی جس میں جون بھائی مہمانِ خصوصی تھے۔ اس مخصوص محفل میں حماد غزنوی نے چند اہلِ ذوق اور جون بھائی کے مداحین کو دعوت دی تھی۔ اس محفل میں صرف جون بھائی کی علمی گفت گو اور شاعری سنی گئی۔ جون بھائی نے کلچر، ہسٹری، مذہب اور لسانیات پر بھی سیر حاصل گفت گو کی۔ ایسی محفلیں زندگی کا حاصل ہوتی ہیں۔

جون بھائی کے لاہور قیام کے دوران مجھے مکالمے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس مکالمے میں میرے ہم راہ ڈاکٹر ناہید شاہد، پرویز احمد ہاشمی اور صفدر حسین شامل تھے۔

مکالمہ کرنے والے پنجابی زبان وادب کے ادیب اور شاعر بھی ہیں لہٰذا جون بھائی سے پوچھا گیا 'کیا آپ نے پنجابی ادب کا مطالعہ کیا یا کبھی پنجابی میں شعر کہنے کا خیال آیا؟'

جون بھائی نے کہا 'میرا ایک عزیز، عنایت اللہ، گوجرانوالا کا رہنے والا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے کراچی میں مقیم ہے، اس سے پنجابی سیکھ رہا ہوں۔

میری خواہش رہی ہے کہ مجھ سے لوگ پنجابی میں بات کریں مگر صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ کراچی میں لاکھوں کی تعداد میں پنجابی ہیں۔ وہ بھی اُردو میں گفت گو کرتے ہیں۔ اگر وہ مجھ سے پنجابی میں گفت گو کرتے تو میں پنجابی سیکھ چکا ہوتا۔

سندھی چوں کہ اپنی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اس لیے سندھی سیکھ چکا ہوں۔ میں پنجابی شاعری کا مطالعہ کر رہا ہوں، میرا ارادہ ہے کہ میں پنجابی میں شعر کہوں۔ عربی بحریں زیادہ ایران والوں نے قبول کیں۔ اُردو والوں نے کم کیں۔ میں نے سوچا کہ پنجابی سیکھ کر عربی اور اُردو بحروں میں شاعری کروں مثلاً بحرِ رجز اور بحرِ رمل۔'

جون ایلیا نے بتایا کہ 'میری والدہ کا انتقال 1954ء میں ہوا۔ وہ کہا کرتی تھیں۔ 'کون بندا اے' یہ نہیں کہتی تھیں کہ 'کون آدمی ہے' یہ پنجابی کا اثر تھا۔ ہماری والدہ تک پنجابی کا اثر رہا۔ اسی طرح ہمارے خاندان کے بعض افراد بیٹی کے بجائے 'دھی' اور داماد کے

بجائے 'جوائی' کہتے تھے۔ ہمارے خاندان میں شیعہ ہوتے ہیں یا دیو بندی۔ بریلوی کوئی نہیں ہوتا۔ امروہہ اُردو کے معاملے میں سکّہ بند شہر رہا ہے۔ میر تقی میر شروع میں فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ امروہہ اتنا سکہ بند علاقہ ہے۔ ناسخ پنجاب سے لکھنؤ گئے۔ عالم آدمی تھے۔ لکھنؤ دبستانِ فکر کے بانی قرار پائے۔ ناسخ اور آتش امروہہ کے مصحفی کے شاگرد تھے۔ لکھنوی اسکول، مصحفی کا شاگرد ہے اور اس کے بعد پنجاب کا شاگرد ہے۔ لاہور کا وارث لکھنوی اسکول تھا۔'

جون بھائی نے بتایا کہ 'جب میں ہندوستان میں تھا تو شاہ لطیف ؒ کو نہیں جانتا تھا۔ یہ میری بد نصیبی ہے۔ اس کے بجائے وارث شاہؒ بلھے شاہؒ اور بابا فرید گنج شکرؒ کا کلام سنا رہتا تھا۔

میری خواہش ہے کہ میں نہ صرف پنجابی رسم الخط میں پڑھوں بل کہ پنجابی میں شعر کہنے کا بھی ارادہ ہے۔ وارث شاہ کے کلام سے متاثر ہوا ہوں۔ سیّد ہونے کے ناتے مجھے فخر ہے کہ میرے خاندان کے ایک 'سیّد' یعنی وارث شاہ پنجابی کے بہت بڑے شاعر ہوئے جو کلاسیکی شاعر کا درجہ رکھتے ہیں۔

سر راہ جب کہیں میں پنجابی گانا سنتا ہوں تو فوراً رک جاتا ہوں۔ میں نے ایک مرتبہ پنجابی میں نوحہ سنا تو بہت متاثر ہوا۔ جو اثر، جو شدّت، تاثیر پنجابی میں ہے وہ اُردو میں نہیں۔ لاہور سے ہمارا رابطہ مستقل رہا ہے۔ ہمارے بزرگوں کا تعلق مغل درباروں سے رہا۔'

جون ایلیا نے بتایا کہ 'سنیئے بے خبرے تیرا لٹیا شہر بھنبھور' مجھے بہت پسند ہے۔ اکثر گنگناتا رہتا ہوں۔ میرے بھتیجے بھتیجیاں سب پنجابی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ میرا بھتیجا منور سعید (فلم اور ٹی وی کا مشہور اداکار) پنجابی بولتا ہے۔ قد وقامت بھی اس کا پنجابیوں جیسا ہے۔ دلی میں پنجابی کا ہمارے ہاں تصور ۶ فٹ قد کا جوان ہوتا تھا، جو دسمبر، جنوری میں بھی لسی پیتا ہو۔ جو پنجابی چائے پیتا تھا، اس کا مذاق اُڑایا جاتا کہ تم پنجابی ہو کر چائے پیتے ہو۔ یہ دلی اور لکھنؤ والوں کی سازش تھی کہ پنجابی کو چائے پلا کر اور پان کھلا کر کم زور کر دیا جائے۔ مجھے لاہور آج یو پی کا شہر لگتا ہے۔ پان کھایا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اب یہاں اتنی چائے پی جاتی ہے۔ اب کوئی جوان دسمبر، جنوری میں لسی پیتا ہے کیا؟ لاہور کی

زبان بھی ٹکسالی پنجابی نہیں ہے۔' جون ایلیا نے کہا کہ 'پنجاب میں اعلیٰ تعلیم تک ذریعہ صرف انگریزی ہی ہے جب کہ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ پنجاب میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ جب بچہ اپنی زبان میں پڑھے گا تو صحیح طور پر سمجھ سکے گا۔ کم از کم پرائمری تک ہر صوبے کی اپنی زبان ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیے۔' جون بھائی نے ہم عصر شعرا کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'احمد فراز مجھ سے سینئر ہیں جب کہ شہزاد احمد اور ظفر اقبال میرے ہم عمر ہیں۔ میں اپنی اولین ادبی عمر سے سیف الدین سیف صاحب سے بے حد متاثر ہوں۔ ایک زمانے میں مجھے سیف صاحب کے علاوہ کوئی جچتا ہی نہ تھا۔ ان کی کئی غزلیں اور نظمیں آج بھی میری خوش گوار یادداشت کا حسین ترین حصہ ہیں۔ اُردو پر واقعی ان کا احسانِ عظیم ہے۔ اپنے بارے میں کچھ کہنا اچھا نہیں لگتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں بیسویں صدی کا سب سے بڑا اُردو کا شاعر ہوں۔ اُردو مجھ سے ہے اور میں اُردو سے ہوں۔' اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں جون بھائی نے کہا۔ 'زاہدہ حنا سے میری جب پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کی عمر 16 برس تھی۔ ہم دونوں کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ سات برس کے بعد یہ ملاقاتیں رنگ لائیں اور 1970ء میں ہم دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ گویہ Love Marriage تھی مگر اس کا ادیبہ ہونا مجھے تباہ کر گیا۔ اس کے اندر ایک ایسی انا پیدا ہو گئی تھی جس کی بنا پر علیحدگی کی نوبت آئی۔ جب کہ اس انا کی پرورش میں نے خود کی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اُسے افسانے لکھنا یا شعر کہنا سکھایا۔ البتہ اس کی تعمیر میں میرا کردار تھا۔ جس کا اس نے اعتراف نہ کیا۔ وہ بے شک اعتراف نہ کرتی لیکن اس نے میرے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، وہ جارحانہ تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بیوی کو گھریلو خاتون ہونا چاہیے۔ اگر آپ دونوں ادیب اور شاعر ہیں تو دونوں کی انا کسی نہ کسی مرحلے پر ٹکرائے گی۔' جون ایلیا کی زندگی میں صرف ان کا ایک شعری مجموعہ 'شاید' ہی چھپ سکا۔ باقی شعری مجموعے شائع نہ ہونے کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی کہ 'اپنے باقی کلام کی اشاعت کی طرف اس لیے توجہ نہ دے پایا کہ میرے بابا نے مجھ سے وعدہ لیا کہ جب تم بڑے ہو جاؤ تو میری کتابیں چھپواؤ گے۔ میں نے اپنے بابا سے وعدہ کر لیا جسے نبھا نہ سکا۔ ان کے بہت سے مسودے ضائع ہو گئے۔ میرے لیے یہ

مسئلہ بیماری بن گیا کہ میری کتابیں شایع ہوں، میرے بابا کی شایع نہ ہوں جب کہ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔ میں نے اپنے شعری مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں 29 برس مزاحمت کی۔ آخر میرے احباب نے مجبور کر کے 1990ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ چھپوایا۔ اس کے اب تک متعدد ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ میرے پاس اس وقت کم از کم غزلوں کے گیارہ مجموعے تیار ہیں۔'

ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ 'یعنی' مکمل ہے۔ افسوس ان کی زندگی میں اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ ان کے محبت نامے 'تمھارے نام' اور نثری فن پارہ 'فرنود' انشائیے کے مسوّدے بھی اشاعت کے لیے تیار ہیں۔

ویرتن شرما فاروقی کے بھائی جون

تنویر فاروقی

نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

یہ وہ شعر ہے، جو میں نے نوعمری میں سُنا اور یہی جون ایلیا سے میرے ابتدائی تعارف کا سبب بھی بنا۔ پھر 1981ء میں حیدری، ناظم آباد کے ایک مشاعرے میں، میں نے پہلی بار جون صاحب کو دیکھا، بہت قریب سے دیکھا اور اُن کا آٹوگراف بھی لیا اور درج بالا شعر اُن سے فرمائش کر کے لکھوایا، جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ میں اُس زمانے میں اپنے دوستوں کیفی، عمران، سہیل اور عاصم کے ساتھ جون صاحب کے اشعار پر سردُھنتا رہا اور اُنھیں مختلف مشاعروں میں سنتا بھی رہا۔

وقت گزرتا گیا اور جب میں 1984ء میں اقبال مہدی صاحب کے اسٹوڈیو میں مصوری کے اسرار و رموز سیکھنے کے لیے جانے لگا، وہاں جون صاحب کا ذکر پہلے ہی سے موجود تھا کیوں کہ جون صاحب اقبال بھائی کے چچا تھے۔ ایک دو بار ہلکی پھلکی ملاقات بھی ہوئی مگر تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ آہستہ آہستہ اُن کا آنا جانا بڑھنے لگا۔ جون صاحب کی چھوٹی بیٹی سحینا کو مصوری سیکھنے کا شوق ہوا تو وہ بھی جون صاحب کے ساتھ آنے لگی۔ زاہدہ باجی بھی اکثر ساتھ ہوتی تھیں۔ بڑھتی ملاقاتوں کے ساتھ جون صاحب کا بوہیمین طرزِ زندگی ہمارے ذہنوں پر اثر انداز ہونے لگا۔ جون صاحب اب اکثر اقبال بھائی کے گھر ٹھیرنے کے لیے بھی آنے لگے۔ یہ ہمارے لیے بڑے خوب صورت اور یادگار دن ہوتے تھے۔ اُنھی دنوں جون صاحب ہمارے لیے بھائی جون ہو گئے اور انھوں نے میرا نام تنویر فاروقی سے ویرتن شرما فاروقی رکھ دیا اور وہ اس سلسلے سے ایک گردان بھی کیا کرتے تھے۔

شرما مت شرما
مت شرما شرما
شرما مت شرما

شرما کے اس خطاب کے بعد، بھائی جون کی دیکھا دیکھی جمال احسانی بھی کبھی کبھار مجھے شرما کے نام سے مخاطب کرنے لگے مگر بنیادی طور پہ کیوں کہ یہ بھائی جون کا دیا ہوا نام تھا، سو یہ اُن تک ہی محدود رہا اور اُن کے ساتھ ہی یہ ختم ہو گیا۔

بھائی جون کا رہنا، دن رات کا ایک کھیل سا تھا، جس کے مرکزی کردار بھی ظاہر ہے جون بھائی ہی ہوا کرتے تھے۔ وہ بزار نگ کھیلا کرتے تھے مگر میں نے اسی دوران اُن کی بھرپور علمیت کے مظاہرے بھی دیکھے۔ ایک شام ہم بھائی جون اور اقبال بھائی کے ساتھ سیّد محمد تقی صاحب کے گھر، گارڈن ایسٹ پہنچے تو دیکھا کہ گھر کے لان میں فرشی نشست جمی ہوئی ہے، جس میں رئیس امروہوی صاحب کے علاوہ سیّد محمد تقی صاحب، بھائی محمد علی صدیقی، بھائی راحت سعید، بھائی سلطان کاظمین اور ثمن بھائی کے علاوہ چند اور احباب بھی وہاں موجود ہیں، جب کہ اُنھی لوگوں میں، میں فرخ، ریحان اور قیصر بھی شامل ہو گئے۔ گفت گو مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی فلسفے تک پہنچ گئی۔ اب اس موضوع پر زیادہ تر مکالمہ تقی صاحب اور بھائی جون کے درمیان شروع ہوا، باقی افراد نے خاموشی اختیار کر لی اور انہماک سے اس مکالمے کو سننے لگے۔ تقی صاحب فلسفے کے جیّد عالم تھے مگر بھائی جون بھی کچھ کم نہ تھے۔ ایک نکتے پر دونوں میں بحث ہونے لگی اور بھائی جون مسلسل ایک کے بعد ایک دلیل کے ذریعے تقی صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اب تقی صاحب ایک مقام پر بھائی جون کے پے در پے دلائل کے سامنے کچھ ہلکے پڑتے دکھائی دیے۔ بحث طول پکڑ چکی تھی اور دونوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ یہ بڑے حیران کن لمحات تھے، تقی صاحب اس بحث میں ایک قدم پیچھے چلے گئے تھے۔ اسی دوران بھائی جون کو سگریٹ کی شدید طلب ہوئی اور اُنھوں نے اپنی واسکٹ کی جیبیں کھنگالیں، ادھر اُدھر سگریٹ تلاش کی مگر اُنھیں سگریٹ کہیں نہ ملی۔ تقی صاحب اب اس بحث کو سمیٹنا چاہتے تھے اور پہلے تو بھائی جون کی بے چینی اُنھیں نظر نہ آئی۔ پھر جیسے ہی

اُن کی نظریں بھائی جون کی بے چینی اور سگریٹ کی طلب کی جانب ہوئیں۔ اُنھوں نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے کرتے کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور بھائی جون کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا 'یہ لو جون سگریٹ پیو۔' بھائی جون نے تقی صاحب سے سگریٹ لے لی اور اُسے جلانے کے بعد ایک گہرا کش لیا اور یوں چپ ہوگئے، جیسے اس کش سے پہلے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

بھائی جون کی اقبال بھائی کے گھر قیام کی کم سے کم مدت ہفتہ دس دن تو رہتی ہی تھی۔ اب جو لوگ بھائی جون سے واقف ہیں، وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کا یہ قیام کتنا ماجرا پرور اور قیامت خیز گزرتا ہوگا۔

بھائی جون کہا کرتے تھے 'میاں شراب پینے کا بہترین وقت وہ ہے، جب سنیوں کی مغرب ہو چکی ہو اور شیعوں کی ہونے والی ہو'، سو ایسی ہی ایک شام 'نگار خانہ' اقبال مہدی' میں، میں اور بھائی جون فرشی نشست جمائے اکیلے بیٹھے تھے، باتیں چل رہی تھیں اور بڑے مزے کی باتیں چل رہی تھیں۔ اسی دوران میں نے بھائی جون سے کہا کہ 'بھائی جون! ایک مصرع ہے اور یہ مصرع مجھے نامکمل سا لگتا ہے، آپ اسے پورا کر دیجیے۔' بھائی جون نے کہا 'ہاں میاں شرما! سناؤ کون سا مصرع ہے۔' میں نے کہا 'ہم کو منزل نہیں رہ نما چاہیے۔' بھائی جون مسکرائے، اُس وقت اُن کے ہاتھ میں کاغذات کا مخصوص دستہ بھی تھا۔ پھر اُنھوں نے کچھ لکھنا شروع کیا، ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے اور اُن کا شغل بھی جاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد بھائی جون نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا 'لو میاں شرما! اب وہ مصرع مکمل ہو گیا ہے' اور پھر اُنھوں نے پوری کی پوری غزل، جو اُن کے خاص رنگ کی عکاس تھی مجھے سنائی اور میں اُس غزل کو سُن کے بڑا خوش ہوا۔ پھر میں نے بھائی جون سے پوچھا کہ 'کیا میں یہ کاغذ رکھ سکتا ہوں؟' اس پر بھائی جون نے رضامندی ظاہر کی اور اپنے ہاتھوں سے لکھی ہوئی میری یہ فرمایشی غزل مجھے عنایت کر دی، جو آج بھی میرے پاس حفاظت سے رکھی ہوئی ہے۔ یہ غزل نہ کہیں چھپی اور نہ اُن کے کسی مجموعے میں شایع ہوئی۔ اس غزل کو ریکارڈ پر لانے کے لیے، خاصی تاخیر سے سہی، میں نے اس غزل کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر لگا دیا جو بعد میں خالد انصاری نے بھائی جون کے آخری مجموعے میں شامل کی،

جو غالباً ابھی طباعت کے مراحل میں ہے۔ اسی غزل کے چند اشعار یہاں پیش کر رہا ہوں۔

تازہ شاخوں کو تازہ ہوا چاہیے
سرو سنبل کو عیش ہوا چاہیے
سیر کی لہر آئی تھی بس چل پڑے
پاگلوں کو اب اپنا پتا چاہیے

1988ء کے عام انتخابات کے بعد پورا شہر کراچی ایک خاص رنگ میں رنگا ہوا تھا، جشنِ فتح منایا جا رہا تھا۔ شام سے رات گئے تک لوگ جلوس کی صورت میں سڑکوں پر ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک جلوس میں بھائی جون، اقبال بھائی، میں، فرخ اور ریحان بھی شامل تھے۔ میں اور فرخ گاڑی کی کھڑکیوں سے آدھے باہر نکلے ہوئے تھے اور گاڑی کے اندر سے بھائی جون ہمیں نعرے تخلیق کر کے دے رہے تھے، جو میں اور فرخ لگا رہے تھے اور باقی لوگ ساتھ دیتے تھے۔ بھائی جون کے تخلیق کردہ کئی نعرے اِن فتح کے جلوسوں میں کافی مقبول بھی ہوئے۔ اُن میں سے ایک نعرہ اب بھی یاد ہے۔

ہم ہیں مِلّت کا منشور
کون نورانی، کون غفور

ایک روز میں اسٹوڈیو میں کھڑا کچھ کام کر رہا تھا کہ اچانک بھائی جون پیچھے سے آئے اور میری کمر پر چڑھ گئے۔ اتفاق سے وہاں کیمرا بھی تھا، کسی نے یہ تصویر اُتار لی، آج کل سوشل میڈیا پر یہ تصویر خاصی مقبول ہے۔ اس کے بعد بھائی جون کے ساتھ کئی تصویریں کھینچی گئیں مگر جو بات اس بے ساختہ تصویر میں ہے، شاید کسی اور میں نہیں۔ اسی طرح جن دنوں اقبال بھائی کے پاس سابق نیول چیف منصور الحق صاحب کی پورٹریٹ بننے آئی۔ اُن کی پوری وردی، کیپ اور تمغے بھی آئے۔ ایک دن بھائی جون کی اسی وردی، کیپ اور تمغوں میں کئی تصویریں کھینچی گئیں، جن میں سے دو تصویریں کچھ عرصے قبل میں نے فیس بُک پر لگائیں اور آج کل وہی دونوں تصویریں سوشل میڈیا پر خوب گردش کر رہی ہیں۔ ایک تصویر میں بھائی جون اکیلے ہیں اور ایک میں اُن کے دائیں بائیں میں اور فرخ، باڈی گارڈ کے انداز میں کھڑے ہیں۔ بھائی جون کبھی کبھی ایسی بچگانہ حرکتیں کرتے تھے اور

پھر اُن کے مزے بھی لیتے تھے اور ایسے عالم میں اُن کے اندر کا بچہ فوراً باہر نکل آتا تھا اور وہ
ایسی تمام شرارتوں میں ہماری قیادت بھی کرتے تھے۔

'نگار خانہ' اقبال مہدی' میں عام طور پر دو پہر کو کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کیا جاتا
تھا۔ اس قیلولے میں اقبال بھائی تو کبھی کبھی شریک ہوتے تھے، تاہم ہم لوگ عام طور پر اس
قیلولے کا حصہ ضرور بنتے تھے، یعنی میں، فرخ، ریحان، قیصر اور نوید وغیرہ۔ ایک دن ایسے
قبیل کے قیلولے کے دوران فرخ اس طرح بے خبر ہو کے لیٹ گیا جیسے بے ہوش ہو گیا ہو۔
اس پر بھائی جون نے اُس کے سرہانے بیٹھ کے ایک طویل وَن مین شو شروع کر دیا، جو یقیناً
دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے پر مشتمل اس پرفارمنس میں وہ مستقل
طور پر فرخ سے مخاطب رہے، اُسے اُٹھ جانے کی تلقین کرتے رہے، جب فرخ نہ جاگا تو وہ
تاریخی حوالے لے آئے۔ اور ہوش میں آنے کی اہمیت اور افادیت کو اُجاگر کرتے رہے۔
آخر کار فرخ کو اتنی لمبی اور بھاری بھرکم تقریر کے بعد جاگنا ہی پڑا۔

اسی طرح ساداتِ امروہہ کا وہ مشاعرہ بھی ہمارے لیے بڑا یادگار ٹھیرا، جس میں
بھائی جون نے اسٹیج سے سیکڑوں کے مجمع کے درمیان، ہمیں باقاعدہ ہمارے ناموں سے
مخاطب کیا اور اُنھوں نے وہاں جو اعلان کیا وہ بھی مجھے حرف بہ حرف یاد ہے۔ 'ارے
یہاں فرخ بھی ہے، شرما بھی ہے، وسعت اللہ خان بھی ہے، یعنی میرے سارے غنڈے
یہاں موجود ہیں۔'

بھائی جون اپنی انتہائی علمیت کے باوجود اپنی بوہمین طرزِ زندگی کی وجہ سے
عام لوگوں سے بالکل منفرد نظر آتے، جلد ہی اجنبیوں کو اپنا دوست بل کہ اپنا قریبی دوست
بنا لینا بھی اُنھی کا ایک انداز تھا۔ ایک رات بھائی جون کو صدر کے علاقے میں، کسی مشاعرے
میں جانا تھا، اُنھوں نے ہم لوگوں سے کہا۔ یوں میں اور فرخ اُنھیں موٹر سائیکل پر بٹھا کے وہاں
لے گئے۔ فرخ موٹر سائیکل چلا رہا تھا، درمیان میں بھائی جون تھے اور اُن کے پیچھے میں بیٹھا
ہوا تھا۔ وہ بھی بڑا یادگار سفر تھا کیوں کہ بھائی جون کو جو لوگ پہچانتے تک نہ تھے وہ بھی اس
حال میں اُنھیں اس طرح سفر کرتا دیکھ کے ایک بار پلٹ کے ضرور دیکھتے تھے۔ ناظم آباد سے
صدر تک کے اس سفر میں بھائی جون سارے راستے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔

بھائی جون کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بہت زیادہ شراب پیتے تھے، جب کہ میں نے اُنھیں ہمیشہ اس خیال کے برخلاف پایا، کیوں کہ وہ بہت ناپ تول کر شراب پیتے تھے۔ وہ دن میں کبھی شراب نہ پیتے، ہمیشہ سورج غروب ہونے کے بعد شراب شروع کرتے اور تین یا چار پیگ کے بعد اپنا ہاتھ روک لیتے اور یہ کام بھی وہ بڑی آہستگی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سِپ لیتے ہوئے کرتے۔ اس دوران وہ اپنی نئی غزل پر کام شروع کر دیتے اور درمیان میں گفت گو بھی چلتی رہتی۔ گفت گو کے دوران اُن کا دھیان گلاس کی طرف کم ہوتا، اصل میں اُن کے لیے یہ اطمینان ہی کافی تھا کہ اُن کے سامنے بھرا ہوا گلاس رکھا ہوا ہے اور یہ کہ رات کے لیے سامان موجود ہے۔ وہ گہرے نشے میں کم دیکھے گئے اور مشاعرے میں تو وہ پورے ہوش میں ہوتے تھے لیکن لوگوں کو وہ یہ محسوس کراتے تھے، جیسے بہت زیادہ نشے میں ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اسٹیج پر آتے ہی وہ تھیٹر کے اُن دنوں میں واپس چلے جاتے تھے جہاں وہ اداکار ہوتے تھے۔ اگر اُنھیں دن کے وقت یہ اندازہ ہو جاتا کہ شام کے لیے شراب کا بند بست نہیں تو وہ اُس کی فرمائش اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کرتے۔ 'میاں جھولی پھیلا کے شہر میں نکل جاؤ اور لوگوں سے کہو بھائی جون کے لیے شراب چاہیے۔' خیر، جھولی پھیلانے کی نوبت تو کبھی نہ آئی لیکن بھائی جون کے لیے شراب کا انتظام ضرور ہو جاتا تھا۔

بھائی جون کی شاعری پر میں نے کوئی بات نہیں کی اور وہ میں کر بھی نہیں سکتا۔ اس کے لیے اور بہت سے لوگ موجود ہیں۔ مجھے تو مصوری کی بہ دولت بھائی جون کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا اور انھی یادگار لمحات میں سے چند میں نے یہاں پیش بھی کر دیے۔ یہ ایسی یادیں ہیں، جنھیں میں کسی کے ساتھ بھی شیئر کر سکتا ہوں مگر بے شمار یادیں اور باتیں ایسی بھی ہیں، جو اس طرح تحریر نہیں کی جا سکتیں، وہ صرف کسی محرم کے ساتھ ہی شیئر کی جا سکتیں ہیں۔ اور بھائی جون کے محرم تو یقیناً اُن کے چار پانچ قریبی دوست ہوں گے مگر بھائی جون کے معاملے میں وہ سارے لوگ میرے لیے محرم ہیں، جنھوں نے بھائی جون کے ساتھ کچھ نہ کچھ روز و شب ضرور گزارے ہوں۔

مسٹر جون ایلیا

حسن ہاشمی

منکرانِ خدائے بخشندہ
اس سے تو اور اک خدا مانگو

کوئی منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتا ہے، کوئی چاندی کا یا کانسی کا۔ اس شعر اور ایسے بے شمار اشعار کے خالق جون ایلیا منہ میں سگریٹ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ دھان پان، لمبوترے یونانی چہرے، گھٹے ہوئے قد، الجھے الجھے بال، پاجامے، کرتے اور واسکٹ میں ملبوس ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ لیے اگر آپ کو کوئی شخص سڑک پر یا کسی محفل میں دکھائی دے تو سمجھ لیجیے وہ جون ایلیا ہے۔

جون ایلیا کا کوئی رنگ ڈھنگ روایت سے ہٹا ہوا نہیں ہے مگر جانے کیوں یہ وضع قطع صرف جون ایلیا سے مخصوص ہے۔ انگریزی لباس بھی اگر ان کا معمول ہوتا تو بھی شاید جون سب سے الگ نظر آتے۔ زندگی بھر الگ دکھائی دینے، الگ پہچانے جانے، الگ باتیں کرتے اور الگ شعر کہنے کی جُستجو کا حاصل یہ نکلا کہ اب وہ سب سے الگ ہو گئے ہیں۔

میں کوئی تین دہائیوں سے ان کا ہم زانو و ہم پہلو ہوں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب جون آئینہ اتنا نہیں دیکھا کرتے تھے۔ 1961ء میں شکیل (شکیل عادل زادہ) اور میں اُردو کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز شکیل دوپہر کے وقت مجھے 'نرجس' لے گیا۔ جون ایلیا اور ان کے بھائیوں کو گارڈن ایسٹ میں یہ کوٹھی نئی نئی ملی تھی۔ وسیع و عریض اراضی پر مشتمل

ایک پرانی اور پرشکوہ عمارت۔ چاروں بھائی رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی، سیّد محمد عباس المعروف بھائی بچھن اور جون ایک چھت کے نیچے فلسفے، شعر، ادب، سیاست اور صحافت کی بزم سجائے ہوتے تھے۔ حقے تازہ ہوتے رہتے تھے اور اقتدا خاں مقتدا خاں کے خمیرے کی خوش بو ساری عمارت میں پھیلی رہتی تھی۔ دو بھائی، بھائی بچھن اور جون غیر شادی شدہ تھے۔ رئیس صاحب کچھ خاندانی حماقتوں کی وجہ سے ایک طرح مجرد زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے بیوی بچے کھارادر کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ شکیل ان کا نگراں بھی تھا، گھر کا فرد بھی۔ نز جس میں صرف تقی صاحب کا پورا خاندان آباد تھا۔

کوٹھی کے ایک گوشے میں باورچی خانے کے پاس ایک تنگ سی کوٹھری تھی۔ یہ جون ایلیا کا حجرہ کہلاتی تھی۔ یہاں بھانت بھانت کے شاعر جمع ہوتے اور قسمت یاوری کرے تو ان کی محبوبائیں بھی کبھی اس گوشۂ محبت میں محبوبوں کو دادِ ہنر دیا کرتی تھیں۔

مرحوم انجم اعظمی، سحر انصاری، عبیداللہ علیم، انور شعور، محمد علی صدیقی، راحت سعید، حسن عابد، اطہر نفیس وغیرہ اس حجرے کے خاص الخاص مکین رہے ہیں۔ شکیل تو خیر اس گھر میں ہی رہتا تھا۔ میرا بھی اس بارگاہ سے گزر رہا۔ حجرے کا سب سے اہم موضوع عشق تھا۔ اصل میں کئی اعتبار سے یہ خانۂ عشق یا عشق گاہ تھی۔ ان دنوں تک پرانے زمانوں کی عاشقی کی روایتیں باقی تھیں۔ دریچہ بہت صبر آزمائی کے بعد کھلتا تھا۔ کئی صدی کے صبر کے بعد نامہ بر کہیں خط لے کے نمودار ہوتا تھا۔ جون ایلیا نے بے شمار عشق کیے اور بس ایک عشق کے لیے ترستے رہے۔ جو میرا خیال ہے، ان کے بس ہی کا نہ تھا یا بہ قول ان کے ایسا کوئی شخص دست یاب ہی کہاں ہوا۔ جون ایلیا کی خوبی یہ تھی کہ موقع ملنے پر وہ ہر کس و ناکس ہر چھوٹے بڑے سے عشق کے اسرار و رموز پوچھا کرتے تھے۔ 'ہاں حسن، تم بتاؤ، تمھارے خیال میں کون سی بات زیادہ متاثر کرتی ہے۔' حالاں کہ ان کے بڑے بھائی نے ایک کلیہ کئی برس پہلے وضع کیا تھا جو معاملاتِ عشق اور وارداتِ قلب کا نہایت بلیغ اور جامع ترجمان ہے۔ رئیس صاحب نے کہا تھا۔

یا رب غمِ عشق کیا بلا ہے
ہر شخص کا تجربہ نیا ہے

لطف یہ کہ جون اپنے کسی محرم راز کا تجربہ سن کے اسے دہرانے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ صورت یہ تھی کہ ان سے ٹھیک طرح بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو سامنے آ کے خود محبوب بن جاتے تھے۔ ان کے کشکول میں جتنے عشق ہیں، سب کی سلسلہ جنبانی دوسری طرف سے ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ ایک ذرا اشارہ بادِ صبا دیکھ کر جون پھر اس میدان کے شہ سوار ثابت ہوتے تھے۔ وہ خون سے خط لکھتے، خون کے آنسو رلواتے اور خون تھکوانے تک معاملے کو لے آنے پر قادر تھے۔ وہ تو روز ایک نظم، روز ایک مرصع، مسجع، تلوار خط لکھ سکتے تھے۔ خطوں میں خود کو مظلوم، دنیا کا محروم ترین شخص ثابت کرنے میں ان کا سارا زور صرف ہوتا تھا۔ آخر ان کی شیریں کسی قیس کے ساتھ اور ان کی لیلیٰ کسی فرہاد کے ساتھ چلی جاتی تھی اور وہ نوحہ لکھتے تھے۔

میرا اعزاز چھن گیا تجھ سے
مجھ سا طناز چھن گیا تجھ سے
تجھ کو بدنام ہو کے جینا ہے
صرف الزام ہو کے جینا ہے
چائے خانوں میں تمھارا ذکر ہے

میں بہت ہی جونیئر تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، جون ایلیا کے ہاں جونیئر، سینئر کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ان کے ہاں سب قسم کا آدمی چلتا ہے۔ مجھے ان کے حال پر ترس بھی آتا تھا، لطف بھی۔ سچ پوچھیے تو میں انھیں احمق سمجھتا تھا لیکن یہ احمق اگلے ہی دن جب کوئی شعر، کوئی نئی غزل، تازہ نظم سنا دیتا تو اپنی بے مائیگی، بے بسی کا شدید احساس ہونے لگتا، پھر امتدادِ وقت کے ساتھ کچھ اندازہ ہوا کہ یہ جون صاحب اصل میں بڑے حضرت قسم کے آدمی ہیں۔ یہ تو ہم سے لطف لیتے ہیں۔ یہ جو کرید کرید کے پوچھتے ہیں، اس میں انھی کو مزہ آتا ہے۔ یہ معصومیت، مظلومیت، محرومیت کا اظہار ان کا مشغلہ ہے۔ یہ نہ عشق کر سکتے ہیں نہ کسی کو اپنے آپ سے عشق کرنے کی اجازت دیں گے۔ یہ تو محض رہِ عشق کے مسافر ہیں۔ ایک منزل کے بعد دوسری منزل، اور منزل کہیں نہیں ہے۔

شاید زاہدہ حنا ان کی منزل نہیں تھیں۔ ان کی حیثیت تو ایک سرائے کی تھی۔ مسافر کو

چلتے چلتے سرائے کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔ جون نے یقیناً کئی بار سرائے سے آگے سفر کیا ہوگا۔ پھر شاید انھوں نے سرائے کا آرام غنیمت جان کے اسے مستقل مُستقر بنالیا لیکن یہ طے ہے کہ سفر کے لیے وہ ہر وقت آمادہ ہوں گے۔ انھیں معلوم ہے کہ منزل بھی آخر سرائے بن جاتی ہے، سرائے کے سوا کچھ نہیں۔

جون ایلیا کی تمام شاعری، ان کی ذات کی شاعری ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے سوا شاید کچھ نہیں کہا۔ عربی، فارسی کے وہ آدمی ہیں۔ عربی و فارسی کے آدمی کو اُردو میں خوش خطی کے دس نمبر ویسے ہی مل جاتے ہیں۔ جون کا لہجہ بھی بیش تر عربی و فارسی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ عربی النسل ہیں۔ سیّد جون ایلیا اولاد شاہ ولایت، نقوی الحسنی، نجیب الطرفین، سادات امروہہ وغیرہ کے حوالے انھیں از بر ہیں لیکن ان کا دل، ان کی روح، ان کا رواں رواں اپنی زمین، اپنی مٹی سے گندھا ہوا، بندھا ہوا، بسا ہوا ہے۔ وہ سر بہ سر، صدفی صد برصغیری آدمی ہیں۔ زندگی بھر وہ اپنے بالوں کی طرح اُلجھے ہوئے رہے ہیں۔ انھیں غم ہے کہ وہ پہلوان کیوں نہیں ہیں۔ انھیں شکوہ ہے کہ وہ خدا کیوں نہیں۔ بہت اچھی شاعری کرنے کی ان میں تمام تر قدرت ہے۔ بہت اچھی شاعری انھوں نے کی بھی ہے لیکن ان کی استطاعت بے شک اس سے سوا ہے۔ یہ بات وہ خود بھی جانتے ہیں اور یہی ان کا کرب بھی ہے کہ انھیں اپنی توفیق، اپنے امکان کے لیے لازم ایک یک سوئی، ایک فراغت، ایک خلوت کا موقع نہیں مل پاتا چناں چہ وہ جھنجھلاتے ہیں، چناں چہ وہ افسردہ ہوجاتے ہیں اور شراب پینے لگتے ہیں۔ لیکن اس یک سوئی، فراغت، خلوت کے لیے میری دانست میں ایک ایثار چاہیے۔ اپنے آپ کو ترک کردینے کا ایثار جو بہت کم کسی کے بس میں ہوتا ہے۔ پر جو یہ نکتہ سمجھ لیتے ہیں، وہ پتھروں میں محفوظ ہوجاتے ہیں۔

جون ایلیا کا یہ مجموعہ اب سے بیس سال قبل شائع ہوجانا چاہیے تھا مگر یہ تاخیر و التوا بھی انھی کی کارستانی تھی۔ وہ سمجھتے رہے کہ کوئی سر دھننے والا، ان کا کوئی عاشق، کوئی محبوب اُٹھے گا اور ان کا کلام ہونٹوں سے اُٹھا کے سونے کے ورق پر نقش کرے گا۔ ان کا کوئی دیوانہ کہیں سے ایک دن ضرور طلوع ہوگا۔ یہاں دیوانے کو خود ایک چار دیواری میسر نہیں ہے۔ صبح کرنا شام کا اس کا وظیفہ ہے، اسے بچے کو اسکول میں داخل کرانا ہے۔ گھر سے دفتر

پہنچنا اور شام کو پھر سواری ڈھونڈنی ہے۔ اور ابھی تو یہاں پندرہ فی صد کو حرف شناسی آئی ہے۔ سو آدمیوں میں ایک آدمی اخبار خریدتا ہے، تین سو میں ایک ہفت روزہ، دو سو میں ایک ڈائجسٹ، دس ہزار میں سے ایک کتاب، دیوانہ تو پھر اپنے بال ہی نوچتا رہ جائے گا۔ ایک صدی بعد کا خواب، جون ایلیا ایک صدی پہلے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ وہ خاطر جمع رکھیں۔ یہ سب کچھ رائیگاں نہیں جائے گا۔

اب نہیں تو تمھارے گزر جانے کے بعد تمھیں لوگ ضرور تلاش کریں گے۔ ایک صدی کی تو بات ہے پھر تمھیں کوئی شکوہ نہ رہے گا۔ دیوانے خود بہ خود اُمڈے چلے آئیں گے۔ ہو سکے تو اس وقت تک کسی طور زندہ رہنے کی کوشش کرو مسٹر جون ایلیا۔

جون بھائی

حماد غزنوی

'جون بھائی، میں آپ کی وفات پر جو کالم لکھوں گا، اُس میں کیا لکھوں، کوئی فرمائش؟' میرے ناگہانی سوال پر جون بھائی مسکرائے، پھر چہرے پہ ہزار سنجیدگی طاری کرتے ہوئے گویا ہوئے 'مری شاعرانہ صلاحیت کے بارے میں حد درجہ مبالغے سے کام لینا اور اہلِ دنیا کو بہ ہر صورت قائل کرنا کہ تمھارے جون بھائی فیڈرل بی ایریا کراچی کے سب سے بڑے اُردو شاعر تھے۔' میں نے صاف انکار کر دیا اور جون بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسے بے سروپا اور بلند بانگ دعوے سے بہ طور نقاد میری ساکھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاک میں مل جائے گی۔ میرے جواب نے بہ ظاہر ان کا رواں رواں اُداس کر دیا، ذرا توقف کے بعد جون بھائی یک دم پلنگ سے اُٹھے اور میرے سامنے زمین پہ دوزانو اور دست بستہ بیٹھ کر گڑگڑانے لگے 'حماد، تم اپنے جون بھائی کو کم از کم فیڈرل بی ایریا کے 'اہم' شعرا میں سے ایک اہم شاعر تو ثابت کر سکتے ہو۔' میں نے انتہائی فیاضی سے ہاں کر دی۔

جون بھائی نے ایک خط میں اپنے جنازے کی نسبت سے مجھے کئی ہدایات لکھ بھیجیں۔ 'میں سامی النسل ہوں، سو اب یہ تمھاری ذمے داری ہے کہ میرے جنازے کو بڑی عظیم نسلی روایات کا مظہر بناؤ، جنازے کے ہم راہ لاکھوں سوگ واران ہونے چاہییں جو باآوازِ بلند گریہ کریں، سینہ کوبی کریں اور اپنی مُٹھیاں خاک سے بھر بھر کے آسمان کی طرف اُچھالیں۔' بعد میں ایک دن فون پہ بات ہوئی تو میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ اُن کے جنازے سے متعلق اُن کی وصیت کو من وعن پورا کیا جائے گا۔

جون بھائی فوت ہوئے تو میں اُن کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ میں نے اپنا دوسرا وعدہ بھی توڑ دیا، میں نے کبھی انھیں کراچی کے کسی محلّے کے اہم ترین شعرا کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔

جون بھائی کی وفات پہ کچھ لکھنا میرے لیے ایک مشکل کام ہے۔ یوں تو میں نے کئی تعزیتی تحریریں لکھیں لیکن اپنے معشوق کی موت پہ لکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔ میں نہیں جانتا مجھے کیا کہنا چاہیے۔ یہاں اُن کی شاعری کے محاسن یا اُن کی نثر کی ندرت کا تذکرہ میرے نزدیک یک سر بے ہودگی ہوگی، یا شاید ایسا نہیں ہے؟ مجھے نہیں معلوم بات کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

یہ جون ایلیا کا پہلا شعر تھا جو میں نے اسکول کے دنوں میں کہیں سُنا۔ مجھے نہیں معلوم تھا یہ کس کا شعر ہے۔ لگ بھگ ایک دہائی بعد میں نے جون ایلیا کو پہلی بار ایک ٹی وی مشاعرے میں دیکھا جس میں وہ اپنا معروف دوغزلہ پڑھ رہے تھے (مرا اک مشورہ ہے التجا نئیں، تو مرے پاس سے اس وقت جا نئیں) اُن کے شعر کا لہجہ منفرد تھا، اُن کی پڑھت کا انداز سب سے جُدا تھا، اور پھر اُن کی راک سٹار لُکس۔ مجھے جون ایلیا ایک بھرپور پیکج لگے، ایک پرکشش پیکج۔ میں نے اُن کی شاعری ڈھونڈنا شروع کی تو اندازہ ہوا کہ لاہور کے اکثر کتب فروش ان کے نام سے ہی آشنا نہیں۔ کراچی میں ایک دوست سے رابطہ قائم کیا اور اسے جون ایلیا نامی شاعر کے سب دیوان ڈھونڈنے کی ذمے داری سونپی۔ کچھ دن بعد اس دوست کا فون آیا کہ اس نام کے شاعر کا کوئی مجموعۂ کلام بازار میں دست یاب نہیں ہے، اس لیے نہیں کہ آؤٹ آف پرنٹ ہے، اس لیے کہ ان صاحب کا کوئی دیوان سرے سے کبھی چھپا ہی نہیں۔

1990ء میں جنگ اخبار کے پچھلے صفحے پر میں نے ایک چھوٹی سی خبر پڑھی، 'جون ایلیا کی شاعری کا پہلا مجموعہ 'شاید' چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا'۔ چند گھنٹوں بعد 'شاید' میرے ہاتھوں میں تھا اور پھر کچھ ہفتے میرے ہاتھوں میں ہی رہا اور اس دوران میں بھی

مسلسل ایک حالت میں رہا۔ جون میری توقع سے بڑھ کر 'جون لیوا' تھے۔ شاعری تو شاعری، ان کی نثر کے سحر نے مجھے دبوچ لیا، علمی تبحر اور بے ساختگی کی ایسی گنگا جمنا میں وہ میرا پہلا اشنان تھا۔ اپنی شاعری اور نثر کے آئینے میں جون ایلیا کسی سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی قدیم داستان کا کوئی ناقابلِ یقین کردار لگتا ہے، جو یہ ہوس رکھتا ہے کہ اسے تپِ دق کا مرض لاحق ہو جائے، وہ خون تھوکے اور جوانی میں مر جائے کہ اس کے نزدیک یہ سب ایک مسلمہ انقلابی کی نشانیاں ہیں۔ ایک ایسا عاشق جو معشوق کی یک بارگی آمد پہ اپنے منھ کا نوالا یک دم نگل جائے کیوں کہ محبوب کے سامنے کھانا چبانے کا عمل اس کے نزدیک ایک فحش اور غیر جمالیاتی حرکت ہے۔ اور پھر یہی شخص جب فلسفے کے ادق مضامین پر گفت گو کرتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس کی بات دوزانو بیٹھ کر سُنی جائے۔ میں جب بھی 'شاید' پڑھتا، خود سے سوال کرتا 'کیا جون ایلیا گوشت پوست کا ایک حقیقی انسان ہے؟'

1993ء کی بات ہے، ایک دن معروف شاعر شہزاد احمد کا فون آیا، انھوں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ جون ایلیا لاہور آئے ہوئے ہیں اور اپنے قریبی رشتے دار اداکار منور سعید کے ہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ میں نے بے قراری میں اِدھر اُدھر منور سعید کا فون نمبر پوچھنا شروع کیا۔ کچھ ہی دیر میں فون نمبر میرے پاس تھا، میں نے فون ملایا، کسی خاتون نے اُٹھایا۔ میں نے پوچھا جون ایلیا صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟ کچھ ہی دیر میں جون صاحب لائن پہ تھے۔ ہمارے درمیان جو گفت گو ہوئی وہ میرے حافظے میں گُھدی ہوئی ہے، میری گفت گو رسمی تھی ان کی بے تکلفانہ۔ میں نے پوچھا 'کل ملاقات کا کوئی وقت مل سکتا ہے؟' ان کا جواب تھا 'آج کیوں نہیں'، میں نے ان کا ایک شعر پڑھا۔

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عُجلت میں

انھوں نے کہا 'آج سے یہ شعر میرا نہیں، تمھارا ہے'۔ ایک گھنٹے بعد میں ان کی قیام گاہ کے باہر کھڑا تھا۔

میرا ذاتی تجربہ یہ رہا ہے کہ اپنے پسندیدہ فن کاروں، شاعروں، مغنیوں سے رو بہ رو ملنا، ان سے گفت گو کرنا کوئی 'محفوظ' عمل نہیں ہے۔ اگر فاصلوں کا سراب درمیان سے ہٹ

جائے تو ضروری نہیں کہ بڑے بڑے لوگ دیو قامت ہی نکلیں۔ کئی پسندیدہ شاعروں اور گویوں سے گفت گو کے دوران میرے لیے جماہیوں پہ قابو پانا ایک کٹھن مرحلہ رہا ہے۔ کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ جون ایلیا سے ملاقات میں چھپے خطرات سے میں اچھی طرح آگاہ تھا۔

جون ایلیا جب میرے استقبال کے لیے گھر سے باہر نکلے تو وہ ننگے پاؤں تھے۔ میں نے سلام کیا تو انھوں نے جواباً میری پیشانی پہ بوسہ دیا۔ 'جون صاحب میں.....' ابھی میں نے فقرہ آغاز ہی کیا تھا کہ انھوں نے ٹوک دیا۔ 'مجھے جون بھائی کہو۔' میں نے کہا 'جون بھائی میں آپ کا فین ہوں'، جون بھائی نے کہا 'اور میں تمھارا فین ہوں۔' میں نے کہا 'میں آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں'، انھوں نے کہا 'کیا انٹرویو؟ تم تو مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہو، ہر موضوع پر میرے خیالات جانتے ہو، خود ہی سوال لکھو، خود ہی جواب لکھو اور دیکھنا یہ میرا بہترین انٹرویو ہو گا۔' میں اور جون بھائی فجر کی اذان تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اُن سے پوچھا 'کیا وہ خدا کے منکر ہیں؟'' یہ سوال تم نے کیوں کیا؟' میں نے اُن کے ایک شعر کا حوالہ دیا۔

اے خدا (جو کہیں نہیں موجود)
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

جون بھائی نے مسکرا کر کہا کہ 'بہ ہر حال اس شعر سے تم مجھے دہریہ ثابت نہیں کر سکتے۔ خدا کے 'وجود' کا اقرار تو کفر ہے کیوں کہ وجود کسی طرف یا سمت میں پایا جاتا ہے، جب کہ خدا تو ہر سمت میں ہے، یعنی سمتوں سے آزاد ہے۔' پھر انھوں نے قران کی یہ آیت پڑھی وللّٰہ المشرق و المغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ (جس طرف بھی تم رُخ کرو گے، اسی طرف اللہ کا رُخ ہے)۔

کچھ دیر بعد جون بھائی کا موضوعِ سخن تھا اُن کی حد سے بڑھی ہوئی حساس طبیعت کے ان کی عشقیہ زندگی پر اثرات۔ ایک واقعہ سنیے، امروہہ میں جون بھائی کا تقریباً ہر روز اپنی منگیتر کے ہاں جانا ہوتا تھا کہ اُس کی والدہ جون بھائی کی شاگرد تھیں۔ ایک دن جون بھائی اُس کے گھر گئے تو معلوم ہوا کہ منگیتر صاحبہ سو رہی ہے۔ فرماتے ہیں 'مجھے انتہائی صدمہ ہوا، مجھے لگا کہ منگنی کے بعد میری اہمیت میں کمی آئی ہے، مجھے روزمرہ

سمجھا جا رہا ہے، یہ میرے عشق کی توہین تھی، سو میں نے وہ منگنی توڑ دی، وہ تعلق یک سر ختم کر دیا۔ بلاشبہ اُس ایک واقعے نے میری پوری زندگی کا رُخ موڑ دیا۔' غالباً، جون بھائی کی نظم 'تعظیمِ محبت' اسی واقعے کا عکس ہے۔

خوشا یہ طرزِ تعظیمِ محبت
یہ تعظیمِ محبت ہو رہی ہے
غمِ فرقت کا شکوہ کرنے والی
مری موجودگی میں سو رہی ہے

جون بھائی نے ایسا ہی ایک اور واقعہ بھی سنایا۔ ایک لڑکی جون بھائی کو پسند آئی اور کراچی کے ایک معروف ریستوران میں دونوں اکٹھے ہوئے۔ لڑکی نے چائے بناتے ہوئے پوچھا 'آپ کتنی چینی لیں گے۔' جون بھائی نے کہا 'ڈیڑھ چمچ'۔ کچھ دن بعد دونوں پھر اسی ریستوران میں ملے اور لڑکی نے چائے بناتے ہوئے پھر جون بھائی سے پوچھا 'آپ کتنی چینی لیں گے۔' بہ قول جون بھائی 'اس کے سوال پر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ اپنے محبوب کے بارے میں ایسی بنیادی باتیں فراموش کر دینا میرے تصورِ عشق کی نفی تھی۔ وہ اُس لڑکی سے میری آخری ملاقات تھی۔' جون بھائی سے پہلی ملاقات میں اُن کے بارے میں نے جو رائے قائم کی وہ پھر کبھی تبدیل نہ ہو سکی۔

اگلے ہی روز میں نے ایک محفل کا اہتمام کیا۔ میں دوستوں سے اپنی 'دریافت' کی داد لینا چاہتا تھا، تصدیق کرنا چاہتا تھا کیا جون ایلیا واقعی ساحر ہے یا میں یوں ہی مسحور ہو گیا تھا۔ وہ شام میں کبھی نہیں بھلا سکا۔ جون بھائی کے موضوعات متنوع تھے۔ تاریخ، تہذیب، مذہب، لسانیات اور ان مضامین پہ ان کی گرفت حیرت انگیز تھی۔ اکثر مصدقہ اور مروجہ 'حقائق' پہ ان کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ شغلِ بُت شکنی کے بعد جون بھائی نے شاعری کا دور آغاز کیا۔ مجلس پہ ایک حالت طاری ہو گئی۔

کچھ دیر بعد یک دم جون بھائی رُکے اور انھوں نے اعلان کیا کہ اب وہ اپنی طویل رزمیہ نظم 'راموز' کے چند Canto سنائیں گے۔ محفل میں 'ارشاد، ارشاد' کا شور اُٹھا۔ جون بھائی نے کہا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ انھیں ایک اوڑھنی فراہم کی جائے۔

'وہ کیوں؟' میں نے ان سے پوچھا۔ جون بھائی کا جواب دل چسپ تھا 'اس لیے کہ اس وقت میں نے جو لباس پہن رکھا ہے اس کا تعلق انسانی تہذیب کے ایک خاص دور سے ہے، جب کہ یہ نظم گزشتہ و فردا، ہر زمانے کا احاطہ کر رہی ہے، لہٰذا مجھے ایک اَن سلا کپڑا درکار ہے جس سے میں خود کو ڈھانپ لوں۔' جون بھائی کو ایک کمبل پیش کیا گیا جو انھوں نے بہ خوشی اوڑھ لیا اور کمرے کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر 'الواح' پڑھنے لگے۔ اُس شام ہماری قسمت میں تحیّر لکھ دیا گیا تھا۔

آخر جون بھائی تھک کر اسی کونے میں گر سے گئے اور بڑی دیر خاموش لیٹے رہے۔ شاعری سننا بھی ایک تخلیقی عمل ہے، سو ہم سب بھی نڈھال سے تھے۔ کچھ دیر بعد جون بھائی اُٹھ بیٹھے اور اگلا ایک گھنٹا فارسی شعرا، بالخصوص آدم الشعرا رودکی کی غزل کی تکنیک پہ گفت گو کرتے رہے۔

جون ایلیا کی شخصیت کا تانا بانا تضادات سے بُنا گیا تھا۔ ایک ایسا عالم جو اظہارِ مسرت کے لیے کسی بھی وقت، کہیں بھی رقص آغاز کر سکتا تھا۔ ایک ایسا تہذیبی آدمی جو گزشتہ صدیوں میں زندہ تھا مگر آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت پہ پہروں گفت گو کر سکتا تھا۔ ایک ایسا شخص جو جاذب نظر آنے کی شدید خواہش رکھتا تھا لیکن اپنے بالوں میں کنگھا پھیرنے کا روادار نہ تھا۔ ایک ایسا اثنا عشری جو دیوبند کا فارغ التحصیل تھا، ایک ایسا مجذوب جس کا دماغ کسی تیز دھار آلے کی مانند تھا۔

ایک بار مرکز ساداتِ امروہہ کراچی میں ایک فرضی عدالت قائم کی گئی جس میں جون بھائی کے ادبی جرائم کی پاداش میں مقدمہ چلایا گیا۔ وکلائے صفائی کے طور پہ پنجاب سے احمد عقیل روبی اور مجھے دعوت دی گئی۔ روبی صاحب کو ان کے ادبی مرتبے کی وجہ سے اور مجھے جون بھائی سے تعلق خاطر کی بنا پر۔ اُس دل چسپ تقریب اور اس کے بعد میرے ایک ہفتہ جون بھائی کا مہمان رہنے کی کہانی پھر کبھی سہی۔

صحافی ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ کسی بھی معروف و مرغوب شخص سے ملاقات کر سکتے ہیں، سو میں نے اس سہولت سے عمر بھر بھرپور فائدہ اُٹھایا اور جس سے ملنا چاہا، ملا۔ اس طرح بہت سے ایسے لوگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو مختلف وجود کے باعث انتہائی دل چسپ اور متاثر کن تھے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے زندگی بھر

جون بھائی سے زیادہ محبوبیت کسی شخص میں نہیں دیکھی۔

مقام غزنویہ منزل، وقت رات کے تین بجے، کردار برادر بزرگ سیّد جنید غزنوی، یار دیرینہ مرزا رضی الرحمان، جون ایلیا اور میں۔ گفت گو چل رہی تھی کبھی ایک موضوع کبھی دوسرا۔ اسی دوران جون بھائی نے اپنے آنے والے مجموعے کا نام بتایا۔ میں نے جھٹ سے کہا 'یہ برا نام ہے۔' جون بھائی میرے لہجے کی قطعیت سے بہت ٹپٹائے۔ انھوں نے اس نام کے دفاع میں کچھ دلائل بھی دیے مگر ہم تینوں میں سے کسی کو قائل نہ کر سکے۔ جون بھائی نے کہا کہ وہ اپنے حلقے میں سب سے مشورہ کر چکے ہیں اور سب کو یہ نام پسند ہے، آخر اس میں کیا خرابی ہے؟ میں نے کہا 'جون بھائی اس مغلق فارسی ترکیب سے علمیت کی بو آ رہی ہے، متاثر کرنے کی خواہش نظر آ رہی ہے، 'شاید' جیسی بے ساختگی نہیں ہے۔' بھائی صاحب کا بھی یہ ہی خیال تھا کہ 'شاید' کے بعد مفرد نام ہی ہونا چاہیے، نہ کہ اضافتوں سے لدی کوئی فارسی ترکیب۔ جون بھائی نے ہتھیار ڈال دیے۔ اب نئے نام کی تلاش شروع ہوئی۔ بہت سے نام زیرِ غور آئے مگر کسی پر اتفاقِ رائے نہ ہو سکا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر ہم میں سے کسی نے کہا 'یعنی' کے بارے کیا خیال ہے؟ جون بھائی نے لفظ 'یعنی' کو مختلف لہجوں اور معنی میں بولنا شروع کر دیا۔ کافی دیر تک مختلف جہتوں سے 'یعنی' کا جائزہ لینے کے بعد ہم سب متفق ہو گئے کہ جون بھائی کے دوسرے مجموعے کا نام 'یعنی' ہو گا۔

کم از کم درجن بار جون بھائی نے مجھے 'یعنی' نام کی کہانی لکھنے کو کہا۔ وہ اس تحریر کو مجموعے میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ میں یہ تحریر نہیں لکھ سکا۔ کیوں نہیں لکھ سکا؟ میرے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔

جون بھائی کی ہدایت پر شکیل عادل زادہ نے 'یعنی' کے پیش لفظ میں میرا شکریہ ادا کیا، جون بھائی نے میری کھینچی ہوئی اپنی ایک تصویر کو 'یعنی' کے سرورق کے لیے استعمال کیا۔ یہ ان کی محبت کے اظہار کا طریقہ تھا۔

شاید میں بے ربط ہو رہا ہوں۔ اس سے خیال آیا کہ جب جون بھائی کو احساس ہوتا کہ وہ بے ربط ہو رہے ہیں تو کہا کرتے تھے 'جانی، میری گفت گو میں ایک داخلی ربط موجود ہے۔' آج احساس ہوا کہ وہ ٹھیک ہی کہا کرتے تھے۔

بہ طور شاعر جون بھائی کا کوئی اصرار نہیں تھا لیکن جب اُردو زبان کی بات ہوتی تو وہ

کہا کرتے تھے 'میں اُردو زبان کا عالم نہیں ہوں، میں تو خود اُردو ہوں، سر بہ سر اُردو۔' اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ اُردو زبان کے ایسے لفظ کا مطلب بھی بتا سکتے ہیں جو انھوں نے پہلے کبھی نہ سنا ہو۔ مجھے جب کسی لفظ کی معنوی تہ تک پہنچنا ہوتا میں جون بھائی سے پوچھتا تھا۔ ہماری ٹیلی فون پہ آخری بات بھی اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ 'جون بھائی، حُسن اور جمال میں کیا فرق ہے؟' بنا توقف کیے جون بھائی کا جواب تھا 'حُسن تحیّر ہے اور جمال جاذب'۔ پھر دیر تک اس کی تشریح کرتے رہے۔ یہ معاملہ مجھ جیسے ادھ پڑھ تک محدود نہیں تھا، اُردو زبان کے علما بھی اس مقصد کے لیے جون بھائی سے رابطہ قائم کرتے رہتے تھے۔ اُردو جون بھائی کا مسئلہ تھا، وہ گھنٹوں زبان کی صحت، اسے مقبول بنانے کے طریقے، اس کے ہجوں میں معقول تبدیلیوں کی نسبت سے گفت گو کیا کرتے تھے۔ ایک روز مجھے جون بھائی کا دو صفحات پر مشتمل ایک خط ملا، پہلا صفحہ اُردو الفاظ کے غلط ہجے لکھنے والے اہلِ زبان کی مدح میں تھا، جس کا ایک ایک لفظ قطعاً ناقابلِ اشاعت ہے اور دوسرے صفحے پہ اغلاط نامہ مرتب کیا گیا تھا۔ اُردو زبان سے متعلق بحثیں جون بھائی کے لیے فقط علمی مسئلہ نہیں تھا، اُردو جون بھائی کا جذباتی مسئلہ تھا۔

ناکام شادی جون بھائی کی زندگی کا ایک تلخ تر باب تھا۔ اس رشتے کی ناکامی میں کس کا کتنا قصور تھا، یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ جون بھائی ایک مشکل آدمی تھے، انتہائی حسّاس، نہایت زود رنج۔ بہ ہر حال، اپنی شادی کی ناکامی کے بہت سال بعد تک بل کہ یوں کہیے کہ اپنے آخری دنوں تک جون بھائی اس موضوع پہ تلخ ہو جاتے تھے، نہ ان کا دکھ کم ہوا نہ غصہ۔ اپنے بچوں سے کئی سطح پر دُوری جون بھائی کے لیے مسلسل کرب کا باعث رہی۔ 'میرا کوئی گھر نہیں ہے'، رات کے پچھلے پہر، بھیگی آنکھوں کے ساتھ یہ جملہ وہ اکثر دہراتے تھے۔ 'غالب کا گھر تھا، اقبال کا گھر تھا، فیض کا گھر تھا، میرا کوئی گھر نہیں ہے، میں نے زندگی کو اُن سب سے زیادہ بھگتا ہے۔'

یہ سچ ہے کہ جون بھائی اپنے روزمرہ کے کام بھی آسانی سے نہیں کر پاتے تھے، ان کا خیال رکھنے کی ضرورت تھی مگر ان کا خیال رکھنے والا کوئی نہ تھا۔

محبت کچھ نہ تھی جُز بدحواسی
وہ بندِ قبا ہم سے کُھلا نئیں

غالباً اس شعر میں کسی حقیقی صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔ ایک مرتبہ اپنی دوا کھانے کے جاں گسل مرحلے کے دوران جون بھائی کہنے لگے زندگی بھر میں دو کام نہیں سیکھ سکا، دوا کھانا اور بوسہ لینا، دوا کھاتے ہوئے ہر بار میرا دم نکلنے لگتا ہے اور بوسہ لیتے ہوئے ہمیشہ حلیف کا سانس رکنے لگتا ہے۔'

مگر دوسری طرف جون بھائی جب زمینی معاملات سے اُوپر اُٹھتے تھے تو ان کا دماغ جگ مگا اُٹھتا تھا۔ ان کی یادداشت تو واقعی لائٹیں مارتی تھی۔

میں اکتوبر 2002ء میں برطانیہ سے فلم سازی میں ایم اے کر کے واپس آ رہا تھا، دورانِ پرواز میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی پہلی ڈاکومنٹری فلم جون بھائی پر بناؤں گا۔ جون ایلیا جیسے دیومالائی کردار پہ کیا عالی شان ڈاکومنٹری بنے گی، آنے والی نسلوں کے لیے یہ عجوبہ ہمیشہ کے لیے فلم بند ہو جائے گا، میں سارا رستہ یہی سوچتا رہا، گرمیِ نشاطِ تصور کا معنیٰ پہلی بار سمجھ آیا۔ میں یہ ڈاکومنٹری نہیں بنا سکا۔ میرے پاکستان آنے کے کچھ دن بعد جون بھائی فوت ہو گئے۔

جون بھائی کے پاس مجھ سے خفا رہنے کی کئی وجوہ تھیں۔ 'صحافت میں وقت برباد نہ کرو، کوئی سنجیدہ کام کرو' انھوں نے بارہا مجھے یہ تاکید کی۔ میں نے ہر بار ان سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی مجھے کسی بامعنیٰ کام میں مصروف پائیں گے۔ 'تمھارے غسل خانے میں لوٹے کی عدم موجودگی سے مجھے شدید صدمہ ہوا ہے، حماد، تم ایک تہذیب کے نگہبان ہو' جون بھائی واقعی اُس دن مجھ سے خفا لگ رہے تھے۔ میں نے ان سے پکا وعدہ کیا کہ جلد ہی ایک روایتی لوٹا میرے غسل خانے کی زینت بن جائے گا۔ میں یہ وعدہ بھی پورا نہیں کر سکا۔ میں نے ان سے 'لیعنی' کے لیے چند ابتدائی سطریں لکھنے کا وعدہ بھی کئی بار کیا لیکن پورا نہیں کر سکا۔ جون بھائی سے ایک وعدہ میں نے اور کر رکھا تھا، وہ میں ضرور پورا کروں گا۔

'میں، سیّد حماد غزنوی، پوری ذمے داری اور کامل سنجیدگی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ سیّد جون ایلیا حسینی ولد علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا، فیڈرل بی ایریا کراچی کے اہم ترین شعرا میں شامل ہیں۔'

جون بھائی، اب تو آپ خوش ہیں؟

زندگی داؤ چل گئی ہوگی

خالد احمد انصاری

2004ء کی ایک سرد شام، ہاتھ میں ''گمان'' کا مسودہ تھامے، لمبے لمبے قدم اٹھاتا
کوریئر کمپنی کے دفتر کی جانب رواں دواں ہوں۔ مجھے یہ مسودہ لاہور ارسال کرنا ہے۔ میں
اُس خواب کی تعبیر پانے کی تگ ودو میں ہوں جو میں نے برسوں پہلے اپنے دوستوں کے
ہم راہ دیکھا تھا۔ خواب، یعنی جون بھائی کا کلام مجموعوں کی صورت اختیار کرے اور دنیا
دیکھے کہ جون ایلیا کی شاعری سے متعلق باتیں محض افسانہ نہیں تھیں۔ جب آپ دل سے
کوئی کام کرنے جارہے ہوں تو اس کام سے متعلق نہ جانے کیا کچھ آپ کے حواس پر طاری
ہوجاتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ اس وقت میرے ساتھ ہے۔ جانے جون بھائی کی کون کون
سی باتیں میری سماعت سے ٹکرارہی ہیں۔

''جانی! میں امیتابھ کو کیوں جانوں؟ اس کی تو میں نے کوئی فلم بھی نہیں دیکھی، نہ میں
اسے پسند کرتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ بہت لمبا ہے۔ وہ کوئی ہمالیہ ہے کہ میں اسے جانوں۔''

''یہ درخت جو ہمیں دکھتے ہیں، ہوسکتا ہے درخت نہ ہوں، کچھ اور ہوں۔ کیوں کہ
ہم وہی دیکھتے ہیں جو ہماری آنکھیں دکھاتی ہیں۔''

''ہاں بھئی۔۔۔ مغرب کا وقت ہورہا ہے۔ سنا ہے کہ اس وقت کی گئی دعا قبول
ہوتی ہے۔ چلو بیٹا! ہاتھ اُٹھاؤ۔۔ دعا مانگو۔۔ خدا کرے سعودی عرب کے تیل کے کنوؤں
میں کیڑے پڑجائیں۔''

ایک فلم ہے جو ذہن میں جاری ہے۔ کوریئر کمپنی کا دفتر آگیا ہے۔ میں نے 'گمان'
کا مسودہ لاہور روانہ کیا، رسید جیب میں ڈالی اور اب میری اگلی منزل شہر بانو پلازا ہے۔ اس

پلازا میں میرے مرحوم دوست جاوید معنی کا فلیٹ ہے لیکن اب وہاں کوئی نہیں رہتا۔ یہ جگہ میری یادوں کا مسکن ہے۔ یہیں جون بھائی سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور جانے کتنی بار ہوئی۔ یہاں ہم سب دوست* اُن کے گرد جمع ہو جاتے اور ایک میلا سا لگ جاتا۔

یاد، خراب و خستہ یاد، بے سر و ساز و نا مراد
جانے قدم قدم کہاں، مجھ کو چلا کے لے گئی

تھوڑی ہی دیر میں شہر بانو پلازا کے اُس فلیٹ کے سامنے کھڑا ہوں جہاں پہلی بار میں نے جون صاحب کی خدمت میں شرفِ باریابی حاصل کیا تھا۔ یہاں پہنچ کر ایک عجیب حزن آمیز طمانیت کا احساس ہوا۔ جیسے کسی بچھڑے محبوب سے مل کر ہوا اور محسوس ہو کہ وہ بھی آپ کی راہ تک رہا تھا۔

مجھے اپنے دوست سہیل فینسی کی آواز سنائی دی۔

''بھائی! کیا ہر وقت فیض، مصطفیٰ زیدی پڑھتے رہتے ہو، یہ بھی پڑھو۔'' اُس نے میری طرف 'شاید' بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جون ایلیا، رئیس امروہوی صاحب کے چھوٹے بھائی۔ کیا کمال کے شاعر ہیں۔ اُردو شاعری کا پہلا ایسا شعر کہا ہے جس میں بریکٹ کا استعمال ہے۔''

میری حیرت زدہ صورت دیکھ کر اُس نے کتاب کھولی اور شعر سنانے لگا۔

اے خدا (جو کہیں نہیں موجود)
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

''اسے پڑھو۔ دو دن بعد اس پر بات ہوگی۔''

یہ کتاب کیا آئی۔ ہم دوستوں کے درمیان اِس کے سوا کوئی موضوع ہی نہ رہا۔ اِس کے دیباچے کی نثر، غزلیں، نظمیں ہر وقت ہماری گفت گو میں شامل رہتیں۔ جانے کتنی غزلیں ہمیں ازبر ہو چکی تھیں کہ ایک نئے دوست آغا وسیم کی ہماری محفل میں آمد ہوئی۔ کلاسیکی شاعری کا دل دادہ، سحر البیان کا حافظ۔ اُس نے بتایا۔ ''یہ جون ایلیا تو واٹر پمپ پر

* جاوید معنی، عزیز احمد، عرفان شیخ، سہیل فینسی، عمار ساجد اور آغا وسیم۔

موٹر سائیکل کی ایک دکان پر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں شام کو جب 'حاجی کلب' سے ایکسر سائز کر کے واپس آتا ہوں تو واٹر پمپ پر واقع 'عمران ملک شاپ' سے لسی پیتا ہوں۔ وہاں سامنے ہی 'ولی آٹوز' ہے۔۔۔ وہاں جون صاحب سیاہ چشمہ لگائے اکثر موجود ہوتے ہیں۔۔۔ اُن کے لیے وہاں سے لسی بھی جاتی ہے۔ اسی آٹوز سے میں اپنی موٹر سائیکل کا کام بھی کرواتا ہوں۔ آٹوز کے مالک جاوید صاحب سے میری اچھی علیک سلیک ہے۔ وہ خود بھی شاعر ہیں۔ کہو تو کل میں اُن سے معلوم کر آؤں کہ اُن کی آٹو شاپ پر بیٹھنے والے کیا واقعی جون ایلیا ہیں؟''

اگلے دن وسیم ہمارے پاس اِس خبر کے ساتھ موجود ہے کہ ہاں، وہ جون ایلیا ہی ہیں۔ دیگر یہ کہ جاوید اُن کے شاگرد ہیں اور جمعے کی شب انھیں اپنے گھر لے آتے ہیں، اتوار کی شام تک وہ وہیں رہتے ہیں۔ میں نے اُن سے ذکر کیا تھا کہ ہم کچھ دوست جون صاحب کے مدّاح ہیں اور اُن سے ملنے کے تمنائی، جس پر جاوید بھائی نے کہا ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں، جمعے کی رات میرے فلیٹ پر آ جاؤ۔ ملاقات ہو جائے گی۔

یہ سب اتنی آسانی سے ہو رہا تھا کہ ہمیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اتنی آسانی سے ہمیں جون ایلیا سے ملنے کا موقع مل رہا ہے، اس سے زیادہ بڑی بات یہ ہونے والی ہے کہ جون بھائی اور ہمارا رشتہ دائمی ہو گا۔

جمعے کی رات میں، سہیل فینسی، عمار ساجد اور آغا وسیم جاوید بھائی کے فلیٹ پر موجود ہیں۔ جون ایلیا ہمارے سامنے بیٹھے ہیں۔ بالکل 'شاید' کے سرورق پر موجود جون۔ ویسے ہی بال، یونانی نقوش اور حد یہ کہ جیسی شاعری پڑھی تھی ویسی ہی باتیں بھی کر رہے ہیں۔ سب اپنا تعارف کروا رہے ہیں۔ اپنی اپنی پسند کی غزل یا اشعار سنا رہے ہیں۔ جون بہت غور سے ہمیں سُن رہے ہیں جیسے انھیں شبہ ہو کہ اتنے کم عمر لڑکے اُن کی شاعری پسند کرتے ہیں۔ اچانک وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ''بیٹا تمھارا نام کیا ہے؟''

میں نے آہستہ سے نام بتایا۔

''پورا نام بتاؤ'' جانے انھوں نے میرا پورا نام کیوں پوچھا؟۔

''خالد احمد انصاری'' میں نے ڈرتے ڈرتے پھر آہستہ سے کہا۔

یہ سُن کر وہ مسکرائے اور کہا۔ ''اوہو۔آپ تو مدینے میں ہمارے میزبان تھے۔''
اور منظر تحلیل۔۔۔

جاوید بھائی کے ڈرائنگ روم میں ہم دوست موجود ہیں اور جون بھائی کے آئندہ مجموعوں کی اشاعت کے لیے کاغذات پر بے ترتیب بکھرا پڑا اُن کا کلام رجسٹروں پر اُتار کر محفوظ کرنے کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔اب یہ کام کون کرے،سب اپنی اپنی لکھائی میں اشعار لکھ کر جون بھائی کو دکھا رہے ہیں۔انھیں کسی کی لکھائی پسند نہیں آرہی۔جاوید نے مجھ سے کہا کہ تم بھی لکھو۔ایک غزل میں نے بھی لکھ کر دکھائی۔میری لکھائی جون بھائی کی سمجھ میں آگئی ہے۔وہ کہہ رہے ہیں،بس طے ہو گیا۔یہ کام خالد کرے گا،یہ لڑکیوں کی طرح صاف صاف لکھتا ہے۔ مجھے ایسا ہی لکھاری چاہیے تھا۔اس طرح یہ ذمے داری میرے سپرد کی جارہی ہے۔ساتھ ساتھ جاوید کی بھابی اسما ہیں اور ان دنوں ایم اے اُردو کے امتحانات میں مصروف ہیں،اُن سے بھی کہا جارہا ہے چوں کہ اُن کی رائٹنگ بھی اچھی ہے لہٰذا وہ بھی حتیٰ الامکان اس کام میں میرا ساتھ دیں۔

پھر۔۔۔نیا منظر
جون بھائی کا شغل جاری ہو چکا ہے۔ گارڈن ایسٹ کا گھر۔ 1992ء کا کراچی آپریشن۔شام 6 بجے کرفیو لگ جاتا ہے۔ اس سے قبل تمام ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرنا ہے۔حرکات و سکنات بھی محدود رکھنا ہیں۔ہم چار دوست جون بھائی کے ساتھ اُن کے حجرے میں موجود ہیں۔ 4 بجے کا وقت ہے۔شہر کے بگڑتے ہوئے حالات پر گفت گو جاری ہے کہ جون بھائی کے لڑک پن کے ایک دوست وارد ہو جاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر جون بھائی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا ہے۔اب وہ اطمینان سے ہماری جانب دیکھ کر بات کر رہے ہیں کہ اچانک اپنے دوست سے مخاطب ہو کر عمار کی طرف اشارہ کر کے پوچھتے ہیں۔۔۔''اسے جانتے ہو؟''
''نہیں''
''یہ حسن عابد کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔''

''اوہ اچھا''

یہ کہہ کر وہ عمار سے مصافحہ کرتے ہیں۔ حسن عابد کی خیریت دریافت کرتے ہیں اور چند لمحوں میں وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اُن کے جانے کے بعد جون بھائی ہم سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہے ہیں۔

''معلوم ہے یہ یہاں کیوں آیا تھا؟''

ہم نے نفی میں سر ہلایا۔

فرمایا۔''بوتل کے چکر میں، کرفیو لگنے والا ہے، اسے معلوم ہے یہاں کے سوا کہیں نہیں ملے گی۔ پر تمھارے بھائی نے بھی کیسا پتا کھیلا۔ اب بھلا اپنے دوست کے چھوٹے بھائی کے سامنے کیسے مانگتا۔''

جون بھائی کی شاطرانہ چال پر ہم سب مسکرا دیے۔

پھر ایک منظر۔۔۔

جون صاحب کا زمان و مکاں کو دیکھنے کا اپنا ہی انداز ہے۔ رات گئے اُوپر فلیٹ میں جون بھائی کے ساتھ۔

جون۔''جانی! وقت کیا ہو گیا ہے؟''

میں۔''جون بھائی، دو بج گئے ہیں۔''

جون۔''دن کے یا رات کے؟''

میں۔''رات کے دو بج رہے ہیں۔''

جون۔''تو ہم بیٹھے کتنے بجے تھے؟''

میں۔''یہی کوئی دس بجے۔''

جون۔ زور سے ہنکارے۔۔۔ ہوں۔۔

''گویا۔۔۔ اگر ہم چھ بجے بیٹھے ہوتے تو ابھی دس بج رہے ہوتے۔''

منظر تبدیل۔۔۔

معروف مصور اور مجسمہ ساز بھائی منصور زبیری کے گھر کا ڈرائنگ روم۔
جاوید معنی، عرفان شیخ اور عزیز احمد، جون بھائی کے ساتھ وہاں موجود ہیں۔ دیگر مہمان
ہیں، صوبائی وزیر پرویز علی شاہ، گلوکارہ یاسمین گل اور ایران سے آئی ہوئی شاعرہ زری سیاح
بھی محفل میں شریک ہیں۔ ہری مرچ، نمک، کالے چنوں کے ساتھ جون جام نوش کر رہے
ہیں۔ ساتھ ہی چینچل، کٹیلے جملوں سے محفل زعفران زار کیے ہوئے ہیں۔ بھائی منصور،
جون کا پیمانہ ختم ہوتے ہی دوبارہ بھر دیتے ہیں۔ جون سے کلام سنانے کا اصرار کیا جا رہا ہے۔
وہ سر جھٹکتے ہیں، یہ گویا اشارہ ہے کہ وہ اب اپنے رنگ میں آ چکے ہیں۔ پھر کچھ توقف کے
بعد وہ اس غزل سے شروع کرتے ہیں۔

کتنے عیش سے رہتے ہوں گے، کتنے اتراتے ہوں گے
جانے کیسے لوگ وہ ہوں گے جو اُس کو بھاتے ہوں گے
یارو ! کچھ تو ذکر کرو تم اُس کی قیامت بانہوں کا
وہ جو سمٹتے ہوں گے اُن میں وہ تو مر جاتے ہوں گے

محفل میں بجلی سی دوڑ گئی ہے۔ اب جون اپنی غزلیں سنا رہے ہیں۔ انھیں ہر شعر پر
داد مل رہی ہے۔ سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔ جون جام پر جام اُنڈیلے جا رہے ہیں کہ
وہاں موجود ایرانی شاعرہ زَری اچانک شرارت آمیز لہجے میں اُن سے مخاطب ہوتی ہیں۔
''اے جون! یہ کیا اَلا بلا پیے جا رہا ہے۔ اِدھر میرے پاس آ۔ میں تجھے زندگی کا
جام پلاتی ہوں۔''

جون معصومانہ انداز سے اُسے دیکھنے لگے اور دی گئی دعوت کا برجستہ جواب دیتے
ہیں۔ ''یہ جام دیکھ کر تو میرا دل چاہ رہا ہے اُن پر اپنی واسکٹ ٹانگ دوں۔'' اور محفل قہقہوں
سے گونج اٹھی۔

اکتوبر کی ایک زرد شام کا منظر
جاوید معنی کینسر کی تشخیص کے بعد زینب میموریل اسپتال کے ایک کمرے میں
کیموتھراپی کے تکلیف دہ مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ جون بھائی اُن کے بستر کے سرہانے
کھڑے اُن کا چہرہ بہ غور دیکھ رہے ہیں۔ جاوید بھی ٹکٹکی باندھے انھیں تکے جا رہے ہیں۔

کمرے کے سکوت میں ڈرپ کی بوندیں ٹپکنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ کہنے کے لیے کسی کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ زندگی کیا داؤ کھیل گئی تھی۔ ہم سب اسے سمجھتے ہوئے بھی سمجھنے کو تیار نہیں ہیں۔ جون جھک کر جاوید کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''تم مجھے کوفے والوں کی طرح دھوکا نہ دینا۔'' جون بھائی کی آنکھوں میں نمی دیکھی جا سکتی ہے، جاوید بھائی کا سپاٹ چہرہ ہر طرح کے تاثرات سے عاری ہے۔ کچھ لمحے اسی طرح گزر جاتے ہیں۔ جون بھائی جاوید کو نظر بھر کر دیکھتے ہیں اور کمرے سے باہر آجاتے ہیں۔ میں اُن کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔ اسپتال کے استقبالیے پر ایک ڈاکٹر انھیں پہچان کر مخاطب ہوتا ہے ''وہ مریض آپ کا کون ہے؟''

جون جواب دیتے ہیں۔ ''وہ میرا بیٹا ہے۔ وہ اتنا مضبوط ہے کہ اس اسپتال کی عمارت بھی اتنی مضبوط نہیں۔''

منظر بدلتے بدلتے رُک گئے۔۔۔۔

میرا دوست جاوید معنی دنیا میں نہیں رہا۔ جون بھائی بھی نہ رہے۔ اِس ہر لمحے بدلتی دنیا میں گزرے لمحوں کو پانے کی فقط تمنا ہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ لمحے بڑا سہارا ہوتے ہیں اور اکثر یہ بھی سمجھا جاتے ہیں کہ یہ سب بے سبب نہیں تھا۔ میں اس سے زیادہ سوچنا نہیں چاہتا پر اس سے قبل کہ زندگی مزید داؤ کھیلے، مجھے وہ سب سمجھنا ہے جو گزرا وقت مجھے سمجھا رہا ہے اور وہ سب کرنا ہے جو ہونا ہے۔ میں ایک نئے عزم سے وہاں سے چل دیا۔

....

جون بھائی سے ملاقاتوں کا ایک باب بند ہو چکا ہے۔ چلیے، اب میں آپ کو ملاقاتوں کے دوسرے دَور کی جانب لے چلوں۔ ہم لوگ نئے گھر میں منتقل ہوئے ہیں۔ جاوید بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ جس سے محبت کی تھی، وہ چھوڑ کر جا چکی ہے۔ نوکری کرنا نہیں ہے۔ بس سارے دن بے کار، ایک نہ آنے والے فون کا انتظار یا دیوانے کی طرح گلیوں میں مٹر گشت، شام ہوتے ہی کسی غم خوار کی تلاش جو میرے عشق کی داستان سُن سکے، اس کے عوض میں چائے، کھانا کچھ بھی کھلانے کو تیار رہتا، بس رات گئے تک مجھے جھیل لے۔ گھر میں اکثر والدہ کی آواز سنائی دیتی۔ ''کب تک بھائیوں کی کمائی کھائے گا۔ لگتا

ہے اس بیٹے کی آمدن میرے نصیب میں نہیں۔''

غرض ایسی ہی کچھ میٹھی، کچھ کسیلی باتیں۔ ایسے حالات میں اگر مجھے کسی شخص کا انتظار رہتا تو وہ آغا وسیم تھا۔ شام کو دفتر سے آتے ہوئے وہ کچھ دیر میرے پاس ٹھہر جاتا۔ وہ میرے معاملاتِ عشق سے بھی واقف تھا اسی لیے اس سے بات کر کے میرا جی بھی ہلکا ہو جاتا۔ صلے میں اُسے جون بھائی کی کچھ غیر مطبوعہ غزلیں، جن کی فوٹو اسٹیٹ اکثر میری جیب میں موجود ہوتی۔۔۔ سناتا، انھیں سُن کے اُس کی دن بھر کی تکان دُور ہو جاتی۔ اُس کے آتے ہی ہم گھر کے سامنے پارک میں بنچ پر بیٹھ جاتے۔ پہلے میں اپنا غبار اُس کے سامنے نکالتا اور پھر جون بھائی کی وہ غزل جس کی اُسے اور مجھے دونوں کو ضرورت ہوتی۔ یہ سلسلہ کافی عرصے تک یوں ہی چلتا رہا۔ اب میرے پاس اُسے سنانے کے لیے کوئی نئی بات تھی، نہ غزل۔ ایسے ہی ایک دن مغرب کے وقت پارک میں بیٹھے ہوئے میں نے وسیم سے کہا۔ ''یار وسیم اِس وقت کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو جون بھائی کے شعروں پر یوں ہلکان ہو رہے ہوں گے؟''

وسیم نے کہا۔ ''مشکل ہے، کوئی ہو۔''

میں نے کہا۔ ''یار، جون بھائی سے ملاقات ہونا چاہیے۔ ہیں تو ہمارے ہی شہر میں، پھر ہم اُن سے دُور کیوں ہیں۔''

کہنے لگا۔ ''کہتا تو تُو ٹھیک ہے۔ نیا کلام تو جانے کیا کیا کچھ ہو چکا ہوگا۔ ہم تو آٹھ دس سال پرانی غزلوں سے دل بہلاتے ہیں۔ چلو کوشش کرتا ہوں۔ ہماری گلی کا ایک لڑکا اُن کا ذکر کرتا ہے، اُس سے معلوم کرتا ہوں۔''

اگلی شام میں گھر کی چھت پر ٹہل رہا تھا کہ آغا وسیم مجھے دُور سے آتا دکھائی دیا، مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس نے دُور سے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ قریب آتے ہی اُس کی پرجوش آواز سنائی دی۔۔۔ ''مِل گئے، مِل گئے، جون بھائی مِل گئے۔''

میں جلدی سے اُتر کے گیٹ پر آیا۔

وسیم کہنے لگا۔ ''چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اُس لڑکے نے جو ایڈریس بتایا ہے، اُس لحاظ سے وہ تمھاری پچھلی گلی میں رہتے ہیں۔ اپنے بھتیجے علی کرار نقوی کے گھر میں۔''

میں نے پتا پوچھا تو کہنے لگا۔ ''تُو چل تو سہی۔ گھروں کی بیل بجا کر پوچھ لیں گے۔'' میں جلدی سے تیار ہو کے باہر آیا اور اُس کے ساتھ ہولیا۔

پچھلی گلی میں داخل ہو کر ہم نے پہلے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد اندر سے آواز آئی۔ ''جی کون؟''

کہا۔ ''کیا یہ علامہ علی کرار نقوی کا گھر ہے، یہاں جون ایلیا رہتے ہیں؟''

جواب ملا۔ ''نہیں''

اس طرح ایک ایک کر کے ہم نے ہر گھر کی بیل یا انٹر کام کا بٹن دبانا شروع کیا۔ بالآخر ایک گھر سے آواز آئی۔ ''سامنے والے گھر میں رہتے ہیں۔'' ہماری خوشی دیدنی تھی۔ سامنے ایک دو منزلہ گھر تھا، ہم نے انٹر کام کا بٹن دبا دیا۔ کچھ دیر بعد اندر سے آواز آئی۔

''کون؟''

ہم نے کہا۔ ''کیا یہ علامہ صاحب کا گھر ہے؟''

جواب آیا۔ ''جی، آپ کون؟''

جواب دیا۔ ''آغا وسیم اور خالد انصاری، ہمیں جون صاحب سے ملنا ہے۔''

تھوڑی دیر میں الیکٹرک لاک کھلا اور ساتھ انٹر کام سے آواز آئی۔ ''اُوپر تشریف لے آئیں۔'' سامنے زینہ تھا، ہم اُوپر چڑھے تو آواز آئی۔ ''سیدھے جا کر آگے دائیں ہاتھ پر دروازہ ہے، اندر چلے جائیں۔'' ہم نے آگے جا کر جیسے ہی دروازہ کھولا۔ سامنے جون بھائی زمین پر بیٹھے لکڑی کی ایک چھوٹی سی صندوقچی پر کاغذات رکھے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ آہٹ سُن کر انھوں نے اُوپر دیکھا، ہمیں دیکھتے ہی وہ چند لمحے گم صم سے رہے پھر اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلا۔

رُندھی ہوئی آواز میں کہنے لگے۔ ''خالد تُو یہاں؟' وہ اس وقت بہت جذباتی ہو رہے تھے، اُسی لہجے میں پھر بولے۔ ''یہ بتا تُو اور یہ وسیم یہاں آئے کیسے؟''

میں نے اُن کا ہاتھ تھام کر انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو ڈھونڈتے ہوئے۔''

وہ کہنے لگے۔ ''یہ نہیں ہوسکتا، تُو یہاں نہیں آسکتا تھا، مجھے بتا، تُو یہاں کیسے آیا؟''

میں نے پھر وہی جواب دیا۔ ''جون بھائی، آپ کو ڈھونڈتے ہوئے۔''

کہنے لگے۔ ''ناممکن، تُو یہاں نہیں آ سکتا تھا، تجھے یہاں بھیجا گیا ہے(ان کا یہ جملہ اب کہیں جا کر سمجھ میں آیا ہے)۔اُن کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں چپ کروا کے بتایا کہ میں یہیں پچھلی گلی میں شفٹ ہو گیا ہوں اور اب روز اُن کے پاس آیا کروں گا۔ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔اس طرح آغا وسیم دوسری بار بھی جون بھائی سے ملاقات کا سبب بنے۔

میرے معمولات اب قدرے تبدیل ہو چکے تھے۔ اکثر شامیں جون بھائی کے ساتھ گزرنے لگیں۔ جون بھائی ویسے ہی جسمانی طور پر کم زور تھے اب اور نحیف نظر آئے۔(سننے میں آیا کہ آغا خان کے ICU سے آئے ہیں) کمرے میں ہر طرف اُن کے کاغذات اور دوائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ بات کرتے ہوئے کبھی سانس لینے میں دشواری ہوتی تو وہ اِن ہیلر کا سہارا لیتے۔ مجھ سے بھائی علامہ علی کرار کا تعارف کچھ اس طرح کروایا۔

''یہ میرا رشتے کا بھتیجا ہے۔ گریڈ 20 کا افسر ہے۔اِس کے پاس نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ ہے مگر پڑھتا نہیں ہے۔ اِس کے کتابوں کے کلیکشن پر بی بی سی نے ایک ڈاکومینٹری بھی بنائی ہے۔مجالس بھی پڑھتا ہے مگر بغیر پیسے کے، چائے کی پیالی پر۔ کرایے پر رہتا ہے اور تمھارا جون بھائی اس کا کرایہ دار ہے یعنی Paying Guest کا Paying Guest۔ میں اس کمرے اور کھانے پینے کے اسے دس ہزار روپے ماہانہ دیتا ہوں۔دوائی اور شراب کا خرچ الگ ہے۔بس جانی! تُو مجھے اب یہاں سے لے جا۔''

میں نے کہا۔''جون بھائی میری تو نوکری بھی نہیں ہے میں کہاں آپ کو سنبھالوں گا۔''

حیرت سے کہنے لگے۔''تُو نوکری نہیں کرتا، تُو نے کہاں تک پڑھا ہے؟''

جب بتایا، ایم بی اے تو تعجب سے کہنے لگے۔''اتنا پڑھ کر بھی نوکری نہیں، میں علی کرار سے کہہ کر تیری نوکری کا بندوبست کرواتا ہوں۔اچھا یہ بتا، تیرے گھر کا ایڈریس کیا ہے؟''

میں نے کہا۔''جون بھائی آپ کو یاد نہیں رہے گا۔''

بولے۔''ارے بتا تو سہی، مجھے یاد ہو جائے گا۔ کبھی میں بھی تیری طرف آجایا کروں گا۔''

میں نے کہا۔''C-57 ''

بولے۔ ''یہ تو بہت آسان ہے۔ 1857ء۔ غدر۔ لے تیرے بھائی کو یاد ہو گیا۔''

جون بھائی شام 4 بجے کے لگ بھگ سو کر اُٹھتے اور پھر ناشتے کے بعد کمرے کی کھڑکی سے دیوار تکا کرتے کہ سایہ دیوار پر آیا کہ نہیں۔ سایہ دیوار پر آجاتا تو اُن کا دَور شروع ہو جاتا جو رات گئے تک جاری رہتا۔ لیکن اب معاملات واضح طور پر مختلف تھے۔ پہلے دَور کے جون بھائی پی کر بہکا نہیں کرتے تھے بل کہ رنگ میں آکر وہ اور دل چسپ ہو جاتے تھے۔ اب جون، وہ جون نہیں تھے بل کہ پرانی باتوں کی تکرار کرنے لگتے۔ پہلے انھیں کالے چنوں اور ہری مرچ نمک کے ساتھ شغل کرتے دیکھا تھا، اب پاپے متبادل تھے اور دَور شروع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد ناقابلِ برداشت ہو جاتے اور یہ بھانپ جاتے کہ میں جانا چاہتا ہوں، لہٰذا آواز لگاتے۔ ''تم جا نہیں سکتے۔'' جب یہ معاملہ میرے لیے مشکل ہوتا چلا گیا تو میں نے یہ ترکیب سوچی کہ اُن سے کہتا جون بھائی ٹیوشن پڑھانے جانا ہے، یہ سُن کر وہ سوچ میں پڑ جاتے اور کہتے۔ ''یہ تو روٹی روزی کا معاملہ ہے، اس پر تو میں تجھے نہیں روک سکتا۔'' اور جانے دیتے۔

کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ جون بھائی کا نیا مجموعۂ کلام 'یعنی' طباعت کے مرحلے میں ہے۔ ایک صاحب جو شاعر بھی ہیں، خوش خط بھی، اُن کا کلام رجسٹروں پر منتقل کر رہے تھے کہ اُس میں سے غزلیں منتخب کر کے کمپوز کروائی جائیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ معاوضہ بھی لیتے ہیں تو حیرت ہوئی۔

اکثر شام کو وہ اپنے بکھرے ہوئے کاغذات کا پلندہ لے کر بیٹھ جاتے اور یعنی کا پیش لفظ لکھوانے کی کوشش کرتے۔ ''لکھو بیٹے، میرے بابا میرے عالی شان بابا۔۔۔'' اور کچھ صفحات کے بعد وہ لکھوانے کے قابل نہ رہتے۔ یہ سلسلہ کافی عرصے چلتا رہا۔ میں بھی اس روز روز کی مشقت سے تنگ آچکا تھا۔ ایک دن اُکتا کر میں نے کہہ ہی دیا ''جون بھائی آپ کے بابا وہی ہیں۔ بھائی وہی ہیں۔۔۔ کوئی نئی بات ہونا چاہیے۔ یہ سب تو آپ کے چاہنے والے 'شاید' کے دیباچے میں پڑھ چکے ہیں۔ لوگ آپ کی شاعری کا انتظار کر رہے ہیں، اسے لانے کی کوشش کریں۔'' آخر یہ بات اُن کی سمجھ میں آگئی اور طے یہ پایا کہ دیباچہ اب شکیل عادل زادہ لکھیں گے جیسا کہ انھوں نے 1957ء سے اب تک

انھیں دیکھا، بس وہ لکھ دیں تو کتاب آ جائے گی۔ اُسی زمانے میں جنگ اخبار کا ٹی وی چینل جیو نیوز لانچ ہوا اور شکیل بھائی وہاں مصروف ہو گئے۔ رات میں جون بھائی انھیں یاددہانی کے لیے کال کرتے۔ کہتے تھے۔ ''شکیل کی نئی نوکری ہوئی ہے جنگ کے نیوز چینل میں، ایک لاکھ روپے تن خواہ ہے مگر کام بہت ہے۔ کہتا ہے، اسکرپٹ کی بوریاں بھر کر دے دی ہیں۔ اُن سب کو پڑھنا ہے، وہ جسے منظور کرے گا، اُسی پر ڈراما بنے گا۔ جیسے ہی اُسے کچھ فرصت ملی، فوراً لکھ دے گا۔''

'یعنی' کے سلسلے میں وہ خاصے محتاط تھے۔ دراصل وہ اپنے پہلے شعری مجموعے 'شاید' کی شہرت کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہر ملنے والے سے اس کے بارے میں رائے لیتے۔ ''جانی! کیا 'شاید' کو پچھاڑ دے گی؟ کیا 'شاید' سے بہتر ہے؟'' یہی نہیں اس کتاب کے نام میں بھی ردوبدل کرتے رہتے۔ کئی غزلیں، نظمیں نکالی گئیں۔ کئی بعد میں شامل ہوئیں۔ ''یہ غم کیا دل کی عادت ہے؟ نہیں تو'' میرے کہنے پر شامل ہوئی۔ اسی طرح ''حالتِ حال کے سبب حالتِ حال ہی گئی'' آخری لمحوں میں نکال لی گئی۔ وجہ جاننا چاہی تو فرمایا۔ ''سارے داؤ ایک ساتھ نہیں چلا کرتے۔''

'یعنی' سب رنگ کے دفتر میں کمپوز ہوئی۔ اسے کمپوز کروا کے الحمد سے شایع ہونا تھا۔ اکثر جون بھائی کتابت کی غلطیاں لگا کر درست کروانے مجھے سب رنگ کے دفتر بھیج دیتے۔ کئی دفعہ خود بھی وہاں ہمارے ساتھ گئے۔ دوپہر کے وقت 'سب رنگ' کے دفتر میں کھانے کا بہترین انتظام ہوتا تھا۔ ایک طرف بھائی شکیل کے خانساماں کے پکوان تو دوسری طرف وہاں آئے ہوئے لوگ بھی کچھ نہ کچھ اپنے ساتھ لے آتے۔ اس طرح اچھی خاصی ضیافت بج جاتیں، بعد میں چائے کا دور چلتا۔ تین بجے بھائی شکیل قیلولہ کرنے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ جون بھائی جب بھی وہاں گئے، یہ حالات دیکھ کر بہت کڑھے اور ایک بار تو سب کے سامنے کہا۔ ''شکیل! تم بھائی رئیس نہیں ہو، تم بھائی رئیس نہیں بن سکتے۔ رسالہ تمھارا سال دو سال میں آتا ہے۔ تن خواہیں تم ہر ماہ دیتے ہو۔ اُس پر یہ شاہانہ انداز، یہ لنگر بند کرو، تم برباد ہو جاؤ گے۔'' شکیل بھائی سب سنتے، مسکراتے رہتے۔

ایک دن جون بھائی نے وہاں موجود لوگوں کو شرمندہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مجھے

اور آغا وسیم کو پہلے سے بتا دیا کہ کھانا شروع ہونے والا ہو تو باہر جا کر کچھ کھا لینا، اُس کے پیسے مجھ سے لے لینا، پھر میں انھیں ٹھیک کروں گا۔ اور ایسا ہی ہوا، کھانا شروع ہوتے ہی انھوں نے ہمیں اشارے سے باہر جانے کو کہا اور وہاں موجود لوگوں کو احساس دلانے کے لیے خود بھی نہ کھایا۔ لیکن یہ معاملات بعد میں بھی یوں ہی جاری رہے۔ سب رنگ کا لنگر جاری رہا۔

جون بھائی کو معلوم تھا کہ وہ صرف شاعر ہیں اِس کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ خود کہتے ''میں سر کے بال سے لے کر پاؤں کے ناخن تک صرف شاعر ہوں۔'' ایک دن اُن کے پاس ایک لڑکا غزل کی اصلاح کے لیے آیا۔ اُس کی غزل دیکھ کر کہنے لگے۔ ''ہر شخص کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس پائے کا شاعر ہے۔ شاعری آدمی کو تب کرنا چاہیے جب اُسے معلوم ہو کہ وہ اے گریڈ شاعری کرتا ہے اور یہ بات شاعر کو خود معلوم ہوتی ہے۔ بی یا سی گریڈ شاعری کا کوئی فائدہ نہیں۔ اِس کے بجائے آپ کوئی اور کام کر لیں۔''

جون بھائی زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک واضح موقف رکھتے تھے۔ مگر کچھ ایسی چیزوں پر بھی یقین رکھتے تھے جو اُن کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں مثلاً وہ علم الاعداد کے اسرار کے بھی اچھے خاصے قائل تھے۔ کوئی بھی تحریر لکھنے سے قبل جانے کیوں صفحہ کے اُوپر 11 کا ہندسہ لکھتے۔ وہ 4 اور 8 کے ہندسے سے بہت کتراتے تھے۔ میں نے انھیں مشاعرے کے لیے تیار ہو کر کسی سے پوچھتے دیکھا۔ ''آج تاریخ کیا ہے؟'' اُس نے کہا۔ ''چار'' یہ سننا تھا کہ انھوں نے کپڑے تبدیل کر لیے اور مشاعرے میں جانے سے انکار کر دیا۔ پوچھنے پر کہنے لگے۔ ''تم سمجھتے ہو گے کہ تمھارا جون بھائی جو اتنا روشن خیال بنا پھرتا ہے، اندر سے کتنا توہم پرست ہے۔ تو سنو، یہ سب حادثات و سانحات میرے ساتھ صرف 4 یا 8 تاریخ ہی کو کیوں پیش آتے ہیں؟'' اس کے بعد انھوں نے ایک طویل فہرست سنائی۔ میرے والد کا انتقال 4 کو، والدہ کا انتقال 8 کو، میری شادی 4 کو اور علیحدگی 8 تاریخ کو وغیرہ وغیرہ۔ ہم حیرت سے اُن کا منھ تکتے رہ گئے۔ وفات سے کچھ عرصے قبل وہ اکثر پوچھا کرتے کہ آج دن کیا ہے؟ کبھی اگر بتایا گیا کہ آج جمعہ ہے تو کہتے۔ ''یار! یہ آج کل جمعہ بہت آ رہا ہے۔'' یہ اور نہ جانے اسی طرح کی کتنی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں اُن کی زندگی کے بارے میں باریک بینی سے اُن کے مشاہدے اور تجزیے بیان کرتی ہیں۔

میں جون بھائی کے علاوہ کبھی کسی شاعر کی صحبت میں نہ بیٹھا تھا۔ اُن کا یہ مصرع ''تمھیں سب شاعروں سے وحشت ہو'' مجھے بد دعا کی طرح لگا ہے۔ وہ دیگر شاعروں کی طرح کبھی اپنے شعر نہیں سنایا کرتے، بل کہ اُن کے پاس بیٹھ کر میرا دل چاہتا، کاش وہ کچھ سنائیں۔ اُن کی علمیت، فلسفیانہ پیچ وخم لیے گفت گو اور قاتلانہ جملے سامنے والے کو مسحور کیے رہتے تھے۔ اسلامی تاریخ پر انھیں مکمل عبور حاصل تھا۔ تاریخ پر گفت گو کرتے تو گھنٹوں ایسے ایسے واقعات سناتے کہ حیران کر دیتے۔ کہتے تھے۔ ''میں نے تاریخ عربی میں پڑھی ہے، ترجمے میں تم لوگوں سے بہت کچھ چھپالیا گیا ہے۔''

شام کو میں اُن کے پاس جاتا تو نچلی منزل پر بندھے ایک دنبے کی آواز انھیں بہت بے کیف کیا کرتی۔ مجھ سے کہا کرتے۔ ''اِس کی آواز سُن، بالکل انسانی آواز میں ممیاتا ہے۔'' کبھی کہتے۔ ''تُو شام میں میرے پاس کیوں آجاتا ہے۔ شام کو تو لڑکے تیار ہو کے بازاروں میں لڑکیوں کے پیچھے جاتے ہیں۔ تُو عجیب ہے۔ دنیا کے سب سے تنہا اور بور کرنے والے آدمی کے پاس آجاتا ہے۔ تجھے میرے پاس ملتا کیا ہے۔''

میں کہتا۔ ''جون بھائی! آپ نہیں جان سکتے جو سکون مجھے آپ سے بات کر کے ملتا ہے وہ کسی لڑکی سے کہاں؟''

کبھی ڈرامائی انداز میں میرا پُر تپاک استقبال کرتے۔ ''ارے خالد انصاری صاحب! آپ آگئے؟ پرسوں میری رام چندر سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے آپ لکھنؤ سے ٹرین میں سوار ہو گئے ہیں۔ میرے حساب سے آج آپ کو دلّی میں ہونا چاہیے تھا مگر آپ تو کراچی پہنچ گئے۔ آیئے آیئے۔۔ اندر تشریف لایئے۔''

ایک دن کہنے لگے۔ ''تجھے معلوم ہے، تیرا جون بھائی بڑا ماڈرن آدمی ہوا کرتا تھا۔ لائٹ ہاؤس جا کر پردوں کا کپڑا خرید کر اُن کی پینٹ سلوا کر پاجامے کے اوپر پہنتا تھا کہ رانیں بھری بھری لگیں اور اُس زمانے میں راک ہڈسن کی مشہور فلم Come September کے میوزک پر ڈانس کیا کرتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر میں وہ میوزک کہیں سے لے آؤں تو آپ ڈانس کریں گے؟''

کہنے لگے۔ ''بالکل، تیرا بھائی ناچ کر دکھائے گا۔'' میں نے وہ میوزک بہت

ڈھونڈا پر مل نہ سکا۔ آج کل کا دور ہوتا تو ایک منٹ میں ڈاؤن لوڈ کر کے لے جاتا۔ لیکن میں نے اُن کا رقص دیکھا، اُس میوزک پر نہ سہی، ایک اور موقع پر۔

میر تقی میر کی مشہور غزل ''دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا'' جون بھائی کو بہت پسند تھی۔ اکثر اُسے گنگنایا بھی کرتے۔ ایک دن گنگناتے ہوئے کہنے لگے۔ ''اس غزل کو جیسا لتا نے گایا ہے، ایسا تو اختری بائی فیض آبادی کے بس کی بھی بات نہیں تھی۔ اس شعر میں اُس نے 'یوں' جس طرح ادا کیا ہے اس نے بڑے بڑے گائیکوں کی ماں بہن ایک کر دی ہے۔''

اور پھر گلاس تھامے، غزل گنگناتے، ماہر رقاص کی طرح تھرکنے لگے۔

ایسے ہی ایک روز کہنے لگے۔ ''یوپی والوں جیسے جملے باز میں نے دنیا میں نہیں دیکھے۔ ایسا جملہ مارتے ہیں کہ سمجھ میں بھی نہ آئے اور سننے والا تڑپ کر رہ جائے۔'' مثال کے طور پر کوئی لڑکی اُن کے سامنے سے گزرے تو کہتے ہیں۔ ''دانہ جا رہا ہے دانہ۔۔۔ دانہ جا رہا ہے دانہ'' اب بتاؤ لڑکی بے چاری پر کیا بیتتی ہوگی۔

ایک شام دَور جاری تھا کہ مجھ سے کہا کہ اپنے لیے بھی پیگ بنا۔ میں نے کہا۔ میں نہیں پیتا۔ کہنے لگے۔ ''میں کہہ رہا ہوں بنا۔''

اُن کے اصرار پر ایک چھوٹا سا پیگ بنا کر بڑی مشکلوں سے پی کر ختم کیا۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے۔ ''ایک اور بنا۔''

میں نے کہا۔ ''بھائی، مجھے گھر بھی جانا ہے، کیسے جاؤں گا۔''

فرمایا۔ ''ابھی وسیم آتا ہوگا، اُس کی اُنگلی پکڑ کر چلے جائیو۔''

جون بھائی کو اپنی شعری حیثیت کا احساس تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اُن جیسا کوئی نہیں اور اُن کی اُس طرح قدر نہیں کی جا رہی جو اُن کا حق ہے۔ دوسری قومیت کے جو شاعر اُردو میں شاعری کر رہے ہیں، انھیں اُن سے زیادہ پذیرائی مل رہی ہے۔ اُس پر کڑھ کر کبھی کہتے۔

''کاش میں بلوچ یا مکرانی ہوتا اور گدھا گاڑی چلا رہا ہوتا یا یوں کہہ لو، پنجابی ہوتا اور کہیں کھیت میں ہل چلا رہا ہوتا یا پھر سندھی ملنگ ہوتا اور کسی مزار پر بھنگ پی کر پڑا ہوتا، پٹھان موچی ہوتا، فٹ پاتھ پر بیٹھا جوتیاں گانٹھ رہا ہوتا اور اُردو میں شاعری کر رہا ہوتا تو

میری قوم مجھے اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتی۔ پر میں ان اُردو بولنے والوں میں نہ پیدا ہوا ہوتا، جہاں میں رائگاں گیا۔''

ایک شام میں جون بھائی کے پاس گیا تو ایک صاحب سفید کرتا پاجامہ پہنے، سر پہ سفید ٹوپی پہنے اُن کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ جون اُن پر سخت برہم دکھائی دیے۔ میں خاموشی سے کونے میں بیٹھ کر اُن کی گفت گو سننے لگا۔ جون کہہ رہے تھے۔ ''طہیر، حالی بن حالی۔ مجھے غالب کی طرح اُٹھا۔ تُو مجھے اُلٹا نیچے گرا رہا ہے۔ یہ میری کتاب کا دیباچہ ہے اگر اس میں ایسا لکھے گا، میری کم زوریاں لکھے گا تو پڑھنے والے پر کیا اثر پڑے گا۔ افسوس! مجھے ایسے حواری ملے۔'' وہ صاحب چپ چاپ کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے اور جون بھائی انھیں کیا کیا سناتے رہے۔ پھر کچھ دیر خاموش رہ کر گویا ہوئے۔ ''طہیر! تُو تو بابا کا پانچواں بیٹا تھا۔ تجھ سے تو وہ کربلا کے نقشے بھی بنواتے تھے۔ ایسا کر، اُس کارٹن میں بابا کی کتابوں کے مسوّدے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تُو لے جا، یہاں ضائع ہو جائیں گے۔ کچھ کام کے ہوئے تو دیکھیں گے۔'' مگر وہ صاحب راضی نہ ہوئے اور کچھ دیر بعد اجازت لے کر چلے گئے۔ یہ وہ مسوّدے تھے جن کے بارے میں انھوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ انھوں نے اپنے بابا سے وعدہ کیا تھا کہ بڑے ہو کر شایع کروائیں گے۔ چوں کہ وہ وعدہ پورا نہ کر سکے اور مسوّدات ضائع ہو گئے، اُسی قلق میں وہ اپنی کتابیں چھپوانے سے گریزاں رہے۔ اور اُن کے اُس ڈرامائی انداز سے، میں اور جانے کتنے لوگ ایک سحر انگیز کرب سے دوچار ہوئے۔ وہ مسوّدے آج بھی علامہ علی کرار نقوی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

اُن صاحب کے جانے کے بعد میں نے جون بھائی سے پوچھا۔ ''آخر یہ اتنا شریف النفس شخص کون تھا جو سر جھکائے آپ کی ڈانٹ سنتا رہا اور زبان سے کچھ نہ بولا۔''

ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ ''یہ میرا بچپن کا دوست طہیر نفسی تھا۔ اُردو کالج میں نفسیات کا پروفیسر ہے، اِسی نسبت سے میں نے اُس کا نام نفسی کر دیا۔ اتنا شریف ہے کہ گالی تک نہیں دے سکتا، اس سے میں نے 'یعنی' پر لکھنے کو کہا تھا۔ اُسے چاہیے تھا، مجھے غالب کی طرح اُٹھاتا، نہ جانے میری کیا کیا باتیں لکھ کر لے آیا کہ جسے پڑھ کر کوئی لڑکی آنے کی بجائے بھاگ جائے۔''

ایسی ہی بہت سی شاموں کی طرح ایک شام، جون بھائی رنگ کی لہر میں وسیم کی گود میں جا بیٹھے اور حکم صادر کیا۔ ''او آریائی النسل! سنا ہے تُو تصویریں بہت اچھی بناتا ہے۔۔۔چل ہم دونوں کی بنا۔۔۔''میں نے تعمیل کی اور قریب موجود کاغذ پر شبیہ بنا ڈالی۔
کچھ دیر کاغذ ہاتھ میں لیے تصویر دیکھتے رہے، پھر اس پر شعر اور یہ سطریں لکھ دیں۔

''خالدِ فن کے خواب کی تعبیر
یعنی، میری اور وسیم کی تصویر

چند لمحوں میں نہایت مبہم شباہت کے زیرِ اثر میرے ناہنجار اور نابکار بیٹے آیت اللہ خالد نے مجھے اور وسیم کو کھینچا ہے اور کھینچ ڈالا ہے۔ خدا کرے کہ وہ موقلم کا راستہ اختیار کرے۔
خدا اور اُس کے فرشتے رات دن اِس پر لعنت بھیجیں۔''
جون ایلیا، 7 اپریل، 2002ء

(تصویر پر لکھی تحریر کا عکس)

کہتے تھے۔ ''اگر تُو باقاعدہ مصوری شروع کر دے تو میں تیرا نام 'خالد فنان' رکھوں گا۔

لوگوں میں اُن کے بارے میں یہ تاثر بھی ہے کہ جون اپنے کلام کے معاملے میں بہت بے پروا تھے۔ میرا خیال ہے، وہ اس معاملے میں بہت محتاط تھے اور اپنا کلام مختلف جگہوں پر لکھ کر منتقل کر دیا کرتے تھے کہ اگر کوئی بیاض یا رجسٹر کھو جائے تو دوسری جگہ موجود ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ ایسی غزلیں ہوں جو لکھے جانے کے فوراً بعد کوئی اُن سے لے گیا ہو یا رجسٹر پر اُتاری نہ جا سکی ہوں۔ اُن کے زیاں کا خدشہ ہے۔ وہ رجسٹر جو میں نے اور اسما بھابی نے نوے کی دہائی میں اُن کا کلام محفوظ کرنے کی غرض سے بنائے تھے، وہاں موجود تھے۔ پر اُن کی حالت دیکھ کر اکثر تکلیف ہوتی کہ کہیں صفحے پھٹے تھے یا کسی کا فون نمبر،

دوائیوں کے نام یا کچھ اور لکھا ہوتا۔ ایک دن میں نے اُن سے کہا کہ "یہ رجسٹر میں یہاں سے لے جا رہا ہوں۔ مجھے اپنی محنت کی ایسی بے توقیری بہت کھلتی ہے۔ آپ کو جب کبھی ان میں سے کسی رجسٹر کی ضرورت ہو تو، میں پچھلی گلی ہی میں تو رہتا ہوں، آپ کے پاس لے آیا کروں گا۔" جون بھائی کبھی اپنا کلام ایسے کسی کو نہ تھماتے لیکن چوں کہ یہ سارا کام میرا ہی کیا ہوا تھا، انکار نہ کر سکے، بل کہ اپنی دیگر چیزیں بھی میری تحویل میں دے دیں کیوں کہ وہاں سے اکثر چیزیں غائب ہو رہی تھیں۔

جون صاحب کی غالبؔ دشمنی کے بھی بہت چرچے ہوئے۔ بعض شعروں میں غالبؔ پر طنز کے تیر بھی برسائے، لیکن وہ خود غالبؔ کی طرح شہرت کے خواہش مند رہے۔ ایک دن اس سلسلے میں بات ہوئی تو فرمایا۔ "غالب ایک بہت چالاک آدمی تھا۔ بھلا بتاؤ، 72 سال کی عمر تک صرف یہ 100 غزلیں ہی کہیں۔ جانی! اُس کا باقی کا کلام کہاں ہے؟ اُسے سامنے کیوں نہیں لایا؟ آخر میرؔ کے بھی تو 6 دیوان ہیں۔ اُس نے جان بوجھ کر صرف انتخاب شایع کروایا۔ اگر تم اُس کے استاد بیدلؔ کا فارسی کلام پڑھ لو تو تم غالبؔ پر سرقے کا الزام لگا دو۔"

اُسی زمانے میں رات کو اکثر نو بجے کے قریب کسی خاتون کا فون آنے لگا جو کافی طویل ہوتا۔ ایک دفعہ میرے پوچھنے پر بتایا۔ "ایک بہت مال دار خاتون ہے۔ شادی شدہ ہے، ایک بیٹی ہے، ڈیفنس میں رہتی ہے، میاں بیمار ہے۔ تیرے بھائی پر مرتی ہے۔ شادی کے لیے کہتی ہے کہ پہلے بیٹی کے فرض سے فارغ ہو جائے تو شوہر سے طلاق لے کر میرے پاس آ جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ تو کافی وقت طلب معاملہ لگ رہا ہے۔ کم از کم ملاقات کی تو کوئی صورت نکالیں۔"

کہنے لگے۔ "ہاں یہ تُو ٹھیک کہتا ہے۔ کل بات کر کے بتاؤں گا۔"

اگلے دن کہنے لگے۔ "تمھاری ہونے والی امّی سے بات ہوئی تھی۔ کہہ رہی تھیں، مجھے فیڈرل بی ایریا تک کا راستہ نہیں معلوم، میں صرف قائدِ اعظم کے مزار تک خود گاڑی ڈرائیو کر کے آ سکتی ہوں۔ میں نے اُس سے کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں، وہاں تک آ جاؤ اور

گاڑی وہاں کہیں پارک کر دینا، اُدھر سے میرا بیٹا خالد تمھیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر یہاں لے آئے گا۔ سُن کر رضامندی تو ظاہر کر دی ہے، دیکھو کس دن آتی ہے۔"

جتنا میں جون بھائی کو سمجھ سکا میرا خیال ہے یہ بات بھی دیگر باتوں کی طرح صرف رنگ بکھیرنے کے لیے ہوتی تھی۔ ورنہ کیسی امی، کس کی امی، کہاں کی امی۔

جب امی کا ذکر چھڑا ہے تو چلیں ایک اور واقعہ --- جون صاحب کے شادی کرنے کے شوق کے بڑے چرچے رہے۔ ایسا وہ صرف لوگوں کو متوجہ کرنے یا انھیں اپنے گرد جمع رکھنے کے لیے کرتے تھے کہ لوگ ایسی باتوں میں دل چسپی لیتے اور گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھتے۔ ایک شام اُن کے پاس گیا تو دیکھا کہ جون بھائی کسی شخص سے بیٹھے دھیمے لہجے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ میں جا کر کچھ فاصلے پر خاموشی سے بیٹھ گیا کہ کیا معلوم، کوئی ذاتی گفت گو ہو رہی ہو۔ کچھ دیر بعد اُن کی نظر مجھ پر پڑی تو کہنے لگے۔

"ارے بیٹا خالد اِدھر آؤ، تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

میں قریب جا کر بیٹھ گیا تو اُس شخص سے تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ صاحب میرے لیے ایک رشتہ لائے ہیں۔ لڑکی بی اے پاس ہے۔ واٹر پمپ کے پاس فلیٹ میں رہتی ہے۔ کہہ رہے ہیں، کل جا کر دیکھ آئیں۔"

میں نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "جون بھائی رہنے دیں، کس معاملے میں پڑ رہے ہیں۔"

شوخی سے بولے۔ "میں اپنے لیے بیوی لینے تھوڑی جا رہا ہوں، تیرے لیے امی لینے جا رہا ہوں۔ جب تُو رویا کرے گا تو وہ تجھے چپ کرائے گی، اپنی گود میں لٹائے گی۔ اور تُو اُس کی گود میں لیٹ کر غاؤں غاؤں غاؤں ---- کرے گا۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی جون بھائی مجھے تو اِس معاملے سے الگ رکھیں۔"

کہنے لگے۔ "تجھے کل میرے ساتھ جانا ہوگا۔ تُو، علی کرار اور ذکیہ (علامہ علی کرار کی بیگم)۔"

میں ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پر وہ نہ مانے اور کہا۔ "تُو کل شام آ رہا ہے بس۔" پھر وہ اُس شخص سے بار بار پوچھتے رہے۔ "لڑکی سامنے آ کر مجھ سے بات تو کرے گی؟"

اور وہ انھیں یقین دہانی کراتا رہا۔

میں نے اُن سے تاکیداً کہا۔ ''اگر وہاں جانا ہے تو کل آپ بالکل نہیں پییں گے۔'' انھوں نے تمام تر سنجیدگی سے ہامی بھرلی۔

اگلے دن شام 5 بجے میں جون بھائی کے پاس گیا تو دیکھا کہ بوتل کھلی ہوئی ہے اور شغل جاری ہے۔ یہ منظر دیکھتے ہی میرا اُن کے ساتھ جانے کا ارادہ ڈگمگانے لگا، لیکن اب فرار کا راستہ نہ تھا۔ دیکھتے ہی کہنے لگے۔ ''ارے یہ تو ایسے ہی پیگ بنالیا تھا، میں کوئی پی تھوڑی رہا تھا۔''

میں کچھ نہ بولا اور آگے پیش آنے والی صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد، میں، علامہ صاحب، اُن کی اہلیہ اور جون بھائی رشتہ دیکھنے روانہ ہو گئے۔ تیسری منزل پر فلیٹ تھا۔ جون بھائی کو سنبھالتے سنبھالتے اُوپر لے گیا۔ میں، علامہ صاحب اور جون بھائی لڑکی کے بزرگوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ رسمی باتوں کے بعد لڑکی کے متعلقین نے جون بھائی کا باقاعدہ انٹرویو شروع کیا۔ جون بھائی کی مے نوشی اپنا کام کر چکی تھی۔ اُن کی بہکی بہکی باتوں سے ہم سب جھینپ رہے تھے کہ وہ آدمی جو یہ رشتہ لے کر آیا تھا، مجھے کمرے کے دروازے پر نظر آیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مجھے اپنے پاس بلانے کے اشارے کرنے لگا۔ میں اُٹھ کر اُس کے پاس گیا تو کہنے لگا۔ ''غضب ہو گیا، لڑکی نہیں ہے۔'' میں نے گڑبڑا کر اس سے کہا۔ ''کیا بات کر رہے ہو، کہاں ہے لڑکی؟'' کہنے لگا۔ ''معلوم نہیں، کہیں گئی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب کیا ہوگا؟ کون سنبھالے گا انھیں؟ وہ تو کل سے پوچھ رہے تھے کہ لڑکی سامنے بیٹھ کر مجھ سے بات کرے گی؟''

پر وہ آئیں بائیں شائیں کرتا رفو چکر ہو گیا۔ میں علامہ صاحب کے پاس آیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ یہ سنتے ہی وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ ''خالد میاں، آپ چچا کو لے کر آجائیے گا۔ مجھے ذرا کام ہے، میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اہلیہ کو آواز دی اور انھیں لے کر چلے گئے۔

جون بھائی ان تمام باتوں سے بے خبر بزرگوں سے گفت گو میں مشغول تھے۔ میں نے اُن سے کہا۔ ''جون بھائی چلیے۔''

کہنے لگے۔ ''کہاں چلیں؟ ابھی تو لڑکی آئے گی، اُس سے بات کرنا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''کوئی لڑکی نہیں ہے، گھر چلیں۔''

یہ سننا تھا کہ وہ بپھر گئے اور لگے کوسنے۔ میں موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے اُن تمام لوگوں سے معذرت کرتا، جون بھائی کو سنبھالتا بڑی مشکل سے فلیٹ سے اُتار کر لایا۔ اور گھر لے گیا۔ اگلے دن اُن سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ شادی کے لیے ایسا کوئی ایڈونچر نہیں کریں گے اور ایسا کیا تو میں اُن کے ساتھ نہیں ہوں گا۔

شام اُن کے لیے قیامت تھی۔ شام کی وحشت سے بچنے کے لیے، وہ جانے کیا کیا سوانگ بھرتے، تماشے کرتے تھے۔ خاندان، گھر، ایک بھرپور مجلسی زندگی گزار کر یکایک وہ اکیلے ہو گئے تھے۔ اپنوں سے بچھڑنے، دوستوں سے دُوری، طرح طرح کی محرومیوں کا احساس اُن کے رَگ وپے میں سرایت کر چکا تھا۔ بس وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ شراب تو ایک بہانہ ہے۔ شراب نوشی کے جس درجے پر وہ پہنچ گئے تھے، اُس نے انھیں اور آزردہ، کبیدہ خاطر اور تنہا کر دیا ہے۔

اُن دنوں وہ مجھے کافی ٹوٹے پھوٹے، اندر سے بکھرے ہوئے لگے۔ اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی نے انھیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ پر اب بھی وہ کسی نہ کسی طور اپنی فیملی سے رابطہ کرتے رہتے، سسپنس ڈائجسٹ میں لکھے انشائیوں کے پیسے بھی گھر بھجواتے، اُن لوگوں کا اُن سے کوئی تعلق تھا یا نہیں مگر جون بھائی اپنے بچوں کے مستقبل اور ضروریات کی فکر رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پھر سے اُن میں جا بسیں۔ پر اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ کہتے تھے۔ ''زاہدہ آج بھی چائے کی پیالی تھامے انھیں جگاتی ہے۔''

دونوں کا تعلق ٹوٹ تو گیا تھا مگر جون بھائی کبھی کبھی کچھ واقعات سنایا کرتے۔ جون بھائی کا ایک شعر ہے

ہاں فضا یاں کی سوئی سی ہے
تو بہت تیز روشنی ہو کیا

میری سمجھ میں یہ شعر نہیں آتا تھا۔ جون بھائی سے پوچھا تو انھوں نے ایک واقعہ سنایا۔ ابھی جون بھائی اور زاہدہ باجی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ رومان چل رہا تھا۔

کسی بات پر دونوں کے بیچ ناراضی ہوگئی۔ جھگڑا اتنا شدید تھا کہ بات چیت بالکل بند تھی۔ یہ صورتِ حال دونوں کو تکلیف دے رہی تھی کہ ایک دوسرے کے بغیر رہنا محال لگتا تھا۔ آخر طے ہوا کہ دونوں کہیں ملیں اور گلے شکوے دُور کریں۔ ایک ریستوراں میں دونوں جا بیٹھے۔ مگر اَنا کے ماروں میں سے کوئی پہل نہیں کر رہا تھا۔ دونوں منھ پھلائے، ایک دوسرے سے نظریں چرائے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ آخر تنگ آکر زاہدہ حنا نے ریستوراں کے ماحول پر سرسری تبصرہ کرتے ہوئے خاموشی توڑی اور کہا۔ ''ہاں! فضا یاں کی سوئی سوئی سی ہے۔''

جون بھائی کا کہنا ہے میں پہلے ہی جھلایا ہوا تھا، تنک کر بولا۔

''تو بہت تیز روشنی ہو گیا۔''

اُسی زمانے میں اُن کے زاہدہ باجی کو لکھے گئے 55 خطوط کتابی صورت میں لانے کے کام کا آغاز کیا۔ جون بھائی چاہتے تھے کہ وہ خط شایع ہو جائیں جو انھوں نے 1963ء سے 1970ء کے دوران زاہدہ حنا کو لکھے۔ لیکن وہ خط اتنی بوسیدہ حالت میں تھے کہ پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہ ہر صورت اُنھیں پڑھ کر ایک رجسٹر پر تاریخ وار ترتیب دیا۔ وہ حیران ہو کر کہتے تھے۔ ''ابے تُو جن ہے یا بھوت، مجھ سے اپنی تحریر نہیں پڑھی جا رہی، تُو نے یہ سب کیسے پڑھ لیے۔''

اس کتاب کا نام جون بھائی نے ''تمھارے نام'' رکھا۔ تمھارے نام، اُن کی ایک نظم ہے جو انھوں نے علیحدگی کی رات لکھی۔ وہ اس نظم سے کتاب کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد خطوط تاریخ وار آنے تھے۔

اُن خطوں میں بعض جگہوں پر انھوں نے Foot notes بھی لکھوائے تھے اور کچھ دیباچے کا متن۔ اُن کے خیال میں ٹائٹل پر اُس پوسٹ کارڈ کی تصویر ہو جو انھوں نے زاہدہ حنا کو پہلی بار پوسٹ کیا اور اُسے منہدی لگے ہاتھوں نے تھاما ہو۔

اُن کی خواہش کے مطابق میں نے ایسا ہی کیا۔ اپنی بھانجی کے ہاتھوں پر منہدی لگوا کر اُن کی تصویر کشی کی۔ جون بھائی بہت خوش ہوئے اور اُس کا ٹائٹل بنانے کے لیے کہا۔ کتاب کمپوز ہو گئی، ٹائٹل تیار ہو گیا تو جون بھائی اس جہاں سے چلے گئے اور کتاب

ذاتی خطوط ہونے کی بنا پر شایع نہ ہو سکی۔

وہ اپنے روزمرہ کے معمولات سے بھی اُکتائے ہوئے رہتے۔ کبھی کہتے۔ ''میرے اکاؤنٹ میں 56 لاکھ محفوظ ہیں، کیوں نہ ایک فلیٹ خرید لیا جائے۔ 10 لاکھ تک کا فلیٹ تو آ جائے گا۔ پھر وہاں ایک لڑکی اپنی سیکریٹری رکھ لوں گا جو خوش شکل ہونی چاہیے کہ اُسے دیکھ کر شعر بھی ہو سکیں۔ میں تیار ہو کر اُس کے پاس بیٹھ کر اُس سے اپنے علمی و ادبی کام کروایا کروں گا۔''

میں ہمیشہ انھیں ایسے کاموں سے باز رہنے کا کہتا۔ حالاں کہ جانتا تھا کہ یہ صرف اُن کی باتیں ہیں۔ پھر بھی اُن سے کہتا۔ ''جون بھائی شہر کے حالات دیکھیں۔ آپ کا کہیں اکیلے رہنا کسی طور مناسب نہیں۔ یہاں آپ فیملی کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا سہارا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہاں آپ کو ہر طرح کی سہولت ہے۔ لوگوں کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں۔ گھر والے آپ کا کیسا خیال رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں آپ تو امریکا میں رہ رہے ہیں۔ اتنی آزادی تو وہاں رہنے والوں کو بھی میسر نہیں۔''

یہ سُن کر وہ میرا منھ تکنے لگے۔

ایک دفعہ کہنے لگے۔ ''آدمی کو 40 سال کے بعد خودکشی کر لینا چاہیے۔''

میں نے وجہ جاننا چاہی تو کہنے لگے۔ ''40 سال کے بعد دنیا کی قلعی کھل جاتی ہے۔ جو چیزیں بہت خوش نما نظر آ رہی ہوتی ہیں اُن کی اصلیت ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے اور آپ اُکتاہٹ اور بیزاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر طرح طرح کی بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ اِس سے بہتر ہے، آدمی خود ہی اپنا فیصلہ کر لے۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے خودکشی کیوں نہیں کی؟''

فرمایا۔ ''کوشش کی تھی مگر مجھے منطق نے بچا لیا۔''

پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

کہنے لگے۔ ''منطق کے مطابق مرنے کے بعد کچھ نہیں ہے۔ جب کچھ ہے ہی نہیں تو یہ جو کچھ ہے، اسی پر گزارا کر لو۔''

پھر کہا۔ ''ایک دفعہ مشاعرے میں حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ ہوٹل میں قیام تھا۔

کمرا چوتھی منزل پر تھا۔ رات زیادہ پی لی تھی اُوپر سے ایک دوست نے بھری ہوئی سگریٹ بھی تھما دی۔ کمرے میں جا کر لیٹا تو کچھ دیر بعد ایسا لگا کہ کوئی کہہ رہا ہے'' سامنے والی کھڑکی سے کود جا'' میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا اور کھڑکی بند کر دی۔ پھر جا کر لیٹا تو آواز آئی ''کھڑکی کھول اور نیچے کود جا'' میں بری طرح ڈر گیا اور جا کر باتھ روم میں اپنے آپ کو بند کر لیا۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ پھر آواز آئی۔ ''دروازہ کھول، کھڑکی کے پاس جا، کھڑکی کھول اور نیچے کود جا۔''

بس یہ سننا تھا کہ میں بھاگ کر کمرے سے باہر نکلا اور اپنے ساتھ آئے دوست کے کمرے میں گھس گیا۔ اس طرح میری جان بچی۔''

ایک بار جون بھائی کے ساتھ اُن کے بچپن کے دوست قمر رضی صاحب کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اُن کے گھر پہنچے تو مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ ملازم نے بتایا کہ'' صاحب نماز ادا کر رہے ہیں۔'' جون بھائی اندر چلے گئے اور قمر رضی صاحب کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے رہے، میں اُن کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کہنے لگے۔

''دیکھ اب یہ ٹھنڈی جگہ پر جانے کی دعا مانگے گا۔''

میں مسکرایا تو آگے فرمایا۔

''بیٹا دو جگہیں تو ہیں۔۔ ایک تھوڑی ٹھنڈی ہے۔۔ دوسری تھوڑی گرم۔۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ ہمیں گرم جگہ پر بھیج دیں گے۔ ہم گرم جگہ پر رہ لیں گے۔''

جون بھائی کے چاہنے والوں نے ایک ادبی تنظیم بنائی۔ جس کا نام غالباً جون بھائی نے 'دائرۂ خیال' رکھا تھا۔ اُس تنظیم کے زیرِ انتظام علامہ علی کرار نقوی صاحب کے گھر پہ ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ شہر کے مقامی شعرا نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور اپنا کلام سنایا۔ آخر میں جون بھائی نے اپنا کلام پیش کیا۔ اُس کے بعد کھانے کا دَور چلا۔ میں بھی اُس مشاعرے میں شریک تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب محسوس ہوا۔ اگلے دن میں جون بھائی کے پاس گیا تو اُن سے برملا اظہار کر دیا کہ'' مجھے اس طرح آپ کا اپنے گھر پر مشاعرہ رکھوانا اور پھر اپنا کلام سنا کر لوگوں کو کھانا کھلانا بالکل اچھا نہیں لگا۔ کیا اب جون ایلیا اپنا کلام اس طرح لوگوں کو اپنے گھر بلا کر سنایا کریں گے؟''

جون بھائی سنجیدگی سے میری بات سنتے رہے پھر میری طرف دیکھا اور گویا ہوئے۔ ''تُو کیا سمجھتا ہے میں یہ بات نہیں سمجھتا۔ مجھے خود یہ سب اچھا نہیں لگا۔ بس کچھ لوگوں کی بات رکھنا ہوتی ہے۔ تُو بے فکر ہو جا، آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ امام۔۔۔خود اپنے ہی نام کی نیاز دے رہے ہوں۔''

ممتاز مجسمہ ساز اور آرٹسٹ بھائی انجم ایاز نے اپنے گھر امروہوی سموسوں کی دعوت رکھی۔ انجم ایاز، جون بھائی کے رشتے دار بھی ہیں۔ میں جون بھائی کو لے کر اُن کے گھر گیا۔ جون بھائی بہت خوش دکھائی دیے کہ آج جی بھر کے امروہے کی باتیں ہوں گی۔ ساتھ ہی وہاں کی سوغات، وہاں کے سموسے۔ مجھے ہدایت کی تھی کہ مووی کیمرا ساتھ لانا کہ اس موقع کی مووی بننا چاہیے۔ اُن کی ہدایات کے مطابق میں اُن لمحوں کی مووی بناتا اور باتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس محفل میں انجم ایاز کے بڑے بھائی اقبال نظر اور والد نظر امروہوی بھی موجود تھے۔ جون بھائی نے امروہے کی تاریخ پر سیر حاصل گفت گو کی۔ جو فلم بند بھی ہوئی۔ اس کے بعد امروہے کے سموسے مختلف چٹنیوں کے ساتھ تناول کیے گئے۔ جون بھائی نے جنھیں بھوک نہ لگنے کی شکایت رہتی تھی، اُس دن ڈٹ کر کھایا بل کہ کھا کھا کر نڈھال ہو گئے۔ پھر ارشاد فرمایا۔

''آج یہ بات تو غلط ثابت ہو گئی کہ مجھے بھوک نہیں لگتی۔ بھوک تو مجھے لگتی ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ کھانا میرے مطلب کا ہو۔ جانی! تُو گواہ رہیو۔ آج تیرے جون بھائی نے 40 سموسے کھائے ہیں۔'' اُس کے بعد جون بھائی کو دو آدمیوں نے سہارا دے کر بڑی مشکل سے گاڑی تک پہنچایا اور میں انھیں گھر تک چھوڑ کر آیا۔

جون بھائی کوئی نیا معاشقہ چلانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے اور اکثر اِس بات کی شکایت بھی کرتے کہ ''ہم سے کوئی لونڈیا عشق نہیں کرتی۔ تم لوگ مجھ سے نئی غزل مانگتے ہو۔ ارے بھائی نئی غزل کس پر کہوں؟ اِس میز یا کرسی پر کہوں؟ کہیں سے لڑکی لاؤ جو تمھارے بھائی کو کوئی آس دے، کوئی زخم دے تا کہ وہ اُس پر شاعری کرے۔''

ایسے ہی دنوں میں ایک دن انھوں نے بتایا۔ ''ایک بہت خوب صورت لڑکی تیرے بھائی کی مدّاح ہے، شاعری کی دل دادہ، خود بھی شاعری کرتی ہے اور ٹی وی پر کسی

پروگرام کی میزبان ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اس سے معاملہ آگے کیسے بڑھایا جائے۔''
میں نے پوچھا۔''اُس نے خود بھی کوئی اشارہ دیا کہ معاملہ آگے بڑھے۔''
کہنے لگے۔''کہتی ہے، کسی دن آپ کو صبح سے اپنے گھر لے جاؤں گی اور رات کو خود چھوڑ کر جاؤں گی۔''
میں نے کہا۔''یہ تو آپ سے عقیدت کا اظہار ہے۔''
فرمایا۔''ہاں! یہی تو بات ہے۔ پر کچھ سوچتا ہوں۔''
اگلے دن ملاقات ہوئی تو فرمایا۔''تیرے بھائی نے منصوبہ بنالیا ہے۔''
میں نے کریدا۔''بھلا وہ کیا؟''

بڑے جوش سے بولے۔''سوچا ہے، لڑکی بن کر ایک غزل کہی جائے۔ جاذبِ غزل اور اتوار کے جنگ اخبار میں اُس لڑکی کے نام سے شائع کرا دی جائے۔ صبح جب وہ بیدار ہوگی تو اخبار میں اپنے نام سے چھپی غزل دیکھ کر حیران ہو جائے گی۔ پھر اُس کے پاس لوگوں کے فون بھی آئیں گے کہ کیا خوب غزل کہی ہے۔ پھر وہ سوچے گی کہ یہ سب کس نے کیا ہے۔ اِس طرح اُسے پہلا خیال جو آئے گا، وہ میرا ہوگا۔ پھر وہ مجھے فون کرے گی۔ اس طرح یہ معاملہ آگے بڑھے گا۔''

یہ سب سُن کر میں مسکرایا اور کہا۔''منصوبہ تو کمال کا ہے۔ بس اب غزل کہنا شروع کریں۔'' اس طرح وہ غزل کہی گئی۔ جسے پچاسیوں دفعہ میں نے لکھا۔ ایک ایک شعر کئی کئی بار سنوارا گیا۔ غزل کا مطلع یہاں لکھے دیتا ہوں کہ اندازہ ہو کہ کیا قاتل غزل ہوگی۔ اُس کی خاص بات اُس کا لڑکی کا انداز ہے لیکن مطلع میں جون اور لڑکی دونوں موجود ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔

مجھ سے میری زندگی اکتا گئی
تم غزالہ آگئیں، میں آگئی

غزل مکمل ہونے کے بعد کئی لوگوں کو سُنا کر اُن سے رائے طلب کی گئی اور اُسے ایک لفافے میں بند کر کے ایک ہرکارے کو جنگ اخبار روانہ کیا گیا کہ وہاں اختر سعیدی صاحب کے حوالے کرے کہ وہ غزل کو اگلے اتوار کے اخبار میں ادبی صفحے پر نمایاں شائع کریں۔

لیکن قسمت کو شاید یہ منظور نہ تھا۔ شام میں وہ صاحب جنھیں اس مشن پر روانہ کیا گیا تھا، واپس آئے تو انھوں نے الگ داستان سنائی کہ جب وہ جنگ اخبار پہنچے تو معلوم ہوا کہ اختر سعیدی آج نہیں آئے ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ 'سب رنگ ڈائجسٹ' کا دفتر پاس ہی ہے، وہاں کچھ دیر بیٹھ کر سستا لیا جائے۔ وہاں جون صاحب کے ایک مداح پہلے سے تشریف فرما تھے۔ انھوں نے معلوم کیا کہ کیسے آنا ہوا؟ تو اُن صاحب نے جون صاحب کا منصوبہ انھیں سنا دیا۔ یہ سُن کر انھوں نے کہا غزل دکھاؤ۔ جب غزل دکھائی تو کہنے لگے ''یہ تو میں شایع نہیں ہونے دوں گا، کیا جون صاحب اب یہ حرکتیں کریں گے۔'' اور یہ کہہ کر غزل اپنے پاس رکھ لی۔

بس یہ سُننا تھا کہ جون صاحب کا دماغ گھوم گیا۔ بپھرتے ہوئے کہا۔ ''اب وہ مجھے بتائے گا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ میرا غلام۔ فون ملا اُسے۔''

میں نے فون مِلایا تو فون پر جو منھ میں آیا اُسے سنانے لگے۔ لیکن بے سود۔ یہ منصوبہ پھر کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن وہ یادگار غزل میرے پاس موجود ہے اور اگلے مجموعے 'کیوں' کا حصہ ہوگی۔

جون ایلیا کو ملحد، لامذہب قرار دینا انھیں ایک محدود دائرے کی سوچ کا شخص قرار دینا ہے۔ وہ ایک بڑے کینوس پر سوچنے والا ذہن تھے۔ اُن سے میری جب بھی خدا، مذہب اور کائنات پر گفت گو ہوئی، انھیں بہت مختلف اور الحاد سے دُور متشکک شخص پایا۔ ایک دن کہنے لگے۔ ''مجھے یہ بتا کہ تُو ایک جنگل میں سے گزر رہا ہے۔ جس کے بارے میں تجھے یہ بتایا گیا ہو کہ اِس سے پہلے یہاں کسی اور انسان کا گزر نہیں ہوا ہے۔ آگے چل کر اگر تجھے زمین پر ایک راڈو گھڑی چلتی ہوئی حالت میں ملے تو اُسے دیکھ کر تجھے پہلا خیال کیا آئے گا؟''

میں نے کہا۔ ''یہی کہ یہاں مجھ سے پہلے کوئی اور انسان بھی آیا ہے۔''

یہ سُن کر مسکرائے اور بولے۔ ''بالکل یہی بات میں تجھے سمجھانا چاہ رہا تھا۔ جتنے دلائل خدا کے رَد کرنے کے ہیں اُتنے ہی اُس کے موجود ہونے کے بھی ہیں۔ خدا کو رَد کرنا اتنا آسان نہیں۔''

کہتے تھے۔ ''ہمارا ذہن اور آنکھیں ہمارے بس میں نہیں ہیں۔ ہم وہی سوچتے اور دیکھتے ہیں جو ہمیں سوچنے اور دیکھنے پر مجبور کیا جائے۔ اب عمران خان ہی کو لے لے۔ میں اسے کیوں جانتا ہوں؟ میں تو کرکٹ نہیں دیکھتا، مجھے تو اس کا نام بھی نہیں معلوم ہونا چاہیے تھا۔ لڑکیاں اُس پر کیوں مرتی ہیں، انھیں تو کرکٹ کی الف بے کا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح ہمیں جو خوب صورت دِکھتا ہے، وہ کسی اور کے لیے ویسا خوش نما نہیں ہوتا۔ اگر ہم ایک دوسرے کو اصل حالت میں دیکھ لیں تو یقین کر، ہم سب ڈر جائیں۔''

وفات سے کچھ دن قبل جون بھائی پر رقت نے ڈیرا جمالیا تھا۔ بات بات پر رو دیتے۔ ہر وقت اپنے بابا، اماں، بھائیوں اور بہن کو یاد کرتے رہتے، امروہے واپس جانے کی ضد کرتے۔ کہتے کہ وہ اب وہیں جا کر اپنی بہن کے پاس رہیں گے۔ شام کا وقت انھیں چپ کراتے، سمجھاتے گزر جاتا۔ ایک رات میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ ٹی وی لاؤنج سے جنون گروپ کے مشہور گیت 'سیونی' کی آواز آئی۔۔۔ ''کیا بشر کی بساط۔۔۔ آج ہے، کل نہیں۔۔۔۔''

یہ سننا تھا کہ جون بھائی گنگنانے لگے۔ ''آج ہے، کل نہیں۔۔۔ واہ، یہ کس نے لکھا ہے، ذرا معلوم تو کر۔''

میں نے کہا۔ ''صابر ظفر کا کلام ہے۔''

کہنے لگے۔ ''اُسے فون ملا کر میری بات کرا۔''

میں نے فون ملا کر ریسیور انھیں تھما دیا۔

صابر بھائی سے فون پر کہنے لگے۔ ''کل تمھیں یہاں میرے پاس آنا ہے۔ کل میں تمھارا کلام سنوں گا۔''

اگلے دن صابر بھائی تشریف لے آئے۔ عجیب سماں تھا۔ جون بھائی رات گئے تک ان سے غزلیں، گیت سنتے رہے۔ روتے رہے، سر دھنتے رہے۔ انھیں داد دیتے رہے اور کہتے جاتے تھے کہ ''بس آج تجھے سنوں گا۔ کیا شعر کہا ہے تُو نے۔۔۔ کیا بشر کی بساط۔۔۔ آج ہے، کل نہیں۔۔۔۔ واہ وا۔۔۔ وا۔۔۔۔ وا''

یہ سلسلہ غالباً رات ایک بجے تک جاری رہا۔ صابر بھائی بہت مشکل سے اجازت

لے کر وہاں سے روانہ ہوئے۔
رمضان کا آغاز تھا۔ دوسرا روزہ، جمعے کا دن۔ سارا دن مصروف بھی گزرا اور مضمحل بھی۔ افطار کے بعد میں جون صاحب سے ملنے پہنچا تو دیکھا کہ علامہ صاحب ڈرائنگ روم میں قرآن کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ میں نے سلام کر کے جون بھائی کے بارے میں دریافت کیا تو کہنے لگے۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے یہیں بیٹھے پپیتا کھا رہے تھے، اپنے کمرے میں ہوں گے۔"

میں کمرے کی جانب بڑھا تو دیکھا وہاں اندھیرا ہے۔ اندر داخل ہو کر آواز دی۔ "جون بھائی" کوئی جواب نہ ملا۔ پھر آواز لگاتا ہوا اندازے سے اُن کے بستر کی جانب بڑھا تو دیکھا وہ بستر پر لیٹے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "جون بھائی کیسی طبیعت ہے؟" جواب میں دُور سے آئی۔۔۔ "خرخر" کی آواز سنائی دی۔ کان قریب لے جا کر سنا تو بہت آہستہ سے کہہ رہے تھے۔ "طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے پوچھا "لائٹ جلا دوں" آواز آئی "نہیں"۔ میں نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے میں کل آؤں گا۔" یہ کہہ کر واپس ڈرائنگ روم کی طرف پلٹا۔ علامہ صاحب ابھی تک تلاوت میں مشغول تھے۔ میں نے اُن کے قریب جا کر کہا۔ "مجھے اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ انھیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں۔" کہنے لگے۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن وہ ڈاکٹر محسن کے سوا کسی کو دکھاتے نہیں ہیں اور ابھی عشا اور تراویح کا وقت ہے۔ پھر بھی معلوم کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے ڈاکٹر کو فون کیا اور وہی ہوا، ڈاکٹر صاحب تراویح کے لیے جا چکے تھے۔ میں نے کہا۔ "کسی اور کو دکھائیں، ایسی حالت میں نے پہلے نہیں دیکھی۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" کہنے لگے۔ "ٹھیک ہے، ابھی تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔ آپ کی ضرورت ہوئی تو آپ کو گھر سے لے لوں گا۔" یہ سُن کر میں گھر آ گیا۔ ایک گھنٹے بعد باہر بیل بجی۔ میں گیٹ پر گیا تو علامہ صاحب کا بیٹا زین کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "خالد بھائی! دادا کا انتقال ہو گیا، ابھی ابھی اسپتال لے کر گئے تھے راستے ہی میں۔۔۔"

آگے کچھ سنائی نہ دیا۔۔۔ میں، زین کے ساتھ اُن کے گھر روانہ ہو گیا۔ گھر جاتے ہی جون بھائی کی ذاتی ڈائری سے اُن کے جاننے والے لوگوں کے فون نمبر دیکھ کر

اطلاع دینا شروع کی۔ اُس وقت میری نگاہ ایک شعر پر پڑی۔ جو اِس موقع پر بہت کچھ کہہ رہا تھا۔

جانے کیا واقعہ ہے ہونے کو
جی بہت چاہ رہا ہے رونے کو

میں وہ رات کبھی نہیں بھول پایا۔ اُس رات کراچی میں جیسی طوفانی ہوا چلی، میں نے اپنی زندگی میں ایسی ہوا نہیں دیکھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہوا بھی نوحہ کناں ہو، ایسی آواز جیسے روتے ہوئے کوئی کراہ رہا ہو۔ کسی اپنے کے بچھڑنے کی خبر سنا رہا ہوں۔ اُداسی کو مہمیز کرتی ہوا۔۔۔سائیں۔سائیں۔سائیں۔

اگلے روز مسجد خیر العمل، انچولی میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ ظہر کے وقت جاننے والے، رشتے دار، دوست احباب اور میڈیا والے سب موجود تھے۔ لوگ اُن سے اپنی قرابت داری اور تاثرات ریکارڈ کروا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں جنازہ اُٹھا لیا گیا اور میں گھر کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ راستے میں ایک پارک کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ نہیں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ کچھ دیر روتا رہا پر رونے سے بھلا کون واپس آتا ہے۔ دل کچھ ہلکا ہوا تو پھر گھر کی طرف چلنا شروع کیا۔ اپنے گھر کی گلی کے قریب پہنچ کر جانے کیوں میں علامہ صاحب کے گھر کی طرف مڑ گیا، اُن کے گھر کے سامنے پہنچ کر کافی دیر تک خالی نگاہوں سے اُس گھر کی جانب دیکھتا رہا جہاں آج ایک عہد تمام ہو گیا تھا۔ میرا اُستاد، میرا مربی، میرا یار جانی اب یہاں نہیں تھا۔ وہ گھر جہاں میں اب نہیں آیا کروں گا۔ کچھ دیر اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد جب واپس مڑا تو پہلی بار میری نگاہ اُس گھر کے گیٹ کے پاس لگی تختی پر پڑی۔ لکھا تھا ''C-40'' اور میں سناٹے میں آ گیا۔ جون بھائی کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ ''آج کل جمعہ بہت آ رہا ہے۔۔۔سنو! یہ سب حادثات و سانحات میرے ساتھ صرف 4 یا 8 تاریخ ہی کو کیوں پیش آتے ہیں۔'' جون بھائی نے شاید کبھی اُس گھر کا نمبر معلوم نہیں کیا ہوگا۔ آخری سانحہ۔۔۔آٹھ اور چار کا آخری وار۔

میں بھی بہت عجیب ہوں

خالد معین

''خالد تم یہاں لاہور میں کیسے، سنو میں اس وقت بہت اُداس ہوں، بہت بے کیف اور تشنہ بھی ہوں، لیکن عجیب واقعہ ہے کہ تم لاہور میں ہو اور میری طرف بھی آ نکلے۔ ایک اور عجیب بات ہے کہ جب میں اپنے لوگوں سے دُور ہوتا ہوں تو انھیں میری یاد بڑی شدت سے ستاتی ہے اور جب میں اپنے لوگوں اور اپنے شہر میں ہوتا ہوں تو میرا شہر اور میرے لوگ مجھ سے بے اعتنائی برتنے لگتے ہیں۔ سوچو جب میں نہیں رہوں گا اور ہمیشہ کے لیے کہیں چلا جاؤں گا تو تم لوگوں کا کیا حال ہوگا۔'' یہ آخری جملہ کہتے ہوئے جون ایلیا کی آواز بھرا گئی تھی اور وہ اچانک گریہ کناں ہو گئے تھے۔ خود میں بھی اُن کا یہ جملے سنتے ہوئے لرز گیا تھا کیوں کہ جون ایلیا کی دائمی جدائی کے بارے میں اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ کیوں کہ اُن کی منفرد ترین شخصیت اور عہدِ حاضر کا مقبول ترین کلام ہم سب میں اتنا رچ بس چکا تھا کہ ایسا کبھی محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی روز اچانک جدا ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی وہ اتنے زندہ اور باغ و بہار شخص تھے کہ موت اُنھیں اتنی جلدی چھو جائے، اس کا امکان نہ ہونے کے برابر لگتا تھا۔ تاہم اس لمحے اُن کی جو حالت تھی، وہ بے حالتی والی تھی اور اُس کو محسوس کر کے میں اندر ہی اندر بہت ڈر گیا تھا، حالاں کہ وہ اس جملے کے بعد کئی برس جیے اور خوب جیے اور ایسے جیے کہ دنیا بھر میں اپنی فتح کے جھنڈے بھی گاڑے، نہ صرف جینے کا بھرپور حق ادا کیا بل کہ دوسروں سے کہیں زیادہ ادا کیا۔

یہ ایک سرد اور اُداس شام تھی۔ جون ایلیا اپنے روایتی ملبوس یعنی واسکٹ، سادہ سے کرتے اور پاجامے میں نظر آئے۔ اس بار شاعرانہ طور اطوار سے سجے ہوئے نہ تھے،

مگر باقی سب کچھ وہی تھا جو اُن کی پُر کشش شخصیت کا ایک زمانے سے حصہ تھا۔ وہی لمبی لمبی پریشاں حال زلفیں، جو بنتی کم اور بکھرتی زیادہ تھیں۔ وہی کھلتی ہوئی سانولی رنگت۔ وہی درمیانہ اور نکلتا ہوا قد، وہی دبلا پتلا اور کسی قدر نحیف جسم۔ وہی سوچتی ہوئی اُداس آنکھیں، وہی ہاتھوں میں دس سگریٹوں والا پرانے کیپسٹن کا پیکٹ، جو اُن کا مخصوص برانڈ بھی رہا۔ وہی اکیلے پن کے عذاب سے نبرد آزمائی، وہی شدید بے کیفی، جو اُداسی کی حدوں سے نکل کے دشتِ وحشت کی خیال آرائی میں اُنھیں آبلہ پا رکھتی تھی۔ وہی اُن کا مخصوص لگاوٹ اور بے نیازی والا لہجہ۔ وہی فکر انگیزی میں ڈوبی خیال انگیز بڑبڑاہٹ اور اِن سب کے بیچ تخلیقی ذہانت سے سجے ہوئے چھوٹے چھوٹے سے معصومیت کے جلو میں نکھرتے ہوئے عالمانہ اور کاٹ دار جملوں کی رِم جھم اور وہی دانش وری کے چراغوں کی چمکتی ہوئی لو میں چمکتے ہوئے کچھ نئے، پرانے الجھے الجھے سوالات اور کچھ الجھے الجھے جوابات۔

کراچی کے برخلاف لاہور میں نومبر کے مہینے کی آخری راتیں کراچی کی نسبت بہت زیادہ خنکی اوڑھ لیتی ہیں۔ میں کچھ دنوں سے لاہور میں تھا اور یہاں ذاتی وقت گزاری کے علاوہ لاہور کے ادبی دوستوں سے ملاقاتوں کے سلسلے بھی جاری تھے۔ اُدھر کراچی سے یہ خبر ملتے ہی کہ جون ایلیا بھی اِن دنوں لاہور آئے ہوئے، میں اُن سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا، حالاں کہ کراچی میں رہتے ہوئے اب ہفتوں اور بعض اوقات مہینوں ہو جاتے تھے اور جون ایلیا سے ذاتی ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی۔ البتہ جون ایلیا سے ملنے، اُن کی عالمانہ باتیں سننے، اُن کے سہل، پیچیدہ، گہرے اور زندگی کی گرہیں کھولتے شعر سننے اور ایک سطح پر اپنے پسندیدہ ترین باغی شاعر جو عربی، فارسی، عبرانی اور انگریزی زبانوں کے ماہر تھے۔ جنھیں تاریخ، منطق، فلسفے، اعلیٰ ترین کلاسیکی اور جدید شعر و ادب کے گہرے مطالعے اور اس مطالعے کی قابلِ تحسین روشنی میں جھلملاتے ہوئے رہنے کی عادت تھی، جو بلا کے نکتہ سنج تھے، جو غضب کے حاضر جواب اور نکتہ طراز تھے، جو ہمہ وقت محفلِ یاراں کے تمنائی تھے، انھی نام ور اور ناقابلِ فراموش سیّد شفیق حسن ایلیا کے صاحب زادے سیّد اصغر جون المعروف جون ایلیا کے ساتھ وقت گزاری کی تخلیقی سعادت یقیناً اپنے اندر بلا کی کشش رکھتی تھی، اُن کی قربت علم و ادب کے بیش بہا خزانوں سے کم نہ تھی۔

جون ایلیا جنھیں ہمارے دوستوں کے خاص حلقے میں بھائی جون، امروہے کے روز مرہ اور کراچی کے روز مرہ میں جون بھائی کہا جاتا تھا۔ وہ بلا کے پُر ماجرا، پُر واقعہ، پُر جمال، جاذب نظر، خوش اطوار اور بعض حالتوں میں انتہائی بد دماغ، مغرور، بد لحاظ، سفاک اور انتقام پرور ہونے کے باوجود وہ دوستوں اور دشمنوں کے لیے ایک بھرپور افسانوی اور ایک ایسی مقناطیسی کشش رکھنے والی حیران کُن شخصیت کے مالک تھے، جو جب اور جہاں سے گزر جاتے، عام لوگ اُنھیں پلٹ پلٹ کے دیکھتے۔ وہ اپنے مخصوص شاعرانہ حلیے، لمبے لمبے بالوں اور کرتے پاجامے کے ساتھ ایک نوع کی تخلیقی خود کلامی، کاٹ دار جملوں اور بے ساختہ بڑبڑاہٹ کے ساتھ پورے منظر پر چھا جانے کی غیر معمولی قوت رکھتے تھے۔

ویسے اس ضمن میں دو تین ہی ایسے معروف شاعر میرے تجربے میں آئے جن کی عوامی فین فالوئنگ کا شمار کسی بھی مشہور شخصیت کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، ان میں حمایت علی شاعر، جون ایلیا اور عبید اللہ علیم سرِ فہرست ہیں۔ یہ مناظر طارق روڈ کے ہیں، جہاں جون بھائی ہمارے اُس خاص حلقۂ یاراں سے ملنے کبھی کبھی چلے آتے، جو یہاں کئی برس سے ڈیرا ڈالے ہوئے ہے اور جب وہ کیفے ایرانیان کی سگریٹوں سے بھری فضا سے باہر نکل کے کھلی ہوا میں فٹ پاتھ پر اپنا ڈیرا جماتے تو ہر آنے جانے والا ایک لمحے کو رک سا جاتا اور ہر آنے جانے والی آنکھ اُنھیں شش در ہو کر دیکھتی اور یوں بہت دیر تک پلٹ پلٹ کے جون بھائی کا دیدار کیا جاتا، جیسے وہ کسی دوسرے سیارے سے آئے ہوں۔ خیال رہے کہ یہ وہ طارق روڈ نہ تھا جو ہمیں اب نظر آتا ہے اور جو شدید بھیڑ چال کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ زمانہ 90ء کی دہائی کا تھا اور اُن دنوں مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس نے ابھی یہاں ہلہ نہ بولا تھا۔ یہاں آنے والی صرف اور صرف اَپر کلاس تھی، یعنی اُن دنوں یہاں کراچی کے منتخب ترین حسن کی جلوہ آرائیاں اور حسن کی بے نیازیاں عام تھیں۔ تاہم جون بھائی، جو بڑے جہاں دیدہ بھی تھے، ایک کمالِ بے نیازی کے ساتھ ہم لوگوں سے محوِ گفت گو رہتے اور کبھی کبھی اچانک ہی اپنے جوتے بغل میں داب کے ننگے پاؤں طارق روڈ کی فٹ پاتھوں پر چہل قدمی شروع کر دیتے، یہ اُن کے فقیرانہ موڈ کی عکاسی ہوتی یا وہ خود ملامتی کی کسی کیفیت سے گزر رہے ہوتے۔ دوسری جانب یہ منظر آس پاس کے لوگوں کے لیے مزید دلچسپی کا

سامان فراہم کرتا تھا۔ اُنھیں ہمیشہ عوام اور خواص کی توجہ، چاہت اور دل داری کے بےلوث تحفے ملے، کچھ اتنے کہ وہ اس کے شدید عادی بھی ہو گئے تھے اور اس چاہت کی مزید طلب نے اُنھیں جانے کیا کیا تماشے دکھانے پر اُکسایا۔ پھر اُنھیں یوں بھی اپنے نت نئے عشاق پیدا کرنے، نت نئے مداحوں سے ملنے، نت نئے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور اُنھیں اپنے خاص حلقۂ ارادت میں قید رکھنے کے سارے گُر اور ساری ترکیبیں اَز بر تھیں۔

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں نکل گئی۔ آیئے! ایک بار پھر لاہور کی جانب لوٹتے ہیں۔ اُسی اُداس منظر کی طرف، جہاں سے گفت گو کا آغاز کیا گیا تھا۔ جون بھائی کے لاہور میں موجود ہونے کی خبر ملتے ہی میں خاصا پُر جوش ہو جاتا ہوں اور موقع ملتے ہی، لاہور میں اپنے خاص دوست اور ہنگامہ پرور افسانہ نگار جاوید آفتاب کی ہم راہی میں، جو ان دنوں ترقی پسند مصنفین کی ایک باغی شاخ 'پادا' کے مرکزی صدر بھی ہیں، جون بھائی کے قریبی عزیز ممتاز اداکار منور سعید کے گھر کا رُخ کرتا ہوں۔ ہمیں منور سعید کا گھر تھوڑی سی تگ و دو کے بعد مل جاتا ہے اور کچھ ہی دیر میں ہم دونوں جون بھائی کے سامنے ہوتے ہیں۔ جون بھائی اُس وقت کسی اضافی کیفیت میں نہیں ہیں، اِس لیے خاصے بے کیف سے لگ رہے ہیں۔ مجھ سے مل کے اُن کے چہرے پر تھوڑی سی بشاشت ضرور جھلکی ہے، تاہم یہ محسوس کرتے ہی کہ ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں، وہ تھوڑے بجھ سے گئے ہیں اور اُن کی تشنگی پہلے سے سوا ہو گئی ہے۔ میں جون بھائی کی دل داری کرتے ہوئے اُنھیں یقین دلاتا ہوں کہ کل تک کوئی نہ کوئی ایسا انتظام ہو جائے گا کہ وہ اس تشنگی کے کرب سے باہر نکل سکیں گے۔ جون بھائی دراصل انرجی ڈرنک کے عادی تھے اور بعض اُلجھے ہوئے ذاتی حالات کے سبب اس انرجی ڈرنک کے بغیر اُن کا روایتی موڈ بحال نہیں ہوتا تھا۔ اُنھیں ہر شام اور ہر شب انرجی ڈرنک کی شدید طلب رہتی تھی، جسے آہستہ آہستہ پیتے ہوئے، وہ اندر باہر سے بحال ہونے لگتے تھے اور پھر 'مے سے غرضِ نشاط' کی جھلکیاں بھی اُن کے اُداسی اور بے کیفی کے حصار سے باہر جھلکنے لگتی تھیں۔ وہ ایسے عالم میں لطیفہ گوئی کرتے، رنگ کھیلتے، قریبی رفقا سے انتہائی بے تکلف ہو جاتے، یاریاں اور دل داریاں نبھاتے، ذاتی لمحات گزارتے، تازہ شعر سناتے، پرانی غزلوں کی فرمائشیں پوری کرتے، علم و حکمت کے نادر موتی رولتے۔

اس عالم میں اگر وہ مشاعروں میں ہوتے تو چھوٹے بڑے مجمعے کو اپنی برجستہ اور تخلیقی گفت گو میں بہا کر لے جاتے، اُن کی ٹائمنگ چاہے شعر ہو یا مکالمہ ہو دونوں میں لاجواب تھی۔ وہ شعر پڑھنے کا سب سے جداگانہ طور رکھتے تھے، ناقدینِ جون کا خیال ہے کہ شعر کم پڑھتے تھے پرفارم زیادہ کرتے تھے۔ درحقیقت اُن کے شعر پڑھنے کا انداز بڑے غضب کا تھا، اس دوران اُن کی مخصوص بڑبڑاہٹ اور اُن کے چبھتے ہوئے معصومانہ فقرے ادا کرنا، اپنے قریبی دوستوں کو بے تکلفی سے پکارنا، بالوں کو مخصوص انداز میں جھٹکنا اور تحت اللفظ میں جادوئی اثر پیدا کرتے ہوئے مشاعرہ لوٹ لینا، اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جون بھائی اپنے انرجی ڈرنک کے ساتھ مشاعرہ تو کیا چاند کو بھی فتح کرنے کا گُر رکھتے تھے اور اُن کی شان دار مشاعرہ پڑھت کے مقابل دو چار شعرا ہی ٹھیر سکتے تھے، جیسے احمد فراز، منیر نیازی اور ایک دو ایسے گانے والے جنھیں مشاعرہ اُلٹنے کا فن آتا ہو، البتہ جون بھائی کی موجودگی میں ان شعرا کو بھی بار بار پہلو بدلتے ضرور دیکھا گیا کہ وہ جون ایلیا تھے۔ البتہ انرجی ڈرنک کے بغیر جون بھائی ایسے ہو جاتے تھے جیسے وہ جون ایلیا ہی نہ ہوں۔ ایسے عالم میں وہ بڑی بے دلی سے مشاعرہ بھگتاتے تھے۔ جون بھائی کے فقرے بڑے کمال کے ہوتے تھے اور ان کے فقروں میں تخلیقی حسن بھی ہوتا تھا۔ ایک دن وہ انیق احمد پر زیادہ مہربان تھے۔ اُس دن اُنھوں نے بڑے جذباتی انداز میں جون بھائی کا کوئی شعر پڑھا، شعر تو بڑا اچھا تھا لیکن وہ ایک مصرعے میں جھول دے گئے، اس پر جون بھائی کی حسِ لطافت جاگ اُٹھی، جو ایسے ہر موقع پر جاگ ہی اُٹھتی تھی۔ اُنھوں نے بڑے پیار سے کہا۔ ''انیق تم اتنے دنوں سے میرے ساتھ ہو، یقین کرو، اتنے دن اگر کوئی بکری بھی میرے حجرے کے باہر بندھی ہوتی تو وہ بھی بے بحر کبھی نہ پڑھتی۔'' اسی طرح ایک بار زاہدہ حنا صاحبہ ملک سے باہر گئی ہوئی تھیں اور اُنھیں ایک دن بعد لوٹنا تھا۔ جون بھائی نے اپنے تینوں بچوں کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا آج کیا تاریخ ہے؟ بچوں نے بتایا آج 27 تاریخ ہے۔ جون بھائی نے برجستہ انداز میں بچوں سے کہا۔ ''اچھا بچو! اب میرے ساتھ مل کے دعا مانگو 28 تاریخ نہ کل آئے اور نہ اس کے بعد آئے۔'' بچے ہنسنے لگے اور سمجھ گئے کہ جون بھائی اپنی بیگم کے نہ لوٹنے کی معصومانہ دعا کر رہے ہیں، جو ظاہر ہے ایک لطیف سا مذاق ہی تھا۔ اب بات چل نکلی

ہے تو اس ضمن میں ایک دو اور واقعے بھی یقیناً یہاں لطف فراہم کریں گے۔ کراچی کے ایک معروف ناقد اور شاعر ہیں، جو قدرے مشکل پسند بھی واقع ہوئے ہیں۔ جون بھائی اُنھیں، اُن کی مہمل پسندی کے باعث ادب کا نواز شریف کہتے تھے۔ ایک دن برسرِ محفل اُن صاحب کی نثر پر رواں ہو گئے اور اُن کی نثری کاوشوں کی کچھ ایسی تعریف کی کہ وہ صاحب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جون بھائی نے اُن سے کہا۔ "میں نے کل رات آپ کی ایک کتاب دیکھی، کیا اعلیٰ نثر تھی، میں ساری رات ایک ٹانگ پر ناچتا رہا۔" اب کیا تھا وہ صاحب لوگوں سے جون بھائی کی اس تعریف کا تذکرہ کرتے رہے جب کہ دوسری طرف جون بھائی حسبِ عادت کئی دنوں تک اپنے خاص دوستوں کے درمیان اُن صاحب پر طنز کے تیر چلاتے رہے۔ اچھا! یہ نواز شریف والی بات کا بھی ایک پس منظر ہے، جون بھائی کمیونسٹ نظریات رکھنے والے ترقی پسند تھے اور اس حوالے سے وہ بہت سے سیاسی لیڈروں کو رجعت پسند تصور کرتے تھے، حالاں کہ ملکی سیاست سے اُنھیں دُور کا واسطہ نہ تھا۔ ایک دن وہ بہت دیر اس بات پر گریہ کرتے رہے کہ لعنت ہو مجھ پر، مجھے پاکستان کے چند حالیہ سیاست دانوں کے نام یاد ہیں اور کسی شریف آدمی کے لیے یہ کتنی بدتہذیبی اور شرم کی بات ہے۔ اصل میں وہ ایک سطح پر بڑے انقلابی اور باغی بھی تھے اور ہمارے ہاں سیاست میں جو لوٹ مار کی تاریخ ہے، اُس سے وہ بڑے بدظن بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی نجی نشستوں اور ایک حوالے سے انقلابی نظموں میں اہلِ سیاست پر کھل کے طنز کیے اور اُنھیں کھل کے للکارا بھی۔

جو بھی ہو تم پہ معترض اُس کو یہی جواب دو
آپ بہت شریف ہیں، آپ نے کیا نہیں کیا
نسبتِ علم ہے بہت حاکمِ وقت کو عزیز
اُس نے تو کارِ جہل بھی بے علما نہیں کیا

اسی طرح اسّی کی دہائی کے ایک نمایاں شاعر، جن کا غالباً دوسرا شعری مجموعہ شائع ہوا تھا، یار لوگوں سے بڑھکیں مارتے رہے کہ جون بھائی میرا مجموعہ پڑھتے ہی بے قرار ہو گئے اور رکشے میں بیٹھ کر میرے گھر چلے آئے اور مجھ سے میری کتاب کی خوب تعریفیں

کرتے رہے لیکن اس ملاقات میں کوئی تیسرا فرد موجود نہ تھا۔ یار لوگ اس پر سخت حیران ہوئے اور معاملہ کیوں کہ جون ایلیا کا تھا، اس لیے جلد ہی اُن تک یہ دروغ گوئی کی داستان پہنچ گئی۔ وہ بڑے جُز بُز ہوئے اور اُنھوں نے اپنے انتقامی خانے میں یہ بات رکھ لی۔ پھر کچھ ماہ بعد، جب ایک مشاعرے میں جون بھائی انر جی ڈرنک کی شدید لہر میں تھے، شومئی قسمت وہ معصوم شاعر چند نوجوان شعرا کی موجودگی میں اُنھیں آداب کہنے پہنچ گیا۔ بس پھر کیا تھا، جون بھائی تو پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے اُسے ایک تھپڑ رسید کیا اور با آوازِ بلند کہا۔ ''جاہل ابھی تُو زیرِ غور ہے۔'' جون بھائی جہاں بڑے سنجیدہ، بردبار، سمجھ دار، اپنے آپ میں گم صم اور دنیاوی معاملات سے دُور رہتے تھے، وہیں وہ بڑے ہنگامہ جُو اور ہنگامہ آرا بھی تھے۔ تاہم وہ ایک دن چپ چاپ مر جائیں گے، ایسا گمان شاید ہی کسی کو ہوا ہوگا۔ اگر چہ وہ بار بار بیمار ہو جاتے تھے، بعض لوگ اس بیماری کو بھی جون بھائی کے دیگر کمالات کی طرح اُن کی اداکاری سے تعبیر کرتے تھے مگر دو چار بار تو میں نے بھی اُنھیں دمے کے شدید اٹیک کے دوران دیکھا اور اُن لمحات میں جون بھائی کی حالت قابلِ تشویش ہی نہیں، قابلِ رحم بھی ہو جاتی تھی۔ وہ پوری طرح سانس نہیں لے پاتے تھے اور اُن کی سانس بار بار اکھڑنے لگتی تھی، وہ انہیلر کے ذریعے اپنی پژمردہ سانسیں بحال کرنے کی کوشش کرتے اور پھر نڈھال و بے دم ہو کر نیم بے ہوش سے ہو جاتے، تاہم چند ہی دنوں میں دوبارہ پہلے سے زیادہ تازہ دم ہو جاتے اور ساری دنیا کا مقابلہ کرنے اور ساری دنیا سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے۔

کتنی دل کش ہو تم، کتنا دل جُو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

جون ایلیا ایک دن واقعی مر گئے لیکن مرے بھی ایسے کہ پہلے سے زیادہ زندہ ہو گئے اور سچ کہوں تو مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے کہ وہ ہمارے درمیان پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ وہ 14 دسمبر، 1931ء کو امروہہ کی مردم خیز سرزمین سے اُٹھے تھے اور کراچی جیسے بڑی تجارتی اور صنعتی شہر میں خون تھوکتے تھوکتے 8 نومبر 2002ء کو رخصت ہو گئے۔ یہ خبر کراچی تو کیا پورے ملک اور پوری اُردو دنیا

کے لیے شدید اُداسی لائی ۔ یہاں کراچی میں چند دوست آرٹس کونسل کراچی میں منعقد ہونے والے تعزیتی اجلاس کے بعد، اُن کی یاد منانے طارق روڈ پر جمع ہوئے اور اُس رات سب کے سب اتنے دکھی، نڈھال اور پژمردہ تھے کہ ہمارے لیے بہت دیر تک خاموش رہنے، سگریٹیں پھونکنے اور یہ یقین کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ جون بھائی اچانک ایک ایسے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے ہیں، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ اُن کی زندگی کا آخری عشرہ اور آس پاس کے چند اور برس، یقیناً انتہائی دکھ، ذاتی پریشانی، بے گھری، تنہائی اور مخالف ہواؤں کے تھپیڑے سہتے ہوئے گزرے۔

اُس کی گلی سے اُٹھ کے میں آن پڑا تھا اپنے گھر
ایک گلی کی بات تھی اور گلی گلی گئی

گارڈن ایسٹ کی مشترکہ حویلی بکنے کے دنوں میں، جون بھائی کا وہاں چند مہینوں کا قیام اپنے اندر ایک دردناک داستان کی طرح ہے۔ جہاں دیگر دوستوں اور چاہنے والوں کی طرح میں بھی گیا اور اس اُجڑے دیار میں اُنھیں بے آسرا محسوس کر کے دل کٹتا رہا لیکن وہ اس گرتی ہوئی حویلی کے اُس خاص حجرے میں مسلسل براجمان رہے، جہاں کبھی رئیس امروہوی اپنے یادگار دنوں کی پُر رونق ادبی اور ثقافتی محفلوں کے ساتھ برسوں موجود رہے۔ اسی حجرے میں شہر بھر کی منتخب ادبی شخصیات کی آمد و رفت رہی۔ جون بھائی 1957ء میں امروہہ سے ہجرت کر کے اپنے نام ور بڑے بھائیوں سیّد محمد تقی اور رئیس امروہوی کے پاس، کراچی میں اسی بڑی اور داستانوی شہرت رکھنے والی بڑی حویلی میں رہے اور اُنھوں نے برسوں یہیں سے شعر و ادب کے متعدد معرکے بھی سرانجام دیے۔ اسی حویلی کے حجرے میں محرم کی خاص مجلسیں بھی ہوئیں، جن میں شہر کے منتخب اور اہم دانش ور، ادیب اور شعرا شریک ہوتے۔ جون بھائی جب تک اس حویلی میں رہے، ظاہر ہے، یہیں سے شریک ہوتے رہے اور جب گلشنِ اقبال والے گھر میں بیگم اور بچوں کے ساتھ رہنے لگے تو اپنے خاص دوستوں اور مداحوں کے ساتھ یہاں پابندی سے آتے رہے۔ رئیس امروہوی کے اندوہ ناک قتل کے بعد جون بھائی اپنے گھر ہی میں دس محرم اس طرح مناتے کہ انرجی ڈرنک کو ہاتھ تک نہ لگاتے۔ پھر برسوں بعد، اسی حویلی کے حجرے میں

انھیں کراچی کے ایک بڑے مشاعرے میں غلط فہمی
جون بھائی اُس وقت بھی مقیم ہوئے، جب اُنھیں کراچی کے ایک بڑے مشاعرے میں غلط فہمی کے باعث زدوکوب کیا گیا۔ اس واقعے کے دوسرے دن میں اُن سے ملنے گارڈن ایسٹ گیا۔ اُس دن جون بھائی بڑے ڈرے ہوئے، بڑے پریشان حال اور گھبرائے ہوئے بھی تھے۔ اُن کا کرتا خون آلود تھا، جسے اُنھوں نے واقعے کے دوسرے دن بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ اُن دنوں شہر میں عجیب سی دہشت پھیلی ہوئی تھی اور لوگ جون بھائی سے ملنے اور بات کرنے تک سے گریزاں تھے اور جون بھائی اس صورتِ حال پر اندر ہی اندر بڑے بے حال، ملول اور آب دیدہ تھے۔ یہ صورتِ حال اُس وقت تک چلی، جب تک جون بھائی کو اس انتہائی ناخوش گوار واقعے کے شدید ذہنی اور جذباتی دباؤ سے رہائی نہ ملی۔

تیغ بازی کا شوق اپنی جگہ
آپ تو قتلِ عام کر رہے ہیں

جون بھائی سے میری پہلی ملاقات گلشنِ اقبال والے گھر میں ہوئی۔ اُس وقت اُن کا بھرا پُرا گھر بڑا شاداب اور خوب صورت تھا۔ رشتوں کے تقدس سے مہکا ہوا، بچوں اور بیگم کی رفاقت سے چمکا ہوا۔ البتہ میں نے پہلی ملاقات سے کچھ ہفتے قبل ہی پی ایم اے ہاؤس، کراچی کے ایک مشاعرے میں جون بھائی کو دیکھا، جہاں اُنھوں نے اپنی یہ مشہور غزل سنائی۔

کوئی حالت نہیں یہ حالت ہے
یہ تو آشوب ناک صورت ہے
طنز پیرایۂ تبسم میں
اس تکلف کی کیا ضرورت ہے
انجمن میں یہ میری خاموشی
بردباری نہیں ہے، وحشت ہے

یہ 1987ء یا 88ء کا زمانہ تھا۔ اس مشاعرے سے پہلے جون بھائی کے بہت سے قصے، لطیفے اور کچھ قیامت کے شعر ضرور سُن رکھے تھے مگر جون ایلیا ادبی منظر سے پندرہ بیس برس سے تقریباً کٹے ہوئے تھے۔ مشاعرے اور ادبی تقریبات تو کجا، وہ اُس زمانے میں گھر سے بھی کم کم نکلتے تھے۔ اُنھیں شدید بے خوابی کی شکایت تھی اور یہ شکایت تو اُنھیں اس کے

بعد بھی رہی بل کہ بعد کی تمام زندگی ہی رہی اور کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی گئی۔ تاہم اُن دنوں وہ ہر ملنے جُلنے والے سے اپنی طویل بے خوابی کا ذکر ضرور کرتے اور برانڈی کے بِناہ کُن استعمال اور اس کے نتیجے میں اپنی تخلیقی قوتوں کی غیر معمولی فعالیت کا ذکر بھی کرتے۔ وہ کہتے کہ اُن دنوں میں ایک ایک دن میں تین چار غزلیں با آسانی کہہ دیتا تھا اور میرے قریبی دوست، جن میں عبید اللہ علیم کا نام سرِ فہرست ہے، مجھ سے کہتے جون ادھر اُدھر اپنا وقت ضائع مت کرو، خوب جم کر غزلیں کہو اور میں اسی میں لگا رہتا مگر اس کے سبب میرا دماغ خشک ہوتا گیا اور پھر اتنا خشک ہوگیا کہ میں شدید ترین بے خوابی کا مریض ہوگیا۔

ساٹھ برس کی عمر میں جون بھائی کا پہلا شعری مجموعہ 'شاید' سامنے آیا، جس کے بعد 'یعنی'، اُن کی موت کے بعد سامنے آیا۔ اس کے بعد 'گمان'، 'لیکن' اور 'گویا' کے علاوہ نثری کتاب 'فرنود' اور نظم کی کتاب 'راموز' شایع ہوئی۔ اور جون ایلیا دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا میں پھیل گئے اور اُن کی شخصیت اور شاعری پوری اُردو دنیا کے لیے سب سے زیادہ پُرکشش بن گئی اور یوں اُنھیں نئی نسل میں ایک حقیقی لیونگ لیجنڈ کا درجہ مل گیا۔

ہاں! پہلی ملاقات والی بات تو اس بیچ میں رہ ہی گئی۔ اُن دنوں دوستوں کے ساتھ طارق روڈ پر ہمارا اڈیرا رہتا تھا اور گھنٹوں کے حساب سے تقریباً روزانہ ہی رہتا تھا۔ پی ایم اے ہاؤس والے مشاعرے کے چند ہفتوں بعد ایک دن انیق احمد اور فیاض وید مجھے جون بھائی کے پاس لے گئے جب کہ یہ دونوں دوست اُس زمانے میں کراچی یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے بل کہ فیاض وید، جنھوں نے 90ء کی دہائی میں کئی خوب صورت غزلیں لکھیں، جون بھائی کے شاگردوں میں تھے اور جون بھائی نے حسبِ عادت فیاض کا تخلص 'وید' رکھا۔ وہ اپنے شاگردوں کے نت نئے تخلص رکھنے کے شوقین تھے، کبھی کبھی تو ایک ہی تخلص کئی شاگردوں کو آگے پیچھے تجویز کر دیتے تھے، پھر اس میں رد و بدل بھی کر دیتے تھے، تاہم جون بھائی کی ندرتِ فکر کے عین مطابق اُن کے شاگردوں کے تخلص عام روش سے کچھ ہٹ کر اور گہری انفرادیت کے حامل ضرور ہوتے تھے، البتہ جون بھائی کے شاگردوں کی حقیقی تعداد کا اندازہ لگانا قدرے دشوار گزار مرحلہ ہے۔ آیئے! ملاقات والی بات کی جانب لوٹتے ہیں تو بس جناب ملاقات کا وہ پہلا دن تھا اور آنے والے بیس پچیس برس جون بھائی سے ایک ایسا

رشتہ بندھا کہ پہلے بہت اور بہت ہی زیادہ، پھر ذاتی مصروفیات کے سبب کچھ کم اور بعد میں گاہے گاہے یہ ملاقاتیں جاری رہیں، جو کبھی گھنٹوں اور کبھی کئی دنوں پر بھی مشتمل رہیں۔ اُن ملاقاتوں کے حوالے سے ایک اور بڑی اہم بات یاد آئی۔ 1990ء میں میرا پہلا مجموعہ 'بے موسم وحشت' شایع ہوا۔ یار لوگوں نے حسب روایت اس مجموعے کو کہیں بھرپور پسندیدگی اور کہیں عدم پسندیدگی سے نوازا، تاہم چند ماہ کے دوران جب اس مجموعے کی تعارفی تقریب آرٹس کونسل، کراچی میں منعقد کی گئی تو ادب نوازوں اور ادب لکھنے والوں کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا۔ اس توجہ کا سبب میرا مجموعہ کم اور تقریب کے صدر اور عہد آفریں شاعر، ناقد اور دانش ور عزیز حامد مدنی اور تقریب کے مہمانِ خصوصی ہمہ جہت اور معتبر ترین شخصیت جون ایلیا زیادہ تھے۔ اُس دن انرجی ڈرنک کے بغیر بھی جون بھائی نے بڑی جان دار، عالمانہ اور خوب صورت گفت گو کی اور اپنی انفرادیت کے بڑے رنگ بکھیرے اور یوں اس تقریب کا چرچا کئی مہینوں تک جاری رہا۔ یاد رہے کہ مدنی صاحب اور جون بھائی پہلی بار ایک شعری مجمعے میں ایک ساتھ اس طرح شریک ہوئے اور انفرادی سطح پر بھی یہ دونوں بلند قامت شخصیات گنتی کی ایسی تقریبات میں گئے۔ اس حوالے سے، یہ تقریب میرے لیے ایک ایسا اعزاز ہے، جس پر جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ 'بے موسم وحشت' کی دوسری اشاعت بھی اس لیے یادگار رہی کہ اس کا بیک فلیپ جون بھائی کے اسی مضمون کا ایک خاص اقتباس تھا، جو اُنھوں نے اس تعارفی تقریب میں پڑھا تھا۔

'شاید' کی ترتیب کا زمانہ بھی میرے سامنے کا ہے۔ ایسا نہیں کہ میں اس مجموعے کی ترتیب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا، تاہم 'شاید' کے اہم ترین اور اُردو ادب کے منتخب ترین دیباچوں میں سے ایک 'نیاز مندانہ' کی کئی ہفتوں پر مشتمل لکھت کے دوران، جو کبھی 'سب رنگ' ڈائجسٹ کے دفتر میں شکیل عادل زادہ کی جانب رہی، کبھی انور شعور صاحب کے گھر رہی، کبھی کہیں اور کبھی کہیں اور کے علاوہ خود جون بھائی کے ہاں بھی اس کے سیشن جاری رہے۔ اس غیر معمولی اہمیت کی حامل لکھت کے بعد اس کی طوالت اور طوالت کے اختصاری عمل میں بھی میں دیگر خاص دوستوں کے ساتھ گاہے گاہے شریک رہا۔ جون ایلیا بولتے، اور کوئی خوش خط لکھنے والا دوست یہ خدمت انجام دیتا۔ جون بھائی پہلے اپنے ذہن

کو مرتب کرتے، انرجی ڈرنک کی چسکی لگاتے، ایک طائرانہ نظر پورے ماحول پر ڈالتے، پھر بڑے ڈرامائی اور فکر انگیز لہجے میں گویا ہوتے۔ پورا پیراگراف لکھوانے کے فوراً ہی بعد اُس کی تصحیح اور ایڈٹ بھی کراتے جاتے اور میں سوچتا جاتا یا خدا اتنا خوب صورت پیرا لکھوانے کے بعد اب اس میں ترمیم کی کیا ضرورت ہے مگر صاحب، جب جون بھائی اس پیراگراف کی مکمل ایڈیٹنگ کرا چکتے تو بڑے معصومانہ انداز میں کمرے میں موجود صاحبان کی جانب ایک فاتحانہ مسکراہٹ سے دیکھتے اور بھرپور داد ملنے کے ساتھ مزید پیراگراف لکھوانے میں مصروف ہو جاتے۔ کبھی کبھی معاملہ ایک، دو، تین پیراگراف تک محدود رہتا اور اس کے بعد انرجی ڈرنک کی بہتات بات کو کہیں سے کہیں لے جاتی، یوں اس نشست کو آئندہ روز تک موقوف کر دیا جاتا۔ برا ہوا کہ 'نیازمندانہ' کا طویل رَف ورک شاید ضائع ہو گیا ورنہ تلخیص اپنی جگہ، اب وہ پورا مسوّدہ بھی کہیں محفوظ ہو تو ضرور شایع ہونا چاہیے کہ ایسی حکمت آمیز، تخلیقی اور تاریخی نثر اپنی جگہ آپ ایک ایسا کمال ہے، جو اُردو ادب میں نایاب بھی ہے اور کم یاب بھی۔ 'شاید' کی اشاعت بھی اُردو ادب کا اہم واقعہ ہے۔ اگر چہ اس مجموعے کے انتخاب پر بہت لے دے ہوئی اور جون بھائی کو اس ضمن میں بہت سی وضاحتیں بھی دینی پڑیں، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ 'شاید' کی آمد نے جون بھائی میں نئی زندگی دوڑا دی تھی۔ یہ کمال اکیلے جون بھائی کا نہ تھا بل کہ اس کمال میں مرحوم سلیم جعفری کی عملی کاوشیں شاید دیگر احباب سے کہیں زیادہ رہیں، جنھوں نے اس مجموعے کی اشاعت کو یقینی بنایا۔ 'شاید' ہی کے ساتھ جون بھائی دبئی میں سلیم جعفری کے پاک و ہند مشاعروں میں ایک نئی آب و تاب سے چمکے۔ اُن کا ایک شان دار جشن بھی منایا گیا اور خود جون بھائی نے اپنے اس دور کو اپنا ظہورِ ثانی قرار دیا اور اس حوالے سے سلیم جعفری کی تحسین بھی کی۔ اسی دور میں جون بھائی کے انرجی ڈرنک کی شہرت بھی ہوئی اور وہ مشاعروں میں اس کے ساتھ ایسے نتھی ہوئے کہ جس مشاعرے میں گئے، ہٹ کیا سپر ہٹ ہوئے۔ جہاں مہیا نہ ہوئی، وہاں سے وہ مشاعرہ بھگتا کے آ گئے، اب انرجی ڈرنک اور جون ایلیا لازم و ملزوم سے ہو گئے، وہ اس کے بعد کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے اور بڑے سے بڑا مشاعرہ باز بھی اس عالم میں اُن کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ پھر وہ بلا کے صاحبِ علم، دانش ور، محفل

لوٹنے کے تمام گر جاننے والے، سامعین کے نبض شناس، خوش آواز، خوش بیاں اور خوش نگاہ تھے۔اُن میں درحقیقت ایک بڑا معصوم اور مہم جو لڑکا رہتا تھا، جو انھیں امروہہ کے جنگلوں اور باغوں کی طرح کراچی اور دنیا بھر کے ادبی مراکز میں نت نئی شرارتوں، جدّتوں اور معرکہ آرائیوں پر اُکساتا رہتا تھا۔

سال ہا سال اور اک لمحہ
کوئی بھی تو نہ اِن میں بل آیا
خود ہی اک در پہ میں نے دستک دی
خود ہی لڑکا سا میں نکل آیا

امروہہ سے اُن کا عشق کسی سے ڈھکا چھپا نہ تھا، وہ نوجوانی کے عالم میں امروہہ سے ہجرت کر کے کراچی جیسے بڑے اور بے حس شہر میں وارد ہوئے تھے۔

میں اور اس شہر کی طرف آتا
اسپِ وحشت نے بد رکابی کی

اس طرح کے بہت سے شعر، نظمیں اور غزلیں ہی نہیں، کراچی آنے کے بعد اُن کے خواب، زندگی اور شاعری شدید ترین جذباتی اُتار چڑھاؤ اور ناسٹلجیا کے شکار رہے۔ البتہ جب وہ ایک زمانے کے بعد واپس امروہہ گئے تو اُنھیں اندازہ ہوا کہ یہاں تو ساری کی ساری آب و ہوا ہی تبدیل ہو چکی ہے، جو اُن کے طویل تر بنجر رَت جگوں میں لَو دیتی ہوئی اور ایک زمانے تک بے خواب صبحوں میں سلگتی ہوئی جمال پرور یادوں کے بالکل برخلاف تھی، مگر اس کے باوجود وہ مرتے دم تک اپنے امروہے، وہاں کے پُر فضا جنگل اور پُر ماجرا شخصیات اور اپنی بان (امروہہ میں بہنے والی ندی) کو گریہ ناکی سے یاد کرتے رہے اور کراچی کی تاجرانہ سفاکی سے سجے شہرِ بے مہر پر گریہ کرتے رہے، جو کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

ہم تو جیسے وہاں کے تھے ہی نہیں
بے اماں تھے اماں کے تھے ہی نہیں
اُس گلی نے یہ سُن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

جون بھائی جو آدھی سے زیادہ عمر نیند سے شاکی رہے، عام طور پر دن کے دو تین بجے ناشتا اور دوپہر کا کھانا اکٹھے کیا کرتے، جو انگریزی میں سنڈے برنچ کی اصطلاح کے طور پر ہمارے ہاں بھی قدرے عام ہو چکا ہے، مگر جون بھائی کا برنچ تمام ہفتے جاری رہتا۔ یہ برنچ جو ایک سالن یا دلیے کے بڑے پیالے میں روٹی کے بھیگے ہوئے ٹکڑوں اور چائے پر مبنی ہوتا۔ بال وہ ہمیشہ بڑی باقاعدگی سے ڈائی کراتے، کبھی کبھی بال تھوڑے سے چھوٹے کرا لیتے تو پہچانے نہ جاتے تھے کیوں کہ اُن کی شخصیت کا جادو بڑے بالوں ہی میں جاگتا تھا۔ شیو وہ روزانہ کی بنیاد پر کرتے تھے، شیو کی پابندی وہ اس قدر کرتے کہ بغیر شیو کے اُنھیں گھر سے باہر شاید ہی دیکھا گیا ہو۔ ایک بار ہنگامی طور پر ہمیں ایک دوست کے گھر رات گزارنی پڑی، وہاں دو چار مرد ضرور تھے مگر سبھی کی داڑھیاں تھیں۔ اب رات بھر بغیر انرجی ڈرنک کے گپ شپ کرنے اور دوپہر کو اُٹھنے کے بعد جون بھائی شیو کرنے پر مصر ہو گئے، اُنھیں بتایا گیا کہ یہاں نہ ریزر ہے اور نہ شیونگ کریم لیکن وہ ضد پر اُتر آئے۔ اس پر اہلِ خانہ نے کہیں سے ریزر تو پیدا کر لیا لیکن شیونگ کریم ندارد۔ اس پر جون بھائی نے اپنی بلا کی وِٹ کا سہارا لیتے ہوئے اہل خانہ سے کہا کوئی بات نہیں، گھر میں کوئی صابن تو ہوگا ہی، وہی لا دو، میں اسی سے جھاگ بنا لوں گا اور شیو کر لوں گا اور پھر اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ جون بھائی انرجی ڈرنک لینے کے بعد اور کبھی کبھی اس کی زیادہ مقدار لینے کے بعد آپے سے باہر بھی ہو جاتے تھے، ایسے عالم میں وہ خطرناک بھی ہو جاتے تھے اور معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اب وہ کیا کرنے والے ہیں۔ ایسے عالم میں وہ ایسے ایسے کارنامے انجام دے جاتے تھے کہ اُنھیں سنبھالنے والے بعد میں کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ ایک بار جون بھائی نے بتایا کہ زیادہ ڈرنک کرنے کے بعد اُن پر خودکشی کا پرانا بھوت سوار ہو گیا اور وہ رات جس ہوٹل میں ٹھیرے تھے، اس کی چوتھی منزل سے کودنے ہی والے تھے کہ اُنھیں بچا لیا گیا۔ دوسری جانب اگر وہ اپنے حساب سے چلتے رہتے تو حالات نہ صرف کنٹرول میں رہتے بل کہ آس پاس کا ماحول بھی انتہائی خوش گوار رہتا۔ تاہم وہ عام حساب کتاب کے آدمی ہی کہاں تھے، اُن کا حساب کتاب ہی دوسرا تھا، جب کہ کارِ سود و زیاں کے بھی یقیناً نہ تھے، اگرچہ بعض اوقات وہ معصومانہ چالاکیاں ضرور کرتے اور پکڑے بھی جاتے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی دنیاوی

حساب کتاب سے کبھی نہ گزاری، بل کہ اُنھیں اس نوع کے حساب کتاب کی زندگی سے شدید الرجی تھی، شاید یہی اُن کی ناکامی کم سے کم دنیاوی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ بھی تھی۔ اسی سبب فی زمانہ کامیابیوں سے دُور رہے اور اسی خیال پرستی اور خواب پرستی کے باعث وہ دنیاداری اور اُس کے بنیادی تقاضوں اور ذاتی رشتوں کی نزاکتوں کو پوری طرح نہ نبھا سکے اور اس میں بری طرح ناکام ہوئے۔

تیرا ہر کام اب حساب سے ہے
بے حسابی کی زندگی کیا کی
اک نہ اک بات سب میں ہوتی ہے
وہ جو اک بات تجھ میں تھی کیا کی

جون بھائی جب جب اپنے کنٹرول میں رہتے، معاملات بڑے شان دار رہتے۔ ایسے عالم میں وہ خوب مہکتے، چہکتے اور اطراف کے لوگوں سے خوب اٹھکیلیاں کرتے۔ دل داریاں عروج پر ہوتیں،، روٹھنا اور منانا بھی ہوتا، علم و دانش کے موتی بھی رولے جاتے، شاعری کے یادگار دور بھی چلتے، ناز نخرے بھی اُٹھائے جاتے، خوش مذاقی لطیفوں اور گریہ کی منازل بھی آتیں، لیکن کبھی کبھی ایک وقت کے بعد پہلے وہ سب اور پھر خود کو ہوٹ کرنے لگتے، یوں ایک بہترین اور بنا بنایا ماحول چند منٹ میں تباہ ہو جاتا۔ ایسے عالم میں نہ اُنھیں اپنے امیج کی کوئی فکر ہوتی اور نہ وہ آس پاس کے ماحول اور لوگوں کی پروا کرتے۔ یہ وہ مناظر تھے، جنھیں دیکھ کے اُن سے پیار کرنے والے اور اُنھیں اپنا محبوب بنانے والے دل ہی دل میں دکھ کے رہ جاتے۔ خاص طور پر زندگی کے آخری چند برسوں کے دوران وہ خود کو مکمل طور پر تباہ کرنے پر تُل گئے تھے، وہ سب سے ناراض اور خفا ہوتے ہوتے، اب اندر ہی اندر اپنے آپ سے بھی خفا لگنے لگے تھے۔ ویسے اب میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جون بھائی کی ملاقات اُن کے آخری دور میں مشہور نفسیات داں، ڈاکٹر صداقت علی صاحب سے ہو جاتی تو وہ اُن کے بائی پولر ڈس آرڈر کا کوئی تشفی بخش علاج ضرور کرتے اور جون بھائی اپنی ابتر اور تباہ کُن حالت سے باہر بھی نکل آتے، تاہم ایسا ممکن نہ ہو سکا اور وہ اپنی تباہی اور بربادی کی آخری انتہاؤں تک پہنچ گئے۔

ہو رہا ہوں میں کس طرح برباد
دیکھنے والے ہاتھ ملتے ہیں
کیا تکلف کریں یہ کہنے میں
جو بھی خوش ہے ہم اُس سے جلتے ہیں

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

پھر ایک دن وہ واقعی چل بسے اور اپنی ناگہانی وفات کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے جدید اُردو ادب کے سب سے زیادہ چہیتے، سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے شعرا میں سرِ فہرست آ گئے۔ کیا کراچی، کیا لاہور، کیا فیصل آباد، کیا ملتان، کیا اسلام آباد، کیا پنڈی، کیا انڈیا، کیا عرب امارات، کیا امریکا، کیا کینیڈا اور کیا دیگر ادبی مراکز۔ سب طرف جون، جون، جون اور جون کی صدائیں آنے لگیں۔ اِدھر کئی برس سے حیران کُن طور پر فیس بُک، واٹس ایپ اور یوٹیوب پر جون ایلیا کی وڈیوز اور اشعار نے میلا لوٹا ہوا ہے۔ درحقیقت جون ایلیا نئی نسل کی پہلی پسند ہی نہیں، پہلا جنون بھی بن گئے ہیں اور اس کا سبب بھی واضح ہے۔ اصل میں جون ایلیا کی سادہ و پُرکار شاعری، جس میں حسن و عشق اور زندگی کے تمام اُتار چڑھاؤ اور انسانی نفسیات کا تخلیقی بیان ایک ایسے منفرد پیرائے میں ملتا ہے، جو ایک طرف جدید روز و شب اور جدید روز و شب سے پیدا ہونے والی نفسیاتی، معاشرتی، رومانی اور انقلابی رویوں میں پیچ در پیچ لہریں لیتی ہوئی گہری، جان دار اور بے ساختہ عکاسی بھی سامنے لاتا ہے اور دوسری جانب انتہائی ذاتی اور حسّاس نوعیت کی خوش کُن خودکلامی کے روپ بھی منعکس کرتا ہے، اسی کے بطن میں پورے ادھورے جون ایلیا سے ملاقات ہو جاتی ہے، اور اسی کے بیچ انتہائی خلاّقی سے ترتیب پانے والی خوش نما، خوش خیال اور خوش انداز، اُداس، اپنے آپ سے اُلجھتی ہوئی، ذات و کائنات کے دَر کھولتی ہوئی، سماجیات اور روایتی رومانی فضا کو ہوٹ کرتی ہوئی، سہل اور پُرکار شاعری بھی ظہور پذیر ہوتی ہے، جو خاص جون ایلیا کی پہچان ہے۔ جون ایلیا کو بے پناہ چاہا گیا، اُن سے بے پناہ عشق

کیا گیا ،اُن کی زندگی میں بھی اور اُن کی زندگی کے بعد اُن کے مداحوں میں یہ جنون مزید بڑھ گیا۔ نوجوان لکھنے والے اُن کے انداز کے بال بنانے لگے ،اُن کا حلیہ کاپی کیا جانے لگا ،اُن کی شخصیت کے انداز چرائے جانے لگے ،اُن جیسی باتیں کرنے کی کوشش کی جانے لگیں ،اُن کے خاص تکیۂ کلام' جانی' کی تکرار عام ہونے لگی ،اُن کے ندرت آمیز کلام کے ہرزاویے پر ہاتھ صاف کیا جانے لگا ،اُن کی زمینیں تو خیر ،اُن کی زندگی ہی میں چرائی جانے لگی تھیں ،مرنے کے بعد تو زمینیں کیا ،اُن کے طرزِ تکلم ،طرزِ ادا اور طرزِ غزل پر بھی بری طرح ہاتھ ڈالے گئے اور اُس پر ستم یہ کہ جون ایلیا کو ڈھٹائی سے چُرانے والے ،داد کے طالب بھی ہیں۔ میں دل ہی دل میں خوب ہنستا ہوں ، بہت ہنستا ہوں ، ایسے تمام مسخروں کو دیکھ کے ، جو جون بھائی کی کھلم کھلا کاپی کرتے ہیں اور خود کو بڑا اطرّم خان بھی سمجھتے ہیں۔ چاہے وہ اُن کی شخصیت کی کوئی ادا کاپی کریں ، چاہے اُن کے منفرد اور تخلیقی کلام کا چربہ کریں ، چاہے کچھ دنوں جون بھائی سے رفاقت کے بعد جون بھائی ، جون بھائی پکارتے پھریں ، میں واقعی بہت ہنستا ہوں۔ اس بارے میں خود جون بھائی نے بھی سچ ہی کہا۔

وا دریغا ! کہ ہم نشیں میرے
میرا طرزِ بیاں چراتے ہیں
کیا بتاؤں ، ہیں کیسے دیدہ دلیر
مجھ سے ہی مجھ کو ہاں چراتے ہیں
نقل کر کے کراہنے کی مرے
میری بیماریاں چراتے ہیں

یہ نظم ضرور پڑھیں اور پوری پڑھیں ، یہ واقعی پڑھنے والی نظم ہے۔ ایک دن باتوں باتوں میں جون بھائی نے کہا ، ایسا کوئی بھی شاعر جو تمھیں پسند ہو ، اُس کے نزدیک کبھی نہ جاؤ ، بل کہ اُس سے اتنا دُور ہو جاؤ کہ اُس کی پرچھائیاں بھی تم سے دُور رہیں۔ درحقیقت اپنے پسندیدہ شاعر سے نفرت کی جانی چاہیے تاکہ اُس کے اثرات سے محفوظ رہا جاسکے۔ تاہم خود جون ایلیا کے معاملے میں نئی نسل جو کچھ کر رہی وہ اُن کی خواہش کے برخلاف ہو رہا ہے۔ آپ جون ایلیا سے نفرت نہ کریں ، اُن سے محبت کریں ، تاہم اُن کے اسلوب اور شخصیت کو

کاپی کرنے کے بجائے اپنی راہ نکالیں۔اب یہ اور بات ہے کہ جون بھائی کا منفرد سخن اور منفرد شخصیت نئے کیا، پرانے کیا، سبھی کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ سو اس پس منظر کے ساتھ میں اس صورتِ حال سے اتنا ناخوش بھی نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زوردار اور فطری قوت رکھنے والے تخلیقی شاعر کے مجموعی اثرات اُس کے پورے عصر پر پڑتے ہی ہیں، جب کہ شاعر کی شخصیت بھی اتنی ہی پُرکشش ہو جتنی جون ایلیا کی تو یقیناً شخصیت کے کچھ نہ کچھ اثرات بھی آس پاس پڑتے ہی ہیں۔ایک اور بات، جون بھائی کا حلقۂ احباب اور اُن کے چاہنے والوں کے جمِ غفیر کا حال، اُن کے جانے کے بعد کھلا۔ایک بار اُنھوں نے نئے لکھنے والوں کے درمیان ایک بات کہی تھی اور یہ بات سو فی صد درست بھی تھی 'جانی! میں رہتا تو اپنے حجرے میں ہوں، مگر میری نظر پورے منظر پر ہے۔' وہ ہر نئے لکھنے والے سے بڑی حد تک باخبر تھے، چاہے وہ پاکستان کے کسی بھی ادبی مرکز میں موجود ہو، چاہے ادبی مرکز سے باہر نمو پا رہا ہو۔مزے کی بات ہے کہ وہ مجھ سمیت ہر نئے ملنے والے سے ہم عصر شعرا اور نئے لکھنے والوں کی ایک فہرست بنوایا کرتے تھے اور دو چار مہینوں کے بعد دوبارہ ایسی ہی فہرست بنوایا کرتے تھے۔اس فہرست میں سب سے پہلے وہ اپنے آپ کو منہا کرتے تھے اور ساتھ ہی فہرست بنانے والے کو اس میں سے خارج کر دیتے تھے تاکہ انصاف پسندی سے ایک بہتر فہرست مرتب ہو سکے۔ایک بار رات بھر کے ہنگامی قیام کے دوران جب جون بھائی نے مجھ سے متعدد بار کی بنائی جانے والی، ایسی ہی نئی فہرست کی فرمایش کی تو میں نے بھی ایک شرط رکھ دی کہ آج یہ فہرست منھ زبانی نہیں بنے گی بل کہ باقاعدہ کاغذ پر بنے گی اور اس پر اس نشست میں موجود تین چار دوست، بہ شمول جون بھائی اس فہرست پر دست خط بھی کریں گے۔کئی گھنٹوں کی قطع برید کے بعد ایک ایسی فہرست مرتب کر لی گئی، جو خاص طور پر کراچی کے سینئر شعرا سے لے کر 80ء کی دہائی کے نوجوان شعرا پر مشتمل تھی، اس فہرست میں بڑے دل چسپ انکشافات بھی موجود تھے اور جون بھائی نے اس پر دست خط بھی کر دیے تھے مگر۔

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا نئیں

والا معاملہ ہوا، حالاں کہ اس بار تو دستاویز پر اُنھوں نے دست خط بھی کر دیے تھے۔ دوسرے دن جون بھائی کو فکر ہوئی کہ کہیں یہ فہرست عام نہ کر دی جائے اور ایسا ہوا تو بڑا فساد برپا ہو جائے گا، لہٰذا اُنھوں نے ہمارے ایک مشترکہ دوست کے ذریعے اُس فہرست کو حاصل کیا اور اسے ضائع کر دیا۔ تاہم اس کے بعد اُنھوں نے کم سے کم مجھ سے بار بار بنوائی جانے والی کسی فہرست کا قصہ نہ چھیڑا۔ اصل میں ایک جانب جون بھائی بڑے معصوم آدمی تھے اور وہ جتنے معصوم تھے، اُس سے زیادہ بننے کی اداکاری بھی کرتے، جب کہ دوسری طرف وہ بڑے جہاں دیدہ، زیرک اور معاملہ فہم بھی تھے۔ جہاں تک لباس کا معاملہ ہے وہ صرف کرتا پاجامہ اور واسکٹ ہی نہیں پہنتے تھے، خاص خاص موقعوں پر سوٹ بھی پہنتے مگر بغیر ٹائی کے، جیسے گرلز کالجوں اور میڈیکل کالجوں میں وہ بالوں کو اچھی طرح ڈائی کرتے اور سوٹ پہن کر جاتے۔ امریکا یا کسی دوسرے ملک جاتے تو بھی وہاں سوٹ پہنتے اور ساتھ ساتھ اپنا روایتی کرتا پاجامہ اور واسکٹ بھی زیب تن کرتے۔ ایک بار کراچی یونی ورسٹی کے بوائز ہاسٹل میں ایک رات مشاعرہ رکھا گیا، صدارت جون بھائی کی طے ہوئی۔ اب جانے اُن کے ذہن میں بوائز کے بجائے گرلز ہاسٹل کی بات کیسے فٹ ہوگئی۔ وہ تھوڑی سی انرجی ڈرنک لگا کے بڑے اہتمام سے مشاعرے کے لیے کراچی یونی ورسٹی پہنچے۔ اکثر شعرا پہلے ہی پہنچ چکے تھے، یونی ورسٹی کے وائس چانسلر، جو اُن دنوں منظور صاحب تھے، بہ نفسِ نفیس شعرا کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے، اُس رات جون بھائی نے خاصا ہنگامہ کیا۔ یونی ورسٹی پہنچنے کے بعد پہلے تو اُنھوں نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھا، بھئی لڑکیاں کہاں ہیں، لوگوں نے کہاں، جون بھائی، لڑکیاں کیسی، یہ تو بوائز ہاسٹل کا مشاعرہ ہے، جون بھائی اَڑ گئے نہیں جانی مشاعرہ تو گرلز ہاسٹل میں ہے۔ یہاں تک کہ وائس چانسلر سے بھی اُنھوں نے فرمایش کر ڈالی کہ لڑکیوں کو بلائیں ورنہ میں واپس جا رہا ہوں، مجھ سے جھوٹ کیوں بولا گیا، میں تو لڑکیوں کے ہاسٹل کا سُن کر یہاں آ گیا۔ پھر بڑی مشکل سے جون بھائی کو سمجھایا گیا کہ مشاعرہ یہیں ہے اور یہ سیکڑوں طلبہ جو پنڈال میں موجود ہیں آپ سے بڑی محبت اور عقیدت رکھتے ہیں، اگر آپ لوٹ گئے تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا، اس پر وہ مان گئے۔

میں نے جون بھائی کے کئی روپ دیکھے، ہر روپ میں ایک نیا روپ دیکھا۔ پھر ایک ایک روپ، کئی کئی بار بھی دیکھا اور اکثر اوقات بالکل ہی غیر متوقع انداز کے ایسے حیران کُن روپ بھی دیکھے ہیں، جو پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس کے علاوہ جون بھائی کے اتنے واقعات، اتنے لطیفے اور اتنے معرکے دوستوں اور اجنبیوں سے سننے کو ملتے رہے کہ مجھے اُن سے طویل رفاقت کے باوجود یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں انھیں بہت کم جان سکا اور میں اُن کے قریبی جاں نثاروں، چاہنے والوں اور اُن کی پارٹی کے خاص لوگوں میں شامل ہونے کے اعزاز سے بھی محروم رہا۔ البتہ میں نے اُنھیں دیکھا ضرور ہے، کبھی بہت قریب سے، کبھی دُور سے اور کبھی کسی اور کی نگاہوں سے۔ اپنی ذات میں وہ ایک لمبی چوڑی اور ان ہونی داستان کی طرح تھے۔ ایک ایسی داستان، جو چند صفحات کے بعد اچانک ہی ایک نیا موڑ لے لیتی ہے۔ وہ افسانہ طراز بھی تھے، خود افسانہ بھی تھے، تماشا بھی تھے، تماشائی بھی تھے، نفی پسند بھی تھے، اثبات کے خواہش مند بھی تھے، تشکیک کے مارے بھی تھے، اس سے نکلنا بھی چاہتے تھے، مشکل بھی تھے، آسان بھی تھے، الجھاؤ میں بھی رہتے تھے اور سلجھاؤ کی تمنا بھی رکھتے تھے، وہ مجھ سے کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ مجھے فلسفے کے عشق نے کہیں کا نہ رکھا، مجھ سے میرا یقین اور میرا خدا تک چھین لیا۔

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نئیں

جون بھائی کے اندر بے شمار تضاد تھے اور اُن کا ہر تضاد بڑا عجیب سا تھا۔ ویسے بھی وہ بڑے عجیب سے تھے اور اُنھیں عجیب ہونے سے عشق بھی تھا۔ عجیب ہونے کا دوسرا مطلب منفرد، دوسروں سے الگ اور دوسروں سے جدا ہونے کا بھی ہے اور وہ واقعی ان معنوں میں اپنے عہد کے سب سے عجیب شاعر تھے۔ ان کے اسی عجیب ہونے سے اُن کے ہم عصر پریشان بھی رہتے تھے اور اُن کے خلاف سازشیں بھی تیار کرتے رہتے تھے، جن کا مقابلہ جون ایلیا اپنے مخصوص مزاج سے کرتے۔ وہ اپنے بعض ہم عصروں سے، جنھوں نے اُنھیں زک پہنچائی، بڑی خوب صورتی سے گھیر گھار کے زک پہنچاتے تھے اور اُنھیں ایسی جگہ مارتے، جہاں وہ دم بھی نہ مار سکیں۔ جون بھائی نئے لوگوں اور اپنے نئے عشاق پر

جان نچھاور کرتے تھے۔ اُنھیں نئے لوگوں کو متاثر کرنے، اُنھیں اپنا بنانے اور اپنے آپ میں مبتلا کرنے کے خاص گُر آتے تھے۔ وہ نو جوان دوستوں کے گھروں پر رہنے اور اُن کے ماحول میں رَچ بس جانے کے خواہش مند رہتے۔ جیسے جیسے وہ اپنے گھر اور اپنے رشتوں سے دُور ہوتے گئے، ویسے ویسے یہ خواہش بھی سوا ہوتی گئی اور ان کے چاہنے والے بھی ایسے تھے کہ وہ اُن کی اس خواہش کو پورا کرنے میں کبھی پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ اسی لیے، وہ پورے پاکستان میں جانے کہاں کہاں اور کس کس کے گھروں میں ایک باعزت اور معزز مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔ کہیں دنوں، کہیں ہفتوں تو کئی مہینوں تک قیام کیا۔ وہ سراپا روح تھے، سراپا تہذیب تھے، سراپا اقدار کے آدمی تھے، اسی لیے لوگ خوشی خوشی اُنھیں اپنے ساتھ رکھتے اور اُن کا ساتھ اپنے لیے اعزاز بھی تصور کرتے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ جون بھائی ایک ایسے وجودی تخلیق کار تھے، جو خود بھی خون تھوکتے تھے اور اپنے چاہنے والوں کو بھی خون تھوکنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ وہ جہاں ایک جانب عجز اور انکسار کا پیکر تھے، وہاں وہ اپنے ہونے، اپنے حسب نسب، اپنے خاندانی شجرے اور اپنی منفرد تخلیقی حیثیت سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ وہ جب اپنی کرنے پر آتے تو بڑی بڑی محفلیں درہم برہم کر دیتے تھے۔ بعض اوقات انرجی ڈرنک لینے اور حد سے سوا لینے کے باعث بھی نجی اور عوامی محفلوں میں نازک حالات پیدا ہو جاتے تھے، وہ لوگوں کو ہُوٹ کرنے لگتے تھے اور بعض ایسے مقامات پر ہُوٹ کرنے لگتے تھے، جہاں ہُوٹ ہونے والے سخت بے کیف ہو جاتے، لیکن کیوں کہ وہ جون بھائی تھے، اس لیے اُنھیں ایک خاص لائسنس حاصل تھا اور لوگ سخت پیچ و تاب کھانے کے باوجود چپ ہو جاتے تھے۔ یہ کیفیت خاص طور پر اُن کی زندگی کے آخری دس پندرہ برس میں نمایاں رہی۔ وہ جب سفاک ہونے پر آتے تو انتہائی سفاک ہو جاتے اور جب کسی کے خلاف ہو جاتے تو اس میں بھی حد سے گزر جاتے، کیوں کہ وہ بلا کے حسّاس اور بلا کے نرگسیت پسند واقع ہوئے تھے۔ البتہ وہ جن چاہنے والوں کو بار بار آزما لیتے اور اُنھیں خوب خون رلا دیتے، اُن کے ساتھ نرم بھی پڑ جاتے مگر نئے کسی مداح کے لیے جون بھائی کی کڑی آزمایشوں اور بلند معیار پر پورا اُترنا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ وہ اپنے نئے شاگردوں اور ایسے اعتماد کے شاگردوں سے، جن پر وہ قدرے بھروسا کرنے

لگتے ،ایک ایسے کام پر لگا دیتے جو وہ بڑی چالاکی سے بہ یک وقت کئی شاگروں سے لیتے تھے ،یعنی اپنی شاعری کے رجسٹر بنوانا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری ایک نہیں بل کہ کئی رجسٹروں پر بار بار نقل کی گئی۔ اُس پر بھی کچھ عیار شاگروں نے ایک آدھ رجسٹر ادھر اُدھر کرنے کی کوشش کی تو جون بھائی اس چوری پر آگ بگولہ رہے اور کئی دنوں تک گریہ بھی کرتے رہے، حالاں کہ میرا خیال ہے کہ چوری کیے جانے والے رجسٹروں کا مواد کئی دوسرے رجسٹروں میں موجود رہا مگر شہر میں یہ قصہ ایک زمانے تک چلتا رہا۔ ویسے حیرت کا مقام ہے کہ جون بھائی نے اتنا زیادہ کلام کیسے محفوظ رکھا اور کہاں رکھا اور 'یعنی' کی اشاعت کے بعد، رفتہ رفتہ کہاں سے برآمد ہوا اور چار پانچ شعری مجموعوں میں شامل کیا گیا، یقیناً یہ کلام جون بھائی کا ہی ہے اور اسی کلام نے پوری اُردو دنیا میں وہ تہلکہ بھی مچایا جو اُن کی بے پناہ مقبولیت کا موجب بنا، جب کہ بعض سنجیدہ ناقدین اور تجزیہ نگاروں کے مطابق 'یعنی' کے بعد کا کلام اتنا میچور اور اتنا گہرا نہیں جو جون بھائی کے دیگر تخلیقی معیارات کی برابری کر سکے مگر صاحب 'قبول کیجیے جو فیصلہ عوام کریں' کی روشنی میں نئی نسل اسی کلام کی دیوانی ہے، جو ایک جانب سادہ اور پُرکار بھی ہے اور دوسری طرف نت نئی زمینوں، ردیفوں، کیفیات اور موج و سرمستی کے تال میل سے زندگی کے عذاب و ثواب، انسانی نفسیات اور وجودی مسائل کا ادراک کراتا ہوا عہدِ حاضر کے حسن و عشق اور انسان کے نفس کی پُر پیچ دنیاؤں کی سیر کراتا ہے۔ یہ کلام خاص جون کے رنگ کا ہے اور جدید شاعری کی دیگر خوبیوں سے بھی مزین ہے۔

جون ایلیا کی ذاتی زندگی ،اُس کی نزاکتیں، اُس کی مسرتیں ،اس کی تکلیفیں، اُس کی اُلجھنیں ،اس کے منظر اور پس منظر پر تھوڑی بہت جان کاری کے باوجود میں اس ضمن میں کچھ بھی کہنے سے گریز کروں گا کیوں کہ خود جون بھائی اس جانب گاہے گاہے مشاعروں میں ایسے کرب ناک اشارے کر چکے ہیں ،جو بالغ نظروں کے لیے کافی ہیں ۔اسی طرح میں اُن کے بہت سے معاملاتِ عشق سے قدرے آگہی رکھنے کے باوجود اس جانب بھی نہیں آنا چاہتا۔ البتہ ایک دو واقعات ایسے ضرور ہیں جو خاصے دل چسپ ہیں اور ان سے جون بھائی کی فطری معصومیت اور سادگی اپنی تمام تر منصوبہ بندی اور ہوشیاری کا گمان رکھنے کے باوجود باقی چیزوں پر حاوی ہے۔ پہلا واقعہ کراچی کی اُس قتالہ کا ہے

جونوے کی دہائی میں اچانک کراچی کے ادبی منظر پر اُبھری اور جانے کتنے دلوں کا قرار اور کتنے حسن پرستوں کا اعتبار لے گئی۔ یہ ایک میاں بیوی تھے۔ بیوی شعروادب کی دل دادہ تھی، کم سے کم بہ ظاہر تو تھی۔ وہ بڑی بے باکی سے کراچی کے ٹاپ شعرا سے دلی وابستگی اور رومانی گرم جوشی کا رشتہ بناتی رہی اور پسِ پردہ اپنے مقاصد بھی حاصل کرتی رہی۔ اسی دوران وہ قتالہ جون ایلیا سے بھی متعارف ہوئی اور اُن سے گہری دل داری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جون بھائی خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ایک ایسی حسین وجمیل عورت، جو شعروادب کا شوق بھی رکھتی ہو اور جون بھائی پر مکمل طور پر فدا بھی ہو۔ ایک سطح پر رومان پرست، خیال پرست اور خواب پرست شاعر کے لیے تخلیقی طور پر بڑی نیک فال ثابت ہوتی ہے اور کئی غزلوں اور نظموں کی تخلیق کا موجب بھی بن جاتی ہے۔ مگر بعض دفعہ اس قسم کے قصوں میں ہزیمت کے ساتھ ساتھ دھوکا بھی بہت ملتا ہے۔ وہ قتالہ بھی جون بھائی کو اپنے حسن کے وہم میں مبتلا کر کے اُن سے ایک بڑی رقم لوٹ کے لے گئی۔ ادھر جون ایلیا ایک عرصے تک دل کی نگری اُجڑنے کا واقعہ بڑی حسرت سے اپنے خاص یاروں کو سناتے رہے اور آہیں بھی بھرتے رہے۔ وہ قتالہ تو ایسی کئی اورواردا تیں کرنے کے بعد کراچی سے ویسے ہی غائب ہوگئی، جیسے یہاں وارد ہوئی تھی۔

اسی طرح ایک اور خاتون تھیں، جو جون ایلیا پر دل و جان سے فدا تھیں۔ ایک تو خیر یوں ہی لکھ دیا ورنہ جون بھائی کے معالاتِ دل خود اُن کی پُر اسرار تخلیقی شخصیت کی طرح گہرے بھی رہے اور اُن میں خاصی وسعت بھی رہی۔ خیر، یہ خاتون ایک قبول صورت اور پچاس پچپن کے پیٹے میں تھیں۔ غالباً غیر شادی شدہ بھی تھیں اور اُنھیں شعروادب سے کم سے کم مشاعروں کی سطح پر خاصی دل چسپی بھی تھی اور ایسے مشاعرے جہاں جون بھائی مدعو ہوتے، وہ وہاں ضرور پہنچ جاتیں۔ خاتون بڑی زندہ دل تھیں، خود بھی انرجی ڈرنک کے سپ لے کر مشاعروں میں پہنچتیں اور جون بھائی کے لیے بھی اپنے پرس میں انرجی ڈرنک کا اہتمام رکھتیں۔ سنی سنائی بات یہ بھی ہے کہ جون بھائی کے اکیلے رہ جانے والے دور میں وہ خاتون اُن سے شادی کے لیے بھی سنجیدہ ہوگئی تھیں، مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی، اسباب چاہے کچھ بھی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ جون بھائی کے گزر جانے کے بعد اب وہ

خاتون کسی مشاعرے میں دکھائی نہیں دیتیں۔اچھا! یہ بات تو بھی جانتے ہیں کہ اکیلے ہونے کے بعد جون بھائی کو بہت عرصے تک دوسری شادی کا ہوکا رہا۔وہ اپنے ہر چاہنے والے سے شادی کا ذکر لے بیٹھتے ۔سب سے پہلے وہ اپنے نوجوان چاہنے والوں سے پوچھتے کہ کیسی خاتون اُن کے لیے مناسب ہیں،یعنی کتنی پڑھی لکھی،کتنی عمر کی،کس خاندان کی،کنواری یا مطلقہ وغیرہ وغیرہ۔بار بار ایک فہرست بنتی اور منسوخ ہو جاتی اور آخر کار وہ اسی خوش گمانی میں ایک دن دنیا ہی چھوڑ گئے ۔میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ بھی جون بھائی کی خوش وقتی کے انداز تھے ورنہ وہ یہ بات تو پہلے ہی لکھ چکے تھے۔

محبت کچھ نہ تھی جز بدحواسی
کہ وہ بندِ قبا ہم سے کھلائیں

یعنی اب شادی کا خیال محض ایک ذہنی عیاشی اور ذہنی تسکین کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

جون بھائی کو بیمار پڑنے اور اپنے چاہنے والوں کو تیماردار بنانے کا بھی بڑا شوق تھا۔

دوا سے فائدہ مقصود تھا ہی کب کہ فقط
دوا کے شوق میں صحت تباہ کی میں نے

اس ضمن میں یہ بات بھی عاشقانِ جون کے لیے دل چسپ ہوگی کہ وہ اُس خیالی نیند کے لیے زندگی کے تیس چالیس برس پریشان رہے،جو اُنھیں اُتنی ہی آتی تھی، جتنی ایک عام آدمی کو یا اُس سے تھوڑی کم آتی ہوگی مگر اُنھوں نے اس نیند کو ایک افسانہ بنائے رکھا اور اس کے لیے ایکوپنکچر،نیند کی ہائی ڈوز دواؤں،ہومیو پیتھک اور حکمت سمیت جانے کیا کیا علاج کرائے اور ہمہ وقت اپنی نیند اور ذاتی مسرت کے حصول سمیت اپنے خیالی امراض کا عملی علاج کراتے رہے۔ایک دن میں اپنے ایک نوجوان دوست نشان عباس کو جو شعر و ادب کا شوق رکھتا تھا اور اُس زمانے میں ڈاکٹری بھی پڑھ رہا تھا، جون بھائی سے ملاقات کے لیے لے گیا۔ جون بھائی نے جیسے ہی اُس کا نام سنا اُن کی آنکھیں چمکیں،مطلب یہ تھا کہ اچھا یہ اپنا مومن بچہ ہے اور پھر جیسے ہی اُس کی ڈاکٹری والی بات اُن کے علم میں آئی،وہ نشان عباس سے لپٹ گئے اور کہنے لگے۔''جانی! میں بہت بیمار ہوں،برسوں سے سویا نہیں اور مجھے فلاں فلاں بیماریاں اور بھی ہیں،اب تم ہی میرا علاج

کرو گے اور تم ہی میرے معالج ہو۔'' نشان عباس بہت دیر تک جون بھائی کے مختلف امراض سنتا رہا اور پھر اُس نے ان امراض کی روشنی میں ایک متفرق نسخہ بھی لکھ دیا۔ تاہم معاملہ اسی پر بس نہ ہوا، اُسے جون بھائی کے لیے اُس نسخے کے مطابق دوائیں بھی لانی پڑیں اور بہت دنوں تک وہ نوجوان ڈاکٹر جون بھائی کا معالج بنا رہا، یہاں تک کہ جون بھائی کسی اور معالج کی جانب متوجہ نہ ہو گئے۔ ویسے جون بھائی کو بعض پیچیدہ امراض واقعی تھے، جیسے دمہ، جو اُن سے خون تھکواتا رہا اور اسی مرض کی شدّت کے سبب وہ اپنی زندگی بھی ہارے۔ البتہ بہت سی بیماریاں خیالی بھی تھیں یا اتنی سنجیدہ نوعیت کی نہ تھیں، جتنی جون بھائی نے سمجھ رکھی تھیں۔ اسی ضمن میں مجھے وہ واقعہ بھی یاد آ گیا، جو جون بھائی کی زبانی کچھ اس طرح مجھ تک پہنچا۔

'میں خاصے دنوں سے ایک ہومیو پیتھک کے معروف ڈاکٹر سے اپنا علاج کرا رہا تھا، برسوں کی بے خوابی، شدید ڈپریشن اور تنہائی کے سبب، اپنے گھر تک محدود تھا۔ آوازوں، لوگوں، مشاعروں اور روشنی سے مجھے سخت وحشت ہوتی تھی۔ ایک شام میں اُس ڈاکٹر سے دوا لینے گھر سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں، گلی سے گزرتے ہوئے کیا بچے، کیا بڑے، سب دبی دبی ہنسی کے ساتھ مجھے پلٹ پلٹ کے دیکھ رہے ہیں، یعنی ہرا یرا غیرا میری جانب متوجہ ہے۔ یہی صورتِ حال ڈاکٹر کے کلینک میں بھی درپیش رہی۔ میں اندر ہی اندر سوچتا رہا کہ یہ کیا واقعہ ہے۔ پھر دو چار دن بعد عقدہ کھلا کہ انور مقصود نے ٹی وی کے کسی پروگرام میں معین اختر سے میری پیروڈی کرائی ہے۔'

کیا وہ سڑک ہوئی تمام، ہاں وہ سڑک ہوئی تمام
کیا وہ ٹرک گزر گئے، ہاں وہ ٹرک گزر گئے

یہ جون بھائی کی اِس مشہور غزل کی پیروڈی ہے۔

ہم نے خدا کا رَد لکھا نفی بہ نفی لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے

یہ وہی مشہور زمین ہے جو قرۃ العین طاہرہ کے سبب، جون بھائی کو دل و جان سے

عزیز رہی اور اُنھوں نے اس زمین میں کئی معرکہ آرا غزلیں بھی کہیں اور اس مشکل اور نازک بحر کو تخلیقی اعتبار سے مکمل طور پر نبھانا بھی جون بھائی جیسے مشاق اور تخلیقی شاعر کے بس کی بات تھی، ورنہ بہت سے یار دوستوں نے اس بحر میں غزلیں کہیں، تاہم کہیں کچھ نہ کچھ اُوپر نیچے ہوگیا، کہیں بحر اور وزن تو ضرور قابو میں رہا مگر شاعری کی لہر اس میں سے غائب ہوگئی۔ اب دوبارہ لوٹتے ہیں انور مقصود کی طرف، واقعی اُنھوں نے بڑا کمال دکھایا اور معین اختر نے اس پیروڈی میں کمال کی فن کاری کے زندہ رنگ بھرے۔ یوں ایک زمانے سے عوام اور خواص کی نظروں سے اوجھل جون بھائی اچانک اور راتوں رات لائم لائٹ پر آگئے، جس کی انتہا سلیم جعفری کے دبئی والے مشاعرے بنے اور پھر 'شاید' کی اشاعت نے جون ایلیا کو پوری اُردو دنیا میں ایک بار پھر ایسے زندہ کیا کہ وہ اپنی آخری سانسوں تک مقبولیت کی انتہاؤں پر رہے مگر بے چین، بد دل، تنہا، اُداس اور شدید ڈپریشن کا شکار بھی رہے۔ حالاں کہ زندگی کے آخری چند برسوں میں وہ 'انشا' اور 'عالمی ڈائجسٹ' کے زمانوں کی طرح بڑے مالا مال رہے۔ اُن کے اکاؤنٹ میں اسی لاکھ سے اُوپر کی بڑی رقم تھی۔ اسی رقم سے اُنھوں نے بتیس ہزار کی بتیسی بھی لگوائی تھی۔ اسی دور میں وہ اپنی درویشانہ وضع کے برخلاف قیمتی بوسکی کے کرتوں میں بھی نظر آئے، مہنگی سے مہنگی انرجی ڈرنک سے بھی لطف اندوز ہوئے مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ اندر سے اُجڑے ہوئے ہی رہے اور اُس روگ سے آخری سانس تک دامن نہ چھڑا سکے جو اُنھیں اندر باہر سے بُری طرح چاٹ رہا تھا۔ پھر ہوتے ہوتے اور باہر باہر کی تمام تر ہنگامہ آرائی کے باوجود ایک خوش آواز، خوش قرینہ اور خوش خیال شاعر اس دنیا سے منھ موڑ گیا۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ جون ایلیا کے ہاں زندگی کی کلّیت سے جڑے ہوئے بڑے شعر ناپید ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ وہ ادب میں شراب، بے راہ روی اور مسخرے پن کو رواج دے گئے۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ وہ ملحد تھے اس لیے اُنھیں سرے سے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ کچھ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنے حلیے میں ساغر صدیقی کی بھونڈی نقالی کرتے کرتے مر گئے۔ کچھ کے نزدیک اُنھوں نے اپنی خانگی زندگی کو اپنے ہاتھوں تباہ کیا اور اسی سبب اُنھیں ایک بھرے پُرے گھر سے جان لیوا تنہائی اور لہو رُلاتی لاچاری کی زندگی کا تحفہ ملا۔ کچھ بڑی سفاکی سے دعویٰ کرتے ہیں کہ

اُن کی غیر معمولی مقبولیت ایک وقتی دھوکا ہے اور بہت جلد حالات اُنھیں گم نامی کے اندھیرے میں دھکیل دیں گے۔ غرض ناقدینِ جون نے زندگی بھر اُن کا کڑا محاسبہ کیا اور اب اُن کے بعد بھی اُنھیں بخشنے پر تیار نہیں جب کہ عاشقانِ جون ایسی تمام لغو باتوں اور بے پر کے الزامات کو رَد کرتے ہیں اور اس کے جواب میں جون ایلیا کی زندگی کے مثبت پہلو، اُن کی انسان دوستی کی مثالیں، اُن کی معصومیت کے قصے، اُن کی دانش وری، علم و حکمت، زبان و بیان پر اُن کی غیر معمولی گرفت، اُن کی دل میں اُتر جانے والی گہری مگر عام فہم غزلوں، اُن کی دقیق و عالمانہ نظموں اور بے مثال نثری کارناموں کی طویل فہرست پیش کرتے ہیں اور کلام کے وہ روشن رُخ پیش کرتے ہیں، جو جدید شعر و ادب کی آبرو ہیں۔ جن کے سبب جون ایلیا، ایک عہد آفریں جون ایلیا بنے۔ خود میں بھی جون بھائی سے منسوب ایسی بہت سی باتوں اور الزامات پر اندر ہی اندر آگ بگولہ ہو جاتا ہوں، دراصل وہ اندر باہر پورے کے پورے بلند قامت تخلیق کار تھے اور پورے انسان بھی تھے، بہ قول یگانہ چنگیزی۔

شیطان کا شیطان ، فرشتے کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

اب بشری کم زوریاں کس میں نہیں؟ مجھ میں بھی بہت سی ہیں اور آپ میں بھی ہوں گی، جہاں تک جون بھائی کا تعلق ہے، یقیناً چند باتیں ایسی ضرور ہیں، جہاں وہ تھوڑے بہت کم زور پڑے مگر دوسری جانب دیکھیے تو اُن کی خوبیوں کا تناسب ان چند باتوں سے کہیں بڑھ کر اور کہیں زیادہ ہے، اتنا کہ اُن پر بے اختیار پیار آ جائے۔ آیئے! اس مکدر فضا سے نکلیں اور چند اور باتیں کریں۔ ایک دن میں نے تنہائی میں جون بھائی سے پوچھا۔ ''جون بھائی آپ کا پسندیدہ شعر کون سا ہے، کوئی ایک شعر جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہو؟'' جون بھائی کی آنکھیں چمکیں، کہنے لگے۔ ''بہت مشکل سوال ہے، کوشش کرتا ہوں کہ ایسا شعر بتاؤں۔'' پھر جو شعر اُنھوں نے بتایا، وہ یہ ہے۔

زندگی کس طرح بسر ہوگی
دل نہیں لگ رہا محبت میں

پھر کہنے لگے۔ ''عجیب بات ہے بعض اوقات میں نے چند ایسے شعر بھی کہے،

جنھیں کہنے کے بعد مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ شعر ہیں، جیسے یہ شعر۔

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

اسی طرح اور ایک شعر ہے، جو کہنے کے بعد مجھے کئی دنوں تک یہ اُلجھن رہی کہ یہ شعر ہے بھی یا نہیں۔

میں اِس دیوار پر چڑھ تو گیا تھا
اُتارے کون اب دیوار پر سے"

جون ایلیا ایک خاص فکری نظام یعنی ترقی پسندی سے ضرور متعلق رہے، ایک زمانے میں کمیونسٹ بھی رہے، لیکن ملحد ہونے کا ڈراما ہی کرتے رہے کیوں کہ وہ اندر سے ملحد نہ تھے۔ وہ اکثر ناشتے سے قبل چند عربی آیتیں پڑھتے اور اسے اپنی بندگی سے تعبیر کیا کرتے۔ اگر چہ اُن کی غالب دشمنی بھی سب کے سامنے ہے مگر میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی وہی معاملہ تھا، جو یگانہ چنگیزی کو درپیش تھا کہ غالب مجھ سے پہلے کیوں پیدا ہوگیا۔ یگانہ بھی زندگی بھر غالب کو کوستے رہے اور اس کا ایک پس منظر لکھنؤ بھی تھا، جہاں غالب پرستی بہت عام تھی اور یگانہ کو یہ بات بہت کھلتی تھی۔ یوں وہ زندگی بھر غالب دشمنی پر بھی کمربستہ رہے اور لاشعوری طور پر اُس کی تقلید میں بھی لگے رہے۔ کچھ اس سے ملتا جلتا حال جون بھائی کا بھی تھا۔ وہ ساری زندگی میرؔ کے زبردست مقلد بنے رہے اور غالب کا مذاق اُڑاتے رہے مگر خود اُن کی سہلِ ممتنع پر میرؔ سے زیادہ غالبؔ کی سہلِ ممتنع کے اثرات رہے۔ غالبؔ کی سہلِ ممتنع میں جس طرح دوسرا مصرع اُلٹ کے آتا ہے اور شعر کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے، جیسے: دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا، شرم تم کو مگر نہیں آتی، وغیرہ اگر چہ چھوٹی بحروں کو میرؔ ہی سے مناسبت رہی اور میرؔ اُس میں بادشاہ بھی رہے لیکن انھی چھوٹی بحروں میں ایک نئی راہ غالبؔ نے نکالی، کسی حد تک مومنؔ نے بھی نکالی، داغؔ بھی اپنے طور پر اس راہ پر کاربند رہے۔ پھر یگانہ نے انھی چھوٹی بحروں میں غالبؔ کی تقلید کی اور دوسرے مصرعے پلٹ کر لگائے، ہمارے جون بھائی نے بھی اسی غالبؔ کی تقلید کی، جسے وہ زندگی بھر حرفِ تنقید کا کھلا نشانہ بناتے رہے۔ البتہ جون بھائی اپنے کثیر شاگردوں کی

موجودگی میں بھی اُس حالؔی سے یقیناً محروم رہے، جو 'یادگارِ غالب' جیسی کوئی معرکہ آرا کتاب لکھ دیتا۔ یاد رہے کہ 'یادگارِ غالب' جون بھائی کی پسندیدہ ترین کتابوں میں شامل رہی۔ ویسے جون بھائی کی رنگارنگ تخلیقی شخصیت پر ایسی کوئی زندہ کتاب لکھ دی جائے تو وہ بھی امر ہو سکتے ہیں اور اس کتاب کو لکھنے والا بھی ادب میں زندہ رہ سکتا ہے لیکن اب عاشقانِ جون میں حالی صاحب کہاں سے لائے جائیں، کیوں کہ اکثر باصلاحیت اور ذہین شاگردانِ جون اور عاشقانِ جون تو جون ایلیا بننے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں، جب کہ بہت سے کم زور شاگرد اُن کی موت کے ساتھ ہی مر کھپ گئے۔

جون ایلیا کے آس پاس گزرنے والے شعرا منیر نیازی اور احمد فراز اُن سے کم شہرت نہیں رکھتے تھے بل کہ دیکھا جائے تو وہ زندگی میں جون ایلیا سے کہیں زیادہ شہرت رکھتے تھے مگر ہوا کچھ یوں کہ جون ایلیا فی الحال تو سب پر حاوی نظر آتے ہیں۔ آگے کا حال خدا جانے مگر آٹھ دس برس کے دوران تو جون ایلیا ہی چاروں طرف چھائے ہوئے ہیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ یار لوگوں نے جون ایلیا کی غزل گوئی پر جاں نچھاور کی ہوئی ہے، جب کہ اُن کے تخلیقی سرمائے کے دیگر اہم میڈیم یعنی اُن کی قابلِ ستایش نظموں اور نثر پاروں کو قدرے نظر انداز کیا ہوا ہے۔ شاید ان دونوں میڈیم تک رسائی قارئین سے زیادہ سنجیدگی، زیادہ توجہ اور زیادہ خلاّقی بھی چاہتی ہے۔ جون بھائی کی نظمیں تاریخ، فلسفے، نفسیات، سیاست، رومانیت، فطرت، معاشرت، تہذیب اور ثقافت کے دائروں سے سفر کرتی ہوئی اُن کی گوں ناگوں تخلیقی کیفیات، خیال و خواب کی نئی جہات، نفیِ ذات، تشکیک اور ندرتِ بیان سے جڑ جاتی ہیں۔ اس مقام تک رسائی جون بھائی کی سادہ و پُرکار غزل کے مقابلے میں یقیناً دشوار گزار ہے، اسی لیے یار لوگ اُن کی نسبتاً سہل دِکھنے والے طرزِ کلام تک اپنی پرواز چاہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ سادگی کے پیرائے میں جو خاص طرزِ کلام جون کا خاصا رہا ہے، اُس کی روح تک پہنچنا یقیناً کارِ محال ہی ہے۔

البتہ 'راموز' اور دیگر طویل نظموں 'درختِ زرد' وغیرہ پر گفت گو کی راہ ابھی ہموار نہیں ہوئی، ممکن ہے آنے والے چند برس کے دوران ایسا ممکن ہو سکے، جب جون بھائی کی شخصیت پرستی کی دھند کچھ کم ہو جائے اور نئی نسل میں جون بھائی کی حقیقی قدر دانی کے آثار

زیادہ واضح ہو جائیں۔ جہاں تک جون بھائی کے فکر و فن پر سچی اور غیر جانب دارانہ تنقید اور تخلیقی جائزے کا سوال ہے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کئی برس گزرنے کے باوجود ابھی تک ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آیا۔ ایک جانب جون بھائی کے ہم عصر ہیں جنھیں اُن سے اُن کی زندگی میں بھی شدید رَدوقبول کا سامنا رہا اور جو اُن کے مرنے کے بعد اُن سے مزید حسد کا شکار دکھائی دیتے ہیں، جب کہ بعد کی نسلوں میں تنقید کے سلسلے میں اچھا خاصا خلا موجود ہے۔ تاہم 'راہِ مضمون تازہ بند نہیں' کے مصداق آج نہیں تو کل حالات بدلیں گے اور آنے والے دور میں غیر جانب دار ناقد یقیناً جون ایلیا کے منفرد فکر و فن کے تخلیقی تجزیے کا حق ادا کریں گے۔ یہاں میں جون ایلیا کے حقیقی قدر دان خالد انصاری کو داد دینا چاہوں گا، جنھوں نے جون شناسی کا حق ادا کیا اور جون بھائی سے اپنے عشق کی عملی شکلیں، اُن کے پے در پے مجموعوں کی صورت میں ادبی دنیا کے سامنے پیش کیں۔ اگرچہ جون ایلیا کے تخلیقی سرمائے کے انتخاب پر یقیناً بات کی جا سکتی ہے، مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جون ایلیا آج جتنے دنیا کے سامنے ہیں، اُس میں اُن کے شایع ہونے والے مجموعوں کے اثرات بڑے واضح ہیں۔ میں جون بھائی کے رخصت ہو جانے کے بعد کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ باندھتا رہا اور جب تک اُنھیں لکھنے نہ بیٹھا، یہ سمجھتا رہا کہ وہ ایک پوری کتاب کا موضوع ہیں، مگر جب بھی اُنھیں لکھنے بیٹھا میرا ذہن اچانک خالی سا ہو گیا اور میں نے سوچا کہ میں اُن پر کیا لکھ سکتا ہوں، میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، اُن پر تو کسی بڑے ادیب، شاعر اور ناقد کو قلم اُٹھانا چاہیے۔ البتہ اسی دوران میں نے بہت سے ایسے لکھنے والوں کو جون ایلیا پر اُلٹے سیدھے قلم چلاتے بھی دیکھا جنھوں نے جون ایلیا کی زندگی میں اُن سے کبھی سیدھے منھ بات نہ کی یا ایسے نئے لکھنے والوں کو ذاتی تعلقات کی بڑھک مارتے دیکھا، جو نہ جون ایلیا کو ٹھیک طرح سے جانتے تھے، نہ مانتے تھے اور نہ اُن پر جون ایلیا کی شخصیت اور فکر و فن کی کوئی تخلیقی پرت گہرائی میں کھل سکی ہے۔ خیر، یہ جو چند اُلٹی سیدھی لکیریں میں نے بھی جون بھائی پر کھینچ دی ہیں تو یہ بھی کون سا کمال کیا ہے، جون بھائی واقعی ایک پوری کتاب کا موضوع ہیں۔ ان چند اُلٹی سیدھی کھینچی جانے والی بے ربط لکیروں کا نہیں۔ دیکھا جائے تو سب کچھ رہ گیا، جون ایلیا کے فکر و فن کی بنیادیں، اُن کا خاص اسلوب، اُن کی

خاص لفظیات، اُن کی غزل پر سیر حاصل گفت گو، اُن کی نظم نگاری کی خصوصیت، اُن کی مختصر اور رومانی نظمیں، اُن کے دل نشیں اور بے ساختہ قطعات، اُن کی طویل اور فکر انگیز نظمیں اور ان نظموں کے خاص تاریخی اور فلسفیانہ موضوعات۔ ہم عصروں میں جون ایلیا کی انفرادیت، روایت اور جدّت سے جون ایلیا کا اکتساب، میر سے اُن کی فطری مناسبت، چھوٹی بحریں اور جون بھائی کے کمالات، طویل بحروں میں جون بھائی کا جداگانہ فارسی آمیز رنگ، جون بھائی پر پڑنے والے تخلیقی اثرات، جون بھائی کے وہ خاص تخلیقی اثرات جو اُن کے ہم عصروں اور بعد کی نسلوں پر پڑے، جون بھائی کی کھلی نقالی، جون بھائی کی حیرت انگیز مقبولیت کے اسباب، جون بھائی کے باکمال انشائیے، جون بھائی کی نثری تخلیقات کا پیش منظر اور پس منظر، یہی نہیں جون بھائی کی پُر پیچ، حیران کُن اور پُر تماشا شخصیت، اُن کی باتیں، اُن کے لطیفے، اُن کے دل چسپ واقعات اور جانے کیا کیا۔ اسی لیے تو میں نے عرض کیا تھا کہ جون ایلیا کسی ایک بے رنگ، روکھے پھیکے اور سرسری مضمون کا موضوع نہیں، وہ تو ایک پوری کتاب کا موضوع ہیں۔

ہارے ہوئے لشکر کا بہادر سپاہی

خرم سہیل

جون صاحب اپنے زمانے سے تقریباً دوسو برس بعد پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب تہذیب رخصت ہورہی تھی،فن کی قدر کرنے والے بے سروساماں ہو چلے تھے۔ معاشرے کی ترجیحات تبدیل ہورہی تھیں،اب نہ کوئی مغل دربار تھا،نہ ہی کوئی واجد علی شاہ کی ریاستِ اودھ،جس کے حضور وہ اپنا فن پیش کرتے اور داد پاتے۔عہدِ حاضر،جس میں انھوں نے جنم لیا،وہ پتھر کے دور کی واپسی میں مصروف تھا،ایسے میں پھول کی بات کرنا جرم تھا، لہٰذا خوش بو کی بات کرنے والے مجرم ٹھیرے۔

اب اتنی تاخیر کی سزا تو ملنی چاہیے تھی،سو وہ انھیں مل کر رہی۔یوں تو وہ کئی جان لیوا احساسات میں مبتلا تھے مگر سب سے زیادہ پریشان کرنے والا احساس 'محبت' تھا۔رومان اور تخیل، جون صاحب کے مزاج کے دو پر تھے،جن کے بل بوتے پر وہ تخلیق کی دنیا میں محوِ پرواز تھے۔سماج میں رہتے ہوئے، انھیں ضرورت تھی کہ دنیاداری کے معاملات کو نبا کر چلتے مگر وہ کسی مخصوص ڈگر پر چلنے کے عادی نہ تھے۔دل کی گواہی پر زندگی گزارنے والے اس شاعرِ بے بدل نے بڑا اخرابہ پیدا کیا۔خارجی دنیا سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا، داخلی دنیا کو مرکز مانے بیٹھے تھے، پھر یہ تو ہونا تھا۔

جو گزاری نہ جاسکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

امروہے کی گلیوں میں ہوش تو سنبھالا مگر خود کو زندگی بھر نہ سنبھال پائے۔چوباروں

کی کھڑکیاں، گھروں کے دروازے اور چلمنوں کے پیچھے سے مرمریں انگلیاں، مسکان سے بھرے چہرے اور مجسم حسن، انھیں بے چین کیے رکھتا تھا۔ دید کی چاہ میں بے چینی، ان کے دل میں کچو کے لگاتی تھی اور درشن ہو جانے پر مسرت کی گدگدی، انھیں مدہوش کر دیتی تھی۔ ظلم کی حد تک اعتراف کر لینے کے قائل تھے، اسی لیے جب کم عمری میں محبت کا پہلا گرم جھونکا دل کو چھو کر گزرا تو گویا بے اختیار لکھ دیا۔

چاہ میں اس کی تمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی میرے رخسار کی

کم عمری میں جس نے کسی کی چاہ میں تمانچے کھائے ہوں، اس کی بے قراری کا عالم کیا ہوگا۔ زندگی کی ابتدا سے لے کر خاتمے تک، ان کے تجربات اتنے تلخ رہے، جن کی کڑواہٹ ان کی شاعری اور نثری تحریروں میں بھی ملتی ہے، جو گفت گو کرتے تھے، اس میں بھی یہ ذائقہ پوری طرح موجود تھا۔ وہ خاص طور پر ایسے معاشرے میں زندہ تھے، جہاں جمالیات بہ تدریج دفن ہو رہی تھیں۔ اسی لیے زندگی کے آخری برسوں میں اعتراف کیا۔ 'میں ہار چکا ہوں، معاشرے کو میں اپنی اقدار پہ لانا چاہتا تھا، مگر میں ہار گیا، یہ افلاطون اور کرگس کا معاشرہ نہیں ہے، یہ بونوں کا معاشرہ ہے۔' ان کی شاعری، سماج کا نوحہ تھی اور خسارے کا واویلا بھی، جس پر کوئی کان دھرنے کو تیار نہیں تھا۔

واعظ کو خرابے میں اک دعوتِ حق دی تھی
میں جان رہا تھا وہ جاہل نہیں آنے کا

یہ جون صاحب ہی تھے، جنھوں نے منافق معاشرے میں سچ کی سولی پر لٹک کر وہ زندگی گزاری، جو گزاری نہ جا سکتی ہو۔ رشتوں کی کرچیوں سے بار بار زخمی ہوئے۔ آبلہ پا، چیخ پکار کرتے کرتے خاموشی اختیار کر لی، پھر ان کے لکھے ہوئے حروف گویا ہوئے، سچائی چیخنے لگی، کیوں کہ جس معاشرے میں وہ رہتے تھے وہاں جھوٹ کا شور بپا تھا، سچائی کی آواز کان پڑی سنائی نہ دیتی تھی۔ تہذیب و تمدن اس معاشرے سے رخصت ہو رہے تھے، جون صاحب اس ہارے ہوئے لشکر کے بہادر سپاہی تھے، جو باہر کی لڑائی کو، اپنے اندر تک کھینچ لائے۔ وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے مگر معاشرے کی جہالت کے استعارے،

یادگاریں زندہ ہیں۔ جون صاحب اپنے آپ سے مکالمہ کرتے ہیں، تو ان کی اذیت دہری ہو جاتی تھی۔

میں رہا عمر بھر جدا خود سے
یاد میں خود کو عمر بھر آیا

جون صاحب نے کیفیات کو حروف میں پرو کر لکھا۔ اسی سلسلے سے یہ شاعری اور نثر پارے ہیں، جن کی زبان، ہمارے دل کی آواز لگتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ 'یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ہمیں اب ایک دوسرے کے دکھ سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔' بتائیے، یہ اذیت کا وہ مقام ہے جہاں سے پھر خاموشی گویا ہوتی ہے۔ انشائیوں میں درد کے یہ نغمے، احساس کے سینے میں پیوست ہیں، جن میں حالاتِ حاضرہ کا تذکرہ، سماج کا دکھ اور ذات کا کرب بھی پوری طرح موجود تھا۔

جون صاحب فرماتے ہیں 'ہم جو کھنکناتی ہوئی مٹی سے بنائے گئے، ہم جو خاک کے خمیر سے اُٹھائے گئے اور ہم جو خاک میں ہی سلائے جائیں گے۔ ہم فتنہ و فساد کے زمانے میں زندہ ہیں اور دہشتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے، سو ہم پر لازم آیا کہ ہم اپنے حجروں سے باہر آئیں اور مرنے والوں اور مارنے والوں کو اس الم ناک حقیقت سے آگاہ کریں کہ زندگی مارنے والوں اور مارے جانے والوں، دونوں ہی سے سوتیلی ماؤں کا سا سلوک کرتی ہے۔ کسی کو ریشم و کم خواب کے بستر پر سلاتی ہے اور کسی کو بچھانے کے لیے گدڑی بھی نصیب نہیں ہوتی لیکن موت سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے، سب کو اپنی چھاتی سے سمیٹ لیتی ہے اور سب کو ایک ہی طور خاک میں ملاتی ہے۔'

کتنی عجیب بات ہے کہ جون صاحب یہ کہہ کر چلے گئے۔ ہم نے ان کی شاعری کو تو تسلیم کر لیا مگر وہ حساس انسان، جس نے اپنی اذیتوں کو قلم بند کیا، معاشرے کے نوحے لکھے، مگر کیا ہوا؟ ہم اخلاقی انحطاط کے جس بدترین دور سے گزر رہے ہیں، وہاں ہو بھی کیا سکتا ہے کیوں کہ ہم نے ہر رشتے میں ایک ترازو رکھ دیا ہے، ہر خواب کے ساتھ ایک منفعت جوڑ رکھی ہے، ہر امید کے پیچھے معاشی اسباب اکٹھے کر رکھے ہیں۔ ایسی تجارتی فضا میں لفظ کا ذکر کون کرے، جذبے پر بات کون کرے، ہم ایک دوسرے پر سبقت لے جانے

کی کوشش میں، خود سے بھی بچھڑ چکے ہیں، اسی لیے کوئی لفظ ہم پر اثر انداز نہیں ہوتا۔
جون صاحب نے اپنی زندگی میں اگر کوئی روگ پالا بھی تو اس قدر حسین طریقے سے کہ دکھ
پھر دکھ نہ رہا۔

بے دلی کیا یوں ہی دن گزر جائیں گے
صرف زندہ رہے ہم تو مر جائیں گے
کتنی دل کش ہو تم، کتنا دل جو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

ہماری ملکی تاریخ میں کتنے لوگ ہوں گے جنھوں نے ظالموں سے بلند آواز میں مکالمہ کیا اور کیا ظالم وہی ہوتا ہے جو آپ کو ظالم دکھائی دیتا ہے، کبھی کبھی ظلمت نیکی کا روپ دھار لیتی ہے، نفرت کو محبت کا بھیس بدلنا پڑتا ہے۔ وہ ظالم جو نیکی کے لبادے میں تھے، معصوم چہرے لیے امن کی بات کرتے تھے، جون ایلیا نے اُن کو، اُن کے اندر سے گھسیٹ کے باہر نکالا، زندگی کی خوں ریزی میں جون اکثر لہولہان ہوئے، اسی رنگ میں اس نے زندگی کے فلسفے رقم کیے، جو کبھی شعر اور کبھی انشائیہ بنے، ہم میں سے کتنے چاہنے والے ہیں جو اس رنگ کو پہچان سکیں۔

زہر کے پیالے پینے والوں کے لفظ کبھی نہیں مرتے، وہ زندہ ہوتے ہیں جب ان کی معنوی منزل قریب آ جاتی ہے، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آج بہ حیثیت قوم ہمارے موجودہ حالات جو بھی ہیں، ان کی پیش گوئی جون صاحب نے بہت پہلے کر دی تھی۔ آج ہر لفظ خون کی ہولی کی ترجمانی کر رہا ہے مگر ہم وقت سے پہلے سمجھنے کے عادی نہیں ہیں بل کہ جو ہمیں کسی ایسی کیفیت سے باخبر کرنا بھی چاہے تو ہم اس کو دیوانہ اور پاگل کہہ کر مار دیتے ہیں۔ پھر وہ جون ایلیا بن جاتا ہے، جس کو دانائی ودیعت ہوتی ہے، ایسی دانائی جو نسل در نسل سفر کرے گی اور گزرتا ہوا وقت جون صاحب کو ایک نئے سرے سے دریافت کرے گا۔

کرتا ہے ہا ہُو مُجھ میں
کون ہے بے قابو مجھ میں

جانے کس کی آنکھوں سے
بہتے ہیں آنسو مجھ میں

جون فہمی اور جون شناسی کا دور تو ابھی شروع ہوا ہے۔ یہ سلسلہ ابھی چلے گا، بہت سے دل مفتوح ہوں گے، بغاوت کے کئی علم بلند ہوں گے، یہ شاعری اور نثری پارے ان کے لیے حوصلے کا منشور بنیں گے۔ بناوٹ، تصنع اور جھوٹ کے سماج سے بغاوت کرنے والوں کے لیے جون صاحب کی تخلیقات، سفر کا سنگِ میل ثابت ہوں گی۔ جون صاحب کے لکھے ہوئے انشائیوں میں سارے جہان کا درد ہے اور سماج سے مکالمہ بھی۔ درد کے قبیلے سے جڑے ہوئے فن کار، کل بھی خاموش تھے اور آج بھی خاموش ہیں، صرف جہالت بول رہی ہے۔ جون صاحب نے اپنی زندگی میں اس احساس کو بھی اپنے اندر محسوس کر لیا تھا، وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھے، انھوں نے اس بات کو مختلف زاویوں سے پیش کیا، جن میں سے ایک زاویہ یہ بھی تھا۔

میں تو صفوں کے درمیاں کب سے پڑا ہوں نیم جاں
میرے تمام جاں نثار میرے لیے تو مر گئے

اپنا دکھ جھیلنا تو کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن کسی دوسرے کا دکھ جھیلنا بہت بڑی بات ہے اور جون صاحب کے دکھوں کو کوئی سمجھے، تو سمجھ آئے گی کہ وہ کتنے بڑے شاعر اور مفکر تھے مگر یہ کون سمجھے گا کیوں کہ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے دکھ سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

سوچا ہے کہ اب کارِ مسیحا نہ کریں گے
وہ خون بھی تھوکے گا تو پروا نہ کریں گے
اِس بار وہ تلخی ہے کہ روٹھے بھی نہیں ہم
اب کے وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے

میرا محبوب شاعر

خمار بارہ بنکوی

شگفتہ اور پر کشش چہرہ، متبسم لب، میانہ قد، کشادہ پیشانی اور لہراتے ہوئے لمبے لمبے بال۔ اسی مجموعے کا خوب صورت نام ہے جون ایلیا۔ ان کے ظاہری وجود کی طرح ان کا باطن بھی صاف اور شفاف ہے۔ پہاڑی ڈھلان سے بہتے ہوئے روپہلے پانی جیسا۔ اسی لیے مجھے ان سے والہانہ محبت ہے۔ ویسے تو میں انھیں کافی عرصے سے جانتا ہوں مگر ان کی شخصیت اور ان کے فن کو جاننے پہچاننے کا موقع اس وقت ملا جب وہ میرے وطن میں کافی دنوں تک قیام پذیر رہے۔ ان کے اعزاز میں کئی ادبی محفلیں ہوئیں جہاں ان کو تفصیل سے سننے اور لطف لینے کے مواقع نصیب ہوئے۔ کئی دوسرے شاعروں کی طرح جون ایلیا بھی ہندوستان سے ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے گئے جہاں انھوں نے یقینی طور پر اپنی اور اپنے فن کی شناخت بنالی ہے۔ لیکن وطن چھوڑنے کا غم ان کی ذات کا ایک اہم جزو اب بھی بنا ہوا ہے جس پر مصلحت آمیز مسرتوں کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ شعر اُن کے کرب کا آئینہ دار ہے۔

مِل کر تپاک سے نہ ہمیں کیجیے اُداس
خاطر نہ کیجیے کبھی ہم بھی یہاں کے تھے

سادات کی مردم خیز بستی امروہہ ان کا وطن تھا۔ ہندوستان میں قیام کے دوران جب وہ اپنے وطن امروہہ گئے تھے تو ایک روز سرِ بازار زمین پر لیٹ گئے تھے۔ جب ان کے کپڑوں کی مٹی جھاڑی گئی تھی تو انھوں نے بڑے دکھ سے کہا تھا 'یار اسے نہ جھاڑو یہ میرے وطن کی خاک ہے۔'

اُن کی اسی لازوال کسک نے اُن سے یہ شعر کہلوایا ہے۔

میں تو صفوں کے درمیاں کب سے پڑا ہوں نیم جاں
میرے تمام جاں نثار میرے لیے تو مر گئے

جون ایلیا بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کے خوب صورت اسلوب نے جوانفرادیت پیدا کی ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ ان کے یہاں جذبہ وفکر کا جوامتزاج ملتا ہے وہ قابلِ ستایش ہے۔ وہ جذباتی ہوتے ہوئے بھی اپنے جذبات کی رو میں بہنا پسند نہیں کرتے اور یہی بات انھیں اپنے دوسرے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

جون ایلیا کی شاعری کے لیے ترقی کے بہت سے راستے اب بھی کھلے ہوئے ہیں اور وہ دن دُور نہیں جب وہ ترقی کے ان راستوں پر میرِ کارواں بن کر گام زن نظر آئیں گے۔

میرا یار بیلی

ذکاء الرحمان

مجھے دنیا کی ہر زبان، ہر بولی پیاری لگتی ہے۔ اُردو تو خیر میری محبوبہ ہے۔ لیکن یوں بھی ہے کہ اگر محبوبہ کوئی لفظ کثرت سے بولنے لگے...... محل بے محل، ضرورت، بے ضرورت، تو میں اس لفظ کے معنی گم کر بیٹھتا ہوں۔ انھی لفظوں میں ایک لفظ 'دوست' ہے۔ یہ لفظ، میری محبوبہ اُردو نے کثرتِ استعمال سے کم از کم میرے لیے، لا لفظ کر دیا ہے۔ اسی لیے میں نے جون کو یار بیلی کہا ہے، دوست نہیں کہا۔ اگر آپ نے میری طرح، پاکستان کے جنوبی علاقے کی جانگلی بستیوں میں اور چھوٹے چھوٹے پُرسکون قصبوں میں اور ٹاہلی اور شرینہ کے گمبھیر چھتنار درختوں کے خنک سایوں تلے آباد دیہات میں، پورے پورے گہرے گہرے سانس لیے ہیں تو آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ وہاں یار بیلی کا لفظ اپنی معنوی حرارتوں سے محروم نہیں ہوا بل کہ اس لفظ میں اتنی جذباتی شدّتیں گھلی ہوئی ہیں کہ خون کے رشتے بھی اپنی تمام حرارتوں اور شدّتوں کے ساتھ موجود ہونے کے باوجود، یار بیلی پر فوقیت نہیں رکھتے۔ وہاں، آج بھی اگر بھائی دایاں بازو ہے تو یار بیلی پورا بدن ہے، ساری جان ہے۔

جون کا اور میرا یار بیلی پن، پاکستان کے جنوبی علاقے ہی کے ایک شاداب گاؤں سے، سادہ اور پُرسوز اور دھیمے دھیمے سروں والے کسی دیہی گیت کی طرح شروع ہوا حالاں کہ جون آج تک میرے گاؤں نہیں گیا اور میں نے بھی آج تک اس کا امروہہ نہیں دیکھا، جہاں آم کے درخت خودرو ہوتے ہیں اور جہاں بزرگوں کے مزاروں پر بچھو بھی

ڈنک مارنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ بہ ظاہر بہت عجیب بات ہے لیکن اتنی عجیب بات بھی نہیں ہے۔ یہ گیت اگر مرے گاؤں سے آغاز نہ ہوتا تو جون کے امروہے سے ابتدا ہو جاتا۔ گیت کسی کے اور کہیں کے پابند نہیں ہوتے۔ اس گیت کی مرضی کہ مجھ سے اور میرے گاؤں سے پہل ہوا۔

میرا گاؤں اور میں......ہم دونوں اس زمانے میں بھی اور آج بھی، بارہ مہینے سرل سرل بہتی ہوئی ایک ندی کے پہلو میں آباد ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس زمانے میں گاؤں کے عین بیچوں بیچ وکٹورین طرزِ تعمیر والی ایک حویلی تھی، اب نہیں ہے۔ میری سال ہا سال کی عدم موجودگی میں اس حویلی کو سیم اور تھور کی چڑیلیں چاٹ گئی ہیں۔ آج کل میرا چھوٹا بھائی اور میں، اس حویلی کی جگہ ایک نئی حویلی، آہستہ آہستہ تعمیر کرنے میں مصروف ہیں۔ ہاں تو گاؤں کے بیچوں بیچ ایک وکٹورین طرزِ تعمیر والی حویلی اور اس حویلی کے مردانے میں مشرقی جانب، میرا کمرا......کمرے میں کتابیں اور رسالے اور مختلف رنگوں کے قلم اور کمرے کے کشادہ دریچوں سے باہر قلمی آموں کے گہرے سبز درختوں کی گھنی قطار اور اس گھنی قطار سے پرے فیّاض دلوں کی طرح کھلے کھیت دُور تک پھیلے ہوئے۔ ایسے میں اگر کوئی چاند شرمیلی اور سورج تپاں مٹیاروں کے دلوں کی دھڑکن بھی ہو، تو اس پر فلک الافلاک سے خوب صورت اور اعلیٰ لفظ نازل نہ ہوں تو کیا نازل ہو؟ مجھ پر بھی خوب صورت اور اعلیٰ لفظوں کا نزول ہوتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے میرا مقدر ٹھیرا......خوب صورت اور اعلیٰ لفظوں کے پہلے پہلے نزول کے پہلے پہلے لمحے اپنے ساتھ ایک نویں نکور سی، پر اسرار سی سرشاری لے کر آتے ہیں اور یہ سرشاری ہمارا بازو تھام کر ہمیں اپنے سے پہلے والوں کی سرشاری کی طرف لے جاتی ہے۔ جب مجھے اپنے سے پہلے والوں کی سرشاری کی طرف لے جایا گیا تو ان میں ایک سرشار، اپنے لفظوں کے درمیان رقصاں و مستاں، بہت اچھا، بہت پیارا، بہت یار بیلی لگا۔ یہ موسمِ سرما کی ایک چاندنی رات کا دوسرا پہر تھا۔ آج تیرے تکلفات دل پہ گراں گزر گئے اور اس رات کے اس دوسرے پہر، رات کی رانی جیسی مہکیلی اور ان کھلی کلیوں جیسی نخریلی مٹیار کے تکلفات دل پر بہت گراں گزرے تھے اور باہر کپاس کے کھیتوں پر چھائے ہوئے سرمائی آسمان پر درمیانی تاریخوں کا چاند اک البیلا کسان شاعر تھا کہ اپنی

کرنوں سے، سادہ اور پرسوز اور دھیمے دھیمے سروں والا دیہی گیت بن رہا تھا...... آج تے میرا دل توڑ گئی ایں، نی مٹیارے نخرے والئی اے...... آج تیرے تکلفات دل پہ گراں گزر گئے...... یہ جون کے اور میرے یار بیلی پن کا پہلا گیت تھا...... اس گیت میں، جون سے میں پہلی بار ملا۔

اور پھر یہی ہوا کہ جون کی اور میری یہ پہلی ملاقات، میری زندگی کے پے در پے حادثوں کی دھول میں اتنی دھندلا گئی کہ کئی برسوں تک یاد ہی نہیں آئی...... پہلے میرے دادا کی موت اور چند ہی ماہ کے وقفے کے بعد والد کی وفات...... میرے کندھوں پر فیوڈل نظام کی ساری لعنتوں اور ساری خباثتوں اور سارے حادثوں کا بوجھ...... قانونی اور غیر قانونی مقدموں کی بھرمار، عدالتوں اور تھانوں کے چکر، اندر کے ادیب کا سرکاری افسروں سے ٹکراؤ اور اس ٹکراؤ کے خطرناک نتائج...... اب مجھ پر خوب صورت اور اعلیٰ لفظوں کے نزول کے ساتھ ساتھ اُداسیاں اور بیابانیاں بھی اُترتی تھیں...... لیکن اس سب کچھ کے باوجود، میرے باطن میں پرورش پاتا ہوا ادیب زندہ رہا۔ لفظوں سے میرا رشتہ نہ ٹوٹ سکا...... شاید ایسے پکے رشتے، نزدیکی رشتے نہیں ہوتے۔ اَن بدل اور اَن مِٹ لوحِ محفوظ پر کندہ ہوتے ہیں۔

میں لعنتوں اور خباثتوں اور حادثوں سے پاگلوں کی طرح لڑا...... ایسی لڑائیوں میں عموماً پاگل ہی فتح مند ہوتے ہیں، سو میں فتح مند ہوا۔

فتح مندی کے آغاز میں، میرے ہاتھ بس یوں ہی، انگریزی کا ایک ناول آ گیا۔ کسی گم نام سے امریکی ناول نگار کا ناول تھا اور ناول کا مرکزی کردار 'کاپی رائٹر' تھا۔ میں ایک نوخیز دیہی ادیب، میں نے اس سے پہلے کبھی 'کاپی رائٹر' کا لفظ پڑھا تھا، نہ سنا تھا۔ اس ناول سے معلوم ہوا کہ شہروں میں اشتہاری کمپنیاں ہوتی ہیں جو اشتہار لکھنے کے لیے باقاعدہ ملازم رکھتی ہیں اور ان 'اشتہاری لکھاریوں' کو 'کاپی رائٹر' کہا جاتا ہے اور یہ کاپی رائٹر بڑی توپ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کاپی رائٹر کے بارے میں کوئی اور تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ گاؤں سے لاہور تو آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ ایک روز میں لاہور میں اپر مال روڈ پر اپنی کار میں جا رہا تھا کہ اچانک میری نظر بائیں جانب،

ایک وسیع وعریض بنگلے کی طرف اُٹھ گئی۔ بنگلے کے صدر دروازے پر ایک اشتہاری کمپنی کا بڑا سا، سائن بورڈ نصب تھا۔ میں نے اپنی کار بنگلے کی طرف موڑ دی۔ اندر جا کر معلوم ہوا کہ کراچی کی ایک بہت بڑی اشتہاری کمپنی کا ذیلی دفتر ہے۔ میں نے کمپنی کے کاپی رائٹر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بتایا گیا کہ کاپی رائٹر بل کہ کئی کاپی رائٹر، کراچی کے مرکزی دفتر میں کام کرتے ہیں، ذیلی دفتر میں فی الوقت کوئی کاپی رائٹر نہیں ہے۔ میں نے بلا سوچے سمجھے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ تنخواہ وغیرہ کی پروا نہیں تھی، صرف یہ جاننے کی خواہش تھی کہ 'رائٹر' انگریزی میں ادیب کو کہتے ہیں، یہ کاپی رائٹر کس قسم کا ادیب ہوتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ میری پیش کش قبول کر لی گئی اور مجھے ذیلی دفتر میں بہ طور کاپی رائٹر ملازمت مل گئی۔ تین سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ یہ میری زندگی کی پہلی ملازمت تھی۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں مشغلے کے طور پر صرف تین ملازمتیں کی ہیں اور ان ملازمتوں کا عرصہ کل سات ماہ بنتا ہے۔

مجھے دفتر میں بیٹھتے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک روز کمپنی کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر صاحب ایک روشن سانولے چہرے، اور لمبے بالوں والے منحنی سے نوجوان کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں کہ اس سے پہلے کہ ڈائریکٹر صاحب ہمیں متعارف کرواتے، نوجوان نے 'آپ جناب' کے تکلف میں پڑے بغیر، چھوٹتے ہی کہا:

'تم ذکاءالرحمان ہو'......؟

میں تو تھا ہی گنوار دیہاتی، میں نے 'تم' کا تکلف بھی اُٹھا دیا۔

'اور تُو جون ایلیا ہے......؟'

یہ جون کی اور میری، پہلی رُو بہ رُو ملاقات تھی......

جون ایلیا اس زمانے میں بھی کراچی میں رہتا تھا، آج بھی کراچی میں رہتا ہے۔ مجھے، کراچی کے نام سے ہی وحشت ہوتی تھی...... کہاں ایک چھوٹے سے گاؤں کا باسی اور کہاں کراچی جیسا ساٹھ ستر لاکھ کی آبادی والا (اب تو شاید ایک کروڑ کی آبادی والا) کاسموپولیٹن شہر...... میں تو اس زمانے کے پر سکون لاہور ہی میں ایک دو ہفتوں کے بعد

گھبراجاتا تھا اور واپس اپنے گاؤں کی طرف دوڑتا تھا...... مجھے کیا خبر تھی کہ آنے والے دنوں میں، حالات کا پراسرار دھارا میرے سارے خاندان کو ایک دن کراچی کی طرف دھکیل دے گا۔

کراچی منتقل ہونے کے بعد جون سے ملنا جلنا شروع ہوا تو یوں لگا جیسے ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، جیسے جون میرے گاؤں میں میرے خاندان میں پیدا ہوا تھا یا جیسے میں نے امروہے میں جون کے گھرانے میں جنم لیا تھا۔ وہی بچپن کے ہم جولیوں جیسی لڑائیاں اور جھگڑے اور ناراضیاں، وہی بچپن کے ہم جولیوں جیسی محبتیں اور الفتیں اور انسیتیں۔

ہم دونوں کا طریق امیری نہیں، فقیری ہے اور ہم دونوں اس زمانے میں، جلالی فقیر تھے...... اب تو جون کے جلال پر جمال غالب آ گیا ہے، لیکن ان دنوں وہ اگر شعلہ جوالہ تھا تو میں آتش بلا خیز...... ہم کراچی میں جس طرف بھی نکلتے تھے، آگ بکھیرتے ہوئے نکلتے تھے...... 'معزز شہری' اور 'معزز شہریوں جیسے ادیب اور شاعر' ہم سے پناہ مانگتے تھے...... جون عالم فاضل آدمی ہے...... اب تو خیر اس میں علمی انکسار آ گیا ہے لیکن ان وقتوں میں وہ میری طرح سرشور آدمی تھا۔ انھی دنوں کی بات ہے کہ ہم چند دوست، رات کے پچھلے پہر کراچی کی سڑکوں پر محوِ آوارگی تھے کہ ایک خاصے مشہور مگر علمی اعتبار سے خالص کورے شاعر دوست نے خبر نہیں کیا بات کہہ دی کہ جون اتنے جلال میں آ گیا کہ ان کی ٹھکائی کرنے پر اُتر آیا۔ وہ بے چارے شاعر، حالاں کہ جثّے میں جون سے دگنے ہیں لیکن اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ ہکلانے لگے...... جون نے ان کی عملاً پٹائی کی یا نہیں...... یہ میں نہیں بتاؤں گا۔

ایسے تھے میرے چچا جون ایلیا

رُخسار امروہی

چچا جون ایلیا کی شاعری، اُن کا انوکھا طرزِ سخن اور ادبی بانک پن، جس نے شائقینِ ادب اور قارئینِ شعروسخن کا دل جیتا اور اُردو زبان کی چاشنی کا لوہا منوایا۔ اُن کا عربی فارسی زبانوں پر عبور، غرض کہ شاعری، ادب اور فلسفے کے حوالے سے اُن کے فن پر تو ملک اور بیرونِ ملک کے عالم و فاضل نقادِ ادب ہی روشنی ڈال سکتے ہیں اور اُن کی ادبی صلاحیتوں کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ میں تو اُن کی بھتیجی ہوں۔ میں نے جس طرح اُن کی ذات اور شخصیت کو دیکھا ہے، سمجھا ہے، پڑھا ہے، چاہا ہے، بس اُن ہی جون ایلیا کو میں اپنی یادوں کے نہاں خانوں سے نکال کر قارئین کے سامنے لانا چاہتی ہوں۔

چچا جون ایلیا کی شخصیت کو دائرۂ تحریر میں لانا یقیناً ایک دُشوار مرحلہ ہے۔ اُن کی باتیں، اُن کے قصے، اُن کی شاعری، اُن کا لہجہ، اُن کی بے انتہا حسّاسیت، جذباتیت، معشوقیت، غرض کہ وہ بے پناہ خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اُن کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے، لکھا جائے، دہرایا جائے، افسانۂ جون ایلیا مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اُن کے ہزار ہا قصے آنے والی نسلیں بھی ہمیشہ دہراتی رہیں گے۔

میں شاید چھ یا سات برس کی رہی ہوں گی۔ اُس وقت کی دھندلی دھندلی یادیں آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور بچپن کی یادیں ہی تو آج میرا سب سے قیمتی سرمایہ بھی ہیں۔

ادب اور آموں کی مہک سے بسے ہوئے شہر امروہہ کے محلّہ لکڑا کے مشہور بڑے مکان کے کنواں کنارے والے محراب دار وسیع دالان میں چھوٹے دادا شفیق حسن ایلیا یعنی چچا جون کے والد محترم اپنے آخری ایام ضعیفی گزار رہے تھے اور اکثر اسی بڑے مکان کے دالان میں بھاری بھرکم پایوں والے ایک بڑے سے پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ شاید اُن کے ہاتھ کے اُوپری حصے (کندھے) میں درد رہا کرتا تھا۔ شہر کے معزز حضرات اُن سے ملاقات کے لیے بڑے مکان میں آیا کرتے تھے۔ بڑی چہل پہل رہا کرتی تھی، رونقوں اور ادبی نشستوں کا دَور تھا۔ بڑا مکان ایک شاہی دربار کی علامت جیسا محسوس ہوا کرتا تھا۔ حقے تازہ ہوتے تھے اور چلمیں بھری جاتی تھیں، جن پر خوب صورت سرپوش رکھے ہوتے اور جن کے تمبا کو کی مہک مکان کو مہکائے رکھتی تھی۔

میری پرورش علم و ادب کے اسی زرخیز گہوارے میں ہوئی لیکن جب تک میں نے ہوش سنبھالا، میرے یہ چاروں تائے چچا، رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی، سیّد محمد عباس اور چچا جون ایلیا تقسیمِ وطن کے بعد پاکستان چلے گئے۔ سب سے آخر میں چچا جون ایلیا رُخصت ہوئے۔ وہ کس دن اور کس وقت اور کس حالت میں امروہہ سے بچھڑے، مجھے تفصیل یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ اُس دن خاندان کے تمام افراد بے چین تھے اور عجیب سا سحر زدہ غم گین ماحول بنا ہوا تھا۔

میں اُسی حویلی نما بڑے مکان کے پچھلے حصے والے مکان میں تنہا اپنی اماں کے ساتھ بچپن کے دن گزارتی رہی، بچھڑے ہوئے رشتوں کو ڈھونڈتی رہی، خالی خالی گھروں کے سناٹے جھیلتی رہی۔ روزانہ اُسی بڑے مکان کے دالان اور صحن سے گزر کر اسکول جاتی اور پھر اپنی ہم جولیوں کے ساتھ کھیلنے بھی جایا کرتی۔ دھیرے دھیرے میں نے اس مکان کو ایک کھنڈر میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑا مکان جو چھوٹے دادا شفیق حسن ایلیا اور اُن کے بیٹوں کے نام سے منسوب تھا، بٹوارے کے بعد جب سب پاکستان چلے گئے تو وہ مکان بھی خالی سناٹے، ویرانگی اور اُداسیاں نہ جھیل سکا اور وقت کی آندھیوں کی زد میں آ کر اس کی چھتیں اور دیواریں بوسیدہ ہو کر اینٹ اینٹ گرتی رہیں اور آخر کار وہ بس ایک بڑے سے چبوترے کی شکل میں رہ گیا، جہاں سے گزرتے وقت نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا

کہ وہ ساری ہستیاں، وہ شفیق بزرگ مجھے آتے جاتے اور کھیلتے ہوئے دیکھا کرتے ہیں، میرا حصار کرتے ہیں۔ میں تو اندھیری راتوں میں بھی وہاں کبھی نہیں ڈری، میں اپنے اطراف میں اُن کے علم و ادب اور محبت کی روشنی کا ایک ہالہ سا محسوس کرتی تھی۔

میں اپنے بچپن کے زمانے سے ہی اپنے والدین اور اپنی چہیتی پھوپھی شاہ زناں نجفی سے اپنے قابل اور ذہین تائے چچا کے قصے سنتی رہی اور ہمیشہ اُن کے ناموں پر اتراتی پھری۔ پھوپھی نجفی اپنے چاروں سگے بھائیوں کے پاکستان چلے جانے سے اندر ہی اندر مرجھا گئیں۔ خاص طور سے چچا جون ایلیا، جن سے وہ بے حد مانوس تھیں، اُن کی جدائی کا غم انھوں نے بڑی ہمت و استقلال کے ساتھ جھیلا۔ پھوپھی نجفی اپنے بھائیوں پر جن میں میرے بابا کمال امروہی بھی شامل ہیں، ہمیشہ فخر کرتی رہیں۔ اُن بھائیوں کی گفت گو، جو شاعری، فلسفہ اور تاریخ پر بحث و مباحثہ بنی رہتی تھی، آج تک دہرایا کرتی ہیں۔ میں اُن کی زبانی اپنے خاندان کے افراد کی قابلیت، علم و ہنر کے قصے سن کر بڑی خوشی محسوس کرتی ہوں۔

وقت کا پہیا گھومتا رہا۔ پھر ایک دن شور اُٹھا کہ چچا جون ایلیا امروہہ آرہے ہیں۔ ایک عرصہ دراز کے بعد 1974ء میں جب وہ آئے تو ریلوے اسٹیشن پر اُتر کر انھوں نے سب سے پہلے سرزمینِ امروہہ کو دوزانو ہو کر چوما، اپنے چہرے اور سر پر امروہہ کی خاک ملی اور پھر سب سے مِل مِل کر روتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ سال ہا سال کے بعد اپنے گھر لوٹ کر آنے پر اُن کی جو کیفیت تھی، وہ بیان سے باہر ہے۔ کبھی زمین پہ لیٹ جاتے، کبھی دیوار پر چڑھ جاتے، ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اُن کی آمد پر خالی مکان میں پھر چہل پہل اور رونق ہو گئی تھی۔ امروہہ آ کر وہ بہ مشکل ہی کسی وقت گہری نیند سوئے ہوں گے۔ مسلسل بولتے تھے، روتے تھے۔ تلفظ اور زبان کی اغلاط پر ہم سب کو ٹوکتے تھے، شہر بھر میں گھومتے تھے، بچھڑے ہوئے لوگوں سے، اپنے پُرانے یار دوستوں سے ملتے تھے۔ اُن کے دوست احباب اُن کو ہر وقت گھیرے رکھتے تھے اور وہ سب کے ساتھ محفلیں جمائے رکھتے۔ مختار حسین تاباں نقوی، جن سے وہ بڑی قربت محسوس کرتے تھے، بھائی رئیس نجمی، بھائی نہال احمد صدیقی، شریف بھارتی صاحب، پروفیسر شریف احمد صاحب، حکیم کلب علی صاحب شاہد، پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب، مولانا عبادت صاحب قبلہ......

غرض کہ اُن کا حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا۔

1974ء میں چچا جون ایلیا کی موجودگی میں ہی وہ بڑا مکان دوبارہ تعمیر ہونا شروع ہوا۔ میرے بابا اُسی بڑے مکان کی دہلیز سے مجھے ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ وہ سانحہ 1976ء میں ہونا قرار پایا تھا۔ لہٰذا دیواریں چنی جانے لگیں اور چچا جون ایلیا واپس پاکستان جانے سے پہلے لکھوری اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر بار بار روتے رہے اور میں بھی اُن کے ساتھ آنسو بہاتی رہی۔

اُن دنوں چچا جون ایلیا کی امروہہ آمد پر شہر بھر میں دعوتوں اور ادبی نشستوں کا اہتمام روز کا معمول بن گیا تھا۔ چچا جون بڑے حسّاس طبیعت تھے، تب اُنھوں نے شعر کہا۔

مِل کر تپاک سے نہ ہمیں کیجیے اُداس
خاطر نہ کیجیے، کبھی ہم بھی یہاں کے تھے

چچا جون ایلیا کے امروہہ کی رہائش کے وہ دن مجھے خوب یاد ہیں۔ نہ جانے رات کے کس پہر میں اُن کی آنکھ ذرا دیر کو لگتی ہوگی اور میری امّاں تڑکے اذانوں کے وقت اُن کے لیے چائے لے کر اُن کے سرہانے کھڑی ہو جاتیں اور پکارنے لگتی تھیں ’جون اُٹھو...... چائے پی لو‘ اور بے چارے چچا جون نیند اور بے خوابی کے عالم میں بڑی محبت اور تابع داری کے ساتھ یہ کہہ کر کروٹ بدل لیتے تھے...... ’بھابی جی، میری ماں آپ چائے میز پر رکھ دیجیے، میں ابھی اُٹھ کر پی لوں گا۔‘

اور اماں بے چاری چائے ٹھنڈی ہونے کی فکر کرنے میں لگ جاتی تھیں اور یہ سمجھ ہی نہیں پاتی تھیں کہ جون آدھی رات کے بعد کس حالت میں اور کیا دوا پی کر سویا ہے۔ بڑی معصومیت سے کہا کرتی تھیں...... ’جون کو نیند کیوں نہیں آتی، وہ تو نیند کی دوا پی کر سوتا ہے، لکھتا رہتا ہے، نماز کے وقت بھی اُٹھ نہیں پاتا۔ اب یہ چائے بھی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو جائے گی۔‘

چچا جون ایلیا لوگوں کی تنقید کے جواب میں اکثر کہا کرتے تھے کہ...... ’سب سمجھتے ہیں کہ جون شراب پیتا ہے، ارے بھئی یہ تو زندگی کا زہر ہے جو میں اپنے جسم میں اُنڈیلتا ہوں۔‘

اماں کو اپنے دیور جون ایلیا سے اس قدر محبت تھی کہ جب میرے ماموں محمد علی حیدر نقوی (منا) کی مکتب کے موقع پر خاندان کی لڑکیاں، بالیاں گیت گا رہی تھیں تو اماں یہ چاہتی تھیں

کہ اُن کے دیور جون ایلیا کا لکھا ہوا گیت گایا جائے۔ جب لڑکیوں نے اُن کی فرمائش کو درگزر کر دیا تو انھوں نے ڈھولک ہی اُٹھا کر صحن میں پھینک دی اور ناراض ہو کر کہا کہ اگر جون کا گیت نہیں گایا جا رہا ہے تو پھر کوئی بھی گیت نہیں گایا جائے گا، بس!'

1993ء میں جب بابا کمال امروہی کا انتقال ہوا تو اُن دنوں چچا جون ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ بابا کے آخری وقت میں وہ اُن کے سرہانے ہی بیٹھے ہوئے تھے اور جیسے ہی بابا کی آنکھیں بند ہوئیں، نبض تھمی، چچا جون چیخنے لگے...... 'بھائی چندن آنکھیں کھولیے...... چندن بھائی آپ ایسے نہیں مر سکتے۔'

14 مارچ، 1993ء کو میرے بابا کمال امروہی کا چہلم تھا۔ اُن دنوں چچا جون دہلی میں میرے ماموں (ممّا) کے یہاں منٹو روڈ پر قیام پذیر تھے۔ انھوں نے شام کے وقت بھائی انیس امروہوی کو بلوایا اور کہا کہ میرے عظیم بھائی کمال کا چہلم امروہے میں ہونا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اُن کی شخصیت اور فلمی دنیا میں اُن کی حیثیت کے مطابق ایک شان دار پوسٹر امروہے کے ہر محلے، گلی، کوچے میں چسپاں ہو۔ لہٰذا انھوں نے بابا کے بارے میں ایک شان دار تعارف اور ایک پُر اثر نظم لکھ کر دی۔ بھائی انیس امروہوی نے وہ پوسٹر بہت بڑے جہازی سائز پر پرنٹ کروا کر دیا جو چہلم کی اطلاع کے طور پر امروہہ کی دیواروں پر لگا۔ نظم کے چند اشعار یوں تھے۔

جس کی ہر بات ہو کمال کی بات
کیا کہیں ایسے بے مثال کی بات
آپ کو کیسے نیند آئی ہے
یہ تو ہم سب سے بے وفائی ہے
رنگ نے لی ہے آخری ہچکی
حسن و فن نے شکست کھائی ہے
دل نے دھڑکن کا ساتھ چھوڑا ہے
شمع نے روشنی گنوائی ہے

سرنگوں ہو گئی ہے اک تاریخ
ایک تہذیب لڑکھڑائی ہے
ہونے والا ہے آخری دیدار
باادب، باملاحظہ، ہشیار!
تھا وہ نام و نشانِ امروہہ
رونقِ خاندانِ امروہہ
اس کے غم میں سیاہ پوش ہوئی
سرخیٔ داستانِ امروہہ
اس کا غم سارے شہر کا غم ہے
تھا وہ جانِ جہانِ امروہہ
ایک تہذیب مر گئی یعنی
اک قیامت گزر گئی یعنی
جان جو خود ہی تھی خبر اپنی
ہے گلہ بے خبر گئی یعنی
زندگی بھر کی ایک آن سے ہار
دل کو حیران کر گئی یعنی
لمحہ لمحہ پڑھا کرے انسان
نوحۂ کل من علیہا فان!

اُس دور میں جب بابا کی جدائی کا غم گھر پر پہاڑ کی طرح بھاری تھا، میں بہت ہراساں تھی، رویا کرتی تھی تو اس وقت چچا جون ہی تھے جنھوں نے ایک باپ کی ہی طرح میرے سر پر ہاتھ رکھا، مجھے شفقت بھری تسلیاں دیں، میری ہمت اور حوصلہ بڑھایا اور میرے ہاتھ میں قلم تھمایا۔ اُنھوں نے نہ جانے اپنے کس یقین کے ساتھ مجھے یہ باور کرایا کہ بٹیا تو شاعرہ ہے، میرے خاندان کی آخری شاعرہ۔ تو شاعری کر، خوب لکھ، رویا نہ کر

ورنہ تیری صلاحیتیں آنسوؤں کے ذریعہ بہہ جائیں گی۔ تو رائیگاں مت ہونا میری طرح۔ تو ہی تو میرے خاندان کی تخلیقی روایت کو باقی رکھے گی۔"

جنوری 1999ء میں چچا جون ایلیا دوحہ قطر میں اپنی بھانجی زہرہ (منّی) کے یہاں قیام پذیر تھے۔ میرے حالات سے وہ بہ خوبی واقف تھے، لہٰذا وہاں سے انھوں نے مجھے ایک منظوم خط لکھا۔ اُسی خط سے صرف تین بند یہاں قارئین کے لیے پیش کر رہی ہوں، جس سے چچا جون کی سوچ وفکر اور میرے لیے اُن کی شفقت اور محبت، فکرمندی اور خلوص کا پتا چلتا ہے۔

تو امیرؔ و نصیرؔ کی ہے جان
اور نفیسؔ و انیسؔ کی ہے آن
تو وحیدؔ و شفیقؔ کی ہے اُمید
تو ہے اِک نسلِ نازنیں کی نوید
تو رئیسؔ و کمالؔ کا ہے کمال
وارثِ فن ہے تو میری مرے لال

میں تیرے غم تمام سہتا ہوں
اور بس اشک بار رہتا ہوں
بے پناہ زخم کھائے ہیں میں نے
خوب شیشے چبائے ہیں میں نے
وقت زخموں کا میرے بھوکا ہے
عمر بھر میں نے خون تھوکا ہے
میری جان تو یہ کھیل کھیلیو مت
کوسنے دیجو، غم کو جھیلیو مت

اے امیرؔ و نصیرؔ کی ناموس
اپنے ہونٹوں سے اپنا خون نہ چوس
مجھ سے اب اور تجھ سے ہے روشن
خانۂ حضرت امیر حسن
دو ہی شاعر ہیں اب مرے گھر میں
یعنی ہم آج بھی ہیں منظر میں
ایک میں ہوں جو رائیگاں ہی گیا
بے نمود اور بے نشاں ہی گیا
اور ایک تو ہے فن کا تازہ خوں
شاعری کا عجیب تر مضموں
نورِ چشم اب تو ہوش میں آجا
یعنی سحرِ سروش میں آجا
کہ قلم ہی تو بس ہمارا ہے
اپنا اُس پر ہی تو اجارہ ہے
آخری شاعرہ مرے گھر کی
تو نے ہی تو مری مہم سر کی
راحتِ جان بھول جا سب کچھ
ہے ترے فن کا معجزہ سب کچھ
قلم کا زورِ بے مثال دکھا
اَب مرے گھر کا تو کمال دکھا
نام کو گھر کے جاویدانی کر
شعر کے فن پہ حکم رانی کر

میں نہیں جانتی کہ میں اُن کے اس یقین پر کہاں تک پوری اُتر پائی، مگر میرے دل کو اطمینان ضرور ہے کہ یقیناً اُن کی روح مجھ سے خوش ہوتی ہوگی کہ میں نے اُن کی خاندانی وراثت کو محفوظ کرنے کی کوشش ضرور کی، یعنی چراغ ابھی جل رہے ہیں!

زندگی نے کس کس طرح کروٹ بدلی کہ خود بہ خود میں اس بڑے مکان کی مجاورہ بن گئی۔ 1998ء میں جب میں کراچی سے واپس آ رہی تھی اور اس رات اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی کہ چچا جون آئے اور انھوں نے میرے کپڑے سوٹ کیس میں سے نکال دیے اور خود اپنے گھٹنے موڑ کر سوٹ کیس میں لیٹ گئے اور روتے ہوئے کہتے رہے کہ بٹیا، تو مت جا...... یا مجھے بھی اس سوٹ کیس میں ڈال کر سب سے چھپا کر اپنے ساتھ ہندوستان لے چل۔ میں اُن کی ضد پوری نہ کر سکی اور اُن سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ کاش میں اُن کی اس خواہش کو پورا کر پاتی......؟

چچا جون ایلیا آج ہم سب کے دلوں میں تو آباد ہیں ہی...... وہ دربار شاہ ولایتؒ میں بھی ہیں، اندھیریا مسجد میں، عیدگاہ میں، پانباڑی کے اطراف میں، بائیں کے کنویں پر، کربلا کے اُداس ماحول میں، چاہ شور کی خاموشی میں، ملانہ کی چہل پہل میں، لکڑوں میں، دوست علی کی امام بارگاہ میں، سیّد المدارس میں، چھوڑے اور گھیر پچھیاں میں، شفاعت پوتہ اور بیگم سرائے میں، ٹھنڈی سڑک کی چہل قدمی اور آموں کے باغوں کی مہکار میں، بان ندی کے شفاف پانی کی چمک دار سطح پر اور مراد آبادی دروازے سے نکلی رہ گزر پر، چاہ غوری کی چوبی من پر، جھنڈا شہید میں مولانا نسیم احمد فریدی کی بارگاہ میں۔ غرض امروہہ کی کون سی ایسی جگہ ہے جہاں چچا جون ایلیا کی یادیں آباد نہیں ہیں۔

امروہہ سے اُن کی والہانہ وابستگی کا ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھول پاتی۔ جب وہ دہلی میں اپنی بہن شاہِ زناں نجفی کی بیٹی نغمہ پرویز نقوی کے یہاں دل شاد گارڈن کے مکان میں پہنچے تو کہنے لگے کہ 'مجھے تھوڑا آرام کرنا ہے، میرا پلنگ ایسے رُخ پر بچھا دو کہ میرا سرہانا امروہے کی طرف رہے تاکہ اُدھر سے آنے والی ہوا سب سے پہلے میرے سر اور چہرے کو چھوئے۔'

چچا جون ایلیا بچپن سے ہی بان ندی سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ بان ندی کا ذکر بار بار اُن کی شاعری میں آتا رہا ہے۔ امروہہ سے بچھڑ کر وہ کبھی، کہیں بھی خوش نہیں رہے۔

اُن کی بے چینی اور کرب کا احساس اس شعر کے ذریعے بھی ہوتا ہے۔

اس سمندر پہ تشنہ کام ہوں میں
بان تم اب بھی بہہ رہی ہو کیا

بان ندی کے فراق میں ہی ایک شعر یوں بھی کہا۔

اے شفق وہ کہاں سمندر میں
تیرے جو رنگ اپنی بان میں تھے

سولہ برس کے بن باس کے بعد جب امروہہ آئے تو اُن کے ان اشعار نے سب کو رُلا دیا۔

ہم تو جیسے وہاں کے تھے ہی نہیں
بے اماں تھے اماں کے تھے ہی نہیں

اب ہمارا مکان کس کا ہے
ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

ہم کہ ہیں تیری داستاں یک سر
ہم تری داستاں کے تھے ہی نہیں

اُن کو آندھی میں ہی بکھرنا تھا
بال و پر آشیاں کے تھے ہی نہیں

ہو تری خاکِ آستاں پہ سلام
ہم ترے آستاں کے تھے ہی نہیں

ہم نے رنجش میں یہ نہیں سوچا
کچھ سخن تو زباں کے تھے ہی نہیں

دل نے ڈالا تھا درمیاں جن کو
لوگ وہ درمیاں کے تھے ہی نہیں

اُس گلی نے یہ سُن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

جب چچا جون ایلیا کے انتقال کی روح فرسا خبر ملی تو عجیب سی بے بسی کا سا عالم تھا، مجبوریاں تھیں، فوری طور پر پاکستان جا کر اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھنا تو ممکن نہیں تھا، لہذا میں بان ندی پر پہنچی، اس کے پانی میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گئی اور فاتحہ بھی پڑھنے لگی۔ اُن کی روح وہاں ضرور آئی ہوگی۔ پھر میں جب پاکستان گئی تو وہاں اُن کی قبر پر لکھا دیکھا۔

میں بھی بہت عجیب ہوں، اِتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

جانے کتنی دیر تک میں اُن کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر روتی رہی اور اُن کی کرب ناک زندگی کا تصور کر کے دل پاش پاش ہوتا رہا۔

ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

ڈاکٹر رضوان احمد

8 نومبر 2002ء کی شب کراچی میں جون ایلیا کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے 72 برس کی عمر پائی۔

مجھے یہ خبر کئی دنوں بعد ملی مگر یادوں کا ایک ایسا سیلاب تھا جو اُمڈا آتا تھا اور میرا قلم ان کو اپنی گرفت میں لینے سے قاصر تھا۔

مجھے سب سے پہلے تو یہ خیال آیا کہ جس شہر کی سرزمین اس شخص کے تلووں کے لیے اس قدر سخت تھی وہ اس میں کیسے سما گیا۔ امروہہ کی خاک کراچی کی مٹی میں کیوں کر مل گئی؟ امروہہ صرف جون کا درد نہیں تھا ان کا پورا وجود ہی امروہہ میں بستا تھا۔ وہ طبعی طور پر کراچی میں رہتے تھے مگر ذہنی و فکری اور جذباتی طور پر امروہہ میں ہی بستے تھے۔

ہم تو جیسے وہاں کے تھے ہی نہیں
بے اماں تھے اماں کے تھے ہی نہیں
اب ہمارا مکان کس کا ہے
ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

امروہہ کے بارے میں وہ خود ہی لکھتے ہیں 'امروہہ میں نہ جانے کب سے یہ کہاوت چلی آرہی ہے۔ امروہہ شہر تخت ہے، گزراں یہاں کی سخت ہے، جو چھوڑے وہ کم بخت ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ شمالی ہند کے پہلے مثنوی نگار سیّد اسمٰعیل امروہوی، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، نسیم امروہوی، سیّد محمد تقی، سیّد صادقین، محمد علی صدیقی اور اقبال مہدی

نے امروہہ چھوڑ کر اپنے کو کم بخت محسوس کیا تھا یا نہیں مگر میں نے...... بہ ہر حال۔

جون ایلیا سے میری خط کتابت کی ابتدا 1968ء میں ہوئی تھی جب ان کا خوب صورت رسالہ 'انشا' میرے رسالے 'زیور' کے تبادلے میں آنے لگا تھا۔ یہ خط کتابت بہت تواتر سے ہوتی تھی۔ اسی دوران صحافت کے شوق میں زاہدہ حنا ان کے ادارے سے وابستہ ہوئیں اور کچھ دنوں بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔ پھر زاہدہ نے جون کی تمام ذمے داریاں خود قبول کرلیں اور خط کتابت کا سلسلہ زاہدہ سے شروع ہوگیا تو پتا چلا کہ ان کا تعلق سہسرام سے ہے۔

ان میں قدرِ مشترک یہ بھی تھی کہ جون ایلیا ذہنی طور پر امروہہ میں رہتے تھے اور زاہدہ حنا سہسرام میں۔ اسی لیے جہاں جون کی فکر کا محور امروہہ ہے وہیں زاہدہ کی کہانیوں میں سہسرام سانسیں لیتا ہے' البتہ فرق یہ ہے کہ جون نے اپنی زندگی کے ابتدائی 28 برس امروہہ میں گزارے تھے جب کہ زاہدہ نے کبھی سہسرام کی زیارت نہیں کی۔

جون کا تعلق امروہہ کے ایسے علمی و ادبی خانوادے سے تھا جس کا چرچا چار دانگ عالم میں تھا۔ ان کے والد سیّد شفیق حسن ایلیا اپنے وقت کے نام ور عالمِ دین' شاعر' فلسفی اور دانش ور تھے۔ جون ایلیا کے دو بھائیوں رئیس امروہوی اور سیّد محمد تقی نے مختلف شعبوں میں اپنی علمیت کے پرچم لہرائے اور ان کے چچیرے بھائی کمال امروہوی کا ہندوستانی فلموں میں طویل عرصے تک رعب و دبدبہ رہا۔ ایسے علمی خانوادے میں آنکھیں کھولنے کے بعد جون ایلیا نے نہ صرف خاندانی علم از بر کیا بل کہ اُردو فارسی کے علاوہ عربی اور عبرانی زبان پر بھی عبور حاصل کیا۔ عربی کی تعلیم کی تکمیل انھوں نے دیو بند میں کی تھی۔ اُنھوں نے 35 سے زیادہ نادر کتابوں کا ترجمہ کیا جس میں منصور حلاج کی کتاب 'کتاب الطواسین' بھی شامل ہے۔ بے تکان شاعری کرتے تھے۔ پچاس ہزار سے بھی زائد اشعار کہے مگر صرف ایک شعری مجموعہ 'شاید' ہی شایع ہوسکا۔ ایک طرح سے ان کی ساری زندگی کی محنت رایگاں ہی گئی۔

ہم نے رنجش میں یہ نہیں سوچا
کچھ سخن تو زباں کے تھے ہی نہیں

جون سے ملاقات سے قبل مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر لا اُبالی اور بے پروا ہیں۔

میری ان سے پہلی ملاقات 1975ء میں ہوئی تھی جب وہ 1957ء میں ہجرت کے بعد پہلی
بار ہندوستان آئے تھے۔ انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں بمبئی، دہلی، لکھنؤ اور امروہہ جاؤں گا۔
بمبئی پہنچنے کے بعد انھوں نے مجھے ایک کارڈ بھیجا کہ میں بمبئی آ گیا ہوں۔ کمال امروہوی
کے ساتھ قیام ہے اور میں ان کی فلم 'رضیہ سلطان' کے لیے کچھ گانے لکھ رہا ہوں۔
اتفاق سے انھیں دوسری جگہوں پر جانے کا ویزا ابھی نہیں ملا تھا مگر کمال امروہوی صاحب نے
بمبئی پردیش کانگریس کے صدر رجنی پٹیل صاحب سے رابطہ کیا تو ان کو دوسرے مقامات
کے لیے بھی ویزا مل گیا۔ میں ان سے ملاقات کے لیے متعینہ تاریخ کو لکھنؤ پہنچا تو پتا چلا کہ
وہ امروہہ چلے گئے ہیں۔ اس درمیان، میں لکھنؤ میں رُکا رہا اور وہاں کے اخبارات میں ان
کے متعلق خبریں پڑھتا رہا کہ پاکستانی شاعر جون ایلیا امروہہ پہنچ کر سرزمین کے بوسے لینے لگے،
کبھی زمین پر لوٹ لوٹ کر آہیں بھرنے لگے، کبھی کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر آہ و بکا کر رہے ہیں۔
میرا قیام لکھنؤ میں ہی تھا کہ ایک دن عثمان غنی صاحب نے بتایا کہ وہ لکھنؤ میں رکے بغیر بارہ بنکی
چلے گئے ہیں۔ جہاں ان کے بہنوئی سیّد محمد شفاعت صاحب لائیو اسٹاک آفیسر ہیں۔
میں فوراً لکھنؤ سے بارہ بنکی روانہ ہوگیا۔ راستے میں معروف شاعر ساغر مہدی صاحب مل گئے
(ان کا بھی کئی سال قبل انتقال ہو چکا ہے)۔ انھوں نے کہا کہ وہ بھی جون ایلیا سے ملنے
کے لیے بارہ بنکی جا رہے ہیں۔ ہم دونوں ساتھ ہو لیے، مکان تلاش کرنے میں کوئی خاص
دقت نہیں پیش آئی۔ مکان پر پہنچ کر خبر بھجوائی تو بے اختیار اندر سے نکلے اور لپٹ کر دھاروں
دھار رونے لگے۔ بالکل دھان پان، کرتے پر متعدد داغ، ملگجا لباس اور چمک دار
آنکھیں۔ ان کے سراپا میں سب سے زیادہ نمایاں ان کی پریشان زلفیں تھیں اور اس سے
زیادہ پریشان چہرہ۔ کہنے لگے 'رضوان تم اب آئے ہو جب میں کل واپس جا رہا ہوں۔
یہاں ہم چار بھائیوں کی اکلوتی بہن شاہِ زناں نجفی رہتی ہے اور میں اس کے سبب ہی
ہندوستان آیا ہوں۔ 17 برسوں میں میرے فراق میں آنسو بہا بہا کر اس نے اپنی آنکھوں
کی روشنی ختم کر لی ہے۔ میں ایک کرتا یہاں چھوڑ کر گیا تھا اور اسی سے لپٹ کر روتی رہتی ہے۔
ہمیشہ لکھتی تھی کہ جون کیا اب تم کبھی نہیں آؤ گے۔ تمھارا چھوڑا ہوا کرتا بھی اب بوسیدہ
ہوگیا ہے۔ بدن کی بو بھی ختم ہوگئی ہے اب تو آ جاؤ اور اسی کے سبب مجھے یہاں آنا پڑا۔'

ان کی باتیں سن کر میں بھی آب دیدہ ہوگیا۔ میری انھوں نے اپنی بہن شاہ زناں نجفی اور بہنوئی سیّد شفاعت احمد سے بھی ملاقات کروائی اور شفاعت صاحب کے انتقال کے وقت تک میری خط کتابت رہی۔ وہ جانوروں کے ڈاکٹر کم تھے اور ادب کے دل دادہ زیادہ اور کیوں نہ ہوتے اتنی ادبی سسرال جو ملی تھی۔

اتفاق سے اسی شام آذر بارہ بنکوی نے ان کے اعزاز میں محلّہ امام باڑا میں ایک مشاعرہ رکھا تھا جس میں قرب و جوار کے تمام شعرا مدعو تھے۔ جون ایلیا کے ساتھ میں اور ساغر مہدی پیدل ہی چلے۔ راستے میں ایک اسٹوڈیو میں ہم نے تصویر کھنچوائی۔ وہ چلتے چلتے جیب سے بوتل بھی نکالتے اور اپنے حلق کو تر کر کے پھر ساتھ چل دیتے۔ ہم لوگ مشاعرہ گاہ پہنچے تو سامعین کا خاصا بڑا مجمع تھا۔ خمار صاحب صدارت کر رہے تھے۔ آذر بارہ بنکوی، عزیز بارہ بنکوی، ساغر اعظمی، نگار بارہ بنکوی اور متعدد شعرا لکھنؤ سے بھی آئے تھے۔

جون ایلیا نے عذر پیش کیا کہ میرے اُوپر جذبات کا ایسا ریلا ہے کہ میں آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں، کیسے کچھ پڑھوں۔ لیکن دو تین غزلیں سنائیں۔ خاص طور سے گنگا جی اور جمنا جی والی غزل سن کر تو سامعین کی آنکھوں سے گنگا اور جمنا کے دھارے بہہ نکلے۔

مت پوچھو کتنا غمگیں ہوں گنگا جی اور جمنا جی
میں خود اپنا سوگ نشیں ہوں گنگا جی اور جمنا جی
بان ندی کے پاس امروہے میں جو لڑکا رہتا تھا
اب وہ کہاں ہے؟ میں تو وہیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی

پھر وہ غزل بھی سنائی تھی۔

ہم آندھیوں کے بن میں کسی کارواں کے تھے
جانے کہاں سے آئے ہیں، جانے کہاں کے تھے
اے جانِ داستاں! تجھے آیا کبھی خیال
وہ لوگ کیا ہوئے جو تری داستاں کے تھے
مِل کر تپاک سے نہ ہمیں کیجیے اُداس
خاطر نہ کیجیے کبھی ہم بھی یہاں کے تھے

اس رات، جب ہم مشاعرہ گاہ سے واپس آرہے تھے تو جون بے حد ملول تھے۔ وہ بار بار شاہ راہ پر بیٹھ جاتے اور کہتے میرا امروہہ میرے اندر سانسیں لے رہا ہے۔ پھر وہ تیز تیز سانسیں بھرتے۔

اس سمندر پہ تشنہ کام ہوں میں

بان، تم اب بھی بہہ رہی ہو کیا

وہ رات جو جون کے قیام کی آخری رات تھی ان کے لیے بے حد جذباتی تھی۔ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لمحے جو بے حد قیمتی ہیں وہ انھوں نے اپنی اکلوتی بہن شاہِ زناں نجفی کے لیے بچا رکھے تھے، وہ لمحے چرا کر میں کیسے سنگین اخلاقی جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے میری خواہش ہو رہی تھی کہ میں ان سے ایک انٹرویو کی درخواست کروں مگر ان کی جو حالت تھی اس کے پیشِ نظر ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس رات کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ سائبان میں وہ ایک چار پائی پر بیٹھے تھے۔ سامنے ان کی بہن، بہنوئی، تینوں بھانجیاں اور ایک طرف میں۔ کبھی وہ باتیں کرتے کرتے بہن کے شانے سے لگ کر رونے لگتے تھے اور کبھی وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے میرے شانے پر سر رکھ کر آنسو بہاتے تھے۔ انھی جذباتی لمحات میں میں نے ان سے بہت سے سوالات پوچھ ڈالے۔ ادب، سیاست، ہندوستان، پاکستان سب کچھ در آیا۔ حالاں کہ وہ کوئی رسمی انٹرویو نہیں تھا مگر میں نے اسے ایک رپورتاژ کی شکل میں 'کھلی جو آنکھ تو خوابوں کا سلسلہ نہ گیا' کے عنوان سے اپنے اخبار ویکلی 'عظیم آباد ایکسپریس' کی چار قسطوں میں شایع کر دیا۔ آخر میں میں نے لکھا تھا کہ بن باس تو 14 برس میں ختم ہو جاتا ہے۔ جون ایلیا کو گئے ہوئے 17 برس ہو گئے پتا نہیں ان کا بن باس کب ختم ہوگا۔

اس اخبار کا پاکستان پہنچنا تھا کہ وہاں کے ایک اخبار نے میرے رپورتاژ کو چٹپٹی سرخیاں لگا کر شایع کر دیا اور جون کو بھارتی ایجنٹ قرار دیا کہ وہ رہتے پاکستان میں ہیں لیکن درحقیقت وہ ہندوستان کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس اخبار میں انٹرویو پر زبردست لے دے شروع ہوگئی۔ کافی ہنگامہ کھڑا ہوا۔ خود مجھے بھی پاکستان کے ادیبوں کی جانب سے کئی تیز و تند خطوط ملے جن میں رشید امجد جیسے نام ور قلم کار بھی شامل

تھے۔انھوں نے بھی جون پر بھارت کے جاسوس ہونے کا الزام لگایا تھا۔ان کا استدلال تھا کہ پاکستان کی نئی نسل کا بھارت کے ساتھ کوئی فکری یا جذباتی رشتہ نہیں ہے۔وا ہگہ بارڈر سے ادھر ان کے لیے ایک بالکل ہی اجنبی ملک ہے۔لیکن اس سارے ہنگامے میں جون بالکل خاموش رہے البتہ مجھے پشیمانی کا احساس ہوتا تھا۔مجھ سے ان کی خط کتابت کا سلسلہ جاری رہا مگر وہ ایک حرفِ شکایت بھی زبان پر نہ لائے۔ البتہ اس کے بعد ہی ان پر زبردست ڈپریشن کا حملہ ہوا اور وہ مکمل تنہائی پسند ہو گئے۔کئی برسوں تک صرف ایک کمرے میں یکہ وتنہا پڑے رہے۔صرف شام کے وقت چھت پر جاتے اور اہتمام سے جام اپنے سامنے رکھتے اور کہتے کہ سمندر پار سے یہ ہوائیں میرے امروہے سے آرہی ہیں۔انھیں میں اپنے پھیپھڑوں میں بھر لینا چاہتا ہوں۔اپنی اس کیفیت کا ذکر انھوں نے 'شاید' کے دیباچے میں کیا ہے۔

'1986ء کا ذکر ہے میری حالت گزشتہ برس سے سخت ابتر تھی۔میں ایک نیم تاریک کمرے کے اندر ایک گوشے میں سہما بیٹھا رہتا تھا۔مجھے روشنی سے، آوازوں سے اور لوگوں سے ڈر لگتا تھا۔ایک دن میرا عزیز بھائی سلیم جعفری مجھ سے ملنے آیا۔وہ چند روز پہلے دبئی سے کراچی آیا تھا۔اس نے مجھ سے کہا کہ جون بھائی میں آپ کو فرار اور گریز کی زندگی نہیں گزارنے دوں گا۔آپ نے مجھے میرے لڑک پن سے انقلاب کے، عوام کی فتح مندی اور لاطبقاتی سماج کے خواب دکھائے ہیں۔میں نے کہا تجھے معلوم ہے کہ میں سال ہا سال سے کس عذاب میں مبتلا ہوں۔میرا دماغ، دماغ نہیں، بھوبل ہے، آنکھیں ہیں کہ زخموں کی طرح تپکتی ہیں۔اگر پڑھنے یا لکھنے کے لیے کاغذ پر چند ثانیوں کو بھی نظر جماتا ہوں تو ایسی حالت گزرتی ہے جیسے مجھے آشوبِ چشم کی شکایت ہو اور ماہِ تموز میں جہنم کے اندر جہنم پڑھنا پڑ رہا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں اب بھی اپنے خوابوں کو نہیں ہارا ہوں۔میری آنکھیں دیکھتی ہیں مگر میرے خوابوں کے خنک چشمے کی لہریں اب بھی میری پلکوں کو چھوتی ہیں۔'

اُردو ادب پر یہ سلیم جعفری مرحوم کا احسان ہے کہ انھوں نے جون ایلیا کا شعری مجموعہ 'شاید' شایع کروایا ورنہ اُن کا پورا سرمایہ تو ضائع ہو گیا ہوتا۔انھوں نے ان کو قنوطیت سے نکال کر دبئی میں ان کا عظیم الشان جشن منوایا اور بہت ہی شان دار یادگاری مجلّہ بھی شایع

کیا۔ حالاں کہ انھوں نے اپنا شعری مجموعہ 'شاید' جس حالت میں مرتب کیا اور اس کا ذکر بھی دیباچے میں کرتے ہیں۔

'میں جس اذیت ناک حالت میں مجموعہ مرتب کرنے پر مامور ہوا تھا اس حالت میں شاید ہی کسی شاعر نے اپنا مجموعہ مرتب کیا ہو۔ میں اس حالت سے کہیں اذیت ناک حالت میں تھا اور ہوں جس میں دسویں صدی عیسوی کے عظیم المرتبت ادیب اور مفکر ابو حیان توحیدی نے اپنے حالات سے تنگ آکر اس عہد کے باذوق امرا کی خوش نودی حاصل کرنے کی ناگوار مشقت سے بیزار ہو کر اپنی ناکام زندگی کے آخری لمحوں میں اپنی تصنیفات کے مسودے جلوا دیے تھے۔'

جون نے اپنے مسودے جلوائے تو نہیں لیکن وہ دست برد کے ہاتھوں ضائع ہو گئے۔ وہ ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے کہ انھیں ضائع ہی ہونا تھا۔ اس کا احساس بھی انھیں تھا۔

'یہ ایک ناکام آدمی کی شاعری ہے۔ یہ کہنے میں بھلا کیا شرمانا کہ میں رائگاں گیا۔ مجھے رائگاں جانا بھی چاہیے تھا۔ جس بیٹے کو اس کے انتہائی خیال پسند اور مثالیہ پرست باپ نے عملی زندگی گزارنے کا کوئی طریقہ نہ سکھایا ہو بل کہ یہ تلقین کی ہو کہ علم سب سے بڑی فضیلت ہے اور کتابیں سب سے بڑی دولت ہے تو وہ رائگاں نہ جاتا تو کیا ہوتا۔'

میں جون ایلیا کے بارے میں خبریں پڑھتا تھا اور اُداس ہو جاتا تھا۔ انھوں نے اپنے رسالے میں دل چسپی لینی بند کر دی تھی۔ 'انشا' بند ہوا تو پھر زاہدہ حنا نے اسے عالمی ڈائجسٹ کے نام سے نکالا جو کئی برسوں تک نکلتا رہا۔ اس کی اچھی مقبولیت تھی۔ میرے پاس اس کے پرچے تواتر سے آتے تھے۔ اس درمیان ایک بار زاہدہ حنا دہلی آئیں تو مجھے انھوں نے فون کیا کہ جون تم کو بہت یاد کرتے ہیں۔ تم پاکستان کا ایک پروگرام بنالو۔ لیکن میں کوئی ایسا پروگرام نہیں بنا سکا کہ 1987ء میں اچانک ہی زاہدہ حنا دہلی ایک کانفرنس میں آئیں اور انھوں نے پٹنہ کا بھی پروگرام بنالیا۔ ان کا بھی یہ سفر بے حد جذباتی تھا۔ میں انھیں پٹنہ ایئرپورٹ لینے گیا تو انھوں نے فرمایش کی کہ وہ مونگیر اور سہسرام بھی جانا

چاہتی ہیں لیکن ان کے پاس دونوں جگہوں کا ویزا نہیں تھا۔ میں نے ریاستی محکمہ داخلہ سے رابطہ قائم کیا اور کچھ پیروی کردائی تو صرف ایک جگہ مونگیر جانے کی اجازت مل سکی جہاں ان کی خالہ رہائش پذیر تھیں۔ مونگیر جانے میں ٹرین مسلسل لیٹ ہوتی رہی اور ہم دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ جون کی، ہندوستان کی، پاکستان کی، شاعری کی، افسانے کی، صحافت کی۔ رات کی تاریکی میں ٹرین کے ڈبے سے جھانکتے ہوئے زاہدہ نے کہا تھا 'رضوان ہم سب کس قدر بے بس ہیں۔ ہمارے قدموں تلے زمین نہیں ہے اور تمھارے سر پر آسمان نہیں ہے۔' میرے احساس کو واقعی اس وقت ایک بڑا جھٹکا لگا تھا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال بہت ہی وسیع ہے، جس پر لمبی بحث کی جا سکتی ہے۔ اس کے پس پردہ مجبوری کا پورا فلسفہ ہے۔ اتفاق سے جون ایلیا اور زاہدہ حنا دونوں ہی ہجرت کے کرب سے گزر رہے تھے۔

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

شہرِ دل میں عجب محلے تھے
ان میں اکثر نہیں رہے آباد
جانے کیا واقعہ ہوا کیوں لوگ
اپنے اندر نہیں رہے آباد

جون کی شاعری میں جہاں امروہہ آباد ہے وہیں زاہدہ کے فکشن میں سہسرام بستا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ طبعی طور پر کراچی میں رہنے کے باوجود دونوں ہی ذہنی اور فکری طور پر وہاں نہیں رہتے تھے۔ پھر پتا نہیں ان کی ملاقات کہاں ہوتی ہوگی۔

زاہدہ رات کی تاریکی میں ٹرین کے باہر جھانکتی رہیں کہ ان کے مونگیر یا سہسرام کی سرزمین کیسی ہے۔ ہم لوگ رات کے ایک بجے جمال پور پہنچے تھے۔ اتنے وقت جمال پور سے مونگیر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن وہ دلیر عورت ہیں خطرات سے گھبراتی نہیں۔

اس لیے ایک بجے رات کو ہی مونگیر چلنے کو مصر ہوگئیں۔ وہ رات ان کے لیے بھی کس قدر جذباتی تھی کہ وہ اپنی ضعیف خالہ کے شانوں سے لگ کر سسک کر روتی رہیں اور میں میرے اندر سسکتا رہا۔ میرے اندر بارہ بنکی کی وہ رات اتر آئی جب جون ایلیا اپنی اکلوتی بہن شاہ زناں نجفی کے شانوں سے لگ کر سسکیاں لیتے رہے تھے۔

جب ہم لوگ جمال پور سے پٹنہ واپس لوٹے تو زاہدہ بہت دل گرفتہ تھیں۔ انھوں نے اپنے تمام پروگرام منسوخ کر دیے، پھر براہ دہلی کراچی واپس لوٹ گئیں۔ اس کے بعد ان کے کئی خطوط آئے اور ایسا محسوس ہوا کہ مونگیر آ کر سہسرام جانے کی بے تابی ان کے اندر اور بڑھ گئی ہے۔

میں 1991ء میں ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے کراچی گیا تھا۔ یہ پروگرام اس قدر اچانک بنا تھا کہ میں کسی کو خبر بھی نہیں کر سکا۔ لیکن وہاں پہنچا تو اگلے دن تمام اخباروں میں میری آمد کی خبر چھپ چکی تھی اور جو شخص مجھ سے ملنے کے لیے سب سے پہلے آیا وہ جون ایلیا تھا۔ اس قدر ٹوٹ کر ملے کہ گنگا اور جمنا دونوں کے دھارے بہہ نکلے۔ اپنے ہم راہ وہ منظر علی خان کو بھی لائے تھے (منظر علی خان کا بھی کئی سال قبل انتقال ہو چکا ہے) وہ ہر لمحہ اپنی چھوڑی سر زمین بھاگلپور کو یاد کرتے رہے۔ اس وقت تک جون کا شعری مجموعہ 'شاید' شائع ہو چکا تھا اور میرے لیے وہ اس کی ایک کاپی لائے تھے۔

جون گھنٹوں بات چیت کرتے رہے، کبھی امروہہ اور کبھی بارہ بنکی کا ذکر کرتے اور یادوں میں کھو جاتے۔ بہت ہی دل گرفتہ بھی تھے کیوں کہ انھی دنوں ان کے بڑے بھائی رئیس امروہوی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ میں دس دنوں کراچی میں رہا اور اس درمیان میرے اعزاز میں درجنوں ادبی اور صحافتی جلسے ہوئے جس میں کافی بڑی تعداد میں ادبا اور شعرا اور صحافی شریک ہوتے تھے۔ جون ایلیا، فرمان فتح پوری، شہزاد منظر، صبا اکرام اور علی حیدر ملک تقریباً ہر نشست میں شریک رہے۔ دعوتوں کا بھی ایک طویل سلسلہ تھا۔ اس ذیل میں ایک روز وہ بھی اپنے یہاں لے گئے۔ ان کے گھر پر ہر جانب سناٹا پسرا ہوا تھا۔ زاہدہ حنا نہیں تھیں، بچے بھی نہیں تھے۔ مجھے کچھ ایسی سن گن مل چکی تھی کہ ان کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع ہو چکی ہے۔ اس لیے میں نے اس موضوع کو نہیں چھیڑا۔ اتنے بڑے مکان میں

دَنی نہیں تھا۔ وہ مجھے اس مقام پر لے گئے جہاں پر رئیس امروہوی بیٹھ کر کچھ لکھنے پڑھنے
میں مصروف تھے کہ کسی سفاک نے ان کے دماغ میں گولیاں اتار دیں۔ وہ جذباتی ہو کر
بولتے رہے۔ 'اس نے بالکل صحیح نشانہ لگایا۔ رئیس بھائی کے پاس دماغ کے سوا اور تھا بھی کیا
ن لیے اس نے وہیں نشانہ لگایا۔ وہ اگلی سانس بھی نہیں لے سکے۔ ان کے جانے کے بعد
میں اور بھی بے بس ہو گیا۔' پھر اچانک وہ ایک ڈبا اُٹھا کر لے آئے۔ 'جانتے ہو رضوان یہ کیا
ہے؟' میں نے استفہامیہ انداز میں ان کی جانب دیکھا، وہ بولے 'اس میں امروہے کی مٹی
ہے۔ اسے اپنے بدن پر مل لیتا ہوں تو پھر نئی تقویت مل جاتی ہے۔' میری آنکھیں بھر آئیں۔

یادیں ہیں یا بلوا ہے
چلتے ہیں چاقو مجھ میں

کئی دنوں بعد زاہدہ حنا مجھ سے ملنے آئیں۔ وہ بہت معذرت خواہ تھیں کہ پہلے نہیں
آسکیں کہ انھی دنوں انھوں نے انگریزی کے مشہور رسالے 'شی' کے اُردو ایڈیشن کی ادارت
کی ذمے داری سنبھالی تھی۔ اسی باعث ان کی مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ وہ بھی ایک روز
اپنے ساتھ کھانے پر گھر لے گئیں۔ لیکن یہ دوسرا مکان تھا۔ تینوں بچے ان کے ساتھ تھے۔
انھوں نے مجھ سے کہا 'رضوان بیسن کی روٹی اور ساگ کھاؤ گے۔' میں نے کہا 'اس سے
اچھا کھانا اور کیا ہو سکتا ہے کیوں کہ یہاں آکر مسلسل مرغن کھانا کھاتے اُکتا سا گیا ہوں۔'
اور کراچی کے قیام میں پہلی بار ہم دونوں نے بیٹھ کر بیسن کی روٹی اور ساگ کھایا۔ ان کے
مکان میں بھی وہی جانا پہچانا سناٹا پسرا ہوا تھا۔ ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔
اور مجھے در و دیوار پر جون ایلیا کا شعر لکھا نظر آیا۔

اب ہمارا مکان کس کا ہے
ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

جون بھائی سے تقریباً ہر روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بے حد ٹوٹے اور بکھرے
ہوئے تھے۔ زاہدہ حنا کے اندر بھی شکستگی تھی لیکن شیر شاہ سوری کے خاندان کی انا تھی کہ وہ
بکھرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مجھے خطرہ تھا کہ یہ تناؤ اس دھاگے کو کہیں توڑ نہ دے اور وہی
ہوا۔ کچھ عرصے بعد مجھے یہ خبر ملی کہ ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی ہے۔ بچے زاہدہ کے ساتھ

چلے گئے ہیں اور یہ صدمہ جون کے لیے جان لیوا تھا۔

وہ میرا خیال تھی، سو وہ تھی
میں اس کا خیال تھا، سو میں تھا
اب دونوں خیال مر چکے ہیں

دو تین برسوں بعد ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے وہ دہلی آئے۔ مجھے فون کے ذریعے خبر کروائی، میں دہلی گیا اور ان کی مایوسی اور شکستگی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ سب مو ٹوٹے اور بکھرے ہوئے تھے۔ اپنے آپ کو جوڑنے کا ایک نسخہ ان کے پاس تھا۔ لیکن اس پر عمل نہیں ہوسکا۔ وہ ہندوستان کی کسی خاتون سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے بہتوں سے کیا، مجھ سے بھی کیا، کافی دنوں تک دہلی میں رہے لیکن چارہ گری کسی نے نہیں کی بل کہ مذاق ہی اُڑایا۔ ناچار، مایوس، نامراد واپس چلے گئے۔

دل نے ڈالا تھا درمیاں جن کو
لوگ وہ درمیاں کے تھے ہی نہیں

جب یہ خبر سنی تو اس کی تصدیق کے لیے ان کی بھانجی ہما کو لکھنؤ اور نغمہ کو دہلی فون کیا۔ دونوں نے اس کی تصدیق کی بل کہ نغمہ کے یہاں ان کی والدہ شاہِ زناں نجفی بھی موجود تھیں۔ ان سے بھی باتیں ہوئیں وہ بہت ہی ملول تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دوحہ جانے کے لیے دہلی رُکی تھیں جہاں ان کی ایک بیٹی رہتی ہے۔ جون سے بات ہوچکی تھی وہ بھی علاج کے لیے دوحہ آنے والے تھے۔ سوچا تھا کہ بہت دنوں بعد بھائی بہن مل کر جی بھر کر باتیں کریں گے مگر اس سے قبل ہی وہ آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔ انھوں نے بیماری، علاج معالجہ اور انتقال تک کے سارے مراحل بتائے کہ وہ بے حد مجبور اور بے بس ہوگئے تھے۔ ایک بھتیجے کے ساتھ کراچی میں رہ رہے تھے۔ تنفس کا مرض عود کر آیا تھا۔ ایسا دورہ پڑا کہ پھر جانبر نہ ہوسکے۔ بس موت کا وقت آ پہنچا تھا۔

اُس گلی نے یہ سُن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

جون ایلیا

رضی صدیقی

جون ایلیا کی شاعری چار دہائیوں سے تخلیق ہو رہی ہے۔ اس کے ان گنت پہلو ہیں۔ 'میر و غالب' کی روایت ہے۔ اس عہد کے سارے کرب ہیں اور ان کا بے باک اظہار ہے۔ جون کی غیر معمولی ذہانت، علم و آگہی، فکر و فلسفہ اور درونِ ذات کا بے پناہ ادراک، اس کی شاعری میں پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ بلا کا حسّاس اور خوددار ہے۔ وہ اپنی ذات میں، اپنے وجود میں اس طرح سویا رہا ہے کہ سال ہا سال اس کے چاہنے والوں اور پرستاروں نے کوششیں کر دیکھیں کہ اس کی تخلیقات منظرِ عام پر آ جائیں مگر ممکن نہ ہو سکا۔ شبنم مرحوم، سیّد قمر رضی، عزیز عباسی، شریف، ڈاکٹر منظر عباس جھنجھلا جاتے، سارے جہان کے واسطے بھی دیے جاتے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ امروہہ کی چالیس سال پرانی وہ محفلیں بس ہمارے ہی لطف اُٹھانے کی محفلیں تھیں۔ یہ اُردو ادب کا بہت بڑا واقعہ ہوا ہے کہ جون کی شاعری بالآخر چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ اُردو ادب ایک بیش بہا خزانے سے محروم ہونے سے بچ گیا ہے۔

زیرِ نظر مجموعۂ کلام بھی جون کی تخلیقات کا بہت ہی مختصر حصہ ہے۔ خود جون نے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کے سلسلے میں حد درجہ بے پروائی سے کام لیا۔ زیادہ تر کلام دوستوں یاروں کے پاس تحریری صورت میں یا پھر ذہنوں میں محفوظ رہا۔ شبنم مرحوم کا ترنم غضب کا تھا۔ جون کا کلام اور شبنم کا ترنم ...... سونے پر سہاگا ہوتا ...... نہ جانے کتنا کلام مرحوم کے ذہن میں تھا جو اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ قمر رضی ذہانت کے ساتھ ہی سلیقے کے بھی بادشاہ ہیں، ان کے پاس جون کی شاعری اس طویل مدت میں بھی محفوظ رہی ہے۔

جون بلا کا زود گو ہے اور ایک زمانے میں تو اس کے خطوط بھی قلم برداشتہ منظوم ہوا کرتے تھے۔ وہ بات بھی شاعری میں کرتا تھا اور حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ جون کے ہاں اس قلم برداشتہ شاعری میں بھی لطیف مفاہیم اور کنائے ہوا کرتے تھے۔ عام زود گو شعرا کی طرح صرف بحر، ردیف اور قافیے ہی نہیں ہوتے تھے۔ اس دور کی محفلوں میں یوں بھی ہوا کہ اچانک فرمایش کردی گئی اور جون نے فوری طور پر غزل سنادی۔ ڈاکٹر منظر عباس کے گھر ایک شام چائے کی پیالی پر اس شرط کے ساتھ کہ چائے ختم ہونے سے پہلے اور ٹھنڈی ہونے سے پہلے سات شعر کہہ دیے جائیں، اس نے بہترین شعر سنائے۔ افسوس کہ وہ محفوظ نہ رہے۔ امروہہ کی تنگ، پر پیچ گلیوں میں یاروں کے ساتھ چلتے چلتے اکثر کانوں میں لڑکیوں بالیوں کی سریلی آوازیں سب کے قدم روک دیتیں۔ جون کنوارے گلوں کی ترنم ریزیوں میں گم ہو جاتا اور پھر اچانک چونک پڑتا کہ یہ تو اس کا ہی گیت ہے۔ وہ بہ یک وقت گیت، مرثیے اور غزل لکھنے پر قادر ہے۔

جون کی ذہانت اور عمیق فکر نے ہمیشہ نت نئی جہتیں تلاش کیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی وہ اس عہد کا منفرد شاعر ہے۔ اس نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ لا تعداد مرثیے، نوحے، گیت، سہرے اور نظمیں لکھیں جو زیادہ تر اب نایاب ہیں۔ اس نے اپنی لاجواب نظم 'وقت' قمر رضی کے گھر 1951ء میں سنائی تھی۔ اس کی نظمیں ایسی تھیں کہ اگر اُردو اس وقت عالمی سطح پر منظور شدہ زبان ہوتی۔ تو دنیا کے ادبِ عالیہ میں شامل ہوتیں۔ یہ لا اُبالی لڑکا اور اس کے پرستار شبنم شریف، قمر رضی اور منظر عباس عجیب و غریب ٹکڑی تھے جو امروہہ کی بوسیدہ حویلیوں کے دالانوں اور کوٹھریوں میں ادق سے ادق موضوعات پر موتی بکھیرتے تھے۔ جون کا مطالعہ اور حافظہ غضب کے ہیں۔ لڑکپن میں بھی اسٹالن اور ماؤ سے شروع ہوئی گفت گو مزدک اور قرۃ العین طاہرہ تک جا پہنچتی تھی۔

جون امروہہ کے شاہ ولایت حضرت شاہ سیّد شرف الدین رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہے۔ وہ خاندانی طور پر فاطمی، صدیقی، فاروقی اور عثمانی ہے مگر وہ نام نہاد طبقہ اشرافیہ کا باغی ہے، وہ ان کا نمائندہ نہیں ہے۔ اس نے اپنی شناخت ان سے نہیں کی۔ وہ پیشہ ور لوگ، جنھیں اس معاشرے میں حقیر سمجھا جاتا تھا جیسے دھوبی، نائی، چھیپے، قصائی،

مراثی وغیرہ، کا نمائندہ ہے۔ وہ عام آدمی کا نمائندہ ہے، اس کے نزدیک عام آدمی عظیم ہے۔
رئیس امروہوی اور حیات امروہوی کے بعد جون ایلیا نے نچلے طبقوں کی نمائندگی کر کے
اپنے اپنے گھروں، دیوان خانوں اور حویلیوں میں زلزلے پیدا کیے۔ ماتھوں پر غضب آلود
شکنیں ڈالیں، لہجوں میں تلخی اور غصہ گھولا مگر اپنی ڈگر پر ثابت قدمی سے چلتے رہے کہ انسان
دوستی ان کا مسلک تھا۔

جون بلاشبہ اس دور میں اُردو غزل کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ انتہائی سادگی سے وہ بہ ظاہر
بہت ہی آسان سیدھے سادے شعروں میں بہت خوب صورتی سے بڑی بڑی باتیں کہہ دیتا ہے۔
وہ 'میر و غالبؔ' کی غزل سے فیض کی غزل تک اور پھر اس سے آگے کا بہت
جان دار تسلسل ہے۔ مثلاً جب وہ کہتا ہے۔

اس کی وفا کے باوجود اس کو نہ پا کے بدگماں
کتنے یقیں بچھڑ گئے، کتنے گماں گزر گئے

تو قاری 'میر و غالبؔ' کے دور میں پہنچ جاتا ہے اور جب

ہو کا عالم ہے یہاں نالہ گروں کے ہوتے
شہر خاموش ہے، شوریدہ سروں کے ہوتے

پڑھتے ہیں تو فیض یاد آ جاتے ہیں۔

خوب صورت، سبک، روز مرہ کے لفظ اس کی غزلوں میں ہمہ جہت معنی میں ڈھل
جاتے ہیں اور قاری کی رگوں میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

آج کا دن بھی عیش سے گزرا
سر سے پا تک بدن سلامت ہے

عام بول چال کے لفظ، جو تحریر میں متروک ہو چکے ہیں اس کی غزلوں میں پوری
توانائی کے ساتھ زندہ ہو گئے ہیں اور نگینوں کی طرح جڑ گئے ہیں۔ نہ صرف یہ بل کہ فکر کی
اس گہرائی تک لے جاتے ہیں جہاں کی دنیا نو دریافت لگتی ہے۔

نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نئیں

یہاں معنی کا بے صورت صلہ نئیں
عجب کچھ میں نے سوچا ہے لکھا نئیں

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا نئیں

گزار اے شوق اب خلوت کی راتیں
گزارش بن، گلہ بن، گفت گو بن

جون مشاعروں کا شاعر نہیں ہے، مگر عجیب بات ہے جب بھی مشاعرے میں پڑھتا ہے تو مشاعرہ لوٹ لیتا ہے۔ مشاعرہ کراچی میں ہو، دبئی میں یا پھر اوسلو (ناروے) میں، سب جگہ یک ساں کیفیت ہوتی ہے۔ جون کا کلام بھی گاہے گاہے ہی چھپا ہے اور کسی مجموعۂ کلام کی عدم موجودگی میں شاعر کا اپنے مداحوں سے رابطہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن ٹوبہ ٹیک سنگھ ہو، گوجرانوالا، فیصل آباد یا مردان، وہ ہر جگہ جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس کے کلام کی رسائی حیرت انگیز ہے۔ برسوں پہلے کی بات ہے جون پشاور آیا اور اپنی آمد کو راز میں رکھا مگر چند دن میں امیر حمزہ خاں شنواری، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، محسن احسان اور جوہر میر سب اس کی موجودگی سے باخبر ہو گئے اور اندرونِ شہر جون کے لیے جو شامیں منعقد ہوتیں اور جو تقریبات ہوتیں ان میں حاضرین کی تعداد حیران کن تھی۔ دھان پان جون کو پشاور کی مہمان نوازی، چپلی کباب اور تکوں نے نڈھال کر دیا۔

عام شعرا کے برعکس، جون سے کلام سننا خاصا دشوار ہے۔ وہ اپنے بہت ہی قریبی حلقے میں، موڈ میں آ کر ہی شعر سناتا ہے۔ مشاعروں میں اکثر سامعین تشنہ رہ جاتے ہیں وہ کسی نہ کسی بہانے فرمایشیں ٹال جاتا ہے اور یوں بھی مشاعروں میں کم شرکت کرتا ہے۔ برس گزرے، گارڈن ایسٹ میں اپنے حجرے میں بہت مختصر مگر باکمال محفلیں جماتا تھا۔ اکثر

پوری پوری رات گزر جاتی تھی۔ نئے نئے شعرا آتے تھے، سر دھنتے تھے اور جون کی زمینیں، ردیف، قافیے پسند کرتے اور پھر ان پر طبع آزمائی کرتے۔ بعض بعض تو یوں کرتے جیسے کسی سائنس داں کا فارمولا چرا کر اپنے نام پیٹنٹ کرالیا جائے۔ جون کو اس کا پورا پورا احساس تھا۔ یہی ردِ عمل اس کے شعروں میں بھی ڈھلا۔

ساری ردیفیں بھی حاضر ہیں پھر ساری ترکیبیں بھی
اور تمھیں کیا چاہیے یارو، حاصل میری داد بھی ہے

کیا بتاؤں ہیں کیسے دیدہ دلیر
مجھ سے ہی مجھ کو ہاں چراتے ہیں

جون کی غزلوں میں سے کسی غزل کا انتخاب یا پھر غزل میں سے شعروں کا انتخاب، حد درجہ مشکل کام ہے۔ یوں لگتا ہے کہ رنگ برنگے دل کش پھولوں کا ایک حسین باغ ہے جس میں ہر پھول کا اپنا حسن اور خوش بو ہے۔ ہر خوش بو اور مہک اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان خوش بوؤں میں مست و سرشار ہو کر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بعض بعض شعر تو بلا کے سادہ ہیں اور مفہوم کے اعتبار سے بھی بالکل سامنے کی بات نظر آتے ہیں مگر انسانی نفسیات کے الجھنوں کو ایسے سلجھاتے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔

مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی
آپ مجھ کو منالیا کیجے

گیارہ سالہ سیاسی وسماجی گھٹن کے بعد جمہوریت کی تازہ ہوا چلی ہے تو 'مزاحمتی ادب' کی بات بھی شروع ہوئی ہے۔ جون کی نظمیں اور غزلیں اس پہلو سے بھی بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ جون کی انسان دوستی اور جمہوریت پسندی نے اسے ہر آمرانہ دور میں سراپا احتجاج بنایا۔ اس نے کبھی بھی غیر جمہوری قوتوں سے مفاہمت نہیں کی۔ لاٹھی، گولی، کرفیو، کوڑے، گھٹن اور حبس کا ماحول اسے ذرا بھی خوف زدہ نہ کر سکے، وہ اپنے قلم اور فن کی پوری قوت سے ان کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کرتا رہا۔

شہرِ قلندراں کا ہوا ہے عجیب طور
سب ہیں جہاں پناہ سے بیزار، کچھ سنا
آثار اب یہ ہیں کہ گریبانِ شاہ سے
الجھیں گے ہاتھ برسرِ دربار، کچھ سنا

گزشتہ عہد گزرنے ہی میں نہیں آتا
یہ حادثہ بھی لکھو معجزوں کے خانے میں
جو رَد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

تاریخ نے قوموں کو دیا ہے یہی پیغام
حق مانگنا توہین ہے حق چھین لیا جائے
وقت نے ایک ہی نکتہ تو کیا ہے تعلیم
حاکمِ وقت کو مسند سے اُتارا جائے •

نسٹیلجیا کو نہ جانے کیوں منفی جذبے کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ انسان بھی درختوں کی طرح جڑ دار ہوتا ہے بس اس کی جڑیں محسوس کی جاسکتی ہیں نظر نہیں آتیں۔ یادِ ماضی زمین سے رشتہ، مٹتی قدروں کا نوحہ، گئے دنوں کی سادہ زندگی، مزے دار کھانے، محفلیں، دوستیاں بل کہ دشمنیاں بھی انسانی تہذیب کے ارتقا کے لیے ضروری ہیں اور زندگی کا کافی بڑا حصہ ان یادوں سے جڑا ہوتا ہے۔ امروہہ کی گلیاں کوچے، مزار، درگاہیں، خانقاہیں، چھڑیوں کا میلا، امام باڑے، عزاداریاں، مجلسیں، مشاعرے، ہولی، دیوالی، شادی بیاہ، ڈھولک کی تھاپ پر سریلی آوازوں میں گیت، سریلی آوازوں سے ان دیکھا معصومانہ عشق، آموں کے باغ، ان کی شاخوں پر جھولے، شاخوں پر چھلانگیں، فضا میں پھیلی ہوئی ایک عجیب مہک، کوئل کی کوکیں۔ یہ سب جون کی رگ وپے میں اسی طرح رچی بسی ہیں جس طرح کسی عام حساس آدمی میں ہیں۔ وہ نہ تو منافق ہے اور نہ اپنے سچے کھرے سیدھے سادے جذبوں کو چھپاتا ہے۔ یہ جذبے تیز وتند دھاروں کی

طرح اپنی راہ نکالتے ہیں اور شعروں میں ڈھل جاتے ہیں۔

کوچ اپنا اس شہر طرف ہے نامی ہم جس شہر کے ہیں
کپڑے پھاڑیں خاک بسر ہوں اور بہ عزو جاہ چلیں

بس طور کچھ نہ پوچھ مری بود و باش کا
دیوار و در ہیں جیب میں اور گھر ہے گم یہاں

اس سمندر پہ تشنہ کام ہوں میں
بان! تم اب بھی بہہ رہی ہو کیا

جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزارے تھے
وہ صبح و شام تو جیسے فسانے ہو گئے ہیں

ہم تھے یہ کسی قدر بجا ہے
ہم ہیں یہ خیال ہو گیا ہے

اور کیا چاہتی ہے گردشِ ایام کہ ہم
اپنا گھر بھول گئے، اس کی گلی بھول گئے

اس گلی سے جو ہو کے آئے ہوں
اب تو وہ راہ رو بھی پیارے ہیں

اب ہمارا مکان کس کا ہے
ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

اس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

اے مرے صبح و شام دل کی شفق
تُو نہاتی ہے اب بھی بان میں کیا

ناسمجھ، بددیانت اور تنگ نظر لوگوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکے بغیر، ان جذبوں کو کوئی اور ہی نام دیا۔ حالاں کہ وطن سے محبت کے لیے جون کو کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ پاک و ہند جنگوں کے دوران جون کے لکھے ہوئے قومی وملی نغموں کی گونج ابھی تک فضا میں ہے۔ پاکستان سے عشق کے لیے ماضی کو کھرچ ڈالنا کوئی شرط نہیں ہے۔ یہ تو بالکل یوں ہوا کہ محبوبہ، جذبوں کی صداقت کو اس وقت تسلیم کرے جب کوئی فرد اپنے ماں، باپ، بہن بھائیوں سے قطعی طور پر لاتعلق ہو جائے۔

جون کا مسلک صرف اور صرف انسانیت ہے۔ وہ کسی خطے گروہ یا دور کا شاعر نہیں ہے وہ کائناتی شاعر ہے اور اس کی فکر کی رسائی نادریافت کائناتوں تک ہے۔ اسی انسان دوستی کے حوالے سے وہ ان تمام ہستیوں کا شیدائی ہے جنھوں نے دکھی انسانیت کی خدمت کی ہے۔ اسی لیے وہ بزرگانِ دین کا حد درجہ احترام کرتا ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ امروہہ میں یومِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سالانہ مشاعروں کا سب کچھ وہی ہوتا تھا اور رات کے پچھلے پہر تک مقامی شاعروں کی پڑھی جانے والی منقبتیں زیادہ تر اسی کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جون کے والد محترم حضرت علامہ شفیق حسن ایلیا نے، جو اپنے عہد کے عظیم فلسفی، مفکر، دانش ور، شاعر اور ادیب تھے۔ امروہہ کے عالم گیر عہد کے چشتی بزرگ حضرت شاہ عبدالہادی صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کی شان میں منقبت لکھی جو آج بھی حضرت علامہ کی اپنی تحریر میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، صدر شعبہ عربی، دہلی یونی ورسٹی کے پاس محفوظ ہے اور جون ایلیا نے بھی 2 سال قبل فارسی میں ان ہی بزرگ کے لیے منقبت لکھی اور کیا خوب لکھی کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

شاہ عبدالہادی امروہوی رحمتہ اللہ علیہ

معنویاں را عطائے معنوی

دودۂ صدیق رضی اللہ عنہ را چشم و چراغ

بادۂ سر جوشِ معنی را ایاغ

راحتِ جانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آں جناب

آں سراپائے دعائے مستجاب

آں محمد ﷺ بے مثال و بے ہمال
بر نوائے نام او رقصد خیال
واسطہ بین ابو بکر رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ
جانِ صدیق رضی اللہ عنہ و جمالِ مرتضٰی علیہ السلام
ثالث الحسنین علیہ السلام و آلِ مرتضٰی علیہ السلام
آں شہیدِ اوّل بیتِ علی علیہ السلام
از رخش نورِ شہادت منجلی
خونِ او لوحِ وفا آراستہ
از فنائے تن بقا آراستہ
زخم و داغ اے دل اندر مقام
ہست زخم و داغ را مرہم حرام
پورِ او قاسم قوام علم بود
شبرِ یثرب را امام علم بود
علمِ او حیران از عرفان او
جان او در ناز از جانان او
صد زباں گویا و مضمونش گم است
محملِ معنی بہ ہامونش گم است
تاج انوار قد است بر سرش
ہفت آئمہ از نژاد دخترش
شاہ عبدالہادی والا شیم
بود جدش قاسم علمِ حرم
دخت جدش ام فروہ فاطمہ
دودمانِ فاطمہ علیہا السلام را فاطمہ
بود عبدالہادیؒ ما خوش نژاد

طالبانِ فیض جاں را اوستاد
اے ترا انجام از آغاز تو مست
شاہدانِ راز از راز تو مست
غیرت صد یاسمن خاشاک تو
مشک بو بادِ شمال از خاک تو
نسبت دو خانوادہ را دلیل
تو شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ را خال جلیل
عارفاں از کفر و اسلام تو مست
خود مغاں از پرتوِ جام تو مست
کاشکے تا حضرتِ آں رفتمے
پائے کوباں دست افشاں رفتمے
سجدہ ہائے شوق نذر راہِ او
صد سلامِ ہجر بر درگاہِ او

جون نے پسند تو بہتوں کو کیا مگر عشق کسی لڑکی سے نہیں کیا وہ اس معنی میں بہت خوش نصیب ہے کہ لڑکیوں نے اس سے عشق کیا وہ ان کا مرکزِ نگاہ رہا اور محبوبیت کے نشے میں مست رہا۔ غالباً محبوب بنانے سے محبوب بننا زیادہ مسحور کن اور نشہ آور ہے۔ یہ نشہ جون کو چڑھا تو خوب چڑھا۔ پھر وہ ہم سب کا میرا، قمر رضی کا، حسن عابد کا، راحت سعید کا اور اُبھرتے نوجوان شعرا کا بھی تو محبوب ہی ہے۔ ویسے یہ بھی اچھا ہی ہوا کیوں کہ وہ درونِ ذات میں اتنا مصروف اور مگن ہے کہ محبوب کے نخرے اُٹھا نہ سکتا۔ نخرے اُٹھوا سکتا ہے، سو وہ ہم سب کس لیے ہیں؟ اس سے خفا بھی رہتے ہیں اور اسے چاہتے بھی بے حد ہیں اور یہی تو عشق کا خاصا ہے۔

جون کی شہرت مُشک کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے جب ہوا جب اوسلو میں عالمی مشاعرے میں اس کی شرکت کے لیے تگ و دو شروع ہوئی۔ ناروے میں میرے دوست سیّد مجاہد علی اور ان کی بیگم یاسمین اپنی ان تھک محنت، لگن اور خلوص سے اُردو کا

پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ اوسلو میں اُردو کے عالمی مشاعرے کراتے ہیں جو اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان مشاعروں میں کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا اور قطعی طور پر کمرشل نہیں ہوتے۔ 1987ء کے مشاعرے میں جون کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے مجھ سے وعدہ لیا گیا۔ گوانھیں یقین نہ تھا کہ جون پہنچ سکیں گے۔ میں جون کو لے کر اوسلو پہنچا تو سب کو خوش گوار حیرت ہوئی اور جون اپنے ہفتہ بھر کے دورانِ قیام سب ہی کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ مشاعرہ بہت شان دار رہا۔ ہندو پاک کے ممتاز شعرا شریک ہوئے مگر ناروے کے اخبارات نے جون کی تصاویر چھاپیں بل کہ صرف اسی کی چھاپیں۔ ناروے کے اُردو داں طبقے کو سب سے زیادہ خوشی جون کی شرکت سے ہوئی۔ جون کا یورپ کا یہ پہلا سفر تھا۔

میں نہ تو شاعر ہوں، نہ نقاد اور نہ ادیب، ہاں مگر اُردو ادب کا طالب علم ضرور ہوں اور اس لحاظ سے معتبر قاری ہوں۔ قاری چوں کہ خود کسی سے داد کا طالب نہیں ہوتا اس لیے تعریف و تنقیص سے بے نیاز ہوتا ہے۔ ایک دیانت دار قاری (وہ بددیانتی کرے بھی کیوں) کے تاثرات کافی اہم ہوتے ہیں۔ جون میرا یار ہے لیکن اس کی شاعری پر بات کرتے ہوئے، شعوری طور پر اس کی یاری کوئی اثر نہیں ڈالتی اور لاشعوری طور پر تو مداحی کا ہر ایک کا اپنا حلقہ ہے۔ اس کے فنِ شاعری کا محاسبہ محکمۂ ناپ تول، قاعدہ قانون، جانچ پڑتال نقادانِ ادب کا کام ہے، سو وہ کریں گے، اس کے مقام کا تعین بھی ہوگا۔ مگر یہ سب کچھ ایک محدود گروہ تک رہ جائے گا۔ عام پڑھا لکھا قاری، جون کی شاعری کو اپنے جذبات و تاثرات اور ترجمانی کے حوالے سے پرکھے گا اور اس کا فیصلہ دیرپا اور دُور رس ہوگا۔

جون میں بڑی مقناطیسی کشش ہے۔ وہ بہت اچھا شاعر ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا صرف ایک رُخ ہے۔ وہ فلسفی ہے، مفکر ہے اور بہترین نثار ہے۔ اس کے انشائیے اُردو نثر میں نایاب کی چیز ہیں جو ایک الگ مضمون کے متقاضی ہیں۔ اس کا ہر پہلو ایک مکمل شخصیت ہے۔

میرا لڑکپن سے جون سے تعلق ہے۔ وہ چالیس سال سے زائد کی مدت سے میرا دوست ہے۔ ہم نے امروہہ کی گلیوں اور باغات میں قمر رضی، شبنم شریف اور عزیز عباسی کے ساتھ زندگی کے بہترین دن گزارے ہیں۔ جس عمر میں لڑکے گلی ڈنڈا، ہاکی اور کبڈی کھیلتے تھے۔ ہم ارسطو، افلاطون اور کارل مارکس کے افکار پر گفت گو کرتے تھے۔

جون جب شروع ہوتا تھا تو تاریخِ انسانی کی تمام فکری منزلیں نظروں کے سامنے گزرنا شروع ہو جاتی تھیں۔ اس کے جسم میں بڑی بے چین روح ہے اور اس کا شعور، اس کے ہوش سنبھالنے کے وقت سے مسلسل جاگ رہا ہے۔ وہ اپنے احساس کی بھٹی میں تپ تپ کر کندن بن چکا ہے۔ وہ خود آگاہ بھی ہے اور معاشرے کی سماجی مجبوریوں سے بھی واقف ہے۔ کوئی تیس سال پہلے مانک جی اسٹریٹ میں اس کے حجرے میں ایک شام دانش ور بیٹھے حسبِ معمول گفت گو میں مصروف تھے۔ موضوعِ سخن خدا کے وجود کی طرف چل پڑا۔ اسی محفل میں ایک متمول صنعت کار بھی دانش وری کے دعوے کے ساتھ شریک تھے۔ دورانِ گفت گو انھوں نے بھی کچھ ایسی باتیں کیں گویا وہ خدا کے وجود سے منکر ہوں۔ جون ایک دم پھٹ پڑا 'میاں...... تمھارا کیا مسئلہ ہے۔ تمام آسائشیں میسر ہیں۔ تم خدا کو کیوں نہیں مانتے۔ اس نے تمھیں کیا نہیں دیا۔ مسئلہ تو ہمارا ہے کہ ایک پیسے کا سکہ جیب میں نہ ہو تو ہاتھ میں پانچ پیسے کا سکہ بے کار ہو جاتا ہے اور بس میں سفر بھی نہیں کر سکتے'

اسی زمانے میں سالِ نو کی استقبالی رات، میں، عبیداللہ علیم، انور شعور اور جون، الفی (زیب النسا اسٹریٹ) کے فٹ پاتھ پر مٹر گشتی کر رہے تھے، کیوں کہ کسی ہوٹل میں گزرتے سال کو رخصت کرنے اور نئے سال کو خوش آمدید کہنے کی ہم میں مالی سکت نہ تھی۔ محرومیوں کے احساس سے جون پھنک رہا تھا اور اسی کیفیت میں اس نے کہا۔

'رضی...... میری وصیت ہے کہ میرا کلام کبھی نہ چھپے...... نہ زندگی میں...... نہ مرنے کے بعد...... اور اگر ایسا ہوا یا میں نصاب میں شامل ہوا...... تو بھوت بن کر چمٹ جاؤں گا اور ساری زندگی جان نہ چھوڑوں گا...... یہ معاشرہ واہ واتو بہت کرتا ہے مگر یہ داد اور قدر دانی سب فراڈ ہے، جھوٹ ہے، دھوکا ہے...... کیوں کہ داد دینے اور تعریف کرنے والے اپنی لڑکی مجھے کبھی نہ دیں گے...... اپنا داماد کبھی نہ مانیں گے...... سب جھوٹ، سب دھوکا......'

وہ سچ بول رہا تھا، ننگا سچ۔ میں بہت افسردہ تھا۔ اور آج میں بہت خوش ہوں کہ آخر کار جون نے اپنی زندگی ہی میں اپنی وصیت تبدیل کر دی اور اس کا کچھ کلام تو طباعت و اشاعت کے مرحلے سے گزر گیا۔

یادیں، زندگی اور زود گوئی

رئیس نجمی امروہوی

خلافِ توقع 9 نومبر کی صبح امروہہ کی فضاؤں میں گشت کرتی ہوئی اس الم ناک خبر کو سن کر کہ کراچی میں بھائی جون ایلیا کا انتقال ہوگیا مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا کیوں کہ اس روح فرسا سانحے کی اطلاع سننے اور پھر اس کا ردِ عمل برداشت کرنے کے لیے میری قوتِ سماعت کافی دنوں پہلے سے ہی تیار تھی لیکن اتنی جلدی ایسا ہو جائے گا اس حقیقت کو قبول کرنے کے لیے ذہن بالکل تیار نہیں تھا۔ اچانک میرا سارا وجود شدید صدمے کے حصار میں قید ہو کر رہ گیا اور آنسو ضبط کی تمام حدود توڑ کر آنکھوں سے باہر نکلنے لگے۔

مجھے ان کی اس مرگِ ناگہانی پر حیرت اس لیے نہیں ہوئی کہ یہ غم انگیز حادثہ میرے لیے ہی نہیں، ان سے قربت رکھنے والے کئی اور احباب کے لیے بھی متوقع تھا۔

کافی طویل عرصے سے وہ سانس کی اذیت ناک بیماری کے دائمی مریض تھے اور عمر کی تھکن کے ساتھ ساتھ اعصابی طور پر بھی بہت کم زور ہو گئے تھے۔ ان کے حالات جاننے کی خواہش میں کراچی سے آنے والے کسی شخص کے ذریعے یا وہاں کسی دوست سے فون پر رابطہ ہونے پر جب ان کے رو بہ صحت ہونے کے بجائے ہمیشہ اسی نا قابلِ تردید حقیقت کا علم ہوتا کہ ان کا شغل بلا نوشی اب بے خبری کی حدود سے آگے نکل چکا ہے اور زندگی قطرہ قطرہ کر کے خود کشی کے خود ساختہ منصوبے کی طرف گام زن ہے تو عجیب سی افسردگی میرے وجود کا محاصرہ کر لیتی اور ایک بے نام سی اُداسی ذہن پر مسلط ہو کر رہ جاتی۔ ذہن جب بھی ان سنگین حقائق کے اندھیروں میں کسی اُمید یا اطمینان کی موہوم سی روشنی کا متلاشی

ہوتا تو تھکا ہوا یقین مایوسی کے اس مرکز پر منجمد ہو کر رہ جاتا کہ مستقبل قریب میں کوئی بھی دل خراش خبر اُن کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعائیں مانگنے کے لیے خدا کے حضور اُوپر اُٹھے ہوئے ہاتھوں کو سرنگوں ہونے پر ضرور مجبور کردے گی۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ 8 نومبر بروز جمعہ 2002ء کی شب ساڑھے نو بجے کراچی میں اپنا رختِ سفر باندھ کر بھائی جون اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اس دن ان کی موت پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلام عالمی نے بڑے جذباتی انداز میں مجھ سے کہا تھا۔

'بھائی جون ایلیا تو اسی دن مر گئے تھے جس دن ترک وطن کر کے انھوں نے پاکستان جانے کا قصد کیا تھا۔ اب تو ان کی یہ دوسری موت ہوئی ہے'۔ حقیقت میں بھائی جون کی ہجرت جذباتی نہیں مجبوری تھی اور یہ مجبوری ان کا اکیلا پن اور تنہائی تھی۔

یوں بھی اس نامراد زندگی کا قرض چکانے کے لیے ہر جذباتی انسان کو کئی بار موت کو گلے لگانا پڑتا ہے اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ بھائی جون کو دوبار ہی موت کو گلے لگانا پڑا۔ اس کے علاوہ کراچی میں ان کے سنگ دل حالات اور شکست خوردہ احساس نے کتنی بار اور ان کو زندہ درگور کیا ہوگا، اس گنتی کے حساب کا مجھے کوئی علم نہیں۔

اس حقیقت سے دنیا کا کوئی بھی مفکر یا دانش ور انحراف نہیں کر سکتا کہ درخت اور انسان کی زندگی کے عناصر میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کو ہی زندہ رہنے کے لیے مزاج کے مطابق آب و ہوا اور زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی درخت کے پودے کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے اس کی جڑ کے چاروں طرف لپٹی ہوئی زمین کی مٹی کو بھی ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ تب ہی اس کو باغ یا گھر کے آنگن میں کسی جگہ لگایا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس عمل کی تکمیل کے بعد ہی اس کی نشو ونما ممکن ہو پاتی ہے۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے وہ پودا درخت بن جاتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس کسی بھی درخت کو اُکھاڑ کر دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ جب کسی درخت کی جڑ کا رشتہ اس کی زمین سے منقطع ہو جاتا ہے تو ایسی حالت میں اس کا مرجھانا اور پھر سوکھ جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دنیا کی کوئی بھی طاقت اس کو سرسبز و شاداب نہیں کر سکتی۔

دراصل بھائی جون کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ بے زمینی کا یہی ردِ عمل تھا کہ ہجرت کے بعد اس زمین سے ان کا رشتہ بالکل ختم ہو گیا تھا، جہاں ان کی زندگی کے پودے نے وقت کا طویل سفر طے کرنے کے بعد ایک تناور درخت کی شکل اختیار کی تھی اور جو اپنی جگہ چھوڑنے کے بعد دوسری زمین یا آب و ہوا میں کسی طرح پنپ نہیں سکتا تھا۔ امروہہ سے نکل کر کراچی ضرور چلے گئے لیکن ان کے دل سے امروہہ نہیں نکل سکا۔

کراچی میں رہ کر امروہہ کے قریب بہنے والی ندی بان بھی ان کی کبھی نہ بھولنے والی یادوں کا مسکن بن کر رہ گئی۔ یہاں آ کر بان ندی پر جانا ان کے اولین فرائض میں شامل رہتا۔ اس کے بہتے پانی میں ہاتھ منھ دھو کر انھیں ہمیشہ راحت اور طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ بان ندی سے ان کا جذباتی لگاؤ عشق کی حدود سے آگے تھا، اس سے جدائی اور فراق کا کرب ان کے اشعار میں بڑی شدّت سے کراہتا محسوس ہوتا ہے۔

اے شفق وہ کہاں سمندر میں
تیرے جو رنگ اپنی بان میں تھے

اس سمندر پہ تشنہ کام ہوں میں
بان تم اب بھی بہہ رہی ہو کیا

اے میرے شہرِ آرزو کی شفق
تو نہاتی ہے اب بھی بان میں کیا

مت پوچھو کتنا غمگیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی
کیا میں تمھاری یاد نہیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی

بان ندی کے پاس امروہے میں جو لڑکا رہتا تھا
اب وہ کہاں ہے، میں تو وہیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ کسی اور شہر کے باشندوں کے مقابلے میں امروہوی

حضرات Home Sickness کے مرض میں کسی قدر زیادہ ہی مبتلا رہتے ہیں۔ [illegible]
ہے اس کی خاص وجہ یہاں کی تہذیب اور ثقافت میں قدیم روایات کا رکھ رکھاؤ اور [illegible]
پاس داری ہو جس کے باعث ربط باہمی اور اپنائیت کے جذبات لوگوں کی روز مرہ [illegible]
اس طرح رچ بس گئے ہیں جن کا احساس امروہہ والوں کو کسی اور شہر کی آب و ہوا [illegible]
نصیب نہ ہوتا ہو۔

اسی محرومی اور جذبے سے متاثر ہو کر بھائی جون (مرحوم) کے بڑے بھائی
رئیس امروہوی (مرحوم) نے شاید یہ شعر کہا ہوگا۔

شکلِ ظاہر کچھ بھی ہو جائے وہی رہتے ہیں ہم
ہم کہیں بھی ہوں مگر امروہوی رہتے ہیں ہم

بعض اہل علم اور اہلِ فن حضرات نے نہ جانے کس کد کی بنا پر بھائی جون کی
امروہہ پرستی اور اظہار میں شدت پسندی کا نہ صرف مضحکہ بنایا بل کہ غیر فطری کردار [illegible]
تک کہہ دیا ہے۔

اس طرح کی ناپسندیدگی کہیں نہ کہیں میں پڑھ چکا ہوں۔ ان بلند پایہ قلم کاروں کی
اس محرومی کو بدقسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی جہاں دیدہ نظروں نے کبھی امروہہ نہیں دیکھا۔

برسوں پہلے ان غیر مرئی احساسات کے مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے
حضرت مولانا نسیم امروہوی (مرحوم) نے پاکستان میں ''امروہوی'' کی وجہ تسمیہ اور نام کے
ساتھ اس کی نسبت پر اپنا بیان ان اشعار کے ساتھ قلم بند کیا تھا۔

پُرسکوں تیری فضا میں روز و شب رہتا ہوں میں
یہ سبب ہے خود کو جو امروہوی کہتا ہوں میں
بعد ہجرت تھی مدینے میں سکونت شاہ کی
یاد مکہ کی بھی تھی سنت رسول اللہؐ کی
ذکر اس سابق وطن کا عام تھا اسلام میں
آج بھی شامل ہے مکی مصطفےٰ کے نام میں

بھائی جون کے ساتھ میری زندگی کے بے شمار شب و روز گزرے ہیں اور ان کے

وجود سے وابستہ ایسی بے شمار زندہ یادیں میرے ماضی کے مزاروں میں دفن ہیں جن کو بیان کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہوگا۔ جب بھی ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو واقعات کے بے شمار خوب صورت پرندے میری یادداشت کے زنگ آلود پنجرے سے باہر آنے کے لیے پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ میرے شعور کی نظروں نے ان کی ذات صفات کو کہاں اور کب تلاش کیا تھا یہ تو ٹھیک سے یاد نہیں آتا لیکن ہندو انٹر کالج کی وہ شعری نشست آج بھی یادوں میں قید ہے جہاں عزیز وارثی (مرحوم) کے ساتھ گلزار دہلوی بھی موجود تھے۔ حافظہ اگر خدا حافظ نہیں کہہ رہا ہے تو بار بار سوچنے کے بعد یہی یاد آتا ہے کہ پہلی بار ان کو وہیں دیکھا تھا۔ ان دنوں میں انٹرمیڈیٹ کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔

شعر و نغمہ کی اس یادگار اور شان دار محفل میں جب ان کو زحمتِ کلام دی گئی تھی تو کوئی غزل یا نظم سنانے سے پہلے انھوں نے ایک قطعہ پڑھا تھا جس کے بعد وہاں کی فضاؤں میں داد و تحسین کا کبھی نہ بھلائے جانے والا ایسا شور بلند ہوا جو کافی دیر بعد ہی خاموشی میں تبدیل ہو سکا تھا۔

نمی آنکھوں میں آتشیں رخسار
چلی ہو کون سا فتنہ جگانے
مہیا کیوں کیے ہیں آگ پانی
لگانے جا رہی ہو یا بجھانے

مجھے یاد ہے شعر و سخن کی وہ شام ان کے ہی نام منسوب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت ان کے رومانی قطعات سن کر نہ صرف ان کی شاعری بل کہ شخصیت بھی میرے حواس پر کچھ اس طرح حاوی ہو گئی تھی کہ میں ان کے خیال کو کسی بھی طرح ذہن سے جدا نہ کر سکا۔ اس کے بعد ان کا کلام سننے کی للک سی لگ گئی اور پھر تو شہر میں منعقد ہونے والی شعر گوئی کی ایسی محفلوں میں میری شرکت بڑی پابندی سے ہونے لگی اور اس پابندی نے مجھے ان کی حزنیہ شاعری کا پرستار بنا دیا۔ اس دور میں ان کا کافی کلام مجھے ازبر ہو گیا تھا۔

اتفاق سے وہ زمانہ فاربہ سے ان کے عشق کا نقطۂ عروج تھا اور اس عشقِ صادق کے کسی نہ کسی موڑ پر ناکامی کا یقین بھی ایک المیہ کہانی کا اختتام بن کر ان کی شاعری کے

لہجے میں تحلیل ہو رہا تھا۔ کسی مقامی نشست یا مشاعرے میں جب بھی ان کے قطعات یا
کوئی نظم سننے کا اتفاق ہوتا تو یاسیت میں بھیگی ہوئی شکست خوردہ آواز اور اشعار میں پنہاں
کسی اندرونی کرب کی شدت کو محسوس کر کے اکثر میں بھی جذباتی سا ہو جاتا۔

ان دنوں ان کی غزلوں اور نظموں میں ہمکتی ہوئی ایک ادھوری داستاں نے میری
مناسبت سے میرے احساس کے تاریک صنم خانوں میں کسی تشنگی اور جذبات کی ایسی
قندیلیں بھی روشن کر دیں جن کی خواب ناک ضیا باری کے بارے میں کسی خوف یا
دوراندیشی کے سبب میں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔

پھر یوں ہوا کہ نہ جانے کس حقیقت کی تلاش میں ان کے حالات کی ورق گردانی
کرنے کی جستجو نے اچانک میرے شعور میں انگڑائیاں لینی شروع کر دیں اور شاید اسی
سبب ان کی کہانی ان کی ہی زبانی سننے کی آرزو میری دل چسپی اور ذہنی آسودگی کا محور
بن کر رہ گئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس آرزو اور جستجو کا سفر آگے اور آگے بڑھتا ہی
چلا گیا اور جب تک ان کی قربت مجھے حاصل نہ ہو گئی ذہنی سکون نصیب نہیں ہوا۔

بھائی جون سے حسب نسب کے تعلق کا میرا کوئی رشتہ نہیں تھا نہ کسی مسلک کی
یک سانی تھی اور نہ ہی کوئی اُستادی، شاگردی کا مسئلہ تھا۔ میرے اور ان کے درمیان صرف
ذہنی ہم آہنگی کا وہ پُرخلوص ربط تھا جس نے میری فکر و آگہی کو ان کی شاعری کا گرویدہ بنا دیا۔
اس لیے میری عقیدت مندی جنون کی حد تک ان کی ذات سے وابستہ ہوگئی۔ اس ایک
بے نام تعلق نے میرے اور ان کے مابین کبھی کسی معمولی تلخی کا احساس تک پیدا نہیں
ہونے دیا۔

جون ایلیا بل کہ بھائی جون عمر میں مجھ سے سات سال بڑے تھے اور تعلیم کی کسی
منزل میں میرے بھائی کے کلاس فیلو رہ چکے تھے لیکن ذہنی ہم آہنگی ہونے کی وجہ سے
انسیت اور اپنائیت کے مراسم مجھ سے زیادہ وابستہ ہو گئے تھے۔

ان کے اور میرے درمیان کافی حد تک بے تکلفی بھی تھی لیکن اس کے باوجود
ادب و احترام کی ایک نازک سی دیوار ہمارے بیچ ہمیشہ قائم رہی۔

اس دیوار کو نہ کبھی انھوں نے مسمار کیا اور نہ میں نے کبھی گرانے کی کوشش کی۔ یوں بھی زندگی کے کسی موڑ پر میں نے ان کا ہم مذاق بننے کی کبھی جسارت نہیں کی اور یوں ان کی شخصیت میری سعادت مندی کے لیے ہمیشہ محترم بنی رہی۔ اس حقیقت سے انکار کرنا میرے لیے ممکن نہیں کہ امروہہ چھوڑ کر اگر وہ کراچی نہ گئے ہوتے تو ایک نہ ایک دن یقیناً مجھے شاعروں کی صف میں کھڑا کر کے اپنی امامت میں شاعری کی نماز ادا کرنے کے لیے ضرور مجبور کر دیتے اور یوں میرے اندر کا افسانہ نگار کبھی کا مر گیا ہوتا۔

اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ ان کا مشہور نام جون ایلیا ان کے ابتدائی نام کی تیسری شکل ہے۔ شروع میں ان کا نام حسین جون اصغر عالی سے متعارف ہوا تھا۔ اس کے بعد کافی دنوں تک جون عصری کے نام سے شاعری کرتے رہے اور آخر میں جون ایلیا ہو کر رہ گئے۔

ان کے نام کی انفرادیت اور انگریزیت نے برصغیر کے کتنے ہی صاحبِ علم لوگوں کو بہت دنوں تک عجیب مخمصے میں ڈالے رکھا۔ کوئی سمجھتا جون ایلیا خاتون شاعرہ ہے اور کوئی سوچتا جون ایلیا کرسچن شاعر ہے۔

اس ضمن کا ایک دلچسپ واقعہ ممبئی کا ہے۔

خلیق امروہوی نے جب پہلی بار ان کا تعارف مشہور اور ممتاز افسانہ نگار کرشن چندر سے ان کی رہائش گاہ 'دینش' واقع سانتا کروز ویسٹ ممبئی میں کرایا اور جیسے ہی نام کی تفصیل سے آگاہ کیا تو نام سنتے ہی وہ حیرت اور تعجب سے بھائی جون کا چہرہ تکنے لگے پھر چند لمحوں بعد اپنے تحیر کا طلسم توڑتے ہوئے ایک دم بولے۔

'کافی دنوں سے میں ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ اس وقت ہماری یہ ملاقات کافی سود مند ثابت ہوئی، مختلف ادبی رسائل اور جرائد میں آپ کا کلام پڑھتے ہوئے اکثر میں حیرت میں پڑ جایا کرتا اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ ہندو پاک میں جون ایلیا کون انگریز شاعر پیدا ہو گیا جو اُردو کی اتنی بامعنی اور معیاری شاعری کر رہا ہے۔ یقیناً یہ غیر ملکی شاعر اپنے ہم عصر اُردو شعرا کو بہت پیچھے چھوڑ جائے گا۔'

بھائی جون نے اپنی زندگی میں ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا، اس طرح تین عشق کیے۔

اختر شیرانی (مرحوم) کی سلمیٰ کی طرح ان کی شاعرانہ محبوبہ کا نام فارہہ
فروزینہ۔ان کا یہ شعر اسی دوسرے عشق کا غماز ہے۔

اے فروزینہ تمھاری بارگاہِ حسن میں
فارہہ کا غم بھلانے کے لیے آیا ہوں میں

دوسرے عشق کی شروعات میں جب مکتبِ عشق کے پہلے سبق میں
کے خط کے جواب میں بھائی کے القاب سے نوازا اور خط لکھا تو اس غیر متوقع
سے متاثر ہو کر انھوں نے نظم 'رشتۂ آدم وحوا' تخلیق کی تھی۔نظم ان کے مجموعۂ
شامل نہیں ہے لیکن برسوں سے میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

رشتۂ آدم وحوا

میری معصوم فروزی، مری معبودۂ جاں
مل گیا ہے مجھے مکتوبِ محبت کا جواب
اس کے اندازِ نگارش سے پریشاں ہوں میں
وحشت افزا ہے مرے واسطے اسلوبِ خطاب
دیکھنا تھا مجھے شرمائے ہوئے کچھ جملے
یہ احادیث و روایات نہیں سننا تھیں
دیکھنا تھا مجھے اِک جذبۂ کامل تم میں
مجھ کو قرآن کی آیات نہیں پڑھنا تھیں
تم نے لکھا ہے کہ تم بھائی سمجھتی ہو مجھے
آبِ زم زم سے کرو پُر نہ جوانی کا ایاغ
تم نے لکھا ہے کہ پاکیزہ محبت ہے مجھے
شمعِ کعبہ سے جلاؤ نہ مری شب کا چراغ
تم اگر بھائی سمجھتی ہو تو یہ بھی لکھو
بھائی کے خط کو بھی چھپ چھپ کے پڑھا کرتے ہیں

تم اگر بھائی سمجھتے ہو تو یہ بھی بتلاؤ
بھائی کا نام بھی شرما کے لیا کرتے ہیں؟
میں تو سمجھا تھا مئے نابِ تخیل تم کو
اب یہ تقدیسِ تخیل تو بڑی مشکل ہے
آؤ میں تم کو بتاؤں کہ محبت کیا ہے
حسرتِ لرزشِ بے جا کا مکمل احساس
مرد و عورت میں مری حور ترے سر کی قسم
رشتۂ آدم و حوا کے سوا کچھ بھی نہیں

پہلے عشق میں انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا، دوسرے عشق کو درمیان میں ادھورا چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر گئے۔ ان کا آخری اور تیسرا عشق امروہہ کی سرزمین سے اس وقت شروع ہوا جب انھیں کراچی میں مستقل سکونت کو اپنانا پڑا۔

اپنی اس محبوبہ کے ہجر میں عمر کی آخری سانسوں تک وہ آنسو بہاتے رہے۔ اتفاق سے اس معاشقے میں بھائی جون ہی بے وفا ثابت ہو کر رہ گئے۔

سرزمینِ امروہہ نے ان سے کوئی بے وفائی نہیں کی، جب بھی امروہہ آتے اس دلی خواہش کا اظہار ضرور کیا کرتے کہ ان کی موت امروہہ میں ہی واقع ہو اور ان کو یہیں کی مٹی میں دفنایا جائے لیکن ان کی یہ حسرت، حسرت ہی رہی۔ یوں بھی اس فانی دنیا میں خواہش کب کسی کی پوری ہوتی ہے۔

خواہش تو دل میں پیدا ہی اس لیے ہوتی ہے کہ تشنۂ تکمیل رہے۔ ان کے جسدِ خاکی کو امروہہ کی زمین کا پیوند بننا نصیب نہ ہو سکا اور یوں اس دلی آرزو کی تکمیل کے سلسلے میں ان کی قسمت کو بہادر شاہ ظفر کے مقدر کا ہم نوا ہونا پڑا۔

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اس حقیقت کے بارے میں بہت سے لوگوں کو علم نہیں ہوگا کہ 71ء کی ہندو پاک جنگ کے بعد جب پہلے ہندوستانی صحافی ظفر پیامی (مرحوم) دونوں ملکوں کے درمیان

خیر سگالی اور تعلقات کی بحالی کا پیغام لے کر پاکستان پہنچے تو انھوں نے اپنے اس سفر کے میں جو اُردو ماہ نامہ 'شبستان' دہلی میں شایع ہوا، لکھا تھا۔

'کراچی میں گھومتے ہوئے میری ملاقات امروہہ (یو پی) کے نوجوان شاعر جون ایلیا سے بھی ہو جاتی ہے جو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا ہے یارو! ہم اس ملک کے شاکی بھلے ہی سہی مخلوق ہرگز نہیں ہو سکتے، یہاں کوئی بھی بڑھیا ایسی نہیں جس نے بچپن کی شرارتوں پر ہمیں گالیاں دی ہوں، کوسنے دیے ہوں۔ کراچی کی یہ بیس بیس منزلہ عمارتیں میرے امروہہ میں ٹوٹے ہوئے مکانوں کے کھنڈرات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں کیوں کہ یہاں کی مٹی میں مجھے اپنے پن کی بو محسوس نہیں ہوتی'۔

جنگ کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان جب حالات کسی قدر استوار و خوش گوار ہوئے تو عوام کی سہولت کے پیشِ نظر سلسلۂ مراسلت کا آغاز ہوا تو برسوں بعد اچانک بھائی جون کا ایک خط مجھے ملا جس کو پڑھ کر خوشی نہیں بل کہ مجھے دُکھ ہوا اور اس دُکھ سے آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

عالمی ڈائجسٹ

129۔اے، مانک جی اسٹریٹ

گارڈن ایسٹ، کراچی

فون:78759

14 نومبر 1974ء

رئیس! میری جان میرے مان!

حرفوں اور سطروں کے راستے کھلے ہیں تو میں تجھے خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ دو چار سطریں تو عید کارڈ میں لکھ بھیجی تھیں اور ایک شعر بھی، ابھی تک اس کا جواب نہیں ملا، جانے تم امروہے میں ہو یا کہیں اور پھر یہ سوچا شاید ڈاک خانے والوں نے ڈاکا ڈالا ہو۔ اب کے اپنے دفتر کے ایک آدمی کے ساتھ یہ خط براہِ راست ڈاک خانے بھجوا کر اس پر مہر لگواؤں گا۔

کم بختو! کمینو! کج اداؤ! کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟ کیا میں بھی اپنے پیاروں اور

اپنے یاروں کے درمیان بھلایا جا سکتا ہوں؟ میں جو تم لوگوں کی یاد میں نڈھال ہو گیا ہوں، کیا وہ دن، وہ دوپہریں اور شامیں یاد نہیں؟ جب میں تیرے کمرے میں بستر پر لوٹ پوٹ کر قطعے اور غزلیں کہا اور سنایا کرتا تھا اور وہ عادل کہاں ہے جو ہم سب سے زیادہ خوب صورت تھا؟ رئیس! کیا پنواڑی کا پانی اسی طرح بہتا ہے؟ کیا پلیا ویسی کی ویسی ہے؟ کیا تم میرے بغیر اب بھی ہندو کالج کے سبزے پر شام کو لوٹ لگاتے ہو؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ کسی نے اب تک ایک حرف نہیں لکھا۔ امروہہ سے میرے نام ابھی تک کوئی خط نہیں آیا۔ وہ امروہہ جس کی میں ایک اُداس علامت اور دکھی ہوئی یاد بن کر رہ گیا ہوں، ویسے ہندوستان سے بہت سے خط آئے۔ مجھے خط لکھو اور میرے پیاروں سے میرے نام خط لکھواؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میں جنوری میں وہاں آنے اور گلی گلی کی خاک سر پر ڈالنے کا عزم کیے بیٹھا ہوں۔ قمر الدین کیسے ہیں؟ ان سے میرا اسلام کہو۔ کسی نے بتایا تھا کہ وہ شاید آگرے میں ہیں اور ماشاء اللہ انھوں نے بڑی عزت پائی ہے۔

مجھے میرے ہندو بچوں اور چیلوں کے پتے لکھو۔ رادھے، جے پال، چندر اور کئی پیارے نام تھے، یاد نہیں آرہے ہیں۔ کیلاش نہ جانے کہاں ہے؟ عنبر نے شاعری چھوڑ تو نہیں دی۔ اکرام فاروقی کہاں ہے بٹوالوں والا؟ ہاں یہ تو بتاؤ حضرت استاذی و مرشدی مولانا عبدالقدوس مرحوم کے گھر والے کس حال میں ہیں؟ منان کیا کر رہا ہے اور کہاں ہے؟ میں اسے یہیں بلانا چاہتا تھا۔

قبلہ و کعبہ حضرت مولانا عبادت صاحب مدظلہ میرے ہادی میرے استاد کیسے ہیں؟ محمد سیادت کا کیا حال ہے اور میرے معلم جلیل اور مجھے نکتہ ہائے درویشی و خیر اندیشی سکھانے والے عالم کامل مولانا نسیم احمد فریدی صاحب قبلہ کا مزاج کیسا ہے؟ انھیں میرے ناقدرِ وطن نے کوئی سکون اور سہولت فراہم کی یا نہیں؟ میں یہ سطریں لکھتے لکھتے اور بھی اُداس ہوگیا ہوں۔ محبوب بھائی اور عزیز بھائی کو کس قدر یاد کرتا ہوں۔ ہائے 'قاضی منزل' اور ہاں مولوی عزت اللہ صاحب تو خیریت سے ہیں؟ میں کئی لوگوں کو خط لکھ رہا ہوں۔ کئی لوگوں کو لکھوں گا۔ تم ناموں پر نہ جاؤ سب کے نام کہاں تک لکھوں، میں ایک ایک کو یاد کرتا ہوں۔ بھائی تاباں، حکیم کلبِ علی صاحب اور ان کے سب احباب مجھے بہت یاد آتے ہیں۔

خط لکھنے بیٹھا ہوں تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ گھر میں
سب کو میری طرف سے سلام کہنا اور دعائیں، میری چھوٹی سی بھابی کو بہت بہت دعا اور
بچوں کو پیار مگر نہ جانے تم باپ بنے یا نہیں؟ میں نے تمھاری شادی ہونے تک کی خبر
پائی تھی۔ بڑے بھائی، بھائی تقی اور بھائی بچھن (محمد عباس) دعا کہتے ہیں تمھاری بھابی سلام
کہتی ہیں، سلام بھی اور دعا بھی۔ میری ایک بچی ہے اس کا نام فینانہ ہے۔ فینی کہلاتی ہے۔
تین برس کی ہے کیا فینی کی 'ف'' سے فارہہ یاد آئی۔ گونڈے سے نجفی کا خط آیا ہے۔
بھائی شفاعت اور وہ دونوں خیریت سے ہیں۔ تم یہ خط ہاتھ میں لے کر امروہہ کی گلیوں میں
اور سڑکوں پر نکل جاؤ اور چیخ چیخ کر یہ کہو۔'اے شہر اور اے شہر والو! تمھاری فرقت زدہ روح
تمھارے لیے بے قرار ہے۔

لکڑوں والے، قریشیوں والے، کالے کنویں والے، کالی پگڑی والے، کٹکوئی اور
افغانان والے، بڑے دربار والے، گذری والے، گھیر مناف والے، دانش مندوں والے،
کوٹ والے، چلے والے، نلوں والے، چاہ غوری والے، پرانی سرائے والے،
ملانوں والے، حقانیوں والے، سب محلوں والے میرے سینے میں لبسے ہوئے ہیں۔
عنبر کے منہ پر گھونسا مارنا اس نے بھی خط نہیں لکھا۔

جون

خط آنے کے چند ماہ گزرنے کے بعد 1976ء میں وہ امروہہ آئے تو ان کا
استقبال کرنے اور خوش آمدید کہنے میں بھی اسٹیشن گیا۔ ٹرین آئی تو ان کو بھی ساتھ لے کر
آئی۔ وہاں موجود سب احباب سے گلے ملے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن سارا وجود
ان جانی خوشیوں سے سرشار تھا۔

ایک رکشے میں سوار ہو کر جب گھر کی طرف روانہ ہونے لگے تو اچانک مجھ سے
بولے: 'رئیس کسی طرح مجھے یقین دلاؤ کہ میں اس وقت امروہہ میں ہوں۔ اس زمین اور
اس کی فضاؤں میں سانس لینے کے خواب میں نے برسوں دیکھے ہیں کہیں اس وقت بھی
یہاں میری موجودگی کوئی خواب تو نہیں؟' دلائل اور ثبوت کے ذریعے جب میں نے انھیں
یقین دلایا تو خوش ہو گئے۔ امروہہ میں ان کی آمد پر جہاں ان کے اعزاز میں بہت سی

استقبالیہ تقریبات ہوئیں وہاں روٹری کلب امروہہ نے بھی ایک شان دار استقبالیے کا اہتمام کیا۔ جہاں انھوں نے اپنی ایک تازہ غزل سنائی جو اس تقریب کے لیے خاص طور پر لکھی تھی۔ غزل پڑھتے پڑھتے ان پر رقت طاری ہوگئی اور آواز گلے میں رندھ گئی۔ غزل کے اشعار یہ ہیں۔

ہم آندھیوں کے بن میں کسی کارواں کے تھے
جانے کہاں سے آئے ہیں، جانے کہاں کے تھے
مل کر تپاک سے نہ ہمیں کیجیے اُداس
خاطر نہ کیجیے، کبھی ہم بھی یہاں کے تھے
اے جانِ داستاں تجھے آیا کبھی خیال
وہ لوگ کیا ہوئے جو تری داستاں کے تھے
ہم تیرے آستاں پہ یہ کہنے کو آئے ہیں
وہ خاک ہوگئے جو ترے آستاں کے تھے
وہ رشتہ ہائے ذات جو برباد ہوگئے
میرے گماں کے تھے کہ تمھارے گماں کے تھے
اب خاک اُڑ رہی ہے یہاں انتظار کی
اے دل یہ بام و در کسی جانِ جہاں کے تھے
ہم کس کو دیں بھلا در و دیوار کا حساب
یہ ہم جو ہیں، زمیں کے نہ تھے، آسماں کے تھے
کیا پوچھتے ہو نام و نشانِ مسافراں
ہندوستاں میں آئے ہیں، ہندوستاں کے تھے

مجھے یاد ہے ان کے اشعار سن کر استقبالیے میں موجود امروہہ کی سب ہی مقتدر اور مشہور و معروف شخصیات زار و قطار رونے لگی تھیں اور جب فضا کسی قدر نارمل ہوئی تھی تو

جواب میں ایک نظم جوأن کی آمد پر میں نے لکھی تھی اور جس کا تخاطب بھی ان ہی سے تھا، پڑھی تھی۔ نظم طویل ہے۔ اس کے چند ابتدائی اشعار اس طرح تھے:
نظم کا عنوان تھا 'سوال'۔

عرصے کے بعد دیکھا تمھیں جون ایلیا
دل خوش ہوا اور آنکھوں نے اشکوں کو پی لیا
یادِ وطن میں سنتا ہوں روتے رہے ہو تم
دامن کو آنسوؤں سے بھگوتے رہے ہو تم
جو گھر رہا عزیز تمھیں جان کی طرح
اس گھر میں آج آئے ہو مہمان کی طرح
کس بات کی کمی تھی یہاں کون سا تھا غم
ہر بات میں شریک نہ تھے کیا تمھارے ہم
کوئی ملا نہ غم کے سوا ہم کو چھوڑ کے
روکا تھا کتنی بار تمھیں ہاتھ جوڑ کے
خوشیوں کے اپنے سینے میں جذبات لائے ہو
یا صرف آنسوؤں کی ہی سوغات لائے ہو
مداح جس کے شعروں کا ہر خاص و عام تھا
اے شاعرِ وطن وہ تمھارا کلام تھا
پایا نہ جا سکے گا تمھارا جو تھا مقام
کرتی ہیں آج شہر کی گلیاں تمھیں سلام
آنکھیں تمھاری یاد میں روتی ہیں آج بھی
پلکوں پہ روز اشک پروتی ہیں آج بھی
عزت ملی وطن میں وطن سے نکل گئے
تم پھول تھے چمن کے چمن سے نکل گئے

رو رو کے اس طرح نہ کرو تم ہمیں اُداس
فرقت کے غم کو خوشیوں کا پہناؤ اب لباس
چھوڑو پرانی باتوں کو کیا ان سے فائدہ
ہیں خیریت سے بھائی میری بھابی زاہدہ

نظم 'سوال' سننے کے بعد فضا اور بوجھل ہوگئی تھی۔ ماحول کی سرگوشیاں خاموشی کی ردا اوڑھ کر کہیں سو گئی تھیں اور فضاؤں میں ہر طرف آنسوؤں کی نمی گھل کر رہ گئی تھی جس کا احساس صرف حاضرینِ محفل کو ہی ہورہا تھا اور یوں وہ یادگار استقبالیہ، الوادعیہ تقریب میں تبدیل ہوکر کسی سوگ وار شام کی طرح ختم ہوگیا تھا۔

کراچی سے امروہہ آنے کے چند دن بعد ہی ان کی بیوی زاہدہ حنا کا ایک خط آیا۔ مجھے یاد ہے اس خط میں دیگر اور گھریلو باتوں کے علاوہ یہ جملہ بھی تحریر تھا۔ 'جون تمھارے کپڑوں کا وہ جوڑا جس کو تم اُتار کر گئے تھے دُھلنے کے لیے نہیں بھیجا ہے کیوں کہ جب بھی تمھاری یاد آتی ہے ان کپڑوں میں بسی ہوئی خوش بو کو سونگھ کر تمھاری موجودگی کا احساس کرلیتی ہوں۔'

مجھے یاد ہے اس عبارت کو بھائی جون بڑے فخر سے دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔

ان کے اس فخریہ اظہار پر رشک کرتے ہوئے ایک دن میں نے مزاح کے لہجے میں کہا۔ بھائی اس عبارت میں بولتی ہوئی بے پایاں چاہت سے متاثر ہوکر کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے احباب بھابی کی محبت کا موازنہ اپنی اپنی بیویوں کے جذبات سے کر کے علیحدگی اختیار کرلیں۔ جملے کی اشاریت سمجھتے ہی بھائی جون ایک دم قہقہہ مار کر ہنس پڑے تھے اور پھر تادیر مسکراتے رہے تھے۔

زاہدہ حنا کے تحریر کردہ خط کی دستاویز میں بھائی جون سے وابستہ ان کی بے پناہ چاہت اور والہانہ تڑپ کے برعکس جب دونوں کی غیر متوقع اور ناقابلِ یقین علیحدگی کے ادھورے منظر نامے کے بارے میں سوچتا ہوں تو میں عجیب اور بے معنی سوالات کے دائروں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہوں کیوں کہ ایسی نادیدہ، ناشنیدہ اور نارسا رفاقت کے رشتے میں کسی دراڑ کا پڑ جانا میرے وہم و گمان سے بالاتر تھا۔ لیکن اتفاق سے ان کی خوش گوار ازدواجی

زندگی کے گنگا جل میں تیزاب گھولنے والے ایک ابتدائی واقعے کا کسی طرح میں بھی خاموش تماشائی بن گیا تھا۔ اس حقیقت کا جس کو علم ہے وہ خوب جانتا ہے۔ اب تو وہ وقت ہی گزر گیا، وقت کے ساتھ ہر حقیقت ماضی بن جاتی ہے اور ماضی میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ اس لیے کبیر داس کے ایک دوہے پر اس ذکر کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

من میں راکھوں من جلے، کہوں تو مکھ جل جائے
جیسے سپنا گونگے کا روئے اور پچھتائے

لیکن کبھی کبھی دو زندگیوں کے ایسے افسوس ناک انجام کو سوچتے ہوئے آخر میں ایک کڑوی سچائی میرے ذہن کے بے ربط خیالوں سے نجات کا ذریعہ ضرور بن جاتی ہے۔

موجود دور میں ہر مرد اپنی بیوی کے ساتھ اور ہر عورت اپنے شوہر کے ساتھ کسی ڈرامے کی طرح شوہر اور بیوی کا کردار نبھا رہے ہیں۔ اصل ایڈجسٹمنٹ کہیں بھی نہیں ہے۔ کچھ پابندیاں ہیں جن کی وجہ سے ہر بیوی اپنے شوہر سے اور ہر شوہر اپنی بیوی سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔

میرا دعویٰ ہے اگر آج مذہب، قانون اور معاشرے کی تمام پابندیوں کو یک سر ختم کر دیا جائے تو آنے والے کل ہر شوہر اپنی بیوی اور ہر بیوی اپنے شوہر سے علیحدگی ضرور اختیار کر لے گی۔ کسی فیصلے کے سامنے ڈر اور خوف کی لکشمن ریکھا آ جاتی ہے تو کہیں کوئی مصلحت علیحدگی کے راستے مسدود کر دیتی ہے اور یوں کوئی نہ کوئی دوراندیشی مجبوری بن کر ہر گھر کا شیرازہ بکھرنے سے روک لیتی ہے۔ کاش بھائی جون اور زاہدہ بھابی کے اس منفی فیصلے کے بیچ بھی کوئی دوراندیشی یا مصلحت آہنی دیوار بن سکتی اور یوں یہ من چاہی رفاقت شاعری اور افسانے کی تاریخ میں کبھی نہ فراموش کی جانے والی مثال بن جاتی۔

بھائی جون جب تک امروہہ میں رہے اشعار کی فیکٹری بنے رہے۔ نظم ہو یا غزل منقبت ہو یا نعت وہ سبھی اصناف سخن کے تھوک سپلائر تھے۔ ان کی موجودگی نے امروہہ میں شاعروں کی ایک پوری فوج تیار کر دی تھی۔ شہر میں طرحی نشست ہوتی یا کوئی

غیر طرحی مشاعرہ، اپنے شاگردوں میں تقسیم کرنے کے لیے ہر طرح کی غزلوں کا اسٹاک بروقت تیار کر دیتے تھے۔ جب یہ فیکٹری کراچی منتقل ہو گئی تو مال کی سپلائی بھی بند ہو گئی۔ ان کے جانے کے بعد امروہہ کے کئی آن بان والے شاعروں کا صرف تخلص باقی رہ گیا کسی مشاعرے میں ان کا کلام سننا نصیب نہ ہو سکا۔

بھائی جون شاعر پیدا ہوئے تھے، انھوں نے امروہہ کے مشہور علمی ادبی گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں۔ جہاں کا اوڑھنا بچھونا علم و ادب اور شاعری تھی۔ وہ ایک عظیم مدبر، مفکر اور فلسفی ہی نہیں بلند پایہ محقق بھی تھے۔ عربی کا عالم ہونے کی وجہ سے دین اسلام کی تاریخ انھیں ازبر تھی، فارسی زبان پر انھیں مکمل دست رس حاصل تھی۔

اُردو زبان کے انسائیکلو پیڈیا ہی نہیں، چلتی پھرتی لائبریری بھی تھے۔ یادداشت بلا کی تیز تھی اور ذہانت ان کی عظمت کا اعتراف تھی۔ وہ منفرد لب و لہجے کے ممتاز شاعر تھے اور ان کی زود گوئی ضرب المثل بن کر رہ گئی تھی۔ اگر کبھی آپ ان سے یہ فرمائش کرتے کہ موجودہ گفت گو اشعار میں ہونی چاہیے تو میرا یہ دعویٰ کسی زاویے سے غلط ثابت نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ہر لمحہ ہر موضوع پر منظوم گفت گو کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آج تک اتنی سرعت کے ساتھ شعر کہنے والا کوئی بھی شاعر میری نظر سے نہیں گزرا اور نہ شاید آئندہ کبھی گزرے۔

بھائی جون کی افسردہ دِلی کی اس کیفیت کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جس دن امروہہ کو خیر باد کہہ کر وہ پاکستان جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے آب شار تھے۔ آواز بھرائی ہوئی تھی، لہجہ یاسیت میں بھیگ گیا تھا اور کچھ بھی بولتے ہوئے زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اسٹیشن پر الوداع کہنے والوں کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں۔ ان دردناک لمحوں میں سب کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے حسب حال ایک قطعہ پڑھا تھا۔

بے نوا ہوں وطن سے جاتا ہوں
سب سے یہ ہی پیام کہہ دینا
مجھ کو پہنچا کے لوٹنے والو
سب سے میرا سلام کہہ دینا

زین چلی گئی اور اس کے ساتھ بھائی جون بھی چلے گئے اور پھر ہم سب نم ناک
آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب رواں لیے تھکے تھکے قدموں سے اپنے گھروں کی طرف
لوٹ گئے۔ لیکن ان کے سب سے زیادہ عزیز اور چہیتے شاگرد نظام امروہوی (مرحوم)
دہلی تک ان کے ہم سفر بن کر ساتھ گئے تھے۔ واپس آنے پر انھوں نے بتایا کہ سفر کے
دوران امروہہ کی حدود ختم ہوتے ہی بھائی جون نے ان کی ڈائری پر ایک قطعہ لکھ دیا تھا۔
وہ قطعہ مجھے آج تک یاد ہے۔

سرحدِ شہرِ عزیزانِ وطن
ہجر تیرے مرحلوں میں کھو گئی
اب کسی منظر سے کیا مطلب مجھے
میری بستی جنگلوں میں کھو گئی

طویل عرصے کے بعد جب امروہہ آئے تو برادرِ محترم نشتر خانقاہی کا ایک خط مجھے
ملا۔ ان دنوں وہ دہلی سے ایک ماہ نامہ 'سو برس' کا اجرا کرنے والے تھے اور اس کے پہلے
ہی شمارے میں اشاعت کے لیے جون کی غزل طلب کی تھی۔ 'سو برس' کے لیے جب
انھوں نے تازہ غزل مجھے عنایت کر دی تو ذاتی خواہش کے سبب میں نے ان سے کہا بھائی
'سو برس' کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آ رہا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ غزل کے ساتھ ایک قطعہ بھی اس
کے لیے لکھ دیں۔

خواہش سنتے ہی ایک لمحے کے لیے پہلے انھوں نے کچھ سوچا اور فوراً قطعہ لکھ کر
دے دیا۔

تو ہے نشتر کا سو برس تو یہ دل
لے رہا ہے نفس نفس ترا نام
ہے فقط بس یہی دعا میری
سو برس تک ہو سو برس ترا نام

ایک روز گھر کے آنگن میں بیٹھے مجھ سے محوِ گفت گو تھے۔ ان کے بھتیجے اعجاز حیدر
ملاقات کی غرض سے گھر میں داخل ہوئے اور قریب ہی ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔

یوں ہماری گفت گو کا تسلسل ٹوٹ کر رہ گیا۔ بھائی جون نے ذرا سی دیر کچھ سوچا اور اعجاز حیدر سے مخاطب ہو کر ایک شعر پڑھتے ہی خاموش ہو گئے۔

ہے طبیعت نگاہ کی ناساز
تم دکھائی نہیں دیے اعجاز

ایک روز میرے یہاں تشریف لائے۔ میں نے کمرا کھولا، اندر داخل ہوئے تو اچانک ان کی نگاہ دیوار پر ٹنگی ایک خوب صورت تصویر پر مرکوز ہو گئی۔ تصویر اندر جیت آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تھی۔ اس کے پس منظر میں سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی اُداس بیٹھی تھی اور اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ تصویر سے نظریں ہٹا کر اچانک بھائی جون میری طرف متوجہ ہوئے اور ایک دم بولے تصویر کے نیچے میرا شعر لکھ دو۔

تیری یہ زلف شامِ غم تو نہیں
تجھ پہ حالات کا ستم تو نہیں

کچھ دیر بعد میرا چھوٹا بیٹا وقار چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں آٹوگراف بک تھی۔ اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اس نے آٹوگراف بک ان کے سامنے پیش کر دی، انھوں نے اسی لمحے مجھ سے قلم مانگا اور آٹوگراف کے صفحے پر لکھ دیا۔

ذات کا اعتبار ہے پیارے
تو ہمارا وقار ہے پیارے

وقار کی آٹوگراف بک پر بھائی جون کا لکھا شعر دیکھ کر میری تینوں بیٹیاں بھی اپنی مشترکہ آٹوگراف بک لے کر آ گئیں، انھوں نے اسی وقت ایک شعر لکھ کر آٹوگراف بک ان کو واپس کر دی۔

نغمہ ہے، شازیہ ہے اور سعدیہ ہے گھر میں
پھر شام میں ہے کیا دُکھ، کیا رنج ہے سحر میں

ان کی زود گوئی کا ایک اور واقعہ میری یادوں کے حصار سے کبھی باہر نہیں ہوا۔ کراچی، پاکستان سے تعلق رکھتا ہے وہاں میں کافی دنوں بعد اپنی بہن سے ملنے گیا تھا۔ آمد کی اطلاع ملتے ہی دوسرے دن مجھ سے ملنے آ گئے۔ بہن اور اس کے بچے ان کو جانتے

تھے اور کافی مانوس تھے۔ گفت گو کرتے کرتے جب میں نے ان کی توجہ کن پٹی پر سفید ہونے والے بالوں کی طرف مبذول کرائی اور عمر کے آگے بڑھنے کی طرف اشارہ کیا تو انھوں نے بے ساختہ ایک قطعہ کہہ کر میری سماعت کو حیرت کے سمندروں میں غرق کر دیا۔

کیا بتاؤں کہ آج تک میں نے
صرف خوابوں کا اعتبار کیا
اب مرے بال ہو رہے ہیں سفید
وقت نے کنپٹی پہ وار کیا

کسی مشاعرے میں وہ مدعو تھے۔ وہاں ایک شاعرہ بھی اپنا کلام سنانے کے لیے تشریف لائی تھی جو زرق برق لباس اور غیر معمولی میک اپ کی وجہ سے کسی فلمی ہیروئن سے کم نظر نہیں آرہی تھیں۔ اتفاق سے مشاعرے میں شاعرہ کو ان سے پہلے دعوتِ سخن دی گئی۔ شاعرہ کے کلام پر سامعین کی طرف سے داد و تحسین کے ایسے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے جس کی مثال اُردو مشاعروں میں تلاش کرنے کے باوجود بھی ملنی مشکل ہے۔ یوں کہ شاعرہ کا لباس اور میک اپ حاضرین مشاعرہ کی توجہ اور دل چسپی کا مرکز بن کر رہ گیا تھا اور یوں وہ مشاعرہ سننے سے زیادہ دیکھنے کا ہو کر رہ گیا۔

ان حالات میں شاعرہ کے بعد جب ناظم مشاعرہ نے اچانک انھیں دعوتِ سخن دے کر اسٹیج پر بلایا تو بھائی جون ہٹپٹا کر رہ گئے اور گھبرا گئے۔ شاعرہ کے بعد کسی بھی شاعر کا کلام پڑھنا اور کام یاب ہونا بہت بڑا امتحان تھا۔ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ذرا دیر بعد ہی انھوں نے خود کو سنبھالا اور ہوش و حواس کو پوری طرح یک جا کر کے اسٹیج پر آگئے اور ماحول کے مطابق اسی وقت ایک قطعہ لکھا اور پڑھا۔ قطعہ سنتے ہی سامعین کی تمام تر توجہ ان کی طرف مرکوز ہو گئی۔ اس کے بعد پورے اعتماد کے ساتھ انھوں نے اپنا کلام سنایا اور شاعرہ سے کہیں زیادہ داد سمیٹ کر مشاعرہ لوٹ لیا۔

جو رعنائی نگاہوں کے لیے فردوسِ جلوہ ہے
لباسِ مفلسی میں کتنی بے قیمت نظر آتی

یہاں تو جاذبیت بھی ہے دولت ہی کی پروردہ
یہ لڑکی فاقہ کش ہوتی تو بدصورت نظر آتی

لقمان امروہوی جب کراچی گئے تو بچپن کے دوست عالمی شہرت یافتہ آرٹسٹ اقبال مہدی (للن) سے ملاقات کرنے کی غرض سے ان کے نگار خانے واقع ناظم آباد بھی گئے۔ اتفاق سے بھائی جون وہاں موجود تھے۔ اقبال مہدی موڈ میں تھے اور لقمان امروہوی سے ذاتی مراسم ہونے کے سبب بغیر کسی فرمایش کے ان کا ایک پورٹریٹ اسی وقت مکمل کر دیا۔ لقمان امروہوی کے چہرے کی رنگت ضرورت سے زیادہ سیاہ فام ہے۔ بھائی جون نے پورٹریٹ کو چند لمحوں تک غور سے دیکھا اور لقمان کے رنگ و روپ کی مناسبت سے ایک قطعہ اس پر لکھ کر انھیں واپس کر دیا۔

کیا تقدس بیان ہو ان کا
سنگِ اسود ہیں حضرتِ لقمان
ہم مریضوں کو عقل کے للن
ہے ابھی تک ضرورتِ لقمان

میری یادداشت کے پنجرے کی کھڑکی سے باہر آنے والے ان کے بے شمار اشعار خوب صورت پرندوں کی طرح اس وقت تصور کی آفاقی رفعتوں پر پرواز کر رہے ہیں لیکن اتفاق سے ایک پرندہ، ان کا ہی ایک شعر جو تمام تر سچائیاں سمیٹ کر کبھی خود اپنے لیے ہی کہا ہوگا کسی جان لیوا پچھتاوے کی طرح میرے احساس کی منڈیروں پر تھک کر بیٹھ گیا ہے جو اب وہاں سے اُڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔

شعر اُن کی خود ساختہ خودکشی کا حلف نامہ بھی ہے اور جی ہوئی ناآسودہ زندگی کا منظر نامہ بھی۔

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

اپنی کربلا کی تلاش میں

زاہدہ حنا

جون ایلیا ایک ایسی سلطنتِ موہوم میں پیدا ہوئے جو 1757ء اور 1857ء میں معدوم ہو چکی تھی۔ وہ ایک ایسی تہذیب کے بیٹے تھے جو اپنا عہدِ کمال تمام کر چکی تھی۔ اور جس کے چراغ اب دھواں دے رہے تھے۔ انھیں ایک ایسی تاریخ میسر آئی جس میں پے بہ پے شکستوں کی دھند تھی اور انھیں ایک ایسا جغرافیہ ورثے میں ملا جس پر غیر ملکی آقاؤں کی حکم رانی تھی۔ ان آقاؤں کی جو 1914ء میں دنیا کے مختلف محاذوں پر اپنی فتوحات کی بنیاد میں محروم ومحکوم برصغیر کے بیٹوں کا لہو اور ان کی ہڈیاں کھاد کر چکے تھے۔

ایک ایسے سماج میں جون ایلیا کی سائیکی نمو پذیر ہوئی جہاں وقت کی طنابیں کھنچی ہوئی تھیں اور جہاں تقویم کا وقت تو بہ ہر طور گزر جاتا تھا لیکن تاریخ کا وقت ٹھہر گیا تھا۔ انھوں نے ایک ایسے ماحول میں زندگی کی جہاں ان کے اجداد اپنی جاگیریں اور جائیدادیں، نازنینوں کے اشارۂ ابرو پر اور ان کے مہندی لگے پیروں کی ایک ٹھوکر پر نثار کر چکے تھے اور اب بھربھرائی ہوئی دیواریں، گرتی ہوئی محرابیں، دیمک زدہ چوکھٹیں اور ویران سہ دریاں رہ گئی تھیں۔

مرشد آباد کے کرگھوں کی گردش کو رُکے ہوئے اور نور بافوں کے انگوٹھوں کو کٹے ہوئے صدیاں گزر گئی تھیں۔ ہندوستان جنت نشان کا سوتی اور ریشمی کپڑا، چینی کے برتن، کھلونے، تصاویر اور چاندی کا سامان جو کبھی انگلستان کے بازاروں میں بکتا تھا، اب قصہ کہانی بن چکا تھا۔ برصغیر کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے کاری گروں کی آنکھیں اور ہاتھ پتھرا چکے تھے۔ جنگِ پلاسی سے حاصل ہونے والی رقم سے 1785ء میں انگلستان میں کپڑا بننے کی پہلی مشین کو

ایجاد ہوئے اور صنعتی انقلاب کو برپا ہوئے زمانے گزر چکے تھے۔ ہندوستان اب انگلستان کے لیے بہترین منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ نیم برہنہ کسان نیل اور کپاس کے کھیتوں میں جھکے جھکے دہرے ہو چکے تھے۔ خواندہ اور نیم خواندہ ہندوستانی مرد، سرکاری محکموں کی فائلوں میں اپنی صلاحیتیں اور ذہانتیں دفن کر رہے تھے۔ صرف بنگال ہی نہیں سارا برصغیر بھوکا تھا اور مٹھی بھر افراد کو چھوڑ کر برصغیر کے لوگ مفلسی اور بدحالی کے گھنے سائے میں بلکتے تھے۔

کسی ایسے ویران اور پالا مارے ہوئے سماج میں بیش تر سفید پوش گھرانے نئے حقائق سے سمجھوتا کرنے کے بجائے، آج کی نکبت پر کل کے بھرے پرے قصوں کا پردہ ڈالتے ہیں اور ان واقعات کو دہراتے ہیں جب ان کے اسلاف میں سے کوئی قاضی القضاۃ ہوتا تھا اور کوئی سلطان ان کی بیٹی کی خواست گاری کرتا تھا۔

ایسے گھرانوں میں جنم لینے والے زود حس، ذہین اور ذکی بچے اپنے حال کی بیت ناکی سے گھبرا کر، احساسِ برتری کی اس شہ نشین میں جا کھڑے ہوتے ہیں جو تاریخ کے کسی دور میں یقیناً موجود ہوتی ہے لیکن جس کی لحۂ موجود میں کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہوتی۔

جون ایلیا نے ایک ایسے ہی دور میں جنم لیا اور اپنے طبقے کی بے بسی اور محرومی ان کی بنیادوں میں اُتر گئی۔ انھیں خواہش پہلوانی کی تھی لیکن جثہ اس میدان میں زور کرنے سے باز رکھتا تھا۔ اداکاری کی طرف دل کھنچتا تھا لیکن اس طرف رُخ کرنے سے عزتِ سادات خطرے میں پڑتی تھی، چناں چہ انھوں نے گھبرا کر ان نیم تاریک کمروں میں پناہ لی جن میں رکھی ہوئی الماریاں عربی اور فارسی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مردان خانے کے ماحول نے ان کے تخلیقی وفور کی رہ نمائی شعروسخن کی طرف کی اور وہ گرہ میں شاعری کا گوہرِ شب تاب رکھ کر تاریخ اور فلسفے کی بھول بھلیوں میں نکل گئے۔

زندگی کی حقیقتوں سے ناتا نہ جوڑنے اور محض کتابی ماحول میں سانس لینے کے سبب جون ایلیا نے ابتدائے عمر سے ہی ایک فرضی دنیا آباد کی۔ وہ دمشق، دیلم اور بغداد و بصرہ کے باشندے تھے۔ ان کا کلام آلِ برامکہ اور آلِ بویہ سے تھا۔ وہ شخص جو زندگی بھر کبھی ایک چوزہ ذبح نہ کر سکا اور ذوالجناح کے سوا کسی رہوار کی ایال پر ہاتھ نہ رکھ سکا، وہی خیالوں میں رستم و سیاوش کی طرح گورخر شکار کرتا، اسے آگ پر بھون کر کھاتا اور 'رخش' پر سواری کرتا۔

Scanned with CamScanner

ان کی محبوبائیں عشتار، شولمیت اور منیژہ کی ہم پلہ تھیں۔ اپنے محبوب کو پاتال سے زندہ کر کے لاتی ہوئیں، غزالوں کی اور میدانوں کی ہرنیوں کی قسم کھاتی ہوئیں اور مطلوب و معشوق کے لیے زر و جواہر کے انبار اور تاج و تخت کو ترک کرتی ہوئیں۔

خوابوں کی اس سریت آمیز وادی میں جون ایلیا تموز تھے۔ مادر سری عہد کے درمیانی اور عبوری دور کا مرد نمائندہ، بے عمل ہیرو، وہ مرد جو محبوبہ سے ماں کی سی محبت کا طالب ہوتا ہے۔ وہ ہیرو جسے دشت نوردی اور آبلہ پائی سے خوف آتا ہے اور جس کا عزم و ارادہ اپنی محبوبہ کے سامنے کم ٹھیرتا ہے۔ جو اسے آگے بڑھ کر حاصل کرنے کے بجائے اس بات کا انتظار کرتا ہے کہ وہ سیم تن نہ صرف اظہارِ عشق میں پہل کرے بل کہ تکملۂ عشق بھی اسی کا فریضہ ٹھیرے۔ اور جو اپنی بے عملی اور کم ہمتی کو 'نرگسیت' کی اصطلاح کا لبادہ پہناتا ہے۔

وہ عہد نامہ عتیق کے سحر میں تھے اور اس سحر سے آج تک آزاد نہ ہو سکے ان کی نظموں اور ان کے انشائیوں پر عہد نامے کی گہری چھاپ ہے۔ اس کے مضمون سے انھوں نے یرمیاہ نبی کا کردار اُٹھایا اور اسے لباس کی طرح پہن لیا۔ انھوں نے اپنے آبائی وطن کو 'یروشلم' فرض کیا اور تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی اتھل پتھل کو 'یروشلم کی اسیری' سے تعبیر کیا۔ وہ جس زمین میں صدیوں سے آباد ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ تقسیم اس کے زمین و آسمان پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہوائیں اور فضائیں بدل گئی تھی۔ اس نئی ہوا اور بدلی ہوئی فضا میں اپنے آپ کو پھر سے کاشت کرنا ایک فرہادی عمل تھا۔ ان سے توقع اسی کی تھی لیکن وہ بھی لاکھوں آدم زادوں کی طرح اپنے آپ کو ماں مٹی سے اکھاڑ کر اور اپنی جڑیں اپنے شانے پر دھر کر وہاں سے چل دیے اور اپنے اس اقدام کو 'اسرائیل کی دربدری' قرار دیا۔ یہ کہتے ہوئے وہ شاید اس تاریخی حقیقت کو بھلا بیٹھے تھے کہ یرمیاہ نبی نے جب یروشلم کا مرثیہ لکھا اور یہ لکھا کہ 'وہ خاتونِ اقوام بیوہ سی ہوگئی' تو اس نے ایک مفتوح شہر کا نوحہ لکھا تھا جب کہ جون ایلیا کی زمین، ان کی بستیاں اور ان کے شہر تو فاتحوں کے تسلط سے آزاد ہوئے تھے۔ اس علاقے سے بیش تر لوگوں کی ہجرت، جبری نہ تھی، اختیاری تھی اور من و سلویٰ کی تلاش میں تھی چناں چہ نہ ان پر یرمیاہ نبی کا لبادہ سجتا ہے اور نہ اپنے آپ کو جڑوں سے اکھاڑ کر شہر بہ شہر پھرنے والے اپنی اس 'ہجرت' کا الزام تاریخ کے کسی بخت نصر کے سر دھر سکتے ہیں۔

انھوں نے قدیم رزمیوں اور داستانوں سے اپنے لیے اساطیری اور نیم تاریخی واقعات اور کردار منتخب کیے۔ یوسف کنعانی کی کہانی ان کا دل لبھاتی تھی، سوانھوں نے برادرانِ یوسف ایجاد کیے کہ ان کا وجود نہ ہوتو مصر کے بازار میں یوسف کا بکنا ممکن نہیں۔ کبھی عیسیٰ ابنِ مریم کا کردار انھیں اپنی طرف بلاتا اور وہ اپنے لیے صلیب تیار کرنے میں جت جاتے اور کبھی ابنِ حلاّج انھیں آوازیں دیتا۔ اس کے بریدہ بازوؤں اور اس کے پورپور ٹخنوں سے بہتا ہوا اور 'اناالحق' کی صدائیں لگاتا ہوا خون انھیں رجھاتا اور وہ بھی اپنے لیے ایک سولی کھڑی کیے جانے کی تمنا کرتے۔ اپنے تہذیبی اور خاندانی پس منظر کے سبب کربلا کا منظرنامہ انھیں بے پناہ محبوب تھا، سوٗنیزے کی انی پر ٹکا ہوا سرِ حسین انھیں اپنی طرف کھینچتا۔

دیکھا جائے تو سقراط سے سرمد اور حسین سے حلاّج تک ان کے جتنے بھی محبوب کردار ہیں۔ ان کرداروں کے دام میں گرفتار ہو کر جون ایلیا نے اپنی ذات میں ایک ایسے شخص کو تعمیر کیا جس کا مسئلہ اس کی اپنی کربلا کی تلاش تھی۔

سولیاں ان کے لیے گڑتی ہیں، صلیبیں ان کے واسطے کھڑی کی جاتی ہیں اور کربلائیں ان کی خاطر برپا ہوتی ہیں جو اپنے عہد کے سچ سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب اپنا سفر ابتدا کرتے ہیں تو جان دینے کے لیے نہیں، دوسروں کے لیے راحتِ جاں بننے کے لیے نکلتے ہیں۔ راحتِ جاں بننے کے اس عمل کے دوران ان لوگوں کی نظروں میں زندگی اس قدر حقیر ہو جاتی ہے کہ راہِ طلب میں اگر سولی چڑھنے یا سر دینے کا مرحلہ درپیش ہوتو وہ اس منزل سے ایسی سہولت اور بے نیازی سے گزر جاتے ہیں جیسے انھوں نے بس ایک گہری سانس لی ہو۔ یہ لوگ کسی کربلا کی تلاش میں اور کسی صلیب کے سراغ میں نہیں نکلتے۔ کربلائیں اور صلیبیں خود ان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

جون ایلیا نے بہت دنوں حجرۂ ذات میں لاف وگزاف اور عجز وانکسار کی زندگی کی اور فلسفے کے اسطوانے پر کھڑے ہو کر آسمانوں سے کلام کیا۔ خارج کی سچائیوں سے اپنا رشتہ استوار کرنے اور ذہنی حقیقتوں کو اپنے نفس میں نافذ کرنے کی گھڑیاں تیزی سے گزر رہی ہیں۔ رہا کربلا کی تلاش کا مسئلہ تو وقت نے اگر ان کے لیے کوئی کربلا تجویز کی ہے تو وہ سجدہ گزارتی ہوئی خود ہی ان کی طرف چلی آئے گی۔

خیال کی خوش بو

پروفیسر سحر انصاری

میرے والد مقبول احمد چشتی کے مراسم مراد آباد اور امروہہ کی نسبت سے رئیس امروہوی سے دیرینہ تھے۔ پاکستان آنے کے بعد ملاقاتوں کے زیادہ مواقع میسر آتے رہے۔ 56-1955ء میں، جب میں کالج کا طالب علم تھا اور شاعری کا بھی کچھ نہ کچھ سلسلہ جاری تھا، میرے والد نے رئیس صاحب سے میرے ادبی رجحانات کا تذکرہ کیا اور پھر رئیس صاحب کے دفتر 'شیراز' میں ملاقات کی غرض سے لے گئے۔ رئیس صاحب اُس وقت کھارادر کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے جہاں سے ان کا دفتر پندرہ، بیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ مجھ سے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آنے لگے، یہاں تک کہ میں رفتہ رفتہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے میں اس خاندان کا ایک فرد ہوں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ چند دن بعد میرے سب سے چھوٹے بھائی جون ایلیا امروہہ سے آرہے ہیں، وہ بہت اچھے شاعر ہیں اور آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ اس وقت تک میں چاروں بھائیوں اور ان کی عرفیت سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ بھائی رئیس اچھن تھے، سیّد محمد تقی چھبن تھے، بھائی عباس بچھن اور جون تو جون ہی رہے۔ خاندان کے بچوں نے ان پر ایک شعر بنا رکھا تھا جو وہ کورس کے انداز میں کبھی کبھی پڑھا کرتے تھے۔

اچھن، چھبن، بچھن، جون
ان چاروں میں اچھا کون؟

ایک دن سہ پہر کے وقت میں 'شیراز' کے دفتر میں بھائی رئیس کی خدمت میں حاضر

تھا کہ ایک جوان العمر شخص دفتر میں داخل ہوا۔ بھائی رئیس نے کہا: آؤ بھئی جون آؤ، اچھے آئے۔ ان سے ملو، یہ نئی نسل کے اچھے شاعر ہیں سحر انصاری۔ ان کے ابا کا تعلق بھی مراد آباد اور امروہے سے رہا ہے۔'

جون ایلیا دفتر میں کھڑے تھے، میں نے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور گلے ملنے کے بعد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ جون ایلیا ململ کے کرتے پاجامے میں ملبوس ہیں، گرمی کا موسم تھا لیکن وہ شانوں پر کمبل ڈالے ہوئے تھے اور پیروں میں کھڑاویں تھیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ کھارادر سے اسی طرح کھڑاؤں پہنے چلے آئے۔ کچھ دیر کے بعد یہ راز کھلا کہ وہ یونانی فلسفیوں سے بہت متاثر ہیں اور اپنی وضع قطع میں فیشن وغیرہ کے قائل نہیں ہیں۔

جون ایلیا سے پہلی ہی ملاقات میں ذہنی و قلبی قربت کا احساس ہوا۔ انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں بتا دیا کہ مجھے پہلوانی کا شوق رہا ہے۔ اکھاڑے میں ورزشیں بھی کی ہیں اور ڈراموں میں بھی اداکاری کی ہے۔ اس وقت کے پرانے دوستوں میں وہ 'طہیر نفسی' کا نام لیتے تھے جو نفسیات کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ امروہہ سے آتے وقت اچھے خاصے افراد ٹرین پر سوار کرانے آئے تھے اور اُن کے لیے اُن کے استاد نے عربی میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔

جون اس وقت بھی دبلے پتلے اور کمزور نظر آتے تھے۔ بڑے فخر سے یہ سناتے تھے 'بھائی سحر! میں ٹی بی میں مبتلا رہا ہوں، خون تھوکتا رہا ہوں۔' اسی طرح اس وقت کی نظموں میں 'فارہہ' کے نام نظمیں بھی سنائیں۔ اندازہ ہوا کہ وہ گلے گلے تک ایک رومان پسند شاعر ہیں جس کے آئیڈیل جون کیٹس اور مجاز ہیں۔ اسی اثنا میں ہمارے حلقۂ احباب میں انجم اعظمی، قمر ہاشمی، محمد علی صدیقی، س م صولت اور رسول احمد کلیمی شامل ہو گئے، جنھوں نے اس وقت ندیم انصاری کے قلمی نام سے لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ 'شیراز' کے دفتر میں ملاقاتیں ہوتی رہیں پھر جون ایلیا کے لیے مصروفیت کا ایک شعبہ بھائی رئیس اور بھائی تقی نے یہ تلاش کیا کہ 'انشا' کے نام سے ایک ماہ نامے کا اجرا کر دیا گیا جس کے مدیر جون ایلیا تھے۔ اس رسالے سے میری وابستگی بھی بہت رہی۔ اُسی میں جون ایلیا نے میرے مختصر حالات، تصویر اور کلام شایع کیا۔ پھر میں کئی برس تک کراچی کی ادبی نشستوں کا حال 'نشستند و گفتند و برخاستند' کے عنوان سے لکھتا رہا۔ ان تحریروں کو اگر یک جا کر دیا جائے

تو 1960ء کی دہائی میں کراچی کی ادبی فضا اور سرگرمیوں کا ایک مجموعی مرقع سامنے آسکتا ہے۔
جون ایلیا کو اب اُن کی فلسفیانہ وضع قطع سے الگ کر لیا گیا اور ہم سب نے
جدید فیشن کے سوٹ سلوائے اور اب ایک نئے طرز کے ادبی ماحول کو نکھارنے میں مصروف
ہو گئے۔ جون ایلیا بعض جدتوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے، مثلاً میں نے ایک دن ایک خط
انھیں لکھا اور لفافے پر نام اور پتا یوں درج کیا۔

حضرت جون ایلیا صاحب

سردبیر مجلّہ انشا

ینگ ہسبنڈ روڈ، کھارادر

بہت خوش ہوئے۔ اس طرح کی تبدیلیوں سے اُن کے مزاج میں شگفتگی آتی گئی اور
ہنسنے بولنے اور اچھے فقرے کہنے اور سننے کا ایک ماحول بننے لگا۔ اُسی زمانے میں
اُردو ڈکشنری بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ جوش ملیح آبادی اس کے مدیرِ اعلیٰ اور شان الحق حقی
بورڈ کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ دیگر حضرات میں نسیم امروہوی، حمید الدین شاہد، زکریا مائل،
قدرت نقوی عملے میں شامل تھے۔

طے یہ پایا کہ یہ بڑی لغت پہلے سے موجود لغات کے ذریعے تیار نہیں کی جائے گی
بل کہ قدیم ترین اُردو مخطوطات اور مطبوعات سے لے کر دورِ حاضر تک کے اصل متون
پڑھے جائیں گے۔ اُن کا تاریخی تسلسل، اسناد اور حوالوں کے ساتھ پیش کیا جائے گا اور
تشریحات مدیران لکھیں گے۔ چناں چہ اس زمانے میں بھائی رئیس، بھائی تقی، بھائی جون
اور میں کتابوں کے متون پڑھنے اور اسناد کے کارڈ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یہی زمانہ تھا
جب بھائی رئیس کا خاندان کھارادر سے منتقل ہو کر خوجہ جماعت خانہ (گارڈن ایسٹ) کے
قریب ایک کوٹھی میں سکونت پذیر ہو گیا۔ اس میں کئی اضافے ہوئے، مثلاً انشا کے دفتر کے
ساتھ ساتھ بھائی تقی نے 'مشرق' کے نام سے ایک پریس قائم کر دیا۔ اس کوٹھی میں ایک بڑا
لان بھی تھا جہاں شام کو ایسی محفلیں جمتی تھیں جو واقعی یادگار تھیں۔ جوش ملیح آبادی، جی الانہ
جیسے بزرگوں سے لے کر عام نوجوان ادیب، شاعر اور طلبہ بھی شریک ہو جاتے تھے۔ ویسے
تو پوری کوٹھی پر جون ایلیا کا بھی تصرف تھا لیکن انھوں نے اپنی خواب گاہ کے طور پر ایک چھوٹا

سا کمرا منتخب کر لیا تھا جسے وہ حجرہ کہتے تھے۔ اس حجرے میں بھی بہت یادگار نشستیں ہوئیں۔

ادبی رسالے کسی زمانے میں بھی منافع بخش نہیں رہے۔ پھر وہ زمانہ تو ایوب خاں کے مارشل لا اور آمریت سے عبارت تھا جو بالآخر 1971ء کے سقوطِ ڈھاکا پر منتج ہوا اور مشرقی پاکستان سے سابق پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد بے سروسامانی کے عالم میں آنے لگی۔ حالات و مسائل کے پیشِ نظر 'انشا' کو ادبی پرچے کے ساتھ ساتھ ایک ڈائجسٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ مالی مشکلات کے سبب جون ایلیا نے کچھ مدت ڈکشنری بورڈ میں، انجمن ترقی اُردو میں اور پھر اسماعیلی ایسوسی ایشن میں ملازمت کر لی لیکن اُن کی تلون مزاجی کسی جگہ بھی مطمئن نہ ہوئی۔

1966ء میں میری شادی خیر النسا سے ہوئی۔ بھائی رئیس کے خانوادے نے اس میں بھرپور دل چسپی لی۔ یہاں تک کہ بھائی رئیس کی شیروانی ہی میں مجھے دولھا بنایا گیا اور ہم جب نکاح کے لیے اپنے سسرالی مکان پر پہنچے تو چند ایک قریبی عزیزوں کے علاوہ بھائی رئیس، بھائی تقی، بھائی جون، محمد علی صدیقی، ممتاز سعید، شفیق حسن زیدی، انجم اعظمی، خلیل صدیقی اور پیار علی الانہ اُس میں شریک ہوئے۔ شادی کی تقریب پر اس وقت ایک ادبی نشست کا گمان ہو رہا تھا۔ چند دوستوں نے بھائی رئیس سے فرمائش کی کہ اس موقع کی مناسبت سے کچھ قطعات تو فرمائیے۔ بھائی رئیس نے فارسی اور اُردو میں فی البدیہہ تاریخی قطعات کہنے شروع کر دیے۔ اب شادی کے گھر میں کاغذ کس سے مانگا جائے؟ چناں چہ دوستوں نے جیبوں سے نئے نئے نوٹ نکالے اور انھیں پر قطعات لکھواتے گئے۔ بھائی رئیس اس شادی سے بہت خوش ہوئے۔ اپنی قیام گاہ پر ہمارے لیے پرتکلف دعوت کا اہتمام بھی کیا۔ اس کے بعد وہ کہا کرتے تھے۔ 'بھائی! اب جون کو بھی شادی کر لینی چاہیے، مگر میں ڈرتا ہوں کہ جون نبھا بھی سکیں گے کہ نہیں۔' اس تبصرے پر جون ایلیا قدرے جھنجھلا کر مجھ سے کہتے 'بھائی سحر! میں کتنی شادیاں کر کے چھوڑ چکا ہوں جو بھائی کو میری طرف سے یہ اندیشہ لاحق ہے۔'

پھر یوں ہوا کہ جون ایلیا، زاہدہ حنا کے حق میں دلیلیں دینے لگے۔ زاہدہ اُس وقت اپنے والدین کے ساتھ جوبلی سنیما کے علاقے میں ایک فلیٹ میں رہتی تھیں۔ شادی سے

قبل میں بھی کئی بار بھائی جون کے ساتھ زاہدہ سے ملا۔ بھائی جون کے مزاج میں وہی تذبذب، بے یقینی اور تشکیک جاگزیں تھی جو آخر دم تک اُن کے ساتھ رہی۔ چناں چہ زاہدہ کے بارے میں کبھی کوئی رائے دیتے، کبھی کچھ اور۔ لیکن میں نے ہمیشہ انھیں اس صورتِ حال کو بہتر شکل دینے اور زاہدہ حنا کو شریکِ حیات کے طور پر اپنانے کے حق میں دلیلیں دیں۔ بہ ہر حال شادی کے بعد وہ بہت خوش رہے۔ میں نے خود دیکھا کہ زاہدہ، جون ایلیا کو صبح تیار کرواتیں اور بچوں کی طرح اُن کے بال سنوارتیں اور خود کار ڈرائیو کر کے انھیں، ان کے دفتر پہنچاتیں۔

بھائی جون کی شاعری مقبولیت حاصل کرتی رہی، مشاعروں میں انھیں ذوق وشوق سے سنا جاتا۔ اُس وقت کے شاعروں میں حمایت علی شاعر، حبیب جالب، خالد علیگ، جون ایلیا، محسن بھوپالی بہ طور خاص مشاعروں میں سنے جاتے تھے۔ اس زمانے میں جون کے چند قطعات اور نظم 'دو آوازیں' بہت مقبول ہوئی۔ ان مشاعروں میں جو لوگ شریک ہوتے تھے، اُن میں ادیب اور شاعر بھی تھے، سیاسی لیڈر بھی اور طالب علم رہ نما بھی۔

بھائی جون کبھی کبھی بہت جدید بن جاتے تھے اور کبھی بہت روایتی، مثلاً کھانے میں مونگ کی کھچڑی، پودینے کی چٹنی یا اڑد گوشت کی فرمایش کرتے۔ ایک دن موڈ ہوا کہ 'سحر بھائی! ہری مرچوں والا قیمہ کھائیں گے اور میں پکاؤں گا۔'

میں نے اپنی اور اپنے بھائیوں کی پڑھائی کے لیے ایک علیحدہ مکان لے رکھا تھا۔ وقت مقررہ پر بھائی جون، انجم اعظمی، س م صولت اور میرے محلے کے دوست خلیل صدیقی یک جا ہو گئے۔ سب مل کر گوشت مارکیٹ روانہ ہوئے تو پتا چلا کہ آج گوشت کا ناغہ ہے، پھر بھی قصائی سے پوچھا کہ 'بھائی اگلے دن کے لیے گوشت کب آئے گا؟'

اس نے دو ڈھائی بجے رات کا وقت بتایا۔ اس اثنا میں تندوری پراٹھے پکانے کے لیے گھی اور آٹا بھی تندور والے کو دے آئے تھے۔ بہ مشکل رات کو دو، ڈھائی بجے ہم پھر مارکیٹ پہنچے۔ قصائی نے کہا، 'بھائی اس طرح گوشت تھوڑی بکتا ہے۔ اس کو ابھی دھوئیں گے، صاف کریں گے، اس کے الگ الگ حصے کریں گے، پھر آپ کو آپ کے مطلب کا قیمہ دیں گے۔' اس وقت بھائی جون کی بے چینی اور بے بسی دیدنی تھی۔ خدا خدا کر کے

سب سامان لے کر گھر پہنچے۔ پکانے کے دوران ہنسی مذاق اور فقرے بازی بھی چلتی رہی، آخر بھائی جون نے یہ مژدہ سنایا کہ قیمہ تیار ہو گیا ہے۔ اس وقت صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ پھر جو لطف اُس وقت کے کھانے میں سب کو محسوس ہوا، اس کا بیان ممکن نہیں۔

بھائی جون اکثر ایسی باتیں مشہور کروانا چاہتے تھے جو حلقوں میں پھیلیں اور لوگ ان پر تبصرے کریں۔ وہ کہتے تھے، 'زندگی کے واقعات مجاز کی طرح عام ہونے چاہئیں۔' انھیں متضاد اور عجوبہ فقرے یا باتیں کرنے میں بھی ایک خاص لطف آتا تھا مثلاً وہ کسی خاتون یا مرد کے بارے میں یہ کہہ دیتے تھے، 'اس کے ساتھ میں ساری زندگی گزار سکتا ہوں لیکن تین گھنٹے نہیں رہ سکتا۔'

واقعات تو بہت سے ہیں لیکن چند ایک کا ذکر مناسب رہے گا۔ ہمیں ایک بار امریکا اور کینیڈا مدعو کیا گیا۔ میزبانوں میں اشفاق حسین، نسیم سیّد، اطہر رضوی، شاہین، اکرام بریلوی، ظفر، اقبال حیدر اور دیگر احباب شامل تھے۔ مدعوئین میں احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، محسن احسان اور ان کی بیگم ثروت، پروفیسر فتح محمد ملک، جون ایلیا اور میرا نام شامل تھا۔ کراچی سے طیارے میں بیٹھنے کے بعد جون ایلیا نے کہا، 'بھائی سحر! میں آپ کی سیٹ کے ساتھ برابر ہی بیٹھوں گا اور تین ماہ تک پورے سفر میں بٹن کی طرح آپ کے ساتھ لگا رہوں گا۔' ہم جب نیویارک ایئرپورٹ پر اُترے تو ایک کھڑکی پر میں اور بھائی جون اپنے اپنے پاسپورٹ پر مہریں لگوانے پہنچ گئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے امریکی نے جون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا، 'Is she your wife' میں نے ہنس کر جواب دیا، 'No! He is my male friend.' ہم حیران ہوئے کہ اس سوال کی کیا تک تھی؟ پتا چلا کہ اپنے دبلے پتلے جسم، کھڑے ناک نقشے اور لمبے بالوں کی وجہ سے وہ میکسیکو کی کوئی خاتون معلوم ہو رہے تھے، اُس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے جو لانگ کوٹ پہن رکھا تھا، وہ زنانہ تھا جس کے بٹن دیکھ کر ہی اسے شبہ ہوا تھا کہ وہ کوئی خاتون ہیں۔ میں نے اس تبصرے اور تجربے کا کسی سے ذکر نہیں کیا لیکن جب میں نے دیکھا کہ بھائی جون سب کو مزے لے لے کر خود یہ واقعہ سنا رہے ہیں تو میں نے بھی احتیاط کرنی چھوڑ دی۔

امریکا پہنچ کر انھیں 'لال پری' سے کچھ زیادہ ہی عشق ہو گیا، یہاں تک کہ کھانے پر

بھی توجہ ختم ہوگئی۔ ایک اچھی دعوت کا اہتمام نیویارک کے 'روز ویلٹ ہوٹل' میں ہوا، وہاں بھی ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد جون نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ نسیم سیّد کے اصرار پر کہتے رہے، 'تیری جان کی قسم! میں کھالوں گا، بھوکا نہیں رہوں گا۔' جب ہوٹل سے سب لوگ باہر نکلے تو جون بھائی نے اپنے لانگ کوٹ کی جیب سے ایک ٹشو پیپر نکالا جس میں ایک سینڈ کباب لپٹا ہوا تھا۔ نسیم سیّد کو دکھا کر بولے، 'دیکھ! اب یہ میں کھالوں گا۔'

یہ سفر ہر اعتبار سے بہت یادگار رہا۔ نیوجرسی میں میری بہن نجمہ اور بہنوئی عرفان رہتے ہیں، وہ روزانہ ہمیں کار میں بٹھا کر نیویارک پہنچا دیتے اور شام کو سیر سپاٹے کے بعد ہم واپس ہو جاتے۔ نیوجرسی ہی میں زرین یاسین اور یاسین زبیری تھے جنھوں نے بڑی محبت سے ہمیں اپنے گھر میں رکھا۔ صبیحہ صبا امریکا کی ادبی فضا میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہیں، وہ واحد لڑکی تھی جو ہمارے لڑکوں کے اسکول میں داخل ہوئی تھی۔ ان کے شوہر عبدالحیّ میرے ہم جماعت تھے۔ ہم جب نیویارک سے مشاعرے میں شرکت کے لیے 'کارنیل یونی ورسٹی' گئے تو عبدالحیّ نے ہی کار چلانے کا ذمہ لے رکھا تھا۔ حمیرا رحمان، وکیل انصاری، حنیف اخگر، سعید وارثی یہ سب بڑے خلوص سے پیش آتے رہے۔ نیویارک سے ہم لاس اینجلس اور شکاگو بھی گئے۔ وہاں شمیم آرٹسٹ اور ان کی بیگم ڈولی سے ملاقات ہوئی۔ فارغ بخاری کے بیٹے ظفر عباس نے لاس اینجلس میں مشاعرے کا انتظام کیا۔ ہم لوگ ہالی وڈ بھی گئے اور خواجہ خالد اور ان کی بیگم کی بہ دولت لاس ویگاس کا بھی دورہ کرلیا۔

شکاگو سے کینیڈا آتے ہوئے نہ معلوم کیوں رینڈم چیکنگ کے لیے جون ایلیا کو روک لیا گیا۔ فلائٹ کے جانے میں چند منٹ رہ گئے۔ ہم نے بھائی جون اور اپنے سامان کو مقامی میز بانوں کے سپرد کیا اور ٹورنٹو پہنچ گئے۔ بعد میں بھائی جون بھی آن ملے۔ یہاں ہم نے عام مشاعروں کے علاوہ اطہر رضوی کا وہ مشاعرہ بھی پڑھا جو وہ ہر سال غالب کی یاد میں غالب کے مصرعہ طرح پر منعقد کرتے ہیں۔ پھر ہم کیلگری گئے جہاں اقبال حیدر اور اُن کے اہلِ خانہ نے بہت محبت اور خلوص کے ساتھ ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھا۔ ہمارے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس بھی ہندوستان سے آگئے تھے۔ اُس وقت کیلگری میں برف پڑ رہی تھی اور درجۂ حرارت منفی 45 ڈگری تھا۔ ہر چیز منجمد نظر آتی تھی لیکن گھروں، دفتروں اور

بازاروں میں Heating کا اس قدر معقول انتظام تھا کہ گھر میں تو عام پینٹ شرٹ میں ہی گزارا ہو رہا تھا۔

وہاں شہزاد احمد اور جون ایلیا ایک کمرے میں سوتے تھے۔ بھائی جون ہر صبح (جو بھائی جون کے لیے وہاں کے وقت کے مطابق عموماً بارہ، ایک بجے دوپہر کو ہوتی تھی) کھانے کی میز پر کہتے تھے، 'بھائی میں گزشتہ چھ مہینوں سے نہیں سویا۔' اور فوراً ہی شہزاد احمد کہتے، 'تو یہ رات بھر خراٹے لے کر میری نیند کون حرام کرتا ہے؟'

ہمارے قیام امریکا کے دوران پروین شاکر 'ہارورڈ یونی ورسٹی' میں سرکاری بنیاد پر ریسرچ کا کوئی کورس مکمل کر رہی تھیں۔ انھوں نے ہمیں لنچ پر مدعو کیا۔ احمد ندیم قاسمی، فتح محمد ملک، محسن احسان، شہزاد احمد، جون ایلیا اور میں دو الگ الگ کاروں میں روانہ ہوئے۔ ہم یاسین زبیری کی گاڑی میں تھے اور راستے میں خوب لطیفے بازی اور اشعار کی پیروڈی چلتی رہی۔ قاسمی صاحب کا مصرع دیا گیا۔

میں نے تو دیا بجھا دیا ہے

خوب طبع آزمائی ہوئی۔ بھائی جون کو شہزاد احمد کا یہ مطلع بہت پسند آیا۔

اے جون! یہ تُو نے کیا کیا ہے
تُو نے مجھے ایلیا دیا ہے

اپنے خاص انداز میں آنکھیں مٹکا کر کہا، 'واہ بھئی شہزاد! یہ نیا لفظ دیا تم نے اُردو کو...... ایلیانا'

جب ہم 'اوٹ وا' پہنچے تو مشہور شاعر ولی عالم شاہین کے یہاں قیام کیا۔ شاہین اور ان کی بیگم نے اپنے بچوں سمیت زندگی کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اور شاہین وہاں کی سماجی اور ادبی زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انھی کی وجہ سے اوٹ وا کے پارلیمنٹ ہاؤس میں اُردو کا پہلا مشاعرہ ہوا۔ صدارت احمد ندیم قاسمی نے کی، نظامت میرے سپرد کی گئی۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ خیر سگالی کے طور پر کینیڈین اراکین پارلیمنٹ بھی سامعین میں شامل تھے۔ پھر ہمارا قیام 'ونی پیگ' میں ہوا جہاں عرفانہ عزیز اور ان کے شوہر پروفیسر ریاض احمد کئی سال سے مقیم تھے۔ اُس وقت تک جون ایلیا کا پہلا شعری مجموعہ 'شاید' شایع ہو چکا تھا۔ کئی حلقوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ جون ایلیا کے دیباچے کو بہ طورِ خاص سراہا۔

ہم کینیڈا سے دوبارہ شکاگو گئے اور وہاں افتخار نسیم کے مہمان ہوئے۔ اس وقت ہم تین ہی اس سفر میں ساتھ تھے۔ میں، شہزاد احمد اور جون ایلیا۔ خوب سیر تفریح ہوئی۔ ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں مظفر الدین فاروقی اور حبیب انصاری نے بھی خصوصی حصہ لیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے سفیر امریکا عابد حسین تھے اور پاکستان کی سفیر عابدہ حسین۔ چناں چہ تقاریر میں امریکی روایت کے مطابق جب 'امبیسیڈر حسین' کہا جاتا تھا تو یہ سمجھنے میں ذرا دیر لگتی تھی کہ عابد کا ذکر ہے یا عابدہ کا۔

افتخار نسیم جنھیں سب 'افتی' کہتے ہیں، شکاگو کی سماجی زندگی میں بہت دخیل اور مقبول ہیں۔ سماجی کاموں میں ایڈز کے مریضوں کو بہ طورِ خاص امداد پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ وہ شکاگو لیک کے قریب تینتالیسویں منزل پر رہتے ہیں اور کاروں کی ایک بڑی فرم میں ملازم ہیں۔ اُن کے یہاں ہم نے خوب بے سلیقگی اور بے ہنگم قسم کے شب و روز گزارے۔ برتن دُھلے بغیر سنک میں پڑے ہیں، مونگ پھلی اور اخروٹ کے چھلکے جا بہ جا بکھرے ہیں، جوتے کہیں، موزے کہیں، بستر کے کمبل اور چادر گڈمڈ ہوتے ہوئے عجب سماں پیش کرتے تھے۔ افتی نے ایک معمر یورپی خاتون کو گھر کی صفائی کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ جو اتوار کے دن گھر کی صفائی کرنے آتی تھی۔ اس نے گھر کو تتر بتر دیکھ کر حیرت کے عالم میں جون ایلیا کی طرف دیکھا اور افتی سے کہا:

"You have made a mess of everything."

"Who are they?"

افتی نے جواب دیا:

"Poets and writers."

بڑھیا نے منھ بسور کر کہا:

"Oh! They are the same all over the world."

پاکستان کے علاوہ دبئی، ابوظبی اور دوحہ (قطر) کے مشاعروں میں بھی جون ایلیا کا ساتھ رہا۔ ہر جگہ وہ بہت توجہ اور دل چسپی سے سنے جاتے تھے اور مشاعرے کی کام یابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ تاہم رفتہ رفتہ شعر خوانی کے ساتھ ساتھ اپنی باڈی لینگویج سے بھی خاصا کام لینے لگے تھے۔ جس میں عینک اُتار کر پھینک دینا اور اپنے یا اپنے برابر بیٹھے

ہوئے شاعر کے زانو پر ہاتھ مارتے رہنا بھی شامل تھا۔ اب سامعین اُن کی ان اداؤں کے بھی گرویدہ ہو چلے تھے اور جون اس کا خاص اہتمام کرنے لگے تھے۔

زاہدہ حنا سے علیحدگی کے بعد اُن کے یہاں رقت اور گریہ وزاری کا سلسلہ شدید تر ہو گیا تھا۔ لیکن یہ مسائل اس قدر گہرے، پیچیدہ اور نجی نوعیت کے ہیں کہ ان کے محرکات اور نتائج پر کوئی تبصرہ ممکن نہیں۔

آخری دنوں میں جون ایلیا ذرا اہتمام سے رہنے لگے تھے۔ ہم نے اس آخری مشاعرے اور کھانے میں ایک ساتھ شرکت کی تھی جس کا انتظام PSO کے تحت اقبال کاظمی نے کیا تھا۔ اُس کے چند دن بعد ہی ڈھائی بجے رات کو میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹی وی چینل سے کسی نے کہا، 'سحر صاحب بول رہے ہیں؟ مجھے جون ایلیا کے بارے میں آپ کے تاثرات حاصل کرنے ہیں۔' میں نے گھبرا کر کہا، 'اس وقت ڈھائی بجے رات کو؟ کیوں کیا ہوا؟'

ادھر سے آواز آئی، 'جون ایلیا کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ کو نہیں معلوم؟' اس قدر دل خراش خبر کے لیے میرا ذہن تیار نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ کسی نے سفا کی سے کاٹ کر جدا کر دیا، پھر اُس کے بعد وہی مراحل اور مراسم درپیش ہوئے کہ سخی حسن کے ابتدائی حصے میں بھائی جون کو سپردِ خاک کر دیا گیا، جہاں رئیس امروہوی اور ان کی بڑی صاحب زادی پہلے سے آسودۂ خاک ہیں۔

جون ایلیا نے اپنی پوری زندگی 'موڈ' کے تابع گزاری۔ ان کے موڈ موسموں کی طرح بدلتے رہتے تھے اور ان کا اظہار شاعری میں اسی طور اور تناظر میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے رویوں میں شدید تھے اور جہاں کہیں شدّت آجاتی تھی، اُسے وہ سفا کی کی حد تک شاعری میں ڈھال دیتے تھے۔ انھوں نے 'شاید' کے دیباچے میں اپنے والد گرامی کے بارے میں لکھتے ہوئے 'جہنم' کا جو تذکرہ کیا ہے، اس میں جون کا مزاج زیادہ جھلکتا ہے۔ جون کہا کرتے تھے کہ میں غصے سے بھرا ہوتا ہوں لیکن اظہار بہت کم کر پاتا ہوں۔ ان کا یہ غصہ اور گرد و پیش کی زندگی کی بے حسی اور لایعنیت انھیں کبھی کبھی کلبیت (Cynicism) سے بھی قریب کر دیتی تھی۔ ان کی یہ کیفیت ان اشعار میں بہ طورِ خاص نمایاں ہے۔

اُٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں
فقط کمروں میں ٹہلا کیوں کریں ہم
جو اک نسلِ فرومایہ کو پہنچے
وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم
نہیں دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم
چبالیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اُسے خفا کیجے
ہے تقاضا مری طبیعت کا
ہر کسی کو چراغ پا کیجے

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا نئیں

جون نے شاعری میں جہاں جہاں غنائیت سے کام لیا ہے، وہاں اُن کا ڈکشن ار
شعری جمالیات مکمل طور پر موجود ہے۔

خوش گزرانِ شہرِ غم، خوش گزراں گزر گئے
زمزمہ خواں گزر گئے، رقص کناں گزر گئے
وادیٔ غم کے خوش خرام، خوش نفسانِ تلخ جام
نغمہ زناں، نوازناں، نعرہ زناں گزر گئے

مے خانہ طرف آیا، یاراں! دل و جاں انگیز
وہ تشنہ لباں ہم دَم، تہ جرعہ کشاں انگیز

اُٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں
فقط کمروں میں ٹہلا کیوں کریں ہم
جو اک نسلِ فرومایہ کو پہنچے
وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم
نہیں دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم
چبالیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اُسے خفا کیجے
ہے تقاضا مری طبیعت کا
ہر کسی کو چراغ پا کیجے

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا نئیں

جون نے شاعری میں جہاں جہاں غنائیت سے کام لیا ہے، وہاں اُن کا ڈکشن ار شعری جمالیات مکمل طور پر موجود ہے۔

خوش گزرانِ شہرِ غم، خوش گزراں گزر گئے
زمزمہ خواں گزر گئے، رقص کناں گزر گئے
وادیِ غم کے خوش خرام، خوش نفسانِ تلخ جام
نغمہ زناں، نوازناں، نعرہ زناں گزر گئے

مے خانہ طرف آیا، یاراں! دل و جاں انگیز
وہ تشنہ لباں ہم دَم، تہ جرعہ کشاں انگیز

شوریدہ سراں درپس، خونیں جگراں درپیش
گل گشت کو نکلا ہے، وہ جانِ جہاں انگیز

جون کو مشاعروں کی شرکت اور مقبولیت کے ساتھ ساتھ یہ اندازہ بھی ہوتا گیا کہ اب شاعری میں ہنرمندی کا دور نہیں رہا۔ انھوں نے بھی ترکیب طرازی اور مضمون آفرینی سے زیادہ اس پیرایے کو نکھارا جسے اُن کا مکالماتی کلام یا سہل ممتنع کا نام دیا جاتا ہے اور جس پر نئی نسل کے کئی شعرا تکیہ کیے ہوئے ہیں۔

جانے مجھ سے یہ کون کہتا تھا
آپ اپنا خیال تو رکھیے

زندگی کیا ہے اک ہنر کرنا
سو قرینے سے زہر پیجیے گا

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

ہر لمحہ جی رہے ہیں دوا کے بغیر ہم
چارہ گرو! تمھاری دعا چاہیے ہمیں

اس بنا پر عام طور سے یہ سمجھا جانے لگا کہ جون کی اصل پہچان اُن کی غزل ہے۔ لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ جون نے نظمیں بھی بہت خیال انگیز کہی ہیں اور ان میں فکر واحساس کی بہترین آمیزش پیدا کی ہے۔ ایک زمانے میں جب بہ قول خود جون کے سینے میں دم تھا اور سانس نہیں اکھڑتی تھی، تو وہ جم کر نظمیں ہی سنایا کرتے تھے۔ ان کا حافظہ اچھا تھا۔ نظمیں سناتے وقت بیاض سامنے نہیں ہوتی تھی۔ غرض بھائی جون پر ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ اُن کی شاعری اور شخصیت کے کئی زاویے اس کا تقاضا کرتے ہیں۔

جانے والا یہاں کا تھا ہی نہیں

سراج نقوی

اُردو شاعری کا ایک اور چراغ گل ہوگیا۔ کراچی میں رہ کر امروہہ کا وظیفہ پڑھنے والے اور ہجرت کے زخموں سے اپنی شاعری کے در و بام سجانے والے جون ایلیا نہیں رہے۔ امروہہ کی شان دار ادبی روایات کراچی میں رہ کر پروان چڑھانے والا چلا گیا اور درد کا یہ احساس اپنے سینے میں لیے چلا گیا کہ وہ جیسے 'یہاں کا تھا ہی نہیں'۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیمِ وطن نے برصغیر کے عوام کو ہر اعتبار سے نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ تقسیمِ وطن اور ہجرت کے المیے کے نتیجے میں وجود میں آنے والی شاعری ہمارے ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے اور جون ایلیا ہجرت کے درد و غم سے بھرپور شاعری کے سب سے بڑے اور آخری نمائندہ شاعر تھے۔ جون ایلیا 1957ء میں ہجرت کر کے کراچی چلے گئے لیکن ان کا دل ہمیشہ امروہہ میں ہی رہا۔ وطنِ مالوف امروہہ سے ہجرت کا صدمہ انھیں ہمیشہ خون کے آنسو رُلاتا اور یہی سبب ہے کہ وہ کراچی میں رہ کر بھی انتہائی حسرت و یاس کے ساتھ کہتے ہیں کہ۔

اس سمندر پہ تشنہ کام ہوں میں
بان، تم اب بھی بہہ رہی ہو کیا

بان امروہہ کی ایک چھوٹی سے ندی کا نام ہے جہاں جون ہجرت سے پہلے اپنے دوستوں کی ٹولی کے ساتھ اکثر سیر و تفریح کے لیے جاتے تھے۔ انھیں امروہہ کی تہذیب سے عشق تھا، یہاں کے عرس، چہار بیت کی محفلوں اور عزاداری کے جلوسوں سے، منقبتی محفلوں، مشاعروں سے عشق تھا۔ یہاں کی درگاہوں، خانقاہوں اور عزاخانوں سے عشق تھا۔ یہاں

کے آموں کے باغات، پنگھٹوں، تالابوں اور ندیوں سے عشق تھا۔ یہاں کی ادبی روایات
اور اس ٹکسالی اُردو سے عشق تھا جو اس وقت امروہہ کے ادبی ماحول میں بولی جاتی تھی اور
جسے انھوں نے اپنی اماں (والدہ) اور بابا (والد) کو بچپن میں بولتے سنا تھا۔ انھیں اس گلی
سے بھی عشق تھا کہ جس میں انھوں نے اپنا بچپن گزارا اور جوانی میں قدم رکھا۔ ان کا خیال
تھا کہ ان کی گلی دنیا کی سب سے عظیم اور قابلِ فخر گلی ہے، کہ چند مکانوں پر مشتمل اس گلی نے
فلمی دنیا کو کمال امروہوی جیسا فلم ساز، اُردو صحافت کو سیّد محمد تقی (سابق مدیر روزنامہ جنگ)
جیسا عالمی سطح کا صحافی اور مفکر، رئیس امروہوی اور خود اُن جیسا بلند قامت شاعر، مصنف اور
اقبال مہدی جیسا مصور دیا۔ لیکن تقدیر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جس امروہہ اور جس گلی سے
ان کا روح و جسم کا رشتہ تھا، اس سے ہجرت کا درد سمیٹ کر انھیں کراچی کا رُخ کرنا پڑا۔ لیکن
وطن کی محبت ہمیشہ ان کی روح کو تڑپاتی رہی۔ کراچی میں اپنے گھر کی چھت پر وہ بیٹھتے تو ان
کی کرسی کا رخ امروہہ کی طرف ہوتا کہ ادھر سے آنے والی ہوائیں بھی ان کو سکون پہنچاتی
تھیں۔ اپنی مٹی سے اس جنون کی حد تک عشق کی مثال شاید ہی ملے۔ جون ایلیا میرے
ہم وطن تھے، میرے عزیز تھے، میرے بزرگ تھے اور امروہہ کی ان کی محبوب گلی کے تعلق
سے دیکھیں تو میرے نزدیک ترین پڑوسی بھی۔ مجھے یاد ہے کہ 1975ء میں جون ایلیا وطن
سے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ امروہہ آئے۔ اسی دوران ماہِ محرم کا آغاز ہو گیا۔ امروہہ کے
محرم کے جلوس اپنی انفرادیت کے لیے مشہور ہیں۔ بات 6 محرم کی ہے، جلوس کی برآمدگی
سے۔ تقریباً بیس منٹ قبل میں گھر سے نکلا تو جون ایلیا عزاخانہ مسماۃ نورن تک پہنچنے کے
لیے رکشے میں بیٹھ چکے تھے، میں بھی ان کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گیا۔ اسی لمحے مجھے یاد آیا
کہ میں اپنا رومال گھر بھول آیا ہوں۔ ان سے گزارش کی کہ چند لمحوں میں واپس آتا ہوں۔
جون ایلیا بے چین ہو گئے، ان کا کہنا تھا کہ وہ 18 سال بعد وطن کا محرم کر رہے ہیں اور نہیں
چاہتے کہ جلوس برآمد ہونے سے قبل پڑھا جانے والا مرثیہ سننے سے محروم ہو جائیں یا جلوس
کی برآمدگی کا منظر نہ دیکھ پائیں۔ چند منٹوں کے اس سفر میں ان کی بے چینی کا عجب عالم
تھا۔ اپنے اس عمل میں وہ ان تمام تکلفات سے بے نیاز ہو کر امروہہ سے وابستہ اپنی یادوں
کو تازہ کرتے رہے اور پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ اس دوران انھوں نے گلّی ڈنڈے

کے میچ کھیلے، پرانے یاروں کے ساتھ محفلیں جمائیں، بان کی سیر کی اور اس طرح رو...
جیسے کوئی ناکام عاشق اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ سے مل کر روئے۔ بان کے لیے کہے گئے
جون ایلیا کے مذکورہ بالا شعر کے تعلق سے مجھے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ میں 1983ء
میں میرٹھ کالج، میرٹھ سے اُردو میں ایم اے کر رہا تھا۔ ڈاکٹر امیر اللہ خان (مرحوم)
صدر شعبۂ اُردو تھے۔ اسی دوران غالباً بیسویں صدی میں رام لال کا سفرنامہ شایع ہوا جس
میں انھوں نے جون ایلیا اور بان سے متعلق ان کے شعر کا تذکرہ کیا تھا۔ اس سے
ڈاکٹر شاہین کو یہ معلوم ہوا کہ جون ایلیا کا وطن امروہہ ہے۔ بان پر کہے گئے ان کے شعر نے
ڈاکٹر شاہین کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ ان کا مجموعۂ کلام پڑھنے کے لیے بے چین ہو گئے لیکن
بعد میں جب دلی میں انھیں عظیم امروہوی سے ایک ملاقات کے دوران یہ معلوم ہوا کہ
جون ایلیا کا ابھی تک کوئی مجموعہ شایع ہی نہیں ہوا ہے تو انھیں جون ایلیا کے قلندرانہ مزاج پر
سخت حیرت ہوئی۔ 1975ء میں ان کے سفرِ امروہہ کے دوران ہی ان کی ایک غزل
نشتر خانقاہی کی ادارت میں شایع ہونے والے رسالہ 'سو برس' میں شایع ہوئی تھی۔ اس غزل
کا ایک ایک شعر جون ایلیا کی وطن سے ہجرت کا مرثیہ ہے۔ چند شعر دیکھیں۔

ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں
دھوپ تھے سائباں کے تھے ہی نہیں

ہو تری خاکِ آستاں پہ سلام
ہم ترے آستاں کے تھے ہی نہیں

اب ہمارا مکان کس کا ہے
ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

اُس گلی نے یہ سُن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

میں نے اور میری والدہ نے جون ایلیا کی یہ غزل پڑھی تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو
آگئے۔ بل کہ سچ تو یہ ہے کہ جون ایلیا کے اس طرح کے اشعار میں نے جب بھی پڑھے،
سنے یا ذہن میں دہرائے تو دل میں ایک ہوک سی اُٹھی ہے۔ ایک بے چینی اور اضطراب کا

احساس ہوا ہے اور میں نے بار بار ایسے شعروں پر اپنا سر دُھنا ہے۔ چند شعر آپ بھی دیکھیں۔

شام ہوئی ہے، یار آئے ہیں یاروں کے ہم راہ چلیں
آج وہاں قوالی ہو گی، جون چلو درگاہ چلیں

اس گلی سے جو ہو کے آئے ہوں
اب تو وہ راہ رو بھی پیارے ہیں

ہم آندھیوں کے بن میں کسی کارواں کے تھے
جانے کہاں سے آئے ہیں، جانے کہاں کے تھے
اے جانِ داستاں! تجھے آیا کبھی خیال
وہ لوگ کیا ہوئے جو تری داستاں کے تھے

لیکن جون ایلیا کی شاعری میں صرف ہجرت کے مرثیے ہی نہیں، معاملاتِ عشق کی بھی بڑی خوب صورت ترجمانی ہے۔ دنیا کی عیاری اور مکاری پر بھی بڑے گہرے طنز ہیں۔ اسی لیے ان کی باغیانہ فطرت انھیں وفا، اخلاص، قربانی، محبت جیسے لفظوں کا پیچھا کرنے سے روکتی ہے۔ وہ وفا کے نام پر کارِ وفا کے قائل نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

کسی سے عہد و پیماں کر نہ رہیو
تُو اس بستی میں رہیو پر نہ رہیو

لیکن ٹھہریے میں جون ایلیا کی شاعرانہ عظمت پر کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ میں خود کو اس کا اہل نہیں پاتا۔ یوں بھی مجھے یقین ہے کہ جون ایلیا کی شاعری میں جو دل پذیری، جو لطیف جذبات و احساسات ہیں، ان کی تشریح کے لیے لفظ ناکافی ہیں۔ ان کی شاعری کے اسرار و رموز اور مختلف کیفیات کو سمجھنے کے لیے ان الفاظ پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے تو شدّتِ احساس کی ضرورت ہے۔ اب جب کہ جون ایلیا اپنی آخری ہجرت کر کے بہت دُور جا چکے ہیں تو یہ گلی، یہ شہر، برصغیر اور اُردو دنیا کو پھر یہی کہہ کر صبر کرنا ہو گا کہ 'جانے والا یہاں کا تھا ہی نہیں'۔

پشاور میں ایک شام

مسعود عثمانی

جون بھائی کے متعلق اپنی بکھری ہوئی یادوں کو مربوط کرنے کی کوشش کروں تو ایک غیر منظم ترتیب کے ساتھ بہت سے جگنو ایک ساتھ جلنے بجھنے لگتے ہیں۔ قدرت کے تخلیق کیے ہوئے مناظر ہوں یا انسان کی بنائی ہوئی اشکال اور نقش و نگار۔ بے ترتیبی کا اپنا ایک حسن ہے اور شاید اس کی پرتوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو ایک ترتیب وہاں بھی کارفرما ہوگی۔ انسانی ذہن جو خالق کی کرشمہ سازی اور انسانی تمثیل گری کا ایک نقطۂ اتصال ہے، بعض اوقات اسی منظم بے ترتیبی میں سہولت محسوس کرتا ہے اور یہ بات تو ہے بھی جون بھائی کی جو منتشر زندگی اور بے ترتیب طرزِ حیات کے بادشاہ تھے اور یہ طرز بھی ان کی شاعری کی طرح ان کا اپنا اختراع کردہ تھا اور اس میں بھی وہ اپنا اسلوبِ خاص رکھتے تھے۔ سو کچھ دیر کے لیے ذہن کی کلائیڈ واسکوپ سے آنکھ لگا کر دیکھتا ہوں کہ کیسے کیسے منظر وہاں دکھائی دیتے ہیں۔

میں فلیٹیز ہوٹل کے یخ بستہ ہال میں بیٹھا ہوں۔ جون بھائی اسٹیج پر صاحبِ شام کی حیثیت میں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ لاہور کی اکثر چھوٹی بڑی ادبی شخصیات انھیں سننے کے لیے جمع ہیں۔ جون بھائی کی آواز اور ان کے لیے منعقد کردہ شام گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ ایک نظم آغاز کرتے ہیں اور لوگ لمحہ بہ لمحہ مصرع بہ مصرع اس نظم کی وسیع اور ساکت جھیل میں اُترتے جاتے ہیں۔

مجھے اپنے بائیں جانب سے سسکیوں کی دبی دبی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں گردن

موڑ کر اپنے ہم نشست اور باکمال شاعر دوست ڈاکٹر معین نظامی کو دیکھتا ہوں جس کے رخساروں پر اس نظم کے بھیگے ہوئے مصرعے روشن ہو رہے ہیں۔ میں دوسری جانب اپنے دوسرے ہم نشین دوست شعیب احمد کی طرف دیکھتا ہوں جو خود اعلیٰ شاعر ہے۔ شعیب کی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے ہیں۔ میری آنکھوں میں بھی کسی نے شاید جلتے ہوئے موم کے قطرے ڈال دیے ہیں اور یہ موم کہیں منجمد ہو کر اور کہیں پگھل کر میرے عدسوں اور بصارت کو دھندلا کیے دے رہا ہے۔

میں گارڈن ایسٹ، کراچی کی ایک نیم ویران کوٹھی کے ایک اُجاڑ کمرے میں بیٹھا ہوں، کچھ ڈرا ہوا اور کچھ گھبرایا ہوا۔ ادب میں بھی نو وارد ہوں اور ان کے گھر میں بھی۔ جون بھائی اپنی شام کی مشغولیات کا آغاز کر چکے ہیں۔ ان کی چسکیوں کے درمیان میں اپنی غزلیں ان کی فرمایش پر انھیں سنا رہا ہوں۔ کسی غزل کے کسی شعر پر داد نہیں مل رہی۔ 'ایک غزل اور سناؤ' کی آواز ہر غزل کے اختتام پر ضرور آتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اگر انھیں میری شاعری اچھی لگ رہی ہے تو داد کیوں نہیں دیتے اور اگر اچھی نہیں لگ رہی تو مزید سنانے کی فرمایش کیسی ہے؟ چھٹی غزل کے اختتام پر آواز آتی ہے، 'چھوٹی بحر کی سناؤ!' میں ان کی بات سمجھ جاتا ہوں۔ وہ میرا امتحان لے رہے ہیں۔ میں چھوٹی بحر کی کئی غزلیں اُن کی بھرپور داد و تحسین کے درمیان سناتا ہوں۔

اب بھی وہ ہمیں ملا کہاں ہے
دیوارِ وصال درمیاں ہے
یہ شہر بلندیوں سے دیکھو
دریائے روا روی رواں ہے
دل سے تری یاد اُتر رہی ہے
سیلاب کے بعد کا سماں ہے

جون صاحب سے بہت غیر معمولی داد مل رہی ہے۔ وہ میری تمام شاعری پر بھرپور ستایشی کلمات کہہ رہے ہیں اور اس سے قبل داد نہ دینے کی وجہ اپنے مخصوص انداز میں بتا رہے ہیں۔

'ارے جانی تُو کیا سمجھا تھا؟ مجھے کیا شعر کی سمجھ نہیں ہے؟ میں کیا الو کا پٹھا ہوں؟ تیرے شعر سمجھ میں نہیں آرہے تھے مجھے؟ ارے میں تو دیکھ رہا تھا کہ کتنی غزلوں میں دم خم دکھاتا ہے تُو۔ ایک دو غزل اچھی کہہ لینا اور بات ہے اور چھوٹی بحر تو قیامت ہے قیامت۔ سانس پھول جاتی ہے آدمی کی۔ تُو تو کمال شاعر ہے...... جا کہہ دیا میں نے، اوروں سے جا کر کہہ دے تُو بھی۔ میاں سانس پھول جاتی ہے سانس۔'

اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر وہ ان غزلوں کے درمیان داد دیتے تو شاید اتنی سیر حاصل داد نہیں مل سکتی تھی جو اَب مل گئی ہے۔

ہم نشیں سانس پھول جاتی ہے۔ یہ مصرع ان کی ایک اور یاد پر کلک کر کے اسے روشن کر دیتا ہے۔ جیسے نقرئی اسکرین پر یکایک ایک رنگا رنگ منظر روشن ہو جائے اور نیم تاریک گرد و پیش اس میں ضم ہو جائیں۔

لاہور کے ایک پبلشر کے دفتر میں جون صاحب بیٹھے ہیں۔ انھیں ان کے مداحوں نے گھیرا ہوا ہے جو اپنے اپنے مداح بھی جون صاحب سے ملوانے لائے ہوئے ہیں۔ جون صاحب شعر سنا رہے ہیں۔

آپ اپنے سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں سانس پھول جاتی ہے
کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے
کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

جون صاحب رو رہے ہیں۔ آج ان کے مصرعے خود انھی کے رخساروں پر پھسل رہے ہیں۔ ان شعروں سے ان کی کون سی یاد، کون سا دکھ وابستہ ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ کسی دکھ نے ان سے یہ شعر کہلوائے ہیں اور پڑھتے وقت کوئی دکھ ان شعروں کو خنجر کی طرح ان کے دل میں اُتار رہا ہے۔

اورینٹل کالج لاہور کے ایک مشاعرے کے لیے جون صاحب کو لینے میں اور

معین نظامی جون صاحب کی اقامت گاہ پر پہنچے ہوئے ہیں۔ جون صاحب تیار ہو رہے ہیں۔ جن کے گھر میں قیام ہے، وہ خاتونِ خانہ شاید جون صاحب کی عزیزہ ہیں۔ وہ جون کی صحت پر کڑھ رہی ہیں۔ 'ارے بھیا خدا کے لیے خود اپنا خیال کرو۔ یہ زخم ٹھیک نہیں ہو رہا، ذرا دیکھو تو سہی'۔ وہ جون صاحب کی پنڈلی پر ایک زخم کی نشان دہی کر رہی ہیں جو اندمال کی منزلوں سے کافی دُور ہے۔ ہم جون بھائی کا یہ شعر یاد کر رہے ہیں۔

جانے مجھ سے یہ کون کہتا تھا
آپ اپنا خیال تو رکھیے

جون صاحب ایک لفظ کہے بغیر تیار ہو رہے ہیں۔ جیسے ایک چھوٹا سا بچہ جسے اس کی ماں اس کی بے پروائی سے عاجز آ کر ڈانٹ رہی ہو۔

گلستانِ جوہر کراچی نیا نیا آباد ہوا ہے اور اس آبادی میں شاید یہ پہلا مشاعرہ ہے۔ کراچی کے تقریباً تمام سینئر جونیئر نمائندہ شاعر موجود ہیں۔ میں کراچی میں موجودی کے سبب اس مشاعرے میں موجود ہوں۔ جناب رضی اختر شوق سے یہ میری پہلی ملاقات ہے۔ مشاعرہ ابھی شروع ہی ہوا ہے۔ چھ سات نو وارد اپنی شاعری سنا چکے ہیں کہ جون صاحب اچانک اُٹھ کر مائیک پر آجاتے ہیں۔ 'اب ہم پڑھیں گے'۔ تمام شاعر اور سامعین ہکا بکا ہیں۔ ناظمِ مشاعرہ سراپا احتجاج ہے، 'جون صاحب آپ کو تو اپنے مقام پر پڑھنا ہے'۔ لیکن جون صاحب مصر ہیں...... وہ کسی کی بات نہیں سن رہے۔ ناظمِ مشاعرہ کیا کسی اور میں بھی اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ ان کی بات ٹال سکے...... وہ اپنا کلام پڑھتے ہیں۔ حسبِ معمول فرمائشوں پر فرمائشیں ہو رہی ہیں اور وہ اپنے مخصوص والہانہ پن سے اپنی نئی اور پرانی غزلیں سنا رہے ہیں۔

یہ غم کیا دل کی عادت ہے؟ نہیں تو
کسی سے کچھ شکایت ہے؟ نہیں تو
کسی صورت بھی دل لگتا نہیں؟ ہاں
تو کچھ دن سے یہ حالت ہے؟ نہیں تو

یہاں میں ذکر نہیں کر رہا مکینوں کا
کبھی کبھی در و دیوار مرنے لگتے ہیں

ان کے جونیئر ان کے بعد اپنا کلام سناتے ہیں لیکن پہلے ہو یا بعد میں، جون صاحب مشاعرہ لوٹ چکے ہیں۔

اب تصویریں تیزی سے چل رہی ہیں جیسے ایک لڑی میں پرو دی گئی ہوں۔ لکشمی چوک کے نیشنل ہوٹل میں، میں نے کافی احباب کو کھانے پر مدعو کیا ہوا ہے۔ جون بھائی کے اعزاز میں دعوت ہے لیکن جون صاحب آ ہی نہیں چکتے۔ انتظار طویل ہو چکا ہے۔ بالآخر جون صاحب آتے ہیں۔ میرے ماتھے کی شکایتی شکنیں دیکھتے ہیں اور اپنے میٹھے لہجے میں کہتے ہیں، 'سعود جانی صرف تیری وجہ سے آیا ہوں قسم سے۔ ورنہ شاعری اور شاعروں سے میرا کیا واسطہ، کیا تعلق...... اب شکایت چھوڑ، کھانا کھلا۔' میں ہنس پڑتا ہوں۔

عکسِ رواں، آبِ رواں کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں۔ جون صاحب اپنے مداحوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ کہہ رہے ہیں، 'یارو! یہاں لاہور میں ایک شاعر ہے (وہ ایک نوجوان شاعر کا نام لیتے ہیں) اس کی فرمائش پر میں نے اس کے مجموعے کا دیباچہ لکھا۔ اس نے وہ دیباچہ تو چھاپ دیا لیکن اس میں تحریف کر دی۔ ایک دو جملے نکال دیے، اس حرکت کے باوجود وہ چل پھر بھی رہا ہے۔ ہنس بول بھی رہا ہے حتیٰ کہ سانس بھی لے رہا ہے اور کوئی شخص کچھ نہیں کرتا۔ حیف ہے بھئی، حیف ہے۔'

اب میں جون صاحب کو غزل سنا رہا ہوں اور وہ کہہ رہے ہیں۔ 'بھئی 'یہ' کی مانند' نہیں ہوتا۔ یاد رکھ جانی 'کے مانند' ہوتا ہے۔'

ایک تصویر اٹک گئی ہے اور ایک فریم اسکرین پر ٹھیر گیا ہے۔ جون صاحب کا کلوز اَپ...... لاہور میں ایک صاحبِ علم شاعر کے گھر جون صاحب مدعو ہیں۔ اپنا رجسٹر طلب کرتے ہیں اور ایک نظم سناتے ہیں جس کا رزمیہ اور رجزیہ آہنگ انتہائی زوردار ہے۔ شاید یہ نظم کبھی چھپی نہیں اور کسی سے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں سنا۔ جون صاحب ویسے ہی حالتِ وارفتگی میں ہیں، کچھ سامعین کی پُرزور داد، کچھ نظم بھی ان پر طاری ہے۔ وہ ایک حالتِ حال میں اُٹھتے ہیں اور قریبی دیوار سے زور سے اپنا سر ٹکراتے ہیں۔ شوریدہ سری اور

دیوار کا جو تعلق ہے، وہ حاضرین بھی جانتے ہیں اور خود صاحب کلام بھی۔ ہوش ترمذی کا شعر یاد آ رہا ہے۔

ایک دیوار ہے زندگی
کوئی شوریدہ سر چاہیے

عکس پھر سے متحرک ہوگئے ہیں۔ ان سب شبیہوں میں ایک شبیہ ایسی ہے جو چالاکی سے عبارت ہے۔ جون صاحب کو شعر سنانے پر مائل کیا جارہا ہے...... یہ جو بحر ہے رجز مثمن مطوی مخبون (مفتعلن مفاعلن، مفتعلن مفاعلن) جس کے بارے میں جون بھائی نے لکھا ہے کہ ہمارے گھر کے در و دیوار اس بحر پر صبح و شام جھوما کرتے تھے، اس میں جون صاحب کی غزل جو حال ہی میں 'فنون' میں چھپی ہے، میں دوستوں کے درمیان ان کے سامنے پڑھ کر داد دے رہا ہوں۔

شہر بہ شہر کر سفر، زادِ سفر لیے بغیر
کوئی اثر کیے بغیر، کوئی اثر لیے بغیر
کچھ بھی ہو قتل گاہ میں، حُسنِ بدن کا ہے ضرر
ہم نہ کہیں سے آئیں گے، دوش پہ سر لیے بغیر
قریۂ گریہ میں مرا گریہ ہنروارنہ ہے
یاں سے کہیں ٹلوں گا میں دادِ ہنر لیے بغیر

ان کے سامنے پڑھنے کا مقصد یہی ہے کہ ان کی طبیعت موج پر آجائے اور اس میں مزید غزلیں ان کی زبان سے سننے کا موقع مل سکے۔ طریقہ کارگر ہوتا ہے اور ان کے در و دیوار اس بحر پر جھومنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس بحر میں جون صاحب نے ایک سے ایک قاتل شعر کہا ہے۔ ایسا کہ یہ بحر گویا اپنی کرلی۔ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس بحر کا ذکر آئے اور جون کے شعر یاد نہ آئیں۔

جو بھی ہو تم پہ معترض اس کو یہی جواب دو
آپ بہت شریف ہیں، آپ نے کیا نہیں کیا
تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہو غالباً
میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

شور اُٹھا مگر تجھے لذتِ گوش تو ملی
خون بہا مگر ترے ہاتھ تو لال ہو گئے
ہم نفسانِ وضع دار، مستمعانِ بردبار
ہم تو تمھارے واسطے ایک وبال ہوگئے

اپنے سبھی گِلے بجا، پر ہے یہی کہ دل رُبا
میرا ترا معاملہ عشق کے بس کا تھا نہیں
جائیے خود میں رایگاں اور وہ یوں کہ دوستاں
ذات کا کوئی ماجرا، شہر کا ماجرا نہیں

شاید جون بھائی کا دکھ یہی تھا کہ ذات کا کوئی ماجرا شہر کا ماجرا نہیں۔
ماجرا کے لفظ کا استعمال تو جون بھائی پر ختم تھا۔ اس لفظ کو پُر اثر اور ایسا پُر ماجرا بنا دینا کیا کسی اور کے لیے ممکن تھا۔
عکس ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آرہے۔ تصاویر ہیں کہ ایک کے بعد ایک کھنچی چلی آرہی ہیں۔ ان کے خدوخال واضح اور رنگ تازہ ہیں جیسے کسی نے وقت کو منجمد کر دیا تھا اور آج ایک اشارے سے یہ ساکت وصامت وقت سیال اور متحرک ہو گیا ہے۔

جون صاحب شعر سنا رہے ہیں۔

اک نہ اک بات سب میں ہوتی ہے
وہ جو اک بات تجھ میں تھی، کیا کی
تیرا ہر کام اب حساب سے ہے
بے حسابی کی زندگی کیا کی
شش جہت آئینوں کے بیچم بیچ
تُو نے اپنی وہ بے رُخی کیا کی

سب اس لفظ بیچم بیچ کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ جون صاحب کے انداز سے ظاہر ہے کہ وہ اس داد کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔

یہ جو بیچم بیچ اور بے رُخی کے الفاظ کا نادر استعمال ہے، یہ کون کرے گا جون کے سوا؟ افسوس کہ یہ غزل جب کتاب میں شامل کی گئی تو یہ شعر اس میں سہواً یا ارادتاً نکال دیا گیا۔ بیچم بیچ کا لفظ میں نے اس سے پہلے شاعری میں کبھی نہیں سنا، حالاں کہ میری نانی اور والدہ یہ لفظ بولا کرتی تھیں اور سچ یہ ہے کہ اس کے بجائے بیچوں بیچ لگا دیں تو بات ہی نہیں بنتی۔

ایسے لفظ برتنے کے لیے ایک حوصلہ درکار ہے جو یا صرف لغت میں ملتے ہیں یا بزرگوں کی زبان میں اور جون بھائی ایسے لفظ نئے نکور کر کے جھاڑ پونچھ کر شاعری کے حوالے کر دیتے تھے...... نہیں کی متروک شکل نئیں کو انھوں نے زندہ کیا۔

مرا اک مشورہ ہے التجا نئیں
تُو میرے پاس سے اس وقت جا نئیں
سفر درپیش ہے اک بے مسافت
مسافت ہو تو کوئی فاصلہ نئیں

اور پھر یہ چل نکلا۔ ہر خاص و عام نے اسے ہر جگہ استعمال کیا خواہ وہاں یہ جچتا بھی نہ ہو۔ اس کے لیے تو مزاج چاہیے تھا اور وہ مزاج دان جون ایلیا تھے۔ جون صاحب کو ایسے الفاظ کا بڑا ادراک تھا، ایک جگہ کہتے ہیں۔

میں خود میں جھینکتا ہوں اور سینے میں بھڑکتا ہوں

یہاں ذرا جھینکنا کا لفظ دیکھیں۔ کم از کم میرے علم میں موجودہ شاعری میں اس کی مثال
نہیں ہے۔ چناں چہ جب وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو یہ ان کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں
یادوں کی ان ساکت و متحرک فلموں میں ایک فلم ایسی بھی ہے جہاں جون صاحب
موجود نہیں ہیں۔ صرف ان کی شاعری موجود ہے۔ جون صاحب کی ایک غزل سے بہ
کے کچھ شعر یاد آرہے ہیں۔

جون قافلہ و راحلہ میں شور بپا ہے
یہاں تو کچھ بھی نہیں، وہاں تو کچھ بھی نہیں

کسے خبر سرِ منزل جو دل نے حال سہے
اذیتِ سفرِ رائگاں تو کچھ بھی نہیں

سہے ہیں میں نے عجب کرب سود مندی کے
گلہ ہے تجھ کو زیاں کا، زیاں تو کچھ بھی نہیں

اس میں کیا عجیب شعر ہے۔ سنتے جائیے، سر دھنتے جائیے۔

درونیانِ تسلّی سے تُو مِلا ہے کبھی
عذابِ حسرتِ بیرونیاں تو کچھ بھی نہیں

یہ درونیانِ تسلی، یہ برونیانِ حسرت زدہ۔ یہ کن منزلوں کی ترجمانی ہے۔ یہ الفاظ نہیں معنی ہیں اور معنی بھی وہ جو اُن منزلوں سے گزرنے والے جون ایلیا پر روشن تھے۔ وہ تو ایک منزل پر پہنچ کر معنی کے بھی انکاری تھے۔

کوئی معنی نہیں کسی شے کے
اور اگر ہوں بھی تو میاں تب کیا

جون صاحب پڑھتے تھے تو ان کے انداز پر اصغر گونڈوی کا وہ مصرع یاد آتا تھا۔

کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

وہ جس والہانہ اور وارفتہ انداز میں شعر پڑھتے تھے وہ انھی سے مخصوص تھا اور یہ انھی کی زبان سے مزہ بھی دیتے تھے۔ اس کی نقل کرنے والے بعد میں کئی آئے لیکن جون صاحب اپنی پڑھت میں یک تا ہی رہے اور یک تا ہی رہیں گے۔

اسی طرح مصرع سازی میں کچھ پیرایے، کچھ اسالیب، کچھ انداز تو ایسے ہیں کہ وہ جون صاحب ہی کے دم سے تھے اور سچ یہ ہے کہ سجتے بھی انھی کو تھے۔

میں اور خود کو تجھ سے چھپاؤں گا یعنی میں
لے دیکھ لے میاں مرے اندر بھی کچھ نہیں

میں انھیں چشمِ تصور سے اپنی نہایت منفرد اور کمال نظم 'درختِ زرد' میں اپنے بیٹے زریون سے مکالمہ کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

تمھارا باپ یعنی میں، عبث میں، اک عبث تر میں
مگر میں، یعنی جانے کون؟ اچھا میں، سراسر میں

میں کبھی کبھی جون بھائی کے یہ شعر یاد کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ یہ شعر انھوں نے کس کے لیے کہے تھے۔ پھر میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ تو کسی کے لیے بھی نہیں تھے۔ یہ تو ان کا خود اپنے آپ سے خطاب تھا، یہ تو خود کلامی تھی۔

حسابِ داریِ سود و زیاں سے چل نکلو
میاں یہاں کی نہیں اور ہاں سے چل نکلو
مری سنو تو زمان و مکاں میں رہتے ہوئے
بہ صد سلیقہ زمان و مکاں سے چل نکلو

سو وہ اس زمان و مکان سے اس سلیقے سے رخصت ہوئے کہ سال ہا سال گزرنے کے بعد بھی یقین ہی نہیں آتا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔

یادوں کے پیڑ تلے بہت سے سرخ، آتشی، نارنج و زرد پتوں کا ایک ڈھیر لگا ہے۔ میں اس پتاور میں کھڑا ہوں۔ ہر پتّا ایک لمحہ ہے، ہر ایک پر تصویر ہے اور ہر تصویر جون ایلیا کی ہے۔ ہنستے روتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، بولتے اور غم گھولتے ہوئے جون ایلیا۔ وہ کہاں گئے ہیں اتنی یادوں، اتنی تصویروں کے ہوتے ہوئے۔

خود انھوں نے ہی تو کہا تھا۔

ہم سے بے واسطہ نہیں ہے وہ
وہ یہیں تھا، یہیں کہیں ہے وہ

سچّا منافق

سلیم جعفری

ایک صاحبِ علم مولوی مولانا حسن مثنیٰ ندوی صاحب نے ایک عجیب فتویٰ انکشاف کی صورت صادر کیا کہ 'حق ہے کہ منافق گھاٹے ہی میں رہیں گے سراسر گھاٹے میں' آخر ش کیوں کہ فقرہ بہ ظاہر حقائق کے تناظر میں غلط سا لگا اور قولِ قبلہ حسن مثنیٰ صاحب کا ابدا حافظے میں کچھ اٹک کر سا رہ گیا اِس لیے نہیں کہ فقرہ مبنی بر صداقت ظاہری تھا بل کہ بہ ظاہر بالکل لغو اور مہمل سا لگا۔ سیاست کے منافق، عقیدے کے منافق، تجارت کے منافق، صحافت و ادب کے منافق غرضے کہ کسی بھی نوع کے منافق پہ نظر ڈالیں وہ گھاٹے میں ہرگز نظر نہیں آتا۔

منصور جاوید اور میں جون کو بہت پسند کرتے ہیں اس لیے نہیں کرتے کہ یہ شخص شخصی وجاہت کا مرقع ہے یا یہ کہ آتے جاتے تمھارے بارے میں کسی مشین کی مانند شاعر کی طرح دو چار رباعیاں یا قطعات کہہ سکتا ہے بل کہ (سرور میں جب موصوف باوجود کوشش و شدید خواہش کے منافقت اختیار نہیں کر سکتے) جو نثری سطور ہماری شان میں رقم فرماتی ہیں ان سطور کے گواہ صرف پیرزادہ قاسم اور عالم تاب تشنہ ہیں کہ بہ وقتِ واردات موجود تھے۔ بس یہ شخص یعنی جون ایلیا اس امر سے واقف ہے کہ یہ دو عقل و خرد سے عاری اشخاص اپنی باطنی جہالت پہ پردہ پوشی کے لیے فراز و جون کو پسند کرنے کے ضمن میں مجبور ہیں اور بس مجبور۔ شاید اس امر سے آگاہی نے جون کو ہمارے سلسلے میں منافق بنا دیا۔

جون کو منافق کہنے کے لیے آپ کو نہ تو اخلاقی جرأت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور نہ

فقیہِ شہر سے فتویٰ لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ آخر ایک منافق کو منافق کہنے کے لیے آپ کو سند کی ضرورت کیوں پیش آئے جب کہ یہ سند خود آپ کی ذات کے لیے ہو یا ذاتی حوالے سے ہو۔ یہ منصور جاوید ہیں، میں سلیم جعفری ہوں یہ کہنے یا منوانے کے لیے مجھے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ ہم ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں۔ مگر ہم ہیں۔ مگر ہمارے ہونے کی جتنی سزا ہمیں جون نے دی اتنی سزا تو ہمیں ہمارے دشمن بھی نہ دے سکے۔ کیوں کہ منافق نہیں ہیں لہٰذا یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم دونوں سراسر خسارے میں ہیں۔ مگر شدید ذہنی کوفت مایوسی اور غم وغصہ بہ طور سزا ناحق نصیب ٹھیرا۔ شاید ہی کسی غیر منافق کو ایک منافق کے طفیل اتنا کچھ سہنا پڑا ہو جتنا منصور جاوید، مجھے اور تازہ ترین شکار شکیل عادل زادہ کو برداشت کرنا پڑا، ناحق۔

جون اپنی بیوی سے عشق کرتے ہیں۔ اختر شیرانی نے اپنی سلمیٰ کی شان میں کیا کہا ہوگا جون کے مقابلے میں، مگر اچھے شوہر نہیں، اچھے باپ ہیں کہ نہیں اس امر کی پروا خود ان کے بچوں کو نہیں، اور ہو بھی کیوں، جون نے ایک اچھا، مناسب یا گوارا قسم تک کا باپ بننے کی کوشش تو کیا شاید خواہش تک نہیں کی۔ بچے پھر بچے ہیں، ان کے اوصافِ ولدیت کی بابت فیصلہ کیوں کریں۔ موصوف بھائیوں کو اس حد تک پسند تھے کہ اُنھیں ان کا پڑوس تک گراں گزرا۔ رہے سسرالی تو اس کے موصوف قائل ہی نہیں۔ موصوف میں کوئی خوئے وابستگی ہی نہیں۔ لہٰذا میکا ہو یا سُسرال قائل ہی نہیں ان فرسودہ رشتوں کے۔ اچھا تو یہ قائل کس حقیقت کے ہیں۔ کوئی حقیقت ہو تو قائل ہوں۔ خوامخواہ قائل معقول ہونے سے فائدہ! جو شخص حقیقتِ اول کا منکر تو نہ ہو مگر عالمِ تشکک میں ہو تو اول یا آخر چہ معنی دارد۔ جس شخص کو صرف اور صرف برزخ کا منظر عزیز ہو اسے عقبیٰ و آخرت، جنت کی حرص اور دوزخ کے عذاب سے کیا نسبت، اسے تو حوروں کے قصے بھی جنت کا خواہش مند نہ بنا سکے۔ یہاں کون سے سکھ اُٹھا رہا ہے کہ دوزخ کے مصائب سے خوف زدہ ہو۔ بس اس کے لیے تو برزخ ہی جنت ہے۔ کیسا منافق ہے یہ شخص! جس شخص کو اسپینش زبان نہ آتی ہو، روسی زبان سے ناواقف ہو، جرمن زبان سے واقفیت نہ ہو اور وہ احساسِ تفاخر اور وہ بھی صرف و محض کہ اسے اپنے کشتگان سے بہتر اُردو آشنائی ہے۔ لاحول ولا کتنا بڑا منافق ہوگا وہ شخص جو فلسفے

کی فطری زبان یعنی جرمن سے ناواقف ہو اور دعویٰ اسے ہو لاطینی اور قدیم یونانی زبان
سے آشنائی کا اور وہ بھی فلسفے کے حوالے سے۔ نجیب الطرفین شیعہ ہو اور نانی اماں سا جائز
کا ورد کرتا پھرے۔ دنیا کے ہر سپہ سالار پر فوقیت دیتا ہو خالد بن ولید کو جو فاتح ہو ہر اس
جنگ کا جو لڑی گئی ہو اس کی موجودی میں (اس کے مضمرات سے اہلِ علم خوب واقف ہیں) وہ
بھی عجیب منافق ہے۔ جیسا کہ شروع میں ذکر تھا، ندوی صاحب کے قول کا مجھے
یقین ہے کہ وہ قول یقیناً کسی نہ کسی آیتِ ربانی یا حدیثِ قدسی پر مبنی ہوگا۔ اور یوں اس کی
صداقت میں شبہ یا تو انتہائی مضبوط اعصاب کے حامل اصحاب کریں گے یا ابوجہل
یعنی لاریب حق ہے کہ منافق گھاٹے میں ہی رہیں گے آخرش۔ اور میں یہ کہنے کی کوشش کر
رہا ہوں کہ جون ایلیا منافق نہیں، بہت بڑے منافق ہیں۔ اور یہ بات اپنے علم اور
مشاہدے کی بنیاد پہ کہہ سکتا ہوں کہ جون ایلیا سراسر گھاٹے میں ہیں اور یوں موصوف
مذکورہ بالا قول کی رو سے بھی منافق ہیں کہ ہر ہر اعتبار سے یہ گھاٹے میں ہی ہیں۔

بھائی جون آپ سراسر گھاٹے میں ہیں اور گھاٹے ہی میں رہیں گے (آخر منافقت
کا گھاٹے کے سوا اور کیا نتیجہ ہو) میں نے کہا۔ سود و زیاں سے بہ ظاہر بے نیاز،
جون بولے...... 'میاں! گھاٹا اُردو کا عام فہم اور نہایت رسوا لفظ ہے اس کے مفہوم سے
واقف بھی ہو تم؟ اور ہاں دیکھو میاں اُردو میری زبان ہے یہ کبھی نہ بھولنا۔ میں صرف لفظ
'گھاٹا' پہ گھنٹوں بول سکتا ہوں اور صفحات کے صفحات سیاہ کر سکتا ہوں مگر اس کے مفہوم کو
شاید پھر بھی تمھیں اپنی تسلی کی حد سمجھا نہ سکوں۔'

جون منافقت کی ہر نوع کی تعریف پر پورے اُترتے ہیں۔ یہ اور بات کہ سب
سے زیادہ منافقت یہ اپنے ہی حق میں روا رکھتے ہیں۔ جو کام کسی طور نہ ہو سکتا ہو اسے یہ
بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ کچھ بھی طلب کر لیں انکار ہرگز نہ کریں گے اور نہ کبھی وہ طلب پوری
کریں گے کیوں کہ کچھ کرنا ان کے بس کی بات نہیں اور انکار کرنا بھی تو کچھ کرنے کا
متقاضی ہے۔ سو انکار تک نہیں کر سکتے۔

منصور جاوید اور میں مارچ 1988ء سے ان کے مجموعے کی اشاعت کے لیے
کوشاں ہیں۔ مارچ 1989ء میں یہ خوش خبری سنائی کہ کتابت ختم ہوگئی، پیش لفظ لکھا جا چکا

ہے، بس نوک پلک درست ہو رہی ہے۔ 2 جون 1989ء کی تاریخ طے ہوئی اجرا یا رونمائی کے لیے۔ پیرزادہ قاسم اور ہم دونوں نہایت پر عزم اور مشتاق تھے اور بس تھے۔ 31 جنوری 1990ء تک نوک پلک درست یوں نہ ہو سکی کہ پیش لفظ ابھی تک لکھا ہی نہ گیا تھا۔ 'میاں لکھنا کیا بس خاکہ ذہن میں موجود ہے، سمجھ لو کہ لکھا جا چکا۔' اور ہاں یہ منافقت نہ تھی۔ موصوف خلافِ طبع سچ بول رہے تھے۔ غالبؔ کا ایک مصرعہ ہے 'سادگی و پرکاری بے خودی وہشیاری' اس مصرعے کی عملی تفسیر مرحوم صادقین و جون نے عملاً پیش کی۔ صادقین کا نام لے کر میں جون کا قد و قامت بڑھایا گھٹا نہیں رہا، بس اپنے مشاہدے میں آپ کو شریک کر رہا ہوں۔ کہاں سادگی سے کام چلے گا اور کہاں پرکاری ناگزیر تھی اس کا ادراک دونوں کو ہمیشہ رہا۔ کون سی بات بے خودی میں برملا کہہ دینی چاہیے اور کیا بات ہوش مندی میں دبا دینی چاہیے اس فن میں دونوں ہی ایک دوسرے کا جواب رہے ہیں، کوئی تیسرا اس ضمن میں ان کے منھ نہ لگا۔ جب پرکاری باعثِ سہولت ہو تو پرکاری اور جہاں سادگی سے واردات ہو سکتی ہو تو پرکاری کی ضرورت کسی کو ہو تو ہو انھیں کبھی پیش نہ آئی۔ وہ گھاٹے جو جون اُٹھاتے رہے (منافقت کے سبب) اس کا ان کی صحت پہ چنداں اثر نہ پڑا (صحت ہوتی تو شاید اثر پڑتا) مگر لواحقین کی حق تلفی ضرور ہوئی۔ کیوں کہ یہ منافقت برتنے میں بھی منافقت برتتے ہیں۔ لہٰذا اپنے رسائل و جرائد کا آہستہ آہستہ گلا گھونٹتے رہے۔ ہر تیز گام کا پیچھا اپنی سست روی سے کیا اور پھر تیز گام رفیق کو بہت آگے نکل جانے پر لعن طعن۔ خود کو سست روی کا طعنہ کبھی نہ دیا۔

جس طور بُرے لوگوں میں چند ایک خوبیاں تلاش کرنے پر تلاش کی جا سکتی ہیں ویسے ہی اگر آپ چاہیں تو جون میں دو ایک پہلو (مثبت) آپ بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ جیسے دو ایک خرابیاں جنرل ضیا کے عہدِ جلیلہ میں قبلہ نواز شریف ممکنہ طور پر ڈھونڈنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں نے جون کے انتہائی قریب خواتین و حضرات سے بارہا درخواست کی کہ جون کی شخصیت پر چند ایک سطور ہی سہی اگر مضمون ممکن نہ ہو، جس میں کوئی پہلوئن کی تعریف و توصیف کا نکلتا ہو۔ مگر کیا مجال کہ کسی نے بھی سفید جھوٹ لکھنے پہ آمادگی کا اظہار کیا ہو۔ میں قریبی لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ ہاں شاعری کے حوالے سے بات

دوسری ٹھیرتی ہے۔ جو عاشق اپنی محبوبہ کو خون تھوکنے پر بھی پرکار ٹھیراتا ہو۔ جو منکر ہو اور اپنے لوگوں سے تقاضا کرتا ہو کہ اس کے ہونے پر دلیل و حجت کی جائے تاکہ اس کا وجود زندگی کے لیے ضروری قرار پائے۔ جو شخص سات آٹھ سال آسمان صرف اس لیے نہ دیکھ پائے کہ اسے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ یعنی فقط کمرے سے باہر نکلنا پڑے گا وہ مزدوری، کسان کی محنت کے ترانے گائے تو بھلا کون صاحبِ قلم، قلم کو اس حد تک رسوا کرے کہ جون کے بارے میں بادل ناخواستہ سفید جھوٹ لکھے (اور یوں بھی سچ لکھنے کا ٹینڈر کسی کے نام پہ کھلا نہیں)۔

معصومین و مظلومین سے نسبت رکھنے والے جون ایلیا نے کوئی ایسا ستم نہیں جو اپنے چاہنے والوں کے حق میں روا و جائز نہ رکھا ہو۔

'شاید' جون کا پہلا (اگر شایع ہو گیا ہو تو) اور یقیناً آخری مجموعۂ کلام منصور جاوید، پیرزادہ قاسم اور شکیل عادل زادہ اور میرے حق میں کچھ یوں ہے کہ ہمارے حق میں جزا و سزا کا سلسلہ یہیں جاری کر دیا گیا ہو۔ ہم سب کی شدید خواہش و کاوش تھی کہ جشنِ جون ایلیا سے بہت پہلے جون کا مجموعۂ کلام منصۂ شہود تو نہیں، ہاں مگر سامنے ضرور آ جائے۔ مگر کیا مجال کہ جون ٹس سے مس ہوا ہو۔ انھیں رئیس بھائی اور اپنے ابا حضور کے وہ دوست واحباب مستقل یاد آتے رہے جنھیں جنت مکانی ہوئے تیس چالیس سال ہو چکے۔ جو ان کا مجموعۂ کلام چھپوانے کی حسرت لیے صاحبِ حسرتین ہوئے۔ اور اب بھی منتظر ہیں کہ شاید اب 'شاید' جون کے منافقت بھرے باطن سے پولینڈ، مشرقی جرمنی، چیکوسلوواکیا اور ہنگری کے مانند اس طور آزادی حاصل کرے جیسے ان ملکوں کے عوام نے اپنے اپنے قومی سامراجوں سے حاصل کی۔ مگر جون ایلیا کسی نظام کا نام نہیں کہ جس کی طبعی عمر طے شدہ ہو۔ جون ایلیا ایک مزاج کا نام ہے اور مزاج کبھی بدلا نہیں کرتے۔ اگر یقین نہ ہو تو اپنے گرد و پیش پہ نظر ڈالیں ہر سو آپ کو ابوجہل نظر آئیں گے، جون ایلیا کی شکل میں۔

جون ایلیا! تم تو کیا۔ تمھارے چاہنے والے بھی سراسر گھاٹے میں ہیں۔

'تری منافقت کا خدا سلسلہ دراز کرے'

شہر میں اپنی طرح کا آخری مہذب اور مجلسی آدمی

سلیم کوثر

میں سمندر کی وہ شام نہیں بھولتا۔ دن بھر کا تھکا ہارا سورج، دھوپ برساتا ہوا نڈھال بے حال سا پانی میں اُترا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ...... ایک پرندہ اپنی لہر میں جھومتا گاتا اس کے درمیان سے گزرتا ہوا، اگلے منظر کی بانہوں میں سمٹتا، میری حیران اور خیرہ آنکھوں کی بے منظری میں گم ہوگیا۔ میں نے دیکھا...... سورج کے درمیان ایک لکیر سی کھنچ گئی ہے جیسے سورج کے چہرے پر دراڑ پڑ گئی ہو۔ دوسرے ہی لمحے یہ لکیر، مجھے اپنی آنکھوں میں جلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سورج اب آدھا سمندر میں اُتر چکا تھا، تقریباً وہاں تک...... جہاں ایک سیاہ لکیر پرندے کی گزرگاہ کی نشان دہی کر رہی تھی۔ سورج اب آدھا سمندر میں اُتر چکا تھا، باقی ماندہ سورج کو میں نے آنکھوں میں جلتی ہوئی لکیر سے باندھا اور ساحلی ریت پر دائرے بناتی ہوئی ہوا سے باتیں کرتا ہوا، اس خوش بو کی جانب روانہ ہوگیا جس کا پتا ذرا دیر پہلے قریب آتی ہوئی ایک لہر نے مجھے بتایا تھا۔ ریت میرے پاؤں سے سرکتی رہی...... لہریں مجھے خوش حال کرتی گزرتی رہیں، پرندوں اور بچوں کی سرگوشیاں ڈھلتی ہوئی شام کے آئینے میں لو دینے لگیں اور پھر...... میں نے اسی ڈھلتی ہوئی شام کے آئینے میں آدھے سورج کا عکس رکھ دیا۔ اب آدھا سورج پانی میں اور آدھا شام کے آئینے میں تھا۔ میری آنکھوں میں کھنچی ہوئی لکیر سے لپٹی ہوئی دھوپ، دھیرے دھیرے بکھرتی ہوئی شام کے صحن میں اُترتی ہوئی رات کے ماتھے پر ستارے بن کر پھیلتی گئی۔

دُور ایک ستارے نے کسی کے آنے کی خبر دی...... بادبانی کشتی کنارے آ لگی۔ کشتی سے اُترنے والے کچھ سائے تھے جو لہولہان تھے۔ یہ زمین پر کھنچی ہوئی چھوٹی بڑی مختلف شکلوں کی لکیروں کے قیدی تھے جو اپنی اپنی لکیروں میں آزادی کی حفاظت کے لیے مارے جارہے تھے...... ایک دھماکے پر میں چونکا، میں نے پلٹ کر شہر کی طرف دیکھا، شہر گولیوں کی آوازسے بے برکتا ہوا جارہا تھا۔ میدان بچوں کی دھنک سے خالی ہورہے تھے اور ان میدانوں میں اب چوکیاں بنتی جارہی تھیں، حفاظت کے لیے...... مگر کس کی حفاظت کے لیے؟ یہ بھید آج تک نہ کھلا...... اور پھر یہ چوکیاں مجھے پوری دنیا میں پھیلتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، جہاں آمدورفت کے لیے ہمیں اپنا ہونا رجسٹرڈ کرانا ہے...... ہم جنھیں ہر صبح اُٹھ کر ایک نئے سورج کے ساتھ ایک نئی اُمید کی ہم راہی میں طلوع ہونا پڑتا ہے، قریب ہی ایک آواز اُبھرتی ہے۔

کیوں شکستہ ہے ترا رنگ متاعِ صد رنگ

اور پھر اپنے ہی خونیں جگروں کے ہوتے شہر کا کام ہوا۔ فرطِ حفاظت سے تمام اور چھلنی ہوئے سینے سپروں کے ہوتے جبر وقدر کی حالتوں میں چلتے ہوئے کائناتی نظام میں زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں اور بدصورتیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو زندگی گزارتے ہیں، کچھ جنھیں زندگی گزارتی ہے مگر کچھ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو کبھی زندگی کو اور کبھی زندگی ان کو گزارتی ہے اور اس دہرے کھیل میں وہ اپنی اُکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ آخری لمحوں تک شامل رہتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے منصب ومرتبے کے لوگ ہیں، زندگی کے دامن کو حسنِ خیال سے بھرتے ہوئے لوگ، محبت کرنے والے امن وآشتی کے متوالے لوگ، ظلم کے خلاف اُٹھنے والی ہر آواز میں آواز ملاتے ہوئے لوگ۔ خود آواز بن کر ظلم سے نبرد آزما رہنے والے لوگ۔ کہانیاں لکھتے ہوئے، تصویریں بناتے ہوئے، گیت گاتے ہوئے، شاعری کرتے ہوئے لوگ۔ اپنی ذات میں کائنات اور کائنات میں ماورائے ذات کا نظارہ کرتے ہوئے لوگ۔ بدلتے ہوئے زمانوں کی شکست وریخت کو لمحہ بہ لمحہ پڑھتے ہوئے، جھیلتے ہوئے، لکھتے ہوئے اور بولتے ہوئے لوگ۔ یہ لفظ تراشنے اور لفظ کی حرمت پر جان دینے کے ہنر سے آگاہ لوگ۔

ہاں لفظ ایجاد ہیں۔

یہ ہزاروں...... ہزاروں برس کے سراسیمہ گہہ اجتہادِ تکلم کا انعام ہیں

ان کے انساب ہیں

جن کی اسناد ہیں

اور پھر اُن کی تاریخ ہے

اور معنی کی تاریخ کوئی نہیں

میری نگاہ شہر کے کسی گوشے سے اُٹھنے والے اس دُھویں کی جانب اُٹھتی ہے جو فضا میں پھیلتا جا رہا تھا اور جس سے ادھر خوش رنگ منظروں کی قطار چھپتی چلی جا رہی تھی۔ کتنے برس بیت گئے، آگ، دھواں، لہو، دہشت گردی اس شہر کا مقدر ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ تاب ناک دنوں اور روشن راتوں والا شہر۔ یہ نت نئی مشینوں، کارخانوں، مزدوروں، ہنرمندوں، محنت کشوں کا آباد اور صنعتی شہر۔ یہ مچھیروں، ملاحوں کے گیتوں کی آوازوں میں جاگتا ہوا شہر، خوب صورت تذکروں، لازوال قصوں کہانیوں والا شہر۔ اپنے اندر بولتے ہوئے موسموں کی تہ داریاں رکھنے والا شہر۔ یہ اُداس اور خوش حال لوگوں کا شہر۔ یہ شاعروں، ادیبوں، دانش وروں، موسیقاروں کا شہر، زندہ اور بے مثال لوگوں کا شہر۔ کتنے ہی نام حافظے کے اُفق پر ستاروں کی طرح چمکنے لگے۔ یہ سلیم الزماں صدیقی، محمد حسن عسکری، عزیز احمد، سلیم احمد، ممتاز حسین، قمر جمیل، عزیز حامد مدنی، بہزاد لکھنوی، زیڈ اے بخاری، قمر جلالوی، ابواللیث صدیقی، محمد خالد اختر، کرار حسین، مجتبیٰ حسین، رئیس امروہوی، آلِ رضا، ماہر القادری، نازش حیدری، بہار کوٹی، صبا اکبر آبادی، شاعر لکھنوی، اطہر نفیس، فرید جاوید، رئیس فروغ، رضی اختر شوق، ابوالفضل صدیقی، سیّد محمد تقی، عبدالرؤف عروج، عالم تاب تشنہ، محشر بدایونی، عارف عثمانی، حمید نسیم، صہبا اختر، صہبا لکھنوی، سرور بارہ بنکوی، جوہر سعیدی، حکیم انجم فوقی، تحسین سروری، افسر آذر، ایوب گونڈوی اور بہت سے لکھنے اور پڑھنے والے جو اَب ہم میں نہیں ہیں اور جن میں ہر ایک اپنی جگہ ایک خاص طرزِ فکر رکھتا تھا، ان سب کا اور بہت سوں کا شہر۔

یہ خوب صورت خیال و خواب رکھنے والے لوگ اسی شہر میں، اور اسی شہر کی گلیوں میں، اس کے قہوہ خانوں میں، اپنی بیٹھکوں میں، ہوٹلوں میں، اپنی خلوتوں میں اور اپنی

محفلوں میں اپنی گفت گو کا، اپنی شاعری کا، اپنے مکالموں کا جادو جگاتے اور اپنے خوابوں کو دکھاتے اور سناتے، نیندوں اور رَت جگوں کی سرشاری میں صبح کو شام سے اور شام کو صبح سے ملاتے ہوئے چلے گئے۔ شام کے زینے سے رات دبے پاؤں اُتر رہی تھی...... میں قریب ہی بیٹھ جاتا ہوں اور ان سب لوگوں کے ہجوم کو گردش کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ سرد رات کی ہوا سے یادوں کا الاؤ تیز ہونے لگتا ہے۔ میں اس الاؤ کے قریب عبیداللہ علیم اور جون ایلیا کو دیکھتا ہوں...... جو ایک دوسرے سے کسی ایسی بات میں اُلجھے ہوئے ہیں جو تھی نہیں...... مگر تھی! میں نے ان دونوں کو ہمیشہ ایک ساتھ ہی دیکھا تھا۔ دونوں اپنے مزاج اور روّیوں میں مختلف مگر دونوں اپنی جگہ سچے اور کھرے شاعر...... اتنے بہت سے لوگوں کا اس طرح چلے جانا، ہر عمر کی صفوں کا یوں خالی ہوتے جانا، خوابوں کی پائمالی کا تماشا ہے جو ہم مسلسل دیکھتے چلے آ رہے ہیں اور بے بس ہیں۔ یہ ایک دوسری طرح کا بحران ہے جو پہلی طرح کی ویرانی سے زیادہ ہول ناک ہے۔ ہوا تیز ہو جاتی ہے، الاؤ بڑھتا جا رہا ہے، اس الاؤ سے ایک چنگاری قریب کی کچھ یادوں کو واضح کرتی ہوئی پھیلتی جاتی ہے۔ پروین شاکر اُمیدوں اور خوش بوؤں بھری شاعرہ...... زندگی کی فتوحات میں بہت تیز رفتار تھی۔ پھر ایک دن اس تیز رفتاری میں اس کی گاڑی سامنے آنے والے ایک خوف ناک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ اب پتا نہیں یہ ٹرک کا رستہ تھا بھی کہ نہیں۔ یہ خوش بو کا قتل تھا۔ صغیر ملال جیسا ذہین شاعر اور کہانی کار اور ترجمہ کرنے والا...... ڈاکٹر کے نہ ملنے پر ایک غلط انجکشن لگنے سے موت کے منھ میں چلا گیا۔ بچ نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ یہ ذہانت کا قتل تھا۔ ثروت حسین جیسا خوب صورت شاعر بار بار ٹرین کے سامنے آتا یا ٹرین اس کے سامنے آتی، بچ نکلنے کا کوئی رستہ ہی نہیں تھا۔ یہ خوب صورتی کا قتل تھا...... جمال احسانی جیسا بانکا اور تیکھا شاعر، ڈاکٹروں کے مشوروں کی اکھاڑ پچھاڑ میں اپنی بیماری سے لڑتا لڑتا ہار گیا۔ یہ ایک شاعر کا قتل تھا...... کتنا دکھ دینے والا ہے یہ سب کچھ...... عبیداللہ علیم، ادب میں جعلی آدمی کے خلاف آواز اُٹھاتے اُٹھاتے شاعر اور شاعری کا مقدمہ لڑتے لڑتے سچ مچ شاعر ہونے کا اعزاز اپنے سینے پر سجائے ہوئے درمیان سے اپنی مسرتوں اور دکھوں سمیت گزر گیا۔

جون ایلیا، جو ہمیں اَن دیکھے زمانوں کی سیر کراتا، شہر کے بجھے ہوئے اور روشن

لوگوں میں خوب صورت خواب وخیال کی دھنک تقسیم کرتا اور بعض اوقات وہ اپنی شاعری میں جسم اور روح کی پراسراریت کو اس طرح کھولتا اور اس طرح کھینچ لاتا کہ سننے اور پڑھنے والے ایک عجیب ہی کیفیت میں چلے جاتے۔ جون ایلیا اپنے لہجے کی انفرادیت میں اتنا سفاک تھا کہ آپ اپنی تنہائی میں یا محفل میں اس کی شاعری اپنی طرح پڑھ ہی نہیں سکتے...... وہ جون ایلیا...... جو شہر کو روحانی آکسیجن فراہم کرتا رہا...... ایک دن، ہاں ایک دن اسی شہر میں، کسی مکان کے اندر...... ایک کمرے میں تنہا، بروقت آکسیجن نہ ملنے پر اپنے اندر گھٹ کر خاموش ہوگیا اور پھر یوں ہوا...... کمرے کی تنہائی نوحہ کرتی ہوئی سڑکوں پر نکل آئی اور محفل محفل بین کرنے لگی۔

یہ عہد وہ ہے کہ دانش ورانِ شہر پہ بھی
منافقت کی شبیہوں کا خوف طاری ہے
نمازِ خوف کے دن ہیں کہ اِن دنوں یارو
قلندروں پہ فقیہوں کا خوف طاری ہے

یہ ہیں وہ تیرہ دلانِ قلم روِ تاریخ
جو روشنائیِ دانش کا خون کرتے رہے
یہی تو ہیں جو حکیموں کی حکمتوں کے خلاف
ہر اِک دور میں حاکم کے کان بھرتے رہے

گزشتہ عہد گزرنے ہی میں نہیں آتا
یہ حادثہ بھی لکھو معجزوں کے خانے میں
جو رَد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

یہ آواز ہمارے عہد کے منافقانہ رویوں کے خلاف احتجاجی مہم کی تاریخ ہے اور تاریخ کے اس آئینے میں ہم اپنی آرزوؤں، اپنی تمناؤں اور اپنے امکانات کی لہولہان شبیہیں دیکھ سکتے ہیں۔

جون ایلیا...... اپنے اندر دھمال ڈالتا ہوا اور اپنے باہر رقص کرتا ہوا، ہر لمحہ اضطرابی اور بے خوابی میں مبتلا ایک بے مثال سخن ور تھا...... وہ نوٹنکی، رام لیلا اور ڈرامے کا دیوانہ تھا۔ وہ اپنی خیالی محبوبہ صوفیہ کو خط لکھتا...... یہ خیال آفرینی کا ایک بہانہ تھا، وہ تو ایک ایسی بات ان خطوں میں اسے لکھنا چاہتا تھا، جو ایک حقیقت بننے والی تھی اور وہ یہ کہ...... 'ہمیں انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔' اس جملے میں 'کچھ کرنا چاہیے' کا جو دکھ ہے وہ اتنے زمانے گزرنے کے بعد آج بھی اسی طرح محسوس ہوتا ہے۔

جون ایلیا...... جو کسی بھی قاعدے اور ضابطے کو تسلیم نہیں کرتا، مگر اپنی شاعری میں، اپنی تمام تر بے ضابطگیوں کے باوجود قاعدوں اور ضابطوں کی نہ صرف پاس داری کرتا بل کہ انھیں نبھاتا بھی ہے اور شاعری تو اس کے لیے زندگی کرنے کا ایک ڈھب تھا...... وہ ایک قادر الکلام سخن ور تھا، جو زبان و بیان کی باریکیوں سے اور اس کی وسعتوں سے آگاہ تھا۔ بہت سے لوگ جون ایلیا کو بے راہ رو...... اور خود فراموشی میں مبتلا آدمی قرار دیتے رہے ہیں...... نہیں وہ ایسا نہیں تھا...... وہ بے حد محتاط، انتہا درجے کا ہوشیار اور معاملہ فہم آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رَد کیا کرنا ہے اور قبول کیا کرتے رہنا ہے...... وہ تو بس کبھی کبھار، اس کی ترتیب بدل دیتا تھا۔ یعنی جسے رَد کرنا ہے اسے قبول کر لیتا اور جسے قبول کرنا ہوا سے رَد کر دیتا...... یہ اس کا کھیل تھا اور اس کھیل پر اسے اختیار نہیں تھا، وہ عجیب ہوش مند تھا۔ وہ کہتا تھا کہ لکھنا لکھانا دراصل غیر فطری فعل ہے۔ تمام باشعور ادیبوں کو لکھنے لکھانے سے کنارہ کر کے صرف بولتے رہنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ہوتا ہے یوں بھی، تخلیقی آدمی ایسی صورتِ حال سے بھی دو چار ہوتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بالکل خاموش ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ ان زمانوں کی رو سے بھی گزرتا ہے جو اسے زندگی کے ایک نئے تجربے سے آشنا کرتی ہے۔ مگر جون ایلیا نے اپنی بات میں 'باشعور ادیبوں' کی کڑی شرط لگا کر اپنی بات میں جو وزن پیدا کیا ہے، وہ اس کے باہوش ہونے کی دلیل ہے۔ ادیب اگر باشعور ہوگا تو لکھنے لکھانے کا غیر فطری کام اور بولتے رہنے کی فطری جہت، دونوں میں اپنا ہونا ثابت کرتا رہے گا لیکن کبھی کبھار لکھنے لکھانے کے موسموں میں بولتے رہنا چاہیے اور بولتے رہنے کے

دنوں میں لکھتے لکھاتے رہنا چاہیے اور جون ایلیا ایسا ہی کرتا تھا۔ وہ اپنی ہی بات کو رَد کر کے اسے قبولیت کے درجے تک پہنچا دیتا تھا، وہ اپنے شک سے اپنا یقین کشید کرتا تھا۔

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نئیں

چُپ رہنے کے سناٹے سے جو مژدہ اُبھرتا ہے وہ خدا کے ہونے کی آواز ہے۔

اتنا خالی تھا اندروں میرا
کچھ دنوں تو خدا رہا مجھ میں

خدا تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ کمرے میں بہت ساز و سامان بھر جائے تو تنہائی اشیا کی تہوں میں سمٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ضرورتوں کی دیمک جب ان اشیا کو کھانے لگتی ہے تو کمرے کے خالی پن میں تنہائی پھیلتی چلی جاتی ہے اور پھیلتی ہوئی تنہائی میں جو تجربہ ظہور کرتا ہے، وہ خدا کی موجودگی کا ہے...... اس تجربے کو جس شدّتِ احساس کے ساتھ جون ایلیا نے تحریر کیا ہے۔ وہ اس کے اندر کچھ دنوں نہیں...... بل کہ بین السطور ہمیشہ خدا رہنے کا احساس اور یقین ہے۔

جون ایلیا کے بہت سے اشعار آپ کو بہ ظاہر اس کی قادر الکلامی کا معجزہ دکھائی دیں گے مگر قادر الکلامی کا یہ معجزہ یوں ہی تو رونما نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ذات کے غارِ حرا میں شاعر کو خلوت اختیار کرتے ہوئے کبھی خود سے، کبھی خدا سے اور کبھی کائنات سے مکالمہ کرنے کی ریاضتوں سے گزرنا پڑتا ہے اور جون ایلیا اُن محدود شعرا میں سے ہیں جن کی قادر الکلامی مصرع گھڑنے کی مشق نہیں، زندگی کرنے کا ہنر ٹھیرتی ہے۔

ترے عدم کو گوارا نہ تھا وجود مرا
سو اپنی بیخ کنی میں کمی نہ کی میں نے
خراشِ نغمہ سے سینہ چھلا ہوا ہے مرا
فغاں کہ ترک نہ کی نغمہ پروری میں نے

تو مرے بدن سے جھلک بھی لے، میں ترے بدن سے مہک بھی لوں
ہمہ نارسائی ہے جانِ جاں، گئی پل کا تُو، گئی پل کا میں

تُو مرا حوصلہ تو دیکھ، داد تو دے کہ اب مجھے
شوقِ کمال بھی نہیں، خوفِ زوال بھی نہیں

نصیب ہو کوئی دم وہ معاشِ حال کہ ہم
حسابِ سلسلۂ صبح و شام کے نہ رہیں

اے شخص اب تو مجھ کو سبھی کچھ قبول ہے
یہ بھی قبول ہے کہ تجھے چھین لے کوئی

ہے غنیمت کہ اسرارِ ہستی سے ہم
بے خبر آئے ہیں بے خبر جائیں گے

سایۂ ذات سے بھی رم، عکسِ صفات سے بھی رم
دشتِ غزل میں آ کے دیکھ، ہم تو غزال ہو گئے
کتنے ہی نشہ ہائے ذوق، کتنے ہی جذبہ ہائے شوق
رسمِ تپاکِ یار سے رُو بہ زوال ہو گئے
کیسے زمیں پرست تھے عہدِ وفا کے پاس دار
اُڑ کے بلندیوں میں ہم گردِ ملال ہو گئے
شور اُٹھا مگر تجھے لذتِ گوش تو ملی
خون بہا مگر ترے ہاتھ تو لال ہو گئے

کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

آپ اپنے سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں سانس پھول جاتی ہے
کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اِک چیز ٹوٹ جاتی ہے

میں نے پچھلے دنوں جون ایلیا کے بارے میں ایک معروف شاعر کی رائے پڑھی جو کچھ یوں ہے۔

'جون ایلیا شاعری میں نہ تو کسی اسلوبِ خاص کا موجد ہے اور نہ ہی کسی نئے لہجے کا خالق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی انفرادیت وہ مکمل پن ہے جو بہت کم لوگوں کو ارزانی ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں کسی محنت کا یا تردد کا بھی سراغ نہیں ملتا بل کہ لگتا ہے کہ یہ غزلیں اس نے بس ایسے ہی لکھ دی ہیں لیکن جو الفاظ وہ زیرِ استعمال لاتا ہے، ان پر اس کی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ شاعروں کے اس ہجوم میں ایک شاعر کی آمد آمد صاف دکھائی اور سنائی دیتی ہے۔ پھر اس نے بعض لفظوں کے پرانے تشخص کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے اور اس طرح ایک نئے اور عجیب ہی ذائقے کا اضافہ کر کے دکھا دیا ہے۔'

یہ جو آخری سطر میں، ایک نئے اور عجیب ذائقے کا اضافہ کر کے دکھا دینے والی بات ہے یہی تو وہ اسلوبِ خاص ہے جسے جون ایلیا نے اپنی ریاضتِ فن سے تراشا ہے اور شاعری میں یہی تو اس کا وہ لہجہ ہے جس کا وہ خالق ہے اور جس کا اس نے دعویٰ نہیں کیا۔ ظاہر ہے جون ایلیا شاعری کا تجربہ کرنے تو نہیں آیا تھا، شاعری تو عشق کی طرح اس کے لہو میں رچی بسی تھی، وہ تو تجربوں کی کیفیتوں کو، جذبوں کو، گفتنی ناگفتنی کو، معلوم نامعلوم کو شاعری بنانے پر مامور تھا۔ کچھ سوال تھے جنھوں نے اس کے ذہن میں سر اُٹھایا تھا اور اُن سوالوں کو وہ ہمارے درمیان اُٹھا لایا تھا۔

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تُو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

کہیں کہیں وہ خود ہی ان سوالوں کا جواب دیتا ہوا نظر آتا اور کہیں وہ اپنے سوال ہی کو جواب کا اصل سمجھتا ہے۔

اپنے حجرے کا کیا بیاں کہ یہاں
خون تھوکا گیا شرارت میں
وہ خلا ہے کہ سوچتا ہوں میں
تجھ سے کیا گفت گو ہو خلوت میں
زندگی کس طرح بسر ہو گی
دل نہیں لگ رہا محبت میں

سو وہ آنسو ہمارے آخری آنسو تھے
جو ہم نے گلے مِل کر بہائے تھے
نہ جانے وقت اُن آنکھوں سے پھر کس طور پیش آیا
مگر میری فریبِ وقت کی بہکی ہوئی آنکھوں نے
اُس کے بعد بھی
آنسو بہائے ہیں
مرے دل نے بہت سے دُکھ رچائے ہیں
مگر یوں ہے کہ ماہ و سال کی اِس رایگانی میں
مری آنکھیں
گلے ملتے ہوئے رشتوں کی فرقت کے وہ آنسو
پھر نہ رو پائیں

اس کا کہنا تھا کہ سچا شاعر ہونے کے لیے صرف ایک گواہی کی ضرورت ہے۔

دیکھا آپ نے، اس نے چھوٹے بڑے شاعر ہونے کا قضیہ نہیں اُٹھایا۔ سچے شاعر ہونے کی بات کی ہے، اس سے ذرا ہٹ کر اصل مسئلہ تو شاعر ہونے ہی کا ہے باقی سب بعد کے لاحقے ہیں۔ ہاں تو صرف ایک گواہی کی ضرورت ہے اور یہ گواہی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اپنی ذات کو بیرونِ ذات سے دیکھا جائے، پرکھا جائے اور محسوس کیا جائے۔ یہ ہے وہ بات خواتین و حضرات! کہ خود شاعر کا وجود اسی کے ذہن سے باہر پایا جاتا ہے اور یہ نظارہ بینی، اہلِ نظارہ پر ایک ایسے ہی جہانِ نادیدہ کا دَر کھولتی ہے جس کے تمنائی اور آرزومند ہوتے ہیں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس منظرنامے کی شہادت کے لیے بھی شاعر کو اپنی ذات ہی کی راہداریوں سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ جو کہا گیا ہے کہ اخلاق سے بے نیاز ہو کر بھی فن یا آرٹ اخلاق سے زیادہ بااخلاق ہوتا ہے تو جون ایلیا کی شاعری اس کا ایک واضح اظہار ہے۔

ہماری ہی تمنا کیوں کرو تم
تمھاری ہی تمنا کیوں کریں ہم
کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے
تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم
جو اک نسلِ فرومایہ کو پہنچے
وہ سرمایہ مہیا کیوں کریں ہم
برہنہ ہیں سرِ بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم
پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم
یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

آپ نے محسوس کیا شاعر ذات و حیات و کائنات کی تماشا گاہ میں اذیت کی کس منزل سے گزر رہا ہے۔ زندگی تو کبھی بھی سہل نہیں رہی اور حسّاس لوگوں پر تو یہ دشوار سے

دشوار تر ہوتی رہی ہے، جون ایلیا حد درجہ حساس شاعر تھا۔ اس کے وہ سارے غصے، ساری ناراضیاں، ساری جھنجھلاہٹیں، محرومیاں، محبتیں اور سارے احتجاج جو اس کی شاعری میں جگہ نہیں پا سکے، اس کی نثری تحریروں میں ایک عالمانہ سنجیدگی اور شاعرانہ وارفتگی کے ساتھ دَر آئے ہیں۔

سمندر کی لہروں سے گزرتی ہوئی ایک لہر بھرے ہوئے پانی سے اُٹھ کر مجھے بھگوتی ہوئی ریت میں جذب ہوتی چلی گئی۔ بادبانی کشتی سے اُترنے والے سایوں کے زخموں کو اب سرد ہوا کی تیزی بڑھاتی جارہی تھی۔ سمندر سے اُٹھنے والی موجوں نے ان کے چہروں کو اُجلا کر دیا تھا۔ میں دُور سمندر کے اُفق کو دیکھتا ہوں، رات کے کسی کونے سے سورج پانی سے باہر آنے کو ہے، آبی پرندوں کی اُڑانوں نے بادلوں کے ٹکڑوں کو دُور تک بچھا دیا۔ میں نے دیکھا کہ بادبانی کشتی میں سوار سایوں کے درمیان جون ایلیا بھی ہے۔ اس کی آواز اُبھرتی ہے۔

اُتار دے جو کنارے پہ ہم کو کشتیِ وہم
تو گرد و پیش کو گرداب ہی سمجھتے ہیں
تمھارے رنگ مہکتے ہیں خواب میں جب بھی
تو خواب میں بھی انھیں خواب ہی سمجھتے ہیں

کشتی ایک معلوم سفر کی نامعلومیت کی جانب روانہ ہوگئی۔

جون ایلیا ہمارے شہر میں اپنی طرح کا آخری مہذب اور مجلسی آدمی تھا۔ اب یہ شہر اور طرح کے مہذب اور مجلسی آدمیوں کا شہر لگتا ہے۔ خواتین وحضرات یہاں اور طرح کے مہذب اور مجلسی کے لفظ پر آپ ناراض مت ہو جائیے گا۔ بات یہ ہے کہ جون ایلیا اور اس جیسے مہذب مجلسیوں کے ساتھ یہ 'اور طرح' کا لفظ اپنے اندر اور طرح کے معنی و مفہوم اور توجیہ کی سج دھج رکھتا ہے۔ ہم میں بہت سے زندگی کی ہوس میں زندگی سے ہار گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کھیل میں اب کی دفعہ زندگی نے جون ایلیا کو ہار دیا ہے۔

ذہنی اور فکری پس منظر

سیّد محمد تقی

طویل اور جاں گسل انتظار کے بعد آخر جون ایلیا کا پہلا مجموعۂ کلام یا اس کی پہلی قسط آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔

ادب۔ کا لفظ اپنے متعارف معنیٰ میں۔ شاعری۔ افسانہ نگاری ڈراما یا ناول نویسی یعنی تخلیقی تحریروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس مرحلے پر ایک عجیب دشواری یہ پیش آتی ہے کہ تحریر کا لفظ ایک پھیلے ہوئے علاقے پر اطلاق رکھتا ہے جب کہ تخلیقی تحریر کا دائرہ نسبتاً محدود ہوتا ہے۔ تخلیقی تحریریں کہیے کہ طیف یعنی اسپکٹرم کے ایک حصے تک پھیل پاتی ہے جب کہ لفظ تحریر پورے طیف کے رنگوں کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ اب مشکل یہ در پیش ہے کہ اگر ادب کو صرف تخلیقی تحریروں تک محدود کر دیا جائے تو پھر مثلاً تراجم کو کیا کہا جائے گا۔ ویسے یہ بات تو صحیح ہے کہ کوئی تحریر چاہے وہ بچوں کا ابتدائی قاعدہ ہی کیوں نہ ہو تخلیق کا تھوڑا بہت جزو ضرور رکھتی ہے۔ دراصل اس مسئلے کی بنیادی نوعیت یہ ہے کہ وہ سارے رشحات یعنی وہ سارے مفاہیم اور معانی جو شعور کے عمل کے نتیجے میں ٹپکتے ہیں اور ان علامتوں کا لباس پہنتے ہیں جنھیں ہم الفاظ کہتے ہیں شعور کی اولاد ہونے کی بنا پر تخلیق و تعقل دونوں جہتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

صورتِ حال کو اس پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو اس ادبی دشواری کا حل ڈھونڈنے میں مدد ملے گی جو دنیا کی تمام زبانوں کے اہلِ قلم کو پیش آتی رہی ہے۔ یہ دشواری پیش اس وقت آتی ہے جب کسی تہذیب یا زبان کے تمام تحریری سرمائے کا ذکر چھڑا ہو، اب اگر

ساری تحریروں کو ادب کے نام سے یاد کیا جائے تو لازماً ایک طرح کی الجھن پیدا ہو جائے گی اس لیے کہ لفظ ادب کا معانیاتی ماحول تخلیق بدوش تحریروں تک ہی پھیلتا ہے اور ان تحریروں کو بمشکل ہی اپنے دائرے میں لیتا ہے جن میں فکر کا بوجھ نسبتاً زیادہ اور تخلیقِ ہیئت، فارم اور اسلوبی ندرت کا عنصر ہلکا ہو۔

اُردو کی حد تک تحریروں کے اس امتیازی رجحان کی وضاحت کے لیے غالباً قابلِ قبول مشورہ یہ ہوگا کہ ادب کے ان دو ممتاز خانوں کا لحاظ رکھ کر دو اصطلاحات اختیار کر لی جائیں۔ تخلیقی ادب اور فکری ادب۔ ظاہر ہے یہ اصطلاحات معانی کی ٹھیک ٹھیک تقسیم تو نہیں کرتیں لیکن کون سی اصطلاح ہے جو سارے معانی کے پھیلاؤ کو اپنے دامن میں سمیٹنے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ ہاں لفظ کائناتی تقدس کا درجہ تو رکھتا ہے لیکن کون سا لفظ ہے جو اپنی کم دامنی کا شکوہ سنج نہ ہو۔ اس گتھی ہوئی کائنات بل کہ وجود کے ہمہ گیر پھیلاؤ میں لفظ کا اطلاق جہاں بھی معانی کے بحر نما پھیلاؤ کو کاٹے گا تو تعین کا یہ عمل حقیقت کے ساتھ ناانصافی ہی قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا مذکورہ اصطلاحات کی تنگ دامنی کو برداشت کرنے کے باوجود مفاہیم کے تعین میں اس تقسیم سے مدد ضرور ملے گی۔ ہر چند وجود کا لفظ اپنی وسعت کے اعتبار سے سارے معانی کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے تاہم یہ جس تصور کو ذہن میں جنم دیتا ہے وہ خود تصور کی محدودیت کی بنا پر تحدید کی زد میں آ جاتا ہے۔ مگر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی تاہم اس گفت گو سے یہ چیز نمایاں ہو کر سامنے لانے میں ضرور مدد ملی کہ ہر تخلیق تفکر سے اور ہر فکر تخیل سے ہم آغوش ہوتی ہے۔ جہاں تک تخلیق کا تعلق ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تخلیق اسی طرح شعور کے بطن سے جنم لیتی ہے جس طرح فکری مباحث عقل کی اولاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ طاقت ور تخلیق شعور کی آغوش میں پرورش پاتی ہے۔ کائنات جیسی کہ ہے کی توضیح سائنس تو کرتی ہے مگر شعری تخلیق ان بہت سے امکانات کو بھی سامنے لے آتی ہے جو اس کائنات کے جواب میں پائے جاتے ہیں چاہے وہ امکانات شعور کے تانے بانے سے ہم آہنگ ہونے کی اہلیت سے محروم ہی کیوں نہ ہوں۔

جون ایلیا ان شعرا میں شامل ہیں جن کی شاعری کو فلسفیانہ عمق جوئی اور ژرف نگہی نے پرورش کیا ہے۔ ان کی ذہنی تربیت مشرقی مدرسے میں ہوئی ہے۔

مشرقی مدرسہ، اس سے میری مراد وہ مدارس ہیں جہاں عربی و فارسی کے قدیم علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ مشرقی مدرسہ یعنی، مشرقی اکیڈیمیا کا معقولاتی نصاب فکر کو تیز اور شک وارتیاب کے خفتہ جراثیم کو بیدار کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ آج بہت سے لوگ تاریخ کے مستند حوالوں سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یورپ کی نشاۃِ جدیدہ (رینے ساں) عرب علوم کے مغربی ممالک میں پھیلنے کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔ یہ خیال صحت پر مبنی ہے لیکن اس ضمن میں جس پہلو کا ذکر نہیں کیا جاتا جب کہ اس کا خاص طور پر تذکرہ ضروری تھا وہ یہی ارتیاب خیزی ہے جو مشرقی اکیڈیمیا کے معقولاتی نصاب کا خاصہ ہے جس نے قرون وسطائی یورپ کے عقیدہ پرستی اور سندنوازی کے ماحول کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ نظام معتزلی نے کہا تھا کہ علم شک سے پیدا ہوتا ہے۔ مغرب کے قرونِ وسطیٰ کی ظلمت میں ارتیاب کے اس نور نے ایک تہلکہ مچادیا جس سے فکر کے تمام بند سوتے پھوٹ پڑے اور عہدِ جدید کی ولادت عمل میں آئی۔ علومِ معقولات نے یہ عمل قدیم معاشروں میں کیا تھا خاص طور پر یونانی علوم نے جو بہت زیادہ منضبط تھے پختگیِ فکر پیدا کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر کردار انجام دیا لیکن مسلمانوں کے دور میں منطق و مابعدالطبعیات نے اس تکمیل کے شاہ کار پیش کیے جس کی مثال تاریخِ تہذیب میں دوسری نظر نہیں آتی۔

اس صدی کا چوتھا عشرہ جس میں جون کے نوجوان شعور نے ارتقا کی منزلیں طے کیں۔ امروہے کی سیّد برادری کے لیے بڑا انقلابی دور تھا۔ پرانے معاشی سہارے ٹوٹ کر گر رہے تھے جس نے ذہین نوجوانوں کے لیے نئے چیلنج پیدا کر دیے تھے۔ تھرٹیز (تیسویں دہائی) میں ساداتِ امروہہ جدید طرزِ تعلیم کے نظریاتی دخول اور اثرات پذیری کے ساتھ ساتھ ماضی کے فکری سرمائے سے بھی قریبی طور پر متعلق تھے۔ مجالس اور ذاکری کا ادارہ یوپی میں خاص طور پر طاقت ور تھا، وہ عہدِ جدید کے فکری دباؤ کو متوازن بنانے کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ اب ہم مستقبل میں ساٹھ سال آگے آگئے ہیں لیکن ذاکری کا ادارہ آج بھی عوام میں اپنے اثر کو باقی رکھنے میں کامیاب رہا ہے جس کا اساسی سبب تو خود واقعۂ کربلا ہے جو انسانی روح کو تڑپا دینے میں تاریخ کے کسی بھی دردناک ترین واقعے سے کہیں زیادہ اثر خیزی کا حامل ہے لیکن مجلس کا نظام بھی جو عرب معقولاتی ڈھانچے

کے تانے بانے سے بنا گیا ہے، مجلسی ادارے کی مقبولیت کا ایک اہم سبب بنا ہے۔ ذاکر صاحبان سے جدید عہد کے نوجوانوں کی یہ شکایت کہ وہ آج کے مسئلوں سے ٹھیک طرح آگہی نہیں رکھتے، وزن رکھتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی صحیح ہے کہ مجلس کا نظام جن مسئلوں سے تعلق رکھتا ہے ان پر بحث کا جو انداز عالم ذاکر صاحبان کے یہاں ملتا ہے اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حضرات جس نصابِ تعلیم سے ہوکر گزرے ہیں اس میں منطقی اصول وقوانین کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔

مئی 1930ء میں رئیس امروہوی، کمال امروہوی اور میں نے لاہور میں منشی کا امتحان دیا۔ فارسی کے اس امتحان کے پاس کرنے کی منطق کا یہ تقاضا تھا کہ مجھے بھی اپنے بڑے بھائی رئیس صاحب کی طرح پنجاب یونیورسٹی کے فارسی کے آخری امتحان منشی فاضل اور الہ آباد بورڈ کے فارسی کے آخری امتحان کامل کو پاس کرنا ہے۔ لیکن اس زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ میں فارسی کی سمت سے ہٹ کر عربی کی طرف چلا گیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مجلس میں ذاکر صاحب نے کسی موقف پر بحث کرتے ہوئے ایک مشہور عرب فلسفی و مفسر کی ایک دلیل دی۔ دلیل اس قدر قوی، اتنی مضبوط اور اطمینان افروز تھی کہ میں اسے سن کر بے حد متاثر ہوا۔ لیکن تاثر ابھی باقی ہی تھا کہ ذاکر صاحب نے یہ دعویٰ کر کے مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ مذکورہ دلیل صحیح بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ میں یہ سوچتا رہ گیا کہ ایسی مضبوط دلیل تو غلط ہو ہی نہیں سکتی پھر مقرر نے کیسے یہ کہنے کی جرأت کی کہ متعلقہ استدلال غیر صحیح بنیادوں پر قائم ہے۔ ایک عجیب عالم حیرت تھا جس میں، میں ڈول رہا تھا کہ ذاکر موصوف نے تھوڑی سی بحث کے بعد ہی اپنے دعوے کو ثابت کرنے یا مجھے یقین دلانے میں کام یابی حاصل کر لی عجیب تجربہ تھا جس سے میں گزرا۔ محسوس مجھے ایسا ہوا جیسے یہ شخص جادوگر ہو جو چاہے تو حقیقت کو افسانہ اور افسانے کو حقیقت بنا دے اور اپنے موقف کو سب سے منوانے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ مولوی صاحب تقریر کر چکے تو میں نے ان سے پوچھا کہ جناب والا یہ غیر معمولی صلاحیت آپ کو کیسے حاصل ہوئی۔ 'علم منطق' کے مطالعے سے۔ مولانا کا جواب تھا اور یہ وہ جواب تھا جس نے میرے پورے مستقبل کو مختلف سمت میں ڈال دیا۔ 13 سال کی عمر تھی جب یہ واقعہ پیش آیا اور اسی وقت میں نے یہ طے کر لیا کہ اب

مجھے صرف منطق کے حصول پر توجہ دینی ہوگی جس کے لیے فارسی کے بجائے عربی پڑھنی ضروری ہے۔ پچھلے ساٹھ سال کی میری شعوری سرگرمیاں اسی فیصلے کے پس منظر میں گزری ہیں۔ 1936ء میں، میں نے پنجاب یونی ورسٹی کا مشکل ترین امتحان مولوی فاضل اور الہ آباد بورڈ کا عربی ادب کا آخری امتحان فاضل ادب پاس کیا جس میں ایک پرچہ انگریزی کا بھی تھا جس کے نتیجے میں 1938ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر سکا جس نے ریاضی اور مغربی مدرسے میں پڑھائے جانے والے دوسرے علوم سے واقفیت کی اہمیت اُجاگر کی۔ تاہم 1940ء تک عربی منطق، فلسفہ اور ادب نے توجہ کا بڑا حصہ اپنی طرف مبذول کیے رکھا اور چھوٹا حصہ جدید علوم کے مطالعے کے لیے مخصوص ہونے لگا۔

یوں جون ایلیا جس ماحول میں شعور کی طرف بڑھے اس میں ان کے ایک بھائی تو فارسی کے کلاسیکی ادب کے ماہر اور دوسرا عربی علوم و ادب سے دل چسپی رکھتا تھا۔ جون کی دل چسپیوں کا تعین کرنے میں یہ عنصر بھی خاصی اہمیت کا حامل بنا۔ پھر ساداتِ امروہہ ہی کے ایک نوجوان اور عربی کے فاضل جو فلسفہ اور منطق سے گہری دل چسپی رکھتے تھے اور نہایت آزاد خیال سوچ کے حامل تھے وہ بھی اس ماحول کو اہم بنانے میں اپنا کردار انجام دے رہے تھے۔ ان کا نام سیّد مصور حسین نجم تھا۔ جون بچے تھے تو مشرقی مدرسے کے یہ تینوں حضرات انقلابی سیاست اور آزاد فکری کے نقیب کی حیثیت سے امروہے کی سیاسی و سماجی زندگی میں ہنگامہ پیدا کیے ہوئے تھے اس صدی کے چوتھے عشرے میں غیر منقسم ہندوستان زبردست سیاسی ہنگاموں کی زد میں تھا۔ جون کے بھائی اس زمانے میں اشتراکی نقطۂ نظر سے بے حد متاثر تھے اور باقاعدہ انقلابی سرگرمیوں میں سرگرم تھے یہاں سے جون کے کمیونسٹ اندازِ نظر کی ابتدا ہوئی۔ وہ انقلابی سوچ اُبھری جو آج تک موجود ہے اور ان کی شاعری کے مختلف گوشوں سے جھانکتی رہتی ہے۔

مشرقی مدرسے میں تعلیم کے دو رُخ ہیں۔ معقولاتی اور منقولاتی۔ منقولاتی رُخ سے زیادہ دل چسپی رکھنے والے عموماً مذہبی فرائض کی ادائیگی کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔ جب کہ معقولاتی پہلو سے زیادہ شغف رکھنے والے یا تو خالص فلسفی بن جاتے ہیں اور یا ادب کی اصناف میں آگے بڑھتے ہیں۔ البتہ یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ منقولات میں مہارت حاصل

کرنے والے معقولاتی مباحث سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں یا وہ حضرات جو معقولات کا درس لیتے ہیں انھیں منقولات سے مکمل ناآگہی رہتی ہے۔ ایک مثال لیجیے۔ وہ حضرات جو مجتہد کے درجے پر فائز ہوئے ہیں انھیں اس وقت تک اجتہاد کرنے کی اجازت ہی نہیں ملتی جب تک وہ منطق اور فلسفے کی اعلیٰ کتابوں کا باقاعدہ درس نہ لے چکے ہوں۔ اجتہاد کی سند دو طرح کی ہوتی ہے۔ اجتہاد بالروایت اور اجتہاد بالدرایت۔ مجتہد بالروایت وہ حضرات ہوتے ہیں جو کسی بڑے مجتہد، حجت الاسلام، آیت اللہ یا اعلم (سب سے بڑے مجتہد کے) فتوے کے تحت فقہی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں جب کہ مجتہد بالدرایت ان علما کو کہتے ہیں جو خود فتویٰ دینے کے مجاز ہوتے ہیں یعنی جو درسِ خارج کی تکمیل کر چکے ہوتے ہیں۔ درسِ خارج، نجف، مشہد اور قم میں اعلیٰ تدریس کے طریقے کا نام ہے۔ درسِ خارج کے سلسلے میں یہاں ایک وضاحت مناسب ہوگی۔ پاکستان بل کہ دوسرے بھی کئی ملکوں میں جو مذاکرے آئے دن منعقد ہوئے ہیں انھیں سیمینار کہا جاتا ہے حالاں کہ مذاکرے کے لیے صحیح لفظ سمپوزیم ہے اور سیمینار ترجمہ ہے درسِ خارج کا۔ سیمینار یا درسِ خارج میں ایک بہت بڑا عالم یا اسکالر اونچے درجے کے طلبہ کی علمی رہ نمائی کا فرض انجام دیتا ہے تدریس کا یہ طریقہ قدیم تہذیب کی صفِ اوّل کی اکیڈمیوں میں رائج تھا اور آج بھی مغرب کے اعلیٰ تحقیقی مراکز میں مروج ہے تو نجف، قم اور مشہد یا عالمِ اسلام اور مغرب کے علمی مراکز میں جو درسِ خارج ہوتا ہے۔ سیمینار کا لفظ اس سے مخصوص ہے جب کہ مذاکرے کے لیے صحیح لفظ سمپوزیم ہے۔ تو بہ ہر حال کہنا یہ ہے لیکن اس سے قبل اس بات پر توجہ کیجیے کہ اس لفظ کا استعمال مسلم معاشرے میں علم اور عالم کا جو مقام ہے اس کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

مشرقی مدرسے کی معقولاتی تعلیم سے گزرے ہوئے طلبہ اکثر و بیش تر انقلابی فکر کے حامل ہوتے ہیں ڈاکٹر محمد اشرف، فیض احمد فیض، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ظ انصاری دوسرے ان متعدد حضرات میں سے چند ہیں جو عربی مدارس کے معقولاتی رُخ سے متعلق نوجوانوں میں شامل تھے۔ اُوپر جن تین حضرات کا ذکر آیا اور جن کے نظریاتی ماحول میں ایلیا کی فکر جواں ہوئی وہ تینوں بھی مشرقی مدرسے ہی سے آئے تھے۔ ان تین میں سے رئیس امروہوی ادب کی رفعتوں اور بلندیوں پر پہنچے اور مولوی سیّد مصور حسین نجم اور اپنے

چھوٹے بھائی کے ساتھ انقلابی سرگرمیوں پیش پیش رہے۔

ان انقلابی سرگرمیوں کے ماحول میں جون کے اپنے مستقبل کی راہیں متعین ہوئیں۔ لیکن فرد کے اپنے ذہنی اور فکری نمو کی توضیح کا یہ انداز جس پر میں اب تک اس مضمون میں چلتا رہا عہدِ جدید کے تحریری بہاؤ سے تو خیر ہم آہنگ ہے تاہم حقیقتوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرتا۔ کسی ذی حیات یا ذی شعور اکائی کے نشوونما کی داستان اس وقت تک پوری داستان نہیں بن پاتی جب تک سوچ کی تنگنائے صرف ماحول کے دائرے میں بند رہے۔ ماحول طاقت ور اور مؤثر تو لازماً ہوتا ہے مگر لفظ کے تقدس کا احترام ملحوظ رکھنے والو! اس زندہ سچائی کو تو نظر انداز مت کرو کہ یہاں صرف ایک اکائی سامنے نہیں ہے دو اکائیاں سامنے ہیں۔ مؤثر ہوگا تو تن تنہا تو نہ ہوگا اس کے ساتھ متاثر بھی ہوگا اور یہ متاثر وہ ذی حیات، ذی شعور اکائی ہے جسے بھلا کر صرف ماحول کا ذکر کر دینا صرف آدھی سچائی کا ہی تو تذکرہ ہوگا پوری سچائی کا تذکرہ تو نہ ہوگا۔

نوجوان جون ایلیا سے متعلق کچھ محرکات کی نشان دہی تو چلیے ہوگئی مگر خود جون ایلیا یا ان کا ذہن، اس کے لیے یاد رکھیے کہ تخلیق ہو یا فکر، غم ہو یا خوشی، کرب ہو یا سکون مآل کار سب کا رشتہ آخر میں ایک اسی نقطے سے جا کر مل جاتا ہے جہاں ذہن کی سب سے عظیم کائنات وجود رکھتی ہے سو اس ذہن کو تو آپ ضرور مرکز میں رکھ کر سوچیں جس سے متعلق محرکات کی طرف کچھ اشارے یہاں کیے گئے ہیں۔ ورنہ ساری کی ساری بات ادھوری رہ جائے گی۔ پوری داستان محض پھیکی اور ہوا میں معلق نظر آئے گی۔ کیا اب بھی اے دوست نقدِ ادب ہو یا تقریظِ ادب، صرف آدھی صداقت ہی پر تکیہ کیا جاتا رہے گا؟ اور جینیات (Genetics) موروثی جینوں میں ردوبدل کر کے جو انقلاب برپا کر رہی ہے کیا ان کے فکری مضمرات کو نظر انداز کر کے ہم انتقادِ ادب کو اب سے پچاس سال پہلے کے مردہ نظریوں کی لاش بنائے رکھنے پر مصر رہیں گے؟

میرے ماموں جون

سیّد ممتاز سعید

میری زندگی میں جہاں بہت سے رشتے باعثِ افتخار ہیں' وہاں سرفرازی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ میری ذہنی اور فکری تربیت، ماموں اچھن (رئیس امروہوی)، ماموں چھبن (سیّد محمد تقی)، ماموں بچھن (محمد عباس) اور ماموں جون کے ہاتھوں ہوئی۔ بل کہ یوں کہو تو غلط نہ ہوگا کہ میری پیشہ ورانہ تعلیم کے ماسوا مجھے شعر و ادب، فکر و فلسفہ، زبان و بیان، غرض تربیت کے تمام منابع و مخارج، انھی چاروں عموانِ محترم کی عدیم النظیر 'یونی ورسٹی' میں مہیا ملے۔

غالباً مندرجہ بالا کے مکمل ادراک کے پیشِ نظر ہی میرے عزیز و محترم ترین بہنوئی، بھائی قمر رضی نے فرمایا کہ مجھے جون کی شاعری پر اپنی تحریر زیرِ نظر مجلّے کے لیے دینا ہے۔ بھائی قمر کا ہر فرمودہ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ انھوں نے جس لطیف پیرائے میں مجھے حکم دیا اس کے پیشِ نظر میرے لیے کوئی چارہ نہ رہا کہ میں جون کے بارے میں اظہارِ خیال کروں۔ انھوں نے فرمایا میں تمھیں جون کا محرم گردانتا ہوں۔ میں نے پوچھا 'آپ تو ان کے بچپن کے دوست ہیں۔ آپ سے زیادہ جون کی شخصیت اور شاعری کا محرم کون ہوسکتا ہے۔' بھائی قمر نے خوب صورت جواب دیا کہ 'محرم' کے چار حروف م، ح، ر اور م ہیں۔ 'م سے تم یعنی ممتاز سعید، ح سے حسن عابد، ر سے راحت سعید اور م سے (ڈاکٹر) محمد علی صدیقی مراد ہیں۔ یہ چاروں جون کے سب سے زیادہ قریب تھے۔ تین نے جون پر تحریریں دے دی ہیں۔ تم کچھ نہ کچھ لکھ کر اس چار حرفی لفظ کو مکمل کردو۔'

بھائی قمر کے اس ارشاد کے بعد، میں یہ بھول گیا کہ میں نے عہد کیا تھا کہ جون پر

کبھی کچھ نہیں لکھوں گا۔ اس لیے کہ کیا میرے آنسوؤں کی روشنائی قلم کی روشنائی کو بہا کر نہیں لے جائے گی۔ اس لیے بھی کہ میں جون کے باب میں 'تھے' کا لفظ استعمال کرتے وقت کیا خود نہ مرجاؤں گا کہ یہ کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ان کے بغیر یہ زندگی کیسے کٹے گی اور کہاں گزرے گی۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ میں بھائی قمر رضی کے بہ قول، جون کا کیسا بھی محرم ہوں لیکن ان پر یا ان کی شاعری پر قلم اُٹھانے کی مجھ کم مایہ کو جرأت کیسے ہو، میں کہاں اور جون کہاں۔ حافظ شیراز سے معذرت کے ساتھ 'فراز جون کجا منے خراب کجا'، 'ببیں تفاوت رہ، کز کجاست تا بکجا'۔ بہ ہر حال بھائی قمر رضی کے حکم کی تعمیل میں، چند یادیں اور چند ہی باتیں پیشِ خدمت ہیں۔ اصل معروضات سے پہلے ایک وضاحت ضروری ہے۔ یوں تو جون میرے ماموں تھے اور شعر و ادب کے مجھ جیسے ایک عام قاری کے لیے انتہائی لائقِ احترام اور عظیم شاعر تھے، لیکن مجھ سے چھ برس بڑے ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ مجھے دوست کی حیثیت دی۔ اس لیے ان پر گفت گو کرتے ہوئے انھیں جون کہوں تو اسے گستاخی محسوس نہ کیجیے۔

جون سے میرے قرب کا پس منظر۔

اس عنوان کے تحت چند گزارشات اس لیے ضروری ہیں کہ جون کی زندگی اور شاعری پر میری تحریر میں قاری کے لیے اعتبار کا عنصر پیدا ہو جائے۔ میری ان سے شناسائی دو چار ملاقاتوں یا کچھ مشاعروں میں ان کا کلام سن کر، ان سے قرب اور واقفیت کا دعویٰ کرنے والے بعض حضرات اور خواتین کی طرح کی شناسائی نہیں تھی۔ میں نے اپنی چھ دہائیوں اور سات سال کی عمر میں اپنے والدین، اپنی شریکِ حیات اور بچوں کے علاوہ اگر سب سے زیادہ وقت گزارا ہے تو وہ جون کی صحبت میں۔ میں نے انھیں ان کی شخصیت کے ہر رنگ میں دیکھا اور ان کی خلوت و جلوت میں ہر ادا کا قاری رہا۔ جون سے میرا پہلا تعارف 1942ء میں (میں دس سال کا تھا، جون سولہ سال کے) اس وقت ہوا، جب آگرہ، گورکھپور، گونڈہ اور اور مرادآباد میں والد صاحب کی تعیناتیوں سے نمٹ کر، ہم لوگ امروہہ آگئے۔ اس سے پہلے، امی جو اُن کی خالہ زاد بہن تھیں، رئیس صاحب، تقی صاحب کے ساتھ جون کا بھی ذکر کرتی تھیں کہ وہ میرا سب سے زیادہ ذہین اور فطین بھیا ہے۔

پھر امروہہ پہنچ کر جلد ایک روز امی ہماری پسندیدہ ترین خالہ نرجس خاتون یعنی جون کی والدہ محترمہ سے ملنے گئیں تو مجھے ساتھ لے گئیں اور یہ کہہ کر مجھے ان سے ملایا کہ 'دیکھ بیٹے یہ ہے جون' اور جون سے کہا 'جون اس بچے کو شعر یاد کرنے کا بہت شوق ہے، اسے اپنے شعر یاد کرادو۔ اس طرح اس کی اُردو اچھی ہو جائے گی اور شاید شعر کی سمجھ پیدا ہو جائے۔' جون بہت پیار سے مجھے الگ لے گئے اور اپنے چند شعر سنائے۔ اس وقت تک والد صاحب، علامہ اقبال کے کلام سے عشق کے نتیجے، مجھے ان کا تمام اُردو کلام حفظ کرا چکے تھے لیکن اکثر حفاظِ قرآن کی طرح، مجھے بھی علامہ کے اشعار کے معنی و مفہوم سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ چناں چہ جون نے پوچھا کہ میں ان کے اشعار کے معنی سمجھا یا نہیں تو مجھے ندامت سے نظریں جھکا لینے کے علاوہ کوئی صورت نظر نہ آئی۔ امروہہ میں 1942ء سے 1949ء تک قیام کے دوران جون سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن میں اپنی کم عمری کی بنا پر ان سے کوئی استفادہ نہ کر پایا اور نہ ان کا وہ قرب نصیب ہوا جس کی ابتدا 1957ء میں ان کے کراچی آنے پر ہوئی اور جو اُن کے سانحۂ ارتحال تک قائم رہا۔

جون کراچی آئے تو میں اکیس سال کا تھا اور کراچی یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا وہاں میں اور نقی اختر انھیں بہ اصرار بزمِ ادب کی ماہانہ نشستوں میں لے گئے تو کراچی کے ادبی مطلع پر جون طلوع ہوئے۔ پھر مشاعروں میں بلائے جانے لگے اور مقبولیت بڑھتی ہی گئی۔ باقی سب تاریخ کا حصہ ہے۔

جون کی شاعری اور نثر پر بات کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے اگر ہمیں یہ یاد رہے کہ ان کے طاقت ور ذہن کی تربیت، تمرین اور ارتقا کے بنیادی ستون کیا تھے۔ سب سے پہلے ان کی ابتدائی تعلیم ان کے والد محترم علامہ شفیق حسن ایلیا کی بے مثال علمیت اور پھر گھر کے اس ماحول کا ذکر ضروری ہے جس میں، رئیس امروہوی اور سیّد محمد تقی جیسے برادرانِ بزرگ اور پھر امروہہ کی یونان صفت مجلسی اور علمی زندگی شامل تھے۔ اس گھر میں رودکی، خسرو، عرفی، حافظ، صائب، جامی و قاآنی کی شاعری پر، طالیس ملطی، دیو جانس کلبی، سقراط، افلاطون، ارسطو، دمقراطیس اور سوفسطائی فلسفیوں کے نظریات اور اسپنوزا، کانٹ، ہیگل، مارکس، برٹینڈ رسل، وائٹ ہیڈ وغیرہ پر گفت گو اسی طرح ہوتی تھیں جیسے عام لوگوں کے یہاں

حالاتِ حاضرہ اور اپنے عزیز و اقارب کے بارے میں باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں عربی، فارسی اور انگریزی کی نہایت مضبوط بنیادیں جو جون کو ورثے اور ماحول سے ملیں، ان سے بھی زیادہ ان کے شاعرانہ ذہن، لہجے اور اسلوب کی جڑیں علامہ شفیق حسن ایلیا کی بابل و نینوا کی تہذیب اور الہامی کتابوں بہ طورِ خاص عہد نامہ عتیق اور جدید اور قرآن حکیم سے علمی اور فکری شغف سے اُٹھیں۔ چناں چہ زبان و بیان کی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ جون کی کرشمہ کار شخصیت اور حضرت عیسیٰ، یوحنا، یرمیاہ منصور حلاج اور امام حسینؑ جیسی شخصیتوں سے ان کے شغف نے ان کے شاعرانہ ذہن کو وہ صیقل بخشی جو اُردو شعرا میں بالکل منفرد ہے۔ اقبالؔ نے کہا تھا 'شاعری جزویست از پیغمبری' چناں چہ جون کے یہاں ایک پیغمبرانہ لہجہ موجود ہے۔

جون کی مشاعرہ افگنی اور ان کی شاعری میں جو اساطیری، ڈرامائی اور تمثیلی پہلو نمایاں ہے، اس کی بنیادیں بھی بچپن اور جوانی میں امروہہ کی ڈراما تنظیم 'بزمِ حق نما' میں ان کی شمولیت سے مضبوط ہوئیں۔ اسی پس منظر میں، میں ان کی اس رزمیہ نظم کو ان کا عظیم ترین کارنامہ سمجھتا ہوں جو 65-1964ء میں انھوں نے 'نئی آگ کا عہد نامہ' کے عنوان سے الواح کی ساخت میں لکھنا شروع کی تھی اور مکمل نہ ہو سکی اور جس کا نامکمل مسودہ ان کی غفلت سے گم ہو گیا۔ جب اس نظم کی 'لوحِ بابل' وہ اپنے مخصوص خطابیانہ انداز میں سناتے تھے تو مجھ سمیت کئی لوگ اشک بار ہو جاتے تھے۔ یہی وہ نظم تھی جس کے لیے جون کی تمام عمر کی زبان و بیان کی اعلیٰ ترین ہنرمندی مہیا ہوئی تھی اور اسی نظم کے حوالے سے میں جون سے اصرار کرتا رہا کہ وہ غزل ضرور کہیں، کچھ مشاعروں میں بھی شریک ہوں، لیکن بنیادی توجہ نظم کہنے پر رکھیں۔ یہ نہ ہو سکا اور جون آہستہ آہستہ غزل اور مشاعرے کے کلچر میں شہرت و اعتراف کے ہجوم میں زندگی گزارنے لگے۔ غزل میں یقیناً جون نے ایسا مقام حاصل کر لیا کہ وہ اُردو کے چند اعلیٰ ترین صاحبِ طرز غزل گو شعرا میں شامل ہوئے لیکن نظم کے میدان میں، اُردو ہی نہیں دنیا کی بڑی زبانوں کے چوٹی کے شعرا کی محفل میں، اپنی تمام تیار چند عظیم نظموں کے باوجود شریک نہیں ہوئے اور اس محفل میں شمول کا حق، غزل گوئی کی نذر کر دیا۔

جون کی شاعری کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی شخصیت کی

ساخت کو سمجھا جائے تا کہ ان کی غزل اور نظم پر ذاتی شخصیت کی پرچھائیں کی شناخت ہو سکے۔ طاقت ورانا اور مسابقت کی خواہش تو ہر بڑے شاعر ادیب اور فن کار کا بنیادی اثاثہ ہوتی ہیں کہ ان کے بغیر اظہار کی خواہش نہیں جاگتی۔ یہ الگ بات ہے کہ عام طرزِ عمل اور زندگی میں، انا اور مسابقت پسندی، بعض شخصیتوں میں براہِ راست جلوہ نما ہوتی ہے اور بعض میں اندروں کا حصہ بن کر کارنامہ جوئی تک محدود رہتی ہے اور عام اخلاق پر نافذ نظر نہیں آتی۔ جون کی شخصیت میں انا اور مسابقت پسندی بہت طاقت ور عناصر تھے لیکن فیض صاحب اور رئیس صاحب کے برعکس، جون کی عام زندگی، سماجی طرزِ عمل اور اخلاق میں باہر آ کر اثر انداز ہوتے تھے۔ وہ فارسی شعرا میں خسرؔو اور عرفیؔ، اور اُردو میں میرؔ کے علاوہ کسی شاعر کے معترف نہیں تھے۔ میرے نزدیک ان کی بے جا غالبؔ دشمنی کی بنیاد بھی یہی طاقت ور انا اور مسابقت پسندی تھی۔ میرؔ کا تاثر جون کے یہاں اتنا گہرا ہوا کہ انھوں نے میرؔ کی بد دماغی کو شعور اور لاشعور میں بسا لیا جس کے نتیجے میں زندگی کے آخری چند برسوں میں وہ قریب ترین دوستوں سے دُور ہو گئے۔

یہ عجیب صورتِ حال رہی کہ وہ میرؔ کے لہجے اور اسلوب سے قریب ہونے کی کوشش کرتے رہے لیکن انا، بد دماغی اور نرگسیت نے ان کے نظریۂ عشق کو غالبؔ سے قریب تر کر دیا۔

جون کی شخصیت کی تعمیر و تربیت کے تین دیگر پہلو نمایاں تھے جو اُن کی شاعری کو مزید انفرادیت بخشتے تھے۔ ایک شدّتِ احساس جو اُردو شعرا میں، جوشؔ صاحب کے ابتدائی دور کی نظموں میں پائی جاتی ہے لیکن اور کسی شاعر کے یہاں بہت کم نظر آتی ہے۔ دوسرے ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت جو مجازؔ کے یہاں ملتی ہیں لیکن جون کے یہاں ان سے بہت زیادہ تھی۔ تیسرے ایک چونکا دینے والی ڈرامائیت جو اُردو شعرا میں بہ مشکل ہی ملتی ہے۔ جون کا شاعرانہ مزاج ان کی انانیت کے علاوہ انھی تینوں عناصر سے عبارت تھا۔

اس سے آگے میری تحریر جون کی شاعری میں عالمی ادب سے مماثلتیں تلاش کرنے اور ان چند پہلوؤں کی طرف مبذول کرانے پر مشتمل ہے جو میرے نزدیک جون کی زندگی اور شاعری کو سمجھنے میں قاری کی مدد کر سکتے ہیں۔ مکمل احاطہ نہ آسان ہے اور نہ میرے بس میں لیکن اب سے آگے برسوں اور صدیوں میں ہوتا ہی رہے گا۔

یار ہمارا ایلیا

سیّدہ تحسین علیم

اپنے منفرد نام، منحنی جسامت اور اوڑھی ہوئی قنوطیت کے سبب جون ایلیا دل چسپ تو بہت لگتے تھے مگر متاثر کن نہیں۔ شروع شروع میں ان کے جو اشعار ہم نے سنے وہ بھی ہمارے مزاج سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ لونڈھیارپنے کے اشعار سے مشاعروں میں چھتیں اُڑائی جا سکتی ہیں مگر سنجیدہ قاری کو متاثر نہیں کیا جا سکتا، مثلاً۔

شرم، دہشت، جھجک، پریشانی
ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں
آپ، وہ، جی، مگر یہ سب کیا ہے
تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں

ایک ثقہ بزرگ نما شخص کے منہ سے اس قسم کے اشعار سنے جائیں تو مسکراہٹ تو آ ہی جاتی ہے مگر۔۔۔ خیر جانے دیجیے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کہ وہ متوجہ کرنے کا فن خوب جانتے تھے۔

علیم کے یہاں جون ایک مستقل 'تذکرہ' تھے۔ کوئی نہ کوئی جون کا ذکر ضرور چھیڑ دیتا۔ جون کی حرکتیں، ناگفتہ بہ باتیں، ان کی بے حسی، ان کے مسائل و معاملات جون کے شعر کی طرح بار بار کہے جاتے، سنے جاتے۔ پھر جون کی دربدری کی داستانیں عام ہوئیں۔ زاہدہ حنا سے علیحدگی کے فوراً بعد ہی 'قبیلہ جونیت' نے جنم لے لیا۔ ایک اہم شاعر، ایک مشہور شخصیت سے قربت کا اعزاز حاصل کرنے کے خواہش مند بہت سے بے نام،

نام ور ہونے لگے کہ جون ٹھکانے کے متلاشی تھے اور ارد گرد منڈلانے والے نام ونمود کے متلاشی۔ دونوں کا کام نکل رہا تھا۔ مگر نام ونمود کا حسین خواب جب گھر والوں کی ناپسندیدگی سے دھندلانے لگتا تو چوتھے پانچویں دن ہی عاشقانِ جون اُن کے لیے کوئی نیا کندھا ڈھونڈنے لگتے، جوں ہی کوئی 'مناسب' کندھا نظر آتا چابک دستی سے اُس کے گلے میں جون کی بانہیں ڈال دی جاتیں اور پھر وہی ڈراما دہرایا جانے لگتا۔ ایک منفرد شاعر کی یہ بے وقعتی ہمارے لیے جہاں حیرت خیز تھی وہیں ہمارا دیدۂ عبرت اُن کی درماندگی سے پریشان بھی ہوتا تھا۔

جون صاحب کی پہلی زیارت 1984ء میں سر سیّد کالج کے ہفتۂ طالبات میں ہوئی۔ اُس دن 'بھائی رئیس' (علیم ہمیشہ رئیس صاحب کو انھی الفاظ میں یاد کرتے تھے) بھی ہم راہ تھے۔ لڑکیوں کی دبی دبی ہنسی اور مضحکہ اُڑاتے ہوئے فقرے ہر چند کہ ہر دو صاحبانِ علم کے مقام سے ناواقفیت کے سبب تھے، مگر پھر بھی اپنی بھد اُڑوانے کا یہ شوق عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

پھر 'شاید' آئی۔ اب جون ایک بہت پیچیدہ شخص محسوس ہوئے۔ غیر معمولی زباں داں اور قابل، ایک اہم اور منفرد شاعر۔ مگر خود رحمی، زود حسی اور نرگسیت کا شکار۔ ایک بالغ شاعر نابلوغیت میں پھنسا ہوا۔ ہمارے لیے جون کا 'محروم النسا' رویہ بھی حیران کن تھا۔ اُن کے شعر سے تو خبر ملتی تھی کہ اُن کے آس پاس حسن ہی حسن بکھرا پڑا تھا۔ اُس وقت جب ہندوستان کی لڑکیاں یوں بے محابا و بے حجابانہ گھروں سے نہ نکلتی تھیں جون کو اتنے مواقع میسر آتے رہے پھر بھی؟

عشق میں ناکامی خون ضرور تھکواتی ہو گی مگر اس کی سرخوشی بھی تو سرمایۂ حیات بنتی ہے۔ جون کے یہاں اس کا اظہار مفقود ہے۔ وہ ہر عورت سے شاکی رہے۔

جون بھائی سے ہمارا پہلا باقاعدہ رابطہ اگست 1991ء میں ہوا۔ ہمارے ایم اے کے مقالے کا موضوع 'عربی ادب کے اُردو تراجم' تھا۔ جون صاحب کی عربی و فارسی میں مہارت کا شہرہ تھا۔ ہمارے سپروائزر ڈاکٹر حسن قاسم مراد صاحب نے جون صاحب کا فون نمبر عطا کرتے ہوئے اُن سے رابطے کی تاکید کی۔ جون صاحب سے بات ہوئی، مدعا

بیان کیا۔ انھوں نے ہمارے اُس وقت تک کے کام کے بارے میں پوچھا۔ خلیل جبران کا ذکر آیا تو جون صاحب 'گوش بر آواز' پر گفت گو کرنے لگے۔ جون ایلیا کی ایک اور صفت ہم پر کھلی۔ غیر معمولی حافظہ۔ وہ گوش بر آواز کے صفحہ نمبر اور سطر نمبر کے حوالوں سے مضمون پر تبادلہ خیال کر رہے تھے، اپنے حافظے سے شاکی تحسین فاطمہ جون سے رشک میں مبتلا ہو چکی تھی۔

ہم نے اپنا تعارف 'بہ وجوہ' اپنے گھریلو نام سے کروایا تھا۔ جب مقالے پر سیر حاصل گفت گو ہو گئی تو جون صاحب نے اچانک ایک ایسی بات کہہ دی کہ ہمارا سادہ ذہن سٹ پٹا گیا، گھبراہٹ میں منھ سے جواب نکلا۔ شاید۔ جون ایلیا تو نہال ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ''شاید!۔۔۔ میرے مجموعے کی طرح۔۔۔ مدتوں بعد کسی حاضر جواب، ذہین الطبع اور سخن فہم لڑکی سے بات ہو رہی ہے۔'' 'بہ وجوہ' کا خوف اب اپنی تمام تر ہول ناکی کے ساتھ ہم پر وارد ہو چکا تھا، ہم نے بھونڈے پن سے موضوع بدلتے ہوئے اُس مشاعرے کا ذکر چھیڑ دیا جس میں اُن پر تشدد کیا گیا تھا۔ جون صاحب گول مول سے جواب دے رہے تھے۔ تب ہم نے اُن سے اپنے ذہن میں اُٹھنے والا وہ سوال پوچھ لیا جو ہم علیم سے پوچھ چکے تھے۔ ''کہ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے کہ اُس واقعے کے بعد وہ مشاعرہ آگے کیسے چلا تھا؟'' جون کیا بتائیں کیا بتائیں کر رہے تھے، تب ہم نے اُن سے کہا، جون صاحب اس معاملے پر ایک تبصرہ یہ بھی ہے کہ ''وہاں کوئی شاعر ہوتا تو مشاعرہ نہ ہوتا، وہاں کوئی شاعر تھا ہی نہیں۔''

جون ایلیا کی آواز میں غیر معمولی پن تھا جب انھوں نے جواباً کہا۔ ''یہ بات کائنات میں صرف ایک شخص کہہ سکتا ہے۔ وہ ہے عبیداللہ علیم۔'' 'بہ وجوہ' اب ہمارے ہوش اُڑا چکا تھا۔ سو سلسلہ منقطع کیا۔

اگلے دن علیم کو بتایا۔ جی بھر کر ڈانٹ کھائی، مگر اس واقعے سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ جون اور علیم ایک دوسرے کے ہم زاد تھے۔ ایک دوسرے کو تمام عالموں میں جانتے تھے، سمجھتے تھے۔

ایک دوسرے کی سنگت میں ان دو دوستوں نے بڑے یادگار دن گزارے،

چھوٹے چھوٹے مگر بڑے دل چسپ واقعات سے گندھے ہوئے دن، دوستی کی خوش بوؤں سے مہکتے ہوئے دن۔ ایک بار ہم اور علیم کہیں جا رہے تھے، ایم اے جناح روڈ پر واقع تبت سینٹر پر نظر پڑی تو علیم کچھ یاد کر کے مسکرانے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ اُن دنوں جب وہ طالب علم تھے اور شدید مالی تنگی کا عالم تھا۔ ایک دن جون اُن کے پاس آئے، علیم ان دنوں 6 نمبر لالوکھیت میں رہا کرتے تھے۔ ڈینسو ہال کے پاس کسی سے ملنے کا پروگرام بنایا گیا۔ علیم نے کہا۔ ''جون جائیں گے کیسے، پیسے تو ہیں نہیں؟''، جون نے کہا۔ '' پیسے تو میرے پاس بھی نہیں ہیں۔''، علیم نے مایوسی سے گردن ہلائی تو جون صاحب نے کہا۔ '' چلتے ہیں دیکھی جائے گی۔'' سو دونوں چل پڑے اور ایک بس میں سوار ہو گئے۔ کنڈکٹر آیا، دونوں بے کار دوستوں کی داستانِ غم سن کر بھی اسے ذرا رحم نہ آیا اور اُسی جگہ اُتار دیا۔ جہاں یہ دونوں اُتارے گئے وہاں تبت سینٹر کی تعمیر کے لیے کھدائی ہو چکی تھی، ایک نہایت گہرا گڑھا موجود تھا۔ اسی جگہ پان کا ایک کھوکھا تھا۔ جون نے نیچے اُتر کر جیب سے اٹھنی نکالی اور سگریٹ خریدنے لگے۔ علیم نے تعجب سے کہا۔ ''جون تم تو کہہ رہے تھے کہ تمھارے پاس پیسے نہیں ہیں، میرے پاس تو واقعی نہیں ہیں پھر یہ کہاں سے آئے؟'' جون نے کمال بے پروائی سے فرمایا۔ '' تو سگریٹ کے پیسے میں اُس بے رحم کنڈکٹر کو دے دیتا؟'' سکہ جون کی کھلی ہوئی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ علیم نے یہ کہتے ہوئے ''ابے حرام کی سگریٹ پیے گا'' جون کی ہتھیلی پر زور سے اپنا ہاتھ مارا۔ جون کی کھلی ہوئی ہتھیلی سے سکہ اُچھلا اور تبت سینٹر کے گہرے گڑھے میں جا گرا۔ واقعہ سنا کر علیم کے چہرے پر وہی پیاری مسکراہٹ پھیل گئی جو اُن کی پہچان بن گئی تھی۔۔۔۔ کہنے لگے۔ '' وہ تاریخی سکہ اب بھی اسی عمارت کے نیچے موجود ہوگا۔''

جولائی 1992ء میں علیم بیماریٔ دل میں مبتلا ہو کر ادارۂ امراضِ قلب کے ایک کمرے میں فروکش ہو گئے۔ ہماری وہاں طلبی ہوئی۔ دوپہر کو ہم وہاں پہنچے تو علیم، مظفر منصور کو شہد اور جامن لانے بھیج چکے تھے۔ مظفر بھائی سے علیم کوئی کام کہتے تو وہ اسے فرض کی طرح ادا کرتے تھے۔ انھوں نے اسپتال کے آس پاس کی تمام دکانوں پر موجود Langnese کی ساری بوتلیں خرید کر علیم کے سرہانے ڈھیر کر دیں، ہم انھیں سنبھالنے کے

بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ دروازے پر آہٹ ہوئی، جون ایلیا ظہیر احمد کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے تھے، ''اے بھائی یہ کیا ادا دکھائی۔'' فل اسٹاپ سے قبل ہی جون صاحب کی نگاہ شہد کی بوتلوں پر پڑ چکی تھی، وہ بیمار دوست کو بھول بھال شہد کی طرف لپکے۔علیم کے چہرے پر اُن کی مخصوص مسکراہٹ جگمگانے لگی۔ جون، علیم کی حوصلہ افزائی سے جب بوتل سنبھال چکے تو بیمار کا حال پوچھا۔ ان کی خود فراموشی کی اس کیفیت سے سب لطف اُٹھاتے تھے۔

کچھ عرصے بعد جون ایلیا ہمارے منھ بولے بھائی ظہیر کے گھر کے مہمان ہو گئے، وہی ہوا جو ہونا تھا۔ بُوا (ظہیر کی مرحومہ والدہ) کا حکم آ چکا تھا۔ظہیر روز علیم کے سامنے پریشانی بیان کرتے، وہ مسکراتے رہتے۔ظہیر اور ہم، دونوں، اُن دنوں جامعہ کراچی کے طالب علم تھے، جون صاحب کے روز و شب کے سلسلوں کا روز ہی ذکر رہتا۔ جون اور زاہدہ حنا کی طلاق کی خبر گرم تھی۔علیم کے حجرے میں اس خبر پر تبصرے جاری رہتے۔علیم بالکل خاموش رہتے۔صرف ایک بار انھوں نے کہا۔''یہ تو بالآخر ہونا ہی تھا۔'' حیرت انگیز طور پر علیم، جون کے معاملات سے خود کو علیحدہ رکھتے تھے۔مگر یار ہمارا ایلیا، کہنے والا دوست کے مصائب سے لاتعلق نہیں تھا۔ جب جون صاحب ظہیر کے گھر میں رہنے لگے تو جون صاحب کا ذکر مزید بڑھ گیا۔خود علیم بھی دن میں کئی کئی بار جون کے لطیفے سناتے رہتے تھے۔

مثلاً کھانے پینے کی کوئی چیز زمین پر گر گئی تو علیم ہنس ہنس کر کہتے تھے۔''ابے برف گر گئی ہے، زاہدہ نہیں ہے، اُٹھا لے جلدی سے اُٹھا لے۔'' سبھی ان باتوں کا لطف لیتے تھے۔

مگر جو چیز علیم خود سے بھی شاید چھپاتے تھے وہ جون کی محبت تھی۔ وہ بہ ظاہر جون سے لاتعلق تھے مگر جون کی فکر بھی کرتے تھے۔ ان دونوں کے بیچ تعلق اور بے تعلقی کا یہ چیستاں سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ دن یوں ہی گزرتے چلے گئے۔ ہماری شادی ہو گئی۔ ہم دونوں کے اس غیر معمولی فیصلے کے اثرات بھی غیر معمولی تھے اور ثمرات بھی۔ زندگی بہت مصروف ہو گئی۔ انھی دنوں ظہیر، جون صاحب کا پیغام لے کر آنے لگے۔ ہمیشہ ایک ہی جملہ ''علیم بھائی، جون بھائی آپ کو یاد کر رہے ہیں'' علیم سُن کر بھی اَن سنا کر دیتے تھے۔ جب بار بار جون صاحب کی بے چینی بیان ہوئی تو علیم ہنس کر بولے۔''پیارے صاحب علیم سے

ملنا ہے؟ نہیں بھائی، اب وہ لاہور میں کوئی انٹرویو دے آیا ہے، جس پر اس کے قتل کا فتویٰ جاری ہوگیا ہے تو علیم یاد آیا کہ وہی بچا سکتا ہے۔'' فتوے والی بات ہمارے لیے انکشاف تھی تو علیم کا وہ چبھتا ہوا طنزیہ رویہ بھی حیرت میں ڈال رہا تھا۔ وہ تو ہمیشہ لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ ہر مشکل میں وہ سب سے آگے نظر آنے والے آدمی تھے، جون کے معاملے میں یہ تلخی کیوں؟ کچھ وقت اور گزر گیا، جون کا ذکر ہوتا رہا۔ پھر جولائی 1997ء آیا۔ تین بڑے واقعات ساتھ لایا، پہلا واقعہ ثابت احمد کی ولادت تھی جو 3 جولائی کو ہوئی۔ ان کی پیدائش میں بڑی پیچیدگیاں جھیلنا پڑی تھیں۔ دو ہفتے بعد اسپتال سے رخصت ملی۔ جسمانی حالت دگرگوں تھی، آپریشن اور بدن میں انفیکشن کے سبب ہم جاں کنی کی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ شام گئے ہم لوگ گھر پہنچے۔ صبح ہوئی تو علیم نے ہم سے کہا۔'' سیدہ تمھیں آرام کی ضرورت ہے، میں قاصد (ہمارا بڑا بیٹا) کو ساتھ لے جاتا ہوں، تم سو جاؤ۔'' علیم بچے کو لے کر اپنی بہن کے گھر چلے گئے۔ انھیں گئے بہ مشکل پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ کال بیل بج اٹھی۔ ہم نے نیچے جھانکا تو ظہیر ایک لڑکی کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔ ظہیر گھر کے فرد کی حیثیت میں آزادانہ آتے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ کبھی کبھی ان کی کلاس فیلو بھی آجاتی تھیں۔ ہم نے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا، اسی لمحے 'اس لڑکی' نے بھی اوپر دیکھا۔ یہ تو جون ایلیا تھے۔ جو دُور سے ہمیں لڑکی لگے۔ دروازہ کھولا تو جون صاحب تشریف لائے۔ یہ اس ماہ کا دوسرا اہم واقعہ تھا، اپنے عہد کا ایک اہم شاعر، ایک نابغہ ہمارے گھر میں رونق افروز تھا۔ ہم اس طرح کے اعزازات کے حریص نہیں تھے مگر کفرانِ نعمت کے بھی قائل نہ تھے۔ علیم سے وابستگی کے علاوہ سب ہیچ نظر آتا تھا سو الحمدللہ وہ میسر تھے۔ ہم نے ان لوگوں کو بتایا کہ علیم تو گھر میں نہیں ہیں۔ ظہیر نے بڑے اعتماد سے کہا۔'' تم انھیں فون کرو، جون صاحب کا معلوم ہوگا تو آجائیں گے۔'' مگر ہوا اس کے برعکس علیم سنتے ہی بھڑک گئے، انھوں نے ہم سے کہا۔'' میں مصروف ہوں نہیں آؤں گا۔ ان سے کہہ دو کہ وہ چلے جائیں'' ہم ہکا بکا۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ علیم بہت غصے میں تھے، ظہیر کی تو شامت ہی آگئی تھی۔ خیر ہم نے ان کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ ہم جون صاحب سے کہیں کہ وہ چلے جائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا، ہم جانتے تھے کہ دل سے

علیم خود بھی نہیں چاہتے کہ وہ جون سے اس طرح پیش آئیں۔ خدا جانے دونوں کے بیچ ایسی کیا بات تھی کہ علیم جیسا محبت کا پیکر، مہمان نواز انسان، گھر آئے مہمان سے اس طرح پیش آرہا تھا۔ بات تو سنبھالنا تھی، ظہیر جو خود علیم کے خوف سے کانپ رہے تھے، بات ٹالنے کے لیے پوچھنے لگے۔ ''تحسین کیا پکایا ہے۔'' دن کے گیارہ بجے ہوں گے، ہم کام کاج کے قابل نہیں تھے مگر خاتونِ خانہ کا فرض بھی نبھانا تھا۔ ہم نے ظہیر سے کہا۔ ''تمھیں حالات کا علم تھا خود لیتے آتے۔'' وہ کہنے لگے۔ ''دن کا وقت تھا اور اتنی جلدی کچھ ملتا بھی نہیں۔ مہمان سے پوچھا کیا کھائیں گے؟'' اب جون صاحب نے ہمارا انٹرویو شروع کر دیا۔

دیکھو میں انیس سال سے دوپہر کا کھانا نہیں کھاتا ہوں، پھر جتا کر بولے انیس سال ہو گئے ہیں میں نے لنچ نہیں کیا، اور دیکھو میں پائے نہیں کھاتا ہوں تم لوگ اس میں آٹا ڈالتے ہو، ہم اور ظہیر بہ یک وقت بول پڑے، آٹا نہاری میں پڑتا ہے پائے میں نہیں۔ جون ہاتھ اُٹھا کر بولے ہم نہاری بھی نہیں کھائیں گے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ اگر وہ پائے یا نہاری کے موڈ میں ہیں تو اس عجلت میں ممکن نہیں ہے، ظہیر نے ہمیں ٹوکا، گھر میں کچھ ہے، ہم نے بتایا قیمہ رکھا ہے وہی پکا دیتے ہیں۔ اب ظہیر، جون بھائی سے مخاطب ہوئے۔ ''جون بھائی تحسین بہت اچھا قیمہ پکاتی ہیں۔'' جون صاحب نے اپنی بات دہرائی کہ ''بھئی میں تو اس وقت کھاتا ہی نہیں ہوں کچھ نہیں کھاؤں گا۔'' ہم گومگو کی کیفیت میں ظہیر کو دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں آنکھ سے اشارہ کیا کہ جاؤ پکاؤ اور زور سے بولے۔ ''اچھا چائے تو پلا دو۔'' ہم باورچی خانے میں چلے گئے۔ چائے کا پانی چولھے پر رکھا اور قیمہ پکانے کی تیاری شروع کر دی، چائے لے کر ہم کمرے میں آئے تو جون صاحب بہت احترام سے گویا ہوئے۔ ''تم بہت پڑھی لکھی ہو۔'' ہم نے حیرت سے انھیں دیکھا (کیوں کہ کسی علمی گفت گو کی نوبت ہی نہیں آئی تھی) بالکل غیر متوقع بات تھی، ہمیں اس کا دعویٰ بھی نہیں تھا۔ ہم نے حیران ہو کر ظہیر سے آنکھوں آنکھوں میں پوچھا، کیا ماجرا ہے؟ جون صاحب نے ہماری وہ حرکت دیکھ لی تھی، اسی لہجے میں کہنے لگے۔ ''ابھی میں تمھاری کتابیں دیکھ رہا تھا یہ جو دوسرے کمرے میں رکھی ہیں، (ہمارا ایک چھوٹا سا ذاتی کتب خانہ ہے) بٹیا ہمیں ظہیر نے بتایا کہ یہ سب کتابیں تمھاری ہیں ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ علیم کی ہوں گی،

انھوں نے بتایا کہ یہ تو تم جہیز میں لائی ہو، بھئی ایسا انتخاب تو کسی بہت پڑھی لکھی لڑکی کا ہی ہو سکتا ہے۔'' ہم مسکرا کر چپ ہو گئے اور پھر باورچی خانے میں جا کر کھانا پکانے میں مصروف ہو گئے۔ دستر خوان لگا، کھانا اُترا تو جون صاحب نے بلا تأمل پلیٹ اُٹھائی اور ایک لقمہ لیا۔ اور پھر ہمارے کانوں کو بھی ان کا شہرۂ آفاق جملہ سننے کی سعادت حاصل ہوئی، پہلے لقمے کے بعد گویا ہوئے۔'' بالی یا تو امروہے میں اماں نے ایسا قیمہ پکایا تھا یا آج تمھارے ہاتھ کا ایسا لذیذ قیمہ کھایا ہے۔'' ہمیں اپنے تاثرات چھپانے نہیں آتے، علیم، جون کے نیند اور کھانے سے متعلق ایسے سارے فقرے اکثر مذاق میں دہرایا کرتے تھے اور ہم سمجھتے تھے کہ علیم مبالغے میں حد کر دیتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ علیم رتی بھر جھوٹ شامل نہیں کرتے تھے۔ جون صاحب کی زبان سے وہ فقرہ ادا ہوا اور ہمارے اندر سے کھلکھلاتی ہوئی ہنسی باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگی، ظہیر بھی سر نیچے کر کے مسکرانے لگے۔ ہم کسی بہانے باہر آئے اور اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ سہ پہر تک جون بھائی ہمارے گھر میں رہے۔ علیم کو نہ آنا تھا نہ آئے۔

رات کو ہمارے اور علیم کے بیچ جون صاحب ہی موضوع تھے۔ اب علیم بالکل نارمل تھے۔ ہم نے علیم سے کہا۔ ''علیم! جون صاحب سے ملاقات میں ایک بات ہم نے محسوس کی۔'' انھوں نے استفہامیہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔ ہم نے کہا۔'' اکثر مرد ملاقاتیوں کی نگاہوں سے کچھ عجیب سا تاثر ملتا ہے، جس سے شدید کوفت ہوتی ہے، مگر جون کی نگاہ بالکل شفاف تھی۔'' ہم علیم سے ہر بات کر سکتے تھے اور کر لیتے تھے۔ مگر ہماری بات سے علیم کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ بہت تیز لہجے میں بولے۔'' میں نے تم سے کب کہا ہے کہ جون نے کسی کا دوپٹا کھینچا ہے۔'' ہم نے وضاحت کی'' بھئی ہم تو اپنا تاثر بتا رہے ہیں۔ ایک عورت کا احساس۔ اس سے پہلے بیش تر ملنے والوں سے جو ملا، مگر جون صاحب کی نگاہ میں وہ گندگی نہیں تھی۔'' علیم ایک دم پُرسکون ہو گئے۔ کہنے لگے۔'' ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو۔ عشق انسان کو مہذب بناتا ہے وحشی نہیں۔ جون عاشق تو ہوتا ہے مگر اس کے مزاج میں آوارگی نہیں ہے۔'' پھر ہم نے پوچھا کہ'' آج آپ نے جون کی آمد پر اتنا ردِعمل کیوں دیا، وہ آپ کے دوست ہیں۔ آپ انھیں اس قدر یاد کرتے ہیں، ان کی پریشانیوں سے پریشان ہوتے ہیں۔

ایسا کیا ہے کہ آپ دونوں اس قدر دُور ہیں؟'' تب علیم نے وجہ بتائی، معاف کیجیے گا ناگفتہ بہ ہے اس لیے ہم دہرا نہیں سکیں گے۔ قصہ سنا کر علیم نے کہا۔ ''مجھے رنج اس بات کا ہے کہ جون نے کیسے مان لیا کہ وہ سب میں نے کیا ہوگا، وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اس نے کیسے یقین کرلیا۔'' اس کے بعد کئی بار اس 'زہریلے' واقعے کا ذکر ہوا جس نے علیم اور جون ایلیا کے بیچ ایک دراڑ ڈال دی تھی۔ علیم ہر بار اُسی کرب سے گزرتے، ایک بار ہم نے ان کی آنکھوں میں نمی بھی دیکھی۔ دوست بھی تو توقع پر پورا نہیں اُترا تھا نا۔

اس کے بعد ہوا یہ کہ جون صاحب اکثر فون کرنے لگے۔ ایک دن فون آیا ہم نے اُٹھایا۔ جون صاحب نے ہمیں بتایا۔ ''بالی میں آرہا ہوں، تم اڑد کی کھچڑی اور سرخ مرچ لہسن کی چٹنی بنالو۔'' علیم اس وقت گھر میں نہیں تھے، ہم نے کہا۔ ''جون صاحب یہ چیزیں نہیں پک سکتیں۔'' انھوں نے سنی اَن سنی کی اور اپنی گائے گئے۔ کچھ دیر بعد پھر فون آیا، انھوں نے پھر مینو بتایا، اب ہم نے بہت جتا کر اُن سے کہا۔ ''اڑد کی کھچڑی ہی پک سکتی ہے نہ چٹنی بن سکتی ہے۔'' انھوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمھیں اڑد کی کھچڑی پکانی نہیں آتی؟'' تب ہم نے بتایا کہ ہمارے یہاں کھانا علیم پکاتے ہیں اور وہ اس طرح کی چیزیں نہیں پکا سکتے، جون صاحب نے شاید ہماری بات پر یقین نہیں کیا، اور انھوں نے فرمائش پھر دہرائی، ہم نے پھر وضاحت کی تو انھوں نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کھانا علیم پکاتا ہے؟'' ہم نے تصدیق کی تو جون پھٹ پڑے۔ ''تُو نے میرے یار کو خان ساماں بنا دیا ہے۔۔ علیم پکاتا ہے۔۔۔'' ہم ہنس ہنس کر بے حال تھے۔ اس دوران علیم بھی آ گئے تھے انھوں نے ہمارے ہاتھ سے ریسیور لیا، جون صاحب کی زبانی گولہ باری جاری تھی، علیم نے رسانیت سے سمجھایا کہ تحسین کا آپریشن ہوا ہے ان کی صحت ابھی اس قابل نہیں ہے۔ ویسے بھی کبھی کبھی بیوی کو بھی آرام کرنا چاہیے۔ کچھ دیر بعد جون صاحب آ گئے، دروازے سے ہی بگڑتے ہوئے۔ ''کمال ہے بھئی علیم کھانا پکاتا ہے، جانی یہ کیا بات ہوئی، تُو شاعر ہے۔'' علیم انھیں بیڈروم میں لے گئے، ہمارے یہاں فرشی سلسلہ تھا، جون صاحب اور علیم بستر پر بیٹھ گئے اور باتوں میں مصروف ہو گئے، ہم خاطر تواضع کے اہتمام میں لگ گئے، کسی کام سے کمرے میں آئے تو علیم اپنے پورے رنگ میں تھے، اور جون صاحب سے کہہ رہے

تھے۔ ''جون تم ساری دنیا سے جھوٹ بول لو مجھ سے نہیں بول سکتے، یہ سارے مذہب اور لامذہب کے ڈھونگ رچاتے پھرو میں جانتا ہوں کہ تم شیعہ تھے، شیعہ ہو۔۔۔ اچانک جون اپنی جگہ سے اُچھلے اور علیم سے لپٹ گئے اور ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چپ چپ کر رہے تھے، علیم اور ظہیر ہنسی سے لوٹ پوٹ تھے۔ بڑی مشکل سے جون صاحب کو آرام سے بیٹھنے پر آمادہ کیا گیا، وہ سراسیمگی کے عالم میں بولے چلے جا رہے تھے، یار! صرف تُو ہی مجھے جانتا ہے، جتنا تُو مجھے جانتا ہے کوئی نہیں جانتا، بس تجھی کو معلوم ہے کہ میں اندر سے شیعہ ہوں مگر تُو اتنی زور سے کیوں کہہ رہا ہے، کسی نے سُن لیا تو؟ گئی رات تک جون صاحب اور علیم باتوں میں مصروف رہے۔ جب وہ جا رہے تھے تو علیم کو یاد آیا کہ کسی نے ان کو برانڈی پیش کی تھی، چوں کہ وہ تائب ہو چکے تھے اور ہمیں ان چیزوں کی موجودگی بھی نہیں بھاتی تھی تو علیم نے یہ کہہ کر الماری کے اُوپر ڈال دی تھی کہ کسی کو دے دیں گے۔ علیم نے برانڈی کی دونوں بوتلیں اُتاریں اور جون صاحب کو ہدیہ کیں، جون صاحب خوش ہو گئے، اپنے مخصوص انداز میں یار علیم یار جانی کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ہم نے محسوس کیا کہ جون صاحب کے آنے جانے سے علیم کا زخم اور ہرا ہو گیا ہے۔ چند ماہ بعد علیم خود سب سے روٹھ گئے اور دنیا ہی ترک کر دی۔ ان کے آخری دیدار کے بعد ہم اندر جانے کو مڑے تو جون صاحب قریب ہی کھڑے تھے، بالکل نڈھال، ہمارے قریب آئے، ہمارے سر پر ہاتھ رکھ دیا، منہ سے کچھ نہ بولے بس ہاتھ کو سوالیہ انداز سے جنبش دیتے رہے۔

2000ء میں علیم کے لکھے ہوئے مضامین اور اُن کے انٹرویو پر مشتمل کتاب شائع ہوئی۔ 'میں جو بولا' ہم اُن کی خدمت میں نذر کرنے گئے۔ بہت خوش ہوئے۔ کچھ دیر اپنی طبیعت اور تنہائی کا ذکر کرتے رہے۔ دو نوجوان اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کا تعارف کروانے لگے، پھر انھوں نے تکیے کے پاس رکھے ایک رجسٹر کو اُٹھایا اور کہنے لگے کہ ''میرا سارا کلام چوری ہو گیا ہے۔ ایسے دو رجسٹر تھے، جانے کون اُٹھا لے گیا۔'' اُس وقت ہم نے وہاں موجود نوجوانوں میں سے ایک کے چہرے کا رنگ اُڑتے دیکھا، پھر کہنے لگے۔ ''یہاں اکیلا پڑا ہوا ہوں، کوئی میرے ساتھ نہیں ہے، معلوم نہیں کون لے گیا۔''

ہم یہ سُن چکے تھے کہ جون بھائی اکثر اپنے رجسٹر چوری ہونے کا واویلا کرتے ہیں۔ عام خیال تھا کہ یہ اُن کی ڈراما بازی تھی، وہ کسی نہ کسی طور خبروں میں رہنے کے لیے اس قسم کے ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

علیم کے انتقال کے دو سال بعد ہم نے جون صاحب سے درخواست کی کہ وہ علیم کی سی ڈی کے اجرا کے پروگرام میں تشریف لائیں، انھوں نے ہامی بھر لی، اس وقت وہ علی کرار نقوی کے یہاں منتقل ہو چکے تھے۔ بچے ہم راہ تھے، ہماری بیٹی خدیجہ جو علیم کی وفات کے چار ماہ بعد پیدا ہوئی تھی گود میں تھی، جون بھائی نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور ہم سے کہا کہ بچی کو ہم اُن کی گود میں دے دیں، اس وقت وہ کسی اور عالم میں تھے، ہم نے بچی کو اُن کے قریب لٹا دیا، خدیجہ کی صورت دیکھتے ہی وہ چلانے لگے۔ ''یہ میرے یار کی آنکھیں لائی ہے، غدّار کی آنکھیں لائی ہے۔'' پھر رونے لگے۔ ''ہائے علیم ہائے علیم۔''

پروگرام میں تو وہ نہیں آئے مگر کبھی کبھی فون کرلیا کرتے تھے۔ خیر خیریت پوچھ کر فون بند کر دیتے، پھر اچانک ان کے فون تواتر سے آنے لگے جس میں ایک انوکھی فرمایش ہوتی، میری شادی کروا دو۔ ہم اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ فرمایش وہ ہر ملنے جلنے والے سے کرتے تھے، شروع شروع میں ہمیں بہت عجیب سا لگتا تھا، وہ اپنی کہے جاتے۔ ''تمھاری سہیلیاں ہوں گی نا، کسی سے میری کروا دو۔'' پھر مطلوبہ دلہن کی خصوصیات بھی بیان کرتے کہ نیلم پری نہیں چاہیے بس فلاں سے خوب صورت ہو۔ ہم حیران پریشان۔ ایسے ہی ایک دن اُن کا فون آیا وہ اپنی کہے جا رہے تھے۔ سوال بھی وہ خود پوچھتے، جواب بھی خود ہی دیتے رہتے، مثلاً تم بتاؤ تمھارے بھائی کے لیے کس عمر کی لڑکی مناسب رہے گی، شروع شروع میں پینتیس سے چالیس سال کی دلہن کی فرمایش تھی پھر ہوتے ہوتے ستائیس اٹھائیس سال کی دلہن کا تقاضا کرنے لگے۔ ہمیں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید وہ ہم سے اس لیے بات کرتے ہیں کہ ہماری اور علیم کی عمروں میں 27 سال کا تفاوت تھا، لہٰذا ہم ان کے لیے بھی کوئی ایسی ہی لڑکی تلاش کر لیں گے۔ اس وقت ہم نے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا کہ ''جون بھائی اگر آپ کے ذہن میں ہماری اور علیم کی شادی ہے تو ہم واضح کر دیں کہ یہ شادی ہمارے ابا نے نہیں کی تھی، علیم ہماری پسند تھے۔ کوئی باپ اپنی بیس پچیس

سال کی بیٹی کی شادی آپ سے نہیں کرے گا،الاّ یہ کہ کوئی آپ میں مبتلا ہوجائے۔'' سنتے رہے چپ ہو رہے، کچھ دن فون نہیں آیا۔ ایک دن پھر انھوں نے فون کیا اور پھر وہی فرمایش، اس بار انھوں نے ایک لالچ بھی دی کہ'' دیکھو بٹیا میرے پاس گارڈن ایسٹ والے مکان سے جو پیسے ملے ہیں،موجود ہیں۔ 56 لاکھ ہیں، جوائنٹ اکاؤنٹ میں رکھوادوں گا،اس کو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔'' یہ باتیں وہ روز ہی کرتے تھے۔مگر حفظ مراتب کا بھی وہ بہت خیال رکھتے تھے۔ہم سے ہمیشہ احترام سے بات کرتے تھے۔اُن کی زبان سے ہم نے کبھی کوئی قابلِ گرفت جملہ نہیں سنا۔ہمیشہ بٹیا کہہ کر مخاطب کرتے۔اپنی شادی کے بارے میں بھی بات کرتے ہوئے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو نا گوار گزرے۔وہ ہم سے بات کرتے ہوئے کبھی اخلاقیات کے دائرے سے باہر نہیں گئے۔رفتہ رفتہ اُن کے لہجے میں ایک گھریلو قسم کی بے تکلفی آ گئی تھی جیسے بہنوں بیٹیوں سے ہوتی ہے۔ایک آدھ بار بھِنّو کہہ کر بھی بات کی۔جون بھائی سے بات کرتے ہوئے اپنی تہذیب کا لطف آتا تھا۔

ایک بار فون آیا تو صاف سلجھی ہوئی آواز میں بات کررہے تھے۔اُس دن انھوں نے انکشاف کیا کہ اُن کی تحویل میں علیم کی پہلی شادی کا طلاق نامہ ہے۔صفیہ حیدر سے علیم کے نکاح کے بارے میں بہت سی کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم نے حیرت سے پوچھا۔ ''طلاق نامہ!جون بھائی لوگ تو کہتے ہیں نکاح ہوا ہی نہیں تھا تو پھر طلاق چہ معنی؟''

جون بولے۔'' بی بی جہلا کی باتوں پر کیوں یقین کرتی ہو۔علیم کے مخالفین اور حاسدین کی جہالت ہے، انھیں خود بھی نکاح کی حقیقت کا علم نہیں اس لیے اُس پر کیچڑ اُچھالتے ہیں۔ ۔نکاح گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کا نام ہے۔ یہ شرط پوری ہوئی تھی۔بات یہ تھی کہ ہم سب دوست اس شادی کے خلاف تھے،علیم کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔چوں کہ ہم دوستوں نے اُس کا ساتھ نہیں دیا تھا اُس نے اس طرح نکاح کرلیا جو شرعاً درست تھا۔احمد ہمدانی اور اطہر نفیس وہاں موجود تھے،نکاح اُن دونوں کی موجودگی میں ہوا تھا، بالکل درست اور شرع کے مطابق۔ یہ سب بکواس باتیں ہیں۔مگر بعد میں وہی ہوا جس کا ڈر تھا، دونوں میں نہیں بنی اور علیم نے صفیہ حیدر کو باقاعدہ طلاق دے دی۔ وہ ڈاکیومنٹ میرے پاس رکھا ہے۔'' ہم تعجب سے سب سنتے رہے۔علیم کا وہ تعلق

سن 1969ء یا 1970ء میں ختم ہوا تھا۔ یہ گفت گو 2002ء کے وسط میں ہوئی تھی۔ گویا وہ جون ایلیا جو اپنے لا اُبالی پن کے لیے شہرت رکھتا ہے، جو رشتوں میں کم زور سمجھا جاتا ہے، وہ اپنے دوست کی زندگی کے ایک اہم موڑ کا ثبوت پوری ذمے داری کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے۔ تین دہائیوں تک سینت سینت کر رکھتا ہے۔ اور ایسے عالم میں کہ دونوں بہ ظاہر ایک دوسرے سے دُور ہو چکے تھے۔ خدا جانے اِس جون ایلیا کو کوئی جانتا ہے یا نہیں۔ سنجیدہ، ذمے دار اور دوستی کے جذبے سے مملو جون ایلیا کو۔۔۔۔

ہم نے پوچھا۔ ''تو کیا ہم وہ آپ سے لے لیں؟''

کہنے لگے۔ ''ہاں اسی لیے تو تمھیں بتا رہا ہوں، تم علیم کی سچی وارث ہو، کسی وقت نکالوں گا، پھر تم مجھ سے لے جانا۔''

مگر یہ ہو نہ سکا۔ آج کل میں جون صاحب کی سناؤنی آ گئی۔ ہمارے ذہن میں بھی وہ بات نہ رہی۔

جون بھائی کی وفات کے کچھ عرصے بعد ایک دن علی کرار نقوی کا فون آیا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ انھیں جون بھائی کے سامان میں علیم اور صفیہ حیدر کا طلاق نامہ ملا ہے۔ ہم نے اُن سے بتایا کہ جون بھائی نے ہمیں بتایا تھا، مگر ہم اُسے لینے نہیں آ سکے تھے۔ اب ہم کوئی وقت طے کر کے آ جائیں گے اور آپ سے لے لیں گے۔ جواباً موصوف نے اُس کے عوض ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ ہم ششدر رہ گئے۔ ہم نے اُن سے کہا کہ وہ تو ہمارے گھر کی چیز ہے آپ اس کی قیمت کیوں مانگ رہے ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ اب تو ان کے پاس ہے اور ہمیں چاہیے ہو تو رقم ادا کر کے لے جائیں۔ ہم اُس طلاق نامے کے لیے اتنی بڑی رقم کہاں سے لاتے، اتنے پیسے ہمارے پاس ہوتے تو ہم اپنے بچوں کے مستقبل پر خرچ کرتے۔ ہم نے علامہ موصوف سے کہا کہ ''کرار صاحب وہ طلاق علیم نے ہمیں تو دی نہیں تھی، لہٰذا ہمارے کس کام کا وہ طلاق نامہ، آپ ہی رکھ لیجیے۔''

جون صاحب سے ہمارا کوئی خون کا رشتہ تھا نہ ہی ہماری اُن سے قریبی دوستی تھی۔ جانے کب وہ جون صاحب سے جون بھائی بن گئے اور ہمارے خاندان کے فرد ہو گئے۔ علیم انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ علیم کہتے تھے۔ ''اگر آپ کسی شخص کا مسلسل ذکر کریں تو یہ

اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ شخص آپ کے لیے بہت اہم ہے۔'' اور جون کا ذکر علیم روز ہی کرتے تھے۔ جون کے فقرے، اُن کی باتیں، کبھی رنجشوں کا ذکر تو کبھی معاصرانہ چشمک کا اظہار۔ اور جون کے مصائب کا بیان تو اکثر ہوا کرتا تھا۔ گویا علیم کے اپنے فلسفے کے مطابق جون علیم کے لیے بہت اہم تھے۔ ایک بار پھر جون در بدر ہونے کو تھے اور علیم ایک تکلیف کے عالم میں تھے۔ ہم نے علیم سے کہا۔'' آپ انھیں گھر لے آیئے، ہم اُن کا خیال رکھ لیں گے، ہم سے یہ بے اوقاتی نہیں دیکھی جاتی۔'' علیم نے نفی میں گردن ہلائی۔ ہم نے پوچھا۔ ''کیوں؟ ہم اُن کی دیکھ بھال کریں گے نا۔'' علیم نے صاف انکار کر دیا کہ'' یہ نہیں ہوسکتا، میں انھیں یہاں نہیں لاسکتا۔'' ہم پر جون صاحب کی بے چارگی کا بہت اثر تھا سو ہم نے علیم سے ضد کی۔ علیم نے یہ کہہ کر قطعی انکار کر دیا۔'' تم جون کو نہیں جانتیں، انھیں تم نہیں سنبھال سکو گی۔ دو شیر خوار بچوں کے ساتھ اُن کے معاملات سنبھالنا تمھارے لیے ممکن نہیں ہیں۔ میں کچھ اور سوچتا ہوں۔'' آج ہم سوچتے ہیں واقعی جو کچھ علیم نے سہا تھا، اُس تناظر میں اُن کے لیے جون کو اپنے گھر لانا ممکن نہیں ہوگا ورنہ جس گھر میں اتنے 'غیر' رہتے تھے وہاں اُن کے 'یار' کا رہنا کیا مشکل ہوتا۔

جون ایلیا نہ بے اولاد تھے نہ دنیا میں یک وتنہا، ایک بھرا پرا کنبہ رکھتے تھے۔ اُن کے بیسیوں رشتے دار موجود تھے، پھر بھی جون کا کوئی گھر نہیں تھا، کوئی ٹھور ٹھکانا نہ تھا۔ اُن کی درگت کسی خاندان کی عزت کے لیے تازیانہ نہ بنی، کسی عزیز کے دل میں اُن کے لیے محبت نہ جاگی، ایک بڑے خاندان کا فرد، ایک مشہور شاعر، دو مشہور بھائیوں کا چھوٹا بھائی در بہ در بھٹک رہا تھا، کسی عزیز کے گھر کا دروازہ اُس کے لیے نہ کھلا۔ 'یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا' انھیں یکے بعد دیگرے سنبھالا تو اُن کے نوجوان مداحوں نے، جو بہ صد شوق انھیں اپنے گھر لے جاتے اور اُن کی دل جوئی کرتے۔ ان کے زخموں پر اپنی محبت کے مرہم لگاتے۔ انھیں ان کے مقام و مرتبے کے مطابق عزت دیتے۔ یہی لوگ اُن کے حقیقی وارث ہیں۔ آج اگر جون زندہ ہیں تو انھی کی بہ دولت، ورنہ جس امروہے کی یاد میں جون بھائی تڑپتے تھے، وہاں آم بھی ہوں گے اور عالم بھی، مگر محبت اور تعلق کی تہذیب سے عاری۔ اگر جون اتنے ہی بُرے تھے تو وہ کسی کے چچا جون بھی نہیں تھے، سوشل میڈیا کی ایک وڈیو کے مطابق اُن کی

اولاد بھی اُن کے وجود سے انکاری تھی۔ راندۂ درگاہ جون سے اب کا ہے کا رشتہ۔ ان کے وجود سے، اُن سے ہر تعلق سے انکار کرنے والوں کا، انھیں بے یار و مددگار چھوڑنے والوں کا اُن کی موت کے بعد اُن پر کیسے حق ہوگیا۔ نفرت کی بھی کوئی تہذیب ہوتی ہے، ترکِ تعلق کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔

جون بھائی کی اپنی بے اعتدالیاں بھی اُن کے انجام کی ذمے دار ہوں گی مگر کیسے بھی ہوں اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ اُن کے خاندان میں ایک سے ایک نامی پڑا ہے۔ دوستیاں ایسی کہ اپنے چار دوستوں کو 'محرم' قرار دے ڈالا۔ کسی کے پاس دھن دولت کی بھی کوئی کمی نہیں مگر جون ایلیا کے لیے کسی کے دل میں جگہ تھی نہ گھر میں۔ ایسی بے چارگی میں مرنے والا 'بعد از مرگ' جس طرح پوجا جانے لگا تو سارے رشتے زندہ ہو گئے۔ اب کس کام کے یہ رشتے، تاریخ اپنا کام کر چکی ہے۔ اُس کے ورق جون کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے اندر سمو چکے ہیں۔ آج کا جون ایلیا صرف اپنے بل پر زندہ ہے، اُس کا کلام جوق در جوق پڑھا جا رہا ہے، ایک ہجوم ہے کہ جو اُس کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہے۔ اُس کے دھتکارے ہوئے وجود کو یہ روشنی اُس کے ایک بے لوث مدّاح نے دی ہے۔ جون کو آبِ حیات پلانے والے خالد احمد انصاری! تم جیتے رہو۔ جون کا وجدان تمھیں پہلی ملاقات میں ہی پہچان گیا تھا۔ اُس مہاجر کے تم تاعمر میزبان بن گئے۔ جون کو حیاتِ نو بخشنے والے تمھارا بہت شکریہ۔

انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ایک دن جون بھائی کا فون آیا، بہت خوش ہو کر بتا رہے تھے۔ "میرا دوسرا مجموعہ آ رہا ہے۔ 'یعنی' لاہور سے چھپ رہا ہے۔ الحمد ہے وہاں کا ایک پبلشر۔ وہ چھاپ رہا ہے۔" ہم نے مبارک باد دی۔

ذرا توقف کے بعد اُس دن انھوں نے اپنی زندگی کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی آواز گلوگیر ہوتی جا رہی تھی۔ دورانِ گفت گو اُن کے اور علیم کے درمیان رنجش کا بھی ذکر آ گیا، وہ اشاروں میں اس موضوع پر بات کر رہے تھے، علیم کی تکلیف تو ہم سے آج بائیس سال بعد بھی برداشت نہیں ہوتی، اُس وقت تو۔۔۔۔ ہم نے کہہ دیا۔ "جون صاحب آپ نے بہت زیادتی کی تھی، اس واقعے سے علیم کا کوئی تعلق

نہیں تھا۔'' جون صاحب چند لمحے بالکل خاموش رہے۔ پھر انھوں نے کہا۔ ''ہاں بٹیا! مجھے معلوم ہو گیا تھا، مجھے بھی دھوکا دیا گیا تھا، مجھے بہکایا گیا، مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں نے اُس پر یقین کر لیا۔ خدا جانے کیا سزا ملے، علیم معصوم تھا۔ اب میں اُس سے کیسے معافی مانگوں؟'' پھر بہت دکھ سے بولے۔ ''تحسین فاطمہ! میں بہت بدقسمت ہوں، مجھے کبھی محبت نہیں ملی، علیم خوش قسمت تھا، عمر کے آخری حصے میں سہی تم جیسی لڑکی اس کو ملی، مجھے کبھی محبت نہیں ملی۔'' وہ پھر رونے لگے۔

علیم اور جون ایلیا عجیب دوست تھے۔ ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے، مگر زندگی بھر ایک دوسرے سے روٹھے رہے، ایک دوسرے کے لیے تڑپتے رہے۔ جون نے کہا۔

ہوئی ہے شام کہیں سے علیم کو لاؤ
وہ ایک شخص جو کم بخت یارِ یاراں ہے

اور علیم جون کے فراق کا مرثیہ لکھتے رہے

یار ہمارا ایلیا، ہم سے اُٹھا لیا گیا
بیٹھے اب اپنی ذات میں ایلیا ایلیا کرو

شیرازہ بکھر گیا

سیّدہ شاہِ زناں نجفی

جون کو امروہہ سے جو تعلق اور محبت تھی اس کا بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہیں ہوگا، اس لیے کہ جون امروہہ اور ہندوستان کی یاد ہی میں گھل گھل کر ختم ہوا۔ اسے اپنا خاندان، اپنا وطن، اپنے عزیز، یہاں کے رسم ورواج، یہاں کے کھانے پینے سے عشق تھا اور کراچی جانے کے بعد وہ ان سب کی یاد میں اتنا بے تاب رہا کہ بیان سے باہر ہے۔ ہمارے چار بھائی تھے اور میں ان بھائیوں کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ بہن کو تو بھائیوں سے محبت ہوتی ہی ہے لیکن ہم دونوں کے درمیان بہت قربت تھی۔

جون کو بچپن میں اسکول جانے کا شوق نہیں تھا اور وہ اسکول جانے سے گھبراتا تھا۔ ہماری اماں کا ارمان تھا کہ جون اعلیٰ تعلیم حاصل کرے، خاص طور پر اماں انگریزی تعلیم کی بہت شوقین تھیں مگر جون کا دل ادھر نہیں لگتا تھا اور صبح کو اس کے اُٹھنے میں ایک ہنگامہ ہوتا تھا۔ ہمارے ایک عزیز اور اس کے دوست بھائی لڈن اسے لینے آیا کرتے تھے لیکن جون اسکول جانے میں ٹال مٹول کرتا تھا۔ اس پر اماں کافی غصہ کرتی تھیں لیکن بابا ہمیشہ کہتے تھے کہ دیکھنا جون بہت پڑھے گا، بہت قابل بنے گا۔

جون کو امروہہ کے ہمارے زمانے کے کھیل بہت پسند تھے۔ مثلاً اتی بتی تلیلیو کا شوق تھا، گلی ڈنڈے کا شوق تھا۔ درگاہِ شاہ ولایت میں شام کو جانے اور وہاں کھیلنے کا اس کا خاص طریقہ تھا، وہ شام کو درگاہ کو نکل جاتا تھا۔ یہ تمام باتیں اماں کو بہت پریشان کرتی تھیں کہ میرا یہ بچہ بہت نالائق ہے۔ ان کے علاوہ بڑے بھائی اور منجھلے بھائی سب کو پڑھنے کا

شوق تھا۔ ان سب بھائیوں کی اس کے بارے میں متفقہ رائے تھی کہ جون پڑھنے کے معاملے میں بہت ہی نالائق ہے لیکن اس کے بعد جون نے پڑھنا شروع کیا تو امی یہ کہنے لگیں کہ 'جون بلّلہ اب کتاب چھوڑ دے، اب پڑھ مت تیری صحت خراب ہو جائے گی' لیکن جون راتوں کو پڑھتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ بڑے بھائی (رئیس امروہوی) جب جون تقریباً ایک سال کا تھا تو اسے گود میں لے کر عید گاہ کی طرف چلے گئے وہاں جا کے بڑے بھائی شعروشاعری میں مشغول ہو گئے اور پھر جون کو وہیں چھوڑ کر آ گئے۔ اماں نے ان سے پوچھا 'ارے اچھن (رئیس امروہوی) جون کہاں ہے؟' بڑے بھائی نے چونک کر کہا 'میں تو اسے عید گاہ چھوڑ آیا۔' الغرض دوڑتے ہوئے عید گاہ پہنچے تو جون وہاں لیٹے ہوئے ہنس رہے تھے۔

جون کا کہنا تھا کہ میں زندگی بھر کبھی اتنا نہیں ہنسا تھا جتنا پیدائش کے بعد قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ یہ ہمارے گھر والوں کا بھی کہنا تھا کہ جون پیدائش کے بعد زور سے ہنسا تھا۔ مگر ان کی زندگی انتہائی اُداس اور مایوس گزری۔ اس کا سب سے بڑا غم یہ تھا کہ وہ امروہہ سے چھوٹ گیا، پورے معاشرے سے دُور ہو گیا، ان تمام چیزوں کا اثر اس کی شاعری اور صحت پر پڑا۔

ہر مرتبہ وہ جب امروہہ آتا تو اپنی سرزمین کو چومتا۔ اسے امروہہ سے عجیب طرح کی عقیدت تھی اور وہ چاہتا کہ امروہہ کی ہر جگہ اور ہر کونے پر جائے۔ وہ دن دن بھر گھومتا تھا اور میں غصہ کرتی کہ جون تُو اتنا مت گھوم، تھک جائے گا، تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن وہ نہیں مانتا اور کہتا کہ تُو میرے اُوپر اور پابندی مت لگایا کر۔ میں اپنے چار بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور اکلوتی بہن تھی۔ اسی لیے جون سے تقریباً 3 سال چھوٹی ہونے کے باوجود مجھے اس بات کے لیے نہیں ٹوکا گیا کہ میں جون سے تُو سے کیوں بولتی ہوں۔

جون کو بھی میرا 'تُو' سے بولنا بہت پسند تھا۔ اکثر جب کبھی میں اس کے ساتھ نشست میں جاتی اور اس کے تعلق سے تم کا لفظ استعمال کرتی تو وہ مجھے وہیں ڈانٹ دیتا کہ یہ غلط بات ہے تم یہاں تمیز تہذیب مت استعمال کرو۔ آج اس کی یہی سب باتیں یاد آ رہی ہیں اور بے چینی ہو رہی ہے۔

کاش کہ ہم دونوں ایک مرتبہ مل لیتے۔ میں دوحہ جا رہی ہوں، جہاں میری ایک

بچی ہے۔ پروگرام بنا تھا کہ جون دوحہ آئے گا اور ہم دونوں وہاں مل لیں گے۔

جون جب یہاں آتا تو تمام عزیزوں سے، خاندان والوں سے، میری بیٹیوں اور دامادوں سے اس طرح ملتا اور اُن کے ساتھ کھیلتا جیسے کوئی بچہ ہو۔ اس لیے کہ وہ اُداسیاں، وہ تڑپ اور وہ بے چینی جو اُسے وہاں محسوس ہوتی تھی اُس کو وہ یہاں پوری طرح بھلا کر Enjoy کرتا تھا۔ دلّی میں میری بیٹی کے گھر وہ کہتا تھا کہ میں اُس رُخ سے بیٹھنا چاہتا ہوں جدھر سے امروہہ کی ہوا آتی ہے۔ امروہہ میں گرمی میں بڑے بڑے صحن والے گھروں میں چھڑکاؤ ہوتا تھا۔ پلنگ بچھے ہوئے ہیں، مٹی کے گھڑے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ماحول جون کو پسند تھا اور وہ یہاں دلّی میں ہوتا تو یہ ماحول پیدا کرنے کے لیے شور مچاتا۔ کہتا تھا ٹیرس پر چھڑکاؤ کرو، کرسیاں ڈالو، میری کرسی کا رُخ امروہہ کی طرف کرو۔ وہ امروہہ کے تمام مناظر کو دہرانا چاہتا۔ سبزی والے، رکشے والے سب اُس کے دوست تھے۔ یہ لوگ جب جون امروہہ آتا تو اُس سے پوچھتے کہ میاں جون کیسے ہو، اتنے دن کہاں تھے؟ امروہہ کی زبان سے اُسے لگاؤ تھا اور اُسی کا استعمال چاہتا تھا۔ ہم لوگ اگر کبھی یہ کہتے کہ کھانا بنالو تو وہ ناراض ہو جاتا اور کہتا تھا کہ تم لوگ اس طرح کیوں بولنے لگے۔ کھانا بنایا نہیں جاتا، کھانا پکایا جاتا ہے۔ تم لوہار، بڑھئی کی طرح چیزیں بنانے والے نہیں ہو۔ یہ باتیں اُس وقت عجیب لگتی تھیں۔ غیر متعلق لوگ اُس کے بارے میں سوچتے تھے کہ یہ شخص پاگل ہے۔ بچے کہتے تھے کہ یہ کس طرح کے اول جلول آدمی ہیں۔ آج جون کی یہ یادیں ہیں اور میں ہوں۔ ہمارا جو بھرا پرا گھر تھا اُس کا شیرازہ بکھر گیا۔

ہستیِ ناصبور

پروفیسر سیف اللہ خالد

یہ ہستیِ ناصبور کیا ہے
میں کون ہوں یہ شعور کیا ہے

دینی تصورات سے قطع نظر، خطۂ عرب کا عہدِ جاہلیت، جسے فی الاصل عصرِ دانش کہنا زیبا ہے، صعالیک (خانماں برباد) شعرا کی نسبت سے بھی امتیازی شان رکھتا ہے۔ یہ وحشی مخلوق اپنے اپنے قبیلے سے جدا ہوکر، دشت کی پنہائیوں میں بگولوں کی ہم رقص تھی۔ یہ سراسر اپنے وجود کے دف پر، اپنی یگانۂ روزگار صفات کا نشید جاں فزا چھیڑتے اور احوالِ زمان و مکاں پر حرف گیری کر کے سرمست ہوتے۔ یہ بادیہ پیما لوگ، طشتِ صحرا پر ٹمٹماتے چراغوں کی تمثال تھے۔ نام نہاد متمدن دُنیا دیوانگانِ شوق کے دوش پر کڑی کمانِ ترازو ہوتی۔ ایک ہاتھ قبضۂ شمشیر پر جما ہوتا تو دوسرے ہاتھ کی انگلیاں ترکش کو ٹٹولتیں۔ مصلحت کوشی انھیں چھوکر بھی نہ گزری تھی۔ یہ استخوانی آزاد منش انسان اپنی انگشت نما پسلیوں کے بل، بسترِ زمیں پر اینڈتے اور ہڈیوں بھرے بازوؤں کا تکیہ بنا کر خوش وقت ہوتے۔ یہ من موجی تو تھے مگر ان میں وہ ٹچا پن قطعی نہ تھا جو ناروا وجدانی رُتوں کا عطیہ ہوتا ہے۔ اس کے علی الرغم ان کے پیکروں میں خودداری، عمیق النظری، وسعتِ قلبی، سلاستِ طبعی اور روشن فکری کا سم سم جھلملاتا تھا۔

جون ایلیا پر بھی کسی صعلوک شاعر کا گماں گزرتا ہے...... وہی شمائل، وہی خصائل! انھیں بھی اپنے وطنِ مالوف، امروہہ سے جدا ہونا پڑا۔ اس 'ہجرت' کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے انھوں نے اس حکایتی بیانیے کا سہارا لیا۔

'امروہہ، شہر تخت ہے، گزران یاں کی سخت ہے، جو چھوڑے، وہ کم بخت ہے! مجھے نہیں معلوم کہ شمالی ہند کے پہلے مثنوی نگار سیّد اسماعیل امروہوی، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، نسیم امروہوی، سیّد محمد تقی، سیّد صادقین، محمد علی صدیقی اور اقبال مہدی نے امروہہ چھوڑ کر اپنے آپ کو کم بخت محسوس کیا تھا یا نہیں مگر میں نے ...... بہ ہر حال!'

جون کے منحنی اندام میں قیامتوں کا سماں ہے۔ ذہنِ رسا، ذوقِ سلیم، حسِ لطیف اور فکرِ عمیق ایک نرالا ارژنگ! حرکات وسکنات داخل وخارج کی مربوط اکائیوں کا شیرازہ! مکالمات ...... جنونی اُڑکے کے شوخ وشنگ ترانے! شعر وانشا ...... جدلیات کا آئینہ خانہ! ہر جہت سے ایک ہی آواز ...... جو کچھ بھی ہے، امکانات بھرا جہان ہی ہے، اسے جنت بناؤ کہ جہنم، اب جنگل کی جانب واپسی کے راستے گم ہو چکے ہیں۔ تب اُن کے اندر کا سیماب، اُن کے روم روم سے پھوٹ بہتا ہے اور ہم اُس جنگ گاہ میں اُترتے ہیں جہاں جون کے فکر وفن کے ثمرات پر اوس بن حجر کے ان اشعار کی چھوٹ پڑتی محسوس ہوتی ہے۔

وَحَشْوَ جَفِيرٍ من فُرُوعٍ غرائبٍ
تـنـطّـعَ فيهـا صـانـعٌ وتـنبّـلا
تـخيّـرْنَ أنـضـاءً وركّـبـنَ أنْصُلاً
كـجـمرِ الـغضـا فـي يومِ ريحٍ تزيّلا

(ترکش میں ایسے تیر بھرے ہیں جن کو تیر ساز نے نہایت عمدہ بنایا ہے۔ چھانٹے ہوئے پتلے پتلے تیروں پر ایسے پھل لگائے گئے ہیں جو تیز ہوا میں انگاروں کے مانند بھڑکتے ہیں)

جس طرح 'ہیر، رانجھا رانجھا کردی کردی آپے رانجھا ہوئی' تھی، جون ایلیا اور شاعری بھی یک جان و دو قالب ہیں۔ فلسفہ ومنطق میں اس تیغِ بے نیام کو صیقل کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ گفت گو ہو کہ نظمی ونثری تحریر، قضایا میں، جزوی وکلی کا توازن، حکمت کے جلو میں اُمڈتا اور دماغوں کو مالا مال کرتا چلا جاتا ہے۔ بصیرت افروزی کی یہ روایت جون کا خاندانی ورثہ ہے۔ ان کے والد سیّد شفیق حسن ایلیا فارسی، عربی، عبرانی، سنسکرت اور انگریزی کے عالم تھے۔ بیسویں صدی کے فلسفی برٹنڈ رسل اور جنوبی ایشیا کی رصد گاہ کے

ڈائریکٹر زسیان سے ان کی خط کتابت تھی۔ گھر میں ہر ساعت بروجِ آسمانی اور گردشِ سیارگان پہ بحث ہوتی۔ منجھلے بھائی سیّد محمد تقی بین الاقوامی فلسفہ کانگریس کے رکن تھے۔ خود جون ایلیا نے اکیس برس کی عمر میں عربی و یونانی فلسفیانہ افکار کے تناظر میں 'سابقات' کے نام سے کتاب لکھی۔ نیز چوتھی صدی ہجری کے زیرِ زمیں فلاسفہ کے باون شہرہ آفاق رسائل 'اخوان الصفا' کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا اور کئی رسائل کا ترجمہ بھی کیا۔

حالی نے کہا تھا...... 'فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص!' مگر یہاں تو...... ایں خانہ ہمہ آفتاب است!' کا سماں ہے۔ اپنے خردمند اور خرد افروز گھرانے کی بلند مقامی کے متعلق جون کہتے ہیں۔

'وہ ایک مشرق رویہ مکان تھا۔ اس کا طرہ دالان، آخرِ شب سے آفتاب کا مراقبہ کیا کرتا تھا۔ اس مکان میں رات دن روشنیٔ طبع اور روشنائی کی روشنی پھیلتی رہتی تھی۔'

جون کی خوش بختی تھی کہ انھوں نے ایسی ضوبار فضا میں بلوغت کی منزلیں طے کیں اور مجسمِ فلسفہ و شعر بن کر ظہور کیا، اقبال نے کہا تھا۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رُو بہ رُو

مگر جون نے حرف و لفظ کوندا کا قالب اس اسلوب سے پہنایا کہ شعور و لاشعور کے آفاق جگمگا اُٹھے۔

صنعت و فلسفہ و فن و تخیل کا مآل
شاید آسایشِ امروز ہے اور کچھ بھی نہیں

'نئی آگ کا عہد نامہ' 'وقت' تک کی نظمیں، اسی 'آسایشِ امروز' کا استشہاد ہیں۔ ان کی شاعری جہاں ایک خوب صورت خیالستان کے خوش نما زاویوں کا پتا دیتی ہے، وہاں ایک خلاّق قلم کار کے ذہن رسا کی گواہی بھی دیتی ہے۔

نیلگوں حزن کے اکناف میں گم ہوتے ہوئے
مہرباں یاد کے اطراف میں گم ہوتے ہوئے

بے طرف شام کے ابہام کی سرسبزی میں
جو تنفس سے خموشی کے سنا ہے میں نے
ایسا نغمہ کسی آواز کے جنگل میں نہیں

نوائے ارونی

وقت آپ ہی اپنی جاں کنی ہے
آنات کی روح کھنچ رہی ہے
یہ ہستیِ ناصبور کیا ہے
میں کون ہوں، یہ شعور کیا ہے
آنات میں بٹ کے رہ گیا ہوں
لفظوں میں سمٹ کے رہ گیا ہوں

وقت

جون ایلیا، اپنے اسمِ معرفہ سے، حرفِ منتہی تک، روکرٹ کا بروزی استعارہ ہیں۔ ان کا ہر آدرش، ایک مصرعۂ دل نواز ہوتا ہے تو ہر شعر ایک مکمل خیال۔ مگر انھوں نے 'شاید' کے ابتدائی اوراق پر اپنے والد کا ہجو لکھتے ہوئے اپنی جبلّی جسارت کا علم بلند کیا ہے۔

'جس بیٹے کو اُس کے انتہائی خیال پسند اور مثالیہ پرست باپ نے عملی زندگی گزارنے کا کوئی طریقہ نہ سکھایا ہو بل کہ یہ تلقین کی ہو کہ علم سب سے بڑی فضیلت ہے اور کتابیں سب سے بڑی دولت تو وہ رایگاں نہ جاتا تو اور کیا ہوتا!'

زبان و ذہن کا بخیہ، زدہ زدہ جامہ
پھٹی ہوئی ہے دلائی، بنے ہیں علامہ
وہ مسئلے ہیں کہ مفہومِ زندگی گم ہے
ہے کس کو فہم کا یارا جنابِ فہامہ

ان نثری و شعری کاوشوں کے مطالعے سے یہ استفہامیہ، ادراک کے در پر دستک دیتا ہے کہ جس شخص کے زائچۂ مزاج کو اُس کے خاندان کے آفتابی و مہتابی پس منظر نے رنگا رنگ چھب عطا کی ہو، انسانیت کے مالہ و ماعلیہ سے آگہی' اُس کا وظیفۂ حیات ہو اور ذاتی و صفاتی

حوالے سے اُسے بحرالعلوم کہنا قرینِ انصاف ہو، وہ رایگاں کیوں کر ہوا؟ پھر اس شعری المیے کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟

ان کتابوں نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر
ان میں اک رمز ہے، جس رمز کا مارا ہوا ذہن
مژدۂ عشرتِ انجام نہیں پاسکتا
زندگی میں کبھی آرام نہیں پاسکتا

اس نوحے میں جون نے اپنی اس انا کا کرب سمویا ہے جو پیش پا افتادہ 'معارف' کی صیدگاہ میں محصور، دیوارِ وجود کی دوسری جانب، جہانِ زندہ کو دیکھنے سے محروم رہی۔ اُس کا سفر، لے دے کے ارتیابیت، لا ادریت اور زندیقیت کے سہ ابعاد اعراف کی حدوں میں تھا۔ رفتہ رفتہ اس فضا میں بھی جہنم کا سم گھل گیا اور قسطوں میں موت کا سلسلہ شروع ہوا۔ تاہم اس بحران کی بانجھ سے کشف کا ثانیہ طلوع ہوا اور جون نے ققنس کا ساحر بہ تراش کر اپنی ہی آگ سے نشاۃ کا اعجاز دکھایا۔ اس آتشیں رونمائی کا ثمر اُن کے اپنے الفاظ میں۔

'1986ء کا ذکر ہے، میری حالت گزشتہ دس برس سے سخت ابتر تھی۔ میں ایک نیم تاریک کمرے کے اندر ایک گوشے میں سہا بیٹھا رہتا تھا، مجھے روشنی سے، آوازوں سے اور لوگوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک دن میرا عزیز بھائی سلیم جعفری مجھ سے ملنے آیا، اُس نے مجھ سے کہا کہ جون بھائی میں آپ کو فرار اور گریز کی زندگی نہیں گزارنے دوں گا۔ میں نے کہا کہ تجھے معلوم ہے کہ میں سال ہا سال سے کس عذاب میں مبتلا ہوں، میرا دماغ دماغ نہیں، بھوبل ہے، آنکھیں ہیں کہ زخموں کی طرح تپکتی ہیں اگر پڑھنے یا لکھنے کے لیے کاغذ پر چند ثانیوں کے لیے بھی نظر جماتا ہوں تو ایسی حالت گزرتی ہے جیسے مجھے آشوبِ چشم کی شکایت ہو اور ماہِ تموز میں جہنم کے اندر جہنم پڑھنا پڑ رہا ہو۔ سلیم نے کہا کہ میں آپ کو دبئی اور امارات کے دوسرے مشاعروں میں مدعو کرنے آیا ہوں تاکہ آپ مجمع میں واپس آجائیں۔ اس طرح دبئی میں میرا ظہورِ ثانی ہوا۔'

جون کا ظہورِ ثانی جہاں ادبی دُنیا کے لیے نیک فال بنا، وہاں اُس تفاخر کا موجب بھی ہوا جو اُن کے نصابِ جاں سے پھوٹا، تب ایسا لگا جیسے اس سیل میں سب کچھ بہتا جارہا

ہے حتیٰ کہ وہ خود بھی:

- میں غالب کو بڑا شاعر نہیں تسلیم کرتا۔
- میں اس دور کے کسی بھی شاعر کو پسند نہیں کرتا اور ان شعرا میں میں خود بھی شامل ہوں۔
- میں سرکاری ذرائع ابلاغ کو انتہائی حقیر سمجھتا ہوں۔
- میں ان باتوں (نثری نظم اور آزاد غزل) کو فحاشی سمجھتا ہوں۔

روزنامہ صداقت لاہور: یکم نومبر 1996ء

جون ایلیا کے وجود میں تفلسف، کلامیت اور شعریت کے تند و تیز دھارے رواں ہیں جن کا سلسلہ 'شاید' سے سسپنس ڈائجسٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ ان جیسا اکل کھرا ابھی وقت نے کاہے کو دیکھا ہوگا، یہ وصف اُن کے اندر کی یگانہ شخصیت کا پرتو ہے، جس آدمی کی انگلیوں کی پوروں تک مابعد الطبعیات اور الہیات، مبادیاتِ حکمت کے طور پر رقص کناں ہو، جو صفحۂ قرطاس کو طبعیات و فلکیات کے پیچ در پیچ مسائل سے رصد گاہ بنا دے، جو لمحۂ موجود میں، تاریخ کے پر ہول نظاروں کی باز دید کا ملکہ رکھتا ہو، پھر بھی اُس کا استعجاب و استفہام، گمان و یقین کی ثنویت سے مملو ہو، اُس کے دانش ور ہونے سے کسے کلام ہو سکتا ہے؟

'ارتیابیت، میرے نزدیک، ہرگز کوئی خوش آئند کیفیت نہیں تھی، لیکن والٹیر کے قول کے مطابق 'یقین' انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ پھر بھی مجھے اپنی بے آرامی کی حالت میں 'مضحکہ خیز یقین' کی اکسیر استعمال کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر صورتِ واقعہ یہ تھی کہ یہ اکسیر فلسفے کے پنساریوں کے ہاں ملتی تھی اور میں ایک بلدیاتی قسم کی شے کے لیے، دکان دکان جا کر اپنی حیثیتِ عرفی زائل کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔'

مگر ان کی حیثیتِ عرفی فلسفہ و منطق کے دیارِ کہن کے آثار سے دُور، فن کی دنیا میں درخشاں ہوئی۔ تشکک سے معموران کی 'ندرتِ بیان' محض چونکانے کا پیرایہ نہیں، بہت کچھ سوچنے اور کچھ نہ کچھ کہنے کا وتیرہ ہے۔ ابلاغ کی خاطر ایک طبقے کا چند طبقات کے مسلمات کی نفی کرنا، معقول رویہ ہوتا ہے اور آدمی کو علم و فن کے شرف کی پاس بانی کی خاطر یہی رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ جون کی جدّت طرازی کے عقب میں تفکر کی جو ہما ہمی محسوس ہوتی ہے، وہ اُن کی فطرت کا نسبی خاصہ ہے۔ اُنھوں نے ہمیشہ عوامی فتح مندی اور لاطبقاتی سماج کے

خواب دیکھے اور دکھائے۔ اُن کے بھائی رئیس امروہوی اور سیّد محمد تقی وطن پرست کمیونسٹ اور سیّد محمد عباس، سرکاری عمارتوں کو اُڑانے کے لیے بم سازی کی تراکیب سوچتے رہتے۔ یہ فکری و عملی روایت جون ایلیا تک پہنچی اور انھوں نے انھی انقلابی خطوط پر، اپنی زندگی کا نگارخانہ استوار کیا۔ اپنی خیالی محبوبہ صوفیہ کے نام خط لکھتے ہوئے، انھوں نے جون کے ساتھ 'فوضوی' (Anarchist) کا لاحقہ استعمال کیا۔ ان کے نقطہ ہائے نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے تاہم چند لمحے ان کے 'خرابات' صرف کر لیے جائیں تو کیا حرج ہے۔

- میں ایک شاعر کی حیثیت سے عقیدوں کی مجموعیت کو رَد کرتا ہوں۔
- میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ شرفائے تاریخ میں سے کوئی ہستی سرمایہ دارانہ نظام کی تائید کرے گی۔ اگر عیسیٰ موجود ہوتے تو کیا وہ سرمایہ دارانہ نظام برداشت کر سکتے تھے؟ کیا آنحضرت ﷺ اور اُن کے برگزیدہ صحابہ کسی سرمایہ دار معاشرے میں ایک پل بھی سانس لینا پسند کر سکتے تھے؟ اشتراکی معاشرہ، شرفائے تاریخ کا خواب رہا ہے۔
- اگر پاکستان اسلام کے لیے بنا ہوتا تو کم سے کم کمیونسٹ پارٹی مطالبۂ پاکستان کی تائید نہیں کرسکتی تھی۔ یہاں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ کہ اگر پاکستان اسلام کے لیے بنا ہوتا تو یہ ایک مذہبی معاملہ ہوتا لہٰذا مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت مذہبی علما کو حاصل ہوتی، جناح صاحب کے بجائے قائدِاعظم کا خطاب کسی قبلہ و کعبہ یا کسی حضرت مولانا کو دیا ہوتا۔
- کراچی یا بمبئی اپنی تعمیر و مزاج کے اعتبار سے کوئی تاریخی اور تہذیبی اہمیت نہیں رکھتے۔ تاریخی اور تہذیبی شہر کون سے ہیں؟ وہ شہر ہیں لاہور، لکھنؤ، دہلی، آگرہ، ٹھٹھہ اور پشاور۔ نیا آگرہ، نیا ملتان اور نیا پشاور میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ان شہروں کے نئے حصے ہی پسند کرنا ہیں تو پھر نیو یارک، لاس اینجلس اور کوپن ہیگن کو کیوں نہ پسند کیا جائے؟

عمران نقوی: حرف ملاقات: صفحہ 110

نفی پسند (Nihilist) آدمی کی انائے مضطرب کا شاخسانہ، عدم مطابق ہوتا ہے۔

عینیت زدہ، سراپا نقیض جون کی ازدواجی زندگی کی تلخیاں، اسی اضطرار کا ثمرہ ہیں۔
ڈاکٹر آغا سہیل، جون اور زاہدہ حنا کی علیحدگی کا ذمے دار جون کو ٹھیراتے ہیں کہ ان کی بے پروائی اور بادہ نوشی کا گراف کبھی نہیں گرتا۔ ادبی لحاظ سے یہ علیحدگی بادِ سموم ٹھیری ہے۔
اس ادبی جوڑی کے اجتماعی مکالمے کبھی اُن کے ربطِ باہمی کی کہانی سناتے تھے۔

زاہدہ حنا:

'جون سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جون سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میری عمر ساڑھے سولہ سال تھی۔ میں بننے کے عمل میں تھی اور چیزوں کو سمجھ رہی تھی۔ جون کی محبوب ترین شخصیات اور موضوعات میری بھی محبوب ترین شخصیات اور موضوعات تھے۔ ہمارے مشترکہ پسندیدہ سلسلوں میں توسیع ہوئی ہے۔ ذاتی اور غیر ذاتی ہر دو طرح کی گفت گو ہم پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔'

ڈاکٹر حسن رضوی۔ بالمشافہ صفحہ 177

'میں نے زاہدہ سے معقولیت اور متانت سیکھی ہے۔'
'عقیدوں کا حسن اور فن سے کوئی غیر مشروط تعلق نہیں ہوتا۔'

اس نظریے کا اعلان، جون ایلیا نے شد و مد سے کیا ہے تو پھر عقدِ ازدواج کا حسن و فن کی دُنیا سے مشروط تعلق کیوں نہ ہو؟ مگر جون کا وتیرہ تو یہ رہا ہے۔
'میں نے اپنی بعض محبوبات کی پنڈلیوں پر بالوں کی جھلک دیکھی ہے اور بعض کی پنڈلیاں بالکل صاف پائی ہیں۔ بعض محبوبات کا پیالۂ ناف گہرا پایا ہے اور بعض کا اتھلا۔'

ہم کو اور تو کچھ نہیں سوجھا البتہ اس کے دل میں
سوزِ رقابت پیدا کر کے اس کی نیند اُڑائی ہے

یوں میزانِ وفا کا جھکاؤ، زاہدہ حنا کے حق میں ہوگیا۔ وہ آج بھی حدِ مصروفیات کے ساتھ ساتھ گھریلو فرائض بھی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھا رہی ہیں جب کہ دخترِ رزکار کی اداؤں پر فریفتہ جون ایلیا اس الم ناک خود کلامی میں مگن ہے۔
'میں اب بھی اپنے خوابوں کو نہیں ہارا ہوں۔ میری آنکھیں دکھتی ہیں مگر میرے

خوابوں کے خنک چشمے کی لہریں اب بھی میری پلکوں کو چھوتی ہیں۔'

زمانِ موجود میں جب ہر وجود کا نخلِ سر سبز آ کاش بیل کی غیر محسوس یرقانی یلغار کا شکار ہے، فردمند افراد گوتم بدھ کی پیروی کا جتن کرتے ہیں جو دھیان کی روشنی پا کر سماج کی جانب پلٹ آئے مگر ہمارے ممدوح جون سدھارتھ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں کہ یہ حضرت بھی فرار کا راستہ اپناتے ہوئے زندگی کی رونقوں کو تیاگ کر مہاتما بننے چل دیے تھے۔اس معکوس طرزِ عمل سے جون ایلیا گیان کی آخر کون سی منزل سر کرنا چاہتے ہیں؟

شاخِ ویراں کا مغنی

شاہانہ رئیس

اُداس اور معصوم آنکھوں والے چچا جون پر ٹوٹ کر پیار بھی آتا ہے اور ان کی کڑوی کسیلی باتوں پر غصہ بھی آتا ہے۔ ان کا مزاج کچھ اس طرح کا ہے کہ یہ طے کرنا امرِ محال ہے کہ وہ کس بات پر خفا ہونے کا جواز ڈھونڈ لیں گے یا کون سی ایسی بات ہوگی جس سے وہ خوش ہوں گے۔ وہ جو پور پور محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر اس پھوہڑپن سے کہ اپنے مخلص اور قریب ترین لوگوں کو بھی ناراض کر دیتے ہیں۔ ان کی ذات سے یہ توقع ناممکن ہے کہ ان کی زبان لوگوں کے کان میں پیار کا امرت ٹپکا سکے، خود ہی کہتے ہیں۔

ہے تقاضا مری طبیعت کا
ہر کسی کو چراغ پا کیجے

چچا جون کا تعلق انسانوں کے اس گروہ سے ہے جو وفاداری کی اس منزل پر ہوتے ہیں کہ کسی عنوان وہ ماضی سے ناتا توڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ انھیں ایسے حسّاس پودے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جسے اس کی اصل جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگا دیا جائے اور وہ پتھریلی زمین کی سختی سے گھبرا کر مرجھا جائے۔ یہی حال چچا کا ہے۔ اتنے طویل عرصے کے بعد بھی وہ بڑے بڑے دالانوں، سہ دریوں اور لق و دق آنگنوں کو بھول نہ سکے۔ آج بھی محلّہ 'لکڑہ' کے بڑے گھر کے صحن میں لگی رابیل اور زرد چنبیلی کی خوش بو ان کا حصار کیے ہوئے ہے۔ بھائی (والد صاحب رئیس امروہوی) کے ہاتھ کا لگایا ہوا انار کا درخت ان کی روح میں جھومتا رہتا ہے۔ چچا جون ان گرمیوں کی شاموں کو آج بھی رگِ جاں سے زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں جب وہ بڑی باجی (ریحانہ) اور اپو (پھوپھی نجفی) کنویں سے پانی بھر بھر

کر آنگن میں چھڑکاؤ کیا کرتے تھے یا مدھر چاندنی میں جگنو پکڑا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں 'میں وہ سوندھی خوش بو کیوں بھول جاؤں' وہ ماضی کو بھلانا گناہِ عظیم سمجھتے ہیں۔

اے وحشتو مجھے اسی وادی میں لے چلو

یہ کون لوگ ہیں یہ کہاں آ گیا ہوں میں

باجی امی بتاتی ہیں کہ 'جون تو پیدائشی عجیب و غریب ہے۔ وہ جب پیدا ہوا تو رونے کے بجائے ہنس پڑا تھا۔' ہاں یقیناً وہ ہنسے ہوں گے، چوں کہ پھر وہ کبھی سچے دل سے ہنس نہ سکے۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا انھیں یوں ہی اُجاڑ اُجاڑ اور اُداس دیکھا ہے۔ ہنستے بھی ہیں تو اُوپری دل سے، بہ قول ان کے۔

مسکراتے ضرور ہیں لیکن

زیرِ لب آہ بھرتے جاتے ہیں

بھائی (والد صاحب رئیس امروہوی) کی جب شادی ہوئی تو چچا جون تین برس کے تھے۔ دادا غنی مرحوم کے لاڈ پیار نے انھیں کافی گستاخ بنا دیا تھا۔ اماں (نرجس خاتون) بھلا کہاں بخشنے والی تھیں۔ وہ چچا جون کی زباں درازی پر مارتی تھیں تو وہ کبھی چوٹ لگنے پر نہیں روئے بل کہ احساسِ خجالت سے روتے تھے اور کہتے تھے 'مجھے آنگن میں سب کے سامنے مت مارو۔ کمرے میں لے جا کر چاہے جان نکال دو۔' چچا جون چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں اور بھائی (والد صاحب رئیس امروہوی) سے تو بہت ہی چھوٹے ہیں۔ اسی لیے ہمیشہ حجاب کی چادر حائل رہی۔ ان کے اور بھائی کے درمیان وہ بے تکلفی نہ تھی جو بھائیوں میں ہوتی ہے بل کہ باپ اور بیٹے والا احترام تھا۔ یہ نہیں کہ ان میں گفت گو نہ ہوتی ہو۔ علمی بحثیں ہوتی تھیں پھر بھی حجاب کی چادر نہ ہٹ سکی۔

بھائی بتاتے تھے کہ چچا جون کوئی ڈیڑھ برس کے ہوں گے۔ ایک دن انھیں چچا جون پر کچھ زیادہ ہی پیار آیا اور وہ انھیں گود میں لے کر عیدگاہ پہنچ گئے۔ اتنا عرض کرتی چلوں کہ 'محلّہ لکڑہ' سے نکلتے ہی کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ کچھ دور جا کر دادا جی (سیّد شرف الدین شاہ ولایت) کا مزار ہے۔ دادا جی کے مزار سے بھی بہت آگے جنگل میں عیدگاہ واقع ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ بھائی اپنی شاعرانہ دھن میں چچا جون کو گود

میں لیے ہوئے عید گاہ پہنچ گئے اور انھیں وہاں منڈیر پر بٹھا کر واپس آ گئے۔ کافی دیر بعد اماں نے بھائی سے پوچھا 'اچھن! جون کہاں ہے؟' یہ سُن کر بھائی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور یاد آیا کہ وہ تو چچا جون کو عید گاہ پر چھوڑ آئے ہیں۔ اُلٹے پاؤں بھاگے، جا کر دیکھا تو جون چچا بالکل خاموش لیٹے تھے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ کوئی جنگلی جانور نہ نکل آیا۔

باجی امی سناتی ہیں کہ ایک دفعہ چچا جون مراد آباد آئے۔ ان دنوں امی اور بھائی مراد آباد میں ہی تھے۔ ایک دن جانے کیا سوجھی شاید بھائی کو خوش کرنے کے لیے ان کی الماریوں کی صفائی کی اسکیم بنالی۔ بڑی باجی (ریحانہ) سے کہا 'آ ریحانہ بھائی کی الماریوں کی صفائی کریں۔' اور واقعی انھوں نے پوری صفائی کر دی یعنی کاپیوں کے وہ صفحے پھاڑ دیے جن پر اشعار لکھتے تھے چوں کہ لکھی ہوئی جگہ تو بے کار ہوتی ہے۔ سادے صفحے رہنے دیے تاکہ کاپی صاف ستھری رہے۔ شام کو جب بھائی گھر واپس آئے تو اپنے کارنامے کی اطلاع دی۔ امی کہتی ہیں کہ شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار بھائی ان پر ناراض ہوئے اور تھپڑ بھی مارا۔ چچا جون جن کی انا بے پناہ طاقت ور ہے وہ بھلا یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ ہزار روکنے کے باوجود وہ نہیں رکے اور امروہہ چلے گئے۔ اس واقعے کا بھائی کے دل پر بھی بہت اثر ہوا۔

خواہ یہ بات اچھی ہو یا بری مگر حقیقت یہی ہے کہ چچا جون حد درجہ حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔ اماں جیسے سنہری بال اور آنکھیں، ریحانہ باجی جیسے خوب صورت نقش و نگار، باجی امی جیسی نزاکت اور چمپئی رنگت۔ ایسی پری چہرہ لڑکی جو مسکرائے تو آسمان پر دھنک سی بکھر جائے۔ اب مشکل یہ ہے کہ ان کے دل میں بسی موہنی صورت اس دھرتی پر ملنی مشکل ہے، خود ہی کہتے ہیں۔

نہ ملے گا مثالیہ اپنا
جون اب ہار مان لی جائے

انھوں نے محبتیں بھی کیں تو اسی اکھڑ پن سے جو اُن کے مزاج کا خاصہ ہے۔ تاہم یہ ہوا کہ ہر دفعہ ان کے مزاج کے زہر نے ان کی ہر محبوبہ کو ڈسا ہے۔ جب ان کی محبت کا قصہ چلے گا تب ململ کا بڑا سا دوپٹا اوڑھنے والی شرمیلی لڑکی ضرور یاد آئے گی جسے چچا جون نے رُلا رُلا دیا۔ وہ معصوم لڑکی جو ہر لمحہ ان کا مزاج ہی دیکھا کرتی تھی۔ یہ ناراض ہو ہو

جاتے اور وہ منا منا کر نڈھال ہو جاتی۔ چچا جون کو اپنی زیادتی کا احساس تھا جب ہی تو انھوں نے کہا۔

مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی
آپ مجھ کو منا لیا کیجے

تیرا زیاں رہا ہوں میں اپنا زیاں رہوں گا میں
تلخ ہے میری زندگی تلخ زباں رہوں گا میں

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ محبت نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ وہ تو پور پور محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر اپنی تلخ زبانی سے مجبور ہیں۔ جب وہ معصوم دوشیزہ چچا جون سے بچھڑ گئی تب یہ بولائے بولائے پھرا کرتے تھے، کہتے ہیں۔

اب کوئی مجھ کو دلائے نہ محبت کا یقیں
جو مجھے بھول نہ سکتے تھے وہی بھول گئے

چچا جون کے محبت کرنے کا انداز بھی عجیب ہے۔ وہ ایک آنہ دے کر روپے کی چیز خریدنا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ خواہ کتنا بھی اکھڑ پن دکھائیں مگر محبوبہ جان سے ہار جائے، بہ قول ان کے۔

تم خون تھوکتی ہو یہ سن کر خوشی ہوئی
اس رنگ اس ادا میں بھی پر کار ہی رہو

مجھے یقین ہے کہ چچا جون کو دنیا کی کوئی خوشی، کوئی طاقت خوش نہیں رکھ سکتی۔ وہ ہر اچھی بات کا منفی پہلو نکال کر اُداس اور پریشان ہونے کا فن خوب جانتے ہیں۔ بالکل یہی عادت چھوٹی باجی (صالحہ) کی ہے۔ یہ دونوں چچا بھتیجی کسی عنوان خوش رہنے پر تیار ہی نہیں۔ خوشیوں کی پھواریں ان دونوں کو راس نہیں آتیں۔ ان دونوں چچا بھتیجی کو اُس ماحول سے وحشت ہونے لگتی ہے جہاں مسکراہٹیں ہوں۔ اب ان دونوں کو کون سمجھائے، چچا جون کہتے ہیں۔

ہم جو دنیا سے تنگ آئے ہیں
تنگ آتے چلے گئے ہوں گے

چچا جون کے ساتھ تو واقعی المیہ ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد بھائی، بڑے چچا

(سیّد محمد تقی) اور چھوٹے چچا (محمد عباس) یہ تینوں پاکستان آ گئے۔ امروہہ میں بابا (علامہ سیّد شفیق حسن)، اماں، اپو (پھوپھی نجفی) اور چچا جون رہ گئے۔ اماں تو اپنے بچھڑے بیٹوں کو یاد کر کے روتیں اور اماں کے بہتے ہوئے آنسو چچا جون کے دل پر گرتے تھے۔ الغرض اماں کا انتقال ہو گیا، اپو کی شادی ہو گئی۔ چچا جون کے ذہن میں یہ خیال جم کر رہ گیا کہ اماں کو بھائیوں کے غم نے مار دیا۔ کچھ عرصے کے بعد بابا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب چچا جون تھے اور ویران گھر کے بھائیں بھائیں کرتے سناٹے۔ وہ باؤلوں کی طرح اِدھر اُدھر مارے مارے پھرا کرتے۔ بھرا گھر کلیجا پھاڑنے کے لیے خالی ہو گیا تھا، کہتے ہیں۔

اب وہ گھر اک ویرانہ تھا بس ویرانہ زندہ تھا
سب آنکھیں دم توڑ چکی تھیں اور میں تنہا زندہ تھا

چچا جون، بابا کی وفات کے بعد کراچی آئے تب تک تنہائی اور اُداسی کا کرب ان کی روح تک کو گھائل کر چکا تھا۔ وہ بیمار تھے، احساس کی شدّت نے ان کا سینہ اور پھیپھڑے چھلنی کر دیے تھے۔ یہاں آ کر وہ جسمانی طور پر تو صحت مند ہو گئے مگر روحانی طور پر زخمی ہی رہے، بہ قول ان کے۔

اس مسلسل شبِ جدائی میں
خون تھوکا گیا ہے مہ پارہ

وہ جسمانی لحاظ سے تو ہمارے ساتھ رہے مگر اصل جون کو وہیں کہیں بڑے مکان کے آنگن میں مہکتی رابیل اور زرد چنبلی کے پاس بھٹکتا چھوڑ آئے۔ جھومتے گاتے انار کے درخت سے لپٹ کر روتا چھوڑ آئے۔ کاش چچا جون ماضی سے رشتہ توڑ سکتے۔ ان کے اندر تہہ در تہہ ماضی کی یادیں اُتر چکی ہیں پھر بھلا وہ کس طرح ناتا توڑ سکتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کاش چچا جون بھی عام لوگوں کی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے لطف اُٹھائیں مگر میری اس خواہش کے جواب میں ان کی ایک مختصر نظم سنیں۔

کس کو فرصت کہ مجھ سے بحث کرے
اور ثابت کرے کہ میرا وجود
زندگی کے لیے ضروری ہے

شاعری

شبنم رومانی

علم، شاعری کا دشمن بھی ہے اور دوست بھی۔ علم شاعری پر غالب آ جائے تو یہ شاعری کی موت ہے۔ اور شاعری علم پر حاوی آ جائے تو یہ دونوں کی زندگی ہے۔ میں نے کبھی اپنے لیے ایک رباعی کہی تھی۔ مگر یہ رباعی جون ایلیا پر بھی صادق آتی ہے۔

تعبیر طلب خواب سہانے لاکھوں
عشرت سے تہی، غم کے زمانے لاکھوں
اک پیر جواں سال کی پیشانی پر
لکھے ہیں تغیر کے فسانے لاکھوں

جون نے کم عمری میں کچھ زیادہ ہی پڑھ لیا تھا۔ تعلیم کی نوعیت کے اعتبار سے اس کو اہلِ مدرسہ میں شمار کیا جا سکتا ہے مگر وہ باغیانِ مدرسہ میں زیادہ نمایاں رہا ہے۔ جن دنوں جون ہجرت کر کے کراچی آیا اور میں نے اس کو رئیس صاحب کے دفتر 'شیراز' میں پہلی بار دیکھا تو ایک عجیب تاثر سے دوچار ہوا۔ ایسا نوخیز اور ایسی خوف ناک سوچوں میں ڈوبا ہوا! ایسا کومل، منحنی نوجوان اور سنجیدگی کا اتنا گہرا غازہ چہرے پر ملے ہوئے! تب مجھے اپنا ایک اور شعر یاد آیا۔

جو پھول کھل کے نشانِ خزاں ہوئے ہوں گے
ہماری طرح وہ شاید جواں ہوئے ہوں گے

آدمی اپنا مقدر لے کر بھی آتا ہے اور اپنا مقدر خود بناتا بھی ہے۔ سو، جون محرومیوں کے اتھاہ سمندر کا پیراک بھی تھا اور ایک پرسکون اور پر جمال جزیرے کا متلاشی اور تمنائی

بھی۔ اس نے ماہ نامہ 'انشا' جاری کیا اور اس کام میں شکیل عادل زادہ کو اپنے ساتھ لگایا۔ مگر شکیل کا اپنا مزاج تھا۔ وہ محنت اور محبت کی ایک الگ کہانی ہے۔ مگر ان دونوں نوجوانوں نے صحافت کے میدان میں اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ جون 'عالمی ڈائجسٹ' تک پہنچا تو شکیل نے 'سب رنگ' کو ایک معیار بنایا۔ مگر جون صحافی نہیں تھا۔ سوچتا ہوا وجود رکھتا تھا۔ زیادہ سوچنا بھی آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتا۔ غالباً یہی اس کے ساتھ ہوا۔ وہ تشکیک میں ایسا اُلجھا کہ اب تک اس سے جان نہیں چھڑا سکا ہے۔ تشکیک شاعر کے لیے تو رحمت ہوتی ہے مگر اپنے ساتھ آدمی کے لیے بڑے عذاب لے کر آتی ہے۔ جون کے لیے تقاضائے شباب ہی کیا کم جان لیوا تھا کہ زیانِ یقیں بھی اس پر بلائے بے درماں کی طرح آپڑا۔

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

یہ ایک شاعر کا سوال ہے اور ایک تشکک کا جواب بھی۔ مگر جواب سے پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور سوال سے پھر ایک جواب جنم لیتا ہے۔ یہ شعر نہیں کائنات کے دائروں میں سے ایک دائرہ ہے۔ بات یہ ہے کہ جون تلاشِ حقیقت کی ایک ناگزیر منزل سے گزر رہا ہے۔ تیقن کو جانے والا راستہ تشکیک سے لازماً گزرتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جون اس راستے سے گزر کر اپنی منزل تک ضرور پہنچے گا۔

میں نے جون کی زندگی کو دُور سے اور اس کی شاعری کو نسبتاً قریب سے دیکھا ہے۔ اس کا مزاج کلاسیکی، ذہن ترقی پسندانہ اور طبیعت جمال پرست ہے۔ ان تینوں نقطوں کو ملایئے تو جون کا چہرہ بنتا ہے مگر یہ فیصلہ ذرا مشکل ہے کہ وہ کلاسیکی زیادہ ہے یا ترقی پسند زیادہ ہے یا جمال پرست زیادہ ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ جنسی محرومیوں کے نیم خفتہ، نیم بیدار احساس نے اس کے دوسرے تمام حواس کو دبوچ رکھا ہے۔

محبت کچھ نہ تھی جز بدحواسی
کہ وہ بندِ قبا ہم سے کھلا ئیں

اب جون کے اسی شعر کو لیجیے۔ یہ تجربہ محض جنسی یا جمالیاتی نہیں ہے، فکری بھی ہے

مگراس نے فکروآگہی کے اس تجربے کوبندِ قبا میں کیسالپیٹ کرپیش کیا ہے۔اس آمیزش اور آویزش نے شعرکوسحر حلال بنادیا ہے۔

جون امروہے کی مٹی ہے، یعنی وہ مصحفی کا ورثہ دار ہے۔ زبان وبیان کی چمک دمک اورلب و لہجے کی تراش خراش کا سلیقہ اس کو وہیں سے ملا ہے۔ زبان شاعری کا نہیں پوری تہذیب کا سنگِ بنیاد ہوتی ہے۔ ہرزبان کا اپناایک کلچر ہوتا ہے۔'اُردو کلچر' کی اصطلاح بھی اسی حقیقت کی غماز ہے۔ جون کی شاعری اسی کلچر کی نشان دہی کرتی ہے مگر شاعری کی یہ زبان جوامروہے کے مصحفی سے چلی تو جون پرآکرزُک نہیں گئی۔ جون نے اس کومتحرک رکھا ہے۔ وہ زبان کی اہمیت سے واقف ہے اسی لیے اس کے ہاں زبان کی قوت، خیال کی ندرت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ جون نے اپنی غزلوں میں جہاں تہاں زبان و بیان کے شعری اورشعوری تجربے بھی کیے ہیں مگراس کی جوشاعری محض زبان کی قوت کے پھیر میں آگئی ہے'بردل ریزد' کی منزل تک نہیں پہنچتی ، گلے میں اٹک کے رہ جاتی ہے۔ہاں جون کا جوکلام اس Complex سے آزاد ہے وہی کلام غالب ہے اور وہی اس کا اصل سرمایہ ہے۔ یہ وہی شاعری ہے جس کواس نے'واسوخت' کہا ہے۔جس میں اس نے حقیقتوں کو محض کپڑے نہیں پہنائے اور بے حقیقت لوگوں کوکھری کھری سنائی ہیں۔مگر یہ محض جلی کٹی سنانے والی شاعری نہیں ہے بل کہ پیچیدہ ذہنی اورحسی نفسیات وتجربات کا اظہار بھی ہے۔ جون کے ہاں اگر غصے اور جھنجھلاہٹ کا عنصر زیادہ ہے تو وہ ایک فطری ردعمل ہے ان تمام منافقتوں کے خلاف جس نے پورے انسانی معاشرے کوایک انساں شکن اور یزداں شکار وحشت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جون کے کم زور اعصاب کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ چیختا ہے، چلاتا ہے، جھنجھوڑتا ہے، کچوکے لگاتا ہے اور جب یہ سب کچھ بے اثر نظر آتا ہے تو بے حسوں کی بے حسی پرلعنت بھیج کرآگے بڑھ جاتا ہے۔

یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم
پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم

مگر تنگ نائے غزل کے برعکس، نظموں میں جون کا دریائے فکر واحساس زیادہ کھل کر بہتا ہے۔ یہاں اس کا پاٹ زیادہ چوڑا ہے۔ وہ خدا سے لے کر انسان تک اور فطرت سے لے کر عورت تک سب سے کھل کر مکالمہ کرتا نظر آتا ہے۔ وہ کبھی ذات کے نہاں خانوں سے بولتا ہے تو کبھی حیات کے اونچے چبوترے پر کھڑے ہو کر آواز دیتا ہے۔ ان نظموں میں کہیں کہیں اخترؔ شیرانی اور جوشؔ کی صدائے بازگشت بھی سنائی دے جاتی ہے۔ اُردو شاعری میں عورت سے براہِ راست تخاطب کی جرأت، اس نے کیا سبھی شعرا نے اخترؔ شیرانی سے سیکھی اور زور اور بیان میں اقبال اور جوش نے پوری ادبی صدی کو متاثر کیا ہے۔ اس لیے اگر جون کے ہاں یہ اثرات ملتے ہیں تو اس میں کوئی معذرت خواہی کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے لہجے اور اسلوب کی اس شناخت تک پہنچا جائے جو اس کو اس کے تمام ہم عصروں سے الگ کرتی ہے۔ اس کی اس انفرادیت کی وجہ سے بہت سے نئے شاعروں نے نہ صرف اس کے اسلوب وادا کو اپنایا ہے بل کہ اس کے بہت سے رنگوں اور ترنگوں کو اُڑانے کی کوشش بھی کی ہے۔ نئی نسل کے سر پھرے شاعروں کو اس طرح اپنے سحر میں مبتلا کر دینا بچوں کا کھیل نہیں ہے، اس کے لیے خون تھوکنا پڑتا ہے۔

میرا جون

شفاعت نقوی

پیغاموں کے بعد اور شادی سے پہلے میں اماں مرحومہ، بابا مرحوم اور جون ایلیا سے مل چکا تھا۔ اماں کی سیدھی سادی پر خلوص محبت کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ بابا کی عظمت نے میرے دل و دماغ پر بہت گہرا نقش چھوڑا تھا۔ جون کی قابلیت، لیاقت اور زود گوئی سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ بھائی رئیس، بھائی تقی اور بھائی عباس سے نہ مل پایا تھا کیوں کہ وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ نجفی (میری بیوی) ان بھائیوں کی سب سے چھوٹی اور اکلوتی بہن ہیں۔ چوں کہ جون اور نجفی زیادہ ساتھ رہے اور تلے اُوپر کے ہیں اس لیے ان کو ایک دوسرے سے زیادہ ہی لگاؤ ہے اور کسی حد تک دوستی بھی۔ باوجود اس کے کہ نجفی جون سے چھوٹی بہن ہیں لیکن وہ بر بنائے محبت تُو تڑاق سے بولتی اور اکثر ڈانٹ دیتی ہیں۔

میری پرورش و تعلیم گونڈا میں ہوئی جہاں اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی اور خواجہ مسعود علی ذوق رہتے تھے۔ میرے والد مرحوم بہت اچھے مقرر، نقاد اور اقبالیات کے ماہر تھے۔ اکثر ہمارے گھر ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی بیٹھکیں ہوتی تھیں، اس لیے میں نے بہت قریب سے ان حضرات کو دیکھا اور سنا تھا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میں جتنا چھوٹے سے جون سے مرعوب و متاثر ہوا کسی سے نہ ہوا۔ میں نے امروہہ میں دیکھا تھا کہ جون کے شاگردوں میں بوڑھے، جوان، بچے اور لڑکیاں تھیں جن کے کلام کی اصلاح کبھی کبھی تو ایک ساتھ بٹھا کر منٹوں میں کر دیتا تھا۔ جون پیدا ہی شاعر ہوا ہے اس کی غیر معمولی ذہانت ہی تھی کہ اس نے لگ بھگ نو سال کی عمر میں یہ شعر کہہ دیا تھا۔

چاہ میں اس کی تمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

پاکستان جانے سے پہلے جو واقعات میرے سامنے پیش آئے وہ حسب ذیل ہیں۔

1- میں بہ سلسلہ سرکاری ملازمت شاہ جہاں پور میں تھا اور ایک مشاعرے کی نظامت کر رہا تھا جس میں بزرگ شاعر حضرت دل شاہ جہاں پوری، جناب اختر علی تلہری جیسے مستند شاعر اور جید عالم موجود تھے۔ میں شاعر کو مدعو کرنے کے فوراً بعد جون کو مائیک دے دیتا تھا اور یقین مانیے جون منٹوں میں شعر میں ان کا تخلص لاکر شعر کہہ دیتا تھا جو کہ بے حد پسند کیا جاتا اور اس شاعر کے لیے دشواری پیدا کر دیتا۔ مثلاً میں نے دعوتِ سخن گل چیں صاحب کو دی جو کہ اس وقت کے استادوں میں تھے اور غالباً حباب ترمذی صاحب سے سینئر تھے۔

جون نے ان کے لیے مندرجہ ذیل شعر کہہ دیا۔

یہ کیوں زرد ہوتے ہیں غنچوں کے چہرے
میں گل کا نگہبان ہوں گل چیں نہیں ہوں

2- ڈائس پر بیٹھے ہوئے چند حضرات نے اعتراض کیا کہ حباب صاحب سے پہلے آپ کو گل چیں صاحب کو نہیں بلانا چاہیے۔ میں نے معافی مانگی اور فوراً جناب حباب کو مدعو کیا۔ جون نے فوراً ہی ان کے لیے بھی اسی لمحے یہ شعر کہہ دیا۔

وہ حقیقت میں ایک دریا ہے
آپ جس کو حباب کہتے ہیں

3- ایک مشاعرے میں جون نے اپنی پسندیدہ اور مشہور و معروف نظم 'دو آوازیں' پڑھی۔ جب سامعین نے حسبِ عادت داد نہ دی تو جون کو محسوس ہو گیا کہ اکثریت کے سروں کے اُوپر سے گزر گئی ہے تو فوراً اس نے اپنے حسبِ ذیل اشعار پڑھے جو بہت پسند کیے گئے، سارا مشاعرہ اُٹھالیا اور واہ وا کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اس پر جون کو غصہ آ گیا اور یہ شعر پڑھا۔

تم مرے آسمان تک آ نہ سکے
میں تمھاری زمیں تک آیا ہوں

دھواں ہیں زلف انگارہ ہیں رخسار
ہٹالو سر کہ جل جائے گا دامن

دیر سے ایک حسین چہرے پر
ایک گستاخ لٹ ہے بل کھائے
دن کے دامن میں بسے کالی رات
جگ بھرے چاند پر جیسے سانپ لہرائے

ساری عقل و ہوش کی آسانیاں
تم نے سانچے میں جنوں کے ڈھال دیں
کر لیا تھا میں نے عہدِ ترکِ عشق
تم نے پھر باہیں گلے میں ڈال دیں

4- میری پوسٹنگ بارہ بنکی میں تھی اس لیے پاکستان سے جون وہاں آیا۔ بارہ بنکی والوں کے اصرار پر رام لعل صاحب نے وہاں جون کے اعزاز میں ایک مشاعرہ کیا جس میں خمار بارہ بنکوی، رام لعل، شمس الرحمان فاروقی، محترمہ دراب بانو وفا شریک تھیں۔ چند حضرات اور شعرا نے عقیدت و محبت میں جون کی بہت تعریف کی اور بے پناہ خلوص کا اظہار کیا۔ اس پر جون کچھ اُداس سا ہو گیا اور فوراً یہ شعر پڑھے۔

مِل کر تپاک سے نہ ہمیں کیجیے اُداس
خاطر نہ کیجیے کبھی ہم بھی یہاں کے تھے

جو تمھیں شام و سحر یاد کیا کرتے ہیں
وہ تمھیں شام و سحر یاد تو آتے ہوں گے

بہت دنوں کی بات ہے کہ عالی جناب ملا طاہر سیف الدین صاحب قبلہ امروہہ تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں ایک محفل ہوئی۔ قبلہ و کعبہ جناب مولوی عبادت صاحب

نے جون (جو کہ اس وقت بہت کم عمر تھا) سے کہا کہ تم ملا صاحب کی شان میں عربی میں ایک قصیدہ لکھو۔ جون حکم بجالایا اور جب جلسے میں پڑھا تو ملا صاحب نے فرمایا کہ لڑکا بہت ہی اچھا پڑھ رہا ہے، یہ کس نے کہا ہے۔ اس پر مولوی عبادت صاحب نے فرمایا کہ یہ اسی کا کہا ہوا ہے تو انھیں انتہائی تعجب ہوا اور بہت تعریف کی۔

میں آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پروردگارِ عالم کا انتہائی شکر و احسان ہے کہ جون جیسے حساس، تنک مزاج اور خراب صحت والے عظیم شاعر کو زاہدہ حنا جیسی چوکس، مستعد اور انتہائی لائق اور ہم مذاق شریکِ حیات ملی جس نے جون کو سمجھا، محبت کی اور خیال رکھتی ہے۔ زاہدہ، جون کی محبوبہ بھی ہے، بچوں کی ماں بھی اور اب تو جون کی ماں ہے۔ یہ جون کی بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ خدا کرے دونوں خوش رہیں اور اپنے بچوں کی بہاریں دیکھیں۔

ماجرا

شکیل عادل زادہ

جون ایلیا سرتاپا شاعر تھے۔ بچپن سے آخری سانسوں تک انھوں نے سخن کاری وقلم اندازی کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ شاید وہ کوئی کام کر بھی نہیں سکتے تھے۔ علم وحکمت، فکرودانش کے معاملات ومسائل سے وابستگی ان کے اجداد کا شعار تھی۔ عربی وفارسی، منطق وفلسفہ، مذہب وتاریخ کی تعلیم اورادب وتہذیب کی تربیت انھوں نے بہت جلد اپنی خاندانی روایت کے مطابق مکمل کرلی تھی، لیکن یہ شاعری کی شوریدہ سری تو الگ ایک خاصہ ہے۔ یہ تو بڑا اخلقی اور جبلی جوہر ہے۔ جون ایلیا گردوپیش میں بہ ظاہر بہ درجۂ تمام شامل اور نہاں خانے میں اپنی ایک کائنات تخلیق کیے ہوے تھے۔ عرصے سے ان کا گھرانا کچھ ایسا آسودہ حال نہیں رہا تھا۔ وراثتوں کی عطیہ ٹوٹی پھوٹی حویلیوں کے پاس بان اور چھوٹے بڑے قطعاتِ اراضی سے ہونے والی آمدنی پر قانع اور مطمئن، اپنے رفتگاں کی عظمت کا بھرم قائم رکھے ہوے، عزت کو امارت اور ہنرِ علم کو اثاثہ سمجھنے والے شرفا، بزعمِ خود اشرافیہ۔ کم سنی میں جون شعر کہنے لگے تھے اور ضلع مرادآباد کی تحصیل، سرزمینِ سبزہ وگل، شہرِ دل براں، مردم آمیز ومردم خیز امروہے کے اطراف میں بپا ہونے والے مشاعروں میں مطلوب ہوگئے تھے۔ اِدھر جوانی کی ابتدا ہی میں سینہ چھلنی ہو چلا تھا۔ دِق کے عارضے نے صبح وشام ویران کردیے تھے۔

پاکستان بن جانے کے بعد بھی کچھ متغیر ہوگیا۔ چند سال میں اُن کی آبائی حویلیاں مکینوں سے عاری ہونے لگیں۔ تینوں بڑے بھائی پاکستان کوچ کر گئے۔ چھوٹی بہن کے ساتھ ایک جون ہی وہاں رہ گئے تھے۔ بہن کی شادی کے بعد آخر اُنھیں بھی ہجرت زدہ

بھائیوں کے پاس پاکستان کا رُخ کرنا پڑا۔ایسی حالت میں وہ یہاں آئے تھے کہ زخمی سینے کی اندمالی کے لیے سال بھر تسلسل و تواتر سے علاج ہوتا رہا' پھر کہیں تارِ نفس استوار ہوا۔ بھائیوں نے کچھ اُن کی دِل جمعی' کچھ اُن کے اعتمادِ ذات کے لیے ایک ماہ نامے کی اشاعت کا اجازت نامہ حاصل کر کے اُن کے حوالے کر دیا۔فروری 58ء میں انشا کے نام سے اس رسالے کا اجرا ہوا۔

برادرم خالد انصاری نے اس مجموعے کے پیش لفظ میں تفصیل سے اپنے مجی کے احوالِ دروں کا احاطہ کر دیا ہے۔میری خامہ فرسائی بے جا اعادہ ہوگی۔میرا تعلق جون صاحب سے کچھ خاندانی قسم کا تھا۔ اُن کے پاکستان آنے کے ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد میں بھی یہاں آ گیا تھا اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے سب کے ساتھ رہنے لگا تھا۔جس وقت انشا کا پہلا شمارہ ترتیب کے مراحل میں تھا تو مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اداریہ کون لکھے گا۔ دونوں بڑے بھائیوں کا شمار نام ور قلم کاروں میں ہوتا تھا۔ بڑی کش مکش اور تکرارِ بسیار کے بعد فیصلہ ہوا کہ جون ہی یہ معرکہ کریں۔

میرا نہیں خیال' جون صاحب کو امروہے میں با قاعدہ نثر نگاری سے کوئی واسطہ رہا ہوگا' یا یوں کہیے کہ انھیں وقت ہی کب اور کیوں ملا ہوگا۔انشا سے پہلے اُن کی نثر نگاری کی کوئی شہادت نہیں۔خطوط کی بات دِگر ہے۔خط تو اُنھوں نے یوں بھی کثرت سے لکھے ہوں گے کہ شاعری کے ساتھ عاشقی بھی اُن کا وظیفۂ جاں تھا۔گلی کوچوں' کونے کھدروں میں کسی عشق کی جُست جو اُنھیں ہر دم مستعد و مضطرب کیے رہتی تھی۔امروہے میں لڑک پن کے دوست اُن سے سرزد ہونے والی ایک کے بعد ایک عشقیہ واردات کے گواہ ہیں۔ کسی خاص کیفیت میں کبھی وہ خود بھی یاس و حسرت سے داستانیں سناتے تھے۔اپنی محبوباؤں کے نام بدل دینے کا انھیں شوق تھا۔'ف' سے شروع ہونے والے نام جانے کیوں اُنھیں بہت مرغوب تھے۔

یہ دریچوں' جھروکوں' چلمنوں اور آنگنوں کا زمانہ تھا۔ کہتے تھے 'جانی! کیا وقت تھا۔ سال دو سال گلی کی ریاضتِ طواف کے بعد کہیں دریچوں میں آہٹ اور چلمنوں میں سرسراہٹ کی سرخوشی یا فتح نصیب ہوتی تھی۔امروہے سے یک سر مختلف یہاں' کراچی میں بھی یارانِ خلوت اُن کے متعدد 'رازہائے نیاز' سے آشنا تھے،اور کبھی معاون' کبھی شارح،

کبھی مشیر کا کام کیا کرتے تھے۔ عاشقی کی شدتوں کے موسم میں جون خوب خوب نظمیں لکھے تھے، نظمیں، غزلیں۔

ایک نازنیں، ناز آفریں کا ذکر ہے۔ پری زادوں کے قبیلے سے اُس ماہ جبیں کا تعلق تھا۔ جون کی شاعری کی دل دادہ، اور برملا اظہار میں پیش پیش۔ جون جیسے تشنہ دل، ہمہ تن آرزومند کو اشارہ غنیمت تھا۔ مستزاد اُس لالہ رُخ کی خوش نگہی و خوش سخنی۔ یہ تیور خاصے دل برانہ، دل ستانہ تھے۔ کون انھیں دل آویزی اور لطفِ خاص پر محمول نہ کرتا۔ جون کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو راتیں بے خواب کر لیتا۔

جلد ہی کچھ یوں ہوا کہ اُس نیک اختر کی بات کسی باحیثیت خاندان میں طے ہوگئی۔ اور دیکھتے دیکھتے 'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی'، پری تو سمندروں پار پرواز کر گئی۔ جون اِس تعبیر سے بہت دل گیر ہوئے حالاں کہ ایسے تجربے اُن کے لیے نئے نہیں تھے۔ ان کی تندی و تُرشی بے جواز تھی۔ بازار کے بھاؤ کا انھیں تھوڑا بہت اندازہ و احساس ہونا چاہیے تھا۔ یہاں ہر سُو پیمانے معیار ہیں۔ ترازوؤں کو اس کارِ خیالاں، کارِ سخناں سے کیا سروکار۔ کبھی سمائی ہو بھی جاتی ہے تو سب سے آخر میں......

پھر انھی دنوں ہوا یہ کہ کراچی کے ادبی رسالے میں شایع ہونے والے ایک افسانے سے منکشف ہوا کہ جون ہی نہیں، کئی اور فرہادِ نامراد بھی اُس ستم پیشہ کے مدّعی تھے۔ ادّعا کی پذیرائی سے مشروط ہوتا ہے۔ یہ تحریر افسانے کے طور پر شایع ہوئی اور سرگزشت ہی سمجھی گئی۔ دیر تک شہر میں چرچے ہوتے رہے۔ شہر تو نت نئی خبروں کی تاک میں رہتے ہیں۔ جون کی بیزاری و برہمی دیدنی تھی۔ اُنھوں نے غصہ و غم، طنز اور لعن طعن سے آلودہ نظم لکھی۔

چائے خانوں میں تمھارا ذکر ہے

چند سطریں اور یاد آ رہی ہیں۔

داستانِ شرم کی سُرخی ہو تم
جانِ جاناں، جانِ جاناں، کیا کہوں
تم ! وفا کو قتل کر سکتی ہو تم!
تم کہ تھیں اُمید و ارمانِ وفا

تھے بھلا کھینچے ہی جانے کے لیے
جان ! دامان و گریبانِ وفا
یعنی آنسو ہچکیاں، سب کچھ تھا جھوٹ
تھا عبث ہر عہد و پیمانِ وفا

نظم نے شہر کے فسانہ سازوں، شوشہ طرازوں کو عرصے تک گرمائے، اُلجھائے رکھا۔ بڑی دھوم مچی۔

محبت نامے بڑی حد تک ذات نامے ہوتے ہیں۔ جون صاحب کو خط لکھنے کا بس کوئی موقع ملنا چاہیے تھا۔ خط کی ترسیل شرط تھی۔ کام رانی تو پھر لازم تھی۔ انھوں نے ایسے بے شمار خطوط لکھے ہوں گے۔ کراچی میں ایک صاحبہ کے نام اُن کے خطوط اتفاق سے محفوظ رہ گئے ہیں، ایک ضخیم مجموعے کے بہ قدر۔ لیکن ان کی اشاعت بہ وجوہ مناسب نہیں۔ ان خطوط کا اُردو کے اہم ترین خطوط مجموعوں میں کیا مرتبہ ہے؟ بہتر ہے، فتوا محفوظ کر لیا جائے۔ اشاعت ہو تو کچھ کہتے ہوئے بھی اچھا لگے۔

مگر یہ عاشقانہ تحریروں کی رقم پذیری اور خالص علمی، ادبی، سماجی موضوعات پر اداریہ نگاری میں بڑا فرق ہے۔ انشا کے لیے پہلا اداریہ لکھتے وقت اُن کے انتشار و اضطرار کا میں شاہد ہوں۔ یہ اداریہ 'انشائیہ' کے عنوان سے شایع ہوا۔ ایک عذاب مرض سے، مہینے پہلے سنبھلنے والے تیس اکتیس سالہ ناتواں نوجوان نے مشاقی اور پختہ کاری کی مثال کیسی توانا نثر تحریر کی تھی۔ اس اداریے کا ابتدائی حصّہ ملاحظہ ہو۔

'حیاتِ بشر کے تمام مظاہر اور تمام شعائر خود اسی حیاتِ اکبر کے رنگا رنگ پہلو ہیں جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ نہ انسان جامد اور معطل ہے اور نہ اس کی شخصی اور اجتماعی زندگی پر جمود و تعطل کبھی وارد ہوتا ہے۔ یہی حال انسان کی فکری و تخلیقی زندگی کا ہے۔ ہم ہر لمحے کچھ نہ کچھ بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ کون و فساد کا یہ عمل مسلسل ہمارے ہاتھوں جاری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بناؤ ارتقائے بشر کے لیے ضروری ہو اور ہر بگاڑ انسانی ذہن و فکر کے لیے تخریب رساں۔ اس کون و فساد کی نوعیت در حقیقت اضافی ہے......'

شاید کسی کو توقع نہیں تھی کہ مشاعروں میں داد و تحسین سمیٹنے کے لیے ہلکے پھلکے رومانی اور

معاملہ بندی قسم کے اشعار پڑھنے والے جون ایلیا محض شاعر ہی نہیں، اس کے سوا بھی بہت کچھ ہیں۔ دو باتیں ایک ساتھ وقوع پذیر ہوئیں۔ اُن کی ادارت میں شایع ہونے والے عام ادبی رسالوں سے مختلف ماہ نامے انشا کی اشاعت کا آغاز اور دوسرے اُن کے اداریے کا پُرعزم لہجہ ولب، اُن کا اعتماد بھرا پیرایۂ بیان۔ قارئین، اُن کے حلقۂ احباب اور متعلقین، سبھی کو رشک آمیز تعجب ہوا کہ ایک شاعر کیسی شان دار، پُروقار نثر پہ قادر ہے، ایسی نثر جو علم، فکر، زبان اور دانش کے بغیر ممکن نہیں۔ پہلے اداریے اور پہلے رسالے کے منفرد، متنوع مضامین کے استقبال سے جون ایلیا کی اداریہ نگاری اور پرچے کی ترتیب وتدوین میں انہماک فزوں ہوگیا۔ ہر مہینے پھر تو اُن کے جوہر کھلتے گئے۔ وہ طرح طرح کے موضوعات پر جلال آمیز، جمال آفریں لہجے میں اداریے لکھتے رہے اور ان کے بیان کی تیزی اور کاٹ بڑھتی رہی۔ انشا کے پہلے اور سسپنس کے آخری اداریے تک اُن کی نثر کروٹیں بدلتی نظر آتی ہے، اور اس کا شکوہ وہی رہتا ہے جو پہلی مرتبہ تھا۔

ایک اچھی نثر کیا ہے۔ کوئی عامی بھی بآسانی جواب دے سکتا ہے کہ ایک خوش گوار، رواں، سادہ اور دل نشیں نثر، لیکن یہ سادگی وخوش گواری، روانی اور دل نشینی آسان کام نہیں۔ یہ ایک طرف تو عطیہ ہے تو دوسری طرف عشق وریاضت، موضوع کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ، موضوع پر گرفت اور خود راقم کی شرکت بل کہ شرکتِ قلبی۔ اچھی نثر کے لیے بار بار چھاننا پھٹکنا پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بار بار کی قطع وبرید، ترمیم واضافے سے نثر کی روانی میں شکن آسکتی ہے۔ امریکا کے نامی گرامی قلم کار جیمس تھربر کی موشگافیوں کی یہی عادت اُنھیں نقصان پہنچاتی تھی۔ گو تھربر نے یادگار تحریریں انگریزی ادب کو نذر کیں لیکن اُن کے ناقد گلہ کرتے تھے کہ بار بار اپنی تحریر پر شک کرنے اور اصلاح کرتے رہنے کی بے کلی سے اُن کی نثر کی روانی اور دل کشی متاثر ہو جاتی تھی۔ اِسے کوئی کلیّہ نہ سمجھا جائے۔ بار بار دیکھنے اور بہ قول شخصے دھوپ دکھانے سے نثر کے جھول یا سقم دُور بھی ہو جاتے ہیں یعنی یہ بھی تو ممکن ہے کہ نظرِ اوّل، دوم، سوم وغیرہ کے بعد عبارت اور چست، رواں، شستہ وشگفتہ توضیح میں بہتری اور تاثر میں اور شدّت آجائے۔

کسی شخص کی کھنک دار آواز، گونجتا لہجہ اور گفت گو کا جُداگانہ ڈھب اُسے دوسروں

سے ممتاز کر دیتا ہے۔ لکھنے والے کا بھی کچھ یہی ہے کہ کوئی مخصوص نثری انداز اُس کی شناخت بن جاتا ہے۔ اگر یہ دل نواز بھی ہو تو کیا خوب! اسے عطیہ کہنا چاہیے کہ لفظ اُمڈ رہے ہیں' لفظ بہہ رہے ہیں اور لفظ کسی خاص آہنگ سے اُتر رہے ہیں' غیر شعوری طور سے۔ شعوری کوششوں سے کوئی صاحبِ طرز نہیں بن جاتا۔ اور یہ کیا طرفہ ماجرا ہے کہ صاحبِ طرز ہونے کی فضیلت' قبولیت کی سند بھی نہیں۔ بہت سے صاحبانِ طرز کی تحریریں بڑی گنجلک اور پیچیدہ بھی ہوتی ہیں۔ اُن کے معانی و مفاہیم سمجھنے کی تگ و دو سے جی گھبرانے لگتا ہے۔

اپنے نفسِ مطلب میں غیر واضح قلم کار کو قلم اُٹھانے سے پہلے اچھی طرح مدعا کی تطہیر و تقطیر کر لینی چاہیے۔ ورنہ تحریر میں سلوٹیں پڑ جانے کا احتمال رہتا ہے' لُکنت آ سکتی ہے۔ کوئی قلم کار نفسِ مطلب سے ہر طرح آگاہ' صاف اور مطمئن ہے اور بدقسمتی سے متناسب الفاظ کا انتخاب کرنے سے قاصر رہا ہے تو بھی کچھ یہی صورت پیش آ سکتی ہے۔ اسی سبب سے نظرِ ثانی پہ اصرار کیا جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہے کہ ایک آدمی' بہ ظاہر ایک نظر آنے والا ایک آدمی نہیں ہوتا کہ وہ مستقلاً ایک حال میں نہیں ہوتا۔ بہ یک وقت کئی آدمی اُس کے ہاں نہاں ہوتے ہیں اور عیاں بھی ہوتے رہتے ہیں۔ جون ایلیا تو جانے کتنے آدمیوں کا مجموعہ تھے۔ میں نے اِس بے شمار آدمی کے ساتھ کوئی تیرہ برس کے صبح و شام گزارے ہیں۔ اور میں کیا' جو اُن سے بہت قریب رہے ہیں' کچھ وہی جانتے ہیں کہ یوں ایک شایستہ' نفیس طبع اور پُرسکون شخص اپنے کم زور جثے میں کیسا سمندر اور کیسی آگ لیے پھرتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر شکوہ کناں اور بڑی سے بڑی بات پر بے حسی کی حد تک بے جنبش۔

عیب جوئی' مین میخ کے لیے ہر وقت کوشاں۔ بدگمان ہونے اور بدگمان کرنے میں یک تا۔ ظاہراً روایت دوست' اصلاً روایت دشمن۔ کاہلی بہ درجۂ تمام' گھنٹوں الکساتا' اینڈتے رہنا' خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے اور دوسروں سے کام لینے کے فن میں طاق۔ فرمایشیں کرنے کا قرینہ کوئی اُن سے سیکھے' ایسے حسرت ناک انداز میں فرمایشیں کرتے کہ مراد پوری کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ مجلس باز' دوست بدلتے رہنا' بہت سے دوست اور شاید کوئی بھی نہیں' سب سے بڑے اپنے آپ کے دوست۔ خود نما، قامت

کی کوتاہی' مجبوری جیسی کم تر زی پر قدرت کے بخل سے نالاں۔

سنا ہے، امروہے میں تجہیز بھی کرتے تھے' تن سازی اور پہلوانی بھی۔ خود کو عجوبہ بنانے کے شائق' رات کی شعری نشستوں میں سیاہ چشمے اور گرمیوں میں بالا پوش (اوور کوٹ) پہن کر شریک ہو سکتے تھے' کئی بار یہ مظاہرہ کیا بھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھرے مشاعرے میں کلام سناتے ہوئے کسی شناسا سامع کے نظر آجانے پر نام لے کر تعجب کا اظہار کریں۔ 'ارے کاشف! تم بھی۔۔۔۔ ہائیں۔۔۔۔ خیریت بھی پوچھ لیں۔ 'اور وہ اپنی بٹیا کیسی ہے؟ پچھلی مرتبہ اُس نے کیا مرچ قیمہ کھلایا تھا۔ یہ ذائقہ تو اس پر ختم ہے' کلام چھپانے میں چور' مشاعرے پڑھنے کے دل دادہ' اور مشاعرے لوٹ لینے کے حیلوں' حربوں کے ماہر۔ یاد نہیں' کبھی ہوٹ ہوئے ہوں۔ علامہ انور صابری کی طرح اُلٹا سامعین کو ہوٹ کرنے کا ہنر خوب آتا تھا۔ لکھنؤ کی ایک شعری محفل کا وڈیو جمال احسانی مرحوم کے پاس تھا۔ وہاں واقعی ہوٹ ہوئے تھے' یقیناً پہلی اور آخری بار۔ کچھ یہی ان ہونی تھی کہ جمال نے یہ وڈیو محفوظ کر لیا تھا۔

گفت گو میں انوکھے اچھوتے فقروں' نت نئی تاویلوں سے مخاطب کو لاجواب کر دینے میں ملکہ حاصل تھا۔ برجستہ' ایسا سفاک' جارحانہ فقرہ چست کرتے' ایسی دلیل وضع کرتے کہ تن بدن میں آگ لگا دے' آدمی آئینے سے چہرہ چھپانے لگے۔ کبھی ایسا شوخ و شگفتہ' ایسا زاویہ طراز' معنی خیز فقرہ کہ آدمی دیکھتا رہ جائے اور داد و تحسین کرتے بھی نہ بنے۔ بڑے بھائی رئیس امروہوی کے حادثاتی انتقال پر لوگ تعزیت کر رہے تھے اور صبر و استقامت کی تلقین کر رہے تھے۔ سنتے رہے اور آہ بھر کے بولے۔ "ہاں صاحب! ہمیں اپنے بھائی کے قتل کا کوئی تجربہ تو نہیں تھا"۔ کسی دن گھریلو امور کا قصہ چل رہا تھا کہنے لگے۔ "یار شکیل! سنتے ہیں' پچھلے زمانوں میں بیویاں مر بھی جایا کرتی تھیں"۔ عبیداللہ علیم کے جنازے پر ایک ہم عصر شاعر بے حال تھے' پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ ہر آنے والے سے لپٹ کر بین کرتے۔ ادھر جون صاحب کا بھی بیش و کم یہی حال تھا۔ نماز ہو گئی۔ قبرستان جانے کے لیے میت بس میں رکھ دی گئی تو کسی قریبی دوست نے مکان سے باہر آتے ہوئے غم زدہ ہم عصر شاعر کے بارے میں سرگوشیانہ تبصرہ کیا کہ اس کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی۔ جون صاحب

سر ہلاتے ہوئے ہونٹ سکوڑ کے بولے۔ "ہاں جانی! وہ ہم سے بازی لے گیا"۔

ممتاز شاعر اور منفرد افسانہ نگار اسد محمد خان بھی اُن کے یاروں میں شامل تھے۔ ایک زمانے میں دونوں کا ایک دوسرے کے ہاں بہت آنا جانا تھا اور طرزِ گفت گو مختلف ہوتی۔ اسد بھائی کو گھر میں سامنے دیکھ کر چیختے۔ "ارے دیدی! کہاں رہ گئی تھی نامراد' کتنی دیر کر دی۔ کب سے راہ تک رہی ہوں۔ گھڑی دیکھی ہے۔ اب کیا خاک جانا ہوگا"۔

اسد بھائی گویا کچھ اس طرح جواب دیتے۔ "کیا بتاؤں بھنو! کچھو' بس خیر ہو گئی۔ خدا جانتا ہے' کس مشکل سے پہنچی ہوں۔ کم بخت بس رستے میں تین جگہ ٹھپ ہوئی۔ معلوم تھا تجھ سے تو انتظار برداشت ہی نہیں ہوتا۔ کھول رہی ہوگی۔۔۔۔ تو تو۔۔۔۔"

"میں تو ہول رہی تھی"۔ جون کہتے۔ "زمانہ برا آ گیا ہے۔ جانے کیسے کیسے وہم آ رہے تھے"۔

مذاہب عالم کا وسیع مطالعہ اور بے گانگی۔ مذہبی تقریبات میں شرکت سے گریز اس اور از روِ وضع شریک بھی۔ بعض اوقات نہایت بے شرم' بے غیرتی کی انتہا تک۔ دوسروں کے معاشقے اور راز و نیاز کی داستانیں سننے کے لیے بے چین' بچوں کی طرح کرید کرید کر پوچھتے اور زچ کر دیتے۔ سکہ بند ترقی پسند ادیبوں شاعروں کے گروہ سے کوئی مغائرت سی' اور عملاً نظری وابستگی۔ علم نجوم' ہندسہ' دست شناسی اور دیگر ماورائی قسم کے علوم' توہمات میں دل چسپی کے علاوہ خیرہ کن سائنسی کرشموں کے معترف اور فکری مسائل پر منطقی استدلال کے موید۔ کبھی دعا کرتے نہیں دیکھا۔

دیسی مل کہ دیسی' مشرقی کھانوں کے مشتاق۔ پہناوے میں انگریزی لباس پسندیدہ۔ اُردو کے جاں نثار اور انگریزی میں مکمل دست رس نہ ہونے پر اُداس' خود سے ناراض۔ علاج اور دوا خوری ایک مستقل مشغلہ اور ضرورت بھی۔ آیورویدک' یونانی' ایلوپیتھی' ہومیوپیتھی' نفسیاتی' روحانی' ایکوپنکچر' شمسی شعاعیں' ہر طریق طب سے استفادہ۔ عام لوگوں کے مشوروں پر قسم قسم کے ٹوٹکے بھی آزمائے جاتے رہے۔ مہینوں تک لگی بجھی نچوڑ کر عرق پیتے رہے۔ چار مغز' سچے موتی' زعفران' مشک اور سونے کے سفوف سے مرکب جوارشوں کے تجربے بھی کیے جاتے رہے۔ سر پہ انڈوں' کبھی جسم پر سرسوں' زیتون اور

روغنِ بادام کی مالش کی جا رہی ہے۔ کسی حکیم ڈاکٹر نے نسخے پر ہوالشافی لکھ دیا یا نسخے پر پہلے ہی سے کندہ ہوا ہو تو مطب سے باہر نکلتے ہی بیزاری سے کہتے۔ ''اسے تو خود پر اعتبار نہیں سارا ذمہ تو اس نے خدا پر ڈال دیا ہے''۔

جرم پیشگاں سے رفاقت کا شوق' اُن کی سرگرمیاں اشتیاق سے سنتے' اُن سے خدمت بھی لیتے' اور ممکن ہوتا تو مدد بھی کرتے۔ ناز نخرے' نرگسیت بے پناہ۔ محبوب کی طرف سے پہل ہو جانے کے طلب گار۔ عشق میں سرخ روئی اور لمحاتِ وصل میں فزونیٔ نشاط کے لیے ہر کسی سے مشورے۔ بہت لونڈھیار پن' چھچھورا پن قطعی نہیں۔ عذر تراشیوں کے لیے ادھر اُدھر دیکھنا نہیں پڑتا تھا' ایسا بے ساختہ' فی البدیہہ عذر کہ شکایت کار شرمندگی سے دوچار ہو۔

آخر میں شراب کی کثرت اور شراب بھی سستی یا جو بھی میسر آ جائے۔ ڈاکٹروں کی تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے۔ سب کو یقین دلاتے تھے اور اپنے آپ کو بھی۔ ''بھیا! اللہ پاک کی قسم' ٹیسٹوں میں جگر ایسا صاف آیا ہے جیسے کسی بچے کا ہو''۔ اُن کی قریبی عزیزہ کا بیان ہے۔ ایک رات سردیوں کے موسم میں سلگتی سگریٹ ہاتھ میں تھی۔ بستر پہ آئے تو نیند نے آلیا۔ گھر میں کپڑا جلنے کی بو پھیلی تو افراتفری سی ہو گئی۔ اُن کے کمرے میں جا کے دیکھا تو رضائی جل رہی تھی۔ دھویں سے کمرا اَٹا ہوا تھا۔ وہ تو جانیے' بس خیر ہو گئی۔ دمے کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ کبھی کبھی تو بڑی شدّت ہو جاتی تھی۔ اِن ہیلر (اسے دم کش کہیے یا تنفس کشا) سے سانسیں بحال کرتے تھے۔ حساب کتاب میں صفر' پیسے پاس رکھنے سے بے نیاز۔ آخری برسوں میں جائداد کی فروخت سے ایک بڑی رقم ملی۔ رقم کی نگرانی کے لیے ایک دوست پر اعتماد کیا اور کچھ غلط نہیں کیا۔ ایک روز مجھے فون کیا۔ کہنے لگے۔ ''اِن دنوں تجھے کچھ پریشان محسوس کیا ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟'' سب رنگ کی عدم تواتری سے اُس وقت میرا ہاتھ واقعی تنگ تھا۔ میں نے جھجک کی تو بولے۔ ''جانی! میری باری بھی تو آنی چاہیے۔ جلدی سے فرماؤ' سرِ دست کتنے میں کام ہو سکتا ہے؟'' انھوں نے دوسرے دن مجھے چیک بھجوا دیا۔

غصہ' کینہ' نفرت' حسد' انتقام بہ یک حالت اور بہ یک وقت کئی عام آدمی۔ عام آدمیوں کی تمام خامیوں سے آلودہ اور بے شک خوبیوں سے آراستہ۔ اُن کے تلوّن' تنوع اور تضاد پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں' لکھی جائیں گی۔

یہاں تو صرف چند پہلوؤں کا، وہ بھی اشارۃً احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُن کے رفقا انھیں جتنا جاننے اور سمجھنے کا دعوا کرتے تھے، جون ایلیا کی شخصی بوقلمونی کا عُشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔ وہ ایک بہت مشکل آدمی تھے۔ اُن سے نبھائے رکھنے کے لیے ایک حوصلہ درکار تھا۔ ہم سبھی کو اُن سے سخت شکایتیں، ناراضیاں ہو جاتی تھیں۔ بعض اوقات تو وہ بہت بُرے لگتے تھے، اور اُن سے بے اعتنائی، بے گانگی، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کو جی کرتا تھا۔

لیکن اِس واقعے کی صحت سے کون منکر ہوگا کہ وہ تو ایک بہت خاص آدمی تھے۔ ہم سبھی جون ایلیا، ایک عام آدمی کو اُس کی والا گہری، والا نگاہی کی رعایت دینے پر مجبور تھے کہ اُسی روز، دوسرے دن، اگلے ہفتے یا اگلے مہینے وہ ایک فکر انگیز نظم، ایک مرصّع غزل کے ہتھیار سے بے دست و پا کر دیتے تھے۔ وہ خود کو کتنا ہی مظلوم و معصوم ظاہر کرتے رہے ہوں، وہ تو بڑے توانا اور بہت دولت مند آدمی تھے۔ اُن کی توانائی اُن کی شاعری اور اُن کی امارت اُن کی شاعری تھی، اُن کا کلام، فصاحت مقام، بلاغت نظام، دل آویز و دل نشیں، خیال آرا، جمال آرا۔ انھوں نے اپنے تیور، اپنے خاص رنگ و آہنگ کی شاعری سے ایک جہاں کو گرویدہ کیا تھا۔ وہ کتنے ہی عجیب اور نا قابلِ فہم رہے ہوں، اصل میں تو وہ محض شاعر تھے۔ باقی تو سارے اُن کے سائے تھے۔

اُن کی شاعری پر نقد و نظر، ستایش و ستائد کا یہ محل نہیں۔ اُن کی شاعری کے بارے میں فیصلے کیے جا چکے ہیں اور کیے جاتے رہیں گے۔ ادب و شعر کا معاملہ بڑا اسفا کانہ ہے۔ کوئی سفارش اور سند کارگر نہیں ہوتی۔ اچھا شعر طاقتِ پرواز رکھتا ہے اور بہ ہر سمت، بہ ہر حال گشت و گردش کرتا رہتا ہے۔ ادب و شعر کا ایک معیار تکرارِ افادیت کا بھی ہے کہ بار بار سُننے اور سُنائے جانے کے بعد اثر پذیری ماند نہیں پڑتی۔ اُردو شاعری کے بحرِ بے کراں میں جس نے پہلے سے کچھ جُدا اور سِوا کیا ہو، بقا پھر اُسی کا نصیب ہوتی ہے۔ ناقدین کے فیصلے ایک طرف، زمانی فیصلے ہی مقتدر ہوتے ہیں۔ زمانہ کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے، صرف چند ہی عزت کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ باقی ایک ہجوم اندھیروں کی نذر ہو جاتا ہے۔

جون ایلیا کی سخن کاری کا مقدمہ ایک جانب اُٹھا رکھیے۔ اُن کا ایک دوسرا رُخ بھی تو ہے۔ ایک با کمال شاعر کی حیثیت سے اُن کی شناخت تسلیم کی جا چکی ہے۔ مگر انھوں نے

صرف شاعری ہی نہیں کی' فکر و نظر' خیال و خواب کی یہ نثری تعبیریں بھی تو کچھ ثابت کیا چاہتی ہیں۔

یہ کتاب آخری برسوں میں جون ایلیا کے رفیق خاص برادرم خالد انصاری نے مرتب کی ہے۔ مجموعہ کلام "یعنی" کے پیش لفظ میں مجھ بد گمان نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ خالد انصاری نے جون صاحب کا اثاثہ دبوچ کے رکھا ہے۔ مجھے ہی نہیں' اُس وقت جون صاحب کے بہت سے احباب کو بھی اندیشہ تھا کہ اب جانے کیا حشر ہو' یہ کلام' کن ہاتھوں میں ارزاں ہو' لیکن خالد انصاری' یہ جواں مرد تو جون صاحب سے رفاقت کے دعوا کاروں' بھی وفا شعاروں سے سبقت لے گیا۔ "یعنی" کے بعد خالد نے اور تین مجموعے ترتیب دیے "گمان" "لیکن" اور "گویا"۔ جون ایلیا کے عشاق کو مژدہ ہو کہ آخری ایک اور مجموعے کی آمد بھی بعید نہیں۔

پھر خالد کو خیال آیا کہ نثر میں بھی تو جون ایلیا نے کچھ الگ کیا ہے۔ اُن کے نثر پارے یک جا کرنے کی ایک کوشش کیوں نہ کی جائے۔ خالد نے کسی مشن کی طرح یہ بکھری ہوئی تحریریں اکٹھی کرنی شروع کیں۔ کامیابی کے لیے نیت کی پاکیزگی چاہیے۔ یہ ہم خوش گزراں' خوش کلاماں کے بس کی بات نہیں تھی۔ کتاب میں خالد کی زبانی اس رُوداد کی دل گزشتی تفصیل اور انکسار سے درج ہے۔ واضح ہو کہ ایم بی اے سند یافتہ اس نوجوان کا روزگاری وسیلہ بینکاری ہے لیکن سرمستوں' سرکشوں کے دشتِ بے اماں پر بھی جان سے فریفتہ ہے' سو اُدھر سے اِدھر بھٹک جاتا ہے۔ کئی بار اچھے بھلے مناصب سے بے انصافی کا مرتکب ہو چکا ہے۔ سرِدست تو اپنے مخدومی جون ایلیا کی یادوں پر قناعت ہے اور خوش حالی ہے۔

اس نثری مجموعے کی قریباً ساری تحریریں ضرورۃً لکھی گئی ہیں۔ انشا کے مدیر کی حیثیت سے اداریہ نگاری جون ایلیا کے فرائض کا حصہ تھی۔ سسپنس ڈائجسٹ کے لیے لکھے جانے والے اداریوں کا انھیں باقاعدہ ماہانہ اعزازیہ ملتا تھا۔ اُن دنوں اُن کے بہت سے مسائل اس اعزازیے سے آسان ہو گئے تھے۔ پھر ایک رسم بن گئی۔ سسپنس کے مدیر' مالک معراج رسول کی درخواست پر دوراں کی گردش سے باہر آنے کے باوجود انھوں نے یہ سلسلہ آخر دم تک برقرار رکھا۔ تاہم اُن کے حاشیہ نشینوں کا چشم دیدہ ہے کہ ان

کثیر الموضوعات تحریروں پر قلم اُٹھاتے ہوئے انھیں کیسی کشاکش' کش مکش سے گزرنا پڑتا تھا۔ ان میں سے شاید ہی کوئی نوشتۂ قلم برداشتہ ہو۔ وہ بار بار انھیں دیکھتے' نفسِ مضمون کی مؤثر رسائی کے لیے لفظ چھانٹتے' لفظ بدلتے' سطروں کی شکنیں ہموار کرتے' عبارتیں تراشتے رہتے۔ ہر بار ایسا لگتا کہ پہلی بار کچھ لکھ رہے ہیں۔

ذہنی خلفشار ہو یا اعصابی فشار' سفر درپیش ہو یا کوئی اور مصروفیت' ناسازیِ طبع اور ناسازگاری حالات میں چند سطری مذعا پر اکتفا کیا جا سکتا تھا۔ حاضری لگا دینے کی اس عام روش سے وہ ہمیشہ مجتنب رہے کہ ایک عہد انھوں نے عزم و جوش' تمام تر استطاعت اور استقامت سے زندگی بھر نبھایا' قلم سے پیمانِ وفا کا کبھی ناغہ نہیں کیا۔ اُن کی تحریر کے انتظار میں رسالوں کی اشاعت میں اکثر تاخیر ہو جایا کرتی مگر اس تذبذب و تامل سے ہوتا یہ کہ کسی گم شدہ نکتے کی بازیابی ممکن ہو جاتی یا کوئی دُور افتادہ دلیل در بیچۂ فکر میں دَر آتی۔ وزن کچھ بیش ہو جاتا' دریا کچھ اور رواں۔ اداریے انشائیوں کی شکل اختیار کر لیتے۔ اس خامہ کشی کے دوران اُن کا انہماک دیدنی ہوتا تھا اور حسبِ منشا انجامِ کلام کے بعد نشاطِ خاطر کا بھی۔

کہتے تھے' یہ نثر کاری میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ شاعری نہیں' جو چلتے پھرتے' اُٹھتے بیٹھتے' ہر حال میں سرزد ہو جائے۔ نثر کے لیے خود کو باندھ کے' جکڑ کے بیٹھنا پڑتا ہے۔ عام طور پر شعرا کی نثر میں ایک دل کشی ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً غالب' حالی' محمد حسین آزاد' جوش' میراجی' ساقی فاروقی وغیرہ۔ جون ایلیا تو شاعری صحرا نوردوں' تیشہ بدوشوں' کج اداؤں' کج کلاہوں' آئینوں اور آئینہ خانوں کے تھے۔ اُن کا جلال آمیز رجانیہ جمال آگیں' خیال و احساس کی تازگی سے عبارت تھا' لپکتا' کھنکتا' دھمکتا' گونج دار لہجہ۔ اُن کی نثر میں ایک آہنگ' شکوہ و یقین' حکم' تمکنت اور خطاب نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کے پیرایۂ اظہار میں ایک جرأت مند' بے باک' ناراض اور تند مزاج شخص کی تصویر اُبھرتی ہے اور یقیناً ایک ہم نفس' غم گسار' دل دار شخص کی بھی۔ اُس جون ایلیا کی نہیں جو ہمارے سامنے موجود تھے۔ لوگ کہتے ہیں' سارا کھیل شاطری جیسا ہے۔ لفظ مہروں کی طرح ہوتے ہیں۔ کون کس تحمل' تدبر سے مہرے بڑھاتا ہے' مگر صرف شاطری' دانائی' تجربہ' مشاقی اور اداکاری نہیں' کون کتنا شامل ہے' کس نے اپنی جاں' اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا ہے' کون سینہ تپاں کا حامل ہے۔ جون ایلیا

ہر سمت سے بے نیاز ہو کر بساطِ سخن بچھاتے تھے اور حاصلِ کلام تو، ہم تمام کا آزمودہ ہے۔
وہ سراپا اُردو کے آدمی تھے۔ عربی و فارسی کو اُردو کی بیساکھیاں قرار دیا جاتا ہے۔
یہ فرمودہ گراں گزرے تو یوں کہیے کہ اُردو کی زینت و شوکت عربی و فارسی کی مرہون ہے۔
یہی آمیزہ برِصغیر کی زبانوں خصوصاً ہندی سے اُردو کو ممتاز کرتا ہے۔ گھر اور مکتب کے
عربی و فارسی میں رچے ماحول کی اساس پر استوار جون ایلیا کے تخلیقی سفر کی ابتدا ہوئی تھی۔
کچھ اپنے رجحان اور ترجیحات کی بات بھی ہوتی ہے۔ سنا ہے، سات سال کی عمر میں انھوں
نے پہلا شعر کہا تھا۔ اُس کے بعد یہ سلسلہ کہیں نہ رُکا۔

خیال کی تاثیر زبان و بیان کی ہنر کاری سے دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے دور میں
اُردو لسانیات کے معدودے چند ماہرین میں جون ایلیا کا شمار کیجیے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اُن کی
نثر سے اُردو کی بہت سی یادگار کتابوں کا پیرایۂ بیاں تازہ ہو جاتا ہے۔ عہد نامۂ عتیق،
باغ و بہار، عذرا اور عذرا کی واپسی، تائیس، غبارِ خاطر وغیرہ، اور بہت سے نثر نگار یاد آتے ہیں،
رجب علی بیگ سرور، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، مولوی عنایت اللہ دہلوی،
حبیب اشعر، نیاز فتح پوری وغیرہ جیسے نادرِ روزگار قلم کار۔

بے شمار دُنیوی مظاہر کی طرح اُردو نثر کے معیار کے پیمانے بھی ہر عہد میں بدلتے
رہے ہیں۔ کسی ایک عہد میں زبان و بیان اور اُسلوب کا کوئی طور مستند و معتبر سمجھا گیا ہے تو
دُوسرے دور میں کوئی اور طرزِ ادا، ادائے نگارش خاص و عام میں مرغوبِ خاطر ہو جاتی
ہے۔ وجوہ متعدد ہو سکتی ہیں کہ ایک ہی قسم کے طریقِ اظہار سے طبیعت اُکتا جاتی ہے۔
بہت سے لفظ کثرتِ استعمال سے بے وقعت بل کہ متروک ہو جاتے ہیں، نئے لفظ، نئے
اسالیب، اُن کی جگہ لے لیتے ہیں۔ لفظوں کے معانی و مفاہیم بھی زمانے کی گرد باد میں کیا
سے کیا ہو جاتے ہیں۔ اُردو نثر بھی گزرتے وقت میں رنگ بدلتی رہی ہے۔ 82 سال پہلے
اُردو نثر کی تاریخ پر ایک اہم تحقیقی کتاب شائع ہوئی تھی۔ ادوار کا تعین مشکل ہے لیکن محقق
جناب احسن مارہروی نے چھ ادوار میں اُردو نثر تقسیم کی ہے۔ 1398ء سے شروع ہونے
والے پہلے دور کی پہلی اور واحد کتاب حضرت خواجہ گیسو دراز کی تصنیف 'معراج العاشقین' کا
چند سطری اقتباس ملاحظہ ہو۔

''انسان کے بوجنے کوں پانچ تن، ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں، ہور پانچ دربان ہیں۔ پیلا تن واجب الوجود، مقام اُس کا شیطانی۔ نفس اُس کا اتارہ یعنی واجب کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سنا سو۔ حسد کی نک سوں بدبوئی نہ کینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدگوئی نہ لینا سوں۔ کینہ کی شہوت کوں۔ غیر جاگا خرچنا سوں پیر طبیب کامل ہونا۔ نبض پچھان کو دوا دینا۔''

مصنف کی تشریح سے معانی کی تشویش دُور کی جاسکتی ہے۔

(بُوجنا' بُوجھنا' سمجھنا۔ کُوں' کو۔ ہور' اور۔ پیلا' پہلا۔ آنک' آنکھ۔ سوں' سے۔ دیکھنا سو' دیکھنا۔ نک' ناک۔ جاگا' جگہ۔ بدبُوئی' بدبُو۔ پچھان' پہچان)

1930ء میں شائع ہونے والی کتاب 'نمونۂ منثورات' میں 532 سال کے عرصے پر محیط کروٹیں بدلتی مختلف تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر تحریر کسی عہد میں رائج بول چال کا پرتو ہوتی ہے' اور قصہ مختصر' ہر عہد میں بولی اور لکھی جانے والی زبان کے ڈھب ڈھنگ بدلتے رہتے ہیں۔ شروع اور درمیانی اَدوار کے یہ مضامیں دیکھیے تو ایک انقلاب نظر آتا ہے۔

احسن مارہروی کی کتاب کی اشاعت کو 89 سال گزر چکے ہیں۔ کتاب میں منقسم ادوار کے اعتبار سے 1930ء کے بعد کا دور اُردو نثر کا ساتواں دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس مدّت میں بھی اُردو نثر کی وضع قطع میں تغیر کا عمل کم نہیں رہا ہے۔ ازل سے یہ پہلو بدلنا' رُخ بدلنا تو زندگی کا شیوۂ رندانہ ہے۔ گزشتہ کی طرح آئندہ بھی زبان کے نو بہ نو پیرائے سامنے آتے رہیں گے۔ نئے عہد کے کارواں کی رفتار پچھلے وقتوں سے خاصی تیز ہے۔ رسل و رسائل کی حیرتی کرشمہ سازیوں سے کرۂ ارض سکڑ رہا ہے۔ انگریزی اور دیگر زبانوں کی رفاقت سے اُردو کے خال و خط بھی بدل رہے ہیں۔ اِس صورتِ حال پر رنج و ملال کا کیا محل ہے کہ یہ کوئی نیا وتیرہ نہیں۔ سکوت و جمود سے زندگی کو کب کوئی علاقہ رہا ہے۔ ایک جبلّت جس کا ذکر گنائے جانے والی مسلّمہ جبلتوں میں نہیں کیا گیا' آدمی کے تلوّن متنوع کی جبلت ہے۔ آدم زادوں کو یک سانی راس نہیں آتی۔ ثقہ اور جیّد روایت شعار بھی روایت کے پنجرے میں ایک دن پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ ہر پُرانی نسل' نئی نسل کو مشکوک سمجھتی ہے اور مآلِ کار شرمندگی سے دوچار ہوتی ہے اور ہر نئی نسل بھول جاتی ہے کہ وہ آسمانوں سے

نہیں اُتری۔ سب کچھ گزشتہ سے پیوستہ ہے اور سلسلے کی کڑی ہے۔ ہر نئی نسل، پرانی نسل کی کوتاہیوں کی تلافیاں کرتی، سزائیں کاٹتی رہتی ہے اور علم و ہنر کا ترکہ نصیب ہو تو زندگی سے اَٹکھیلیاں بھی خوب کرتی ہے، پیش رووں کے عظیم ترکے کی سرمایہ کاری سے آنے والے کل بھی محفوظ کر لیتی ہے۔

مناسب ہوگا، یہ بحث یہیں تک رہنے دی جائے کہ اِن سماجیاتی مسائل سے خلطِ مبحث کا امکان ہے۔

وہ جو کہتے ہیں، کچھ ایسا ہی تھا۔ جون ایلیا کی عمر بیس پچیس سال کی عمر تک ٹھیری سی گئی تھی۔ پچاس ساٹھ سال کی منزلوں میں کچھ اضافہ ہوا ہو تو چند سال کا۔ پینتیس برس کے ہو گئے ہوں۔ آخر تک لڑکے بالوں کی طرح مچلتے پھڑ کتے رہے۔ نومبر 1970ء میں طویل دورانیے کی رسم وراہ کے بعد شادی ہوئی، بچے ہوئے، دو بیٹیاں، ایک بیٹا۔ الگ ایک گھر بھی بس گیا تھا۔ بچے بھی بڑے ہوئے اور ایک مدّت بعد علاحدگی کی المناکی پیش آ گئی۔ پھر اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے اور سنجیدگی سے ایک اور شادی کی ضد کرنے لگے۔ شناساؤں میں شاید ہی کوئی بچا ہو جسے اُنھوں نے شادی کے لیے کہنیاں نہ ماری ہوں۔

ستائیس سوگز پر پھیلی، کلیم میں ملی ہوئی، چار بھائیوں کی مشترکہ مِلک، وسیع کوٹھی کی فروخت سے اچھا حصہ مل گیا اور ایک میعادی کھاتے میں جمع کرانے سے معقول ماہانہ رقم ملنے لگی تو شادی کی فرمایش میں شدّت آ گئی۔ ستم یہ کہ شرائط بھی فرمایش میں شامل تھیں، یہ ناک نقشہ، یہ رنگ رُوپ۔ شادی کی تو حسرت ہی رہی۔ آخری برسوں، خوردوں میں ایک قریبی عزیز، روشن خیال اور سعادت مند علاّمہ علی کرار نقوی کے ہاں آخر اُنھیں پناہ مل گئی۔ علاّمہ نے سائباں مثال اپنے بزرگ، اُس پیچیدہ آدمی کا بڑا خیال رکھا۔ جون صاحب بھی اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے کا تاثر دینے لگے تھے۔ مگر اُنھیں تو کہیں اور جانا تھا۔ علاّمہ کے گھر میں ایک شام حالت دگرگوں ہوئی۔ علاّمہ کا کہنا ہے کہ انھوں نے قابو میں کرنے کی بڑی کوشش کی۔ قبلۂ عالم کو بڑی جلدی تھی۔ ویسے ہی وہ بہت بے قرار مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ آئے دن ہٹ دھرمیاں کرتے، تماشے کرتے رہتے تھے۔ اُس شام پھر ایسا کیا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے مٹی ہو گئے۔

ادب وشعر سے علامہ کا گدازِ واقعی ایک مستزاد جوہر ہے۔ شکر ہے' جون صاحب کے نہایت مختصر ساز وسامان کتابوں اور مسودوں کی قدر دانی' پاس بانی وہ کسی امانت کے طور کرتے رہے۔ اُن کی معاونت سے بعد کے کئی شعری مجموعوں کے لیے غیر مطبوعہ کلام دست یاب ہو سکا اور اس نثری مجموعے کے لیے بھی کاغذوں میں دبی کئی نایاب تحریروں تک رسائی ممکن ہو سکی۔

تاریخ' تنقید' مذہب' مختلف علوم وفنون' افسانہ' داستان' طنز ومزاح' اخباری خبر وغیرہ' انھیں نثر کی اصناف کہیے تو تمام اصناف میں لفظ تو ایک ہی ہوتے ہیں' سانچے جدا جدا' لفظ برتنے کا سلیقہ الگ الگ۔ خالص علمی موضوعات کی داستانی انداز سے مطابقت نہیں ہوتی۔ داستاں نگاری کا اپنا ایک طور ہے۔ رسالوں اور اخباروں کے اداریے تحریر کی متانت چاہتے ہیں لیکن سانچا کوئی بھی ہو' موضوع کتنا ہی علمی وفکری۔ انشا پردازی کی گنجایش ہر جگہ ہوتی ہے۔ انشا کی پُرکاری سے تحریریں جاذبِ نگاہ ہو جاتی ہیں اور متن میں وزن ہو' فکر کا عمق بھی تو مؤثر ومؤقر۔ تحریریں یادگار بن جاتی ہیں۔

جون ایلیا نے اِن تحریروں میں انشا کے حُسن کا اہتمام رکھا ہے تو متن کی توانائی کا التزام بھی۔ سو یہ تحریریں خاصے کی تحریریں بن گئی ہیں' ان کا زور واثر کچھ اور ہو گیا ہے۔

اردگرد کوئی نظر نہیں آتا جس نے جون ایلیا کے زمانے میں اور اُن کے جانے کے بعد اُن جیسے انشائیے تخلیق کیے ہوں۔ کوئی ہو تو جون ایلیا کے نیاز مند اُس قیصرِ قلم' خسروِ سخن کی بارگاہ میں باریابی اور بندگی کے لیے مضطرب ہیں۔

چھوٹا سا آدمی۔ بڑا شاعر

شمیم نوید

ٹرین پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ ہم صہبا اختر اور دو ایک شاعر اپنی اپنی دھن میں مست سفر کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ سامنے والی سیٹ پر چھوٹا سا ایک آدمی اکڑوں بیٹھا تھا۔ حلیے سے ہمیں وہ بھی اپنے قبیلے کا معلوم ہوا۔ سو ہم نے دھیمی آواز میں صہبا اختر سے پوچھا 'یہ کون ہے؟' سوال کرتے ہوئے ہماری نظریں اسی چھوٹے سے آدمی پر جمی ہوئی تھیں۔

ارے! تم نہیں جانتے انھیں؟ صہبا اختر نے اظہارِ حیرت کیا۔

'نہیں۔ اگر جانتے تو پوچھتے کیوں!' ہم نے کہا 'یہ جون ایلیا ہیں' صہبا اختر نے بتایا۔

سامنے بیٹھے ہوئے اس چھوٹے سے آدمی نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے پہلے ہمیں گھور کر دیکھا، پھر دانت نکال دیے۔

دانت نکالنے کی وجہ ہمارا یہ جملہ تھا 'ہم تو آج تک انھیں کوئی لڑکی سمجھتے تھے'۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہم کراچی اور بیرونِ کراچی مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ کراچی کے علاوہ ہم حیدر آباد، نواب شاہ، سکھر، لاڑکانہ، میر پور خاص وغیرہ تک مشاعرے پڑھنے جاتے تھے۔ اندرونِ سندھ، اُردو کی ترویج و اشاعت میں ان مشاعروں کو خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے یہ 1964ء کا واقعہ ہے کہ جب ٹرین میں صہبا اختر نے جون ایلیا سے ہمارا تعارف کرایا تھا۔ ہم دونوں ہی اندرونِ سندھ ایک مشاعرے میں شرکت کرنے جا رہے تھے۔

کراچی میں جن شعرا سے ہماری زیادہ رسم وراہ تھی انھی میں جون ایلیا کا نام بھی شامل ہے۔ جون پہلے ایک ادبی ماہ نامہ 'انشا' نکالتے تھے۔ پھر یہ ماہ نامہ انشا عالمی ہوا اور اس کے بعد عالمی ڈائجسٹ۔ ہماری اکثر شامیں جون ایلیا کے یہاں گزرتی تھیں۔ یہیں ہماری ملاقات شکیل عادل زادہ سے بھی ہوئی۔ شکیل، عالمی ڈائجسٹ کے ایڈیٹر تھے۔ 'عالمی' میں حصہ نظم بھی ہوتا تھا۔ شکیل اس کے لیے ہم سے اکثر غزلیں لے لیتے تھے۔ ہر چند کہ ہم نے شاعری لکھنے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری بھی شروع کی اور ہمارا پہلا افسانہ 1955ء ہی میں ایک سرکاری ادبی ماہ نامے کی زینت بنا، مگر ہمارا یہ شوق ادبی پرچوں تک ہی محدود تھا۔ ہمیں اپنے پہلے افسانے کے 25 روپے ملے تھے۔ یہ ہماری پہلی نثری کاوش تھی جس کا ہمیں معاوضہ ملا تھا۔ اس زمانے میں سرکاری ادبی پرچے غزل یا نظم کی اشاعت پر 15 روپے دیتے تھے، افسانے کا بھاؤ 10 روپے زیادہ تھا۔ یہ لین دین بھی صرف سرکاری پرچوں تک تھا ورنہ دیگر ادبی پرچے پھوٹی کوڑی نہیں دیتے تھے۔

جون ایلیا سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو انھیں پاکستان آئے تقریباً 8 سال ہو چکے تھے۔ ملازمت کرنے، مشاعرے پڑھنے اور دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ ہم ریڈیو پاکستان کے لیے بھی کام کرتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ ہم ریڈیو ہی کے ہو کر رہ گئے اور بہ وجوہ ملازمت چھوڑ دی۔ کبھی کبھی سب کچھ چھوڑنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ سو ایک دن ہم نے ریڈیو پر کام کرنا بھی چھوڑ دیا، کیوں؟ یہ ایک داستان ہے جس کا جون ایلیا سے کوئی تعلق نہیں ہاں اس قدر تعلق ضرور ہے کہ اس شام جون نے ہماری اُداسی کو محسوس کر لیا۔

'شمیم! کیا بات ہے، تُو چپ چپ سا کیوں ہے؟' جون نے ہم سے دریافت کیا۔

'کوئی ایسی خاص بات نہیں' ہم ٹال گئے، مگر وہ نہ ٹلا۔ ہماری زبان کھلوا ہی لی۔

'تو کیا ہوا! جون نے ہمیں حوصلہ دیا' 'تمھارا دفتر موجود ہے یہاں!'

'کہاں؟' ہم نے بے خیالی میں کہہ دیا۔

اس وقت جون اور ہم بڑے سے لان کے ایک گوشے میں 'شام گزار' رہے تھے۔ چنوں اور ہری مرچوں کے سوا خورونوش کا دیگر سامان بھی ہمارے سامنے رکھا تھا۔

جون ایلیا نے ہمارے سوال کے جواب میں عالمی ڈائجسٹ کے دفتر کی طرف اشارہ کیا، پھر کہا 'تم عالمی کے لیے کام کرو'۔ شکیل عادل زادہ عالمی چھوڑ کر جا چکے تھے اور زاہدہ حنا، پرچے کی ایڈیٹر ہو چکی تھیں۔ جون کے ساتھ ہم لان سے اُٹھ کر دفتر میں آ گئے، دفتر میں گھستے ہی ہماری نظر سیّد محمد تقی پر پڑی جو حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ دائیں جانب بھائی بچھن (محمد عباس) کی کرسی خالی تھی، ہم اس پر بیٹھ گئے۔ بائیں طرف زاہدہ حنا بیٹھی تھیں اور پھر کاتب حضرات کی نشستیں تھیں۔ ہم کتابت شدہ سلسلہ وار کہانی پڑھنے لگے جو عالمی ڈائجسٹ میں شایع ہو رہی تھی۔ ان دنوں ہندو متھ کے پس منظر میں پراسرار کہانیاں ڈائجسٹوں میں شایع ہو رہی تھیں، وہ کہانی بھی ایسی ہی تھی۔

ہندی ہم نے ایڈوانس پڑھی تھی۔ زیرِ مطالعہ کہانی میں متعدد ہندی الفاظ غلط معنی میں لکھے گئے تھے۔ مثلاً کیول کے معنی صرف ہیں تو اسے پرنتو، یعنی مگر کے معنی میں لکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کہانی لکھنے والا ہندو مائتھولوجی سے بھی ناواقف تھا۔ ہم نے کہانی کے املا، الفاظ کے غلط استعمال اور ہندو مائتھولوجی سے مصنف کی لاعلمی پر اعتراض کیا اور کہا کہ 'ایسی کہانیاں تو قلم اُٹھاؤ اور لکھے چلے جاؤ، ان میں کیا رکھا ہے!' ہماری مراد اس کہانی کے بے تکے پن سے تھی۔

اس پر زاہدہ حنا بولیں۔ 'بھائی! یہاں دن رات شاعر، ادیب ہی آتے رہتے ہیں۔ باتیں تو ایسی سب کرتے ہیں، مگر ایسی کہانیاں جنھیں پڑھنے والوں کا بڑا حلقہ پسند کرتا ہے۔ کوئی لکھ کر نہیں دیتا۔ ویسے آپ یہ کہانی لے جایئے اور اس میں جو الفاظ غلط استعمال ہوئے ہیں یا جن کا املا غلط ہوا ہے، درست کر دیجیے۔' زاہدہ حنا نے جس لہجے میں ہم سے یہ باتیں کیں، ہمیں کچھ کھلا، پھر بھی پی گئے، بہ قول ریاض خیر آبادی۔

سن کر جو پی گیا یہ مزہ مفلسی کا تھا

'اچھا، کل ہی ہم ایک کہانی کا پلاٹ سنائیں گے۔' ہم نے زاہدہ حنا کو مخاطب کیا۔
'بالکل!' جون ایلیا نے گویا گرہ لگائی۔
'گویا!' بھائی تقی نے بھی ہمیں مسکرا کر دیکھا اور حقے کے کش لگانے لگے۔

جون ایلیا نے کتابت شدہ کہانی کے صفحات ایک لفافے میں رکھ کر ہمیں تھما دیے۔ ہم دونوں دفتر سے نکل کر پھر لان کی طرف بڑھنے لگے۔ شام ابھی پوری طرح گزری نہیں تھی۔ ہماری فرمایش پر جون ایلیا نے شعر سنانا شروع کر دیے۔

رات تھی میرے سامنے، فردِ حساب ماہ و سال
دن مری سرخوشی کے دن، جانے کہاں گزر گئے
کیا وہ بساط اُلٹ گئی، ہاں وہ بساط اُلٹ گئی
کیا وہ جواں گزر گئے، ہاں وہ جواں گزر گئے

'شمیم نوید! شعر سنو!' جون ایلیا جیسے لفظوں پر جھولا جھولتا رہا اور ہم جھومتے رہے۔
اب ہم سمجھ چکے تھے کہ وہ چھوٹا آدمی، بڑا شاعر بھی ہے۔ حسب معمول دوسرے دن شام کو جب ہم جون ایلیا سے ملنے چلے تو وہ کہانی بھی ہمارے ساتھ تھی جس پر ہمیں اعتراضات تھے۔ ہم نے اس کہانی کی درستی کر دی تھی۔ خوجہ جماعت خانے کے اسٹاپ پر بس سے اُتر کر جب ہم مانک جی اسٹریٹ کی طرف چلے تو یاد آیا کہ ہم نے زاہدہ حنا سے کسی کہانی کے پلاٹ کو سنانے کا وعدہ کیا تھا۔ کھپریلوں پڑی اس قدیم اور بڑی عمارت کے پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے ہم نے ایک کہانی گھڑ لی۔ کبھی جب جون کو ہمارے اور عبیداللہ علیم کے ساتھ آوارہ گردی کرتے ہوئے رات زیادہ گزر جاتی اور لکڑی کا وہ پھاٹک بند ہو جاتا تو جون بالکل بندروں کی طرح پھاٹک پر چڑھ کر دوسری طرف کود جاتا، ہم اور علیم اسے دیکھتے رہ جاتے کہ یہ چھوٹا سا آدمی بھی کیا چیز ہے!

اس شام کو پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہی ہمیں بھائی رئیس (رئیس امروہوی) بے چینی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے نظر آئے۔ لان میں وہ اِدھر سے اُدھر چکر کاٹ رہے تھے اور جون کا کہیں پتا نہ تھا۔ بھائی رئیس نے ہمیں اور ہم نے انھیں دیکھا۔

'آپ کیوں اس قدر بے چین ہیں؟' ہم نے علیک سلیک کے بعد بھائی رئیس سے پوچھا۔

'سائنس کی مشقوں پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں، عنوان نہیں سوجھ رہا۔' بھائی رئیس نے بتایا۔

'لے سانس بھی آہستہ' ہم نے گویا بھائی کی مشکل میر کا شعر پڑھ کر آسان کر دی۔
'سبحان اللہ' بھائی رئیس اتنے خوش ہوئے کہ بولے۔' جون کے ساتھ نہیں، آج کی شام ہمارے ساتھ!'

ہم نے بھائی رئیس کی دعوت قبول کرتے ہوئے جون کے بارے میں پوچھا۔
'جون عالمی کے دفتر میں ہیں' بھائی رئیس نے جواب دیا۔ اسی عمارت کی حدود میں بڑا اور چوکور سا ایک کمرا عالمی ڈائجسٹ کا دفتر کہلاتا تھا اور اسی کے پیچھے چھوٹا سا ایک پرنٹنگ پریس بھائی تقی (سیّد محمد تقی) نے لگا رکھا تھا جس کا نام غالباً مشرق پریس تھا۔ ہم نے عالمی کے دفتر میں پہنچتے ہی راستے میں گھڑی ہوئی پراسرار کہانی کا پلاٹ سنانا شروع کر دیا۔ اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ کراچی میں عالمی کے سول ایجنٹ ایوب بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اور دفتر کے بقیہ افراد نے ہم پر زور دیا کہ یہ کہانی عالمی کے لیے قسط وار لکھیں۔ جون تو پیچھے ہی پڑ گئے۔ کوئی اور ہوتا تو ہم اسے 'گولی' دے دیتے مگر جون سے مفر ممکن نہیں تھا۔

دراصل ہمارے اس قدر 'ہچر مچر' کرنے کی وجہ یہ تھی کہ کسی ڈائجسٹ کے لیے کوئی افسانہ، کہانی یا ناول لکھنے کو ہم 'غیر ادبی حرکت' سمجھتے تھے۔ عالمی کے بھی ہم نے وہی صفحات پڑھے تھے جو نظموں اور غزلوں کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ جب جون نے کہانی لکھنے پر زیادہ زور دیا تو ہم نے کہا۔ 'دیکھو' کہانی تو خیر ہم لکھ دیں گے، مگر اس کا سارا ثواب تمھاری گردن پر ہوگا۔ ہمیں جب بھی موقع ملا' سارا الزام تم پر لگا دیں گے۔'
'یعنی' جون نے اپنے مخصوص لہجے میں استفسار کیا۔
'یعنی یہ کہ تم نے ہمیں خراب کیا اور ہم سے ڈائجسٹ کے لیے کہانی لکھوائی۔'
یہ وہ دور تھا کہ ہم معاشی طور پر پریشان تھے۔ ہم نے سنا تھا کہ ڈائجسٹوں میں لکھنے والوں کو معاوضہ بھی ملتا ہے۔ ہم کئی ماہ تک مذکورہ کہانی لکھتے رہے اور اسے مکمل کر دیا۔ جب ہم اس کی آخری قسط لکھ رہے تھے، پہلی قسط پرچے میں شایع ہوگئی۔ جون کے اصرار پر ہم اس عرصے میں کچھ مسوّدات کی درستی بھی کرتے رہے تھے۔ کہانی مکمل کر کے ہم نے سوچا

تھا کہ دوست کا پرچہ ہے پیسے نہیں لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ دو سو روپے کہانی کے مل جائیں گے، اس سے کیا کام چلے گا! ادھر عید قریب آ رہی تھی اور ہم نے چھوٹے بھائی بہنوں کے کپڑے تک نہیں بنوائے تھے۔

کبھی ہم سوچتے کہانی کے پیسے نہ لیں، کبھی اپنی ضرورت دیکھ کر خیال آتا لے لیں۔ ابھی ہمارے اندر یہ کش مکش جاری تھی کہ جون کے بڑے بھائی محمد عباس نے ہمیں آواز دی۔

'بھائی شمیم! ذرا ادھر آیئے!'

پرچے کا سارا حساب کتاب اور لین دین بھائی عباس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک چیک اور واؤچر ان کے سامنے میز پر رکھا تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ ہمیں کہانی کا معاوضہ دینے کے لیے بلا رہے ہیں۔ ہم نے جو یہ سوچا تھا کہ پیسے نہیں لیں گے، پیسوں کی ضرورت اور عید کی عن قریب آمد نے وہ ارادہ متزلزل کر دیا۔ ہمیں خیال آیا کہ ان پیسوں سے کچھ تو آنسو پچھ ہی جائیں گے۔

بھائی عباس سے چیک لے کر پڑھے بغیر ہم نے پینٹ کی پچھلی جیب میں رکھ لیا۔ ہم نے سوچا یہی تھا کہ دو تین سو روپے کا چیک ہوگا، مگر جب بھائی عباس نے دست خط کرنے کے لیے واؤچر ہماری طرف بڑھایا تو ہم چونک اُٹھے، واؤچر پر ہزاروں روپے کی رقم لکھی ہوئی تھی۔ ہم نے چیک نکال کر دیکھا اور سوچا کہ بھائی عباس نے غلطی سے اتنی بڑی رقم کا چیک ہمارے نام کاٹ دیا ہے۔

ہم نے چیک انھیں یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا 'آپ نے غلطی سے یہ چیک ہمیں دے دیا ہے، آپ رقم کسی اور کو دینے والے ہوں گے' پھر دھیمی آواز میں کہا 'لگتا ہے کہ آپ باہر لان کا ایک آدھ چکر لگا آئے ہیں۔' لان کے چکر لگانے کا مطلب بھائی عباس بہ خوبی سمجھتے تھے لیکن اس وقت واقعہ کچھ اور تھا۔ بھائی عباس کہنے لگے 'ذرا ٹھیریے!' ہم اس سے زیادہ معاوضہ ادا نہیں کر سکتے! پھر انھوں نے بہزاد لکھنوی اور ابنِ صفی کا حساب ہمیں دکھایا اور بولے 'ہم ان دونوں حضرات کو جس حساب سے ادائی کرتے ہیں، آپ کو بھی اسی حساب سے معاوضہ دیا گیا ہے۔'

ہم حیران رہ گئے کہ لکھنے والوں کو ڈائجسٹ اس قدر معاوضہ دیتے ہیں! جون یہ سارا تماشا ہمارے قریب کھڑے اس طرح دیکھتے رہے جیسے اس میں ان کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ چھوٹا سا آدمی اندر سے اتنا ہی بڑا تھا!

'شمیم! تم لان میں بیٹھو، میں آتا ہوں' جون نے ہم سے کہا۔ ہم ابھی لان تک پہنچے تھے کہ جون لمبے لمبے ڈگ بھرتا اور ہانپتا لپکتا ہمارے قریب آیا اور ہماری پینٹ کی جیب میں کچھ ٹھونسنے لگا۔ 'کیا ہے بھئی؟' ہم رُک کر بولے، وہ شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا۔ 'غلطی میری تھی، میں بھائی بچھن (محمد عباس) کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ تم نے کہانیوں کی درستی بھی کی ہے۔ یہ پیسے اس کے ہیں!'

'جون! تجھے تو میں مار ڈالوں۔' ہم نے یہ کہہ کر اسے گلے سے لگا لیا اور پھر بھائی رئیس کی طرف سے دعوت کا مژدہ سنایا تو وہ ہمارے ساتھ ہولیا۔ پھر اس روز کے بعد سے گویا کہانیاں لکھنا ہی ہمارا مقدر ہو گیا۔

نثر لکھنا بڑا ہی پتا مارو کام ہے، اس کے لیے بڑا وقت اور محنت درکار ہوتی ہے، سو مشاعرے چھوٹ گئے۔ ہم نے ڈائجسٹوں کی ادارت اور کہانیاں لکھنے ہی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ اس دوران میں ہم کئی اخبارات سے بھی متعلق رہے۔ پاکستان آکر ہمارا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں جون ایلیا کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ یہ ذکر مارچ 1968ء کا ہے۔ ہم الف لیلہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر تھے اور لیاقت آباد میں رہتے تھے۔ ایک روز جون وہاں آگئے اور ہم سے کہا کہ ہم عالمی ڈائجسٹ کے لیے کام کریں۔ ایک تو یہ کہ جون سے ہماری دوستی تھی، دوسرے یہ کہ عالمی ڈائجسٹ ہی سے ہم نے ڈائجسٹوں کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کی تھیں۔ ہم نے جون کی پیش کش قبول کر لی، یوں بھی جون کو اپنی بات منوانا آتی تھی۔ اس نے ہم سے کہا تھا۔ 'شمیم! تم پر میرا حق ہے' ہم نے اس کا یہ حق تسلیم کر لیا۔ جون ایلیا اور ہمارے درمیان 'تُو، تم اور آپ' سب چلتا تھا۔ اس کا انحصار ہم دونوں کے موڈ پر ہوتا تھا۔ ہم نے اسی لیے اپنے مضمون میں اس 'شتر گربائی' کو دانستہ روا رکھا ہے۔ جون ایلیا نے کیا ادبی و علمی کارنامے انجام دیے، سب پر ظاہر ہیں۔ انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کب

پیدا ہوا اس سے بھی اس کے شخص یا شاعر پر کوئی فرق نہیں پڑتا، ہمیں تو اس وقت بس ایک ہی واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک صاحب جو ہمارے اور جون کے مشترکہ دوست ہیں انھوں نے ایک بار کوئی اخبار نکالنے کا منصوبہ بنایا اور ہم سے سیاسی قطعہ نویسی کو کہا۔ اس ضمن میں انھوں نے جون ایلیا کا حوالہ دیا کہ انھوں نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔ 'آپ خود جون ایلیا سے اپنے اخبار کے لیے قطعہ کیوں نہیں لکھواتے؟' ہم نے ان صاحب سے سوال کیا۔ 'جون صاحب سے ہم نے کہا تھا، مگر وہ بولے کہ اگر شمیم میرے سینے پر پیر رکھ کر ایک سیڑھی اُوپر چڑھ جائے تو میں فوراً زمین پر لیٹ جاؤں گا'۔.... آج ہم سوچ رہے ہیں کہ وہ سینہ کہاں سے لائیں کہ جس پر پیر رکھ کر ایک سیڑھی اُوپر چڑھ سکیں؟ اس چھوٹے سے آدمی اور بڑے سے شاعر کو شہر والے مٹی میں دبا آئے اور ہم لاکھ چاہنے کے باوجود اس 'گیٹ ٹو گیدر' میں شریک نہ ہو پائے۔

حیرت اندر حیرت

صغیر ملال

مانا کہ بابِ سخن قیامت تک کھلا رہے گا اور مضمونِ تازہ کا راستہ کبھی بند نہیں ہوتا، لیکن کسی دن بابِ سخن کے اس جانب کھڑے ہو کر دیکھیے کہ شام تک کتنے مضامین تازہ وارد ہوتے ہیں۔ کسی پر تازہ ہونے کا گمان گزرے تو چھان پھٹک کیجیے گا، ممکن ہے عربی، فارسی کے سائے سے بچ نکلنے والا نورِ مغرب کے سہارے نمایاں ہونے کا جرم کرتے ہوئے پکڑا جائے۔ یوں تو سخن کے بازار میں ایک ہنگامہ بپا ہے۔ ایک ہاتھ سے ڈگڈگی بج رہی ہے، دوسرے ہاتھ کی تین انگلیوں سے وہ کام لیا جا رہا ہے جس کے لیے عام آدمی کو چھ انگلیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ 'بچہ جمہورا' تو مجمع اکٹھا کرنے کے لیے وہ راگ الاپے گا جس کے لیے اسے تیار کیا گیا ہے۔ (اور 'بچے جمہورے' خوب تیار کیے گئے ہیں) کسی سے شکایت کرو تو کندھے اچکا کر کہے گا۔ 'مگر ادب میں بالآخر انصاف ہو جاتا ہے۔' کوئی یہ نہیں سوچتا کہ انصاف میں تاخیر بہ ذاتِ خود بے انصافی ہے۔

کم از کم میں یگانہ جیسی ہوشیاری نہیں دکھا سکتا کہ زمانۂ مردہ پرست کی نظر میں معتبر ہونے کے لیے زندہ ہی گڑ جاؤں۔ باصلاحیت شخص کی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنا بخل ہے۔ ہر ادیب اپنے کیے پر فخر کرتا ہے، ہر شاعر داد طلب ہوتا ہے۔ زمانہ اگر انھیں ان کے حق سے محروم رکھتا ہے تو بخیلی کا ارتکاب کرتا ہے۔ 'قدر دانیِ عالم بالا معلوم شد' والی صورتِ حال بہت صبر آزما، نہایت مایوس کن اور انتہائی ستم انگیز ہوتی ہے۔ اچھا ادیب محض داد حاصل کرنے کے لیے نہیں لکھتا (داد حاصل کرنے کے لیے اس سے آسان طریقے موجود ہیں) مگر اچھا لکھنے کے بعد وہ یقیناً چاہتا ہے کہ اس کی تحریر پر سنجیدہ توجہ دی جائے اگر

ایسا نہ ہو تو شاعر کی جانب سے 'تفو بر تو.....' کی صدا بھی جائز ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ جون ایلیا کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے چند ایسے الفاظ دہرانے پڑیں گے جو'بے قدروں' کے ہاتھوں اپنی توقیر گنوا چکے ہیں۔ 'صوفی منش' 'ذات میں گم' 'بے نیازی و تیرہ' 'سرمستی شعار' 'دنیا داری میں سادہ لوحی کی انتہا' 'سود و زیاں کی فکر سے ماورا' یہ تمام باتیں ایسے لوگوں کے بارے میں کہی گئی ہیں اور اتنی مرتبہ کہی گئی ہیں کہ سنجیدہ مزاج قارئین نہ صرف یہ کہ ان باتوں سے چڑ گئے ہیں بل کہ اب ان خصوصیات کے حامل افراد کو بھی ٹیڑھی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ یعنی بے دردانہ اور بے دریغ استعمال نے ان بھاری الفاظ کو ان خطابات کی طرح مضحکہ خیز کر دیا ہے جو کائنات گیر معانی رکھنے کے باوجود کثرتِ استعمال سے بے معنی اور سپاٹ ہو جاتے ہیں۔

'ندیم الملک' 'شیخ المشائخ' 'قطب الاقطاب'..... آپ نے کتنے ناموں کے ساتھ یہ خطابات لگے دیکھے ہوں گے۔ میری دست بستہ عرض فقط اتنی ہے کہ تصوف کی کسی معیاری کتاب میں 'قطب الاقطاب' کے معنی اور خصوصیات دیکھنے کے بعد ان 'صاحبِ اسرار و رموز' کے حالاتِ زندگی غور سے پڑھ لیجیے جنھیں حاکمِ وقت نے اس خطاب سے نوازا تھا۔

کھرے کھوٹے کا سب احوال کھل جائے گا رانوں میں

لیکن جون ایلیا واقعتاً ایک شاعر ہے۔ اس کا اندازِ گفت گو، طرزِ فکر، نشست و برخاست حتیٰ کہ جسمانی ساخت بھی سو فی صد شاعرانہ ہے۔ میں نے اس کی روزمرہ باتوں میں ایسے فقرے سنے ہیں جو وزن میں ڈھال دیے جائیں تو درجہ اول کے اشعار میں شمار ہوں۔ اس کی بذلہ سنجی پر میں اکثر اس خوف سے نہیں ہنسا کہ اگر ایک مرتبہ ہنسنا شروع کر دیا تو نہ جانے کبھی رک بھی سکوں گا یا نہیں۔ اور جب اسے بے کیفی اور 'سیاہ سنجیدگی' کے عالم میں دیکھا تو ہفتوں چیزوں کو چھو کر یقین دلانا پڑا کہ دنیا حقیقت میں موجود ہے اور جون ایلیا کی باتیں بس برائے شعر گفتن خوب ہیں۔

اب بھلا کون جون ایلیا کے اس طرح کے اشعار میں ڈوب کر اپنے نارمل وجود کو سطح

پر تیرتی لاش میں تبدیل کر لے کہ۔

آ کہ جہانِ بے خبراں میں بے خبرانہ رقص کریں
خیرہ سرانہ شور مچائیں، خیرہ سرانہ رقص کریں

اور

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نئیں

ہمارے بزرگ دینوی دانش رکھتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو جون ایلیا جیسے لوگوں کی صحبت سے بچاتے تھے۔ یہی تو وہ لوگ ہوتے ہیں 'جو خیالی وادیوں میں سر مارتے پھرتے ہیں'۔

ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے جنگ ہار گیا۔ فتح مند بادشاہ نے شکست خوردہ حریف کو محل کے ستون سے باندھ دیا۔ جب اس کی ملکہ پابہ زنجیر اس کے سامنے سے گزری تو وہ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ملکہ کے بعد فتح کے نشے سے چور سپاہی اس کے بیٹوں اور بیٹیوں کو بالوں سے گھسیٹتے لے گئے، تب بھی اس کی آنکھیں خشک رہیں۔ لیکن کچھ دیر بعد جب اس نے دیکھا کہ اس کے غلام کے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں اور جیت جانے والے اسے بھی زدوکوب کرتے لے جا رہے ہیں تو اچانک وہ رونے لگا، چیخنے لگا اور اپنا سر ستون سے پٹخ پٹخ کر لہولہان ہو گیا۔

یہ قصہ آج تک مجھ پر پوری طرح واضح نہیں ہوا۔ لیکن جب بھی یہ واقعہ ذہن سے گزرا ہر مرتبہ محسوس ہوا کہ اس میں ان گنت پیغامات، معانی اور اشارے ہیں۔

اس واقعے کا معاملہ بھی 'شعر خوب' والا ہے کہ کوئی ایک واضح 'معنی نہ دارد' اور غور کرو تو ہزار ہا پریشان کن معانی دارد۔ جون ایلیا کے کئی اشعار نے بھی مجھے ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار کیا۔

یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے

نطشے نے اپنے زرتشت کی زبانی یہ بھی کہا کہ 'مجھے شاعروں سے نفرت ہے۔ وہ اپنے پانی کو گدلا کر دیتے ہیں تا کہ تہ اوجھل ہو جانے کے باعث وہ گہرے معلوم ہوں۔' لیکن جون ایلیا کے خیالات تو مٹیالے بھی نہیں۔ اس کے سلیس الفاظ کی شفاف سطح سے، تہ میں پڑی سیپیاں جھل مِل کرتی نظر آتی ہیں۔ مگر انھیں چھونے کی کوشش کرنے والا لذت اور اذیت کے طوفانوں سے گزرتا ہے۔ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟؟

ایک مرتبہ جون ایلیا نے کہا کہ 'لکھنا لکھانا دراصل غیر فطری کام ہے۔ اس لیے تمام باشعور ادیبوں کو لکھنے سے دست بردار ہو کر محض بولنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔' یہ سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ منطقی اعتبار سے اس کی بات درست تھی۔ بولنا فطری اور لکھنا غیر فطری ہے۔ ٹالسٹائی بھی 'جنگ و امن' جیسے ناول سے دنیا کو ششدر کرنے کے بعد کچھ اسی طرح کے خیالات میں ڈوب کر خاموش ہو گیا تھا۔ نہ صرف خاموش ہو گیا، بل کہ مصنف کی حیثیت سے گزری اپنی سابقہ 'غیر فطری' اور 'غیر اخلاقی' زندگی پر وہ شرمندگی بھی محسوس کرنے لگا تھا اور پھر دنیا نے ایک عظیم الشان ادیب کو آہستہ آہستہ مذہبیات کے استاد کی شکل اختیار کرتے دیکھا۔ اُردو ادب میں بھی ایسا ہی ایک حیران کن واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ 'حرام جادی' اور 'پھسلن' جیسے افسانوں کے خالق پروفیسر حسن عسکری آخری عمر میں محض اپنے انکسار کے سبب خود کو 'علمائے دین' کی صف میں شامل ہونے کا نا اہل قرار دیتے تھے۔ لیکن حسن عسکری پھر کبھی افسانہ نگاری کی جانب واپس نہ آ سکے اور ٹالسٹائی شام اور 'وہ' اس معاملے میں ذرا تیز ہی سہی۔

جون ایلیا کے اضطراب کی کیفیت بھی وہی ہے۔ وجود و عدم کی باریکیوں اور تہ داریوں پر چیخ اُٹھنے والی تمام روحیں ایک دوسرے کو 'یا اخی' کہہ کر گلے لگا لیتی ہیں۔ بلندی پر نفی و اثبات کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ گہرائی میں انکار اور اقرار ایک ہو جاتے ہیں۔ منکروں کی حیرت اور عارفوں کے سکتے میں فرق روا رکھنا کم نظری کی دلیل ہے۔ جون ایلیا منکر ہے، اس لیے دوسرے پہلو سے عارف ہے، اور عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

گئے گھر لوٹا بھی تو چند مختصر سی کہانیاں کہہ کر سو گیا۔ جب کہ جون ایلیا فلسفہ و دانش کے جھاگ اُڑاتا، بار بار کوچہ شعر سے گزرتا رہا۔ مگر اب کے ہوئی جو اُن سے ملاقات اور تھی۔ جون کی گفت گو میں علمیت زیادہ اور غزل اور وارفتگی کم ہوتی گئی اور اس کی شاعری کے مجھ جیسے مداحوں کی تعداد گھٹنے لگی۔

جون کی شاعری کو کیا ہوا؟

بہت سے لوگوں نے مجھ سے اور خود میں نے بہت سے لوگوں سے پوچھا۔

کیا وہ بساط اُلٹ گئی؟ ہاں وہ بساط اُلٹ گئی
کیا وہ جواں گزر گئے؟ ہاں وہ جواں گزر گئے

کاش جون ایلیا کی وہ آنکھ نہ کھلتی جو چیزوں کو اس قدر وسیع تناظر میں دیکھنے لگتی ہے کہ بالآخر دنیا و مافیہا بے معنی لگتی ہیں اور ایسی بے بنیاد کائنات میں ایک فرد کی ذات اور ایک فرد کی شاعری کی کیا حقیقت ہے۔ جون ایلیا نے کسی فلسفی کی طرح خود کو آخری حد تک بے بساط اور ناچیز دیکھا ہے۔ اگر وہ اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح آنکھیں بند کیے 'شاعرانہ تعلّی' کا شکار رہتا تو اب تک اس کے تین چار شعری مجموعے منظر پر آ چکے ہوتے اور اس کی درجنوں غزلیں ٹی وی اور ریڈیو سے بجائی، سنائی اور نچوائی جا چکی ہوتیں۔

'ہم وہ نہیں جو بزمِ طرب میں پیشہ ورانہ رقص کریں۔' تو اس کی سزا بھی بھگتو۔ اور جون ایلیا نے جون ایلیا ہونے کی خوب سزا بھگتی ہے۔ پچاس سال سے زائد کا ہو چکا تو پہلا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ اور مجموعہ بھی وہ کہ جس میں پہلے دور کی غزلیں عہد سازی کرتی نظر آتی ہیں۔ جب کہ دوسرے دور کی غزلیں محض استادی میں مصروف دکھائی دیتی ہیں۔ آخر علامہ اقبال کو بھی تو 'ضربِ کلیم' میں اپنے علم و فضل کی قیمت چکانی پڑی تھی۔

جو کچھ بھی ہے۔ آخری تجزیے میں کہنا پڑتا ہے کہ جون ایلیا کو اُردو ادب اس کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے یاد رکھے گا۔ کاش یوں ہو کہ کائناتوں کا رب ہمیں بھی اس مقامِ محمود سے نواز دے۔

عاشوق

طہیر نفسی

میں نے بھائی جون کو سب سے پہلے غالباً1945ء میں دیکھا تھا۔ وہ ایک مذہبی ڈرامے میں خلیفہ منصور عباسی کا رول ادا کر رہے تھے۔ اس وقت ان کی عمر غالباً چودہ یا پندرہ برس اور میری عمر گیارہ یا بارہ برس تھی۔ ان کی خوب صورتی اور وجاہت کے ساتھ ساتھ مشکل مکالموں کی شستہ، خوب صورت اور پروقار ادائی نے پہلی ہی جھلک میں میرا دل موہ لیا تھا۔ وہ ساتھی اداکاروں میں سب سے کم سن ہونے کے باوجود اپنی زبان دانی اور اداکارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے سب پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کا دبدبہ اور طنطنہ دیکھنے کے قابل تھا۔

پھر 1951ء میں سیّد المدارس میں ان سے تعارف ہوا۔ وہ وہاں عالم کی جماعت کے طالب علم تھے اور میں منشی کا۔ چند برسوں میں وہ بہت بدل چکے تھے۔ دیر تک بیٹھ کر پڑھنے، مشاعروں میں جاگنے اور کھانے میں بے احتیاطی کے باعث پیٹ کی بیماریوں نے انھیں بہت نحیف و لاغر بنا دیا تھا۔ میں اس وقت تک ان سے اور ان کے خاندانی پس منظر سے واقف ہو چکا تھا۔ علامہ شفیق حسن ایلیا، رئیس امروہوی، محمد تقی اور کمال امروہوی جیسے صاحبانِ فضل و کمال سے نسبت اور سیّد حسین جون اصغر جیسے منفرد نام کے علاوہ عربی، فارسی، فلسفہ اور منطق کے طالب علم اور مشکل پسند، زود گو اور قادر الکلام شاعر ہونے کی وجہ سے شہر میں ان کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ شہر کے بزرگ علما، فضلا اور شعرا بڑی شفقت اور بڑے اشتیاق کے ساتھ انھیں محفلوں میں خوش آمدید کہتے تھے۔ بعض بزرگ شعرا اُن سے خفیہ طور پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ شاعری، فلسفے اور زباں دانی میں امتیازی حیثیت رکھنے

کے باعث انگریزی اداروں میں تعلیم پانے والے مجھ جیسے نوجوان ان سے دوستی اور شناسائی کو فخر سمجھتے تھے۔ چناں چہ میں بھی پہلی ہی ملاقات میں بھائی جون کا گرویدہ ہوگیا۔ مجھے ان کی بیماری کی وجہ سے ان پر بڑا ترس آیا۔ اتنا ذہین اور قابل نوجوان ضائع ہو رہا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ وہ صبح کو میرے ساتھ ٹہلنے جایا کریں۔ اس طرح ان کی صحت بھی درست ہو جائے گی اور طبیعت بھی تروتازہ رہے گی۔

چناں چہ اس دن کے بعد سے صبح سویرے سائیکل پر ان کے گھر پہنچنا میرا معمول بن گیا۔ میں ان کو لے کر پیدل عموماً پنواڑی تالاب اور دادا شاہ ولایت کے مزار کے آس پاس یا سائیکل پر نتھے خاں کی مسجد اور بانکے کنوئیں تک میلوں دور لے جاتا تھا۔ پھر شامیں بھی پنواڑی تالاب پر گزرنے لگیں۔ ہم گھنٹوں پلیا پر بیٹھ کر نکلتے یا ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتے اور شاعری، فلسفے اور مذہب پر آزادانہ طور پر تبادلہ خیال اور بحث کیا کرتے۔ وہ اکثر میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتے اور میں ان کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کیا کرتا۔ وہ انتہا درجے کی قنوطیت اور نرگسیت میں مبتلا تھے۔ (اتفاق سے ان کی والدہ کا نام بھی نرجس تھا) شدید خود پرستی (Egoism or Self-Love) خود شعوری (Self-Consciousness) اور خودرحمی (Self-Pity) کے باعث وہ ہر شخص سے اپنے ناز اُٹھوانا چاہتے تھے اور جب لوگ ان کی توقع کے مطابق ان سے پیش نہیں آتے تھے تو ان پر کبھی غصے اور برہمی اور کبھی قنوطیت اور مردم بیزاری کے دورے پڑتے تھے۔

اتفاق سے وہ ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جو اگر چہ دولت مند نہ تھا مگر علم و فضل میں مشہور تھا۔ پرورش ناز و نعم سے ہوئی تھی، بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس لیے بھائیوں نے، شہر کے نوجوانوں نے، یہاں تک کہ بزرگوں نے بھی ناز برداریاں کر کے ان کو حقیقت پسند نہ بننے دیا۔ رہی سہی کسر کم سنی میں فلسفے کے مطالعے نے پوری کردی۔ وہ حقیقتاً 'اینگری ینگ مین' (خفا نوجوان) بن چکے تھے۔ وہ میر، فانی، یگانہ، ناصر، عرفی، بوعلی سینا، فارابی، ابنِ رشد، دیو جانس کلبی، شوپنہار، روسو، والٹیر اور نطشے سے بہت متاثر تھے۔ وہ نہ صرف مذہبی، معاشی، سماجی اور جنسی مسائل پر بے باکانہ اور باغیانہ انداز میں گفت گو کرتے تھے بل کہ موسم، دن رات اور چاند تاروں غرض کہ ہر شخص ہر بات اور ہر چیز پر سخت تنقید اور

برہمی کا اظہار کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی شدّتِ جذبات میں بچوں کی طرح رونے لگتے تھے اور میں بزرگوں کی طرح ان کو تسلیاں دیا کرتا تھا۔

میں ایک شریف اور متوسط خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والدین نہایت نیک، سادہ مگر خوددار تھے۔ مجھے خاندانی ورثے میں نہ دولت و شہرت ملی تھی نہ علم و فضل۔ نہ آگے بڑھنے کے لیے ہمت افزائی ملی تھی نہ رہ نمائی۔ صرف متجسس ذہن اور دردمند دل میرا کل سرمایۂ حیات تھا۔ شروع ہی سے نوجوانوں کے بجائے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے تحمل، بردباری اور سنجیدگی میرے مزاج کا خاصہ بن گئی تھی۔ طلسم ہوش ربا، فسانہ عجائب، توبۃ النصوح، نگار، ہمایوں اور آج کل کے مطالعے سے اُردو زبان پر مجھے عبور حاصل ہو چکا تھا۔ مولوی صفی مرتضٰی جیسے جید عالم سے عربی اور فارسی پڑھنے کی وجہ سے میں بھائی جون اور ان کے والد سے گفت گو کرنے کے قابل تھا۔ انگریزی، سائنس، ریاضی اور جغرافیے کی تعلیم نے میرے ذہن میں وسعت، معروضیت، حقیقت پسندی اور میانہ روی پیدا کر دی تھی۔ اسی لیے میں علمی معاملات میں نہ کبھی جذباتی ہوا نہ کسی سے مرعوب ہوا۔ میری فکر اعتدال کے ساتھ ارتقا کی راہ پر چلتی رہی۔ علامہ نیاز فتح پوری، مولانا علی نقی اور مولوی شفا احمد ادیم کی تحریروں نے مذہب، فلسفہ، نفسیات، اخلاقیات، جمالیات، جنسیات وغیرہ سے متعلق تمام اہم مسائل و موضوعات سے مجھے باخبر کر دیا تھا۔ اس لیے میں یقیناً بھائی جون کے اس وقت کے بیش تر دوستوں سے منفرد اور ممتاز تھا۔ میں مغربی اور مشرقی دونوں طرح کی تعلیم سے بہرہ مند تھا۔ جب کہ بھائی جون کے محلے اور برادری کے دوست صرف انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور آس پاس کے محلوں سے متعلق دوستوں کی اکثریت درزی، نان بائی، قصائی، کنجڑے اور عطار کے لڑکوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ بھائی جون سے غزلیں، سہرے، تقریریں اور مضمون لکھوانے یا اصلاح لینے کے لیے آتے تھے۔ ڈراموں مشاعروں، مقاصدوں، نعتیہ محفلوں، جلسوں، اور قوالیوں میں ان کو مہمانِ خصوصی اور صدر بناتے تھے۔ چائے، پان سگریٹ وغیرہ کا عادی بناتے اور ضرورت سے زیادہ خوشامد اور ناز برداریاں کر کے ان کا دماغ عرشِ معلّٰی پر پہنچاتے تھے۔ شہر کے معزز اور بزرگ حضرات کی تعریف اور ستایش نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔

میں نے بھائی جون کے قریب آتے ہی ان کی نگرانی شروع کر دی۔ ان کے والدین اور بزرگوں نے بھی مجھے سنجیدہ، مخلص اور قابل نوجوان سمجھتے ہوئے میری آمدورفت کو سراہا اور مجھے اس بات کا حق دے دیا کہ میں ان کے معاملات اور معمولات کو درست اور باقاعدہ بنانے کی کوشش کروں۔ چناں چہ میں ایک ناصح مشفق کی حیثیت سے نصیحتوں اور مشوروں کے ذریعے ان کو پُر اُمید، کام یاب اور حقیقت پسند انسان بننے کی ترغیب دینے اور موقع محل کے مطابق ان پر اعتراض اور تنقید بھی کرنے لگا۔ کئی بار میں نے ان سے سگریٹ چھین کر پیروں سے مسل ڈالے۔ بے ہودہ قسم کے دوستوں سے ملنے اور عام محفلوں میں جانے پر روک ٹوک کی۔

شروع میں بھائی جون نے میرے خلوص اور محبت کی قدر کی۔ میری جسارتوں کو برداشت کیا۔ منشی کے امتحان کی تیاری میں میری مدد کی۔ میری ذہانت، روشن فکری اور علمی و ادبی صلاحیتوں کو سراہا۔ مجھے دوسروں سے ممتاز اور بہتر سمجھا۔ کیوں کہ مذہب، فلسفے، تصوف خصوصاً الٰہیات کے مسائل پر ہم اکثر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں میرے چبھنے والے سوالات اور بے باکانہ تنقیدی جسارتوں پر تحمل اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ کبھی کبھی انگریزی مضامین کا مجھ سے ترجمہ کرواتے اور اپنی فلکیات کی کتاب کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ اور مدد بھی لیتے تھے کیوں کہ جغرافیے اور فلکیات کے سلسلے میں میرا مطالعہ اچھا خاصا تھا۔

بھائی جون سے میری دوستی بہت جلد محبت بل کہ عشق تک پہنچ گئی۔ ان کا نام سن کر میرا دل دھڑکنے لگتا اور ان کو دیکھ کر میری باچھیں کھل جاتی تھیں۔ میں ان کو اس طرح پکارتا کہ لوگ سمجھتے کہ میں انھیں 'بھائی جان' کہہ رہا ہوں۔ میں بھی اس زمانے میں شعر کہنے لگا تھا۔ چناں چہ میں ان کو محبوب کی حیثیت سے مخاطب کر کے یا ان کے تصور میں اشعار کہا کرتا تھا۔ (مگر میں ادبی ورثے سے محروم اور مزاجی لحاظ سے غیر جذباتی ہونے کی وجہ سے تیز تر اور اچھے اشعار نہ کہہ پاتا تھا۔ اسی لیے بھائی جون نے مجھے ہمیشہ نظم کے بجائے نثر لکھنے کا مشورہ دیا) میری ان سے والہانہ محبت کا میرے اور ان کے خاندانوں اور دوستوں میں چرچا ہونے لگا۔ ایک دو بے تکلف دوست بھائی جون کے حوالے سے مجھے چھیڑ چھاڑ

اور مذاق کا نشانہ بھی بنانے لگے۔ ایک بار بھائی قمر رضی نے بڑے خلوص سے مجھے سمجھایا بھی کہ اتنے دیوانے نہ بنو جون اپنی ذات کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ مگر میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ آگ اور پانی کا ساتھ نہیں ہو سکتا ان کی ذات و صفات سے بے پایاں محبت کرنے لگا تھا۔ مجھے ان میں کبھی بوعلی سینا اور ابنِ رشد کی جھلک نظر آتی تھی اور کبھی افلاطون اور ارسطو کی۔ میں ان کے والد ماجد کو جو اعلیٰ پائے کے مولوی اور شاعر ہونے کے علاوہ مذاہبِ عالم، فلکیات اور الٰہیات وغیرہ کے بحرالعلوم تھے، اکبر بادشاہ کے عہد کے شیخ مبارک، بھائی رئیس امروہوی کو ملا فیضی اور بھائی محمد تقی کو ابوالفضل کی طرح نابغۂ روزگار سمجھتا تھا۔ بھائی جون میں تینوں کی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ اس لیے میں ان سے ویسی ہی عقیدت رکھتا تھا جیسی حضرت علی علیہ السلام کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی یا حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔ بھائی جون اگر بھائی رئیس کی طرح خوش فکر اور زود گو شاعر تھے تو بھائی تقی کی طرح آزاد فکر اور وسیع النظر فلسفی بھی تھے۔ فلسفیانہ مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ اکیس سال کی عمر میں ہی انھوں نے فلسفے پر ایک کتابچہ لکھ ڈالا تھا جسے اپنے لاابالی پن اور بے پروائی کی وجہ سے انھوں نے شروع ہی میں ضائع کر دیا۔

شاعری کا ان کی، یہ عالم تھا کہ شہر کے مشاعروں، مقاصدوں اور شادیوں میں مختلف ناموں سے ان کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ جس زمانے میں کوئی مشاعرہ یا مقاصدہ منعقد ہوتا تو وہ مصحفی کی طرح مگر مفت اپنا کلام بانٹتے تھے۔ بہت سے غیر شاعر حضرات ان کی وجہ سے شاعر بنے ہوئے تھے۔ ایک بار میں نے ان کی زود گوئی کا امتحان لیا اور گھڑی رکھ کر شعر کہنے کے لیے کہا تو انھوں نے فی منٹ تقریباً چار شعر تک کہہ ڈالے۔ بسیار گوئی کے باوجود ان کو غالب کی طرح مشکل زبان اور پیچیدہ تراکیب استعمال کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اسی لیے بزرگ شعرا بھی ان سے متاثر اور مرعوب تھے۔ عربی اور فارسی زبان و ادب پر عبور اور شاعری کے وسیع مطالعے نے ان کو کم سنی ہی میں بڑا قادر الکلام اور مشکل پسند شاعر بنا دیا تھا۔

ذرا میں اکیس سال کے نوجوان شاعر کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ادائے جلوۂ ناظورۂ چمن کیا ہے
ورائے پردہ شمشاد و نسترن کیا ہے؟

نوا و نغمگیٔ مرغ زار کیا کہنا
مگر یہ طرزِ سکوت کوہ و دمن کیا ہے؟

انھیں سودا، غالب، بیدل، عرفی، امراء القیس اور متنبّی جیسے شاعر بہت پسند تھے۔ مقاصدوں کی محفلوں میں مانی جائسی اور جوش ملیح آبادی جیسے شعرا جب اس کم سن اور نوخیز شاعر کا پختہ اور اعلیٰ پائے کا کلام سنتے تو دنگ رہ جاتے تھے۔ مثلاً ایک قصیدہ اس مصرعے سے شروع ہوا۔

چہرہ مہروش ہے ایک زلف سیاہ فام دو

ایک اور قصیدے میں الفاظ کی قاآنی کی سی نغمگی اور شان وشوکت کے اندازے کے لیے یہ مصرع کافی ہے۔

بخشش ساقیٔ حرم، جرعہ بہ جرعہ دم بہ دم

غزل، قصیدہ، نظم، قطعہ، رباعی، سہرا، نوحہ، مرثیہ غرض ہر صنفِ سخن پر اُن کو یک ساں قدرت حاصل تھی۔ ایک پاگل عورت پر جوش کے انداز میں بڑی فکر انگیز نظم لکھی تھی، ایک شعر یاد رہ گیا۔

ایک دیوانی کھڑی تھی شاہ راہِ عام پر
ہنس رہی تھی عقل و ہوش و آگہی کے نام پر

تنہائی پر فیضؔ اور ن م راشدؔ کے رنگ میں ایک منفرد نظم کہی تھی، جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

جب شبِ زندگی کی تنہائی
در اور اک کھٹکھٹاتی ہے

غزلوں میں یاسیت اور قنوطیت کا رنگ غالب تھا جو میرؔ، فانیؔ، ناصرؔ اور مجازؔ سے مزاجی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا، تین اشعار یاد آرہے ہیں

غم کی گر چاشنی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی

آجاؤ کہ بحرِ ہستی کو اس طرح سے ہم تقسیم کریں
ساحل پہ تمھارا قبضہ ہو طوفان ہمارا ہو جائے

مذاقِ بزم کی سنجیدگی کا پاس کرو
یہ کیوں چراغ جلا کر بجھائے جاتے ہیں

ایک بار چہلم کے موقع پر ایسا نوحہ کہا جو پورے امروہہ شہر میں عرصے تک بچے بچے کی زبان پر رہا، اس کا پہلا مصرع یہ تھا۔

کہہ دو بشیر عابد بیمار آئے ہیں

ان کی قدرتِ کلام کا ایک اور منفرد نمونہ حکیم اچھو کا مرثیہ تھا۔ سوز و گداز اور زورِ بیان میں وہ اسی طرز کے اس مرثیے سے کسی طرح کم نہ تھا جو مولانا حالی نے مرزا غالب کی وفات پر کہا تھا۔

میں نے بھی بھائی جون سے ملنے سے پہلے ہی شاعری شروع کر دی تھی اور کبھی کبھی اپنے استاد مولوی صفی مرتضیٰ صاحب سے اصلاح بھی لیتا تھا مگر میری شاعری زیادہ تر پودوں، پھولوں، شمع، پروانوں اور کیڑوں کے بارے میں تھی۔ دو ایک غزلیں بھی کہی تھیں۔ طبیعت زیادہ موزوں اور رواں نہ تھی۔ اسی لیے بھائی جون نے شاعری کے سلسلے میں نہ صرف میری ہمت افزائی نہیں کی بل کہ قطعاً ممانعت کی مگر میں ان کی اور دوسرے شاعر دوستوں کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے شاعری سے باز نہیں آیا۔ دو ایک چیزوں کے علاوہ پھر میں نے ان کو کوئی چیز نہیں دکھائی۔ اگر چہ آہستہ آہستہ میری شاعری میں نکھار آتا گیا مگر میں اتنے بڑے شاعر کی صحبت اور دوستی کے باوجود اس کی اصلاح تو کیا صلاح سے بھی محروم رہا۔ ایک بار میں نے حضرت علی علیہ السلام کی ایک منقبت لکھی اور پہلی بار ایک مقاصدے میں مائکروفون پر پڑھی۔ مطلع تھا۔

زلف سیہ پیچاں ہیں دو اک اس طرف اک اس طرف
شیرازہ ایماں ہیں دو اک اس طرف اک اس طرف

ہر شعر پر خوب داد ملی۔ بھائی جون کے گھر گیا تو ان کے والد علامہ شفیق ایلیا صاحب

نے بہت تعریف کی اور کہا کہ 'میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ تم نے جون کا کلام پڑھا ہوگا تمھیں مقاصدے میں داد نہیں دی۔ مگر جب جون سے معلوم ہوا کہ تم نے ایک شعر بھی جون کو نہیں دکھایا اور سارا کلام تمھارا اپنا ہے تو میں حیران رہ گیا۔ ماشاءاللہ خوب کہتے ہو۔' بہ ہر حال آج تک میں بھائی جون کی نافرمانی کرر ہا ہوں۔ اسی لیے انھوں نے نہ مجھے کسی مشاعرے میں کلام پڑھنے کا موقع دیا اور نہ اپنے رسالے میں میرا کلام چھاپنا پسند کیا۔ یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ بھائی جون نے ہی میرا قلمی نام تجویز کیا۔ انھوں نے نفسیات کے حوالے سے مجھے نفسی کے نام سے لکھنے کا مشورہ دیا مگر میں نے اسے اپنا تخلص بنالیا۔ اگر بھائی جون میری شاعری کی مخالفت نہ کرتے تو میں بھی شاید آج ہندو پاکستان کا ایک نہایت مشہور و معروف شاعر ہوتا۔ اس زمانے کے صرف تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

نفسا نفسی کے دور میں نفسی
فکرِ نوعِ بشر نے مارا ہے

آہ وہ میں کہ نہ شرمندہ ہستی ہوتا
ہائے وہ ہوش اگر ہوش نہ آیا ہوتا

ہم کو تو راہِ عشق میں کھانی تھیں ٹھوکریں
کیوں تم نے راہِ عشق کو آساں بنادیا

بہ ہر حال حضرت رئیس امروہوی کے اس شعر کے مطابق کہ۔

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

دنیا والے اور بھائی جون دیکھیں گے کہ۔

میں بھی ایک خزانہ ہوں کھل ہی جائے گا اک دن
فکر و فن کی دنیا میں میں نے کیا کیا تنہا

چوں کہ بھائی جون نرگسیت کے مریض ہونے کی وجہ سے بے حد خود پسند بل کہ خود پرست تھے اسی لیے میں نے ان کے لیے 'عاشوق' کی اصطلاح وضع کی تھی۔ بہ ظاہر وہ بہت دوست نواز، رومان پسند اور عاشق مزاج تھے۔ ان کا مزاج واقعی لڑک پن سے عاشقانہ ہی تھا۔ میں نے بہت کم لوگ اتنے چاہنے اور چاہے جانے والے دیکھے ہیں۔ بلامبالغہ ان کے شناساؤں کی تعداد لاکھوں، دوستوں کی تعداد ہزاروں، یاروں کی تعداد سیکڑوں، عاشقوں کی تعداد درجنوں اور آشناؤں کی تعداد جوش ملیح آبادی کے آشناؤں سے کچھ زیادہ ہی ہے اور معشوقوں کی تعداد صفر یعنی وہ خود اپنے معشوق ہیں۔ بھائی جون کا عشق بڑا انوکھا اور طوفانی قسم کا ہوتا تھا۔ لڑکا ہو یا لڑکی ان کا عشق بڑی تیزی سے شروع ہوتا، ہمہ گیری کے ساتھ پروان چڑھتا اور اچانک غلط فہمیوں، بدگمانیوں اور الزام تراشیوں پر ختم ہو جاتا تھا۔ شہر کے لڑکوں کی طرح لڑکیاں بھی ان کی منفرد شخصیت اور دل نشین شاعری کی شیدائی تھیں۔ مشاعروں، مقاصدوں اور محفلوں میں دھوم مچانے اور پھبتیں اُڑانے والا یہ نوجوان جب گلیوں میں شیروانی کے بٹن کھولے، بال بکھرائے، کتاب کی ورق گردانی کرتا ہوا خاموشی سے گزرتا تو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن ہی جاتا تھا۔ بعض منچلی لڑکیاں بلاواسطہ یا بالواسطہ عشق کی حماقت بھی کر بیٹھتی تھیں۔ مگر وہ کسی سے عشق کے آداب نبھا نہیں سکتے تھے۔ صرف رومانی گفت گو اور شاعری تک ان کا عشق محدود رہتا تھا۔ وہ چوں کہ خود ہی اپنے عاشق تھے اس لیے وہ غالباً ایسی لڑکی کی جُست جو میں رہتے تھے جو ان سے ماں کی طرح محبت کرے۔ میں دوستی اور عشق کے معاملے میں ان کو بے وفا اور ہر جائی نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے کسی لڑکے یا لڑکی سے خاص مادی فائدہ یا جسمانی لذت حاصل نہیں کی۔ وہ محض بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح اپنی نامعلوم منزل کی جُست جو میں سرگرداں تھے۔ لوگ غلط فہمی سے ان کے گرویدہ اور دل دادہ ہو کر انھیں اپنا بنانا اور دوطرفہ محبت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار کسی نہ کسی موڑ پر کوئی نہ کوئی عذر اور بہانہ طرفین کو راستہ بدل لینے پر مجبور کر دیتا تھا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

اتفاق سے ان کی والدہ کچھ عرصے کے بعد غالباً 1953ء میں وفات پا گئیں۔ (میں نے ان کی وفات پر ایک چھوٹی سی مرثیہ نما نظم کہی تھی جسے انھوں نے بہت سراہا تھا)

والدہ کے انتقال نے ان کے دل و دماغ پر اتنا شدید اثر کیا کہ وہ جنون کی سرحد تک پہنچ گئے۔ نظریاتی طور پر غیر مذہبی تو وہ پہلے ہی تھے، اس سانحے کے بعد تو مذہب، روایات اور بزرگوں پر بے رحمی اور گستاخی کے ساتھ تنقید کرنے لگے۔ چوں کہ ان کے والد صاحب بہت ہی زیادہ مذہبی آدمی تھے اس لیے ان کی تلخ نوائی سے انھیں شدید صدمات پہنچے۔ غالباً اسی زمانے میں ایک ہندو دوست کیلاش نے انھیں شراب پلا دی۔ چوں کہ چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی، اسی لیے ایسی ہی بے اعتدالیوں کی وجہ سے ان کی صحت پھر خراب ہو گئی اور بالآخر وہ مستقل طورر پر بیمار رہنے لگے اور آج تک بیمار ہیں۔ میری مخلصانہ کوششوں سے جو بہتری شروع ہوئی تھی اس پر ان کی بے احتیاطی اور ان کے ہندو پاکستان کے دوستوں نے پانی پھیر دیا اور آج تک پھیر رہے ہیں۔ ان کو ان کی خود پرستی، خود رائی، خود شعوری، خود رحمی اور ان کے غیر ذمے دار اور غیر مخلص دوستوں نے برباد کر دیا ورنہ وہ بھی آدمی تھے کام کے۔

اسی جذباتی اور ہیجانی کیفیت کے زمانے میں انھوں نے ایک عجیب حرکت کی جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انھوں نے ایک دن چاقو سے اپنا بایاں انگوٹھا کاٹ کر چمچے میں خون بھرا اور آدھے صفحے پر مشتمل ایک خط میرے نام لکھ مارا۔ انھوں نے کیا سوچ کر مجھے خط لکھا میں نہیں سمجھا۔ مگر جیسے ہی وہ خط انھوں نے مجھے دیا میرے اندر دردمندی ہی نہیں بل کہ یک دردی (Empathy) کا جذبہ طوفان اور سیلاب کی طرح اُمنڈ پڑا۔ میں تھا سچا عاشق، عشق میں مرٹنا میرا ایمان ہے۔ میں نے سمجھا بھائی جون نے میرے لیے اپنی محبت کی شدّت کا اظہار کیا ہے۔ میں ان کے خلوص اور جذبۂ قربانی پر حیران رہ گیا۔ میں نے تہیہ کیا کہ میں بھائی جون کے خوں نامے کے جواب میں اس سے بھی بڑا اور اس سے بھی زیادہ خون آلود خط لکھوں گا۔ چناں چہ میں نے رات کو اپنا انگوٹھا ایک دم کاٹنے کی بجائے سوئی سے بائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو چھلنی کیا اور دبا دبا کر اس وقت تک خون سے خط لکھتا رہا جب تک کہ گھر کے لوگ نہ جاگ گئے اور میرا ہاتھ ٹھنڈا اور سُن نہ ہو گیا۔ میں نے کاپی کے چار صفحات پر باریک الفاظ میں لکھا ہوا خط دوسرے دن لے جا کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے جواب پر حیران رہ جائیں گے اور میرے خلوص اور

میری قربانی کے جذبے کی قدر کریں گے۔ وہ سمجھ لیں گے کہ اگر وہ میری طرف محبت کا ایک قدم بڑھائیں گے تو میں ان کی طرف دس قدم بڑھا سکتا ہوں۔ میں نے خط میں من تو شدم تو من شدی کے انداز میں انھیں اس طرح مخاطب کیا تھا جیسے میں اپنی ذات سے مخاطب ہوں۔ میں نے چاہا تھا کہ وہ اپنی ذات اور انا کے حصار سے نکل کر میری ذات کی آغوش میں آجائیں اور میرے حوالے سے پوری انسانیت کے عشق کے محیط بے کراں میں شناوری کریں۔ یا دوسرے الفاظ میں اپنے غمِ جاں سے نجات حاصل کر کے غمِ جاناں اور غمِ جہاں کی لذت سے آشنا ہو جائیں۔ جس طرح میں نے اپنے غم کو بھلا کر ان کے غم کو اپنا غم بنا لیا تھا اور ان کے ساتھ مل کر سارے انسانوں کو غم سے نجات دلانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ خط واقعی پریم بھگتی اور صوفیانہ رنگ میں رنگا ہوا ایک نادر شہ پارہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے خط کو چوم لیں گے اور سینے سے لگا لیں گے جیسا کہ میں نے کیا تھا۔ مگر صد حیف کہ انھوں نے شاید اسے بھی اپنی طرح کی احمقانہ اور فضول حرکت قرار دیا اور نہ صرف انھوں نے اپنا خط مجھ سے واپس لے کر ضائع کر دیا بل کہ میرے خط کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ کہیں گم ہو گیا۔ انھوں نے اسی طرح میری کئی نادر کتابیں یہاں تک کہ میرے والد کی قلمی بیاض بھی گم کر دی تھی۔ مجھے کتنا صدمہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ کچھ عرصے کے بعد یہ جان کر مجھے سب سے زیادہ صدمہ پہنچا کہ انھوں نے صرف مجھے ہی خون سے خط نہیں لکھا تھا بل کہ ایک نان بائی کے لڑکے خلیل الرحمٰن کو بھی لکھا تھا۔ خلیل الرحمٰن معمولی قسم اور درجے کا لڑکا تھا، وہ میرا بھی دوست تھا۔ وہ حقیقی اور صوفیانہ عشق سے کوسوں دور تھا مگر بے چارے بھائی جون اس کو مجھ سے زیادہ اپنا ہم درد سمجھ رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ بھائی جون اس سے میری بہت سی شکایتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس نے بھائی جون کا خون نامہ مجھے دکھایا اور ہنس کر ایک طرف ڈال دیا۔ بھائی جون میری اور دوسرے دوستوں کی وفا اور خلوص کا اندازہ نہ کر سکے۔

دراصل بھائی جون میرے خلوص و محبت کے اعتراف کے باوجود میری جا و بے جا نصیحتوں اور سخت نگرانی اور روک ٹوک سے پریشان بھی تھے۔ مجھے بھی احساس تھا کہ وہ اُٹّل خو اور سیماب طبع آدمی ہیں۔ ان کی عادتیں پختہ ہیں۔ بے پروائی اور غیر ذمے داری

ان کی سرشت ہے۔ مگر میں ان کے پاس آ کر اور سب کچھ دیکھ کر خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں پوری کوشش کرتا تھا کہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر ان کی مدد کروں مگر میں اس وقت ماہرِ نفسیات نہیں تھا (میں نے نفسیات میں ایم اے 1958ء میں کیا) اس لیے مجھ سے غلطیاں بھی ہوتی ہوں گی۔ اس کا اظہار کبھی کبھی بھائی جون فی البدیہہ اشعار کی صورت میں کرتے تھے۔ ایک بار بڑے پیار سے میری پھول دار قمیص دیکھ کر کہا۔

کسی کے جذبۂ یعقوب کی قسم اے دوست
تری قمیص نہیں ہے قمیصِ یوسف ہے

ایک بار میری نصیحتوں سے اکتا کر کہا۔

آپ لائے ہیں اک دلِ ساکن
مجھ کو سیماب کی ضرورت ہے

ایک اور بہت واضح قطعہ یوں تھا۔

سیّد طہیر نفسی ابرِ مطیر نفسی
جون ایلیا کے حق میں ہیں سخت گیر نفسی

ان کے خون نامے کے جواب میں لکھے جانے والے اپنے خون نامے کے سرد ردِ عمل اور اس کے بعد اس کو گم کر دینے والی حرکت نے مجھے بہت رنج پہنچایا۔ میں ان کی اصلاح اور ان کی محبت اور مستقبل کے مشترکہ منصوبوں کی طرف سے مایوس ہونے لگا۔ مگر میری کیفیت دو گیری یا دو دلی (Ambivalence) کی تھی۔ نہ تابِ وصل تھی نہ طاقت جدائی۔ بہ ہر کیف یہ دور چند مہینوں تک چلا۔ پھر 1954ء کے شروع میں، میں تعلیم اور ملازمت کی جُست جو میں علی گڑھ چلا گیا۔ اسی زمانے میں، میں نے ایک قطعہ کہا تھا۔

تو میرے پاس بھی ہے اور مجھ سے دُور بھی ہے
عجیب موڑ پہ لے آئی ہے ہمیں ہستی
نہ تیرا قرب گوارا ہے اور نہ تیرا ہجر
مجھے ہے تجھ سے محبت بھی اور نفرت بھی

1945ء سے 1958ء تک میں علی گڑھ میں زیرِ تعلیم رہا۔ اس دوران بھائی جون کبھی کبھی مشاعروں وغیرہ کے سلسلے میں علی گڑھ یونی ورسٹی آتے رہے مگر ہمارے درمیان فاصلے برابر بڑھتے رہے۔ میں تو ان سے مل کر پھولا نہ سماتا تھا اور فخر سے دوستوں پر یہ جتانا چاہتا تھا کہ بھائی جون سے میرا خصوصی تعلقِ خاطر ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا مگر وہ سب کے سامنے مجھے اپنا برخوردار ثابت کرنے کے لیے عجیب عجیب حرکتیں کرتے تھے۔ کبھی کوئی کتاب مجھے تھما دیتے، کبھی پانی لانے کی فرمائش کرتے اور کبھی سگریٹ وغیرہ لانے کے لیے محفل سے دُور بھیج دیتے۔ میں ان تحقیر آمیز حرکتوں پر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ مگر میں ان کی خیر خواہی سے پھر بھی باز نہ آتا تھا۔ ایک بار میں نے بازار سے سگریٹ کے بجائے ٹافیاں لا کر ان کے ہاتھ میں تھما دیں۔ ان کی جھنجھلاہٹ قابلِ دید تھی۔ احباب میرے خلوص، محبت اور نگرانی کے جذبے سے بہت محظوظ ہوئے۔

اسی طرح کے نرم و گرم اور تلخ و شیریں تعلقات 1958ء میں پاکستان آنے کے بعد بھی طویل عرصے تک باقی رہے۔ بھائی جون اب رئیس امروہوی اور محمد تقی صاحبان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ سے شاعری، ادب اور صحافت میں بھائی جون کو اپنے اظہار کے لیے تیار وسیع میدان اور ترقی کے امید افزا امکانات ملے، حلقۂ احباب ہزاروں تک پہنچ گیا اور وہ انشا جیسے ادبی پرچے کے مدیر کی حیثیت سے بہت جلد پاکستان کے آسمانِ ادب و شاعری پر ایک درخشندہ ستارہ بن کر جگمگانے لگے۔ ان تمام اچھی باتوں کے ساتھ سب سے بری بات یہ ہوئی کہ ان کی شراب نوشی بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ انھوں نے مجھ سے بھی اصرار کیا کہ میں صرف ایک قطرہ چکھ کر اپنے زہد و تقویٰ کا شیشہ چکنا چور کردوں اور اپنی آزاد خیالی اور روشن فکری کا ثبوت پیش کروں۔ مگر میرا نقطۂ نظر یہ رہا کہ میں عشق کے نشے کے آگے ہر نشے کو ہیچ سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ نشہ ہی اتنا سرشار رکھتا ہے کہ میں فلسفہ، نفسیات اور شاعری کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہوں۔ مجھے نیک اور شریف رہنے کے لیے معاشرے کی مروجہ قدروں کا احترام کرنا ہے۔ میں رندانہ اور مستانہ روش اپنا کر اپنی خاندانی شرافت اور نوعِ بشر کی عظمت کا علم بردار نہیں بن سکتا۔

میری ایک رباعی ہے۔

منظورِ نظر جس کا ہے دل بر کوئی
ہشیار نہیں اس کے برابر کوئی
گم ہے غمِ جاناں میں غمِ جان و جہاں
نشہ نہیں ہے عشق سے بڑھ کر کوئی

میرا اور بھائی جون کا اختلاف غیر ضروری، غیر مخلصانہ اور ظاہر دارانہ خوش اخلاقی، متلون، سطحی اور طوفانی قسم کی محبت اور غیر حقیقی قنوطیت، زندگی سے بیزاری اور مستقل شکوہ سنجی وغیرہ کے سلسلے میں بھی رہا۔ وہ ہر شخص سے بہ ظاہر اس طرح ملتے ہیں کہ وہ میری طرح غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ کچھ عرصے اس زعم میں مبتلا رہتا ہے کہ بھائی جون سب سے زیادہ اسی سے محبت کرتے ہیں اور وہ صرف اور صرف اسی کے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی کے بھی نہیں، شاید خود اپنے بھی نہیں۔ وہ خود شعوری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہر چیز کو اپنے ہی حوالے اور زاویے سے دیکھتے ہیں اور خود رحمی کی وجہ سے ہر شخص سے شاکی رہتے ہیں اور ہر شخص سے فریادی کی حیثیت سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ بلاوجہ کی چیخ پکار اور فضول ہائے واویلا ہے۔

جو اس زور سے میر روتا رہے گا
تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مگر الفاظ اتنے خوب صورت اور برمحل، تراکیب ایسی چست اور موزوں، تشبیہات و استعارات ایسے نادر اور اچھوتے اور لہجہ بیان ایسا دل نشیں اور سحر آفریں ہوتا ہے کہ میر کے 72 نشتروں کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ مشاعرے لوٹ لیتے ہیں مگر ان کے کلام میں کوئی واضح پیام نہیں ہوتا۔ وہ خود مسائل کا حل تلاش نہیں کرتے بل کہ چاہتے ہیں کہ کوئی اور حالات کو درست کر دے کوئی اور ان پر رحم کھائے، ان کے ناز اُٹھائے اور ان سے بے وفائی کرنے والوں کا منہ نوچ لے۔ جب کہ ہر شخص اس دور میں اپنے اپنے غم میں مبتلا اور اپنی اپنی جگہ حق بہ جانب ہے۔ وہ ہر شخص کو بے وفا ٹھیراتے ہیں جب کہ وہ خود اپنے آپ سے بھی وفا نہیں کرتے۔ میں نے بارہا انھیں سمجھایا کہ وہ اگر اپنی ذات کے غم سے نجات چاہتے ہیں تو کسی کو اپنا بنالیں یا کسی کے ہو جائیں، اپنی بجائے دوسرے کی ذات

سے سچی محبت کر کے دیکھیں، اس محبت میں جو لذت ہے اسے چکھیں اور اس طرح کڑھنے، جھینکنے اور چیخنے چلانے سے اپنے اور دوسروں کے دل کو غیر ضروری اور بے نتیجہ صدمے نہ پہنچائیں۔

ایک باران کی ایک غزل چھپی جس کا مطلع تھا۔

سینہ دہک رہا ہو تو کیا چپ رہے کوئی
کیوں چیخ چیخ کر نہ گلا چھیل لے کوئی

مجھے اس غزل کے لہجے نے بہت متاثر کیا، میں تڑپ گیا۔ وہ مجھے زمین پر ایڑیاں رگڑ کر بچے کی طرح روتے دکھائی دیے۔ میں نے اس غزل کے جواب میں ایک طویل غزل لکھی جس کا مطلع تھا۔

کیوں اپنے غم کی آگ میں جلتا رہے کوئی
بہتر ہے دوسروں کے لیے بھی مرے کوئی

میری یہ طویل غزل صرف دوستانہ مشورے کے طور پر لکھی گئی تھی۔ شاعرانہ چیلنج اور درجواب آں غزل نہ تھی۔ وہ بہ ہر حال شاعری کے پوری طرح نہ سہی مگر عربی اور فارسی کے مکمل طور پر میرے استاد ہیں۔ میں ان سے شاعری میں صرف اسی طرح اصلاح لے سکا جس طرح وہ مجھ سے برائے نام انگریزی سیکھ سکے۔ مجھے اس کا بھی بالکل اعتراف ہے کہ ان کی غزل کے مقابلے میں میری غزل ایسی ہی تھی جیسے غالب کی غزل کے سامنے حالی کی غزل۔ اگر وہ میرے جذبے کی سچائی پر غور کرتے تو میری غزل کی اصلاح کر سکتے تھے۔ انھوں نے میری پوری غزل سن کر کوئی خاص ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ میں نے سمجھا شاید ٹھیک ہی ہے۔ چناں چہ نبی باغ کالج کے مشاعرے میں جب میں نے یہ غزل پڑھی تو مجھے ناقابلِ فراموش ہوٹنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ انتہا یہ ہے کہ میرے اس قطعے پر بھی ہوٹنگ کی گئی اور اس ہوٹنگ میں ایک کم نگاہ شخص پیش پیش تھا جو اس قطعے میں مضمر اپنے ممدوح پر تنقید برداشت نہ کر سکا۔

آزادیِ افکار چراغِ رہِ عرفاں
پابندیِ افکار فقط پنجۂ بیداد

آزادیٔ افکار براہیم کا شیوہ
پابندیٔ افکار ہے نمرود کی ایجاد

اس نے اس قطعے کو کانا قطعہ قرار دیا تھا۔ حالاں کہ ہر مصرع بے عیب ہے۔ بھائی جون نے مشاعرے کے بعد بھی میرے ساتھ اظہارِ ہم دردی نہیں کیا۔ اس صدمے کے بعد میں نے جو غزل کہی اس کے چند اشعار یہ تھے۔

اب ذکرِ غیر سے مجھے نفرت نہیں رہی
شاید اب آپ سے مجھے الفت نہیں رہی

پھولوں سے کیں جو تو نے بھی سر کی ضیافتیں
تیری گلی میں جانے کی عادت نہیں رہی

یادوں سے بے وفاؤں کی دل پاک ہو گیا
اس بت کدے میں اب کوئی مورت نہیں رہی

نوعِ بشر کے درد سے جب آشنا ہوئے
تیرے لیے تڑپنے کی فرصت نہیں رہی

اس غزل کے بعد میں نے بھائی جون کے لیے اپنے دل کے نہاں خانے میں ایک گوشہ مخصوص کر دیا کہ اگر ان کا دل چاہے تو آ کر قیام کریں ورنہ وہ جانیں اور ان کا کام۔ اس کے بعد ان کے رویے میں بھی کوئی بہتر تبدیلی نہیں آئی۔ اب تک دونوں طرف یہی کیفیت ہے کہ۔

تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک

وہ مجھ سے سرسری طور پر ملتے ہیں جب کہ بھائی رئیس اور بھائی تقی کے ساتھ گھنٹوں علمی ادبی گفت گو ہوتی رہتی ہے۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ اگر چہ بھائی جون خود غرض، بے وفا اور ہرجائی نہیں ہیں (کیوں کہ وہ خود کسی سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں حاصل کرتے نہ خود کسی

کو فائدہ پہنچاتے ہیں) لیکن اپنی خود پرستی، خود شعوری اور خود رحمی کے باعث وہ اپنا اور دوسروں کا دل توڑتے رہیں گے۔ حسنِ اتفاق یا سوئے اتفاق سے ان میں اتنا حوصلہ بھی ہے کہ وہ اپنی جان کونت نئے روگ لگائے رکھیں اور ان کی شخصیت اور شاعری میں اتنی مقناطیسیت بھی ہے کہ نئے نئے لوگ ان کی زلفِ دراز و پریشاں کے اسیر ہوتے رہیں اور اپنے اپنے حصے کے غم لے کر ان کی زندگی کی شاہ راہ کی دونوں طرف قطار بنا کر کھڑے ہوتے رہیں۔

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

بہت سی اعلیٰ خاندانوں کی قابل، خوش ذوق اور حسین لڑکیوں نے ان سے غالبًا میری ہی طرح محبت کی مگر وہ لباس کی طرح محبتیں بدلتے رہے۔ اگر چہ فارہہ سے عشق کے سلسلے میں وہ واقعی بہت سنجیدہ تھے۔ ان کی نظمیں اس کی گواہ ہیں مگر ان کا اس کھلونے پر مچلنا غلط تھا۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ اچھا ہی ہوا جو وہ انھیں نہ ملی ورنہ انھیں اور اسے زہر پینا پڑتا۔ چناں چہ بھائی جون فارہہ کو بھی حسبِ معمول بھول گئے۔ وہ قیس و فرہاد نہیں ہیں۔ انھیں حضرت یوسف اور کرشن جی سے کسی حد تک تشبیہ دی جا سکتی ہے مگر وہ حضرات بھی کسی نہ کسی طرح کسی ایک کے ضرور ہو کر رہے۔ بہ ہر حال میں بھائی جون کو اکثر مشورہ دیتا رہا کہ وہ حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھ لیں اور اپنے وجود کی لگام کو ڈھیلا چھوڑ دیں، کوئی نہ کوئی آ کر انھیں سنبھال ہی لے گا ورنہ خوب سے خوب تر کی جُست جو میں زندگی برباد اور تمام ہو جائے گی۔

آخر کار مہاتما گوتم بدھ کے دیس کی ایک پری نے اس 'گنگارام' کا دل جیت ہی لیا۔ ان کے انتخاب پر سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے موصوفہ کے انتخاب کے سلسلے میں مجھ سے بھی مشورہ لیا تھا۔ میں نے کچھ اندیشوں کے ساتھ ان کو اپنی کشتی اس شاداب اور خاصی حد تک محفوظ ساحل پر لنگر انداز کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ میں زاہدہ حنا کی تمام کیفی اور کمی خوبیوں کا تو معترف تھا مگر مجھے خود بھائی جون پر ان کے مزاج کی نزاکتوں اور تلون پذیریوں کی وجہ سے بھروسا نہیں تھا۔ ان کے اندر ایک ضدی بچے کو بیوی کے روپ

میں ایک ماں کی ضرورت تھی۔ یعنی ایسی عورت کی جو اس بکھرے ہوئے باصلاحیت، ذہین اور فطین شخص کو سمیٹ لے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ان کی لیڈی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی لیڈی سیکریٹری کے فرائض بھی انجام دے سکے۔ خوش قسمتی سے زاہدہ حنا میں دونوں قسم کی صلاحیتیں تھیں۔ اسی لیے میں نے انھیں شادی کے تحفے کے طور پر لکڑی کا ایک خوب صورت چمچہ پیش کیا تھا۔ تمام نشیب و فراز اور تلخ و شیریں سے قطع نظر یہ شادی کام یاب رہی۔ بھائی جون نے زندگی کے اسٹیج پر ایک کافی حد تک گوارا شوہر اور بہتر باپ کا رول ادا کیا اور کر رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ شاد و آباد رہیں۔ زاہدہ کو چمچہ تحفے میں دینے کے پسِ پردہ میرا جذبۂ رقابت بھی کارفرما تھا کیوں کہ انھوں نے بہ ہر حال میرے محبوب کو چھین لیا تھا۔ بھائی جون بہ ظاہر مجھ سے خوش قسمت رہے کہ انھیں اپنی پُر شور طبیعت کے باوجود ساحل مل گیا اور میری پُرسکون طبیعت کے حصے میں طوفان آیا۔

جون ایلیا کی شاعری

ظفر اقبال

تنقید، تخلیقی عمل میں عام طور پر شمار نہیں ہوتی جب کہ شعر کی تنقید جہاں ناممکن ہے وہاں غیر ضروری بھی ہے کہ یہ اس کے اسکوپ اور معانی کو زیادہ تر محدود ہی کرنے کا کام کرتی ہے کیوں کہ شعر بنیادی طور پر سمجھنے یعنی مکمل طور پر سمجھنے کی چیز ہی نہیں ہوتی کہ اس سے تو صرف لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی سوچ کی لہروں میں ہلکا سا تموّج پیدا کر دے اور بس، شاعری سے انقلاب تو ہرگز نہیں لایا جا سکتا جب کہ اس مقصد کے لیے اب تک کی گئی ساری کی ساری شاعری رائگاں ہی سمجھیے۔ نیز شعر کی عمدگی کا انحصار محض اس بات پر ہی نہیں ہے کہ وہ آپ کے سینے میں تیر کی طرح آ لگے بل کہ آپ کے پاس سے چھو کر یا چھوئے بغیر ہی گزر جانے والا شعر بھی عمدہ ہو سکتا ہے۔

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ پچیس برس تک مسلسل لکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہرگز نہیں ہے لیکن اس وقت تک میں اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے ہاں اکثریت ایسے ہی شعرائے کرام کی ہے بل کہ اس پر بھی مستزاد یہ کہ انھیں پچیس برس تک لکھنے کے بعد بھی اس بات کا احساس و ادراک تک نہیں ہوتا کہ وہ اب تک لکھنے کی صلاحیت کے بغیر ہی لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن وہ اس کے باوجود نہ صرف دیوان پر دیوان چھپوائے چلے جاتے ہیں بل کہ وہ دیوان بازار میں بکتے بھی ہیں۔ حتیٰ کہ ان قابلِ رحم مصنفین کو بامِ شہرت تک پہنچانے کے لیے پیشہ ور ناقدین کے ایسے گروہ بھی موجود ہوتے ہیں جو محض اپنی لابی بنانے کی دھن میں یہ کارِ خیر عمر بھر انجام دیتے ہیں اور اس طرح اپنے اثبات کی کوشش بھی کرتے ہیں اور یہ کام وہ اس تسلسل اور تکرار کے ساتھ سر انجام دیتے ہیں کہ

اکثر لوگ تنگ آ کر ان کے آگے سرِ تسلیم خم بھی کر دیتے ہیں۔

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ بازارِ سیاست اور بازارِ ادب میں ایک ہی جیسا کام ہو رہا ہے اور کام یابی اہلیت کی بنیاد پر کم اور وسائل کی بہ دولت زیادہ حاصل کی جاتی ہے یعنی سیاست کی طرح ادب میں بھی معیار بالآخر یہی ٹھیرتا ہے کہ آپ کے حامی کتنے ہیں؟ اور سخن فہمی کی بجائے غالب کی طرف داری ہی فیصلہ کن کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ نیز سیاست کی طرح ادب میں بھی اگر جماعتیں نہیں تو گروپ اور دھڑے ضرور موجود ہیں اور اپنے اپنے جرائد اور نقاد بھی، جن کا کام اپنے دھڑے کے نااہل اور ماٹھے لکھنے والوں کو دوسرے دھڑے کے ایسے ہی بوگس ادیبوں سے بڑھا چڑھا کر قارئین کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔ چناں چہ سیاست کی طرح ادب بھی باقاعدہ کاروبار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس میں نفع و نقصان کا نہ صرف باقاعدہ حساب کتاب رکھا جاتا ہے بل کہ سال بہ سال اس کی بیلنس شیٹ بھی تیار کی جاتی ہے تاکہ اپنی اور مخالفین کی کارکردگی پر بھی نظر رکھی جا سکے۔ اس صورتِ حال میں دھڑے بازی کے اس شیطانی چکر سے باہر نکل کر یا اس سے لاتعلق ہو کر شعر و ادب میں ملوث ہونا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل بل کہ بے وقوفی کا کام لگتا ہے اور ان بے وقوفوں میں جون ایلیا کا شمار بھی کیا جا سکتا ہے، بھلے ہی وہ اپنے آپ کو بہت عقل مند بھی سمجھتے ہوں۔

میں نے ایک جگہ عرض کیا تھا کہ جس شاعر کی فارسی جتنی کم زور ہوگی اس کی شاعری بھی اتنی ہی کم زور ہوگی۔ شاید اسی لیے ن۔م راشد کی شاعری فیض احمد فیض کی شاعری سے زیادہ توانا اور مضبوط نظر آتی ہے جب کہ فیض میں زبان و بیان اور گرامر وغیرہ کی غلطیاں بھی جا بہ جا ملتی ہیں۔ اس سے میرا عرض کرنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ شاعری کو مرصع اور صنائع و بدائع سے بھرپور ہی ہونا چاہیے بل کہ میں گوش گزار یہ کرنا چاہتا ہوں کہ قدرتِ کلام کے بغیر ندرتِ بیان پیدا نہیں ہو سکتی۔ فارسی پر زور اس لیے بھی نہیں کہ غزل کی ہماری روایت فارسی سے ہم تک پہنچی ہے بل کہ فارسی ایک لحاظ سے اُردو شاعری کی ماں بھی ہے اور اسے کافی حد تک جانے بغیر وہ معجزہ شعر برپا کیا ہی نہیں جا سکتا جو شعر کہنے کا جواز بن سکتا ہو، کیوں کہ شعر گوئی میں بنیادی کردار زبان ہی ادا کرتی ہے کہ کیسے الفاظ کو شعر میں کس طرح باندھا یا استعمال کیا گیا ہے کہ یہی سلیقہ اور قرینہ ہی ناشاعری کو شاعری بنانے پر قادر ہو سکتا ہے، جب کہ سہلِ ممتنع بھی آپ کو زیادہ دُور تک نہیں لے جا سکتا، حتیٰ کہ سہلِ ممتنع کا مطلب بھی ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ فارسی زبان سے

نابلد ہوتے ہوئے بھی سہلِ ممتنع کے ضمن میں کوئی خاص جوہر دکھا سکتے ہیں۔

بہ ہر حال، عرض میں یہی کرنا چاہتا ہوں کہ جون ایلیا کی ندرتِ کلام ان کی قادر الکلامی کی بھی مرہونِ منت ہے کہ شاعری جو بنیادی طور پر حسن سازی ہی ہے اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آپ زبان کے جملہ اسرار و رموز سے پوری طرح ہتھیار بند نہ ہوں۔ کیوں کہ جدت، تنوع اور ایجاد و اختراع کو شعری سانچے میں ڈھالنے کے لیے بھی زبان کے بارے میں معقول علم رکھنا از بس ضروری ہے۔ اگرچہ اگلا مرحلہ سخت تر ہے کہ آپ اس زبان کو استعمال کس ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ جس کے لیے بنیادی شرط زبان کا صحیح معنوں میں محرم راز ہونا ہی ہے جب کہ شعر کے لیے الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب ہی اصل حقیقت ہے اور باقی سب کہانیاں، اور یہی چیز شعر کو نثر سے الگ اور ممتاز کرتی یا کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ الفاظ کی ترتیب ہی آپ کی ندرتِ طبع کا بھی پتا دیتی ہے کیوں کہ مسئلہ شاعری میں اعلیٰ مضامین باندھنا نہیں ہے کہ یہ تو کم و بیش سب کے سب باندھے ہی جا چکے ہیں۔ اصل کام تو ان مضامین کو نئے انداز و اسلوب سے اس طرح پیش کرنا ہے کہ یہ بالکل نئے لگنے لگیں۔ نہ صرف یہ بل کہ الفاظ کے انتخاب و ترتیب کی ایک معجزانہ صورت ایسی بھی ہوتی یا ہو سکتی ہے جو اعلیٰ و عمدہ مضمون کی دست نگر نہیں رہتی اور بجائے خود شعری حسن کی ایک انتہائی شکل بن کر وجود میں آتی ہے۔

جون ایلیا نہ تو کسی اسلوبِ خاص کا موجد ہے اور نہ ہی کسی نئے لہجے کا خالق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی انفرادیت وہ مکمل پن ہے جو بہت کم لوگوں کو ارزانی ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں کسی محنت یا تردّد کا بھی سراغ نہیں ملتا بل کہ لگتا ہے کہ یہ غزلیں اس نے بس ایسے ہی لکھ دی ہیں، لیکن جو الفاظ وہ زیرِ استعمال لاتا ہے ان پر اس کی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ ناشاعروں کے اس ہجوم میں ایک شاعر کی آمد آمد صاف دکھائی اور سنائی دیتی ہے۔ پھر اس نے بعض لفظوں کے پرانے تشخص کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے اور اس طرح ایک نئے اور عجیب ہی ذائقے کا اضافہ کر کے دکھایا ہے، یہ اشعار دیکھیے۔

محبت کچھ نہ تھی جز بدحواسی
کہ وہ بندِ قبا ہم سے کھلا تھیں

ہیں سب اک دوسرے کی جست جو میں
مگر کوئی کسی کو بھی ملا تھیں

جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزارے تھے
وہ صبح و شام تو جیسے فسانے ہو گئے ہیں
ہمارے بعد جو آئیں انھیں مبارک ہو
جہاں تھے کنج وہاں کارخانے ہو گئے ہیں

ان اشعار میں یعنی ردیف میں نہیں اور گئے کو ان کے معمول کے اوزان میں نہیں باندھا گیا جب کہ موجودہ اوزان پنجابی کے ہیں جو ابتداءً اُردو میں بھی مستعمل تھے۔ اس سے جون ایلیا کی خلاقانہ صلاحیت اور جرأتِ رندانہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بہ ہر حال جون کا عمومی انداز یہ ہے۔

جانے کیا واقعہ ہوا کیوں لوگ
اپنے اندر نہیں رہے آباد

تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہو غالباً
میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا

ہیں دلیلیں ترے خلاف مگر
سوچتا ہوں تری حمایت میں

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

تھے عجب دھیان کے در و دیوار
گرتے گرتے بھی اپنے دھیان میں تھے

ہم نے رنجش میں یہ نہیں سوچا
کچھ سخن تو زباں کے تھے ہی نہیں

دل نے ڈالا تھا درمیاں جن کو
لوگ وہ درمیاں کے تھے ہی نہیں

جون ایلیا

ظہیر کاشمیری

ابنِ آدم نے جب اس کرۂ ارض پر پہلے پہل قدم رکھا تو اس نے اپنی کارکردگی کا آغاز لفظ 'شاید' سے ہی کیا ہوگا۔ لفظ 'شاید' کے بطن سے تشکک اور گمان پیدا ہوئے، جو تجسس، تحقیق اور تخلیق کا باعث ہے اور انسانی معاشروں کے ارتقا کی بنیاد قرار پائے۔

جون ایلیا کی شاعری میں لفظ 'شاید' کی استفہامیہ معنویت ہی مرکزی موضوع ہے۔ موجود اور ناموجود کے مسئلے سے لے کر انفرادی احساسات کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک میں ایک فکری تجسس نظر آتا ہے۔ نظموں اور غزلوں کی بنت میں جو تانا بانا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ داخلی اور خارجی مشاہدوں کے رنگین دھاگوں سے تیار ہوا ہے اور ذات و کائنات کے سفر میں جو احساسی منزلیں آتی ہیں، انھیں شعوری گہرائی اور گیرائی سے پیش کیا گیا ہے۔

جون ایلیا کے ہاں فکری ہیولے تجرید یا تعطیل کا ہی پتا نہیں دیتے، بل کہ اس نے اپنے خیال واحساس کو تجسیم اور تشبیہ کا جامہ پہنا کر اپنی جمال شناسی کا ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے، زندہ اور تازہ امیجز کے استعمال سے پیکر تراشی کے دل کش نمونے پیش کیے ہیں۔ اس کی غزل کلاسیکی انداز کے علاوہ جدید اسلوب کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس کی قدرتِ اظہار مختصر اور طویل بحروں میں یک ساں طور پر رواں دواں نظر آتی ہے اور اس نے غزل کی تنگنائے میں ہر قسم کے فکری بجرے چھوڑ کر اسے وسیع تر بنانے کی سعی کی ہے۔

آب خورے میں اسکاچ

عارف امام

جون ایلیا تشکیک کے خمیر سے یقین کی شراب کشید کرتا ہے اور رات بھر عالمِ گریہ میں قطرہ قطرہ اپنے نزار جسم کی نحیف رگوں میں اُتارتا رہتا ہے۔
(شراب کے گلاس میں اگر چار قطرے آنسوؤں کے ملا دیے جائیں تو کیسا لگتا ہے؟)
وہ ناراض لہجے میں بے تکان گفت گو کرتا ہے اور اس کے اندر کی بے کراں خاموشی پس منظر میں کھنکھناتی رہتی ہے۔
وہ ہنستا ہے اور اس کی دھونکتی ہوئی پسلیوں کے پیچھے چھپے ہوئے لامحدود خالی اندروں سے گردشِ سیارگاں کی آواز سنائی دیتی ہے اور خدا درمیان سے نکل جاتا ہے۔
وہ فیصلے کے صحرا میں بجھے ہوئے دل اور سلگتے ہوئے تلووں کے ساتھ مجذوبانہ دوڑتا ہے کہ تلووں کی آگ وہ اپنے آنسوؤں سے نہیں بجھا سکتا۔
کیا آپ نے کبھی آب خورے میں اسکاچ وِسکی پی ہے؟

شاعری کا نفسِ امارہ

عالم تاب تشنہ

جون کو ہم بتیس تینتیس سال سے جانتے ہیں ہم دونوں نے اچھے دنوں میں ساتھ مشاعرے پڑھے ہیں۔ وہ عمر میں صرف چار پانچ سال بڑا ہے لیکن شعری عمر میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ اس لیے بھی ہے کہ وہ صرف شاعر ہے نرا شاعر، اور ہم بہ قول جون ہی کے کماؤ پوت بھی ہیں۔ اور کماؤ پوت تو وہ بیل ہوتا ہے جو کولہو میں جت کر عمر بھر معاش کے دائرے میں گھومتا رہتا ہے اور اس دائرے کے سفر پر ہی اس کو منزلیں مار لینے کا زعم رہتا ہے۔ ہماری ہی کسی غزل کا ایک شعر ہے۔

محروم پیش رفت رہے ہم سے خوش خرام
دشتِ جہاں میں اپنا سفر دائرے کا تھا

لیکن جون نے دائرے میں کبھی سفر نہیں کیا اور وہ کر بھی نہیں سکتا کہ دائروں کا سفر تو مصلحت کوشی کی علامت ہے۔ زندگی کے معاملات میں جون کم از کم مصلحت کوش نہیں۔ وہ تو ان معاملات میں بالکل کورا ہے۔ زندگی کے رموز و آداب سے نابلد ہونے کے باوجود شاعری میں نہایت معاملہ فہم، چوکس اور حساس ہے۔ مجال ہے کوئی چوک ہو جائے یا کوئی شاعر اسے جل دے کر نکل جائے۔ گویا یہ بہ ظاہر دیوانہ سا شخص شاعری کے معاملے میں نہایت فرزانہ ہے اور شاید زندگی کی اس دیوانگی نے اسے شاعری میں یہ فرزانگی عطا کی ہے، 'شاید'۔

ہماری جون سے پہلی ملاقات مظفر نگر کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ کڑاکے کی سردیوں کے دن تھے۔ سامعین مع لحاف اور حقوں کے پنڈال میں کھچا کچ بھرے ہوئے

تھے۔ ہندوستان کا ہر قابلِ ذکر شاعر وہاں موجود تھا۔ علامہ انور صابری مرحوم اس مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے۔ صابری صاحب شاعر کو زحمتِ کلام دینے سے قبل اس کا شعر اپنے پاٹ دار اور خوب صورت ترنم میں پڑھتے اس کے بعد شاعر کا جو حشر ہونا ہوتا وہ ہو جاتا۔ لیکن وہاں بھی جون نے اپنے جملوں کا کمال دکھایا۔ پہلے مسکرا کر مجمع پر نظر ڈالی اور مناسب جملے پھینک کر انور صابری صاحب کے ترنم کا اثر زائل کیا اور اس کے بعد اپنے مخصوص والہانہ تحت اللفظ میں رومان پرور واردات اشعار سنانے شروع کر دیے۔ کڑاکے کی سردیوں میں گرمی کا احساس ہونے لگا۔ سامعین لحاف اور حقے بھول کر جون کی شاعری کا لطف لینے لگے۔ مشاعرہ صبح چار بجے ختم ہوا۔ یہ جون سے ہمارا پہلا تعارف تھا۔ مشاعرے کے بعد ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے اس نے ہم پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو دیکھا میرا کمال، ہم نے اس کی شاعری کی داد دی۔ اس نے بھی از راہِ تکلف ہمیں سراہا گویا ہماری حوصلہ افزائی کر رہا ہو۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ منتظمین نے ناشتے کا مژدہ سنایا۔ جون بولا یار یہ لوگ کھانے پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں۔ گویا کھانا جون کا مسئلہ کبھی نہیں رہا، پوت کے معدے نے پالنے میں ہی پاؤں سکیڑ لیے تھے سو آج تک یہ پاؤں سکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اور کئی مشاعروں میں جون سے ملاقات ہوئی جس میں علی گڑھ یونی ورسٹی کا مشاعرہ قابلِ ذکر ہے۔ اس مشاعرے کی صدارت حضرت جگر مراد آبادی فرما رہے تھے اور اسی مشاعرے میں جگر صاحب نے اپنی مشہور غزل 'میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے' پڑھی تھی۔ اس مشاعرے کی نظامت کے فرائض حضرت خیر بھوروی کر رہے تھے۔ دس پندرہ ہزار کا مجمع جس میں طلبہ کی اکثریت (طالبات کا بھی جم غفیر)، جون نے اس مشاعرے کی نوجوان فضا کو بھانپ کر خوب صورت شعروں کے ایسے پھول بکھیرے کہ تمام فضا معطر ہو گئی۔ نوجوان دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ کچھ سسکیاں ہم نے بھی سنیں۔ جون اپنا کمال دکھا کر واپس لوٹا اور تالیوں سے سارا ہال گونج اُٹھا۔ یہ سن 1954ء کا قصہ ہے اس وقت بھی مشاعروں میں فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر داد و تحسین میں تالیاں بج اُٹھتی تھیں۔ جسے یقیناً ثقہ شعری محفلوں میں آداب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اور پھر جون پاکستان آ گیا اور ہم تعلیم مکمل کرنے کے لیے وہیں رہ گئے۔

پھر جون سے ہماری ملاقات 1970ء میں ہوئی، ملاقات کا مقام تھا کراچی۔ جب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے، کبھی گاہے گاہے کبھی متواتر۔ جون کو زندگی کے معاملات میں جتنا اول جلول پہلے پایا تھا ویسا ہی وہ آج بھی ہے۔ سر مو بھی تو فرق نہیں آیا۔ لیکن شاعری کے سلسلے میں جتنا فعال پہلے دن تھا اتنا ہی فعال آج بھی ہے بل کہ اب تو کچھ زیادہ ہی فعال ہے کیوں کہ اسے احساس ہو گیا ہے کہ وہ جون ایلیا ہے۔ جون ایلیا نے اپنے قد کاٹھ اور جثے کو بھی پنپنے نہیں دیا کہ کہیں جثے کی جسامت شعری قد و قامت پر اثر انداز نہ ہو جائے۔

ہم نے 1961ء میں پاکستان کے لیے ہجرت کی اور جس دن پاکستان میں قدم رکھا شاعری کو ترک کر دیا۔ اور ایک وفا شعار کماؤ پوت کی طرح کیریئر سازی میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن جب 1970ء میں جون کے ہتھے چڑھے تو اس نے پھر ہمیں شاعری کے رنگ میں گھسیٹ لیا۔ حکم ہوا کہ شام کو تم روز بیٹھ کر میرے سامنے مشقِ سخن کیا کرو تا کہ تمھارا بارہ سالہ زنگ اتر سکے اور تم پھر آدمی بن سکو۔ گویا شاعری کے بغیر ہم اس کی نظر میں آدمی تک نہیں تھے۔

آپ یقین کیجیے ہم برسوں جون کے سامنے بیٹھ کر اپنے شاعری کے آئینے کا زنگ اُتارتے رہے اور جب تک اس نے عالمی ڈائجسٹ کے خوب صورت انشائیے میں ہماری شاعری کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار نہیں کر دیا ہم نے اس کے رو بہ رو مشقِ سخن جاری رکھی۔ وہ شعر تخلیق کرتا اور ہم مشقِ سخن۔ اسی دوران دنیا جہان کی باتیں ہوتیں اور ہم اس سقراط کے افلاطون بن کر برسوں اس کے مکالمے سنتے رہے۔ تخلیقِ کائنات سے آج تک جتنے فلسفے وجود میں آئے ہیں ان پر سیر حاصل گفت گو کرتا اور پھر شعر گوئی کا سلسلہ وہیں سے جڑ جاتا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ جون کی اس بیٹھک میں بڑے بڑے شاعر، نقاد، فلسفی، دانش ور، افسانہ نگار آتے اور جاتے رہے۔ لیکن ہماری جوڑی بنی رہی۔ دراصل مکالمہ جون کی بہت بڑی کم زوری ہے اگر اسے گفت گو کرنے سے روک دیا جائے تو اس کا دم گھٹ جائے۔ کبھی کبھی جون کے ان مکالمات سے کچھ لوگوں کی دل آزاری بھی ہو جاتی اور مہابھارت کا رن پڑ جاتا۔ وہ زمانہ جون پر سرشاری کا زمانہ تھا اور شعر گوئی اس کا روزمرہ کا مشغلہ جس میں ہم بھی شریک تھے اور ہانپتے کانپتے اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں لگے

رہتے۔ آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ جون میرا اُستاد ہے۔ جون کا شعری اسلوب میرے اسلوب سے قطعی مختلف اور بڑا والہانہ ہے۔ اتنا والہانہ جیسے وہ اپنے محبوب سے بڑے انہماک کے ساتھ گفت گو کر رہا ہو ایسی نظم جس کو نثر کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو۔

اسی بیٹھک کے دوران ایک واقعہ اور رونما ہو گیا جو قطعی اتفاقیہ تھا۔ ہوا یہ کہ فون کی گھنٹی بجی جون نے فون اُٹھایا ادھر سے نقرئی آواز میں کسی نے کچھ پوچھا اس آواز نے جون کو مسحور کر دیا اور جون اپنی والی پر اُتر آیا اور گفت گو کو اتنا پُر کشش بنا دیا کہ ادھر انھوں نے بھی فون بند کرنے کا نام نہیں لیا۔ بات کو یہاں تک بڑھایا کہ موصوفہ سے ان کا ٹیلی فون نمبر تک لے لیا اور پھر فون پر عشق کا سلسلہ مہینوں چلا۔ موصوفہ نے بھی بتا دیا تھا کہ ان کو کن اوقات میں فون کیا جائے۔ جون کا افلاطونی عشق کمال پر تھا۔ بس گفت گو اور لامتناہی گفت گو۔ جون نے اپنی نادیدہ محبوبہ کو سقراط، ارسطو، منصور حلاج، غزالی اور کانٹ سے لے کر کارل مارکس تک کے فلسفے تعلیم کر دیے تھے۔ جون روز ہم سے اس کے قد و قامت، خدو خال پر گفت گو کرتا۔ یار اس کا رنگ گورا ہونا چاہیے۔ ہونٹ رسیلے، آنکھیں غزالی، آواز سے اس کا یہی نقشہ بنتا تھا۔

کھینچے ہے تصور لب و رخسار کے نقشے
دیکھا نہیں اس کو مگر آواز سنی ہے

جون نے اپنی نادیدہ محبوبہ کا وہی نقشہ کھینچا جو اس کی شاعری کی محبوبہ کا زمانے سے اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ انسان اپنے خیال و خواب کے حصار سے کم ہی نکل پاتا ہے۔ جون ان دنوں اس ٹیلی فونی عشق پر بہت خوش تھا۔ روز رات کو آٹھ بجے کا انتظار رہتا، یا ادھر گھنٹی بج اُٹھتی اور اگر دو چار منٹ کی اِدھر سے دیر ہو جاتی، اُدھر گھنٹی بجنے لگتی۔ اس عشق کا سلسلہ ایک دن منقطع تو ہونا ہی تھا کہ اگر صرف فون ہی ذریعہ ملاقات ہو اور اصل ملاقات پر آمادگی نہ ہو تو پھر یہ سلسلہ ایک نہ ایک دن ٹوٹ ہی جاتا ہے سو لائن کٹ گئی۔ اور جون اُداس رہنے لگا اور پھر شاعری میں ڈوب گیا کہ غم کو بھلانے کے لیے ایک نشے کی ضرورت ہوتی ہے اور جون کے ہاتھ میں تو جام بھی تھا اور جامِ جم بھی۔

انھی دنوں اس کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی، پیٹ کا عارضہ لاحق ہو گیا۔

ڈاکٹر سے معائنہ کراتے ہوئے فرمانے لگے۔ 'ڈاکٹر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے معدے کی چھت گر گئی ہے اوراس کے ملبے میں میری بھوک دفن ہوگئی ہے۔' ایک روز ڈاکٹر سے بولے 'ڈاکٹر میری نیندوں کے پرندے میری آنکھوں کے گھونسلوں سے اُڑ گئے ہیں بہتیرا دانہ ڈالتا ہوں مگر کم بخت واپس ہی نہیں آتے۔' ایک اور موقع پر ڈاکٹر سے کہنے لگے 'ڈاکٹر صاحب میرے ذہن میں یہ آندھیاں سی کیوں چلتی رہتی ہیں یہ تو آندھیوں کا موسم بھی نہیں۔ ہمارے امروہے میں تو جب آم کا موسم ہوتا تھا تو آندھیاں چلتی تھیں اور ٹپ ٹپ آم گرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہیں میرا دماغ عرب کا ریگستان تو نہیں ہو گیا کیوں کہ پیغمبر تو وہیں آتے رہے ہیں' یہ جملہ ڈاکٹر صاحب کے سر سے گزر گیا اور جون اپنے مخصوص انداز میں ہنکارے کے ساتھ مسکرادیا۔

بے خوابی کا مرض بھی قیامت کا مرض ہوتا ہے، جون اس مرض میں بارہ سال مبتلا رہا، ہزاروں علاج کرائے لیکن نیند جیسے اس سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی تھی۔ ان بارہ برسوں نے جون کو بکھیر کر رکھ دیا وہ سارے زمانے سے کٹ کر گوشہ نشین ہو گیا۔ تخلیق کے سوتے سوکھ گئے۔ ذہن میں ایک خلا رہ گیا، بے کنار خلا لیکن 'ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں' اس حالت کو بھی تبدیل تو ہونا ہی تھا، ہلکے ہلکے بادل گھر کر آنے لگے، بوندا باندی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ذہن میں پھر سبزہ بے گانہ کروٹیں لینے لگا۔ جون کو نیند بھی آنے لگی لیکن نیند کے وہ مانوس پرندے نہیں لوٹے، انھوں نے اپنے چوزے بھیج دیے ہیں گویا اب بے خوابی کی حالت سے نکل کر نیم خوابی کے دور سے گزر رہا ہے۔ پیٹ بھر کر نیند آنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ جس سے ہم شاعر اکثر محروم رہتے ہیں

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں جون کو شاعری کے علاوہ کچھ نہیں آتا اور شاعری ایسی آتی ہے کہ بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دے، کم از کم ہمارا تو یہی خیال ہے اور شاید آپ بھی ہم سے متفق ہوں۔ ویسے جون کا ساتھ نبھانا بڑا مشکل کام ہے پتا نہیں کب وہ اپنے دونوں جوتوں کو بغل میں دبا کر آواز لگانا شروع کر دے 'یا اخی یا اخی میں خدا زادہ ہوں' اور کب وہ بیچ سڑک پر بیٹھ کر سڑک پر ہونے والے مظالم کا قصہ لے بیٹھے اور نہ جانے کب وہ ٹپ ٹپ رونے لگے اور رونے کی وجہ وہ بچھڑنے والے دوست ہوں جو اس کی محفل سے

اُٹھ کر اس کے اسلوب، لفظ و بیاں اور اس کے خواب نقل کر کے اس کی نقل کرنے کی کوشش میں خود اپنے مقام سے گر جاتے ہیں۔ جون اپنی شاعری کے بارے میں بہت حساس ہے وہ یہ کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ کوئی اس کی اپنی وضع کردہ تراکیب کا سرقہ کرے یا اس کی زمینوں میں اپنے شعروں کی تخم ریزی کرنے لگے۔ جون جس کمال کی نظم لکھتا ہے اسی کمال کی نثر بھی لکھتا ہے اس میں یہ وصف غالب کی طرح کا ہے۔ غالب جس نے نظم و نثر میں اپنا سکہ ایسا چلایا کہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود آج تک سکہ رائج الوقت ہے۔

جون کمال کا شاعر ہے، ہم اس کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک تو خالص جمالیاتی شاعری ہے جیسے شیلی اور کیٹس کی شاعری جو اپنی پوری تہذیبی روایت کے ساتھ ہمارے دلوں میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ جس میں عشق اپنی سچائی کے ساتھ بھرپور انداز میں جلوہ فگن نظر آتا ہے جسے معاملاتِ عشق کا روز مرہ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا حصہ ترقی پسند فکر کی عکاس کربِ حیات کی شاعری ہے جو زندگی کی سچائیوں کو بڑی بے دردی اور بے رحمی سے پیش کرنے کا ایک صادق عمل ہے۔ جون کی شاعری پر تبصرہ میرا منصب نہیں جو کچھ لکھ رہا ہوں یہ سب اس کی ذات کے حوالے سے اور اس کی ذات کا سب سے توانا حوالہ اس کی شاعری ہی ہے۔

ہم اکثر مشاعروں میں جون کی شاعری کا حصہ اول ہی سن پاتے ہیں اور جون بھی مشاعرے کی رعایت سے یہی شاعری سنانے پر مجبور ہے۔ 'تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں' یا ناف تک جھیل پہنے ہوئے کسی چاندنی میں نہانے کا خوب صورت تصور یا خطوط کا خزانہ، رومال کی عطر بیز خوش بو یہ سب وہ علامتیں ہیں جو عشقیہ تہذیب کی روایت کہی جا سکتی ہیں۔ ایک رومانی سچائی جس کا تجربہ ہر صاحب دل کو ضرور ہوا ہوگا لیکن عشق کی یہ تہذیب آج کل مفقود ہے۔ ہم ایک ایسے عہدِ برق رفتار میں سانس لے رہے ہیں جہاں معاملاتِ دل بھی اس تیز رفتاری سے رونما ہوتے ہیں اور آناً فاناً ساری منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ جون اس تہذیب کا آدمی ہے جہاں زینوں، چھتوں پر ملاقاتیں، چلمنوں سے تاک جھانک، کھڑکیوں سے پرچہ بازی کے ذریعے عشق کی منزلیں طے ہوتیں اور پھر یہ عشق اکثر ناکام ہو جاتا۔ محبوبہ رقیب کی بیوی بن کر چلی جاتی اور عاشق بے چارہ ہجر اور مسلسل ہجر کی کیفیت سے گزر کر ذہنی توازن

کھو بیٹھتا۔ یہ کل کی بات تھی، کل جو بہت تیزی سے گزر گیا۔ آج تو بس ایک نظر دیکھا عشق ہوا اور اس کے تمام مدارج طے ہو گئے پھر قیس اپنی راہ اور لیلیٰ اپنی راہ لیکن جون تو کل کا شاعر ہے۔ کل جو گزر گیا، کل جو آنے والا ہے۔ وہ آج کی اذیت میں خود کو خراب کر رہا ہے۔

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

غارتِ روز و شب تو دیکھ وقت کا یہ غضب تو دیکھ
کل تو نڈھال بھی تھا میں آج نڈھال بھی نہیں

میرے زمان و ذات کا ہے یہ معاملہ کہ اب
صبحِ فراق بھی نہیں شامِ وصال بھی نہیں

یہ جون کا اپنا کرب ہے۔ وہ اپنی ایک نظم خواب میں ایک جگہ کہتا ہے۔

یقینِ جاں فزا خوابِ تمنا
عذابِ روح بن جائے گا اک دن
کبھی میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا
یہ ہوگی خواب کی تعبیر یعنی
کہ میں نے خواب دیکھا ہی نہیں تھا
جو میری آرزو کا نقش گر ہے
کبھی وہ دور گزرا ہی نہیں تھا

جون اپنے کل کے خوار و زبوں ہونے پر کڑھتا رہتا ہے، اپنی محبت کی بربادی پر چیخ چیخ کر کہتا ہے۔

میں نے یہ کب کہا تھا محبت میں ہے نجات
میں نے یہ کب کہا تھا وفادار ہی رہو
اپنی متاعِ ناز لٹا کر مرے لیے
بازارِ التفات میں نادار ہی رہو

جون بڑا حساس شاعر ہے، وہ محبت میں خون تھوکنے اور زخم چاٹنے کے عمل سے

گزرا ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری دراصل اپنی محبوبہ سے ایک مسلسل مکالمہ ہے۔ اس المیے کا مکالمہ جس سے وہ عشق میں ناکامی کے بعد دوچار ہوا۔

اس کی شاعری کا دوسرا حصہ کربِ حیات کی شاعری کا ہے۔ اس کی نظم 'رمزِ ہمیشہ' اس کی باطنی پیکار کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے ان تمام منازل کی نشان دہی کرتی ہے جس سے گزر کر جون 'لا' کی منزل پر پہنچ کر رک گیا ہے۔ دراصل یہ یقین اور عقل کے درمیان ایک جنگ کی سفاکی کا عمل ہے۔

ہم سب اپنے یقین وگماں کے فرحناک
اسرار میں
شاد وخرم تھے
خوش بین وخرسند تھے
اے خداوند! میں تجھ سے معمور تھا

اور پھر
عقلِ انگیزہ جو درمیاں آ گئی اے خدا
ایک سفاک پُرخاش و پیکار تھی
جو مرے اور مرے درمیاں چھڑ گئی تھی
مرے ذہن میں
ناسزا، جاں گزا آگہی کا جہنم بھڑکنے لگا

اور پھر
وہ زمانہ بھی آیا کہ جب
میں ترے باب میں مضمحل ہو گیا
بادِ یغماگرِ نفی وانکار نے
اُن فرحناک اُسرار کے
عالمِ خواب آگیں کو زیروزبر کر دیا

یہ جون کا وہ المیہ ہے جس نے اس کی زندگی کو یقین وگمان کی ایک جنگ مسلسل میں مبتلا کر دیا ہے لیکن اس المیے نے اسے اپنے عہد کی ایک منفرد آواز بھی بنا دیا ہے جس نے اس کی شاعری کو کمال رنگ دیے ہیں۔ اس کا یہ مجموعہ پندرہ بیس سال قبل آ جانا چاہیے تھا لیکن جون جسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی عادت بیماری کی حد تک ہے بس پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا اور اس کی محفل کے خوشہ چین اپنے کئی کئی مجموعے لے آئے۔ دراصل اس میں جون کا قصور نہیں قصور اس معاشرے اور اس عہد کا ہے جس میں وہ پیدا ہو گیا ہے، جہاں شاعر کو شاعری کے کربِ آفرینش سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور پھر اس کی اشاعت کے جاں گسل مرحلوں سے بھی۔ جون کو تو یونان میں اس وقت پیدا ہونا چاہیے تھا جب علم کو مربوط بنیادوں پر استوار کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوا تھا۔ جب فیثا غورث اور دیو جانس کلبی دنیا سے بے خبر دنیا کو باخبر کر رہے تھے اور دنیا باخبر ہو رہی تھی، کم بخت جون یہاں بھی مار کھا گیا، ملحد کہیں کا!

جون صاحب

ایک طویل مضمون سے انتخاب

عرفان جاوید

کتابوں میں لکھا ہے کہ جون ایلیا 14 دسمبر 1931ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ زاہدہ حنا کا خیال ہے کہ اُن کا سنِ پیدائش 1928ء ہے۔ شکیل عادل زادہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جون صاحب کو کم عمر نظر آنے اور کہے جانے کا جنون تھا۔ اِس لیے اپنی عمر چند برس کم لکھوائی۔ جب شکیل عادل زادہ مراد آباد میں ساتویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھے تو جون صاحب وہاں امروہہ سے تقریری مقابلے میں بہ طور مہمان آئے تھے۔ یہ 52-1951ء کی بات ہے۔ مراد آباد امروہہ سے قریباً بیس میل کے فاصلے پر ہے۔

تقریری مقابلے میں ایک مقرر یعنی نوعمر شکیل عادل زادہ کو جون صاحب نے پہلے انعام سے نوازا تھا۔ بعد میں مقابلے کے مہتمم مولوی عتیق الرحمان نے شکیل کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ عادل ادیب مرحوم کے فرزند ہیں۔ عادل ادیب کا نام سن کے جون صاحب اُچھل گئے اور جوش و جذبے سے شکیل کو گلے لپٹا لیا۔ ''ارے، تُم عادل بھائی کے بیٹے ہو۔''

جون ایلیا نے مولوی عتیق الرحمان سے کہا ''آپ کو معلوم ہے، یہ کون ہے؟ یہ ہمارے خاندان کا فرد ہے۔'' شکیل کے والد نام ور ادیب شاعر اور صحافی عادل ادیب ہی رئیس امروہوی کو امروہے سے مراد آباد لائے تھے اور اپنے علمی و ادبی ماہ نامے 'مسافر' کی

ادارتی ذمے داری سونپی تھی، یعنی رسالہ مسافر کے ذریعے رئیس امروہوی عملی طور پر صحافت سے وابستہ ہوئے تھے۔ مسافر میں اُن کا نام 'رئیس التحریر' کے لقب کے ساتھ شایع ہوتا تھا (رسالہ مسافر کے چند شمارے کراچی کی بیدل لائبریری میں محفوظ ہیں)۔ رئیس امروہوی نے پھر بیوی اور بچوں سمیت مرادآباد ہی کو مسکن بنالیا تھا۔ جون صاحب کے بہ قول، ہم پیشگی، دوستی کے علاوہ خاندانی قسم کا تعلق عادل ادیب اور رئیس امروہوی کے درمیان بہت گہرا تھا۔

1944ء دوسری جنگ عظیم کے دوران کاغذ کی نایابی کے سبب 'مسافر' بند کرنا پڑا تھا۔

جون صاحب نے آہ بھر کے کہا۔ ''اور اسی سال کے آخر میں عادل بھائی کا انتقال ہوگیا۔ لوگ تو بہت کچھ کہتے ہیں، میں سمجھتا ہوں، 'مسافر' کے بند ہوجانے کا صدمہ جان لیوا ثابت ہوا۔''

1951-52ء کے اُس تقریری مقابلے میں یوں جون اور شکیل صاحب کے خاندانی مراسم کا اعادہ ہوا۔ بعد میں دونوں کی قربت کے احوال سے بے شمار ادب دوست واقف ہیں۔

شکیل صاحب کہتے ہیں۔ ''جون صاحب اس وقت باقاعدہ جوان مرد تھے، پھر 1931ء کی پیدائش کیسے تسلیم کی جائے۔''

جون ایلیا کی بھتیجی شاہانہ رئیس ایلیا اپنی کتاب چچا جون (مطبوعہ، ورثہ پبلی کیشنز: از عقیل عباس جعفری صاحب) میں اُس دور کی خوب صورت تصویر کشی کرتی ہیں۔

امروہہ میں بھوڑ ٹیلے آگ دھونکتے سورج کی تپش میں گرمیوں کی آندھیوں اور تیز ہواؤں میں مقام بدلتے رہتے تھے۔ گلی محلوں میں ریت کے بھنور بنتے رہتے تھے اور جھکڑ انھیں لیے پھرتے تھے۔ ان کے بارے میں معروف تھا کہ ریت اور ہوا کے بگولوں کی شکل میں چڑیلیں ڈائنیں ہیں جو چھوٹے بچوں کو پکڑ لیتی ہیں۔ بچے دوپہروں میں گھروں سے باہر آوارہ گردی کرنے نہیں نکلتے تھے۔ وہاں کے مزار، ٹھنڈے سایوں والی اندھیریا مسجد اور عیدگاہ میدان تو گویا نیر مسعود کے کسی افسانے سے نکلے دکھائی دیتے تھے، پراسرار اور دھندلے۔

''جون کے والد علامہ شفیق حسن ایلیا عالم تھے جنھیں فلکیات اور فلسفے سے خاص

شغف تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اُن کی تصنیف ''حقیقت المسیح'' خاصے کی چیز تھی۔ امروہہ کے شیعہ سادات عموماً بہت پڑھے لکھے عالم فاضل لوگ تھے۔ ہندوستان میں تین مقامات کے سادات معروف تھے، سادات بارہ، سادات بلگرام اور سادات امروہہ۔ مصحفی جیسے استاد شاعر بھی امروہہ سے تھے۔ ایک پورا تہذیبی ماحول تھا۔'' شکیل عادل زادہ یاد کرتے ہوئے گویا ہوتے ہیں۔

علامہ شفیق حسن ایلیا کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی، رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی، سیّد محمد عباس، جون ایلیا اور سیّدہ نجفی۔ علوم و فنون خاندان کی گھٹی میں تھے۔ جون کے سگے چچا زاد بھائی کمال امروہی نے کئی باکمال فلمیں بنائیں اور کہانیاں لکھیں۔ ان میں پکار، سکندر، محل، پاکیزہ، رضیہ سلطان کا شمار یادگار فلموں میں ہوتا ہے۔

شہر میں ایک پوری تہذیب زندہ تھی۔ ایسا تہذیبی ماحول تھا جو صدیوں کے ٹھیراؤ اور رچاؤ سے آتا ہے۔ جون کا خاندان حقیقی طور پر ایک خوش حال خانوادہ تھا جس کی مناسب آمدنی اور حویلیاں تھیں۔ چار بیٹوں میں سے تین کی عرفیت تھی، رئیس امروہوی اچھن، سیّد محمد تقی چھبن اور محمد عباس بچھن تھے۔ سُنا ہے، عرفیت کی نسبت سے بچے بچیاں محلے کی حویلیوں کے آنگن میں نعرے لگایا کرتے تھے۔ ''اچھن، چھبن، بچھن، جون...... ان چاروں میں اچھا کون؟'' پھر کسی بچے کی صدا بلند ہوتی ''جون''۔ جون کی کوئی عرفیت نہ تھی۔ وہ ابتدائی دنوں میں جون اصغر کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ جون بہ یک وقت شوخ اور غم گین آدمی تھے اور اپنے آپ کو 'ابوالحزن' (دکھ کا باپ) کہتے تھے۔ جون ایلیا نام کو غلط طور پر مسیحی یا مغربی نام بھی سمجھا گیا۔ اس نام کی ماہیت اور معنی کے حوالے سے مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک رائے میں جون حضرت عباس بن علی المرتضیٰؑ کا لقب تھا۔ جون کا خاندان شیعیت میں فکری و عملی طور پر سرگرم تھا چناں چہ یہ مفہوم برمحل نظر آتا ہے۔ 'ایلیا' کے بارے میں شاہد شاہمیر صاحب کی رائے ہے ''جون ایلیا اور مرزا غالبؔ کے ناموں میں ایلیا اور غالبؔ کا مفہوم ایک ہے۔ لفظ 'اسرائیل' حضرت یعقوب کا لقب ہے۔ جو ایک روایت کے مطابق انھیں پینیل کے مقام پر ملا تھا۔ اسرائیل میں ایل کا معنی ہے غالب آجانا۔ حضرت یعقوب کے غالب آجانے کی وجہ سے ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔

انسانی جسم میں پینیل کا مقام پائنیل گلینڈ ہے۔ پینیل یا پائنیل گلینڈ کو تیسری یا شیو کی آنکھ بھی کہتے ہیں۔ ایل یا ایلیا کا مطلب وہ قوت ہے جو غالب آ جائے۔ اس اعتبار سے حضرت علیؓ اور حضرت الیاسؑ کے ناموں کا مفہوم بھی یہی ہے۔''

شکیل عادل زادہ فرماتے ہیں۔ ''جب میں نے جون صاحب سے اُن کے نام میں موجود لفظ ایلیا کے مفہوم پر بات کی تو انھوں نے بتایا کہ ایلیا یونان میں فن کاروں اور دانش وروں کی اساطیری بستی تھی۔''

یہ بھی ممکن ہے کہ نام میں کثرتِ معانی کے لیے دونوں مفاہیم کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہو۔

جون صاحب ابتدا سے منحنی جثّہ، معدے کی خرابی میں مبتلا اور کم خوراک تھے۔ انھیں دوسروں کو ستانے میں لطف آتا تھا۔ جون اور بہن بھائیوں کو صبح ناشتے میں چائے کے پیالے میں روٹی بھگو کر دی جاتی تھی۔ وہ شرارتاً بڑی باجی (ریحانہ، بنت رئیس امروہوی) سے کہتے تھے کہ اُن کی چائے میں مکھی گر گئی ہے۔ باجی ناراض ہو کر اُٹھ کر چلی جاتیں اور جون خوب لطف اُٹھاتے۔

یہ بات اُن کی بھتیجی شاہانہ رئیس ایلیا نے اپنی کتاب ''چچا جون'' میں بیان کی ہے کہ جب جون پیدا ہوئے تو انھوں نے با قاعدہ قہقہہ مارا تھا۔ بعدازاں وہ اتنے خشک مزاج اور ضدی ہو گئے کہ اُن کی اماں مارتی بھی تھیں تو وہ کہتے تھے ''میری جان نکال دو، مگر میں بات نہیں مانوں گا۔''

رئیس امروہوی کی شادی ہوئی تو جون تین برس کے تھے۔ رئیس اپنی دلہن کے ساتھ کمرے میں چلے جاتے تھے تو وہ کمرے کے دروازے سے لگ کر بیٹھ جاتے اور دلہن کو توتلی آواز میں برا بھلا کہتے، دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہتے ''دروازہ کھول، میرا گھی اندر رکھا ہے۔'' اب جو دروازہ نہ کھلتا تو اُسے زور زور سے پیٹنے لگ جاتے اور چیختے ''اس عورت سے کہو، میرے بھائی کو باہر بھیجے۔''

جون کے مزاج میں ضد کے ساتھ طنز اور لااُبالی پن نے کچھ ایسا رنگ جمایا کہ وہ اپنی ذات میں انجمن اور فردِ واحد میں افراد ہو گئے۔ لڑکیوں سے شرمائے رہنا، اُن سے توقع رکھنا کہ وہ ان کے سامنے کچھ کھائیں پئیں نہیں اور تصوراتی دوشیزہ اور محبوبہ کے مانند

بنی رہیں، لڑکے بالوں سے بے لحاظ ہو جانا، بے وجہ مسکرانا اور بے وقت رقت طاری کر لینا ان کے مزاج کا حصہ بن گیا۔ بعض اوقات ایسی بے مروّتی طاری ہو جاتی کہ ایک دفعہ کوئی لڑکا شاعری پر اصلاح لینے گیا تو اُس کی کاپی کا شاعری والا صفحہ پھاڑ کر بولے "میاں بالے! بھول جاؤ، یہ تمھارے بس کا کام نہیں۔ جاؤ کرکٹ کھیلو، فلمیں دیکھو، لونڈیوں سے عشق لڑاؤ مگر شاعری پر رحم کرو۔ یہ ایرے غیرے کا کام نہیں۔" اسی طرح ایک مرتبہ گھر پر منعقد ہونے والی ادبی نشست میں ایک نو آموز شاعر نے غزل میں لفظ "کرچی" استعمال کیا تھا۔ یہ لفظ سن کر جون نے تحکّم سے اُسے بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا تو جون نے اپنی بھتیجی ریحانہ کو آواز لگائی۔

"ریحانہ بتا، جب امروہے میں کئی دن تک لگاتار بارش ہوتی تھی تو اماں ہم سے کیا کہلواتی تھیں؟"

ریحانہ نے جواب دیا "چھلنی میں مرچیں، بادل کی کرچیں۔"

جون ترت لڑکے سے بولے۔ "بالے، سنا کچھ۔ ہماری اماں پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر اُردو غلط نہیں بولتی تھیں۔ کرچی غلط ہی نہیں، بالکل غلط ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ غزل پھاڑ کر پھینک دو۔"

جون کو لڑکپن ہی سے مطالعے کی لت اور فلسفیانہ موشگافیوں میں سر کھپانے کی عادت تھی۔ تجسّس اور سیکھنے کا شوق ایسا کہ اُردو، عربی اور فارسی میں حقیقی طور پر رواں، انگریزی اور عبرانی کی شُد بُد، ادب، فلسفے اور لسانیات میں مہارت، دیگر علوم پر مناسب دسترس رکھتے تھے۔ بچپن سے صحت ایسی تھی کہ ہلکا پھلکا سا کھانا بھی کھا لیتے تو معدے پر ایسی گرانی ہوتی کہ صحن میں تخت پر لیٹ جاتے۔ مزاج میں مبالغہ ایسا کہ اپنے لیے وہی تاریخِ پیدائش منتخب کی جو حضرت علیؓ کی تھی، یعنی تیرہ رجب۔ خود شاعر تھے، شاعری سے محبت تھی پر شاعروں سے کد تھی۔ غالب کو پچیس اشعار کا شاعر سمجھتے تھے۔ یعنی غالب نے فقط پچیس قابلِ ذکر اشعار کہے تھے۔ البتہ میر تقی میؔر کے عاشقِ صادق تھے۔ اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتے تھے۔ اپنے والد کو اپنے آپ سے بھی برتر کہتے تھے۔ اداکاری تھیٹر میں بھی فرماتے تھے اور زندگی میں بھی۔ امروہہ میں تھیٹر میں باقاعدہ اداکاری کرتے رہے

تھے، پہلوانی کا بھی شوق تھا۔

لڑک پن میں جون کا تخیل بھی تصور کی گلیوں میں پھرا کرتا۔ انھوں نے ایک تصوراتی لڑکی صوفیہ کا خیال تراش رکھا تھا۔ اُسی سے عشق میں مبتلا تھے اور باتیں کیا کرتے تھے۔ تصور کی رسائی کا یہ عالم تھا کہ پسندیدہ شعرا، میر تقی میر کے استثنا سے سوا، قدیم بابل، فارس اور جزیرہ نُما سے تعلق رکھتے تھے اور جون فکری طور پر تبھی سے ان میں زندگی بسر کرتے تھے۔

نوعمری ہی میں جون کو پریا نام کی ایک حقیقی لڑکی سے عشق ہوگیا۔ وہ گورے رنگ کی تھی، چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور وہ جون سے اشعار سن کر لکھ لیا کرتی تھی۔ وہ جون سے عمر میں بڑی تھی اور ایک دوسرے لڑکے کی محبت میں گرفتار تھی۔ سو اُس لڑکے کو جون سے نئے اشعار لکھ بھیجتی تھی۔ جون پر تو یہ راز تب کھلا جب اُس لڑکی کی شادی اپنے محبوب سے ہوگئی۔

محلے بھر کی لڑکیاں، بالیاں جون سے سہاگ، قصیدے، غزلیں لکھوایا کرتیں۔ جون کو دوسری محبت ایک منگنی شدہ لڑکی سے ہوئی۔ وہ بھی جلد بیاہ کر چلی گئی۔ اب جون تھے، اُن کی یادیں، شاعری تھی اور غم غلط کرنے کے ذرائع۔

جون نے لڑک پن ہی میں امروہہ میں بہ طور شاعر ایک پہچان بنانا شروع کردی تھی۔ دن کو پہلوانی اور تن سازی کرتے، رات کو مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ حلیے کے علاوہ مشاعرے میں حرکات بھی جدا ہوتی تھیں۔ کھچا کھچ بھرے مشاعرے میں اشعار سناتے سناتے رُک جاتے اور کسی سامع کو دیکھ کر آواز لگاتے ''ارے نذر تُم ...... یہاں؟ پچھلی مرتبہ تمھارے ہاں خوب لطف رہا۔ بھئی میزبانی تو تم پر ختم ہے۔ کیا خوب آم کا اچار کھلایا تھا۔''

قیامِ پاکستان کے وقت وہ اور ان کی بہن ہندوستان ہی میں ٹھیر گئے تھے۔ دیگر بھائی پاکستان چلے آئے۔ رئیس امروہوی ''جنگ'' اخبار میں قطعات، سیاسی، سماجی کالم لکھنے لگے۔ سیّد محمد تقی ادارتی شعبے کی سربراہی پر فائز تھے۔

رئیس امروہوی کا گاندھی جی کے قتل کے دن ایک فی البدیہہ قطعے سے قطعہ نگاری

میں شہرت کا آغاز ہوا۔ وہ نہایت قادرالکلام شاعر تھے۔ اُنھیں چلتے پھرتے، اُٹھتے، بیٹھتے شعر کہنے کی قدرت حاصل تھی۔ گاندھی جی کی موت پر جو قطعہ انھوں نے کہا، وہ کچھ یوں تھا۔

جس نے اُمیدِ زیست تھی باندھی
لے اُڑی اُس کو موت کی آندھی
گالیاں کھاکے، گولیاں کھا کے
چل بسے اُف، مہاتما گاندھی

روزنامہ جنگ کے مالک میر خلیل الرحمان جو خود بھی ایک بے پناہ صحافی تھے، نے رئیس صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ ملک کے سیاسی وسماجی واقعات پر روز ایک قطعہ لکھ سکتے ہیں۔ رئیس صاحب کے ہامی بھرنے پر یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ روز ایک قطعہ، ملک کے سیاسی سماجی حالات کی ترجمانی کرتا ہوا، کبھی طنز، کبھی مزاح سے مرصّع، ایسی کاٹ کہ اللہ اکبر، کوئی شبہ نہیں، سبھی ناقد اعتراف کرتے ہیں کہ رئیس امروہوی نے قطعہ نگاری کے فن میں کیا کیا تجربے کیے۔ انھوں نے کئی بے مثال قطعات کہے پھر جنگ کے ہم عصر اخبارات نے جنگ کی پیروی میں قطعہ نگاری کو مستقل جگہ دینی شروع کردی مگر کوئی بھی رئیس امروہوی کا ہم سر نہ ہوسکا۔ کسی فن کار، قلم کار کی وفات پر ایک رسمی جملہ ادا کیا جاتا ہے کہ اُس کے خلا کا پُر ہونا مشکل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رئیس امروہوی کے انتقال کے بعد اُن جیسا باکمال قطعہ نگار سامنے نہیں آیا۔ اخبارِ جہاں نے رئیس امروہوی کی زندگی میں اُن کے قطعات کے تین مجموعے شایع کیے تھے جو اَب نایاب ہیں۔

بھارت میں جون کے دن تنگ دستی میں گزرے۔ سیّد تقی اور رئیس امروہوی اُنھیں اخراجات کے لیے پیسے بھیجتے تھے۔ اپنی تساہل پسندی کے باعث جون نے جم کر کوئی ذریعۂ روزگار اختیار نہ کیا۔ اُنھیں اپنی ماں اور بہن کے اخراجات بھی اُٹھانا تھے۔ وہیں انھیں تپِ دِق نے آلیا۔ جب جنوری، 1957ء میں کراچی آئے تو بہت بیمار تھے، خالی نظروں سے گردونواح کو تکتے رہتے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کا جسم تو کراچی آگیا ہے پر وہ اپنی روح امروہہ چھوڑ آئے ہیں۔

کراچی میں جون کا ابتدائی قیام کھارادر میں بھائیوں کے ہم راہ تھا۔ ڈیڑھ کمروں پر مشتمل دو فلیٹوں میں دونوں بھائی اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک میں رئیس امروہوی، دوسرے برابر والے فلیٹ میں سیّد محمد تقی۔ بعدازاں پورا خاندان گارڈن ایسٹ کے علاقے میں 2700 گز پر محیط ایک وسیع کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔ یہ کوٹھی انھیں کلیم میں ملی تھی۔ اس کوٹھی کا نام پہلے ارسطا طالیس پھر جون کی والدہ کے نام پر نرجس رکھا گیا۔ جلد ہی وہ بنگلا ایک تہذیبی اور ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔

منفرد شاعرہ اور ادیبہ عذرا عباس نے اُس بنگلے کی لفظی عکس گری کی ہے۔

''دروازے ہی سے ایک راستہ شروع ہو کر برآمدے کی سیڑھیوں پر ختم ہوتا تھا۔ برآمدے کی بائیں طرف کسی اُجاڑ باغ کی سی کوئی چیز تھی۔ اُدھڑی ہوئی گھاس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک مضبوط پرانے درخت کے نیچے ایک دبلا پتلا لمبا سا آدمی چوڑے پائنچے کا سفید پاجامہ اور کُرتا پہنے کھڑا کسی دکھائی نہ دینے والی چیز کو گھور رہا تھا اور اس سے قدرے فاصلے پر لکڑی کے ایک کم زور تخت پر ایک خوب رو شخص بیٹھا تھا۔

''یہ میرے باپ ہیں، تم نے نام تو ضرور سنا ہوگا، رئیس امروہوی۔'' اس نے تیزی سے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے درخت کے نیچے کھڑے آدمی کی طرف آنکھوں ہی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے دماغ پر زور ڈالا لیکن ابھی میں 'ہاں' اور 'نہیں' سے نکل بھی نہ پائی تھی کہ برآمدہ بھی ختم ہو گیا۔

اِدھر اُدھر کئی کمرے آئے لیکن ان میں سے کسی میں بھی مجھے لے جایا نہیں گیا، پھر ایک لمبا کمرا اور اس کے بعد باورچی خانہ، کھانوں کی خوشبوؤں سے بھرا ہوا۔ کوٹھی کا تصور اب ضائع ہو رہا تھا۔

ہر طرف کمرے، کمروں میں تخت، تختوں پر چاندنیاں اور چاندنیوں پر گاؤ تکیے، برآمدے کا تخت سب سے بڑا تھا اور اس پر ایک بھاری پان دان بھی رکھا تھا۔ اس پر ایک خاتون بیٹھی تھیں، ریشمی غرارے اور چوڑے ریشمی دوپٹے میں ملبوس۔ پان دان، تخت اور برآمدے کا ایسا میل میں نے نہ تو پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ پھر کبھی دیکھا۔

ساری فضا کہانیوں جیسی تھی لیکن میں اس سے مانوس نہیں ہو پا رہی تھی۔ اب ہم

جس کمرے کے پاس تھے اس میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی لیکن دروازے تین تھے، انھی میں سے ایک کی طرف منہ کر کے مجھے کوٹھی لانے والی نے زور سے کہا ''جون جاگ رہے ہو؟''

''ہاں بالی، سوتا کب ہوں؟ مجھے تو یاد بھی نہیں، کبھی سویا بھی تھا۔'' کمرے کے ملگجے اندھیرے سے ایک غیر مانوس سی کھنکتی ہوئی آواز میں، سر کو اس طرح حرکت دیتے ہوئے ایک سائے نے جواب دیا کہ بالوں کی ایک لٹ خود بہ خود ماتھے پر آجائے۔

اب میں جون کے سامنے کھڑی تھی، جو مجھے کوٹھی میں لانے والی بالی کے چچا تھے لیکن چچا بھتیجی میں ایسا کوئی تکلف نہیں تھا کہ رشتہ آڑے آتا۔ ''یہ جون ہیں، شاعر ہیں، بہت مشہور شاعر'' اس نے سامنے تخت پر بیٹھے اس آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس طرح بیٹھا تھا کہ گھیر دار پاجامے میں یہ پتا نہیں چل سکتا تھا کہ کون سی ٹانگ سیدھی ہے اور کون سی اُلٹی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے جون بالی کو کوئی شعر سنانے لگے۔ شعر سناتے ہوئے انھوں نے دونوں اُنگلیاں بالوں میں پھنسا رکھی تھیں۔''

جون ایلیا کی شہرت کے تین مدارج ہیں۔

پہلے درجے میں انھیں ایک صاحبِ علم شاعر، مفکر اور ماہرِ لسانیات کے طور پر کراچی کے ادبی حلقوں میں جانا جانے لگا۔

جون کے ہاں مختلف المزاج صاحبانِ سخن کے ہونے سے رونق لگی رہتی تھی۔ اُن کے برادرِ بزرگ رئیس امروہوی صاحب کا ایک معمولی سا واقعہ ان کے مزاج اور حیوانات کی فطرت کی خبر دیتا ہے۔

شاہانہ رئیس ایلیا ''چچا جون'' میں ایک واقعہ بیان کرتی ہیں کہ ایک رات رئیس رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ گھر میں رات کا کھانا صحن میں ہوتا تھا۔ روز رات کو کھانے کے وقت ایک کتا آجایا کرتا تھا جسے رئیس صاحب بہت محبت سے کھانا ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک رات معمول کے مطابق وہ کتا کھانے کے وقت آیا تو رئیس صاحب کی اہلیہ کسی بات پر بھری بیٹھی تھیں، انھوں نے کتے کو ڈانٹ دیا۔

''کس قدر بے غیرت ہے۔ جانے کہاں سے یہ کھانے کے وقت آمرتا ہے۔''

اُس کتے نے اِس جانب دیکھا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔ یہ دیکھ کر رئیس صاحب سے رہا نہ گیا اور وہ افسردگی میں روٹی لیے کتے کے پیچھے پیچھے باہر چلے آئے۔ باہر انھوں نے کتے کو شفقت سے روٹی دی اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ''تم میری بیوی کی بات کا برامت مانو۔ اسے اندازہ نہیں کہ بھوک کیا بلا ہے۔''

کتے نے سر جھکا کر روٹی اُٹھائی اور وہاں سے چلا گیا۔ اُس دن کے بعد وہ کتا دوبارہ ان کے گھر نہ آیا۔

چوں کہ انشا علمی نوعیت کا پرچہ تھا سو اس کی اشاعت بہ مشکل ایک ہزار سے بڑھ پائی، لاکھ جتن کر لیے، ٹائٹل پر ٹائٹل بدلے، حسین و جمیل عورتوں کی تصاویر سجائیں، ساڑھے بارہ سو سے آگے اشاعت نہ بڑھ پائی۔ اس اشاعت میں معاشی استحکام ممکن نہ تھا۔ انھی دنوں ریڈرز ڈائجسٹ کی طرز پر اُردو ڈائجسٹ نکالا گیا جو بہت مقبول ہوا۔ اُردو ڈائجسٹ کی مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے انشا کو 'انشا عالمی ڈائجسٹ' کے نام سے بدل دیا گیا۔ نتیجتاً اس کی اشاعت کچھ عرصے میں چار ہزار ہوگئی۔ البتہ پھر یہ اشاعت وہیں پر رک گئی۔ مقابلتاً اُردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ کی اشاعت بہ تدریج بڑھ رہی تھی۔

جون صاحب کے مزاج میں کاروباری چمک نہ تھی۔ شاعری ہی ان کا مسئلہ تھی۔ رسالے کی اشاعت جم کے رہ گئی تھی اور اس جمود میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہو رہی تو وہ بددل ہو گئے۔

انشا عالمی ڈائجسٹ سے انشا کا لاحقہ ہٹا کر عالمی ڈائجسٹ بنا دیا گیا۔

اُس دور میں ڈائجسٹوں کو (اور کچھ حد تک آج بھی) سنجیدہ ادب سے نچلے درجے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ امر بھی جون کے لیے حوصلہ شکن تھا۔

اس سے ہٹ کر محبت کے معاملے۔

اور وہ ایک لڑکی! نام تو اُس کا کچھ اور تھا۔ فرض کر لیجیے ماریا۔ داستان ہر چند فرضی نہیں ہے۔ سانولی، سلونی، دل کش خال وخد، کسی قدر سنجیدہ و متین اور عمر کے سب سے قیامت دور میں۔ وہ جو جوش صاحب کا شعر ہے۔

مہترانی ہو کہ رانی، گنگنائے گی ضرور
یہ جوانی ہے جوانی، رنگ لائے گی ضرور

صورت یہ تھی کہ جون صاحب کی کوٹھی سے ملحق ایک بڑی کوٹھی کی انیکسی میں
اینگلو انڈین خاندان مقیم تھا۔ انیکسی کی دیوار کے ساتھ عالمی ڈائجسٹ کا دفتر بنایا گیا تھا۔
انیکسی کی کھڑکیاں دفتر کی طرف کھلتی تھیں اور اینگلو خاندان کے لوگ تاک جھانک کرتے
رہتے تھے۔ جانے کیسے، کیوں کر اور کب جون اور ماریا کی رسم و راہ ہوگئی۔ جون عام
نوجوانوں کی طرح بھڑ کیلے، من چلے اشاروں کنایوں کے متحمل تھے نہ انھیں جذباتی قسم کی
شوخیاں شعبدہ بازیاں آتی تھیں، نہ خطوط کا تبادلہ ممکن تھا۔ ماریا کو اُردو صرف بولنا آتی تھی،
لکھنا نہیں، لکھنا آتی ہوگی تو بہت واجبی، نہ دوسری لڑکیوں کی طرح جون کی شاعری سے
متاثر ہو جانے کا کوئی امکان تھا۔ رئیس امروہوی اور سیّد محمد تقی کلیم میں ملی وسیع و عریض کوٹھی
میں آ کے بس تو گئے تھے مگر ان کے رہن سہن اور ساز و سامان سے صاف ظاہر تھا کہ سفید پوشی
کا بھرم قائم کیے ہوئے ہیں۔ سیّد محمد تقی نے پرانی فورڈ ٹائپ کار خرید لی تھی جس کا پٹرول وہ
پھونک پھونک کے استعمال کرتے تھے۔ پڑوسی خاندان کی لڑکیاں کبھی کبھار جون کے گھر کی
خواتین سے ملنے آیا کرتی تھیں۔ اِن میں ماریا بھی ہوتی تھی مگر بھرے پُرے گھر کے
سامنے اظہارِ عشق کے امکانات بھی بہت کم تھے۔ پھر یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ کس وقت جون
نے ماریا کو اسیر کیا اور کس دن ماریا نے کھڑکی سے جون پر تیر برسائے۔ جون کی کون سی ادا
اُسے بھا گئی۔ ایک روز یہ انکشاف کر کے جون صاحب نے شکیل عادل زادہ صاحب کو
حیرت میں مبتلا کیا کہ ماریا سے ملاقات کے لیے انھیں خلوت کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔
مراد یہ تھی کہ ہو سکے تو شکیل اس بابت کوئی حل نکالیں۔ اصرار اِس قدر شدید تھا کہ شکیل کو
اپنے ایک دوست سے مدد لینا پڑی۔ خوش قسمتی سے دوست کے والدین ہندوستان گئے
ہوئے تھے۔ ایک بار نہیں، کئی بار جون نے استفادۂ خلوت کیا۔ پر ماریا سے تعلقِ خاطر میں
جون کے اشتیاق کا عالم وہ نہیں تھا جو اُن کے احباب نے ایسے معاملات میں دیکھا اور سنا
تھا۔ جون دنیا کی ہر لڑکی سے عشق کے آرزو مند تھے اور بہ یک وقت کئی لڑکیوں سے۔
ایسا نہیں تھا کہ انھیں موقعے نہ ملے ہوں مگر یا تو کچھ عرصے بعد وہ ہچکچانے لگتے تھے
یا پیروی کے لیے وقت نہیں دے پاتے تھے یا اُن سے عشق کے پیچیدہ مطالبے، تقاضے
نبھائے نہیں جاتے تھے۔ جون کو کسی مثالیے کی تلاش تھی۔ کچھ عرصے بعد انھیں احساس ہوتا

کہ یہ تعبیر تو ان کے خوابوں، خیالوں کی ضد ہے۔ کسی کو مثالیہ نہیں ملتا اور مل جاتا ہے تو مثالیہ نہیں رہتا۔ انھوں نے کہا تھا۔

جون کروگے کب تلک اپنا مثالیہ تلاش
اَب کئی ہجر ہو چکے، اب کئی سال ہو گئے

جون صاحب کے لیے کوئی پری بھی آسمان سے اُترتی تو وہ کچھ مدت بعد اس میں بھی عیب تلاش کر لیتے۔ کچھ اور نہیں تو جمالیاتی عیب۔ رفتہ رفتہ ماریا بھی دُور ہوتی گئی۔ جون صاحب اور اُس میں ایسی کوئی نسبت بھی نہیں تھی۔ شادی وغیرہ کے تو شاید عہد و پیمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ یہ صرف دوستی تھی اور دوستی ہی رہا کرے تو کیا اچھا ہے لیکن یہ مرد و زن کی دوستیاں عموماً بھٹک اور بہک جایا کرتی ہیں۔ ماریا کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ کنارہ کشی سے نہ کسی نے ماریا کو سرگشتہ و سرگرداں دیکھا نہ جون پر جاں سوزی و جاں کنی کی کیفیت طاری ہوئی اور ہوا یہ کہ اچانک ماریا کے غریب خاندان کو انیکسی چھوڑنی پڑ گئی۔ بے شک اس دُوری کی جون صاحب کو توقع نہ تھی۔ ماریا کے اس طرح بچھڑ جانے کے بعد بہت دنوں تک وہ خاموش اور اُداس دیکھے گئے۔ اُداسی اور شکایت کے بہانے تو خیر وہ ویسے بھی ڈھونڈتے رہتے تھے۔ خود مظلومی شعار تھی۔ کسی دوست نے مشورہ دیا تھا کہ ماریا کو تلاش کرنا چاہیے۔ وہ اِسی شہر کے کسی علاقے میں گئی ہوگی۔ جون نے مشورے پر عمل نہیں کیا اور آہ و زاری پر اکتفا کی۔

یہ 65-1966ء کی بات ہے۔ ایک روز جون ایلیا کو ایک خط موصول ہوا۔ سادہ سے کاغذ پر ایک لڑکی کا خط، لکھا تھا کہ وہ جون کی شاعری کی دل دادہ ہے، اُن کے بیش تر کلام کی حافظ۔ جون بہت سرشار ہوئے۔ اُس زمانے میں ان کے گہرے دوستوں میں اسد محمد خاں، محمد علی صدیقی، راحت سعید، حسن عابد، قمر ہاشمی، انجم اعظمی، یوسف ضیغم، سحر انصاری اور انور شعور وغیرہ شامل تھے۔ سب نہیں تو چند قریباً روز ہی گھر آتے تھے اور شکیل عادل زادہ تو گھر ہی کے ایک فرد تھے۔ جون بار بار احباب کو خط دکھاتے۔ انھیں خط کی تحریر میں نہاں اصل مقصد و منشا دریافت کرنے بل کہ سراغ لگانے کی بڑی بے کلی تھی۔ لڑکی کا نام افشاں تھا۔ تحریر سے خوش ذوق، شائستہ و سنجیدہ اور تعلیم یافتہ نظر آتی تھی۔

مسلم لیگ کوارٹرز کا پتا درج تھا۔ کسی ایک کوارٹر کا پتا درج نہیں تھا۔ اتنے بہت سے مسلم لیگ کوارٹرز میں افشاں کے گھر کی نشان دہی کیوں کر ہو پاتی۔ ابھی خط کے مندرجات پر تحقیق و تفتیش کے مراحل طے ہو رہے تھے کہ دوسرا خط آ گیا، دوسرا، تیسرا، چوتھا۔ یک طرفہ خطوط کے اس سلسلے میں جون ایلیا کی شاعری ہی موضوع ہوتی۔ چند خطوط کے بعد کچھ باتیں واضح ہوگئی تھیں کہ افشاں کا تعلق متوسط گھرانے سے ہے۔ کسی کالج میں بی اے کے سالِ آخر میں ہے اور جون کی شاعری کی شیدائی ہے۔ 'یونی ورسٹی کے حالیہ مشاعرے میں آپ کا لباس خوب بچ رہا تھا۔ یہی لباس پہنا کیجیے، شیروانی کو تو ترک کر ہی دیجیے، صحت کا خیال رکھیے، مشاعروں میں کم جایئے' صرف بڑے مشاعروں میں شامل ہونے کی ہدایتوں، تاکیدوں کے علاوہ جون کی شخصیت کے بارے میں اشتیاق آمیز تجسس سے یہ امر بھی واضح تھا کہ افشاں، ایک شاعر کی شیدائی ہی نہیں، ایک نوجوان کی بھی تمنائی ہے۔ ہر اگلے خط میں یہ فریفتگی فزوں ہو جاتی تھی۔ خطوط سے یہ شبہ بھی ہوتا تھا کہ افشاں نے جون کو قریب سے دیکھا ہے اور اُن کی بہت سی عادتوں، خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہے۔

جون تو پہلے ہی خط سے متزلزل ہو گئے تھے، ہر خط کے بعد ان کا اضطراب سوا ہو جاتا۔ ہر نیا خط دوستوں کے سامنے پیش کیا جاتا اور ایک ایک لفظ، ایک ایک سطر کے معانی و مطالب پر غور و خوض ہوتا۔ احباب آسرا دلاتے کہ دیکھنا، کسی روز اپنے پتے سے بھی آگاہ کر دے گی۔ متوسط خاندان کی لڑکیاں اپنے آپ سے بھی ڈرتی ہیں۔ دس اطراف کا انھیں خیال رکھنا ہوتا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ کسی دن اپنی سہیلی کے ساتھ وہ خود ملنے چلی آئے۔ جیسے جیسے خط آتے گئے، افشاں معما بنتی گئی۔ جون صاحب کی بے چینیاں بڑھتی گئیں اور صرف اُنھی کے لیے نہیں، ان کے سبھی راز داں دوستوں کے لیے بھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جون پر والہ و شیدا، اتنی خوب صورت تحریر لکھنے اور جون کو اتنا جاننے والی لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ سبھی کا اتفاق تھا کہ تحریر لڑکی ہی کی ہے۔ یہ اسلوب کسی مرد کا نہیں ہو سکتا۔ افشاں کے کسی خط میں شیفتگی کا کھل کے اظہار نہیں ہوتا تھا۔ سارا اظہار بالواسطہ تھا جو اُس کی ذہنی بلوغت کا غماز تھا۔ جون کے آس پاس، نزدیک و دُور ہر لڑکی کی ٹوہ لی گئی، کسی پر شک نہیں گزرا۔ دوست تسلیاں دینے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ اِس دوران جون صاحب

سے کئی غزلیں نظمیں سرزد ہوئیں۔ یہ صدمہ مستزاد تھا کہ وہ یہ تازہ کلام افشاں کو نہیں بھیج سکتے تھے۔ خط آتے رہے اور جون کے ہوش و حواس روز و شب پراگندہ کرتے رہے۔ دوست بھی کچھ عاجز آنے لگے تھے کہ وہ جون کی دل جوئی کے لیے کیا تشریح و تفسیر کریں۔ انھوں نے افشاں کا ایک خیالی پیکر بھی تراش لیا تھا۔ دوستوں میں بھی شاعر و ادیب تھے، ایک سے ایک فسانے کو حقیقت، حقیقت کو فسانہ بنانے والا۔

انھی میں ایک شاعر دوست نے رنگ و نشاط کے عالم میں ایک شام جون کی بے تابیوں پر لطف کا اظہار کیا تو شکیل عادل زادہ کو شبہ ہوا۔ بہت کرید نے، بڑی منتوں کے بعد شاعر دوست نے زبان کھولی کہ خطوط ایک لڑکی ہی لکھ رہی ہے اور اُس کا نام افشاں نہیں ہے۔ کئی بار وہ جون صاحب سے مل چکی ہے۔ شکیل بھی اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔ صنفِ نازک کے لیے جون کی بے تحاشا دل چسپی، فطری قسم کی رغبت دیکھ کے شاعر دوست کو شوخی سوجھی اور انھوں نے بہن بنی ہوئی اس لڑکی کو آمادہ کیا کہ وہ یہ خطوط لکھے۔ خطوط کے متن میں شاعر دوست بھی اُس کی مدد کرتے تھے۔ اب کچھ صورتِ حال اس نوعیت کی تھی جیسے قاتل خود مقتول کے سوگ واروں میں شامل ہو اور جنازے کو کندھا دے۔

وہ شاعر دوست جون صاحب کے ہیجان و انتشار کی بنیاد بھی تھے، شاہد بھی۔ دیگر دوستوں کے ساتھ وہ جوش و خروش سے مشورے دیتے، نکتہ طرازیاں کرتے اور نظارہ فرماتے رہے اور کسی کو احساس نہ ہونے دیا کہ ساری تماشابازی اُن کی ہے۔

شکیل عادل زادہ اس انکشاف پر دنگ رہ گئے۔ شاعر دوست سے دست بستہ درخواست کی کہ اب تک جو ہو چکا ہے، ٹھیک ہے مگر خدا کے لیے اب بس کیا جائے، یہ سلسلہ فوراً بند کر دیا جائے۔ جون صاحب کی حالت کا انھیں اندازہ ہے، ایسے معاملات میں وہ کیسے جذباتی ہو جاتے ہیں، پاگل پن کی حد تک۔ صبح و شام اُن کی زبان پر اَب ایک ہی ذکر ہے۔ شکیل عادل زادہ نے لڑکی سے بھی بات کی۔ آخر دوست اس شرط اور وعدے وعید کے بعد تیار ہو گئے کہ شکیل کسی اور سے اِس کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ بہت سوچ بچار کے بعد ایک آخری خط ضرور لکھا گیا۔ لڑکی نے رقت و ندامت آمیز انداز میں اپنی مجبوریوں، محرومیوں اور گھریلو قد امتوں کا ذکر کیا، لکھا کہ اُسے معاف کر دیا جائے، شاید اب وہ کوئی

خط نہ لکھ سکے۔ یعنی کچھ ایسے اشارے کیے گئے کہ وہ اپنے والدین کی مرضی ومنشا کے آگے بے اختیار ہوگئی ہے اور کہیں دور جارہی ہے۔ متوسط طبقے میں آدمی کو پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے منت کی کہ جون شاعری کرتے رہیں، کیوں کہ وہ تو شاعری کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اُسے یقین ہے کہ شاعری میں ایک روز اُن کا بہت بلند مقام ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ خط موصول ہوا تو جون صاحب پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دل گیری و دل برداشتگی کا جو حال ہونا چاہیے تھا، ہوا۔ شکیل عادل زادہ نے بھی دیکھا اور اُس شاعر دوست نے بھی۔ عرصے تک جون صاحب نے خطوط سنبھال کے رکھے اور عرصے تک وہ حسرت و یاس سے تذکرہ کرتے رہے اور یہ راز شکیل عادل زادہ، شاعر دوست اور اُس لڑکی کے درمیان ہی محدود رہا۔ جون صاحب کے علم میں آتا تو اُن کے غم و غصے کا کیا عالم ہوتا، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ غضب ناک بھی اتنے ہی تھے، جتنے جمالی، اتنے جلالی۔

پھر یہ ہوا، جیسا کہ بہت قریبی احباب بتاتے ہیں۔ عالمی ڈائجسٹ شایع ہورہا تھا۔ جون، عالمی ڈائجسٹ کے ساتھ آغا خان انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر جواد المسقطی کے زیرِ نگرانی عربی اور فارسی کی کچھ نادر و نایاب کتابوں کا ترجمہ کررہے تھے۔ اس سے پہلے اُردو کی سب سے بڑی لغت کی ترتیب و تدوین میں وہ کچھ عرصے اُردو ڈکشنری بورڈ میں بھی کام کرچکے تھے۔ انشا اور عالمی ڈائجسٹ کے ذریعے اُن کی ادبی حیثیت مستحکم ہوچکی تھی۔ کراچی میں کثرت سے ہونے والے مشاعروں کے مقبول شعرا میں ان کا شمار ہونے لگا تھا کہ ایک اسکول کے مشاعرے میں انھوں نے اسکول کی کارکن زاہدہ حنا کو دیکھا۔ زاہدہ تعلیم کے ساتھ ملازمت بھی کررہی تھیں اور گھر بھی دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے والدِ گرامی ابوالخیر صاحب علالت کے سبب خانہ نشین ہوچکے تھے۔ بڑے وضع دار، نستعلیق قسم کے بزرگ تھے، طبی امور سے دل چسپی، علم وادب کے دل دادہ۔ زاہدہ گھر کی بڑی تھیں، ایک بھائی، ایک بہن اور والدہ پر مشتمل اس خانوادے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ زاہدہ نے زندگی میں بہت محنت کی اور محنت ہی سے مقام بنایا۔ تعلیم کے دوران اُن کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ قرۃ العین کی عاشق، ابتدا ہی میں اُردو کے نام ور ادیبوں، شاعروں کو پڑھ لیا تھا۔ سانولی، خوش چہرہ، خوش قامت اور خوش شعار زاہدہ اُن بہت سی لڑکیوں سے مختلف تھیں جن

ے جون کا واسطہ ہوا تھا، یا رہا تھا۔ زاہدہ حنا سے پہلی ملاقات کے بعد بات بڑھتی گئی۔ زاہدہ کی مصروفیات کی وجہ سے ملاقاتیں تو کم کم ہوتی تھیں،فون اور خطوط یہ کمی دُور کردیتے تھے۔ دونوں جانب سے خطوط کا سلسلہ معمول بن گیا تھا۔ جن چند قریب ترین احباب نے یہ خطوط پڑھے ہیں، اُن کی رائے ہے کہ اُردو میں گنتی کے خطوط کے مجموعوں میں زاہدہ اور جون کے خطوط بیش قیمت اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہ وجوہ ان کی اشاعت ممکن نہیں۔

ایک مرتبہ عبیداللہ علیم نے جون کو ایک اطلاع سنائی جس سے وہ حواس باختہ ہوگئے۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ کسی نے زاہدہ کو خبر سنائی تھی کہ جون کی مرضی اور خواہش کے مطابق ان کا رشتہ ایک لڑکی فیروزہ کو بھیجا گیا ہے۔ دروغ برگردنِ راوی، خبر اُڑی کہ پیام کی یہ بات سن کر اور جون کی بے وفائی و بے اعتنائی کا سوچ کر زاہدہ نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ ظاہر ہے، خبر بے بنیاد اور جھوٹی تھی۔ خدا جانے، یہ جون کی محبت تھی، اپنے اہم ہوجانے کا احساس کہ ایک لڑکی نے ان کی خاطر اپنی جان لینے کی کوشش کی ہے یا دروغ گوئی کا معاملہ کہ جون نے مایوس ہوکر کہا ''ایسا جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔''

زاہدہ عالمی ڈائجسٹ میں باقاعدہ لکھنے لگی تھیں، ترجمے کرتی تھیں، مضامین بھی لکھتی تھیں۔ ان کی نثر شروع ہی سے پختہ، رواں اور دل کش تھی۔ کوئی آٹھ سالہ رفاقت کے باوجود اُن کی شادی بہ ہر حال ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ رئیس امروہوی کا خاندان تو جون صاحب کی خوشی میں خوش تھا لیکن اُدھر زاہدہ کے گھر والے خصوصاً والد صاحب آمادہ نہیں ہو پارہے تھے۔ بہت دنوں تک حجت ہوتی رہی۔ دونوں پرعزم تھے کہ کسی طور یہ مسلک و فرقے کا قضیہ ٹل جائے گا۔ بہ ہر حال 1970ء میں زاہدہ جون کی دلہن بن کے گھر میں آبسیں۔ نومبر 1969ء میں شکیل عادل زادہ کی علیحدگی کے بعد وہ عالمی ڈائجسٹ کی مدیر بن چکی تھیں۔

اس بیاہ نے بعد ازاں انھیں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا کیا۔ زاہدہ حنا صاحبِ طرز ادیبہ جنھوں نے سفرِ حیات میں اب تک عمدہ فکشن اور مضامین کے دو ہزار سے زیادہ فن پارے تخلیق کیے ہیں، ایک بااصول اور نظریاتی تخلیق کار بھی ثابت ہوئی ہیں۔ کئی انعامات، اعزازات اور ایوارڈ حاصل کرنے کے علاوہ سب سے بڑھ کر انھوں نے ایک تمغہ، عزت و منزلت کا حقیقی مرتبہ پایا ہے۔

ہمارے وطن میں ادیب، شاعر، تخلیق کار عمر بھر کی محنت کے بعد عزت اور گنتی کے چند ٹکے ہی کما پاتے ہیں۔ ایسے میں قومی اعزاز اُن کے لیے حوصلہ افزائی کا اَن مول تحفہ ہوتا ہے۔ حکومت پاکستان نے 2006ء میں انھیں پرائڈ آف پرفارمنس دینے کا اعلان کیا جسے انھوں نے اس وقت کی فوجی آمریت کے خلاف احتجاجاً لینے سے انکار کردیا اور رَد کردیا۔ زاہدہ اور سلیم الرحمان صاحب جیسی شخصیات ہی معاشرتی ضمیر کے ماتھے پر سونے میں ڈھلا جھومر ہیں۔

1971ء جون کی زندگی میں شہرت کا دوسرا درجہ لے کر آیا۔ 16 دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا الم ناک سانحہ ہوا۔ آنسوؤں میں بھیگی اُس رات کو عبیداللہ علیم نے پاکستان ٹیلی وژن کے لیے ان سے نظم لکھوائی۔ نظم کا عنوان تھا ''استفسار''۔ اس کا شعر تھا۔

کیا اِس قدر حقیر تھا اس قوم کا وقار
ہر شہر تم سے پوچھ رہا ہے، جواب دو!

اس نظم نے لوگوں کے دل چھولیے اور یہ عوام کے جذبات کی آواز بن گئی۔ پاکستان ٹیلی وژن سب سے مقبول ومعروف ذریعۂ ابلاغ تھا۔ جون ایلیا کی شہرت خواص کے دائرے سے نکل کر عوام کے بحرِ بے کراں میں موج در موج پھیلنے لگی۔

مبالغہ جون کی سرشت میں تھا۔ شاہ نامۂ فردوسی 60 ہزار اشعار پر مشتمل ایک عالم گیر شہرت وعظمت کا حامل رزمیہ ہے۔ جون نے فردوسی کے اتباع میں 50 ہزار سطروں پر مشتمل ''نئی آگ کا عہد نامہ'' لکھنے کا اعلان کردیا۔ کئی برس گزر گئے۔ اس عہد نامے کے ہر حصے کو لوح اور ان کی جمع کو الواح کہا گیا۔ سال ہا سال بعد جون نے دکھ سے اعلان کیا کہ بہت سی الواح چوری کر لی گئی ہیں۔ بعد میں کہا گیا کہ کئی الواح کھوگئی ہیں۔ بالآخر پانچ ہزار سطروں کی بات ہوئی اور یہ بات بھی نامکمل رہ گئی۔

زاہدہ حنا ان الواح کے ابتدائی سامعین میں سے تھیں۔ وہ رقم طراز ہیں۔

''نئی آگ کا عہدنامہ'' کی ابتدائی الواح میں ن م راشد کی جھلک نظر آتی تھی۔ 'حسن کوزہ گر'، 'اسرافیل کی موت' بہ طور خاص 'دل مرے صحرا نورد'، جس میں راشد نے آگ کا ذکر سورنگ سے کیا ہے۔ وہ آگ جو پرومی تھیس نے کوہ اَلمپس سے چرائی اور اس نیم حیوان

دو پایہ کو دی جس کے لیے دیوتاؤں نے آگ ممنوع کر رکھی تھی۔ اسی جرأت کے سبب پرومی تھیس معتوب و مقہور ٹھیرا اور 30 ہزار برس کی سزا کاٹی۔ اسی نے آگ سے انسان کو آہن گری سکھائی، شکار کے کچے گوشت کو بھون کر کھانے کا سلیقہ عطا کیا، آگ جو اندھیری رات میں اسے بھیڑیوں اور لگڑ بگھوں سے بچاتی تھی، وہ آگ جس نے خاک کے پتلے کو انسان بنایا، اسی آگ سے چراغ جلے اور انسان پر علم و ہنر کے دروازے وا ہوئے۔ آگ جس کی تعظیم کا حق زرتشتیوں نے ادا کیا۔''

وہ دور جون کی پُرگوئی کا زمانہ ہے۔ ان کے ہاں خیال اور اس کی ترسیل جداگانہ اور حقیقی نظر آتے ہیں۔ جون نے اپنی شاعری سے سیکڑوں نئے خیالات، تشبیہات اور استعارے متعارف کروائے۔ اُنھیں قبل از اسلام کا عرب اپنی اُور بلاتا تھا، وہ اُس دور کے کاہنوں سے تخلیقی تحریک حاصل کرتے تھے۔ اُن کے ہاں انجیلِ مقدس، قرآنِ کریم اور دیگر صحائف کے نشانات ملتے ہیں، معتزلہ فلسفیوں کے مباحث، کانٹ، نطشے اور سارتر کے خیالات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس علمی مرتبے ہی نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کو ایسا متاثر کیا تھا کہ وہ جون کی نوجوانی ہی میں اُن کی آمد پر کھڑے ہو گئے تھے۔ جون خوب جانتے تھے کہ فلسفے کی ابتدا حیرت و استعجاب سے ہوتی ہے۔ اس میں تشکیک کا رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ کائنات وسیع ہے اور فہمِ انسان میں آنے والے سوالات بے شمار۔ قدم قدم پر الجھنیں انسان کے قدموں سے لپٹ جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی بھتیجی شاہانہ کو سقراط کے دمِ آخریں کا جملہ سنایا تھا ''افسوس کہ پیچیدہ گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے وقت تمام ہو گیا۔ ہاتھ کیا آیا؟ کچھ بھی نہیں۔''

اُن کا اپنی بھتیجی کو فلسفے کا درس دیتے ہوئے مکالمہ اُن کی ذہنی پختگی کا عکاس ہے۔

''مذہبی لوگوں کو معلوم تو ہو کہ اسلام میں فلسفے کا کیا مقام ہے۔ جب فلسفہ یونان سے دنیائے اسلام میں پہنچا تو وہیں سے ان دونوں میں ٹھن گئی اور جب غزالی نے ابونصر فارابی، ابنِ رشد اور ابنِ سینا جیسے دیوقامت فلسفیوں کی تعلیم سے انکار کیا تو شدت سے آگ بھڑک اُٹھی۔''

''مگر چچا آخر دنیائے اسلام کو فلسفے سے کیوں نفرت ہوئی۔'' اُس نے دل چسپی سے پوچھا۔

''ہاں، تُو نے اچھا سوال کیا۔ ایک فرانسیسی دانش ور ارنسٹ رینان تھا۔ وہ کہتا ہے کہ سامی نسل یعنی عرب مسلمان اور یہودی ایک خاص مزاج کے حامل ہیں۔ وہ نظریہ توحید کے علاوہ اور کوئی نظریہ ایجاد نہ کر سکے۔ رینان کہتا ہے کہ سامی نسل کے ذہن میں پیچ در پیچ مسائل کی گنجایش نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سامی لوگوں کی عقل بدوی اور صحرائی ہے۔ عرب مختلف چیزوں کے درمیان ربط پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ کمال آریائی قوم کا ہے۔''

تفکر اُن کے معدے پر اثر انداز ہوتا رہا۔ صحت بگڑتی رہی۔ آگہی کا بوجھ اُن کی کمر توڑتا رہا۔ وہ اس وزن سے نجات کے لیے چند پالتو خبطوں سے مدد لیتے رہے۔ اہل دانش میں سنک اور خبط عام رہے ہیں، بحیرۂ اسود کے یونانی دیوجانس کلبی سے لے کر آرمینیا اور دلی کے سرمد تک، مزنگ، لاہور کے میراجی سے لے کر امروہے کے جون ایلیا تک سبھی اس قافلے میں شامل رہے ہیں۔ ویسے بھی ایک مفکر سے توقع کرنا کہ وہ ولی اللہ کی صفات کا حامل ہو، ایک کھلاڑی سے فلسفے کی اُمید کرنا اور شاعر سے انسانِ کامل ہونے کی خواہش کرنا ایسے ہی ہے جیسے شیر سے مور کا انڈا دینے کی توقع کی جائے۔

فقرے بازی اور کلیے وضع کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ کیا چست اور شان دار فقرے اور کلیے تخلیق کرتے۔ ان کے نثری مجموعے 'فرنود' میں ایسے بے شمار جملے ملتے ہیں جو انھی کا خاصہ ہیں۔ لکھتے ہیں ''اگر آپ کام یاب عشق کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک غیر عاشق اور عاقل قسم کا آدمی ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت عیار اور گھٹیا شخص۔'' ایک پُر معانی جملہ ہے ''کوئی جنازہ کبھی تنہا نہیں اُٹھتا، اُس کے ساتھ کئی جنازے اُٹھتے ہیں۔'' اسی طرح ایک پیچیدہ گتھی کو جملے میں بیان کر دیا ''اسلام ایک نظامِ حیات ہے اور فلسفہ وجود کی مطلق و مجرد بحث کا نام ہے۔ اسی لیے فلسفہ مسلمانوں میں آ کر فنا ہو گیا۔''

ایک جانب جون کی فکر جولانی پر تھی، دوسری جانب سنک بڑھ رہی تھی۔

اُن کے مزاج کی آزادروی، احباب کے ساتھ تسلسل سے بسر کی گئی شامیں اور معاشی ذمّے داریوں سے روگردانی شادی پر آنچ لے آئیں۔ بچوں کو نظر انداز کیے جانے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ چشم کشا امر تو یہ ہے کہ تمام تر شاعرانہ مزاج اور دل پھینک اطوار کے باوجود شادی کے دوران جون زاہدہ سے مکمل وفادار رہے۔ اُن کا اور زاہدہ کا بیاہ آگ

اور پانی کا ملاپ تھا۔ اب ایسا موقع آگیا تھا کہ یا تو پانی آگ کو بجھا ڈالتا یا آگ پانی کو
خشک کر دیتی۔

بالآخر وہ وقت آگیا جب زاہدہ نے جون صاحب سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ ان
کے احباب کا کہنا ہے، یہ مطالبہ جون پر بجلی کی کڑک کی طرح ٹوٹا۔ انھوں نے اپنی سی بھر پور
کوشش کی، منّت سماجت اور ناراضی اختیار کر کے دیکھ لی پر یہ علیحدگی قسمت کے صحائف پر
رقم ہو چکی تھی۔ اس طرح یہ جوڑی ٹوٹ گئی۔

طلاق کے بعد جون کی زود رنجی بڑھ گئی اور توہم پرستی بھی۔ توہم پرست تو وہ شروع
سے تھے۔ اکیلے میں گھٹنوں کے بَل کچھ پڑھتے رہتے، پھر کھڑے ہو کر زیر لب پڑھنے
لگتے۔ لکھنے سے پہلے گیارہ کا ہندسہ لکھا کرتے تھے۔ غم گینی ان کی سرشت میں تھی۔

وہ اکثر رات کو جذباتی کیفیت میں رئیس امروہوی کی قدِ آدم تصویر کے سامنے
کھڑے ہو جاتے تھے، روتے تھے اور اپنے بال نوچتے ہوئے بڑے بھائی کو ملامت کرتے
ہوئے کہتے تھے ''تُو کیوں مر گیا، تُو ڈراماباز ہے۔ جان کر ڈرامے کا اختتام ایسے کیا کہ سب
تڑپ کر رہ گئے۔''

علیحدگی کے بعد جون نے مزاروں پر جانا شروع کر دیا۔ دِلّی میں نظام الدین اولیاؒ
کے مزار پر گئے تو دن بھر وہیں پڑے رہتے۔ کراچی سے لے کر سیہون تک اور لاہور سے
لے کر دِلّی تک مزاروں کا طواف کرنا عادت سی بن گیا پر دل کی بے قراری کو قرار نہ آتا تھا۔

ایک روز دن بھر شہر گردی کر کے جون گھر آئے تو اُن کے چہرے پر زردی کھنڈی
ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے جسم سے خون نچوڑ لیا گیا ہو، کہنے لگے۔

''میرا ایکسا تیار کر دے، میں جا رہا ہوں۔''

پوچھا گیا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

انھوں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں، میں امروہہ جا رہا ہوں۔ اماں اور ابا
کے پاس۔ میں اب یہاں رہ کر کیا کروں۔ میں برباد ہو گیا۔ مجھے اماں کے پاس جانا ہے۔''

بہت عرصے بعد جون کا یہ جنون تھما۔

چند برس آہ و زاری، کچھ سال اُداسی اور مزید گنتی کے برس آس میں گزر گئے۔

یہ آس ایک اور بیاہ رچانے کی، ایک اور رومان لڑانے کی تھی۔

ہر دوسرے شخص سے درخواست، التجا، تقاضا کرتے کہ ان کا بیاہ کروادیا جائے۔ جلد ہی ان کی یہ خواہش معروف ہوگئی۔ اُن کی چند مداح لڑکیوں، بالیوں اور خواتین نے اس خواہش کا فائدہ یوں بھی اُٹھایا کہ شاعری کی اصلاح لی، اپنے وقت کے اہم شاعر کے ساتھ گپ شپ میں وقت بتا کر یادوں کے تتلی گھر میں لمحات کی چند تتلیاں سجائیں اور اُڑن چھو ہوگئیں۔

اُن میں سے ایک لڑکی گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ کوئی اور بیچ میں آن بیٹھتا تو جون باقاعدہ شرما جاتے۔ آخر کو بڑی عمر کے لڑکے ہی تو تھے۔

آہستہ آہستہ وہ لڑکی ان کی زندگی میں پوری طرح داخل ہوگئی۔ جون کو زکام ہوتا تو ادرک اور دار چینی کی چائے بناتی، جون اُداس ہوتے تو دِل لبھاتی۔

اہلِ خانہ کا خیال تھا کہ وہ جون کے ساتھ اپنا نام منسوب کر کے مشہور ہونا چاہتی تھی۔ ایک دن شاہانہ ٹہلتی ہوئی جون کے دفتر جا نکلیں تو وہاں اُس لڑکی کو جون کی کرسی کے پیچھے یوں کھڑا پایا کہ وہ ان کا سر دبا رہی تھی۔ بھتیجی نے چچا سے پوچھا کہ اُنھیں کیا ہوا تو وہ لڑکی بول اُٹھی۔

''جون صاحب کے سر میں درد ہے۔ باجی مجھے تیل لا دیجیے۔ میں ان کے سر میں مالش کر دوں۔''

بھتیجی اندر چلی گئی تو جون گھبرائے ہوئے پیچھے پیچھے آئے اور بولے ''باؤلی ہوگئی ہے، میرے سر میں تیل کی مالش کرے گی تو اُسے معلوم ہوگا کہ میرے سر میں جوئیں ہیں، تُو واپس مت آنا۔''

وہ لڑکی جون کو اپنے گھر سے لائے ہوئے کھانے نوالے بنا بنا کر کھلاتی اور جون شرماتے ہوئے فرماں برداری سے کھاتے جاتے۔

دونوں خوب بن ٹھن کر ادبی محافل میں جاتے۔

جون جو ہر کسی سے اپنی شادی کا کہتے تھے، اس لڑکی سے بیاہ کا کسی کو نہ کہتے تھے۔ غالباً جون خود بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

آہستہ آہستہ یہ تعلق کم زور پڑنے لگا۔ دونوں کی عمروں میں تیس برس کا فرق تھا۔ ابتدائی چمک ماند پڑی اور غیر محسوس انداز میں یہ تعلق دوستی سے ہوتا ہوا شناسائی تک آیا اور اجنبیت پر ختم ہو گیا۔

جون کی شہرت کا آخری درجہ ان کی شاعری کی پہلی کتاب ''شاید'' کی اشاعت کے ساتھ آیا۔ یہ تیسرا درجہ تھا۔ اب وہ صاحبِ کتاب تھے۔ اس سے پہلے ان کا کلام بکھرا ہوا تھا، سوائے باقاعدہ تعارف مل گیا تھا۔ اُن کا پہلا مجموعۂ کلام 1990ء میں تب سامنے آیا جب وہ قریباً ساٹھ برس کے ہو چلے تھے۔

اس تاخیر کی بھی ایک وجہ تھی۔

جون نے اپنے والد علامہ شفیق حسن ایلیا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بڑے ہو کر والد کی تخلیقات شایع کروائیں گے۔ والد کی وفات کے بعد، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے سارے مسوّدات کھو گئے۔ والد کی تصانیف نہ چھپوا سکنے کا جون کو بہت احساس تھا۔ ندامت کے اسی احساس نے جون کو ان کا اپنا کلام شایع کروانے سے روکے رکھا۔

چند ستم ظریف اس کا پہلوئے دیگر بھی کھوج نکالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جون نے والد سے وعدہ کیا تھا کہ بڑے ہو کر وہ ان کا کام شایع کروائیں گے۔ جون تو ساری عمر بڑے ہوئے ہی نہیں، وہی من چلے انداز اور بانک پن کی زندگی۔ سو اگر انھوں نے وعدہ ایفا نہیں کیا تو اس کی مدلل وضاحت موجود تھی۔ جون کے آخری ایام کے بارے میں شکیل عادل زادہ فرماتے ہیں۔

'آخری عمر میں جون کو دو بہت مخلص دوستوں کی قربت میسر رہی۔ یہ اُن کی خوش نصیبی تھی اور ان احباب کی بھی۔ ایک خالد احمد انصاری ہیں جنھوں نے جون کی وفات کے بعد ان کے تین شعری مجموعے ''گمان''، ''لیکن'' اور ''گویا'' شایع کر کے ان کا کلام محفوظ کر لیا اور ان کی نثر کو بھی۔ جون کے شاہ کار مقالوں کی کتاب 'فرنود' کی اشاعت کا بھی خالد انصاری نے اہتمام کیا۔ ناقدین کی رائے میں یہ ایک بے پناہ نثری مجموعہ ہے۔ ساتھ ہی الواح پر مشتمل طویل رزمیہ نظم 'راموز' بھی شایع کی۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ مخلص اور جاں نثار دوست صدقۂ جاریہ ہوتے ہیں۔

دوسرے دوست علامہ علی کرار نقوی تھے جن کے گھر جون نے آخری ایام گزارے۔ وہ جون کے عزیز تھے، بیماری میں اُن کا علاج کروایا، اُن کے پیسوں کی حفاظت کی اور جون کی وفات بہ روز 8 نومبر 2002ء کے بعد جنازہ بھی انھی کے ہاں سے اُٹھا۔

بعد ازاں انھوں نے جون کی ایک ایک پائی اُن کی اولاد کو بہ حفاظت یوں سونپ دی جیسے ایک بھاری ذمے داری سے عہدہ برآ ہوئے ہوں۔

زمانۂ حال میں ایسے لوگ نایاب ہیں۔'

جون صاحب جس دنیا سے تھے، وہیں لوٹ گئے۔ 'گمان' ہوتا ہے، 'شاید' جون، رئیس، تقی اور عباس صاحب کے ہم راہ اُوپر اندر سبھا سجائے بیٹھے ہوں۔ 'گویا' وقت تھم چکا ہو، کراچی کی کوٹھی 'نرجس' ہی میں وقت منجمد ہو' لیکن' جب آسمانوں کے اس مقام پر ان کی محفل سے کوئی گزرے گا تو یقیناً جون اُسے پکاریں گے' جانی! ذرا برف لے کر آنا۔'

نادرِ روزگار تھے ہم تو

عرفان ستار

جون ایلیا کی تخلیقی شخصیت پر ہمیشہ اُن کی ذاتی شخصیت کا غلبہ رہا۔ ادبی دنیا کی اُن کے ساتھ ایک Love-Hate Relationship رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شخصیت تو موضوعِ گفت گو رہی مگر ان کی شاعری کو کبھی Objectively پڑھا ہی نہ گیا۔ میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ بیش تر نقادوں اور زیادہ تر شعرا کو جون ایلیا کے دس پندرہ سے زیادہ اشعار نہ یاد ہیں، نہ انھوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ کتنا بڑا آدمی ان کے سامنے سے ہو کر گزر گیا۔ حیرت کا مقام ہوتا ہے جب جون صاحب کا تقابل ایسے شعرا کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کا نہ اپنا لہجہ ہے نہ انھوں نے اپنی یا اپنے بعد آنے والی نسل پر کوئی گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اور اس وقت بھی مجھے حیرت ہوتی ہے جب اس عہد کے اہم ترین شعرا کی فہرست میں جون صاحب کا نام اکثر شامل ہونے سے رہ جاتا ہے۔

خیر جو ہوا سو ہوا۔ جون ایلیا اچھا شاعر نہیں ہے۔ جون ایلیا بہت اچھا شاعر بھی نہیں ہے۔ جون ایلیا بہت اہم شاعر بھی نہیں ہے۔ جون ایلیا تقسیمِ ہندوستان کے بعد سے آج تک کے سب سے بڑے شاعروں میں سے ایک ہے۔ گویا کن شعرا کے ساتھ میں انھیں شمار کر رہا ہوں؟ فیضؔ، راشدؔ، مجید امجدؔ اور عزیز حامد مدنی۔ جون ایلیا میری نظر میں ان چاروں کے ساتھ وہ پانچواں بڑا شاعر ہے جس نے اُردو شاعری کے گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں پر اپنے گہرے اور اَن مٹ نقش ثبت کیے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس دعوے کی کوئی حیثیت نہیں اگر میں اس کے حق میں ناقابلِ تردید دلائل نہ پیش کر سکا۔ مگر مجھے اس بات کی

کوئی فکر اس لیے نہیں کہ جون ایلیا کی شاعری ایسے کسی بھی دعوے کے حق میں دلائل سے بھری پڑی ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے ان جملوں پر بہت سے لوگ یہ کہیں گے کہ 'حد ہوگئی۔ جون ایلیا اور بڑا شاعر؟ ایک چھوٹے سے دائرے میں گھومنے والی شاعری اور بڑی؟ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔' اس پر میرا جواب یہ ہے کہ جون کی شاعری ایک چھوٹے سے دائرے میں نہیں گھومتی، آپ کا ذہن گھومتا ہے۔ آپ نے جون ایلیا کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں بنا رکھا ہے، جس میں دس پندرہ اشعار فٹ ہوتے ہیں۔ باقی پر آپ غور کرنے کی یا تو صلاحیت نہیں رکھتے یا ہمت سے محروم ہیں۔

ہمت کی بات کہاں سے آ گئی؟ ہمت ہی کی تو بات ہے۔ وہ تمام نقاد اور شاعر جو جون ایلیا کے ہم عصر ہیں، ان سب سے میرا یہ مضمون ایک سوال کر رہا ہے اور سوال یہ ہے کہ جناب جون ایلیا جیسے شاعر کو اس کا جائز مقام نہ دینا آپ کی مصلحت تھی، یا شعر فہمی اور بصیرت کی کمی؟ کیا آپ کے خیال میں اس سوال کا جواب آسان ہے؟ آسان نہیں ہے۔ یہ ان نام نہاد سکہ بند نقادوں اور بہ زعمِ خود صاحبانِ علم سے تقاضا ہے کہ یا تو جون ایلیا کو اس مسندِ فضیلت پر بٹھائیں جو ان کے لیے بنی تھی، یا یہ ثابت کریں کہ جون ایلیا اس مسند کے قابل نہیں ہے، یا اپنا جرم قبول کریں۔ بہ ہر صورت جواب دینا اُن کا فرض ہے۔

چلیے اب یہ طے کیجیے کہ بڑا شاعر کون ہوتا ہے؟ میرے نزدیک بڑی شاعری کے چار بنیادی عناصر ہیں۔ بڑی شاعری کے عناصرِ اربعہ کہہ لیجیے۔

1- زبان کی درستی، ذخیرۂ الفاظ اور الفاظ کو برتنے کا سلیقہ
2- مضمون آفرینی اور ندرتِ خیال
3- قدرتِ اظہار
4- شعریت

ان چار عناصر کی موجودگی ہی کسی شاعر کی بڑی شعری روایت سے وابستگی، اس کے اپنے عہد پر اثرات اور اس کے بعد آنے والوں کے تخلیقی سفر میں ان کی رہ نمائی کو یقینی بناتی ہے۔

یہاں تک لکھا تھا کہ جون صاحب کی ایک بات یاد آ گئی اور میری انگلیاں ٹائپنگ

کرتے ہوئے اچانک جم سی گئیں۔

'جانی! اگر کہیں مجھ سے محبت کرنے والے جمع ہوں تو تیرا صرف ایک کام ہے۔ انھیں میرے شعر سنانا۔ جیسے تُو میرے شعر پڑھتا ہے، ویسے انھیں کوئی نہیں سنا سکتا۔ تیرا جون بھائی مقالوں کا موضوع نہیں ہے۔ مقالہ نگاروں کے لیے تو جون ایلیا ہمیشہ ایک مسئلہ شاعر رہے گا۔ انھیں اس مسئلے سے اُلجھنے دے۔ تُو میرے شعر سنایا کر۔ میں اپنی شاعری میں زندہ ہوں۔ اسے زندہ رکھ تو سمجھ کہ میں زندہ رہوں گا۔'

بات سمجھ میں آ گئی۔ جون بڑا شاعر اس لیے نہیں کہ وہ ان تمام کسوٹیوں پر کھرا اُتر سکتا ہے جو صدیوں کی شعری روایت اور تنقیدی معیارات کے تحت قائم ہوئی ہیں۔ جون بڑا شاعر اس لیے ہے کہ شاعری کے سب سے بڑے موضوع، یعنی انسان کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیات پر جیسے اشعار جون ایلیا نے کہے ہیں، اُردو شاعری کی روایت میں اُس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جون ایلیا بڑا شاعر اس لیے ہے کہ کیفیت کو ایک شدید ترین احساس کی صورت میں قاری یا سامع تک منتقل کرنے کی جو صلاحیت جون کے یہاں ہے، اُردو شاعری میں اس کی مثال صرف میرؔ کے یہاں ملتی ہے۔

جون ایلیا کے ساتھ دو بڑے ظلم ہوئے۔ اوّل یہ کہ انھیں 'شاید' کے بعد اپنا کلام منتخب کرنے کا موقع نہ ملا اور نتیجتاً ان کا نسبتاً کم زور کلام بھی ان کے مجموعوں میں شامل ہو گیا۔ جون صاحب بہت زُود گو شاعر تھے اور روز بہت کچھ کہتے تھے۔ مگر ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کا وہ کلام بھی شایع کر دیا جائے گا جو اُن کے لیے مشق، تجربے، یا بسا اوقات محض وقت گزاری کے ایک مشغلے کے ضمن میں آتا ہے۔ جون سراپا شاعر تھے اور شاعری کے سوا کچھ کرنا انھیں نہیں آتا تھا۔ لہٰذا وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ کبھی پھاڑ دیتے تھے، کبھی رکھ چھوڑتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 'شاید' کے مقابلے میں ان کے باقی تمام مجموعے نسبتاً کم زور لگتے ہیں۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ انھیں اچھا قاری تو ملا مگر اچھا نقاد نصیب نہ ہوا۔ ان کے سینئر اور ہم عصر نقادوں نے زبانی کلامی تو انھیں بہت سراہا، مگر ان کے کلام کی بڑائی کا تحریری طور پر اعتراف نہ کیا۔ آج بھی ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کوئی صاحب جون صاحب کے دس پندرہ 'ناف پیالہ' والے اشعار پکڑ کر انھیں ایک بیمار، برا اور نیم پاگل شاعر قرار دے کر

تالیاں بجواتے نظر آتے ہیں۔

رابرٹ فراسٹ نے کہا تھا کہ 'Poetry is what is lost during translation'

آخر کیوں؟ ایسا کیا ہے جو الفاظ میں منتقل ہونے سے رہ جاتا ہے؟ اس کا جواب ہے کیفیت۔ وہ کیفیت جو شعر کے الفاظ اور ان کے معانی میں نہیں، ان کے باہم ملاپ سے پیدا ہونے والی ایک ایسی حقیقت ہے جسے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ صرف محسوس کروایا جا سکتا ہے۔ آج میں آپ کو جون ایلیا۔ کے احساس میں شریک کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ وہ اشعار ہیں جو رابرٹ فراسٹ کے بیان کردہ معیار کا کامل نمونہ ہیں۔ ان کی تشریح میں وہ کیفیت آ ہی نہیں سکتی جو ان اشعار کے دو مصرعوں میں موجود ہے۔ ان اشعار کو سن کر اگر آپ کے منھ سے واہ اور دل سے آہ نکلے تو سمجھیے جون ایلیا زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اشعار کے انتخاب کا معیار میرا حافظہ ہے۔ جون ایلیا ان شاعروں میں سے نہیں جن کے یہاں اچھے اشعار ڈھونڈنے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ جون کے یہاں تو ایک انبار لگا ہوا ہے ایسے اشعار کا جن میں سے ایک ایک کے ساتھ پوری پوری رات گزاری جا سکتی ہے۔

آیئے اور میرے ساتھ جون ایلیا کی شاعری سے اپنے احساس کو مہمیز کریں۔

کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

کسی محبت کرنے والے کے لیے اس سے زیادہ روح فرسا کیفیت اور کیا ہوگی کہ اس کے محبوب کے خال و خط اُس کے حافظے میں دھندلانے لگیں اور پھر اس کا ایسا اظہار کہ 'کیا ستم ہے......' ایسے دل میں جا گڑے کہ منھ سے بے اختیار آہ نکلے۔ یہ کیفیت نئی ہرگز نہیں ہے۔ اس کیفیت کا ایسا اظہار صرف جون ایلیا کے یہاں ملتا ہے۔

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

بھری پری دنیا میں ایک ہی شخص دنیا کیسے بن جاتا ہے، یہ عشق کرنے والے جانتے ہیں۔ مگر ایسا اظہار اُردو شاعری میں کتنی بار ہو سکا ہوگا؟ یہ قدرتِ کلام کا لازوال نمونہ ہے جس کے لیے بھاری بھرکم الفاظ کی نہیں بل کہ عام الفاظ کو ایسے باکمال انداز سے برتنے کی

ضرورت ہوتی ہے جو ایک خاص صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں۔

گرم جوشی اور اس قدر، کیا بات
کیا تمھیں مجھ سے کچھ شکایت ہے؟

کیا بات ہے۔ کیسی نازک Behavioral Complexity کو کیسے شعر میں ڈھالا ہے جون صاحب نے۔ یا یہ شعر دیکھیے۔

مل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ
مجھ کو یک سر بھلا چکی ہو کیا

یہ اُردو شاعری میں بالکل مختلف مزاج کے اشعار ہیں۔ یہ ان کیفیات کے اشعار ہیں جن سے انسان گزرتا تو تھا مگر کوئی ایسا شاعر جون ایلیا سے پہلے نہ تھا جو ان کیفیات کو شاعری کے قالب میں ڈھال سکتا۔

کیا کہا؟ عشق جاودانی ہے
آخری بار مل رہی ہو کیا

کیا جواب ہو اس شعر کا؟ کیا داد دی جائے۔ ایک سوال اور اس کے جواب میں ایک اور سوال ..... اور کیفیت ایسی کہ بس قیامت۔

عشق کو درمیاں نہ لاؤ کہ میں
چیختا ہوں بدن کی عسرت میں

اب میرے مخاطب وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جون بیمار ذہن کا شاعر ہے۔ رانوں، پستانوں اور ناف پیالوں پر شعر کہتا ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ بیمار جون نہیں، آپ ہیں۔ آپ کو انسان کی نفسانی خواہشوں اور فطری جذبات سے خوف آتا ہے، اس لیے آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ جون اس پہلو کو انسانی وجود کی ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتا ہے، اس لیے اس کے بیان اور اس سے متعلق کیفیات کے اظہار میں جھجکتا نہیں۔ یہ کہنے کا حوصلہ کسی معمولی انسان میں ہو ہی نہیں سکتا کہ عشق کو درمیاں نہ لاؤ..... یہاں تو خالصتاً جسمانی تعلق کو عشق تصور کر کے کتابوں کی کتابیں لکھ دی جاتی ہیں اور یہ شخص ہے کہ کہتا ہے، چیختا ہوں بدن کی عسرت میں؟ یہ اُردو شاعری میں ایک بالکل تازہ لہجہ اور

طرزِ احساس و اظہار ہے۔

میں اُسی طرح تو بہلتا ہوں
اور سب جس طرح بہلتے ہیں

بہ ظاہر سادہ نظر آنے والا یہ شعر ایک ایسے انسان کی نفسیاتی کیفیت کی بھرپور ترجمانی ہے جسے اس کے مختلف رویوں اور زندگی سے متعلق مختلف نظریات کی بنا پر Alien سمجھا جائے، جس سے دوری اختیار کرلی جائے۔ جب کہ وہ بے چارہ اندر اندر گھٹتا ہو اور چیختا ہو کہ میں اُسی طرح تو بہلتا ہوں...... ہائے ہائے...... کیا ظلم ہے۔

وہ خلا ہے کہ سوچتا ہوں میں
اُس سے کیا گفت گو ہو خلوت میں

وہ خلا ہے...... اور اس کا اثر خلوت پر...... خلا...... خلوت...... کچھ سمجھے صاحبان؟ یہ شاعری کی کتابیں نہیں شاعروں کے لیے Instruction Manuals ہیں، اگر کوئی سیکھنا چاہے۔

اب فقط عادتوں کی ورزش ہے
روح شامل نہیں شکایت میں
یہ کچھ آسان تو نہیں ہے کہ ہم
روٹھتے اب بھی ہیں مروّت میں

آج ہم اپنے آپ سے سچ بولیں تو ہم میں سے کتنے ہی لوگ ہوں گے جو فقط عادتوں کی ورزش میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مصلحتوں کو مجبوریوں کا نام دیے جا رہے ہیں۔ کسی نامعلوم کے خوف سے معلوم کو جھیل رہے ہیں۔ یہ انوکھی بات نہیں، انسانی زندگی کا حصہ ہے، اکثریت کا احوال ہے۔ مگر اسی احوال کو زبان نہ ملتی تھی۔ یہ جون ایلیا ہی کا کمال ہے کہ اس سادگی سے سب کچھ کہہ گئے کہ۔

اس میں آخر عجب کی بات ہے کیا
تم نہیں تھے مری طبیعت کے

اب ذرا روح کے شکایت میں شامل نہ ہونے اور مروّت میں روٹھنے کی کرب نا کی کو محسوس کیجیے۔ آپ کو جون ایلیا پر بے اختیار پیار آئے گا۔

تو کیا اب نیند بھی آنے لگی ہے
تو بستر کیوں بچھایا جا رہا ہے

یہ شعر قدرتِ اظہار کا ایک نادر نمونہ ہے۔ تو کیا اب نیند بھی آنے لگی ہے؟ اس سوال کے پیچھے ایک پوری داستان ہے جس کے نتیجے میں پوچھنے والے کو حیرت ہو رہی ہے کہ تو کیا اب نیند بھی آنے لگی ہے؟ پھر دو مصرعوں کے درمیان کہیں 'نہیں' لکھا ہوا ہے جو لفظوں میں ظاہر نہیں ہوا، مگر پوچھنے والے کے دوسرے سوال میں موجود ہے...... تو بستر کیوں بچھایا جا رہا ہے؟ یہ غیر معمولی شاعری ہے جناب۔

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

کس گھر کی بات ہو رہی ہے؟ جی ہاں۔ اس گھر کی بھی جو باہر آباد ہے اور جس کو سنبھالنا ایک اپنے اندر رہنے والے شخص کے لیے کارے دارد ہے اور اس گھر کی بھی جو اندر آباد ہے، جسے دل کہتے ہیں، جس پر قیامتیں گزری ہیں اور آج بھی کوئی دن جاتا ہوگا جب اس دل میں کسی یاد کی آندھی ہلچل نہ مچائے اور کچھ ایسا ٹوٹ نہ جائے جو اب تک سلامت تھا۔ اندر کی دنیا جون کی دنیا ہے اور اس دنیا کا جیسا احوال جون نے لکھا وہ جون ہی کا حصہ ہے۔

یادیں ہیں یا بلوا ہے
چلتے ہیں چاقو مجھ میں

یہ شعر کسی بھی حساس انسان کو رُلا سکتا ہے، تڑپا سکتا ہے اور ہر ہر بار جب یہ شعر پڑھا جائے تب تب ایسا ہی ہو سکتا ہے کہ ان اشعار کی تاثیر دُہرانے سے گھٹتی نہیں، بڑھتی ہے۔

تم میری اک خود مستی ہو، میں ہوں تمھاری خود بینی
قصے میں اس عشق کے ہم تم، دونوں بے بنیاد ہوئے

یہاں جون صاحب ہی کی ایک تین مصرعوں پر مبنی نظم یاد آ گئی۔

وہ میرا خیال تھی، سو وہ تھی
میں اُس کا خیال تھا، سو میں تھا
اب دونوں خیال مر چکے ہیں

جب دونوں خیال مر گئے تو کیا رہ گیا؟ حقیقت کی سفاک چیرہ دستی...... میرا جنون تمھیں اپنانا چاہتا تھا۔ تمھاری کوئی کمی مجھ میں اپنا آپ تلاش کر رہی تھی...... تم میری اک خود مستی ہو، میں ہوں تمھاری خود بینی...... نتیجہ؟ قصے میں اس عشق کے ہم تم، دونوں بے بنیاد ہوئے! اللہ اکبر۔

شوق کا رنگ بجھ گیا، یاد کے زخم بھر گئے
کیا مری فصل ہو چکی، کیا مرے دن گزر گئے

یہ بحر جون صاحب کی مرغوب ترین بحر ہے اور اُردو اور فارسی ملا کر بھی دیکھیں تو اس بحر میں اتنی غزلیں کسی نے نہیں کہیں، جتنی جون صاحب نے کہی ہیں اور اس بحر میں ان کا تخلیقی وفور اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اب ذرا شعر کی نازکی پر غور کیجیے۔

شوق کا رنگ بجھ گیا یاد کے زخم بھر گئے
کیا میری فصل ہو چکی، کیا مرے دن گزر گئے

یہ کسی اور سے سوال ہے یا خود کلامی؟ اتنا دھیما لہجہ اور ایسا کاٹ دار؟ نازک ہے بہت کام صاحب...... سینہ کوبی کیجیے یا سر دیوار سے دے ماریے۔ اس سے کم داد کا مستحق یہ شعر نہیں۔

شام ہے کتنی بے تپاک، شہر ہے کتنا سہم ناک
ہم نفسو، کہاں ہو تم، جانے یہ سب کدھر گئے

کون ہیں جو کہتے ہیں کہ جون ایلیا سہلِ ممتنع کا شاعر ہے۔ جناب شام کی بے تپاکی۔ شہر کی سہم ناکی...... یہ اتنی پیچ دار صورتِ حال ہے کہ جدید حسیّت کے تمام دعوے دار اپنی دکانیں بڑھا کر جون ایلیا کے حجرے کی دربانی کریں تو انھیں معلوم ہو کہ جدید حسیّت کسے کہتے ہیں۔ سہلِ ممتنع تک جون صاحب کو محدود سمجھنے والوں کے لیے چند اور اشعار۔

خیرہ سرانِ شوق کا، کوئی نہیں ہے جنبہ دار
شہر میں اس گروہ نے کس کو خفا نہیں کیا
جس کو بھی شیخ و شاہ نے، حکمِ خدا دیا قرار
ہم نے نہیں کیا وہ کام، ہاں با خدا نہیں کیا

تُو کبھی سوچنا بھی مت، تُو نے گنوا دیا مجھے
مجھ کو مرے خیال کی موج بہا کے لے گئی

بند رہے جن کا دروازہ ایسے گھروں کی مت پوچھو
دیواریں گر جاتی ہوں گی، آنگن رہ جاتے ہوں گے
میرا سانس اُکھڑتے ہی سب، بین کریں گے روئیں گے
یعنی میرے بعد بھی یعنی، سانس لیے جاتے ہوں گے

ہم نے خدا کا رَد لکھا، نفی بہ نفی لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پر گراں گزر گئے
میں تو صفوں کے درمیاں کب سے پڑا ہوں نیم جاں
میرے تمام جاں نثار، میرے لیے تو مر گئے

عجب ہے ایک حالت سی ہوا میں
ہمیں جیسے گنوایا جا رہا ہے

ایسے کتنے ہی اشعار ہیں جن کے موضوعات بھی بہت گہرے اور گنجلک ہیں اور جن میں جون صاحب کی قدرتِ کلام اس اوجِ کمال پر ہے کہ اس پر گفت گو ایک مکمل کتاب کا موضوع ہے۔

اس بار وہ تلخی ہے کہ روٹھے بھی نہیں ہم
اب کے وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے

ایسی تلخی کہ روٹھنا اور جھگڑنا ایک تعلق کی تجدید لگے، یہ بالکل جدید طرزِ احساس بھی ہے اور طرزِ اظہار بھی۔ یہ اتنی افراط اور کاملیت کے ساتھ صرف جون ایلیا کے یہاں پایا جاتا ہے۔

جانے تری نہیں کے ساتھ، کتنے ہی جبر تھے کہ تھے
میں نے ترے لحاظ میں، تیرا کہا نہیں کیا

کون ہوگا جو اس شعر سے سرسری گزر جاتا ہوگا؟ کیا اسے یہ احساس ہے کہ کتنا بڑا شعر اس نے سرسری گزار دیا؟ میں نے ترے لحاظ میں تیرا کہا نہیں کیا؟ سبحان اللہ۔

کل دوپہر عجیب سی اک بے دلی رہی
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں

بے دلی کی کیفیت کا ایسا نادر بیان مجھے پوری اُردو شاعری میں دکھا دیجیے تو میں اپنے اس دعوے سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں کہ جون ایلیا ایک بہت اچھا نہیں، بہت بڑا شاعر ہے۔

دل کو تری ہوس سے کسی دم نہیں قرار
ہلکان ہوگیا ہوں تری دل کشی سے میں

ایک لفظ سے کیفیت کو شدید ترین احساس بنا دینا اور ایسا احساس جس کی شدت پڑھنے والے کو پوری پوری محسوس ہو، کوئی معمولی بات نہیں۔ ہلکان کا ایسا برتاؤ کہ اس کی جگہ کوئی لفظ نہ لے سکے، مجھے تو کہیں نہیں ملا۔ ذرا دل کشی سے ہلکان ہونے کا تصور تو اپنے حواس پر طاری کیجیے اور اگر وجد میں آ ئے تو جون ایلیا کو یاد کیجیے۔

یہ حشرِ ناز کہ بس اور یہ تیز تیز نفس
تمھیں سلیقۂ انکار تک نہیں آتا

کیسی منظر کشی ہے۔ ایک قتالہ سامنے صاف دکھائی پڑتی ہے، اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں کے ساتھ اور اس پر یہ شدید مصرع کہ...... تمھیں سلیقۂ انکار تک نہیں آتا...... یہ شاعری ہے صاحب، خالص شاعری۔

مستقل بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

سہل ممتنع؟ چھوٹے سے دائرے کا شاعر۔ یہ چھوٹا سا دائرہ ہے تو بڑا کیا ہوتا ہوگا؟ انسان کی نفسیاتی پیچیدگی کا ایسا اظہار اس قابل ہے کہ اس شعر کے خالق پر یونی ورسٹیوں میں مقالہ در مقالہ کام کیا جا رہا ہو۔ کہاں ہو رہا ہے وہ کام؟ کون لکھ رہا ہے جون ایلیا پر؟ آج ان کے انتقال کو کئی برس گزرنے کے بعد بھی کوئی ایک قابلِ ذکر مضمون کہیں شایع ہوا ہو تو

میرے علم میں نہیں ہے۔

بولنے ہی سے ہیں جو رشتے ہیں
تُو عجب ہے کہ بولتا ہی نہیں

عمرانیات کے ماہرین کو ایسا شعر ہاتھ لگ جائے تو جون کی دست بوسی کریں۔ مگر پڑھے تو کوئی ذہن کھول کر پہلے اس شاعر کو۔

عجیب ہے مری فطرت کہ آج ہی مثلاً
مجھے سکون ملا ہے ترے نہ آنے سے

کیا کسی شاعر نے آج تک انسانی فطرت کی اس نفسیاتی پیچیدگی پر شعر کہا ہے؟ یہ ایک بالکل نیا شعری رویہ ہے جس کا آغاز بھی جون صاحب نے کیا اور اسے ایسے کمال پر پہنچا دیا کہ اب ان کی تقلید کرنا شاید ہی کسی کے لیے ممکن ہو سکے۔

اُس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

کسی غیر انسانی وجود کو احساس بخش دینا جون ایلیا کا کمال ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا تھا کہ آپ ایک گلی کے غم کو اپنی روح کی گہرائی میں محسوس کر سکتے ہیں؟ کیسے ایک گلی ایک پوری انسانی برادری کا استعارہ بن گئی ہے، مذاق نہ باشد۔

جانا نہیں ہے گھر سے نکل کر کہیں مگر
ہر ماہ رُو کے گھر کا پتا چاہیے ہمیں

کیسی سچی کیفیت ہے۔ کتنی بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم اس بات سے قطع نظر کہ ہمیں اس معلومات کی ضرورت ہے یا نہیں، کسی کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ کتنے اشعار اس موضوع پر اُردو شاعری میں ملیں گے آپ کو؟ جون چھوٹے دائرے کا شاعر نہیں، جون ایک آفاقی شاعر ہے جس کا دائرہ پوری انسانی حسیات پر محیط ہے۔

کیا تکلف کریں یہ کہنے میں
جو بھی خوش ہے، ہم اُس سے جلتے ہیں

ایسا سچا اور کھرا شاعر کوئی دوسرا نہ ہوا ہوگا۔ کس میں اتنی ہمت ہوگی جو یہ کہہ سکے؟

مگر کوئی ہے جو اس بات سے انکار کرے؟ حسد کا جذبہ جس شدّت سے انسانی نفسیات میں گہرا اُترا ہوا ہے شاید اتنا کوئی اور جذبہ نہیں، خواہ ہم اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں۔ جون نے اعتراف بھی کیا اور ہمیں آئینہ بھی دکھا دیا۔ اسی طرح کی سچائی پر مبنی ایک اور شعر دیکھیے۔

ہاں ٹھیک ہے، میں اپنی انا کا مریض ہوں
آخر مرے مزاج میں کیوں دخل دے کوئی

بڑے بڑے انا گیر ہیں جو انکسار کا ڈھونگ رچاتے نہیں تھکتے اور یہاں یہ شخص ہے جو کھل کر ایک ایسی انسانی کمزوری کا اعتراف کر رہا ہے، جو بیشتر انسانوں میں ہوتی ہے، مگر جسے قبول کرنے کی ہمت ان میں نہیں ہوتی۔

اک شخص کر رہا ہے ابھی تک وفا کا ذکر
کاش اس زباں دراز کا منہ نوچ لے کوئی

لاہور میں ایک بہت جیّد شاعر نے اس شعر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ 'بتایئے صاحب، یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ شاعر تو وفا کا پرچار کرتا ہے۔ یہ کیسا شاعر ہے جو وفا کا ذکر کرنے والے کا منہ نوچ لینا چاہتا ہے؟' میرا جی چاہا کہ یا تو ان حضرت کا منہ نوچ لوں یا اپنے بال نوچ ڈالوں۔ وفا کی گھٹتی ہوئی قدر اور انسان کی اس بنیادی صفت کے ختم ہونے کا کرب ایسے طنزیہ انداز میں ایک باکمال شاعر کے ایک شان دار شعر کی صورت میں منتج ہوا، جس کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی بہت سے لوگ محروم ہیں۔ محسوس کرنا اور اس کرب میں شریک ہونا تو دُور کی بات ہے۔

ہم موجۂ شمیم کی صورت برہنہ ہیں
تُو رنگ بن کے آ کہ ردا چاہیے ہمیں

غالبؔ نے کہا تھا کہ..... چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا..... کتنے قاری ہیں جنھوں نے یہ بات سمجھی کہ جون ایلیا نے اس خیال کو ایسے Personalize کر دیا ہے کہ مرزا نوشہ سنتے تو جون میاں کا ماتھا چوم لیتے۔

نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو، وہاں اکثر نہ رہیو

Monotony کی صورتِ حال پر ایسا بڑا شعر اگر آپ نے کہیں پڑھا ہو تو میں سننا چاہوں گا۔ اس شعر کا تو پہلا مصرع ہی اتنا بڑا ہے کہ صرف اس پر ایک فلسفیانہ مقالہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔

شکستِ اعتمادِ ذات کے وقت
قیامت آ رہی تھی، آ گئی کیا؟

اپنی ذات پر اعتماد ہی ہے جو جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ دنیا کو جھیلنے کی سکت دیتا ہے۔ جب یہ اعتماد ٹوٹتا ہے تو یہی گمان گزرتا ہے کہ وجود کا اب کوئی جواز نہیں۔ قیامت کا کوئی اور نہیں یہی دن ہے اور پھر یہ سوال...... قیامت آ رہی تھی، آ گئی کیا؟ کیا کہیے اس باب میں مزید۔

اس کی اُمیدِ ناز کا، ہم سے یہ مان تھا کہ آپ
عمر گزار دیجیے، عمر گزار دی گئی

میرے نزدیک یہ جون ایلیا کے بہترین اشعار میں سے ایک ہے۔ شدّتِ احساس کی ترسیل کی ایسی اعلیٰ مثال بہت کم پڑھنے میں آتی ہے۔ کسی بھی شاعر کے لیے یہ سب سے مشکل کام ہوتا ہے کہ قاری تک اس احساس کو اسی شدّت کے ساتھ منتقل کر دے جو اس خاص کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ جون صاحب یہ کام ایسی سہولت سے کر جاتے ہیں کہ انھیں اس کی داد تک نہیں ملتی۔

ہم کہ اے دل سخن سراپا تھے
ہم لبوں پر نہیں رہے آباد

کیسا بڑا المیہ ہے آج کے انسان کا۔ کیبل ٹی وی، سیل فون اور انٹرنیٹ پر مصروف انسان کا المیہ۔ بولنے ہی سے تھے جو رشتے تھے۔ آج کا انسان کیا عجب ہے کہ بولتا ہی نہیں۔ لبوں پر آباد رہنے والے سخن سراپے آج خاموش ہیں۔ تبھی تو ایسی ویرانی ہے دنیا میں ہر طرف۔ مگر جون یہیں پر بس نہیں کر جاتا...... وہ اس المیے سے اتنا متاثر ہے کہ اس کا ذہن فوراً یہ سوال اُٹھاتا ہے کہ۔

جانے کیا واقعہ ہوا کیوں لوگ
اپنے اندر نہیں رہے آباد

جدید حسیت اگر یہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اب پوچھے کوئی ان جید نقادوں سے جو جدید حسیت کا راگ الاپتے ہیں مگر ان کی گفت گو میں کہیں جون ایلیا کا ذکر نہیں آتا۔ جدید عہد کا اس سے زیادہ الم ناک واقعہ کوئی نہیں کہ لوگ اپنے اندر آباد نہیں رہے۔ آج ہم اپنے اطراف میں پھیلی ہوئی اشیا کے حوالے سے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ انسان کے اندرون کی موت ہے۔ گویا انسان کی موت۔ ایک غیر انسانی طرزِ احساس کا مظہر۔ کسی اور مخلوق کی سمت Devolution کی بنیاد۔

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدائیں

جب مایوسی حد سے بڑھتی ہے، جب ایک حساس شاعر اپنے اطراف پھیلتی ہوئی بے گانگی، بھوک، افلاس، ناانصافی دیکھتا ہے تو کسی بھی سوچنے والے ذہن کی طرح خدا کے وجود پر سوال اُٹھاتا ہے، مگر ایک ایسے لہجے میں کہ دیوانے کی بڑ نہیں بل کہ جیسے کسی فلسفی کا قول شعر میں ڈھلتا ہے...... بہت بے آسرا پن ہے، سو چپ رہ۔ نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدائیں!

تُو ہے پہلو میں پھر تری خوش بو
ہو کے باسی کہاں سے آتی ہے

یہ شعر کسی بے وفا محبوبہ کے جسم سے آنے والی مہک کا بیان نہیں۔ یہ ایک بٹے ہوئے انسانی تعلق کا نوحہ ہے۔ اس سے زیادہ تشریح کرنے کے بجائے صرف اتنا کہوں گا کہ جون ایلیا ایک ایسا شاعر ہے جسے بڑی بات کو بالکل سامنے کی بات بنا دینا آتا ہے اور اس خوبی کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والا دھوکا کھا جاتا ہے۔ سپردگی جب کامل سپردگی نہیں رہتی تو پھر تری خوش بو...... ہو کے باسی کہاں سے آتی ہے...... اور آج کے اس دور میں کامل سپردگی ہم بٹے ہوئے انسانوں کے نصیب میں بھلا کہاں؟

خوش ہو سینے کی ان خراشوں پر
پھر تنفس کے یہ صلے بھی کہاں

ایک ایسا انسان جس کے پھیپھڑے چالیس سالہ پرانی ٹی بی اور اس پر دی گئی برسوں پر محیط سگریٹوں کی دھونی نے چھلنی کر رکھے ہوں، اس کا اس تکلیف کو ایسا شعر بنا دینا

کوئی معمولی بات ہے؟

کیوں ہمیں کر دیا گیا مجبور
خود ہی بے اختیار تھے ہم تو

جبر و اختیار پر کیا کیا مباحث قدما، متوسطین سے لے کر آج تک جاری ہیں۔ ایسی فلسفیانہ بحث کو کس سہولت سے دو مصرعوں میں سمیٹ دیا ہے جون ایلیا نے۔ یہ شعر محض ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ جون صاحب کے یہاں اس طرح کے فلسفیانہ موضوعات پر بے شمار اشعار ملتے ہیں۔

اب جو رشتوں میں بندھا ہوں تو کھلا ہے مجھ پر
کب پرند اُڑ نہیں پاتے ہیں پروں کے ہوتے

ذمے داریوں میں بندھا ہوا انسان کتنی ہی بار اس احساس کو اپنے اندر موج زن پاتا ہے، مگر کون شاعر ہے جو اس احساس کو یوں زبان عطا کرنے پر قادر ہے...... جون ایلیا۔

ہم نے جانا تو ہم نے یہ جانا
جو نہیں ہے وہ خوب صورت ہے

انسانی نفسیات کی ایک ازلی اور ابدی کم زوری کو کس خوب صورتی سے شعر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ فلسفہ اور ہوتا کیا ہے؟ بڑی حقیقتوں کا ادراک اور ان کی توجیہ۔ شاعر کا کام بات سمجھانا نہیں ہوتا، بات پہنچانا ہوتا ہے۔ اور بات بھی کیا، اس بات سے متعلق کیفیت۔ کیفیت کی ترسیل ہی شاعری ہے۔

خواہشیں دل کا ساتھ چھوڑ گئیں
یہ اذیت بڑی اذیت ہے

ایک طرف ایسا براہِ راست اظہار اور دوسری طرف یہ شعر۔

وہ جو تعمیر ہونے والی تھی
لگ گئی آگ اُس عمارت میں

ایک انسان اپنے شب و روز میں جن نازک کیفیات سے دو چار رہتا ہے، ان کیفیات کا اُردو شاعری کی معلوم تاریخ میں اتنا شاعرانہ اظہار مجموعی طور پر بھی کم ہی ملتا ہے،

کسی ایک شاعر کے یہاں تو ماسوائے جون ایلیا کی ان کی تلاش فضول ہے۔

زندگی کی غزل تمام ہوئی
قافیہ رہ گیا محبت کا

ایک تمام زندگی کی محرومی اس ایک شعر میں موجود ہے۔ مگر یہ محرومی شاعر کو توڑتی نہیں۔ اس کے احساس کو مہمیز دیتی ہے اور وہ اس تجربے سے گزر کر یہ کہتا ہے کہ۔

ترکِ الفت ہے کس قدر آسان
آج تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں

اس شعر کو آپ پر کھولنے کے لیے میں جون صاحب کا ایک اور شعر پڑھتا چلوں کہ۔

آج کے بعد عشرتِ مجلسِ شامِ غم کہاں
دل نہ لگے گا تیرے بعد، پر ترے بعد ہم کہاں

جب میں ہی نہ رہا تو مجھ سے متعلق کسی چیز کا ہونا یا نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ پس..... آج تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

جمالیات کا اظہار اُردو شاعری میں بہت ہوا ہے، مگر شیروانی پہنے ہوئے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ ایک عاشق کی شدّت، معصومیت، والہانہ پن، ہوس، خواہش، محبت، سب کا ویسا اظہار ہوتا نظر آئے جیسا کہ فطری تقاضا ہے۔ جون صاحب اُردو شاعری میں اس کمی کو بھی پورا کیے دیتے ہیں۔

یارو! کچھ تو ذکر کرو تم اس کی قیامت بانہوں کا
وہ جو سمٹتے ہوں گے اُن میں، وہ تو مر جاتے ہوں گے

کوئی جواب ہے ان دو مصرعوں کا اور کیا ایسی ہی کیفیت اُس عاشق کی نہ ہوگی جس کا محبوب اس کی دسترس سے باہر ہو اور اس کی خواہش اپنے عروج پر ہو؟ یہ سچی شاعری ہے۔ سچی کیفیات کا کھرا اظہار ہے۔

ہے نسیم بہار گرد آلود
خاک اُڑتی ہے اُس مکان میں کیا

ہجرت کا ایسا نوحہ کس نے لکھا ہوگا؟ ہجرت کی کسک ہو یا فراق کی بے چینی، وصال

کی آسودگی ہو یا نامعلوم کی حیرت، خدا کی تلاش ہو یا تقدیر کا جبر، اختیار کا عیش ہو یا ہونے کی صعوبت...... جون ایلیا کے یہاں سب کچھ ہے۔

ابھی اک شورِ ہا و ہُو سنا ہے سار بانوں نے
وہ پاگل قافلے کی ضد میں پیچھے رہ گیا ہوگا

بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جون ایلیا تنہائی پسند، بل کہ مردم بیزار تھے۔ ایسا بالکل نہیں۔ اپنی شاعری میں بھی واحد متکلم سے بہت کام لینے کے باوجود ایک تہذیبی اثاث کے اور انسانیت کی یک جائی کے شاعر ہیں۔

ہے بکھرنے کو یہ محفلِ رنگ و بُو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے
ہر طرف ہو رہی ہے یہی گفت گو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

وہ خواب دیکھتے ہیں تو ساری انسانیت کے لیے دیکھتے ہیں۔ ایک نئی دنیا کا نقشہ اُبھارتے ہیں تو وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے ہوتا ہے۔ ذاتی رنج کو اجتماعی احساس بنا دینا ایک بہت عظیم بات ہے اور جون صاحب اس کے بادشاہ ہیں۔

جو ان روزوں مرا غم ہے وہ یہ ہے
غموں سے بردباری جا رہی ہے

جون ایلیا کی شاعری ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے۔ ایک ایسی تہذیب جس میں رکھ رکھاؤ تھا، محبت تھی، سخن تھا، تعلق تھا، محبت تھی، بردباری تھی، برداشت تھی، انسانیت تھی۔ وہ جدید دور کے انسان کی ایک بات سے بہت چڑتے تھے۔ دوغلا پن۔ دوسروں کو اس بات کی تلقین کرنا جو آپ خود نہ کرتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے جون صاحب سخت چڑ جاتے تھے۔

جو بھی ہو تم پہ معترض، اُس کو یہی جواب دو
آپ بہت شریف ہیں، آپ نے کیا نہیں کیا

وہ ایک ایسی تہذیب کے نمائندہ تھے جو بہت پرانی ہونے کے باوجود آج کی تہذیب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ زیادہ انسان دوست تھی۔

ایسے شاعر پر بات کرتے ہوئے اس تہذیب کا پاس بھی ضروری ہے اور ادب کی بنیادی اقدار سے محبت بھی۔

تمام گفت گو جون صاحب کی غزل کے اشعار تک محدود رہ گئی جب کہ جون صاحب نظم کے بھی بہت بڑے شاعر ہیں۔ تفصیل کسی اور وقت مگر سرِ دست اتنا کہ جون ایلیا کی نظم 'درختِ زرد' اُردو شاعری کی تاریخ کی چند بڑی نظموں میں سے ایک ہے۔ اتنی بڑی کہ اگر آپ جون ایلیا کی غزلوں کو ایک طرف رکھ دیں تو یہ اکیلی نظم انھیں ہمیشہ ایک بڑے شاعر کے طور پر زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

آپ کو ایسے شاعر ملیں گے جن کے مضامین جون کی شاعری میں موجود مضامین کی طرح بڑے ہیں۔ ایسے شاعر بھی ملیں گے جن کی فنی مہارت اور چابک دستی بھی جون ایلیا کے پائے کی ہو۔ وہ شاعر بھی موجود ہیں جن کا ذخیرۂ الفاظ اور الفاظ کو برتنے کا سلیقہ جون ایلیا سے کسی طرح کم نہیں اور ایسے شاعر بھی کچھ ہیں جن کے اشعار میں شعریت ویسے ہی موج زن ہے جیسے جون ایلیا کی شاعری میں مگر ایک خوبی ہے جو صرف جون ایلیا کے پاس ہے...... بے ساختہ، براہِ راست دل میں کُھب جانے والا لہجہ۔ ایسا لہجہ جو جون ایلیا کی شناخت بھی ہے، انفرادیت بھی اور ان کی آئندہ دور میں زندہ رہنے والی شاعری کا جواز بھی۔

اُردو شاعری کا ایک بڑا المیہ ہے۔ اور وہ المیہ یہ ہے کہ غزل کی روایت میں کئی دہائیوں تک ایک جیسے مضامین اور طرزِ اظہار نے شاعروں کو اپنا احوال لکھنے کے بجائے گل و بلبل کی حکایات رقم کرنے پر لگائے رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں احساس کا اظہار زندگی میں احساس اور بدلتے رویوں سے کٹ کر رہ گیا۔ ان پر ستم یہ کہ جدید حسیّت کے نام پر اُردو شاعری میں انگریزی الفاظ کا ٹانکنا، عام بول چال کو رائج کرنا اور مروّجہ اصولوں سے روگردانی کو عہدِ جدید کی نمائندہ شاعری کہہ دیا گیا۔ جدید شاعری وہ ہے جو ایک جدید انسان کے احساس اور کیفیات کی ترجمانی کرے۔ انسان جدید اشیا سے نہیں ہوتا کہ بلب، ٹرک اور کار لکھ کر آپ اس کی ترجمانی کر دیں۔ انسان جدید احساس کی سطح پر ہوتا ہے۔ جون ایلیا ان پانچوں شعرا میں سے، جن کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا، جدید طرزِ احساس اور اظہار کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔

وہ بات رہ گئی کہ جون صاحب بڑے شاعر ہیں یا نہیں۔ مگر ان کے اشعار سنانا ان کی خوشی کے لیے زیادہ اہم تھا۔ جہاں تک جون ایلیا کے بڑے شاعر ہونے کا سوال ہے تو جون ایلیا کی شاعری میں زبان کی درستی، لفظوں کو ان کے پورے امکانات کے ساتھ برتنے کا سلیقہ اور تراکیب اور ردیفیں اخذ کرنے کا جو کمال موجود ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی بات کیجیے تو شاید جوش صاحب اور رئیس امروہوی کے علاوہ کوئی اور شاعر ان کی برابری نہ کر سکے۔ مضامین کا جیسا تنوع ان کے یہاں ملتا ہے، وہ کسی معمولی ذہن کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مصرع سازی اور کیفیت کے اظہار کا جو سلیقہ جون صاحب دکھا گئے ہیں، آنے والا دور اس کے سبب ان پر ناز کرے گا اور شعریت تو گویا جون صاحب پر ختم ہے۔ جب شعریت، کیفیت اور احساس کی ترسیل کی بات آئے تو بس پھر ایک میر جون اور ایک میر تقی۔

شاعر تو دو ہیں، میر تقی اور میر جون
باقی جو ہیں، وہ شام و سحر خیریت سے ہیں

اس شعر کو اس کے لغوی معنی میں بے شک نہ لیجیے، مگر جون ایلیا کو محض ایک اچھا یا بہت اچھا شاعر کہہ کر مت گزر جائیے۔ جون ایلیا ایک بڑا شاعر ہے۔ اس پر بات کیجیے، تنقید کیجیے، عیب گنوائیے، میری باتوں کو رَد کیجیے مگر خاموش نہ رہیے۔

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

یاد تھے، یادگار تھے ہم تو

عزیز احمد

جاڑوں کی اک نرم دوپہر خالد انصاری سے میرا صوتی رابطہ قائم ہوا کہ وہ جون بھائی پر لکھی تحریریں مرتب کر رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ایسا لگا کہ چھت ٹوٹ کر مجھ پر آن گری ہے کیوں کہ جون بھائی کی نئی کتاب کا تجسّس میرا یہی حال کرتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ خالد انصاری کو جون بھائی سے اک خاص ارادت ہے اور جیسا کہ جون بھائی نے خالد کے لیے کہا تھا 'جانی؟ تُو آیا نہیں، تجھے بھیجا گیا ہے۔'

بہ ہر کیف خالد نے کہا کہ عزیز بھائی، جون ایلیا کے نثری اور شعری شہ پاروں سے تو قاری آگاہ ہیں اُن پر مزید گفت گو کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ اب کیوں نہ اُن پر لکھی ہوئی تحریروں کو مرتب کیا جائے۔ لہٰذا آپ اُن کے ساتھ گزارے ہوئے کچھ پل اور واقعات لکھیں۔ ویسے بھی مجھ ناچیز کی سمجھ یہ کہتی ہے کہ جون بھائی پر جس قدر مواد موجود ہے اُسے خالد انصاری کے لیے منظرِ عام تک لانے کے لیے اک مُشکل مرحلہ ہے۔ اس لیے میں نے قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق جو لمحات جون بھائی کے ساتھ گزارے اُن میں سے چند اک آپ لوگوں کے لیے رقم کیے دیتا ہوں۔

سن 80ء کی درمیانی دہائی کی بات ہے میں اُن دنوں گورنمنٹ پریمیئر کالج میں زیرِ تعلیم تھا کہ جنگ اخبار میں جون بھائی کی اک غزل شایع ہوئی۔

کسی لباس کی خوش بو جب اُڑ کے آتی ہے
ترے بدن کی جُدائی بہت ستاتی ہے

بس یقین جانیں یہ پڑھ کر مجھے جون کا روگ لگ گیا۔ یہ جون کی پہلی تحریر تھی کہ جس نے مجھے پسینے سے وضو کرا دیا۔ بس اب یہ جنون تھا کہ جون ایلیا تک کسی طرح رسائی ہو کیوں کہ اُس زمانے میں مواصلاتی نظام اس طرح سے بام عروج کو نہ پہنچا تھا کہ جیسے آج کل کے مواصلاتی نظام نے پوری دنیا کو سکیڑ کر اک کنبا بنا دیا ہے۔ تقریباً اب ہر کوئی اک دوسرے کی دست رَس میں آسانی سے ہے۔

تقریباً پانچ سال میری اس خواہش کی تکمیل کو لگے۔ اک روز میرے عزیز تر عزیز دوست جاوید آدرش کے بھائی ولی نے آ کر ہمیں اطلاع دی کہ جون بھائی فلاں کلینک میں علاج کی غرض سے تشریف فرما ہیں۔ بس پھر کیا تھا ہم دوست آناً فاناً وہاں جا پہنچے۔ یقین جانیے جون ایلیا کو دیکھ کر لگا کہ شعر کی اگر کوئی ملکیت ہوتی تو وہ جون ایلیا ہوتے۔ جون بھائی سے مل کر مجھے نہایت دُکھ ہوا کہ میں اُن سے اتنی دیر سے کیوں ملا۔

جون بھائی سے ملاقاتوں کا سلسلہ ایسا بنا کہ اب ہم دوستوں کا جس میں خالد انصاری بھی شامل تھے کہ جون ہی ہمارا کھانا، جون ہی ہمارا اُٹھنا بیٹھنا اور پینا اوڑھنا بن گیا۔ جون بھائی کے ساتھ اگر آپ ایک بار مل لیں تو آپ اپنے پیر چھوڑ کر پنجوں پر ایسے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ آپ دوبارہ زمین پر پیر رکھنے کی اذیت میں گرفتار رہتے ہیں۔

اب جون بھائی کے ساتھ ہم دوستوں کا ناتا ایسا بن گیا جیسا عیسیٰؑ کا حواریوں کے ساتھ تھا۔ دوسرے شعرائے کرام کا کلام ہمارے دل و دماغ سے محو ہونے لگا، جون ہمارے خون میں دوڑنے لگا۔ جون بھائی سے اسی ناتے سے میں نے پوچھا کہ 'جون بھائی بڑے شاعر کی کیا شناخت ہے؟' اپنے مخصوص انداز میں مُسکرائے زلفوں کو پیچھے کی جانب بے رُخی سے جھٹکتے ہوئے کہنے لگے کہ 'دیکھو اگر شاعر انقلابی شاعری کر رہا ہے اور انقلاب میں کام یابی حاصل ہو گئی تو اب وہ شاعری بے معنی ہو گئی، اگر کوئی شاعر رومانی شاعری کر رہا ہے اور اُسے اپنی محبت میں کام یابی حاصل ہو گئی تو اُس کی شاعری اب بے معنی ہو گئی۔ شاعر بڑا وہی ہے جس کی شاعری میں کائنات کی اور فلسفے کی گتھیاں سلجھائی اور اُلجھائی جا رہی ہوں۔' دوستو، فلسفے میں جون کو قدرت حاصل تھی۔ اک روز میں گارڈن ایسٹ والے گھر میں جون بھائی کے ساتھ بیٹھا فلسفے پر گفت گو کر رہا تھا کہ جون بھائی کے بڑے بھائی سیّد محمد تقی صاحب

جو کہ دنیا میں فلسفے پر اک سند سمجھے جاتے ہیں اور دنیا میں کہیں بھی فلسفے پر کانفرنس ہوتی تھی تو پاکستان کی جانب سے وہی نمائندگی کرتے تھے، اندر داخل ہوئے اور مجھ سے مخاطب ہوکر کہا کہ 'عزیز! میں فلسفے پر سند ہوں مگر جون میرے بھی کان کترتا ہے۔'

جون بھائی کی شخصیت جس قدر قد آور تھی دوسری جانب اُن کی خوشیاں اور لذتیں نہایت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ جون بھائی غریب خانے پر تشریف لائے۔ جولائی کی ایک گرم دوپہر تھی، آتے ہی کہنے لگے کہ 'عزیز بھوک مجھے پھاڑ کھانے کو ہے، گھر میں کیا انتظام ہے؟' میں نے عرض کیا کہ 'جون بھائی آلو قیمہ ہے، مونگ کی دال اور آم رس ہے۔' یہ سُنتے ہی پہلے اُنھوں نے اُٹھ کر میری پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر خوشی میں رقص کرنے لگے۔ اُن کے رقص میں ایسا والہانہ پن تھا کہ مجھے پورا کمرا رقص کرتا محسوس ہونے لگا۔ فرمانے لگے 'مجھے کھانے کا یہ سنگم انتہائی مرغوب ہے۔'

شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہوگا کہ جس دن جون بھائی ہمارے ادا کیے گئے جملوں کی تصحیح نہ کرتے ہوں۔ مثال کے طور پر اک روز ہم دوستوں کی محفل میں جون بھائی مدعو تھے۔ وقتِ رُخصت عزیزم عرفان شیخ جو کہ جون بھائی کے چہیتوں میں شامل تھے کہنے لگے 'آیئے جون بھائی میں آپ کو چھوڑ دُوں گا۔' جون بھائی مُسکرائے اور مصنوعی غصے سے کہا کہ 'عرفان کیا تم مجھے چھوڑ دو گے۔' عرفان سٹپٹا گئے، کہنے لگے کہ 'میرا مطلب ہے آپ کو Drop کر دُوں گا۔' جون بھائی نے کہا کہ 'چھوڑ دو نہیں کہا کرو بلکہ یہ کہو کہ میں آپ کو پہنچا دوں گا۔' اور یوں محفل زعفران زار بن گئی۔

سال ہا سال اور اک لمحہ
کوئی بھی تو نہ ان میں بل آیا
خود ہی اک در پہ میں نے دستک دی
خود ہی لڑکا سا میں نکل آیا

جون بھائی کے اندر کا لڑکا کبھی کبھی بے چین ہوکر باہر نکل آتا تھا۔ رات کے ڈھائی بجے کا عمل ہوگا۔ جون بھائی ہم دوستوں کے درمیان موجود تھے جن میں عزیزم خالد ادریس اور جاوید آدرش سلمہ موجود تھے۔ میری جانب مخاطب ہوکر کہنے لگے

'عزیز موٹر کار لائے ہو؟' میں نے کہا 'جی۔' یک دم کھڑے ہو گئے اور کہا' چلو سمندر چلیں گے۔' جون بھائی کی ادائی اس طرح تھی کہ شاید سمندر سے بُلاوا آیا ہے۔ ہم کلفٹن پہنچ گئے اور جون بھائی سمندر میں غوطے لگانے لگے۔ لہریں ہر بار جون بھائی کے نرم و نازک وجود کو ساحل پر لا کر پٹخ دیتیں۔ جون بھائی جھنجھلا کر کہتے 'میں ترا پڑوسی ہوں کیوں کہ تُو بھی تنہا اور میں بھی تنہا۔' ہم سب دوست آب دیدہ ہو گئے۔ واپسی پر ہم فریئر ہال کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اک دم جون بھائی نے کہا 'عزیز! گاڑی روکو۔' میں نے گاڑی روک دی۔ کہنے لگے' آؤ ہری ہری گھاس میں لوٹیں لگائیں گے اور لونڈھار مستی کریں گے۔'

جون بھائی ہری ہری گھاس پر لوٹیں لگاتے جاتے اور خوشی و وارفتگی میں کہتے جاتے 'خود ہی لڑکا سا میں نکل آیا۔'

عاشورے کا دن تھا، شہر کراچی میں شیعہ سُنی فسادات پھوٹے ہوئے تھے۔ ہم دوست جون بھائی کے ساتھ عزیزم عرفان شیخ کی گاڑی میں موجود تھے۔ جون بھائی آگے کی سیٹ پر براجمان تھے اور اس یقین کے ساتھ کہ اس بھنور سے وہ ہمیں آسانی کے ساتھ نکال لے جائیں گے، ہنس کر کہنے لگے کہ 'میں تمھارا کمانڈر ہوں۔' لسبیلا کے پل پر پہنچے تو سامنے پولیس والے کھڑے تھے۔ اک سپاہی کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگے 'اِدھر آ بے، اے او سرکاری ملازم۔' وہ پولیس والا جون بھائی کے پاس آیا اور جون بھائی کو پہچان کر کہنے لگا 'آپ جون ایلیا ہیں۔' جون بھائی غصے سے کہنے لگے 'جون گیا بھاڑ میں، یہ بتا کہ تُو سُنی ہے کہ شیعہ؟' سپاہی نے نہایت سادگی سے کہا کہ 'میں پولیس والا ہوں جناب۔' جون بھائی فوراً گاڑی سے باہر نکلے اور سپاہی کی پیشانی کو بوسہ دے کر کہا کہ 'جیتے رہو۔' واپس گاڑی میں بیٹھ کر کہنے لگے کہ 'جون کو مات دینا آسان نہیں مگر اس سپاہی نے مجھے مات دے دی۔'

جون علم کا چراغ، جون غم کا احساس، جون رومانیت کا محاذ، جون زندہ باد، جون پائندہ باد۔

ہم تم سے محبت کرتے ہیں جون بھائی!

عطاءالحق قاسمی

غالب نے کہا تھا۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے لیکن میری خواہشیں وہ نہیں ہیں، جو اس شعر میں تہ در تہ موجود ہیں، میری خواہش تو چھوٹی سی ہے مگر میرے لیے وہ بہت اہم ہے۔ میں ان شخصیتوں کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں جنھوں نے مختلف شعبوں میں اپنے فن کا سکہ جمایا (ان میں سرفہرست تو میں خود ہوں)۔

میں اس حوالے سے (بھی) بہت خوش قسمت ہوں کہ میری بے تکلفانہ دوستی ان نابغۂ روزگار ہستیوں سے رہی ہے جن کی ایک جھلک دیکھنے کو ہی لوگ ترستے ہیں، میں آج خصوصی طور پر منیر نیازی اور جون ایلیا کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دو شاعر اپنی منفرد شاعری کے علاوہ اپنی منفرد شخصیت کی وجہ سے بھی مجھے بہت محبوب ہیں مگر فی الحال جون بھائی سے اپنی چند ملاقاتوں کا ذکر کروں گا۔ میرے دوستوں کو بھی شاید علم نہیں کہ میں اوائلِ جوانی میں پورے چھ مہینے کراچی میں مقیم رہا، ان دنوں سلیم احمد، قمر جمیل، اطہر نفیس، جمیل الدین عالی، شبنم رومانی، رضی اختر شوق، محشر بدایونی اور دوسرے سینئرز کے علاوہ اپنے ہم عصروں، ثروت حسین، جمال احسانی، عبیداللہ علیم، اور اس دور کے دوسرے نوجوان اور بہت خوب صورت شاعری کرنے والے دوستوں سے ایرانیوں کے چائے خانوں میں ملاقاتیں رہیں مگر عجیب بات ہے کہ جون بھائی سے ملاقاتیں تو کیا، ایک ملاقات کا موقع بھی نہ ملا۔ ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ تو اس وقت شروع ہوا جب میری شاعری کی دھومیں ہماری زمین کے علاوہ کائنات کے دوسرے سیاروں تک بھی جا پہنچیں اور اندرون اور بیرونِ ملک

مشاعرے کرانے والوں نے بہت منت ترلے کر کے مجھے ان مشاعروں میں شرکت کی دعوت دینا شروع کی۔ بس جون ایلیا سے ان مشاعروں اور مشاعروں کے بعد ہوٹل میں جمنے والی محفلوں میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ جون کو پڑھا تو بہت ہوا تھا اور ان کی شاعری نے مجھے ان کا دیوانہ بنا رکھا تھا مگر جب ان سے ملنے کا موقع ملا تو پتا چلا کہ وہ صرف دوسروں کو دیوانہ نہیں بناتے بل کہ خود بھی دیوانے ہیں مگر کبھی کبھار بکار خویش ہشیار بھی نظر آتے تھے۔ منیر نیازی بتاتے تھے کہ جب وہ پہلی دفعہ جون کو ملے تو وہ ''مجھے دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ درخت پر چڑھ گیا۔'' میں اس بات کو منیر کی جملے بازی کا حصہ سمجھا مگر قطر کے مشاعرے میں جب ہم ہوٹل کے ایک کمرے میں جمع تھے، باقی بات بعد میں بتاتا ہوں پہلے یہ سن لیں کہ جون مجھے صرف ''الحق'' کہہ کر پکارتے تھے۔ نیز مجھے یہ بھی بتانا ہے کہ اکثر لوگوں کی زبان سے عطاء الحق بڑی مشکل سے ادا ہوتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو ''ضیاء الحق'' بہت آسانی سے کہہ لیتے تھے، بہ ہر حال مجھے کوئی عطاء اللہ کوئی عطاء اللہ حق اور کوئی عطا محمد خان کہہ دیتا ہے۔ بہ ہر حال جب قطر کے ہوٹل کے اس کمرے میں جہاں جون بھائی اپنے دوستوں اور مداحوں سے گپ شپ میں مشغول تھے، اچانک انھوں نے مجھے مخاطب کیا اور کہا ''الحق'' مجھے سیر کراؤ، مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میں انھیں سیر کیسے کراؤں مگر میرے فیصلے سے پہلے وہ ''پلاپی'' مار کر میرے کاندھے پر سوار ہو گئے اور کہا ''چلو''۔ میں انھیں کمرے سے باہر لے آیا اور دیر تک اِدھر اُدھر گھماتا رہا اور اس وقت کاندھے سے اُتارا جب وہ تھک گئے یا بور ہو گئے، میں تو نہ بور ہوا تھا اور اُن کے وزن سے تھکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جون بھائی ڈرامے باز بھی تھے۔ دبئی کے ایک مشاعرے میں جب ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، وہ گرم اوور کوٹ اور سر پر جناح کیپ پہنے نمودار ہوئے، میں اسٹیج پر پہلے سے موجود تھا، انھیں اس گیٹ اَپ میں دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔ اپنی باری آنے پر انھوں نے ٹوپی اُتار دی کیوں کہ کلام سناتے ہوئے انھوں نے اپنے لمبے بالوں سے بھی کام لینا ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد اوور کوٹ بھی اُتار کر پرے رکھ دیا، تاہم خدا کا شکر ہے معاملہ یہیں تک محدود رہا۔ جون بھائی چائے کے کپ میں بہ ظاہر چائے مگر منیر نیازی کے الفاظ میں دراصل ''گرائپ واٹر'' پی رہے تھے۔ برابر میں دھری چینک بھی ''گرائپ واٹر'' سے بھری

ہوئی تھی۔ سلیم جعفری مرحوم مشاعرے کی نظامت کررہے تھے۔ اُردو ادب کے لیے بے پناہ خدمات انجام دینے والے مصیب الرحمان حسب معمول بھرے ہوئے ہال کے آخر میں کھڑے تھے۔ اس شخص نے بلامبالغہ کروڑوں روپے اُردو کی خدمت پر صرف کیے، افسوس انھیں اب کوئی یاد نہیں کرتا، صرف میں نے لاہور میں ان کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی۔ مصیب قطر میں رہتے تھے اور برادرم محمد عتیق کے ساتھ مل کر انھوں نے فروغِ اُردو ادب ایوارڈ جاری کیا جو ہر سال ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی ادیب کو ملتا تھا، بہ ہر حال چائے یعنی ''گرائپ واٹر'' (وہسکی) پینے کے دوران اچانک جون بھائی نے سلیم جعفری کو با آوازِ بلند مخاطب کر کے کہا۔ ''میاں چائے گرم ہو رہی ہے، تھوڑی سی برف بھجواؤ۔''

جون ایلیا سے ملاقاتوں کا سلسلہ سال ہا سال پر محیط ہے مگر یہ ''سال ہا سال'' اپنے دامن میں کل آٹھ دس ملاقاتیں لیے ہوئے ہیں، چناں چہ ان یادوں کا سلسلہ ترتیب وار ممکن نہیں، جیسا کہ شروع میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے منیر نیازی اور جون ایلیا صرف اپنی اعلیٰ درجے کی شاعری کی وجہ سے نہیں، باقی شاعروں سے بالکل مختلف زندگی گزارنے کی وجہ سے بھی محبوب تھے اور محبوب ہیں۔ جون بے حد بل کہ غیر ضروری حد تک پڑھے لکھے انسان تھے۔ عالمانہ گفت گو پر آتے تو علم کے موتی بکھیرتے چلے جاتے، ایک دن جب علم کے موتیوں کا ڈھیر لگ گیا اور گفت گو ختم ہونے کو نہیں آرہی تھی تو میں نے جون کو مخاطب کر کے کہا۔ ''جون بھائی آپ کو ایک لطیفہ سناؤں؟'' اس پر اہلِ محفل نے مجھے گھور کر دیکھا مگر جون نے کہا ''الحق تم ان جاہلوں کی پروا نہ کرو، لطیفہ سناؤ'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''جون بھائی، میں دراصل درمیان میں ذرا سی بریک چاہتا تھا کہ مجھے علمی بدہضمی محسوس ہونے لگی تھی۔ اب آپ دوبارہ شروع ہو جائیں۔'' مگر اس کے بعد دوبارہ کیا شروع ہونا تھا، محفل ہی اُجڑ گئی، سو جون دوبارہ وہی جون بن گئے، جن کی اداؤں نے مجھے اُن کا اسیر کیا ہوا تھا۔

اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہے کہ جون ایلیا محض شاعر تھے، خوش ادا تھے، تو وہ بھول جائے، میں نے جون کا ایک روپ کراچی کے مشاعرے میں دیکھا، جو ایک سیاسی جماعت کی

آشیر باد سے ہو رہا تھا، میں اتفاق سے جون بھائی کے قریب بیٹھا تھا مشاعرے کے دوران اس جماعت کے ایک لیڈر اسٹیج پر آئے اور سامعین کے علاوہ شعرا نے بھی اپنی نشستوں سے اُٹھ کر موصوف کا استقبال کیا مگر جون بھائی نہ صرف بیٹھے رہے بل کہ کچھ بڑبڑاتے بھی محسوس ہوئے، دوسرے لیڈر کی آمد پر بھی جب یہ ڈراما ہوا تو جون کے لیے یہ سب کچھ نا قابلِ برداشت ہو گیا، انھوں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''یہ کیا گھٹیا پا ہے؟'' بس قیامت کا منظر تھا جو میں نے دیکھا، کچھ کارکن جون کی طرف بڑھے مگر اس سے پہلے ایک شاعر نے (نام یاد نہیں) جون بھائی کو بغل میں دبایا اور بھاگ نکلا۔ میں شرم سے پانی پانی ہو گیا اور یہ سوچ کر جان سی نکل گئی کہ کہیں رستے میں ظالموں نے میرے جون بھائی کو نہ گھیر لیا ہو مگر اللہ کا شکر ہے، کہ اس شیر جوان نے، جس نے جون کو ''اغوا'' کیا تھا، ایک مشن امپوسیبل کو مشن پوسیبل بنا دیا اور اس حوالے سے آخر میں ایک ہول ناک انکشاف، جس کے بارے میں آج بھی سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ یہ کہ پاکستان بھر سے آئے ہوئے شعرا کو جس اسٹیج پر بٹھایا گیا تھا، عین اس کے نیچے بارود کے ڈھیر بچھے ہوئے تھے مگر لعنت ہے مجھ پر کہ ایک صحافی کے طور پر میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر بارود کو کوئی ماچس کی تیلی دکھا دیتا تو اس روز اخبارات کے نیوز ایڈیٹرز کو کتنی بڑی خبر لیڈ کا زیادہ انتظام کیے بغیر مل جاتی۔

اور اب ایک بہت مزے دار محفل کی روداد، اس محفل میں صرف میں اور جون تھے یا غالباً امجد اسلام بھی تھا۔ جون بھائی کہنے لگے۔ ''الحق تم اب بھی اتنے خوب صورت ہو جتنے آج سے پندرہ برس قبل تم جب پچیس تیس سال کے ہو گے، نری قیامت ہو گے'' یہ سن کر میری ہنسی رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر میں نے خود پر کنٹرول کیا اور کہا۔ ''ہو سکتا ہے آپ صحیح کہتے ہوں۔'' بولے۔ ''ہو نہیں سکتا، تم نے اس دَور میں کشتوں کے پشتے لگا دیے ہوں گے۔'' میں نے شرمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اللہ بہتر جانتا ہے، میرے علم میں تو نہیں۔'' اس کے بعد جون نے جو بات کی، اس پر ہنستے ہنستے میری ''وکھیوں'' میں بل پڑ گئے مگر افسوس دنیا کا کوئی اخبار وہ شایع نہیں کر سکتا، تاہم میں ان کے جملے کو کند چھری سے ذبح کرنے کی کوشش کرتا ہوں، بولے۔ ''صرف اتنا بتا دو کہ تم آج تک کتنے کلومیٹر جسمانی

سیاحت کر چکے ہو۔" یہ بوگس جملہ لکھنے کی بجائے بہتر تھا، میں یہ قصہ ہی نہیں چھیڑتا۔

میں نے جون ایلیا کے حوالے سے ایک بات یہ بھی کہی تھی کہ جہاں ان کی مجموعی ہیئت اور کیفیت ایک دیوانے کی سی تھی، وہاں ان کی شخصیت میں ڈرامے کا عنصر بھی شامل تھا اور اس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا تھا۔ میں نے بیرونِ ملک ایک مشاعرے میں اپنی ایک غزل جس کا مطلع ہے

کہیں گلاب میں ہوں اور کہیں ببول میں ہوں
کسی کی یاد میں ہوں اور کسی کی بھول میں ہوں

سنائی تو جو داد قسمت میں تھی، وہ مل گئی۔ مشاعرے کے اختتام پر جون بھائی کے ہوٹل کے کمرے میں محفل جمی، تو انھوں نے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ "الحق" ذرا اپنی غزل تو نکالو، جو تم نے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ میں نے غزلوں کے پلندے میں سے وہ غزل نکالی جو سنائی تھی۔ انھوں نے غزل والا کاغذ ہاتھ میں تھاما اور بولے۔ "الحق تم نے اتنی عمدہ غزل صحیح طریقے سے سنائی ہوتی تو اس سے کہیں زیادہ داد ملتی جو تمھیں مل رہی تھی۔" اس کے بعد انھوں نے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ "یہ غزل میں پڑھتا ہوں، تم میری طرف دیکھتے رہو اور آئندہ اپنا کلام اسی انداز میں پڑھنا۔" پھر انھوں نے غزل پڑھنا شروع کی مگر ایسے جیسے سناتے ہوئے خود کو حال پڑ گیا ہو۔ گردن کو کبھی بائیں اور کبھی دائیں جانب جھٹکا دیتے ہوئے اپنے لمبے بال کبھی آنکھوں کے سامنے لے آتے اور کبھی انھیں پیچھے دھکیل دیتے۔ اس دوران انھوں نے آنکھوں میں نمی قسم کی کوئی چمک بھی تخلیق کی۔ میں نے مشاعرے میں جو غزل دو تین منٹوں میں سنائی تھی، انھوں نے اس پر اپنے قیمتی دس منٹ صرف کیے۔ پھر انھوں نے میری غزل مجھے واپس کی اس ہدایت کے ساتھ کہ مشاعروں میں کلام اس طرح سنایا کرتے ہیں۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے واپس، پاکستان آکر تین چار روز اُستاد کے بتائے ہوئے طریقے کی پریکٹس شروع کر دی مگر گردن کو بار بار دائیں بائیں جھٹکے دینے سے میں CERVICAL کا مریض ہو گیا ہوں، اب گردن کسی بھی طرف آسانی سے نہیں مڑتی۔ لوگ کہتے ہیں تم مغرور ہو گئے ہو۔ تمھاری گردن میں سریا آ گیا ہے۔ میں انھیں بتاتا ہوں کہ بھائی سریا نہیں آیا، یہ میرے

جون بھائی کا ایک عطیہ ہے جو مجھے بہ ہر حال عزیز ہے۔ اب میں جون بھائی کو کیا بتاتا کہ گردن کو بھی پتا ہوتا ہے اسے جھٹکے دینے والے شاعر کا مقام اور مرتبہ کیا ہے؟

جون بھائی سے ایک ملاقات لاہور میں بھی ہوئی۔ ان کے گرد پروانوں کا ہجوم تھا، اس روز میں نے جس جون کو دیکھا، ایک بہت بڑے اسکالر کے روپ میں دیکھا۔ لسانیات سے لے کر الٰہیات تک اور اس کے علاوہ ہر موضوع پر ان کی تخلیقی گفت گو سن کر میں سوچ رہا تھا کہ کیا جون صرف شاعر ہے، بے پناہ شاعر، جس کی تقلید کوئی نہیں کر سکتا اور یہ کہ شعرا میں اس سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ بھی ''ٹانواں ٹانواں'' ہی مل سکتے ہیں، اور یہ کہ اس نے علم کے اتنے ڈھیر سارے خزانے اپنے سینے میں چھپا کر کیوں رکھے ہوئے ہیں۔ انھیں کتابی شکل کیوں نہیں دی۔ وہ صرف علمی گفت گو ہی نہیں کر رہے تھے، درمیان درمیان میں منیر نیازی کی طرح کوئی ایسا جملہ بھی کہہ دیتے جو شہر در شہر سفر کرنے والا ہوتا ہے۔ اس روز انھوں نے ایک عجیب بات بھی کہی ''الحق، تمھیں پتا ہے میرے بزرگوں کا تعلق لاہور سے ہے'' اور اس کے بعد انھوں نے ایک طویل شجرۂ نسب کی نقل وحمل سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ بنیادی طور پر لاہور یئے ہیں۔ لاہور کے لیے اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے، تاہم امروہہ والوں سے میری دست بستہ گذارش ہے کہ وہ جون بھائی کے اس بیان کو ان دس بارہ جام کا کرشمہ سمجھیں جو انھوں نے اپنے اندر انڈیلے تھے اور اس کے بعد بارہ تیرہ مختلف قسم کی ادویات کی ٹیبلٹس پانی کے ایک گھونٹ سے اپنے منھ میں ٹھونس کر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

اور آخر میں ایک بالکل مختلف جون ایلیا، جو میں نے اس روز دیکھا جب پاکستان کے لیے ہماری پرواز ایک ہی تھی، جو براہِ راست کراچی آ رہی تھی اور اس کے بعد اس نے لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا۔ کراچی پہنچ کر بجائے اس کے کہ جون بھائی مجھے خدا حافظ کہتے، وہ باہر میرے ساتھ ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ اس روز جون بالکل سنجیدہ موڈ میں تھے، انھوں نے مجھے اپنی عائلی زندگی کے بارے میں بتانا شروع کیا، مجھے علم تھا میری پسندیدہ افسانہ نگار اور کالم نگار خاتون سے ان کی شادی ہوئی اور تین بچوں کی ولادت کے بعد ان میں علیحدگی ہوگئی۔ وہ باتیں کرتے جاتے تھے، بچوں کا احوال بھی بیان کر رہے تھے پھر

اچانک انھوں نے رونا شروع کر دیا، حتیٰ کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ میرا دل صدمے سے بوجھل ہو گیا، پھر انھوں نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا اور ان کے آنسو میری آستین تک پہنچ گئے۔ میری اپنی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں، میں اپنے محبوب شاعر کو اس عالم میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں لاہور کی فلائٹ میں سوار ہوا تو جون ایلیا کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی اپنی قمیص کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری آنکھوں میں بھی آنسوؤں کا ایک ریلا آیا، میرا ہم نشست میری کیفیت دیکھ کر پریشان ہو گیا، مگر میں اسے کیا بتاتا کہ مزاح نگار کے اگر قلم میں نہیں آنکھوں میں آنسو تو ہوتے ہی ہیں نا۔

ہم تم سے محبت کرتے ہیں جون بھائی، تم نے خود کو برباد کر کے اپنی شاعری سے ہمیں اور آنے والی نسلوں کو آباد کر دیا ہے۔

یہ سمندر پہ تشنہ کام ہے کون؟

عظیم امروہوی

سیّد العارفین سیّد حسین شاہ ولایت شرف الدینؒ، شاہ سیّد نصیر الدینؒ، خواجہ سیّد محمد خطیرؒ، سیّد محمد اشرف دانشمندؒ، سیّد ابن بدر چشتی کرمانیؒ اور شاہ عبدالہادی صدیقیؒ وغیرہ جیسے بزرگوں نے گزشتہ سات آٹھ صدیوں میں تصوف کے حوالے سے جو عشق ومحبت اور اخلاق وتہذیب کا پیغام سرزمینِ امروہہ پر بیٹھ کر دُور دُور تک پھیلایا تھا اس نے جب ادب کی زبان اور شاعری کا قالب اختیار کیا تو عارفی امروہوی، سیّد غلام نبی نسیم، اسمٰعیل امروہوی، میر سعادت علی سعادت (رہنمائے میر)، شاہ عالم محزوں، نجابت علی نجابت، سیّد علی نذر نظر، غلام علی شاہ ولی، رمضان علی ناطق اور غلام ہمدانی مصحفی وغیرہ کی آواز بن کر ابھرا۔

مرزا مظہر جان جاناں نے جب امروہہ میں تصوف اور ادب کا یہ سنگم دیکھا تو وہ بھی یہاں آئے اور میر اسداللہ کے دیوان خانے میں قیام رہا۔ میر تقی میر بھی ضابطہ خاں پر مرہٹوں کی چڑھائی کے وقت لشکر کے ساتھ امروہہ سے گزرے تو اپنے رہنما کے وطن کو سلام کرتے ہوئے۔

سیّد ابدال محمد امروہہ سے دہلی گئے اور جب امروہہ واپس ہوئے تو شاہ عبدالرسول نثار (شاگردِ میر تقی میر) کو اپنے ساتھ لے آئے۔ نثار امروہہ پر دل و جان سے ایسے نثار ہوئے کہ واپسی کا ذکر نہیں کیا اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

نثار کے امروہہ آنے سے خاندانِ سیّد ابدال محمد کے ادبی ذوق میں اور بھی اضافہ ہوا۔ ابدال محمد کے فرزند سیّد ولی احمد ولی فارسی کے شاعر تھے۔ نثار کی قربت نے ان کے ذوق میں اور بھی نکھار پیدا کیا۔ ولی کے پوتے سیّد باسط علی باسط لسانیات کے ایسے ماہر

ہوئے کہ ڈپٹی نذیر احمد کو ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا اور وہ امروہہ صرف باسط سے ملنے آئے۔ سیّد ابدال محمد کے پوتے اور سیّد ولی احمد ولی کے بھتیجے سیّد سلطان احمد نثار کے شاگرد ہوئے اور یہ ادبی ماحول ایسا چھایا کہ سلطان احمد کا دیوان خانہ، ادب کدہ بن گیا۔ سیّد محمد زماں امروہوی مکتبِ امروہہ سے درس لے کر دہلی چلے گئے تھے لیکن وہ جب اپنا کلام چوری ہونے یا بانٹنے کے بعد امروہہ آئے تو سلطان احمد کے ہی دیوان خانے میں محفل جمتی۔ سلطان کے پوتے سیّد امیر حسن امیر بھی امیر الشعرا ہوئے۔ امیر کے فرزند نصیر نے بھی حتی الامکان علم وادب کی نصرت کی۔ نصیر کے چار فرزند ہوئے۔ سیّد نفیس حسن نفیس، سیّد انیس حسن ہلال، سیّد شفیق حسن ایلیا اور سیّد وحید حسن گدا۔ یوں تو یہ چاروں بھائی علم وادب کے لیے انیس و شفیق ثابت ہوئے اور نفیس وحید بن کر رہے۔ لیکن علامہ شفیق حسن ایلیا اپنے تبحر علمی کی وجہ سے امروہہ کے اُفقِ علم وادب پر پوری طرح ایسے چھائے رہے کہ جگر مرادآبادی بھی امروہہ آئے تو علامہ کی خدمت میں حاضری اپنے لیے شرف سمجھا اسی لیے اہلِ امروہہ علامہ کو ایک چلتی پھرتی لائبریری کہا کرتے تھے۔

علامہ شفیق حسن ایلیا کی رگوں میں دوڑنے والا وہی ادب نگار خون جو صدیوں سے بے چین اور بے تاب تھا اس نے دسمبر 1931ء کو جون ایلیا کی شکل اختیار کی۔ جون ایلیا کے وجود میں آنے تک اس دیوان خانے کا طواف ادبا وشعرا کے لیے واجب ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اس سے قبل اسی چہار دیواری میں رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی (مشہور فلسفی) اور سیّد محمد عباس (صحافی) بھی آنکھیں کھول چکے تھے۔ اس لیے جون ایلیا نے جب آنکھیں کھولیں تو علم وادب، لباس اور شاعری، اوڑھنا اور بچھونا تھی۔ کئی پشتوں سے اس گھر میں شاعری پرورش پا رہی تھی، غنی حسن غنی، الطاف حسین کوثری، معراج النبی معراج اور شجاع الحسن نقی جیسے بزرگ شاعر موجود تھے۔

اس ماحول میں جس شعور کی پرورش اور جس ذوق کی تربیت ہوئی ہو۔ جسے گھٹی میں شعر پلائے گئے ہوں، جسے بچپن میں سلانے کے لیے شعروں میں لوریاں دی گئی ہوں۔ اس کا ادبی شعور بیدار نہ ہوتا تو پھر کس کا ہوتا۔ اور وہ اگر جون ایلیا سے کم ہوتا تو یقیناً تعجب ہوتا لیکن آج بھی یہ تاخیر نہ صرف تعجب خیز بل کہ نقصان دہ ہوئی۔ کیوں کہ جون ایلیا کے خوشہ چیں تک معتبر سمجھے جانے لگے ہیں۔ اس وقت اس فن کار کی شاعرانہ حیثیت کا

جائزہ لیا جارہا ہے جو گلے گلے شاعری میں دھنسا ہوا ہے، جو چوٹی سے ایڑی تک شاعر ہے اور جس کا ہر سانس شعر ہے۔ اس تاخیر کا ذمے دار بھی جون ایلیا کا وہی خاندانی مزاج۔ یعنی گوشہ نشینی، خودنمائی سے نفرت، شہرت سے بیزاری اور سادات والی انا رہا۔ یہاں ہم یہ سوچ کر بھی تسلی حاصل نہیں کر سکتے ہیں کہ دیر آید درست آید۔ کیوں کہ یہ بر وقت آید درست آید بھی ہو سکتا تھا۔ بہ ہر حال انھوں نے یہ ظلم نہ صرف خود پر کیا بل کہ اپنے قدر دانوں اور پرستاروں پر بھی کیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔

غالب اکیڈمی نئی دہلی میں چند سال قبل ایک ادبی سیمینار تھا۔ میں بھی شرکت کی غرض سے گیا تھا۔ وہاں ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین صدر شعبۂ اُردو میرٹھ یونی ورسٹی و ڈپٹی چیئر مین اُردو اکیڈمی یوپی سے ملاقات ہوگئی۔ 'بھئی جون ایلیا کا جب سے ایک شعر سنا ہے بے چین ہوں۔ ان کا مجموعۂ کلام مہیا کر دیجیے۔' میں نے عرض کیا جناب ان کا ابھی تک کوئی شعری مجموعہ شایع نہیں ہوا۔ فرمانے لگے کہ 'یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسی منفرد فکر کا شاعر اور مجموعۂ کلام شایع نہیں ہوا۔ آج کل تو ایسے مجموعۂ کلام شایع ہو رہے ہیں جو تول سے بکنے چاہییں۔' غرض یہ کہ بڑی مشکل سے انھیں میری بات کا یقین آیا۔ وہ شعر تھا۔

اس سمندر پہ تشنہ کام ہوں میں
بان! تم اب بھی بہہ رہی ہو کیا

آج ڈاکٹر امیر اللہ شاہین مرحوم ہو چکے ہیں۔ کون جون ایلیا کے مجموعۂ کلام کو ان کی قبر پر جا کر سنائے۔

جون ایلیا کی شاعری کا آغاز کب، کس نیک ساعت میں اور کہاں ہوا؟ شاید ان کا جواب وہ خود بھی صحیح نہ دے سکیں۔ مصرع موزوں کرنے کی صلاحیت ان میں شاید اس عمر میں تھی جس عمر کی باتیں حافظے میں نہیں رہتیں۔ اس بات کے بہت سے گواہ آج بھی ان کے وطن امروہہ میں موجود ہیں۔

جون ایلیا نے جس شاعرستان میں جنم لیا اسی کوچے میں میرے بھی شعور کے تانے بانے بنے گئے اور اس درِ سخن سے میرے دروازے کا فاصلہ مشکل سے 10-12 فٹ ہوگا۔ اس جغرافیائی قربت نے دلی اور ذہنی قربت بھی پیدا کر دی تھی۔ بہ ہر حال اس وقت

یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس دیرِ سخن کی چوکھٹ کو دو چار بار پار کرنے والوں میں سے 50 فی صد ضرور شاعر ادیب ہو جاتے ہیں۔ رہ گئے باقی 50 فی صد وہ اگر علم ریاضی کے طالب علم یا اقتصادیاتی مزاج کے مالک ہیں تو بھی ان کے خشک ذہن میں ادبی ذوق کا پودا پھوٹ نکلتا ہے۔

دربارِ شاہ ولایت امروہہ کا یہ کوچہ کیا تھا، شاہ راہِ شاعراں و خرام گاہِ دل براں تھا۔ شہرت کا ہر چھوٹا بڑا شاعر یہاں دیکھا جاتا۔ رہا بیرونی شعرا کا حال تو ان کا بھی امروہہ آ کر مشاعرے میں شرکت کے بعد اس گھر پر حاضری دیے بغیر واپس چلا جانا بالکل ایسا تھا کہ جیسے کوئی حاجی حجرِ اسود کو بوسہ دیے بغیر مکہ معظّمہ سے واپس آ جائے۔

جون ایلیا کی شاعری نے آنکھیں کھولیں تو پورے امروہہ کو چکا چوند کر دیا۔ جس کم عمری میں وہ امروہہ کی ہر محفل، ہر ادبی نشست اور ہر مشاعرے پر چھا گئے وہ یقیناً قابلِ رشک تھا۔ اور پھر ان کی ذہانت اور طباعی کا مظاہرہ اس طرح اور بھی ہوا کہ ناظمِ مشاعرہ کے فرائض ان کے سپرد ہونے لگے۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی طبع کے جوہر اس طرح دکھائے کہ جس شاعر کو دعوتِ سخن دیتے اس کے لیے ایک شعر گزشتہ شاعر کی زمین میں فی البدیہہ کہہ کر پڑھ دیتے۔

جون ایلیا کے وطن میں ادبی تقریبات کا سلسلہ تقریباً پورے سال رہتا۔ مختلف ادبی انجمنیں قائم تھیں ان تقریبات میں حصہ لینے والے غیر شاعر بھی جون ایلیا کے پاس سوالی بن کر آتے اور کچھ نہ کچھ اس شعری کمپیوٹر سے لے کر جاتے۔ یہ جذبۂ عطا اور بخشش کا مزاج انھیں بزرگوں سے ورثے میں ملا تھا۔ شہر میں زنانے منقبتی مشاعرے ہوتے تو بھی بھائی جون کہنے والی نہ جانے کتنی لڑکیاں ان کی خدمات حاصل کرتیں اور یہ ان کے درمیان بیٹھے زلفیں بکھرائے شعر کہہ کہہ کر دیتے رہتے۔

گھر سے کبھی سگریٹ وغیرہ لینے کو نکلتے تو ہاتھوں میں کھلی ہوئی کتاب اور اس پر جمی ہوئی نگاہیں۔ کوئی بچہ برابر سے سلام کرتا ہوا بھی گزر گیا تو انھیں خبر نہ ہوئی۔ اس کا سبب ان کے شاعرانہ بل کہ فلسفیانہ مزاج کا دخل ہی نہیں، ذوقِ مطالعہ کی شدّت بھی ہوتا۔ اس بات سے ان کے کوچے میں رہنے والی ان بوڑھی عورتوں کو تشویش بھی ہوتی، جو اُن کو دیکھتیں وہ سوچتیں کہ جون کسی سواری وغیرہ سے سڑک پر نہ ٹکرا جائے۔ کبھی دار العلوم سیّد المدارس

جانے کو گھر سے نکلتے تو سگریٹ کے دھویں کو فضاؤں میں اُڑاتے ہوئے۔ لیکن نگاہیں نیچی کیے۔ جس کا سبب جمالیاتی حس کی کمی نہیں بل کہ وہ قدیم تہذیب اور خاندانی روایات کی پاس داری ہوتا جوان کے خمیر میں شامل ہے۔

اسی زمانے کی بات ہے، جون ایلیا جب کسی دستِ حنائی کے متلاشی تھے انھوں نے ایک نظم شادی کی موافقت میں اور ایک مخالفت میں کہی۔ یہ دونوں نظمیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ امروہہ کے بچے بچے کی زبان پر ان کے اشعار پہنچ گئے۔

جس کم عمری میں جون کا ایک وسیع حلقہ قائم ہو گیا تھا وہ بھی مثالی ہے۔ اتنا کم عمر شاعر مشکل سے ہی استادی کے درجے پر فائز ملے گا۔ اور پھر یہ عجیب بات کہ جون کے بہت سے شاگردان سے عمر میں بڑے تھے۔ وہ اکثر شام کو دو چار شاگردوں اور دوستوں کے ساتھ اپنے جدِ اعلیٰ کی درگاہ کی جانب ٹہلنے جاتے۔ جو امروہہ کے باہر باہر گزرنے والی سڑک پر جانبِ مغرب ان کے مکان سے آدھے کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر ہے۔ جس کا ذکر مشہور سیاح ابنِ بطوطہ سے لے کر قرۃ العین حیدر تک نے 'کارِ جہاں دراز ہے' میں کیا ہے۔ اس شاہ راہ پر ایک جانب آموں کے باغات میں گھرا ہوا عقیدتوں کا مرکز مزار شاہ ولایت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسری جانب شہر کی سب سے خوب صورت جھیل جس کے ایک کنارے پر شہر کی جامع مسجد واقع ہے۔ درگاہ سے کچھ آگے امروہہ کی عیدگاہ جس پر صدیوں پرانے برگد کا بے حد وسیع درخت اور اس کی پشت پر ریت کے ٹیلے۔ روز شام کو سورج ان ٹیلوں کا الوداعی بوسہ لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ آموں کے باغات میں موسمِ بہار میں کوئل کی سریلی آوازیں۔ ادھر جھیل میں چہچہاتی ہوئی مرغابیاں اور اس کے ساحل پر شفاف بگلوں کا ہجوم۔ غرض کہ ایک شاعر کے لیے تمام فطری نعمتیں موجود۔ وہاں جون ایلیا گھنٹوں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ٹہلتے۔ مصرعوں پر مصرعے لگانا، شاگردوں کی غزلیں سن کر اصلاح دینا اور ادبی بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس درگاہ کا ذکر جون خود اس طرح کرتے ہیں۔

شام ہوئی ہے یار آئے ہیں یاروں کے ہم راہ چلیں
آج وہاں قوالی ہوگی جون چلو درگاہ چلیں

ان کے خاص شاگردوں میں رضا امروہوی، کامریڈ عنبر اور جالب امروہوی رہے۔
جون کے شاگردوں کے ساتھ احباب کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا۔ جن میں خاص طور پر قابل ذکر جناب قمر رضی، شبنم امروہوی، رئیس نجمی، پروفیسر شریف احمد، زبیر رضوی اور جے پال عادل وغیرہ تھے۔

امروہہ سے شہر جگر کا فاصلہ صرف 30 کلومیٹر ہے، جہاں جون ایلیا کا جانا آنا رہتا تھا۔ وہاں ان کے قریبی دوست تو، کلیم مرادآبادی تھے۔ ویسے قمر مرادآبادی اور کیف مرادآبادی سے بھی ملاقاتیں رہتیں۔ اور پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ جگر صاحب سے نہ ملتے۔ مرادآباد میں خوب ادبی نشستیں منعقد ہوتیں۔ کلیم بھی اکثر امروہہ آتے اور جون ایلیا ہی کے گھر قیام رہتا۔ آج کلیم مرادآبادی سے جب اس زمانے کا ذکر ہوتا ہے تو ان کا دل بھرآتا ہے۔

لیکن ان دوستوں سے زیادہ عزیز انھیں ان کی کتابیں رہیں جن میں وہ کھوئے رہتے تھے۔ ایک نظم میں کہتے ہیں کہ۔

میرے کمرے کو سجانے کی تمنا ہے تمھیں
میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

حالاں کہ ان کتابوں نے ان پر ظلم بھی کیا ہے اور بہ قول ان کے ان کتابوں میں رمز ہے اور اس رمز کا مارا ہوا ذہن زندگی میں کبھی آرام نہیں پا سکتا۔

کتابوں، قلم اور دوات میں گھرا ہوا یہ دبلا پتلا، نازک سا نوجوان کسی کھیل میں کیا خاص حصہ لیتا۔ البتہ کبھی دوستوں میں سے کسی کی اُڑتی ہوئی پتنگ کا زور ضرور دیکھ لیا کرتے۔ ایک مرتبہ میرے ایک عزیز بھائی حمید الحسن (جو اس وقت امیر العلما مولانا سیّد حمید الحسن قبلہ مجتہد پرنسپل ناظمیہ عربی کالج لکھنؤ ہیں) لکھنؤ سے امروہہ کئی دن کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جون ایلیا سے بھی ان کی دوستی تھی۔ روز کئی کئی گھنٹے دونوں نے گھر کی چھت پر پتنگ بازی کا خوب شوق کیا۔ میں اور میرا دوست للن (اقبال مہدی جو اس وقت پاکستان کے مشہور آرٹسٹ ہیں) بازار سے پتنگیں لا کر دیتے رہے۔

لیکن ایک دن اسی امروہہ سے جون ایلیا یہ کہہ کر ہجرت کر گئے کہ۔

لیجیے میں چمن سے جاتا ہوں
اب تو کانٹا چبھا ہوا نہ رہا

سارے امروہہ کی نگاہوں میں پھول اور آنکھوں کا تارا کس مجبوری کے سبب اپنے آپ کو کانٹا سمجھنے لگا؟ یہ راز تلخ ہے۔

بہر حال جون ایلیا کی ہندوستان سے ہجرت کے بعد وقت کے ہاتھوں یہ بساطِ سخن پلٹ گئی اور بزمِ احباب منتشر ہوگئی۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ یہ زندگی جون ایلیا نے اپنے طور سے گزاری تھی جس کو وہ اس طرح یاد کرتے ہیں کہ۔

جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزارے تھے
وہ صبح شام تو جیسے فسانے ہو گئے ہیں

کتب خانے نما دیوان خانے میں پیدا ہونے والے جون ایلیا کا دارالعلوم سیدالمدارس امروہہ سے بھی خاص تعلق رہا۔ جہاں دینی علوم علاوہ دارالعلوم ادبیات عربی و فارسی کی کتابوں کا بھی ایک اچھا ذخیرہ تھا۔ اس کے علاوہ دارالعلوم سے ملحق ایک لائبریری بھی تھی جو اس وقت امروہہ کی ایک اچھی لائبریری تھی۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ موافق اور خوش گوار حالات کیا ہو سکتے تھے۔ علم وفن کے اس پیاسے نے اپنے آپ کو خوب خوب سیراب کیا جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ فلسفے کی گتھیاں، ادب کے نکات، تاریخ کی تصاویر اور شاعری کے رموز سامنے آئے۔ یہ باتیں اس صدی کی چھٹی دہائی کی ہیں۔

جون ایلیا کے ماضی کے ذکر سے مقصد یہ تھا کہ انھوں نے کس ماحول میں آنکھیں کھولیں، ان کے شعور کی تخلیق میں کیا کیا عناصر شامل ہیں۔ ان کی ذہنی تربیت کس طرح ہوئی، ان کی شخصیت اور فن کا پس منظر کیا ہے، ان کو وراثتی طور پر اپنے خمیر سے کیا کیا ملا۔ یہ ایک مختصر سا ذکر ان کی ابتدائی تعمیر کا تھا جو ان کے فن کو سمجھنے میں یقیناً معاون ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں نہ صرف ان کا حال اور موجود کیفیت ہے بل کہ ماضی کی جھلکیاں بھی ہیں اور بہت سے سرے اس سے ملے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری کی عمارت انھی بنیادوں پر تعمیر ہوئی ہے اور پھر یہ یادیں میری زندگی کا بھی قیمتی سرمایہ ہیں۔

جون ایلیا کی شاعری پر قلم اُٹھانے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ میری شاعری نے بھی ان کی شاعری کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہے اور ان کے بنائے ہوئے خاص ماحول کی پروردہ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ صداقتوں کے اس شاعر سے قربتوں کے سبب کسی کو

جانب داری کی بو آنے لگے کیوں کہ میں محمد حسین آزاد کی اس سیرت اور روایت کو آگے نہیں بڑھانا چاہتا اور پھر میرے اور جون ایلیا کے درمیان ذوق اور آزاد والا رشتہ بھی نہیں ہے۔
جون ایلیا نے شاعری شروع کی تو رائج الوقت ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور پورے اُترے۔ حمد بھی کہی نعت بھی۔ قصیدہ بھی کہا سلام بھی۔ نظم بھی کہی قطعات بھی اور پھر غزل تو انھیں جان سے زیادہ عزیز اور محبوب ترین رہی۔ ان کا وہ اجتہادِ فکر اور اختراع پسندی جو پاکستان پہنچ کر شباب پر آئی، دراصل ہندوستان میں ہی جنم لے چکی تھی۔ وہ ابتدا سے ہی پرانے راستوں سے بچ کر اپنے لیے نیا راستہ بنانے کے قائل رہے ہیں۔ انھوں نے محبوب کے ستم کا شکوہ نہیں کیا۔ بل کہ ان کی ستم پسندی بھی انوکھی ہے اور اس میں ایک خاص بانکپن ہے، کہتے ہیں کہ۔

وہ ستم بھی تو اب نہیں کرتے
جون شاید بہت برا نہیں رہا

انھوں نے سہلِ ممتنع اور سادہ زبان میں اتنے سچے اور زندگی سے بے حد قریب قطعات کہے ہیں کہ نوجوانوں نے نہ صرف انھیں یاد کرلیا بل کہ وقتِ ضرورت کام میں بھی لانے لگے اور جلد ہی وہ نوجوانوں کے پسندیدہ البیلے شاعر سمجھے جانے لگے۔ محبت میں اظہار کی جو دشوار منزل ہے اس سے گزرنا یقیناً سخت ہے۔ ایک شش و پنج کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ایک ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ کیوں کہ فطری اور سماجی تقاضوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جون ایلیا نے اس کے لیے دیکھیے کیا اسلوب اختیار کیا ہے۔

ہے محبت حیات کی لذت
ورنہ کچھ لذتِ حیات نہیں
کیا اجازت ہے، ایک بات کہوں؟
وہ، مگر، خیر کوئی بات نہیں

اپنی بات کو نہ کہہ کر بھی جس طرح اپنا مقصد ادا کیا ہے یہ جون ایلیا کا حصہ ہے۔
نوجوانی کی اسی الھڑ عمر کی بہت سی دیگر کیفیتوں کا پوری صداقت کے ساتھ جون ذکر کر دیتے ہیں۔ وہ باتیں جنھیں محسوس سب کرتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے بل کہ شاید کہنے

کے بارے میں سوچا بھی نہیں انھیں جون نے سادگی، بے تکلفی، بے باکی اور بھولے پن سے کہہ دیا ہے کسی بناوٹ یا تصنع سے کام نہیں لیا۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

شرم، دہشت، جھجک، پریشانی
ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں
آپ، وہ، جی، مگر یہ سب کیا ہے
تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں

جون کا مزاج اُمید افزا اور یاس سے کافی حد تک بے گانہ ہے۔ وہ اچھائی میں برائی تلاش نہیں کرتے۔ بل کہ نقصان میں بھی فائدہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ گلاس کو آدھا خالی نہیں بل کہ آدھا بھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ فراق کی تکلیف میں آرام اور جدائی کی اذیت میں کیف تلاش کر لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ۔

میں نے ہر بار تجھ سے ملتے وقت
تجھ سے ملنے کی آرزو کی ہے
تیرے جانے کے بعد بھی میں نے
تیری خوش بو سے گفت گو کی ہے

وہ خوش بو سے گفت گو کا سلیقہ اور ہنر خوب جانتے ہیں اور کبھی کبھی تو محبوب کے ملبوس کی خوش بو اُن کو گھر پہنچانے بھی آتی ہے اور اس کے کیف کا احساس ان کی جمالیاتی حس کی شدت کا مظہر ہے۔

جون کے ہاں کم سنی کی شوخیاں بھی ہیں اور جوانی کے جذبے بھی۔ کبھی وہ ایک عمر کے تقاضوں کے تحت گالوں پر روشنائی ملنا چاہتے ہیں۔ کبھی محبوب سے چاند کی پگھلی ہوئی چاندی میں رنگِ سخن گھولنے کو کہتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے اندر کسی کو تلاش کرتے ہیں۔ کبھی خاموشی کے رشتے توڑ کر گفت گو کے رشتے جوڑتے ہیں۔ کبھی وہ تلخ حقائق کا اقرار کراتے ہیں اور خیالوں میں گم ہونے سے روکتے ہیں۔ کبھی حسن کو دولت کا ساتھ دیتے دیکھتے ہیں۔ کبھی رعنائیوں کو لباسِ مفلسی میں بے قیمت دیکھ کر افسوس کرتے ہیں۔ کبھی دولت کی پروردہ جاذبیت کا ذکر کرتے ہیں۔ غرض کہ زندگی کی یہ تمام تر حقیقت اور جذبے من و عن بیان

کر دیتے ہیں۔ یہاں ان کا ذاتی تجربہ، مطالعہ اور مشاہدہ ہی غور طلب نہیں بل کہ اس کے اظہار
میں جو جذبے کی صداقت اور ایک خاص اسلوب کارفرما ہے وہ اور بھی زیادہ قابل توجہ ہے۔
جون ایلیا کے پاس جتنے سرمائے ہیں ان میں انھیں سب سے زیادہ عزیز، یادوں کا
سرمایہ ہے اور یہ سرمایہ ان کی غزلوں میں جگہ جگہ مل جاتا ہے۔ یادوں کی دولت کو وہ بہت
زیادہ محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اس کے باوجود بھی ان کی یادوں کے جو گھر آباد نہیں
رہے ان پر افسوس کرتے ہیں۔ کبھی مجبوراً کسی کی یاد سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں اس لیے صبا
کی آمد پر بھی پابندی لگا دیتے ہیں۔ کبھی انھیں فرقت کی دھوپ میں زلف یاد آتی ہے تو
شامیانے کا کام کرتی ہے۔ کبھی وہ اپنے محبوب کا بدن اور اپنے معجزے یاد کرتے ہیں۔ کبھی
انھیں یادِ محبوب کے بے اماں ہونے کی فکر ہے۔ کبھی یادِ یاراں میں کھو جاتے ہیں۔ کبھی
محبوب کو اس کے خواب یاد دلاتے ہیں۔ کبھی ان کی نظروں میں یادوں کے باغ لہلہاتے
ہیں۔ کبھی کسی کی فرمائشِ سخن یاد آتی ہے۔ کبھی وہ کسی کو یہ سوچ کر یاد کرتے ہیں کہ اب اس
کی یاد کسے جگاتی ہوگی۔ کبھی وہ یہ یاد کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہ کسی یاد کی امان میں
تھے۔ کبھی وہ اپنے زخمِ تمنا کی فصل کو یاد کرتے ہیں۔ غرض کہ یادوں کے ایک حصار میں ان
کی ذات گھری ہوئی ہے۔ یادوں کا ازدحام ہے اور جون ایلیا ہیں۔ یادوں کی یہ افراط اور
شدت کبھی کبھی بلوے کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور وہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ۔

یادیں ہیں یا بلوا ہے
چلتے ہیں چاقو مجھ میں

یادوں کے حصار میں گھِرا ہوا یہ شاعر اس حصار سے باہر بھی نکلتا ہے لیکن کائنات
کی وسعتوں میں اپنے آپ کو نہیں کھوتا بل کہ وہ کائنات کو اپنی ذات میں سمونے کی کوشش
کرتا ہے اور کائنات کو اپنے دل کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ اس لیے جون ایلیا کی شاعری
کائنات کا مطالعہ کم اور اپنے دل کا مطالعہ زیادہ ہے۔ ان کے ہاں عہد کم اور ذات زیادہ
ہے۔ انھوں نے اس ذات کو بے حد وسعت دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ وہ 'مجھ میں'۔
'میرے اندر'۔ 'اپنے اندر'۔ 'اندر ہے'۔ 'اور اندر سے'۔ اور 'اندرونِ ذات' جیسے الفاظ جگہ جگہ
دہراتے ہیں۔

وہ منافقت سے ناواقف، مکر سے ناآشنا اور ریا سے بے تعلق ہیں۔ اس لیے ان کی جو بھی کیفیت ہے اور ان کے اندر جو کچھ ہے وہ اسے ویسا ہی پیش کر دیتے ہیں۔ اس میں نہ نہیں کوئی جھجک ہے اور نہ شرم اور اگر ایسا ہوتا تو داخلیت کے تقاضے پورے نہ ہوتے۔ اس سلسلے میں ان کی بے باکی، سچائی اور ایمان داری یقیناً قابلِ قدر ہے، وہ بالکل صاف کہہ دیتے ہیں کہ۔

میں تو ایک جہنم ہوں
کیوں رہتا ہے تُو مجھ میں
ڈھونڈتی ہے اک آہو کو
اک مادہ آہو مجھ میں

فکر اور فلسفے کی بلندی انسان کو تشکیک کی منزل پر بھی پہنچا دیتی ہے۔

آدم ابلیس اور خدا
کوئی نہیں یک سو مجھ میں

ایک جگہ کہتے ہیں۔

اتنا خالی تھا اندروں میرا
کچھ دنوں تو خدا رہا مجھ میں

حالاں کہ ذات کے اندر رہنے میں ایک دشواری بھی ہے اور کرب بھی۔ جون اس سے بھی واقف ہیں، کہتے ہیں۔

بہت دشوار ہو جائے گا جینا
یہاں تُو ذات کے اندر نہ رہیو

جون ایلیا کے دل سے جو یادوں کے قافلے گزرتے ہیں وہ یوں تو مختلف قسم کے ہیں لیکن چوں کہ وہ اپنی جڑوں سے وابستگی اور تعلق قائم رکھنا چاہتے ہیں اس لیے اس جذبے کے اظہار میں خاص شدّت ہے، کہتے ہیں۔

اب ہمارا مکان کس کا ہے
ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

ان کو آندھی میں ہی بکھرنا تھا
بال و پر آشیاں کے تھے ہی نہیں
اس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

واہ ان بستیوں کے سناٹے
سب قصیدے ہماری شان میں تھے

یہاں ہجرت زدگی کا کرب ہر لفظ سے چھلک رہا ہے۔ میرؔ نے دلی سے ہجرت کی لکھنؤ پہنچے۔ جون اسی حوالے سے بڑے محتاط انداز میں کہتے ہیں۔

ہم ہیں رسوا کن دلی و لکھنؤ، اپنی کیا زندگی اپنی کیا آبرو
میر دلی سے نکلے گئے لکھنؤ، تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے

یہاں ردیف میں جو درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ نہ جانے کتنے دلوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ میرؔ کے سلسلے میں اس کرب کو جون نے کہیں نیا لہجہ دیا ہے تو کہیں نئی معنویت عطا کی ہے۔

سماج میں کچھ اپنوں سے انھیں تکلیف اور صدمہ بھی پہنچا ہے اور نقصانات بھی اُٹھانے پڑے ہیں۔ لیکن اس کا اظہار انھوں نے اپنے منفرد انداز میں کیا ہے، کہتے ہیں۔

کیسے پہنچے غنیم تک یہ خبر
گھر گیا ہوں میں اپنے لشکر میں

ایک دیوار گر پڑی دل پر
ایک دیوار کھنچ گئی گھر میں

جون جو اندرونی اذیتیں محسوس کرتے ہیں، اپنی اس بے چینی کا اظہار اور داخلی کیفیت کا بیان کس قدر جامع اور انوکھے انداز میں کرتے ہیں۔

سانس کیا ہیں کہ میرے سینے میں
ہر نفس چل رہا ہے اک آرا

وہ انسان کی ذات اور اس کی ہستی کے اسرار و رموز سے پردہ اُٹھاتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی بے خبر رہنے کو ہی غنیمت جانتے ہیں۔

ہے غنیمت کہ اسرارِ ہستی سے ہم
بے خبر آئے ہیں، بے خبر جائیں گے

جون کی شاعری ذات کے بیان کی شاعری ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ کائنات سے بالکل بے خبر ہیں۔ وہ اپنے ماحول سے، حالات سے، شہر سے، حکم رانوں سے، فوجی آمریت سے بہ خوبی واقف ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بڑے عجیب اور تیکھے انداز میں طنز بھی کرتے ہیں، کہتے ہیں۔

نسبتِ علم ہے بہت حاکمِ وقت کو عزیز
اس نے تو کارِ جہل بھی بے علما نہیں کیا

آج کا دن بھی عیش سے گزرا
سر سے پا تک بدن سلامت ہے

شہرِ قلندراں کا ہوا ہے عجیب طور
سب ہیں جہاں پناہ سے بیزار کچھ سنا
آثار اب یہ ہیں کہ گریبانِ شاہ سے
اُلجھیں گے ہاتھ بر سرِ دربار کچھ سنا

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

جون سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں لیکن وہ اپنے ہم عصر حبیب جالب اور احمد فراز کی طرح نہ صف آرا ہوتے ہیں اور نہ چہرے سے کچھ ظاہر کرتے ہیں بل کہ یہ تلخیاں پی جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ۔

جا بھی فقیہِ سبز قدم، اب یہاں سے جا
میں تیری بات پی گیا پر یار سُرخ ہیں

جون ایلیا کے دور میں مذہب کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے بے خبر نہیں ہیں، کہتے ہیں۔

دھرم کی بانسری سے راگ نکلے
وہ سوراخوں سے کالے ناگ نکلے

رشتوں کی نزاکت بھی ملاحظہ ہو۔

اب جو رشتوں میں بندھا ہوں تو کھلا ہے مجھ پر
کب پرند اُڑ نہیں پاتے ہیں پروں کے ہوتے

اور جب کوئی مضبوط رشتہ منقطع ہو جاتا ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ۔

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

مرزا غالب کو محبوب کے دست و بازو کو نظر لگنے کی فکر رہتی تھی۔ دوسرے بہت سے شعرانے ساقِ سیمیں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن آج بدلے ہوئے زمانے میں کھیل کے میدان، ورزش گاہیں اور جمنازیم میں عورت بھی مرد کے شانہ بہ شانہ ہے۔ جون ایلیا کو محبوب کے ورزش کرنے کے وقت صندلیں رانوں کا دھیان بہت تڑپاتا ہے۔ یہ بات آج کچھ عجیب سی لگ سکتی ہے لیکن آنے والے کل میں نہیں لگے گی۔

جہاں تک جون ایلیا کی زبان، بیان، لفظیات، علامت نگاری، تراکیب، اصطلاحات، نئی زمینیں، قافیہ تراشی، الفاظ کی قدیم شکل کا احیا اور تجدید اور اختراع پسندی کا سوال ہے اس سلسلے میں سب سے زیادہ اثر انداز تو ان پر فارسی زبان ملے گی جو اُن کے لاشعور میں پیوست ہے۔ لیکن اس میں ان کا کام یہ ہے کہ فارسی لفظیات کی مدد سے ایک نئے اسلوب کی تشکیل کی ہے۔ اس طرح ان کے اسلوب اور لہجے کی تخلیق میں فارسی الفاظ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مثلاً محراب ابرواں، مژگاں شماراں، بے یادگاراں، روزگاراں، زندہ داراں، خداگزیدگاں، ہجرت زدگاں، کج کلہاں، گریباں تارتاراں، صورت نگاراں،

آشفتہ کاراں، خوش گزراں، راز داراں، شہر قلندراں، خوش نفساں، خوش دلاں، غزال چشماں، کم نظراں، زخم داراں، بے دلاں، خیرہ سراں وغیرہ وغیرہ۔

غزل لاکھ نازک مزاج سہی لیکن اب نئی غزل چیل کوا بھی برداشت کر رہی ہے۔ جون کے ہاں بھی جھاڑو، بل ڈاگ، راتب، چھپکلی اور کوا جیسے الفاظ مل جاتے ہیں لیکن بہت کم، جس کی وجہ یہی ہے کہ ان الفاظ کے نباہنے اور برتنے میں سلیقہ شرط ہے۔ جون ایسے الفاظ کا استعمال وہیں کرتے ہیں جہاں وہ کسی کردار یا خاص کیفیت کو پیش کرنے کے لیے ضروری ہو گئے ہوں، مثلاً۔

پیلے پتوں کو سہ پہر کی وحشت پرسہ دیتی تھی
آنگن میں اک اوندھے گھڑے پر بس اِک کوا زندہ تھا

جون ایلیا کے مزاج کی اختراع پسندی قافیہ تراشی، زمین تلاشی اور علامت نگاری میں خاص کام کرتی ہے، مثلاً غافلہا، ساحلہا، منزلہا، دلہا، محفلہا، بسملہا۔ یا گریباناں، مہماناں، تن آساناں، ساماناں، مژگاناں، راناں، درباناں وغیرہ جیسے قافیے استعمال کرتے ہیں۔

'تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے' 'گئی پل کا تُو گئی پل کا میں' 'اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا۔' شام بخیر شب بخیر، خواب خواب، شامِ خزاں، کچھ سنا، سرخ ہیں، چل نکلے اور رہیو جیسی نئی ردیفیں استعمال کرتے ہیں۔ 'نئیں' جیسے لفظ کو وہ پھر زندہ کر رہے ہیں۔

جون ایلیا کے مزاج اور ذہن کا مطالعہ کرنے میں ان کی علامتیں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں بل کہ کہیں کہیں چغلی بھی کھاتی ہیں۔ بہت سی علامتوں کو انھوں نے نئے معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ ان علامتوں کی تخلیق میں وہ رنگوں سے خاص کام لیتے ہیں۔ مثلاً سبز ملال، سبز قندیل، فقیہِ سبز قدم، زرد اُداسی، زرد سرائے، زرد آوازیں، سگانِ زرد، سُرخ وادیاں، دیواروں پر کائی اور کیاری میں پانی وغیرہ۔

جہاں تک نئی نئی تراکیب تراشنے کا سوال ہے، اس میں جون ایلیا کو ایک خاص مہارت حاصل ہے۔ ان کے ہاں نئی ترکیبوں کی بھرمار ہے۔ مثلاً عشرتیانِ رزقِ غم، آبِ حوضِ نمازیاں، بانوئے شہرِ جسم وجاں، محملِ لیلائے آرزو، قرارِ بے دلاں اور منجنیق منبر وغیرہ۔

جون ایلیا کے بارے میں یہ بحث کہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں یا غزل کے، کچھ زیادہ مناسب نہیں۔ کیوں کہ ان کا آرٹ نہ اینٹی غزل ہے اور نہ اینٹی نظم، وہ نظم کی زنجیر اور غزل کی زلفِ گرہ گیر دونوں میں اسیر ہیں۔ ان کا کوئی پیر خالی نہیں ہے۔ ان کی نظمیں موضوعاتی نہیں ہیں بل کہ ان کے تخلیقی عمل میں عنوان مؤخر ہے اور نظم مقدم۔ وہ موضوعاتی نہیں بل کہ کیفیاتی نظم گو ہیں۔ انھوں نے کرداروں، کیفیتوں، تجربوں اور تخیلی پیکروں کو موضوع سے ہم آہنگ اسلوب کے وسیلوں سے نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔

جون ایلیا کی نظموں میں نہ صرف رومان ہے بل کہ ماضی، ہجرت، تنہائی، جدائی، دربدری، بے گھری، امید و نا امیدی، آزادی، مزدوری، وقت، خواب تاریخ، سیاست، ملائیت، وجودیت، فوجی آمریت، اقتصادی نظام، سرمائے اور محنت کی جنگ وغیرہ وغیرہ کا ذکر سنجیدہ، حزنیہ، طنزیہ اور ہجویہ انداز میں ملتا ہے۔

جون کی نظموں میں نئے ماحول کے سبب اجنبیت، بچھڑنے کے بعد کے آنسو، اذیت ناک یادداشت، ماضی کا تعاقب، کسی کے بھول جانے کا شبہ، آسیب کی کیفیت، ملازمانِ حرم، استخواں فروش اور دشمنانِ جمال پر طنز اور ہم نشینوں کا ذکر ان کے انوکھے اور تیکھے انداز میں ہے۔ ان کی شاہ کار نظموں میں تعاقب، اجنبی شام، سوفسطا، رمزِ ہمیشہ، شاید، شہر آشوب اور قطعہ درِ ہجو ہم نشینانِ خود وغیرہ ہیں۔ 'سوفسطا' کا ایک جز ملاحظہ ہو۔

لفظ معنی سے برتر ہیں
میں قبلِ سقراط کے سب زباں ور حکیموں کے سر کی قسم کھا کے کہتا ہوں
یہ میری اغلوطہ زائی نہیں
ژاژ خائی نہیں

لفظ برتر ہیں، معنی سے، معنائے ذی جاہ سے
اور وہ یوں کہ معنی تو پہلے سے موجود تھے

جون ایلیا اپنی نظم 'رمزِ ہمیشہ' میں خدا سے مخاطب ہو کر کسی زمانے کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں کہ۔

نیلگوں آسمانوں سے دیوان خانے کی

سرسبز
نکہت نفس
کیاریوں تک کا سارا سماں
تجھ سے معمور تھا
خود سے مسحور تھا
شہر میں معجزوں اور
موسم کے میووں کی بہتات تھی
اور میووں کی چاہے کسی فصل میں
کچھ کمی بھی ہوئی ہو
مگر معجزے
روز افزوں تھے

شہر آشوب کا سلسلہ اُردو شاعری میں کافی قدیم ہے۔ جون ایلیا نے بھی 'شہر آشوب' کے عنوان سے نظم کہی ہے جس میں شہر کا حبس، گھٹن، آلودگی، جبر، قہر، عتاب اور خوف کا منظر نئی تراکیب اور نئی علامتوں کی مدد سے پیش کیا ہے۔ جس میں ساری کارفرمائیاں جبہ و دستار کی ہیں اور اس کا غرور پورے عروج پر ہے، کہتے ہیں کہ۔

ملازمانِ حرم نے وہ تنگیاں کی ہیں
فضائیں ہی نہ رہیں رقصِ رنگ و بو کے لیے
یہ انتظام تو دیکھو خزاں پرستوں کا
بچھائی جاتی ہیں سنگینیاں نمو کے لیے

اسی ہوس میں ہیں ہر دم یہ دشمنانِ جمال
جو سوئے رنگ اُٹھے اس نظر کو گل کر دیں
جو بس چلے کہیں ان کا تو یہ فضا بیزار
شفق کا رنگ بجھا دیں سحر کو گل کر دیں

ہوئی ہے جانبِ محراب سے وہ بارشِ سنگ
کہ عافیت خمِ ابرو کی ہے بہت دشوار
ستم کیا ہے عجب منجنیقِ منبر نے
حریمِ دل کی سلامت نہیں رہی دیوار

یہ عہد وہ ہے کہ دانش ورانِ عہد پہ بھی
منافقت کی شبیہوں کا خوف طاری ہے
نمازِ خوف کے دن ہیں کہ ان دنوں یارو
قلندروں پہ فقیہوں کا خوف طاری ہے

یہ وہ حالات ہیں کہ جن کا بیان پاکستان کے زیادہ تر باشعور اور حساس شعرا نے کیا ہے لیکن جون کا اپنا ایک الگ انداز ہے۔ ان کے ہاں غنیم سے تخاطب نہیں لیکن غنیم کے ہر عمل پر ان کی نظر ہے۔

جون ایلیا کی شاعری خون تھوکنے اور اندر سے پاش پاش ہونے کے بعد وجود میں آئی ہے۔ ان کی شاعری کا پودا فکر و ہمت کی زمین میں پھوٹ کر تناور درخت بنا ہے۔ ان کی شاعری نہ تفریحِ طبع کا سامان ہے نہ کسی خاص مقصد کی تبلیغ، نہ وہ نعرے بازی ہے، نہ چیخ پکار، نہ شعلہ ہے نہ چنگاری بل کہ غور و فکر کی وادیوں میں پہنچ کر خرامِ ناز کی کیفیت، ستاروں کی چمک اور کلیوں کی چٹک ہے جو تسکینِ ذوق کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ان کے شعری رویے میں ایک خاص سلیقہ ہے۔ ان کی شاعری احساس کا ایسا کرب ہے کہ جس میں وسعتیں بھی ہیں اور مٹھاس بھی جو اُن کے اندرونی تقاضوں اور روحانی ہیجان کے تحت وجود میں آئی ہے۔ جون کی شاعری کے نہ جانے کتنے طواف کرنے پڑیں تب اس میں پنہاں ان کا اندروں نظر آئے۔

ایک ستون اور گرا، ایک ستارہ ٹوٹا

عقیل دانش

فکر وفن کا ایک ستون گر گیا۔ شعر وسخن کا ایک اور ستارہ ٹوٹا۔ فلسفہ ودانش کا ایک اور چراغ بجھ گیا۔ ژرف نگاہی اور ادراک کا ایک اور مینار منہدم ہو گیا۔ اُردو کے معروف شاعر ادیب، ناقد، دانش ور اور انشائیہ نگار جناب جون ایلیا بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جون بھائی میرے بڑے بھائی ڈاکٹر شریف احمد سابق صدر شعبۂ اُردو یونی ورسٹی کے قریبی دوست تھے۔ اس لیے میں انھیں جون بھائی کہتا تھا، وہ میرے ہی کیا نہ جانے کتنے لوگوں کے جون بھائی تھے اور نئی نسل کے کتنے ہی شاعروں ادیبوں اور نثر نگاروں نے جون بھائی سے فکری اور فنی استفادہ کیا ہے۔ جون، رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی اور محمد عباس کے چہیتے بھائی تھے جنھوں نے خود کو فکر و فلسفے میں ڈبو دیا تھا اور شعر وسخن کے لیے وقف کر دیا تھا۔ میری یادوں کے اُفق پر جون بھائی کی امروہے کی وہ تصویر اُبھر رہی ہے جس نے ہمیشہ مجھے شفقتیں اور حوصلہ عطا کیا ہے۔ جون اور میرے بڑے بھائی 1959ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی سے ادیب کامل کا امتحان دینے والے تھے۔ مشترکہ مطالعے کی جگہ میرے گھر کا اُوپری کمرا قرار پایا تھا۔ میں ہر دو گھنٹے بعد اُوپری منزل پر چائے پہنچاتا تھا۔ میں جب بھی اُوپر جاتا جون بھائی چند منٹ کے لیے مجھے اپنے پاس بٹھا لیتے اور امروہے میں اکثر منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے جلسوں کی روداد شروع کر دیتے۔ میں کسی کسی جلسے میں اقبال یا مولانا ظفر علی خان کی کوئی نظم پڑھتا تھا۔ جون بھائی اُس نظم کا ذکر کرتے، کبھی کبھی تلفظ کی غلطیوں پر ناراض ہوتے اور کبھی اچھی ادائی پر شاباش دیتے۔ اس طرح میری فکری تربیت

میں جون بھائی کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں اس زمانے میں قافیے جوڑنے کی مشق بھی کرتا تھا۔ کبھی کبھی جون بھائی کو سُناتا تو مسکراتے اور کہتے "میاں ابھی تم لکھنے کی نہیں بل کہ پڑھنے کی مشق کرو۔" پڑھنے کی مشق کی یہ تاکید اس لیے ہوئی تھی کہ اُس وقت میں دارالعلوم امروہہ میں کلام پاک حفظ کر رہا تھا۔ اُردو ہیئت اٹک اٹک کر پڑھتا تھا۔ قافیہ بندی امروہے کی فضا کی دین تھی، ہر طرف شعر وسخن کا چرچا۔ آئے دن ادبی اور شعری محفلیں۔ چند اساتذہ کی قادرالکلامی، جون بھائی کی خوش فکری اور کوثر امروہوی کے ترنم نے امروہے کو فکر وفن کا گل زار بنا رکھا تھا۔ کوئی مشاعرہ کوئی شعری نشست اور کوئی محفلِ سخن ایسی نہیں تھی، جو جون بھائی کی شرکت کے بغیر مکمل سمجھی جاتی ہو۔ اُن کے اُن محفلوں کے کچھ اشعار اب بھی ذہن میں پھول کھلاتے ہیں۔

کتنے ظالم ہیں جو یہ کہتے ہیں
توڑ لو پھول، پھول چھوڑو مت
باغ باں ہم تو اس خیال کے ہیں
دیکھ لو پھول، پھول توڑو مت

شرم، دہشت، جھجک، پریشانی
ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں
آپ، وہ، جی، مگر یہ سب کیا ہے
تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں

امروہے میں فکر وفن اور شعر وسخن کو اُجالنے کے کئی مراکز تھے۔ مثلاً مولانا عبادت کا آستانہ، حکیم کلبِ علی کی نشست گاہ، قاضی عبدالعزیز کی بیٹھک۔ قاضی عزیز سے میری عزیز داری بھی تھی شاید اسی لیے وہ بڑوں کی محفل میں مجھ بچے کو بھی بیٹھنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ شعر وسخن کا اور لفظ شناسی کا شغف مجھے انھی محفلوں سے ہوا۔ جون بھائی ہر محفل کی جان ہوتے تھے۔ اوّل اُن کی شخصیت، گندمی رنگ، سبک ناک نقشہ، کچھ سوچتی ہوئی آنکھیں، ایک خاص انداز سے بکھرے بال جنھیں جون بھائی اکثر ہاتھ سے سنوارتے

رہتے۔ اُن کے اطوار میں ایک خاص قسم کی بے چینی نظر آتی تھی جسے میں اس وقت سمجھ نہیں سکتا تھا۔ جون بھائی تحت اللفظ میں شعر پڑھتے تھے لیکن ایسا تحت اللفظ جس پر ہزار ترنم نثار کیے جا سکتے تھے۔

1952ء میں، میں پاکستان آ گیا۔ امروہے کی فضاؤں سے بہت دُور بے رحم شہر کراچی میں بسنا پڑا۔ اس وقت مجھے یہ شہر بے رحم ہی نظر آتا تھا۔ اجنبی زبان، اجنبی درودیوار اور دھول مٹی۔ کراچی پہنچ کر نبی باغ ہائی اسکول میں ابتدا سے پڑھنا شروع کیا۔ یہ غالباً 1957ء کی بات ہے کہ گاندھی گارڈن کے قریب ایک دن جون بھائی نظر آئے۔ پراگندہ حال، شیروانی کھلی ہوئی جس کے کئی بٹن غائب، بال بکھرے ہوئے، ہونٹوں پر پپڑیاں، چہرے پر تکان، انداز میں وہی بے چینی جو امروہے میں اُن کی شناخت بن گئی تھی۔ مجھے دیکھا تو بے اختیار لپٹ کر رونے لگے اور روتے روتے کہنے لگے 'بھائی میں امروہہ چھوڑ کر کیسی بے امان بستی میں آ گیا ہوں۔' میں نے انھیں تسلی دینے کی کوشش کی 'جون بھائی! آپ ہی کیا یہاں تو اکنافِ ہند سے ہزاروں لوگ آ گئے ہیں۔' اس وقت تک کراچی آنے والوں کی تعداد ہزاروں ہی میں تھی، بہت بعد کو یہ لاکھوں تک پہنچی۔ جون بھائی نے کہا 'میاں مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم امروہے میں قافیے جوڑنے کی مشق کرتے تھے اور تمھارا بھائی شریف اور میں تمھیں پڑھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ کیا اب بھی شعر کہنے کا شوق باقی ہے۔' میں نے اثبات میں جواب دیا تو کچھ سوچ کر کہنے لگے 'میاں تمھارا نام عقیل ہے تم دانش تخلص رکھ لو۔ کیسا رہے گا؟' اس وقت میرے ذہن میں یہ حقیقت بالکل نہیں آئی کہ شاعری کی دنیا میں پہلے سے ایک احسان بن دانش (اور بعد میں احسان دانش) موجود ہے۔ میرے اس تخلص پر بہت سے لوگوں نے اعتراض بھی کیا کہ بھائی یہ بہ یک وقت عقیل اور دانش کی کیا تک ہے؟ جواباً میں ہمیشہ جون بھائی کا حوالہ دیتا رہا۔ جون بھائی ایک بار دلی گئے تو کنور مہندر سنگھ بیدی نے بھی عقیل پر اعتراض کیا۔ جون بھائی نے فوراً سعدی کا مصرع پڑھا۔

بہ ایں عقیل و دانش

بہت بعد کو جون بھائی نے کراچی سے 'انشا' نکالا۔ انشا اپنی وضع کا بہت انوکھا اور معیاری ادبی ماہ نامہ تھا جس نے فکر و فن کی بہت سی روایتیں قائم کیں۔ انشا کے دو شماروں

میں راقم الحروف کے مضامین بھی شامل تھے۔ پاکستان میں ڈائجسٹوں کی روایت اُردو ڈائجسٹ سے شروع ہوئی۔ وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جون بھائی نے انشا کو عالمی ڈائجسٹ کا نام دے کر ادب میں ایک اور صحت مند روایت کا آغاز کیا۔ آغاز کا لفظ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ آج پاکستان میں جتنے بھی ڈائجسٹ نظر آتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح اُردو ڈائجسٹ ہی کا پرتو ہیں۔ جون بھائی کے حکم پر میں نے بھی عالمی ڈائجسٹ میں طلسم ہوش ربا کے ایک زندہ کردار عمرو عیار کی داستان لکھنی شروع کی تھی جو کئی ماہ چلتی رہی اور بعد کو مجھے مکروہاتِ زمانہ نے ایسا جکڑا کہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جون بھائی بڑے مرنج و مرنجاں، خلیق، متواضع، دوست دار، باوضع اور منکسر المزاج انسان تھے۔ کبھی کبھی عالمِ سرخوشی میں اُن کی منکسر المزاجی 'خود پرستی' میں بدل جاتی تھی۔ بڑے طمطراق سے کہتے 'میاں میں نے اُردو غزل کو جو رنگ دیا ہے، وہ میرا اپنا رنگ، اسلوب اور اپنی وضع ہے۔ کوئی اور اسی رنگ میں کہے تو خون تھوکنے لگے۔' ان کی یہ خود پرستی جائز بھی تھی۔ جن لوگوں نے جون بھائی کو سنا ہے، 'شاید' کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ جون بھائی کا ہر شعر، ہر مصرع پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں جون کی تخلیق ہوں۔ اُردو میں کتنے شاعروں کو یہ اعزاز حاصل ہے؟ نہ صرف پاکستان میں بل کہ برصغیر میں جون بھائی جیسے کثیر المطالعہ اشخاص اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اُن کا اوڑھنا بچھونا کتابیں تھیں۔ اُردو، عربی، فارسی، لسانیات، صوتیات، تاریخِ اسلام، عبرانی اور اشتراکیت پر انھیں ایسا عبور حاصل تھا کہ باید و شاید کسی کو ہو۔ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ انھوں نے متعدد عربی اور فارسی رسائل کا ترجمہ کیا تھا۔ جس میں سے بیش تر شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکے۔ نثر میں بھی ان کا انداز، لہجہ اور لفظیات بالکل اچھوتے، منفرد اور انوکھے تھے۔ وہ گزشتہ کئی سال سے اُردو کے کثیر الاشاعت ماہ نامے 'سسپنس ڈائجسٹ' میں ایک صفحے کا انشائیہ لکھتے تھے۔ ہزاروں لوگ صرف یہ انشائیہ پڑھنے کے لیے یہ ڈائجسٹ خریدتے تھے۔ اس انشائیے کی زبان آج تک کی اُردو نثر میں منفرد زبان ہے۔ جون بھائی مشاعروں میں اکثر غزلیں پڑھتے تھے۔ اس لیے بعض شاعر انھیں صرف غزل کا شاعر گردانتے ہیں لیکن جنھوں نے ان کی نظمیں پڑھی ہیں انھیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ان کی غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی فکر کی بوقلمونی، جذبے کی حدت، احساس کی شدت،

الفاظ کی ندرت اور خیال کی لطافت موجود ہے۔ امروہے میں جون بھائی ایک رومانی حادثے سے دو چار ہوئے اور ایک نظم لکھی 'نامہ بہ نامِ فارہہ'۔ نصف صدی پہلے لکھی جانے والی اس نظم کے صرف دو شعر میرے ذہن میں رہ گئے ہیں۔

جو حقیقت ہے اُس حقیقت سے
دُور مت جاؤ، لوٹ بھی آؤ
ہو گئیں پھر کسی خیال میں گم
تم مری عادتیں نہ اپناؤ

یہ جون بھائی کی شاعری کی ابتدا تھی، جس کی انتہا نظم 'راموز' ہے۔ وہ بلا مبالغہ روحِ عصر تھے۔ عالم، فاضل، شاعر، ادیب، ناقد، انشا نگار، مدیر، مترجم، مؤرخ اور اُستاد۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے ہمہ صفت موصوف کی اصطلاح تراشی گئی ہے۔ جون بھائی کے دوست، ملنے والے، شاگرد، اعزہ ان کی عزت بھی کرتے تھے اور ان سے محبت بھی۔ جب سلیم جعفری مرحوم نے اصرار کر کے دبئی میں ان کا جشن منایا تو عالمِ سرخوشی میں جون بھائی نے بھرے مشاعرے میں فرمایا۔ 'میں دبئی کبھی نہیں آتا مگر اس حرام زادے سلیم نے اصرار کیا تو میں پہنچ گیا۔' حاضرین اور سلیم جعفری جون بھائی کی باتیں سن کر مسکراتے رہے۔ اس لیے کہ اس 'حرام زادے' میں جو پیار چھپا ہوا تھا، اس کو دل والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ آج جون بھائی ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کا فن، ان کا لہجہ، ان کا کمال اور ان کا خلوص جب تک زندہ رہے گا، جب تک اُردو پائندہ رہے گی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

جانِ چمن رہو گے تم

علی زریون

شاعری انسانی تاریخ کا سب سے خوب صورت ترین سچ! ایک ایسا سچ جس کی لہریں، تقویمِ محدود سے کہیں آگے تک رواں ہیں۔ یہ وہ سچ ہے جس نے قدیم اور حادث کے معاملات بھی سلجھائے، درون اور بیرون کے فلسفے ہزارہا شکلوں، لہجوں اور طریقوں سے نمٹائے۔ یہ شاعری ہی تھی جس نے انسان کو انسان کے دروں کی خبر دی، جس نے اپنی دریافت سے احساسات کا وہ در وا کیا کہ جس کا کھلنا، جہانِ معانی کی اس عظیم الشان اِقلیم میں راہ دیتا ہے جہاں پھول گفت گو کرتے ہیں، پانی خواب دیکھتا ہے، مٹی کلام کرتی ہے اور درخت اپنے سائے میں بیٹھنے والے مسافروں کی میزبانی کرتے ہیں۔ شاعری کے روزِ اوّل سے لے کر لمحۂ حاضر تک یہ پُراسرار داستان اپنے خاص الخاص رازداروں پر ہی کھلی ہے، اس کی حالتیں رمز پرور، اس کا مکالمہ کہیں شور اور کہیں سحر انگیز ہے، یہ وہ بانوئے شہر ہے جس نے اپنی چلمن کا رُخ بھی کبھی نامحرموں پر عیاں نہیں ہونے دیا...... جمال تو دُور کی بات ہے۔ 'لکھنے' اور 'کہنے' والوں کے درمیان فرق، فصلِ عظیم یہی تو رہا ہے کہ جانے کتنے ہی آئے جنھوں نے اپنی اپنی بساط بھر 'بہت زورِ غزل میں مارا' کے مصداق ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن...... نہیں...... کام یابی انھی کو ملی جو اس لیلائے پُرافسوں کے حضور مکمل و اکمل حاضری، کیفیت اور جذب سے آئے۔ بانوئے شہرِ سخن، عارفۂ اسرارِ کائنات یعنی شاعری کے انھی رازداروں، انھی محرموں، انھی اعلیٰ والیاؤں میں سے ایک نہایت سرکش، نہایت حال خیز اور نہایت رمز پرور محرم اور محبوب کا نام جون ایلیا ہے۔

جون ایلیا مدینۃ الشعر کا بابِ کرامت ہے۔ ایک ایسا بابِ کرامت جس نے

اُردو شاعری میں اس لہجے کو ازسرِ نو دریافت کیا جس لہجے کی رمق قریب قریب ڈوب چکی تھی۔ وہ سرمستِ ذات ایسا تھا کہ جس نے اپنے لہجے اور اپنے اسلوب سے ایک ایسے نصاب کی شرح تحریر کی جس کی مثال کہیں اور سوائے جون ایلیا کے کہیں نہیں ملتی۔ یہ اس عظیم سرکش کے ذروں کا سچ ہی تو ہے کہ آج بھی جونِ عظیم ایلیا کا کلام، اپنی سادگی اور رمز کی پُرکاری کے سبب گروہانِ کاریگراں کے تمام لکھے ہوئے پر بھاری ہے۔

جون ایک ایسا دریا ہے جس کی مستی نے اپنی تمام سرکشی اور بھرپور روانی کے باوجود حرمتِ حرف ولفظ کی کسی بستی، کسی قریے پر چڑھائی نہیں کی۔ یہ دریا اپنی مستی سے اپنے سینۂ لخت لخت سے چیختا ہوا جو نکلا ہے تو اپنے اندر ہی سمایا ہے۔ اس کی چیخ ایسی بہترین چیخ ہے کہ آج بھی محبت کے تھکے ہوئے وجود، ذات ولا ذات کی چڑھائیوں سے گر کر ہارے ہوئے نفوس، جون کی شاعری کو کلامِ مقدس کی طرح جانتے ہیں۔ جون اپنے عہد کا جبلِ احد تھا، ایسا جبلِ احد جس کے سائے میں حرف ولفظ کے تمام منافقین وکافرین بھی اگر آئے تو فیض یاب ہو کر گئے۔ وہ سب میں رہ کر بھی سب جیسا نہیں تھا اور اس کی طرف کوئی وحی بھی نازل نہیں ہوتی تھی...... لیکن پھر بھی اس کے چاہنے والے اس کے ناز اُٹھانا اپنا فخر جانتے تھے۔ وہ ایسا محبوب تھا کہ جس پر ناز جچتا تھا، غرور کھلتا تھا اور بے نیازی سجا کرتی تھی۔ اس نے اپنے کلام میں کوئی جھوٹ نہیں بولا، بالکل اسی طرح جس طرح اس نے اپنی زندگی میں بہت سے سچ بھگتے اور ہر سچ کا صلہ بھی۔

جون ایلیا اُردو ادب کا وہ واحد ادیب ہے جس کے ہاں ادب اپنے کُل کے ساتھ درود کرتا نظر آتا ہے۔ وہ واحد تخلیق کار ہے جس کا کہا ہوا شعر آج بھی کوئی اپنے لہجے میں نہیں پڑھ سکتا۔ کلام کے ساتھ شخصیت کا یہ اٹل آہنگ ہی وہ سبب ہے جس نے جون کے کلام کو آفاقی انفرادیت عطا کی۔ جون کا سب سے بڑا اور خاص کمال اُردو شاعری میں 'میں' کی حسیت، خاصیت اور ہیئتوں کا اجرا ہے۔ 'میں' کا جتنا بڑا نفوذ جون کے ہاں ہے، کسی اور کے ہاں نہیں۔ جون نے اپنی انفرادی 'میں' کو اس انداز سے برتا اور دیکھا ہے کہ اس انفرادی 'میں' نے بڑے معجزے برپا کیے ہیں۔ کہیں یہ 'میں' محبت میں سخت جھنجھلائے ہوئے شخص کی 'میں' بن کر سامنے آتی ہے اور کہیں یہ 'میں' منافقت، عوام پر جاری کردہ جبر اور ذات کی

عجیب و غریب منطق سے الجھ کر باقاعدہ خطاب کرتی نظر آتی ہے۔

اے خدا! (جو کہیں نہیں موجود)
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

جون کا کمال یہ ہے کہ جون کا شعر انسانی و شخصی نفسیات کے اس قدر قریب رہ کر مکالمہ کرتا ہے کہ ذرّہ برابر بھی بوجھل پن نہیں پیدا کرتا۔ لطف اور حیرت کی ایک ایسی رو دوڑ جاتی ہے کہ جیسے آپ نے کوئی شعر نہیں سنا، اپنے سامنے کوئی ورائے عقل بات سرانجام پاتے دیکھ لی ہو۔ وہ اپنے قاری کے ساتھ بالکل اجنبی نہیں۔ جون کو اگر ہم ان نہایت چند خوش نصیب تخلیق کاروں میں شامل کریں جن کا قاری ان سے والہانہ محبت کرتا ہے تو جون بلا مبالغہ سرِفہرست نظر آئے گا۔ اس کے کلام میں موجود بے ساختگی جون کا وہ نہایت خالص اور ذاتی مقام ہے جہاں کوئی اس کا شریک تو دُور کی بات، پاس بھی نظر نہیں آتا۔ جون کی زمینیں اور بالخصوص وہ تمام زمینیں جن کی ردیف 'ہاں تو'..... 'تھا کیا'..... 'کوئی ہے' اور ایسی تمام زمینیں جن میں ذات سے مکالمہ کیا گیا ہے، ایسی خطرناک اور اٹل زمینیں ہیں کہ کوئی بھی 'بے کیفیت و بے برکت' شاعر اس زمین میں غزل کہتے ہوئے جون کے اثر سے بچ ہی نہیں سکتا۔

جونِ عظیم ایلیا کی شاعری کا سب سے محبوب و مرغوب تلازمہ اور موضوع 'ذات' ہے۔ کچھ عاقبت نااندیش لوگ جون کی شاعری کے بارے میں بڑے فلسفیانہ انداز میں موشگافی کرتے نظر آتے ہیں کہ 'جون ایلیا کی شاعری دو تین پرتوں تک ہی محدود ہے۔' یہ بات اگر بالفرضِ محال مان بھی لی جائے تو ان تین پرتوں میں سے پہلی پرت ہی 'ذات' ہے اور جس تخلیق کار کی تخلیق سازی کا دورانیہ شروع ہی 'ذات' سے ہو رہا ہو، اس کی باقی جہات کا اندازہ لگانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ادب کی تمام منقولہ و غیر منقولہ دستاویزات کا جائزہ لیا جائے تو ان تمام دستاویزات میں جو لفظ جلی حروف میں لکھا ہوا ملے گا۔ وہ یہی 'ذات' کا لفظ ہوگا۔ جون کی شاعری کا محیط 'ذات' کی نہایت بے قرارانہ حیثیت سے ہوتا ہوا، اجتماع در اجتماع سفر کرتا ہوا خود خدا کی زبان بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات نہایت واضح رہے کہ جو خدا جون کے ہاں زیرِ بحث آیا ہے، وہ جون کا ذاتی خدا ہے۔ اس خدا کا کوئی معاملہ کسی اور یا یوں کہہ لیجیے کہ عوام الناس میں رائج و نافذ خدائی نظریے سے

ہر گز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جون نے جہاں جہاں خدا سے مکالمہ کرتے ہوئے کوئی بات کی ہے، وہاں وہاں اس کا لہجہ تیز ہوتے ہوئے بھی ایک خاص طرح کے محبوبی آہنگ سے خارج نہیں ہوا...... یہ اہلیت نہیں تھی، یہ کوئی کمالِ فن نہیں تھا، یہ درحقیقت جون کے بہت اندر کی وہ معصومیت اور وہ سچ تھا جو اسے تحقیق، سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ زرِ فکر بازاری دکانوں پر لٹانے، فلسفی کسبیوں کا مجرا دیکھنے سے کہیں بہتر یہی راہ تھی جو جون کے اندر از خود بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ خدا کے حضور آدمی کی وکالت، یزداں کے سامنے حضرتِ انسان کا وجود ثابت کرنا جون کی فکری مجبوری تھی، کیوں کہ وہ بہت پہلے کہیں کہہ چکا تھا 'میں اپنا آدمی ہرگز نہیں، لوح وقلم کا آدمی ہوں۔' یہ بات کوئی معمولی بات ہے ہی نہیں۔ یعنی یہی وہ جداگانہ روش تھی جس کے سبب جون کا اسلوبِ شاعری اور آہنگ شخصیت اسے تمام ہم عصر اہلِ سخن سے ممتاز و منفرد کرتا ہے۔ وہ جیسا اپنے کلام میں ہے، ایسا ہی خالص وہ اپنی شخصیت میں ہے۔ اس کی شخصیت اتنی بڑی شخصیت ہے کہ دریا مثال ہے۔ اس کی تمام سرشاری اور مستی اس کے کلام کا آہنگ بنی اور کائنات گواہ ہے کہ کلام تو بہت دُور کی بات ہے، اگر کوئی ایک ذرّہ بھی اپنے داخلی سچ کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جون تو پھر ایک جیتی جاگتی کلام کرتی شخصیت تھی۔

جون کی شاعری ایک مثال ہے کہ لہجے کا بے ساختہ پن بھی وہ بڑی شاعری تخلیق کر سکتا ہے جس کی طرف بہت سے لوگوں نے خود ساختہ سنجیدگی اور گمبھیرتا اوڑھے ہوئے سفر کیا ہے۔ وہ ہنس کر ان معاملات کی گرد اُڑا گیا جن پر بات کرتے ہوئے بہت سوں کی سانس پھول جاتی ہے۔ نسلِ انسانی جیسے جیسے اپنے ارتقا کی سیڑھیاں چڑھے گی، جیسے جیسے فرد کا شعوری تنفس بحال ہوتا رہے گا، فرد جیسے جیسے خدا اور ذات کے قریب ہوتا جائے گا......

جون کا یہ شعر تا ابد لوحِ زمان و مکان پر لَو دیتا رہے گا!

کربِ تنہائی ہے وہ شے کہ خدا
آدمی کو پکار اُٹھتا ہے

وہ چمن ہی نہیں جانِ چمن بھی تھا۔ جب تک یہ چمن قائم ہے جانِ چمن تم ہی رہو گے جون......!

سخن طراز وسحر کار

عمران الحق چوہان

میں چھٹی جماعت میں تھا کہ مجھے اسکول میں ادبی مقابلوں کی نمائندگی کے لیے چن لیا گیا۔ تقریروں، مباحثوں اور تحت اللفظ کلام اقبال پڑھنے کے علاوہ مجھے بیت بازی میں بھی شریک ہونا ہوتا تھا۔ بیت بازی کی تیاری کروانا اسد اللہ غالب صاحب (جی ہاں ان کا یہی نام تھا) کے ذمے تھا۔ غالب صاحب یوں تو بھیرہ کے رہنے والے تھے لیکن بہ سلسلہ روزگار 'الاصلاح ہائی اسکول' چنیوٹ میں اُردو کے معلم تھے۔ وہ مجھے اچھے اچھے اشعار خوش خط لکھ کر دیتے اور میں انھیں یاد کر لیتا۔ کم عمری اور ذہنی زرخیزی کے باعث ایک دن میں سو اشعار یاد کر لینا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایک روز انھوں نے مجھے ایک مجلد کتاب لا کر دی اور کہا کہ اس میں سے حروفِ تہجی کے اعتبار سے اچھے اشعار نکال کر یاد کرو۔ اس کتاب میں لاتعداد شعرا کا کلام درج تھا۔ اور انتخاب بھی بہت اعلیٰ تھا۔ یہ کتاب جسے ہم طلبہ مذاقاً 'کاپا' (کاپی کا اسمِ مکبر) کہا کرتے تھے۔ دراصل ادبی رسالے 'فنون' کا غزل نمبر تھا۔ اس طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ ابتدائی عمر ہی میں میرے اندر اچھے شعر کا ذوق پیدا کرنے میں غالب صاحب کے علاوہ فنون کے غزل نمبر کا بنیادی ہاتھ تھا۔ جن جن شعرا کو میں نے وہاں پڑھا وہ سب ادب کی قدآور شخصیات تھیں۔ میں نے اس غزل نمبر کی بنیاد پر کتنی ٹرافیاں جیتیں، میرے اشعار کے انتخاب کی دھوم کہاں تک تھی اور کہاں کہاں سے لوگ میرا مقابلۂ بیت بازی سننے آتے تھے۔ یہ الگ موضوع ہے۔ جو بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس 'کاپے' میں ایک شاعر کی غزلوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ جس

غزل نے مجھے بہت حیران کیا اس کے چند اشعار سنیے۔ (ردیف کا صحیح املا 'کیجے' ہے جسے کمپیوٹر درست نہیں لکھ سکتا، براہِ مہربانی اسے خود درست پڑھ لیجیے گا۔ شکریہ)

آپ تھے جس کے چارہ گر وہ جواں
سخت بیمار ہے دعا کیجے
کوہ کن کو ہے خودکشی خواہش
شاہ بانو سے التجا کیجے
ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اسے خفا کیجے
مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی
آپ مجھ کو منا لیا کیجے

اور اس غزل کے جن دو شعروں نے مجھے صحیح معنوں میں حیران کیا، وہ یہ تھے۔

رنگ ہر رنگ میں ہے داد طلب
خون تھوکوں تو واہ وا کیجے
نطق حیوان پر گراں ہے ابھی
گفت گو کم سے کم کیا کیجے

یہ مضامین، لہجہ عام شاعروں اور مضامین عام روایتی شاعری کے نہیں تھے۔ شاعر کا نام میرے لیے نامانوس تھا۔۔۔ جون ایلیا۔ میں حیران ہوا کہ کوئی یوریپین شاعر اتنے انوکھے اشعار کیسے کہہ لیتا ہے؟ ان کا نام ہی ایسا تھا کہ ایک کم عمر طالبِ علم کا دھوکا کھا جانا معمولی بات تھی۔ بعد میں یوسفی صاحب کی غلط فہمی کا احوال پڑھا تو میری شرمندگی کم ہوئی کہ یوسفی صاحب تو نام کی وجہ سے انھیں کوئی 'آوارہ اینگلو انڈین لڑکی' سمجھے تھے۔ تب جون ایلیا کو وہ شہرتِ عام نہیں ملی تھی جو بعد ازاں انھیں ملی۔ ظاہر ہے اس کی وجہ ان کی شہرت کی سیاست سے عدم دل چسپی تھی۔ ایک بار پی ٹی وی پر ایک مشاعرے کی پیروڈی میں معین اختر کو لمبے بالوں کی وگ لگائے اور شیروانی پہنے جون کے انداز کی مزاحیہ غزل 'کیا وہ سڑک ہوئی تمام؟ ہاں وہ سڑک ہوئی تمام..... کیا وہ ٹرک گزر گئے؟ ہاں وہ ٹرک گزر گئے۔'

پڑھتے سنا تو جون کے حلیے اور شباہت کا کچھ اندازہ ہوا۔ وہ اچھے دن تھے اور ابھی شاعروں کی جگہ جگتوں اور لطیفوں کے مضامین کو شعر بنانے والے مسخروں اور بھانڈوں نے نہیں لی تھی اور پی ٹی وی پر بڑے اعلیٰ مشاعرے دیکھنے سننے کو ملتے تھے۔ ان ہی مشاعروں میں جون ایلیا کو شعر پڑھتے دیکھا تو شاعری کے علاوہ ان کے اندازِ بیان نے مجھے اور بھی ان کا مداح بنا دیا۔ میں طبعاً زبان کا رسیا ہوں اور جون کی زبان دانی سے متاثر ہونا ایک فطری سی بات تھی۔ پھر یہ ہوا کہ ان کی شاعری جہاں ملتی میں اسے سنبھال لیتا اور زبانی دوسروں کو سناتا۔ لیکن اس ظالم کا کوئی شعری مجموعہ میسر نہیں تھا۔ نوے کی دہائی کے آغاز میں جب 'شاید' شایع ہوئی تو جون صحیح معنوں میں اپنے قارئین تک پہنچے۔

جون سے میری ملاقات لاہور میں نام ور فن کار منور سعید کے گھر ہوئی۔ غالباً یہ نومبر 1996ء کی بات ہے۔ آتی سردیوں کی ایک سہ پہر تھی۔ ڈھلتے سورج کی زرد روشنی سے پیڑوں کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ بالائی منزل کی ایک خواب گاہ میں ان سے طویل گفت گو ہوئی جو ان کی وفات کے بعد 2006ء میں 'ادبیات' اسلام آباد میں شایع ہوئی۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے جون بھائی (انھوں نے پہلی ملاقات میں ہی مجھے صاحب کہنے سے منع کر دیا تھا۔ اور بھائی کہلوانے پر اصرار کیا تھا۔) کو ان کا ایک بھولا ہوا شعر یاد دلایا۔ 'نطق حیوان پر گراں ہے ابھی' والا۔ یہ شعر 'شاید' کی ابتدائی اشاعت میں درج غزل میں نہیں تھا۔ جون یہ شعر یاد دلائے جانے پر بہت خوش ہوئے اور اسی وقت مجھے گاڑی میں اپنے ساتھ انارکلی میں واقع الحمد پبلشرز کے ہاں لے گئے اور یہ شعر اگلی اشاعت میں شامل کرنے کے لیے کہا۔ میری ایک نظم 'اب اس سے ملنے کا امکان' سن کر داد دی اور وعدہ لیا کہ میں اپنی شاعری اصلاح کے لیے انھیں بھیجا کروں گا لیکن میں ان کے شعری معیار کے خوف سے یہ جرأت کبھی نہ کر سکا۔

وہ ایک پیچیدہ شخصیت تھے اور بے حد اوریجنل شاعر۔ وہ جس پس منظر سے تھے وہاں شعر و شاعری ماحول کا لازمہ تھی۔ بہ قول ان کے بڑے بھائی رئیس امروہوی 'ہمارے معاشرے میں تخلص رکھنا اور تک بندی کرنا لازمہ تصور کیا جاتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں بے تخلص شخص کو دُم کٹا بھینسا یا بے سینگوں کا بیل سمجھا جاتا تھا۔ امارت، فارغ البالی اور

اقبال مندی کا دور کب کا ختم ہو چکا تھا اور اب ہمارے بزرگوں کے لیے لطفِ معاشرت اور لطفِ معاشرہ صرف شطرنج بازی اور شعر طرازی میں رہ گئی تھی۔' پاکستان بہ وجوہ تہذیبی اعتبار سے وہ فضا نہیں رکھتا تھا جو جون بھائی ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے۔ اس فرق نے انھیں ہمیشہ تکلیف میں مبتلا رکھا۔ اس بارے میں ایک دل چسپ واقعہ انھی کی زبانی سنتے چلیے جو اُن کی رئیس امروہوی صاحب کے ساتھ علامہ اقبال سے ملاقات کا ہے۔ 'لاہور کے اس قیام کے دوران بڑے بھائی نے علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف بھی حاصل کیا۔ اس وقت علامہ اقبال بان کے کھرے پلنگ پر تکیہ لگائے ہوئے نیم دراز تھے اور حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ وہ نوخیز سیّد محمد مہدی رئیس امروہوی سے بے حد شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ انھوں نے مصحفی امروہوی کی تعریف کرنے کے بجائے امروہے کے آموں کی تعریف کی اور بہت کی۔ انھیں امروہے کا 'چونسا' بہت پسند تھا۔'

جون ان شاعروں میں سے تھے جو صرف اور صرف شاعر ہوتے ہیں۔ وہ شاعری کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ انھیں شعر بنانے نہیں پڑتے تھے۔ ان کے احساس کی شدید تند اور کٹیلی رو خود بہ خود شعر بنتی چلی جاتی تھی۔ شاعری میں ہم سب 'آمد' اور 'آورد' کی ترکیبوں سے بہ خوبی واقف ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ عموماً پوری غزل میں ایک دو شعر ہی آمد ہوتے ہیں باقی سارے شعر بے چارے شاعر کو غزل کی روایتی طوالت پوری کرنے کے لیے بنانے یعنی گھڑنے پڑتے ہیں۔ میں نے کچھ شاعر ایسے بھی دیکھے ہیں جو اپنی بیاض میں پہلے سارے متعلقہ قافیے لکھ لیتے ہیں اس کے بعد کسی بڑھئی کی طرح ان میں مصرع 'ٹھونکتے' جاتے ہیں۔ اس دست کاری سے کچھ اس قسم کے شعر وجود میں آتے ہیں۔

آسماں پر جو یہ ستارے ہیں
سب ہوا سے بھرے غبارے ہیں

ظاہر ہے اس شعر میں 'ستارے' اور 'غبارے' کے ہم قافیہ ہونے کے علاوہ کچھ بھی شاعرانہ نہیں ہے۔ اس کریہہ مشقت کی دوسری وجہ غالباً یہ ہے کہ اُردو ان شاعروں کی فکری زبان بھی نہیں ہوتی، انھیں اُردو سوچ کر لکھنی پڑتی ہے۔ (رفعِ شر کی خاطر پہلی وجہ لکھنا مناسب نہیں ہے، آپ خود سمجھ دار ہیں۔) لیکن اُردو جون کے شعور، لاشعور اور معاشرت کی

زبان تھی۔ اُردو الفاظ کے تاثر، تھوں اور شیڈز سے جس طرح وہ واقف تھے اور انھیں سہولت سے برت سکتے تھے وہ صلاحیت بہت کم شاعروں کو میسر آتی ہے اور رہی بات تاثیرِ سخن اور قبولِ عام کی، تو ہم جانتے ہیں کہ یہ صرف مشق اور ریاضت کی شے نہیں ہے، یہ خداداد ہوتی ہے۔ سوایک عالم نے ان کی شاعری کا لوہا مانا۔ وہ سامعین اور قارئین کے محبوب شاعر تھے۔ ان کی ردیفیں بعض نام ور شاعروں بہ شمول احمد فراز اور افتخار عارف وغیرہ نے بھی برتیں۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی! ان کی شعری خصوصیات کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن میں سرِ دست ان کی نثر نگاری کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

'شاید' کی اشاعت سے جہاں ان کی شاعری مرتب شکل میں لوگوں تک پہنچی وہیں اس کتاب کے دیباچے نے قاری کو جون بھائی کی شخصیت کے بہ طور نثر نگار ایک اور پہلو سے روشناس کروایا۔ سچ پوچھیے تو ان کی نثر بھی ویسی ہی طناز، طرح دار اور دل زدہ تھی جیسی ان کی شاعری اور پھر کتاب کے پس ورق پر ان کی دیگر کتب کے نام پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ نرے شاعر ہی نہیں بل کہ کثیر المطالعہ، ماہر لسانیات، فلسفی اور تاریخ دان بھی ہیں۔ لیکن ان کی کسی مربوط اور مسلسل تحریر کو پڑھنے کی آرزو ہی رہی۔ اس دوران ان کے کئی Posthumous شعری مجموعے شایع ہوئے لیکن ان کی نثر کہیں پس چلمن ہی رہی۔ کچھ عرصہ ہوا مجھے پتا چلا کہ جون کے مضامین اور انشائیوں کا مجموعہ شایع ہوا ہے تو مجھے ایک بار پھر اسی Excitement کا احساس ہوا جو 'شاید' کی اشاعت کی خبر سن کر ہوا تھا۔ کتاب کی ضخامت دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کتاب کا نام 'فرنود' ہے اور محترم خالد احمد انصاری نے اسے مرتب کیا ہے۔ ایسا مداح اور وفا شعار دوست بڑے مقدر سے ملتا ہے۔ جون بھائی کی جیسی ادبی نصرت انھوں نے کی ہے اسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید اسی بنا پر 'انصاری' کہلاتے ہوں۔ یہ کتاب جس میں 1958ء سے 2002ء تک کے انشایئے اور مضامین ہیں ایک جہانِ حیرت ہے۔ یا اللہ یہ آدمی تھا یا جن؟ مضامین کی بوقلمونی اور تنوع کا ایک عجائب خانہ ہے۔ صفحے اُلٹتے جایئے اور (اشفاق احمد سے استفادہ کرتے ہوئے) اس 'طلسمِ ہوش افزا' میں گم ہوتے چلے جایئے۔ کتاب کے ابتدائی تین تعارفی مضامین شکیل عادل زادہ (جن کی تحریر اور ادبی معیار کا میں 'سب رنگ' کے سبب لڑک پن سے پرستار ہوں۔)،

خالد احمد انصاری اور جون بھائی کے تحریر کردہ ہیں۔ اس کے بعد جون بھائی کی تحریریں ہیں۔ جو زمانی ترتیب یعنی Chronological Order میں ہیں۔ چوں کہ یہ سب کچھ مختلف رسائل اور ماہ ناموں میں شایع ہوتا رہا ہے اس لیے چوالیس سال پر محیط ان تمام تحریروں کو ڈھونڈ نا یقیناً کارے دارد تھا۔ کتاب کے مندرجات پر نگاہ ڈالیں تو تاریخ، فلسفہ، مذہب، سماجیات، فنونِ لطیفہ، سائنس، ادب، زبان، تعزیت، انقلاب، محبت، حال، مستقبل، حقوقِ نسواں، قومیت، اخلاقیات، سیاست، قومی اور عالمی مسائل...... غرض کیا نہیں ہے؟ حتیٰ کہ ایک مضمون عصمت فروشی کے حق میں بھی ہے اور پھر تحریر میں بھی وہ ہی شاعرانہ بے ساختگی، شوخی، طنز، تمسخر، خوش اُمیدی، یاسیت، سنجیدگی، انوکھے موضوعات، دل چسپ پیرایہِ اظہار، گہرائی اور گیرائی ہے جو اُن کی شاعری کا امتیاز ہیں، جو قاری کو باندھ لیتی ہیں۔ وہ جس مثالی معاشرے کا خواب دیکھتے تھے، اس کے قیام کے لیے اپنے قلم کو بے باکانہ استعمال کرتے رہے۔ قلم ہی ان کا درفشِ کاویانی تھا۔ کچھ تراجم بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں 'تہذیب' کے عنوان سے ایک مضمون چھے حصوں میں ہے۔ یہ طویل مضمون جون بھائی نے غالباً فیض صاحب کے اس موضوع پر کروائے گئے کسی مذاکرے کے جواب میں لکھا ہے۔ ابتدا میں جب اپنا رسالہ 'انشا' نکالا تو اس میں خواتین کے بعض بے حد حساس موضوعات پر 'ذہینہ سائیکی' کے نسوانی نام سے لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ افروز آفشید اور نشیان کے فرضی ناموں سے اپنے نظریات پھیلاتے، اعتراضات اُٹھاتے اور معاشرے کے منافقانہ وجود کو کچوکے لگاتے رہے۔ ان کی شخصیت تہ در تہ اور اُلجھی ہوئی تھی۔ وہ ماضی پرست بھی تھے، انا پرست بھی اور حسن پرست بھی۔ دیدۂ بینا بھی رکھتے تھے اور گہرا شعور بھی اور یہ چیزیں جان کو لاحق ہوں تو کوئی کیسے سکھی، خوش حال اور آرام سے رہ سکتا ہے۔ سو وہ بھی نہیں رہے۔ زندگی بھر ایک اضطراب، مایوسی اور افسردگی ان کے وجود کو چاٹتی رہی۔ وہ جس ماحول کے پروردہ تھے وہ علم دوست اور علم پرور تھا، اور جو وقت کی دھول میں کھو گیا۔ شاید وہ اسی ماحول میں خوش رہ سکتے تھے۔ شاید......!

'فرنود' میں جو کچھ ہے اس کے متعلق لکھنا مشکل کام ہے۔ اسے قاری کو خود ہی پڑھنا

چاہیے اور ٹھیر ٹھیر کر، سوچ سمجھ کر اور مزہ لے لے کر پڑھنا چاہیے۔ فرنود کے پس ورق پر جون کا ایک جملہ درج ہے۔ 'ہم ایک ہزار برس سے تاریخ کے دسترخوان پر حرام خوری کے سوا کچھ نہیں کر رہے۔' اس ایک جملے میں جون ایلیا نے پوری امت مسلمہ کا مرثیہ کہہ دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں 'مجھ سے اُردو کے حق گو شاعر سحر انصاری اور بے لوث ادیب محمد علی نے کہا کہ ایوب خان کے عہد سے ہمارے ہاں ادیبوں کا ایک ایسا گروہ فروغ پا رہا ہے جو روشن خیالی کی مبہم اصطلاح کے نام پر اپنا ضمیر بیچتا ہے۔ یہ زمانہ اس کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ کوئی نظریہ نہیں رکھتے۔ انھیں تو ہر صورت میں اقتدار کا ساتھ دینا ہے۔ اگر تم ایسی فضا میں اپنے نفس کا سچ بولنا چاہو گے تو دکھ کماؤ گے۔'

آخر میں قارئین کی نذر فرنود سے چند جملے۔

'ہماری قوم کے بڑوں نے راستی کو بھلا دیا اور جھگڑے کو اس کی حدوں سے بڑھایا ...... ہمارے ایوانوں میں دانائی ترک ہوئی اور فراست پسپا...... ایسا کیوں ہوا لوگو! کہ تم پر وہ مسلط کیے گئے جو مسلط کیے گئے؟ یاد کرو لوگو! کہ تاریخ محکوموں کے اعمال کے مطابق ہی ان کے حاکم منتخب کرتی ہے۔ سو محض اپنے سردھروں کو برامت کہو، اپنے کیے ہوئے کو اپنے ایمان کی میزان پر تولو...... تاریخ، قوموں اور گروہوں کو نہ ان کے حق سے کم کرتی ہے اور نہ زیادہ۔ جغرافیہ، ان ہی سے روٹھتا ہے جو اپنے دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں، کھیتوں، کھلیانوں، بستیوں اور بنوں، باغوں اور باغیچوں کی نگہ داری نہیں کرتے...... ہم جنھیں حساب فہمی کا عارضہ ہے، ہم کبھی اپنا حساب بھی دیں۔ اپنے نامۂ اعمال پر ایک نظر تو ڈالیں۔ تب ہی ہم اس کے اہل ٹھیریں گے کہ اپنے نادان اور عاقبت نا اندیش بڑوں سے کہہ سکیں کہ انھوں نے راستی کو بھلا دیا اور جھگڑے کو اس کی حدوں سے بڑھا دیا۔'

دیکھیے موت نے کیسا گراں مایہ شخص ہم سے چھین لیا۔ میں اپنی طرف سے خالد احمد انصاری صاحب کو اس کارنامے کی تکمیل پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ان کی محنت لائقِ صد تحسین و تشکر ہے۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

یہ حضرتِ جون کا عہد ہے!

فرنود عالم

شاعری کون سی اچھی ہوتی ہے؟ یہ وہ سوال ہے جسے کوئی زوال نہیں۔ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ بہت سے جواب اس سوال کے ہوئے ہیں۔ جس جواب پر شعر وانشا کا ضمیر مطمئن ہے وہ کچھ یوں ہے، شاعری وہ اچھی ہے جو شاعر نے اپنے لیے کہی ہو۔ اس سے مراد قطعاً یہ نہیں ہے کہ شاعر نے شعر وسخن کو اپنے عارض وگیسو سنوارنے پر مامور کر دیا ہو۔ مراد یہ ہے کہ فن کو آئینہ بنا کر دل کو اس کے روبہ رو کر دیا ہو۔ آئینے کو جھٹلانے کے بجائے اعتماد سے کہا ہو، ہر داغ ہے اس دل میں بہ جز داغِ ندامت!

ناظرین کی نظر سے خود کو دیکھنے والا فن کار اپنی ذات پر سمجھوتا کر لیتا ہے۔ سامعین کی سماعتوں سے خود کو سننے والے شاعر کو خمیازے کا خوف مار دیتا ہے۔ شفافیت اسی جذبے میں ہوتی ہے جس کا اظہار خود کلامیوں میں ہوتا ہے۔ ملمع کاری سے پاک اور فریب سازیوں سے صاف۔ محفل میں خود کلامی جگر کا زور مانگتی ہے۔ ہانپ جانے والے خود کلامی میں نہیں پڑتے۔ وہ خود فریبی جیسا ہموار رستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ خاصہ بے نیازوں کا ہے کہ آپ ہی فن کار بھی ہوں اور آپ ہی انجمن بھی۔ آپ ہی کردار ہوں اور آپ ہی بزم بھی۔ دل پہ ہاتھ رکھ کر کوئی اس شاعر کا نام بتائے جس کا کلام اس کی اپنی ذات کا محاسبہ ہو۔ وہ کلام بتائے جس کا ہر شعر خود شاعر پر دانستہ عائد ہونے والی فردِ جرم ہو۔ وہ غزل جس کا حاصلِ غزل شعر خود اپنے خلاف شاعر کی گواہی ہو۔ وہ جملہ جس کے معانی خود انشا پرداز کو سزا سناتے ہوں۔ وہ میرِ محفل جو اپنی داد تو آپ ہو ہی، اپنا ماتم بھی آپ ہو۔

وہ بے نیازی جو محفل تک میں زیرِلب کلام کرتی ہو۔ جتنے منھ ہوں اتنے جواب ہو سکتے ہیں۔ مگر مجھ ایسوں کا جواب حضرتِ جون ایلیا کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ انھی کو اس بات کا سلیقہ ہے کہ خود ہی اک در پہ دستک دیں اور خود ہی لڑکا سا وہ نکل آئیں۔ حضرتِ جون کی حیرت پڑھیے۔

داد و تحسین کا یہ شور ہے کیوں
ہم تو خود سے کلام کر رہے ہیں

آپ حضرتِ جون کی ذات کو تحلیل کر کے اوزان میں ڈھال کر دیکھ لیں، ٹھیک وہی شاعری نقش ہو جائے گی جو حضرتِ جون سے سرزد ہوئی۔ اسی شاعری کو سمیٹ کر واپس ایک مجسم پیکر میں ڈھال لیں تو حضرتِ جون اُبھر کے سامنے آ جائیں گے۔ کہے اور لکھے کا ایسا مرکب ممکن کب ہوتا ہے؟ تب کہ جب ان نفیس جذبوں اور فطری اظہاریوں سے شرمندہ نہ ہوا جائے جو قدرت نے حضرتِ انسان میں ودیعت کر دی ہیں۔ جس معاشرے میں حضرتِ جون پلے وہاں ژاژاک روسو بھی ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ وہ 'اعترافات' جیسی تصنیف کے خیال سے کنی کترا کے نکل جاتے۔ یہ حضرتِ جون ہی ہیں جو معصومیت سے پہلو میں نکے کی ایک حسینہ کی موجودگی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ جون کو یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار نہیں ہوتا کہ جو بھی خوش ہیں ہم اس سے جلتے ہیں۔ اپنی اس افتادِ طبع پر معذرت خواہ بھی نہیں ہیں کہ ہر ایک کے دل سے وہ اُترتے چلے جانے کا ہنر کر رہے ہیں۔ وہ بہ سہولت قبول کر سکتے ہیں کہ دل نے وفا کے نام پر کارِ وفا نہیں کیا۔ وہ تو اپنے دماغ کا وہ سی ٹی اسکین تک پبلک کر سکتے ہیں جس میں ایک قتالہ کبھی کروٹ بدل رہی ہوتی ہے تو کبھی کپڑے بدل رہی ہوتی ہے۔ وہ لبِ لعلیں پر ہونٹ رکھ کر بات تو تمام کرتے ہی ہیں مگر یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس میں ایسی کیا بات ہے۔ بات تو تب ہے کہ اسی آہنگ اور ترنگ میں پیالۂ ناف کو بھی سراہا جائے۔ اللہ داد قسم کی ریاستوں میں ساغر و جام سے شاعری میں تشبیہ و استعارے کا کام لیا جاتا ہے، مگر جون کا شعر عیشِ فراق میں جام سے شراب ہی پی کر دکھاتا ہے۔ جون کے نہاں خانۂ دل میں خدا قیام کرتا ہے تو وہ طور کی تجلی کا خوف کھائے بغیر اس سے کلام کرتے ہیں۔ جب خدا یقین کے خانوں سے اُتر جاتا ہے تو منارۂ سخن سے اعلان کر دیتے

ہیں کہ دل میں تو کیا وہ کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ ایسے میں حیرت ہوتی ہے جب آواز سنائی دیتی ہے کہ جون نے ہمارا لہجہ چرالیا ہے۔ ظالمو! لہجے پر ملکیت کا دعویٰ کراوٴ گے مگر خون تھوکنے کا وہ انداز کہاں سے لاوٴ گے جو حضرتِ جون سے پہلے دیکھا نہیں گیا اور حضرت جون کے بعد برتا نہیں جا سکا۔

غالب اچھے وقتوں میں شاہ کا مصاحب اور مشکل وقت میں ناصح بن جانے والے دوستوں یا منہ اُٹھا کے کعبے کی طرف چل پڑنے والوں پر اپنے انداز میں طعن ارزاں کرتے تھے۔ میر چراغوں میں روشنی نہ رہنے کی کچھ دیگر وجوہات بھی بیان کرتے تھے۔ داغ کو بیٹھنے کے واسطے جہاں جگہ ملتی وہیں مسند سجا لیتے تھے۔ عدم پری پیکر کے تھکے ہوئے جسم کی ہر سطر کو بہ غور پڑھنے کا تقاضا کرتے تھے۔ ساحر تاج محل پہ چڑھ کے ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کو آواز دیتے تھے۔ فیض ہر حلقۂ زنجیر میں زباں رکھ کر اپنی ہی دھج سے مقتل جانے والوں کو سراہتے تھے۔ ساغر اندھیرے میں چراغِ طور جلا کر مدہوشی کے عالم میں سجدے کرتے تھے۔ فراز محاصرے میں ہوتے تو بھی کتابوں میں پھول رکھ کر محبتوں کے نصاب تشکیل دیتے تھے۔ ناصر کاظمی رات کے پچھلے پہر چاند کی آنکھ میں پراسراری تنہائی کا سرمہ بھرتے تھے۔ خمار بارہ بنکوی مے خانے کے سامنے کرسی لگا کر واعظوں کو آتا جاتا دیکھتے تھے۔ مجید امجد دل رُبا کے کان میں جھولنے والی بالی پہ رشک کرتے تھے۔ نون میم راشد نگر نگر خواب بیچنے نکل جاتے تھے۔ جالب حرص کے موسموں میں بھی جو محسوس کرتے تھے وہی تحریر کرتے تھے۔ پروین شاکر ہجر تک کی پذیرائی خوش بو کی طرح کیا کرتی تھیں۔ منیر نیازی جہاں رہتے تھے اُکتائے ہوئے رہتے تھے اور جب بھی کرتے تھے دیر ہی کرتے تھے۔ ابنِ انشا چودھویں کی رات کسی کا تذکرہ سنتے تو اول چپ رہتے اور پھر ہنس دیا کرتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ حضرتِ جون کیا کرتے تھے؟ مت پوچھیے صاحب! حضرتِ جون وہ سوال کرتے تھے کہ چودہ کے چودہ طبق جل بجھ کے رہ جائیں۔ آسمان کو تکنے والوں سے جا کر پوچھ لیا کرتے تھے کہ کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا۔ قریب آنے والوں سے پوچھ لیتے تھے کہ بہت دُور جا چکے ہو کیا۔ عشق کو سراہنے والوں سے پوچھ لیتے تھے کہ آخری بار مل رہے ہو کیا۔ تپاک سے ملنے والے سے پوچھ لیتے تھے کہ مجھے یک سر بھلا چکے ہو کیا۔ جون کے

جہانِ دل کا تو سماں ہی عجب تھا۔ جانے والے کی یاد ایک وقت تک ان کے دل میں رہتی تھی اور پھر وہ یاد بھی ہوا ہو جاتی تھی۔ اپنے آپ سے انھیں خطرہ درپیش ہو جاتا اور پھر خود کو بھی شکست دے کر نکل جاتے تھے۔ سب پر سے گزر کر اپنے سامنے کھڑے ہو جاتے اور پھر خود پر سے بھی گزر جاتے تھے۔ ان کے بال تو یوں بھی بکھرے ہی ہوتے تھے مگر وقت آنے پر اور بھی بکھر جاتے تھے۔ آج حضرتِ جون نہیں ہیں تو سخن وروں کے ہاں دو چیزوں کا چلن عام ہے۔ یا تو بھلے سخن کہتے کہتے وہ جون کے بال کھینچ لیتے ہیں یا پھر جون بننے کے چکر میں وہ بال بکھیر لیتے ہیں۔ دونوں اس سچائی کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کسی کی زلفِ پریشاں کے پیچھے اس کا حاصلِ ایماں بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ حاصل ایماں یہ ہے کہ اپنے عہد کی سچائیوں کو انتہائی شکل میں حضرتِ جون نے پینٹ کر دیا ہے۔ وسعت اللہ خان کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو تصویر کا دوسرا رُخ تو سبھی دکھاتے ہیں، جون نے مگر تصویر کا تیسرا رُخ بھی دکھایا ہے۔ یہی وہ رُخ ہے جس کی بے حجابی جگر کا خون مانگتی ہے۔

شاعری وہی کمال ہے جو اپنے عہد کی ترجمان ہو۔ یہ تازہ زمانوں کی معمار ہوتی ہے۔ ایک طرف اٹھارویں صدی کے موپساں جیسے ادیب و شاعر آج فرانس سے چل کر دبے پاؤں پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں اور دوسری طرف خود پاکستان کے آج ہی کے ادیب و شاعر اپنے آج ہی میں فنا ہو رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ بھائی بات یہ ہے کہ درد کو زبان ملے تو آواز مصر کے صنم خانوں سے بھی سنائی دے جاتی ہے۔ زباں نہ ملے تو کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ وقت آیا تو منٹو کی تاب فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی جیسے عالی مرتبت بھی نہیں لا سکے تھے، آج مگر ان پر فلمیں بن رہی ہیں اور فیچر چھپ رہے ہیں۔ جب تک اس سماج کا سر کوٹھے میں اور پاؤں مزار میں ہیں تب تک منٹو زندہ رہے گا۔ گو کہ وہ جون جو دراصل فلسفے اور تاریخ کا ہفت زبان عالم ہے وہ قافیہ و ردیف میں اُلجھ کر سماج کی آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ مگر پھر بھی جب تک بات نہیں کہی جائے گی اور بات نہیں سنی جائے گی حضرتِ جون کا شعر اپنی ترجمانی میں کچھ ایسا تازہ رہے گا کہ جیسے ابھی اور اسی وقت اُترا ہو۔ وہی جملہ جون کی ذات والا صفات کو زیبا ہے جو گرو رجنیش اوشو کی لحد پر مرقوم ہے۔ جو کبھی پیدا نہیں ہوا، جو کبھی مرا نہیں!

بھائی جون

فہمیدہ ریاض

بھائی جون ایلیا کے انتقال کی خبر مجھے دوسری صبح ملی، اخباروں سے۔ سارا دن خاموشی سے گزر گیا۔ سوچتی رہی کہ تمام لوگ جا رہے ہوں گے، مگر مجھے ان کے مکان کا پتا بالکل یاد نہیں تھا، جاتی بھی تو کہاں اور کس کے پاس؟ وہ عجب شخص تھے۔ ان سے پہلی ملاقات ایک تقریب میں ہوئی۔ کیا دیکھتی ہوں ایک بالکل مہین، منحنی، گورا سا شخص بال لہراتا میری ہی طرف چلا آ رہا ہے۔ 'تم ہی ہو فہمیدہ؟ میں تم سے پہلے بہت نفرت کرتا تھا مگر اب بے حد محبت کرتا ہوں۔' یہ سن کر میں خوب ہنسی۔ ان کی شاعری کی تو گرویدہ میں ہمیشہ سے تھی لیکن ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ 'نفرت کیوں کرتے تھے؟' میں نے پوچھا۔ 'میں نے سنا تھا تم مہاجروں کو بہت بُرا بھلا کہتی ہو۔' 'وہ تو میں کہتی ہوں اور اب محبت کیوں کرنے لگے، بھائی جون؟' انھوں نے کہا 'میں نے تمھاری وہ نظم پڑھی ہے۔

دلی تری چھاؤں بڑی گہری
مری پوری کایا گھل رہی
مجھے گلے لگا کر گلی گلی
دھیرے سے کہے تو کون ہے ری'

جلاوطنی میں ہندوستان جانے سے پہلے بھی وہ میرے گھر آئے۔ بے چین، بے قرار، ٹکر ٹکر کبھی در و دیوار کو دیکھتے اور کبھی مجھے۔ انھیں میرے ارادے کا کوئی علم نہیں تھا۔ مگر جب میں ہندوستان پہنچی اور برس ڈیڑھ بعد امروہہ جانا ہوا تو کتنے ہی خاندانوں کو اپنا

منتظر پایا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ بھائی جون کا خط آیا تھا۔ واپس آنے پر جب میں نے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ حیران رہ گئے۔ ان کو ساری باتیں محو ہو چکی تھیں۔ رئیس امروہوی مرحوم کا قتل بھی ہو چکا تھا اور بھائی جون سہم کر رہ گئے تھے۔ اکثر حیران ہو کر کہتے 'تعجب ہے، میں کہاں ہوں؟ میں کون ہوں؟ اور یہ کیا مقام ہے جہاں میں ہوں؟' ان کے روشن اور بے قرار ذہن سے تمام راستے، سڑکیں اور گلیاں، سب محو ہوئے ایک مدت ہو چکی تھی۔ مشاعرہ خوب مزے میں آ کر پڑھتے۔ بال جھٹک کر اور زانو پیٹ کر شعر سناتے اور ایک سماں باندھ دیتے۔ بھائی جون کے اصلی وجود کی ایک ٹھوس حقیقت بھی تھی۔ عجیب اٹل حقیقت تھی، دھان پان سے اس وجود کی، جو اصلی، سچی اور کھری تھی۔ جس کی جڑیں بہت گہری، گویا صدیوں میں تھیں۔ بہت اَن مِٹ تہذیبی قدریں ان کے وجود میں رچی ہوئی تھیں۔ اتنی طاقت ور کہ وہ اپنے گرد و پیش کی ہر اخلاقی گراوٹ سے بلند ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی دھن میں پوری طرح مست اور مگن رہتے تھے۔ ایک طرح سے وہ گرد و پیش کو معدوم کر دیتے تھے۔ خود بین و خود شناس۔ ان کی شخصیت میں ایک انوکھی شانِ محبوبیت تھی جو صرف انھی پر پھب سکتی تھی۔ بھائی جون طیش کھاتے رہتے تھے۔ علم کی بے قدری پر، انسانی اقدار کی بے حرمتی پر، جہالت کی مکمل حکم رانی پر، ایسی تمام باتوں پر جن پر کئی عشروں سے اب کسی کو غصہ نہیں آتا۔ کسی اندرونی طاقت کے اُجالے سے وہ یوں پوری طرح زندہ تھے کہ موت کا تو خیال تک ان کے قریب نہ پھٹکتا تھا۔ ایسا تو انھوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ دے کے دورے میں ان کے سانس کی ڈوری ٹوٹے گی تو پھر نہ جڑے گی۔

ابّو

فینانہ فرنام

میں جب شعور کی منزل کو پہنچی تو میں نے سب سے پہلے ابو کی شخصیت کو کھنگالا۔
مجھے ابو بہت اُداس اور بکھرے ہوئے محسوس ہوئے۔ ابو نے جس گھر میں آنکھ کھولی، سنا ہے وہ بہت بسا بسایا گھر تھا مگر نہ جانے اس ہنستے مسکراتے ماحول کو کس کی نظر لگ گئی کہ سب کچھ اُجڑ گیا۔ جب ابو ہندوستان سے پاکستان آئے تو اماں اور بابا منوں مٹی تلے سو چکے تھے۔ ابو کی شادی ہو گئی تھی۔ رئیس تایا، تقی تایا اور چچا بچھن سب پاکستان آ چکے تھے۔

وہ گھر جس کا ہر پتّا اور ہر ذرّہ زندگی کی علامت ہوا کرتا تھا اب وہاں ہر جگہ زندگی کے بجائے موت کا سناٹا سمٹ آیا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس حویلی جیسے گھر کی دیواریں آج بھی آپس میں باتیں کرتی ہیں کیوں کہ وہاں للن انکل (اقبال مہدی) کی تصاویر ہر دیوار پر منقش ہیں۔ ابو جنھوں نے اپنا بچپن اور اپنی جوانی ان بارہ دریوں اور پھولوں سے لدے بڑے اور چھوٹے صحن میں گزاری تھی وہاں اب صرف وقت کی ستم ظریفی کے نشانات ملتے ہیں۔ میں امروہہ کے اس گھر میں کبھی نہیں گئی ہوں جہاں میرے آبا و اجداد نے کئی صدیوں سے آباد زندگی گزاری تھی مگر ابو کی ذات نے اس گھر کا ہر در ہمارے لیے کھول دیا ہے۔ ابو آج بھی جب کبھی ہمارے ساتھ کھانا کھا کر گلی میں ٹہلتے ہیں اور ان کے نتھنوں سے رات کی رانی کی خوش بو گفت گو کرتی ہے تو ابو کی آنکھیں کہیں بہت دُور کچھ تلاش کر رہی ہوتی ہیں۔ اس وقت ابو گلشن اقبال کی گلی میں نہیں بل کہ امروہہ میں اپنی حویلی کے صحن میں موجود ہوتے ہیں اس وقت ان کے چاروں طرف دھیمی دھیمی آوازیں ہوتی ہیں

جو اماں، بابا اور گھر کے دیگر مکینوں کی ہوتی ہیں اور جب ابو اُس سحر زدہ منظر سے باہر نکلتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور تلخی موجود ہوتی ہے۔ ابو جب بھی ٹہلتے ہوئے ماضی میں نکل جاتے ہیں اور اپنے گھر کے دالانوں میں چہل قدمی کرتے ہیں تو ان کے قدموں کے نیچے خشک پتے ہوتے ہیں اور ان کے نتھنے سے ٹکرانے والی خوش بو گلاب یا موتیے کی نہیں ہوتی بل کہ اس وقت اس ماحول سے ایسی خوش بو آتی ہے جیسے برسوں بعد کسی بند کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا ہو اور گندی ہوا اور صاف ہوا کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہو اور مدھم مدھم آوازیں ہوتی ہیں اماں کی، بابا کی، جو ہر طرف ابو کا پیچھا کرتی ہیں اور اس وقت جون ایلیا اٹھارہ، انیس سالہ ایک نوجوان ہوتا ہے جو اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر باتیں منوالیا کرتا تھا اور اپنے بابا کا بڑا منہ پھٹ بیٹا تھا۔ وہ گھر کیا اُجڑا، اس نے ابو کے اندر بھی اُداسیاں اور سناٹے بھر دیے۔ ابو آج بھی کھانا کھاتے ہوئے اماں کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا یاد کرتے ہیں۔ ابو کو آج بھی اماں کی دی ہوئی لوری یاد آتی ہے۔ 'ادب ادب کتے تیرے کان کاٹوں، جون کے بیاہ کے نان باٹوں۔'

یہ لوری میں نے بھی اپنے بچپن میں سنی ہے اور میرے خیال میں یہ لوری ریحانہ باجی، صالحہ باجی، حیدر بھائی، منے بھائی سب نے جاڑے کی راتوں میں لحاف میں گھس کر سنی ہوگی۔ میں نے ابو سے جب بھی یہ لوری سنی، ابو کی آواز میں آنسوؤں کو گھلا ہوا پایا۔ میں بچپن میں ابو سے کہانی سننے کی بڑی ضد کیا کرتی تھی کیوں کہ ابو کہانی بڑے مزے سے سناتے تھے اور جب امی مجھ سے پوچھا کرتی تھیں کہ تم ابو ہی سے ضد کر کے کیوں کہانی سنتی ہو تو میں کہتی تھی کہ 'ابو کی زبان بڑی میٹھی ہے۔' ابو نے مجھے 'چندن پیڑ' اور 'رکس' کی کہانی اتنی دفعہ سنائی ہے کہ میں اب تک چندن پیڑ کی پرورش اپنے اندر کرتی رہی ہوں اور رکس (راکشس) بھی مجھے ہمیشہ سے یاد ہے۔ جب بچپن میں امی یا نانی اماں مجھے لحاف میں لپیٹ کر سلاتی تھیں تو مجھے لحاف کی نہیں رکس کی بانہیں محسوس ہوتی تھیں۔

ابو واقعی ایک سچے شاعر ہیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک دفعہ ابو مجھے علیم ماموں (عبیداللہ علیم) کے ہاں چھوڑ آئے تھے۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ ابو امی سے ضد کر کے مجھے لے گئے کہ چھوڑ کر نہیں آئیں گے اور جب رات کو ایک بجے گھر پہنچے اور امی نے میرے

بارے میں پوچھا تو انھیں یاد ہی نہیں تھا کہ میں ان کے ساتھ تھی۔ امی کی جان میں جان اس وقت آئی تھی جب نگار آنٹی مجھے رات کے ڈیڑھ دو بجے لے کر واپس آئی تھیں۔ اور ایک دفعہ ابو نے مجھے خاص بندر روڈ پر چھوڑ دیا اور رکشے والے کو آواز دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے میں اس وقت صرف چار سال کی تھی۔ میں ابو کو آواز دیتی ہوئی ٹریفک کے بیچ میں پھنس گئی تھی۔ وہ تو اس روز میری زندگی تھی کہ ماموں بھی ہم لوگوں کے ساتھ تھے۔ وہ ہم سے ذرا پیچھے نانی اماں کے ساتھ تھے، انھوں نے مجھے ٹریفک کے اس ازدحام سے بچالیا تھا ورنہ آج میری کئی برسیاں منائی جاچکی ہوتیں۔

ابو کے لمبے بالوں سے میری کزن بہت ڈرا کرتی تھیں اور ابو ان کو چادر اوڑھ کر مزید ڈرایا کرتے تھے۔ ابو نے میرے پیار کے کئی نام رکھے تھے ڈوڈو، ڈاکٹر دلہن، قم قم پختون طپنچہ زن، گل جان بی بی، زرک خان وغیرہ۔ ان میں سب سے زیادہ جو نام مشہور ہوا، وہ ڈوڈو ہے۔ ابو پہلے مجھے فینی کے بجائے ڈوڈو کہا کرتے تھے۔ پورے گھر اور خاندان کے لیے میں فینی تھی مگر ابو کے لیے ڈوڈو تھی۔ اب ایک دو برس سے وہ مجھے فینی ہی کہتے ہیں اور ڈوڈو کہنا بہت کم کر دیا ہے۔

ابو نے آج تک مجھے نہیں ڈانٹا۔ انھوں نے مجھے آج تک انگلی بھی نہیں لگائی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ابو نے مجھے کبھی کیوں نہیں ڈانٹا اور کیوں نہیں مارا۔

ابو سے میں بہت بے تکلف ہوں اور دنیا کے ہر موضوع پر ان سے بحث کرتی ہوں۔ ابو کو امروہہ کے اس ماحول سے اتنی محبت ہے کہ آج تک وہاں کے مٹی کے چولھے اور وہاں کی ہنڈیا ابو کو یاد ہیں۔ ابو کو کھانا پکانے کی کچھ ترکیبیں بھی یاد ہیں مثلاً کھچڑی کی، فیرنی وغیرہ کی۔

ابو کو غرارے پہننے والی اور چوڑیاں کھنکھناتی ہوئی لڑکیاں بڑی پسند ہیں کہ یہی اس زمانے میں لڑکیوں کا پہناوا ہوتا تھا۔

کہتے ہیں ابو بے پناہ متوالے اور کھلنڈرے قسم کے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر سے سنا ہے کہ ابو نے پہلا عشق آٹھ یا نو برس کی عمر میں کیا تھا۔ اب بھی ابو اُلجھے اُلجھے اور بکھرے بکھرے سے رہتے ہیں۔ جب میں یا سحینا ہم میں سے کوئی ابو کے بال بناتا ہے

تو بڑی مشکل سے سلجھتے ہیں۔ مجھے ابو کی بتائی ہوئی یہ بات آج بھی یاد ہے کہ جب ابو کی شادی ہوئی تھی تو دادا کے حالات اتنے اچھے نہ تھے۔ اپو کا جہیز بہت شان دار نہ تھا۔ ابو کو اس بات کا بڑا ملال ہوتا تھا۔ اس وقت ابو کماتے نہیں تھے۔ سارا جہیز تقی تایا، رئیس تایا اور چچا بچھن نے بنایا تھا اور ابو نے جو، اس وقت بہت نوعمر تھے، گھر کا سارا ٹوٹا پھوٹا سامان بھی جہیز کے سامان میں شامل کر دیا کہ جہیز زیادہ معلوم ہو۔ ابو کو دنیا میں دادی اور اپو سے زیادہ شاید کسی نے نہ چاہا ہو۔ دادی کی چاہت کو ہم نے صرف سنا ہے، وہ اپو کی شادی سے پہلے ختم ہو گئی تھیں مگر اپو کی چاہت کو میں نے دیکھا بھی ہے اور محسوس بھی کیا ہے۔ وہ ابو کو بے پناہ چاہتی ہیں، رئیس تایا کے انتقال پر جب وہ پاکستان آئی تھیں تو ابو کو دیکھ کر بکھر گئی تھیں۔
ابو سے اپو صرف ڈھائی سال چھوٹی ہیں اس لیے وہ بچپن سے اب تک ابو کا نام لیتی ہیں اور ابو سے بہت بے تکلف ہیں۔ دیوانے جون کی بے پناہ چاہنے والی بہن ان سے دُور ہندوستان میں ہیں مگر یقین کیجیے، وہ اپنے بھائیوں کو اتنا چاہتی ہیں کہ روز رات کو سوتے ہوئے چاروں بھائیوں کے گھروں پر آیت الکرسی پڑھ کر اس کا حصار کھینچتی ہیں۔

میں جب چھوٹی تھی تو ابو گھوڑا بن کر مجھے اپنے اُوپر سیر کرایا کرتے تھے۔ ابو کو کھانے میں قیمہ کریلا، فیرنی، کباب، اچار، اروی گوشت وغیرہ بہت پسند ہیں۔ ابو اپنے پرانے ماحول میں آج بھی زندہ ہیں۔ ان کو وہی ہنڈیا میں پکی ہوئی کھچڑی اور چولھے سے نکلتا دھواں پسند ہے۔

بعض اوقات شام کو وہ بڑے اُداس ہو جاتے ہیں کیوں کہ امروہہ میں شام کو ہمارے ہاں بڑی محفلیں جما کرتی تھیں۔

آج بھی ابو کے اندر کچی پگ ڈنڈی ہے جس پر چل کر وہ صبح و شام امروہہ پہنچ جاتے ہیں، وہاں موجود ہر درخت ابو کی ذات میں ہرا بھرا ہے۔

ابو جو کہ شاعری کے اُفق پر روشن ستارہ ہیں، اپنی زندگی کے آسمان پر بھی وہ تنہا تنہا اور مضطرب ہیں۔ ماضی سے ناتا توڑنے کو وہ تیار نہیں ہیں۔ ماضی سے ناتا توڑنا شاید کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ ابو کے دل میں ایک ایسی تصویر بسی ہے جس میں امروہہ کے گلی کوچے، بازار، میدان، جنگل، کھیت سب کچھ آج بھی اپنی جگہ زندہ ہیں اور

اس تصویر میں ایک شفیق عورت ابو کی بلائیں لے رہی ہے۔اس باوقار عورت کے چہرے پر مایوسی اور امید کا ملا جلا تاثر ہے۔ یہ ہماری پیاری دادی ہیں۔ برابر میں ایک نوجوان لڑکی بھائی کے کاندھے سے لگی کھڑی ہے اور یاد دلا رہی ہے کہ جلد لوٹنا، اس شہر کا ہر منظر تمھارا منتظر رہے گا۔ یہ ہماری اپو ہیں، ہماری پھوپھی۔ اس طرح کی بہت سی تصویریں، یادیں اُداسیاں اور خوشیاں ابو کے اندر نقش ہیں اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آج وہ انھی میں بستے، انھی میں زندہ رہتے ہیں۔بل کہ انھی کی وجہ سے زندہ بھی ہیں۔

پچاسویں دہائی کا ایک نوجوان شاعر

قمر رضی

ایک بے حد زود رنج مگر بہت ہی مخلص دوست، ایک شفیق اور بے تکلف استاد، اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا راہ گیر، ایک مرعوب کن شریکِ بحث، ایک مغرور فلسفی، ایک فوراً رو دینے والا غم گسار، ناروا حد تک خوددار و سرکش عاشق، ہر وقت تمباکو نوشی میں مصروف رہنے والا، خلوت پسند انجمن ساز، بہت ہی ناتواں مگر ساری دنیا سے بہ یک وقت جھگڑا مول لے لینے کا خوگر، سارے زمانے کو اپنا محرم بنا لینے والا نامحرم، حد درجہ غیر ذمے دار بیمار، ایک شدید الحس نادرہ کار شاعر۔ یہ ہے وہ نوجوان اور نورس فن کار جسے جون ایلیا کہتے ہیں۔

ایک مغربی عالم نے بڑی حد تک صحیح لکھا ہے کہ حال میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کے اسباب و علل بعید ماضی میں تلاش کرو۔ یہ ایک انفرادی رائے نہیں ہے بل کہ عہدِ جدید کے مدلل فلسفہ نظریہ توارث کی بنیاد ہے۔ چناں چہ کسی بھی شخصیت کے امکانات اور ذہنی مضمرات کو سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کا جاننا بہت ضروری ہے۔ اس لیے جون کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لیے ہمیں ماضی میں جانا پڑے گا۔

جون کے والد علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا صاحب تاریخ اور مذاہب عالم کے ایک جید عالم تھے۔ اسی سال (1957ء) مرحوم کا انتقال ہوا ہے۔ پانچ ضخیم دیوان اور پینتالیس مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ دادا بھی شاعر تھے اور اسی طرح یہ سلسلہ 5 اسلاف پر منتہی ہوتا ہے۔ جون اور رئیس امروہوی اپنی چھٹی پشت میں دادِ سخن وری دے رہے ہیں۔ یہ خاندان اپنے علمی اور ادبی مذاق و مزاج کے لیے مشہور ہے۔ چناں چہ

ان صدیوں کے رچے ہوئے ادبی مزاج سے جون کے مذاقِ فن کی تشکیل و تہذیب ہوئی اور یہی سبب تھا کہ اس نو جوان شاعر نے سات آٹھ سال کی عمر میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا اور بے ضابطہ طور پر 12 سال کی عمر تک یہ سلسلہ جاری رہا تیرہ چودہ سال کی عمر میں باقاعدہ دیوان مرتب ہو گیا جو مضرابِ تخیّل کے نام سے طاقِ نسیاں کی زینت ہے۔ اسی دور کے دو شعر یاد ہیں۔

چاہ میں اس کی تمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی
وہ بھلا بالیں پہ کیوں آنے لگے
جان بچ جاتی کبھی بیمار کی

میں نے جون کی 1956ء تک کی شاعری کو تین دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ دورِ اوّل کی باقاعدہ ابتدا 1945ء سے ہوئی اور یہ دور 1947ء یا 1948ء تک جاری رہا۔ اس دور میں مشکل پسندی اور اشکال طرازی شاعر کے دماغ پر طاری ہے۔ مشکل اور غریب الفاظ کی بھرمار، عطف و اضافات کی کثرت ہر جگہ کارفرما ہے۔

تابہ کے حلِ عقودِ زلفِ اسباب و علل
تابہ کے تسلیم و ایقاں سے گریزِ ناصواب
کس قدر صبر آزما منزل میں ہیں محفل نشیں
گیسوئے رقاصۂ فطرت سے، پر پیچاک و تاب

مگر دورِ اوّل میں ایسی غزلوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جن میں برجستگی، شستگی اور سلاست کا ظہور بے حد لطیف انداز میں ہوا۔

ملاحظہ ہو۔

ان کے جانے کے بعد سے اے نیند
تو ہی کھا لے قسم جو آئی ہو

جو رہینِ خرد نہیں ہوتے
وہ بہت ہوشیار ہوتے ہیں

کتنے فسانے لکھ چکا کاتبِ دفترِ ازل
اور کتابِ زندگی آج بھی ناتمام ہے

یہ بے خودی و بے خبری بے سبب نہیں
اکثر یہ سوچتا ہوں کہ کیا سوچتا ہوں میں

میں تو اس زندگی سے رُوٹھا ہوں
آپ کیوں آرہے ہیں سمجھانے

تڑپ اُٹھوں میں کلیوں کی چٹک سے کیوں نہ گلشن میں
کہ آوازِ شکستِ شیشۂ دل یاد آتی ہے

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ شعر تیرہ چودہ سال کے لڑکے نے لکھے ہوں گے۔

دوسرا دور

یہ دور 1947ء سے 1953ء تک جاری رہتا ہے۔ 1947ء برصغیر ہند و پاک میں رہنے والوں کے لیے ایسا زمانہ نہیں تھا جس سے شعوری و لاشعوری طور پر کوئی متاثر نہ ہوا ہو اور خصوصاً ایک حساس شاعر جس نے اس دور کا مطالعہ اور مشاہدہ بھی کیا ہو۔

اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلسل اور مربوط غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں کا بھی کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جن میں اجتماعی اور عمرانی مسائل کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ فکر میں ایک تسلسل ہے حالاں کہ جون شروع میں سخت متعصب غزل گو شاعر تھا۔ اس بے محابا دعوے کے ساتھ کہ نظم نگار غیر شاعر ہوتے ہیں مگر تسلسلِ فکر اور وحدتِ خیال نے آخر نظم نگاری کی طرف مائل کر دیا۔ اب بھی اس دعوے میں ترمیم ہوئی ہے تنسیخ

نہیں۔ چناں چہ جون کی فن کارانہ کوششوں اور کاوشوں میں اس امر کی بجا آوری بھی شامل ہے کہ نظم میں غزل جیسا لوچ اور گھلاوٹ پیدا کی جائے چناں چہ اس اعزاز کو اپنی طرف منسوب بھی کیا ہے۔

جون میری آتشِ احساس نے
نظم میں سوزِ غزل پیدا کیا

احساس کی شدّت، استنباط کی طاقت اور مشاہدے کی صلاحیت ایک شاعر اور عام آدمی کے درمیان فرق پیدا کر دیتی ہے۔ کون سا ایسا شاعر اور ادیب ہوگا جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے تأثر قبول نہیں کرتا۔ چناں چہ اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات جون کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے۔ میں یہاں ایسے چند اشعار پیش کروں گا جن میں روحِ عصر پوری طرح جھلک رہی ہے۔

تمھارے آستاں کی ناصیہ سائی نے کیا بخشا
کرم ہوگا جو ہم کچھ احترامِ آستاں کر لیں

اسے مضراب کا اعجاز کہیے
نوا فریاد ہو کر رہ گئی ہے
مرے حق میں زمینِ غنچہ و گل
فلک افتاد ہو کر رہ گئی ہے

سانس تک بھی لیا نہیں جاتا
کس قدر تنگ ہے یہ پیراہن

تیسرا دور

یہ دور 1953ء سے آج تک جاری ہے۔ اس دور کی شاعری کا خاص امتیاز یہ ہے کہ شاعر نے غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کو بھی بہت شدّت سے محسوس کیا اور کہیں

کہیں غمِ دوراں کے احساس کا پلہ غمِ جاناں کے مقابلے میں بھاری پڑ جاتا ہے۔ سیاسی بے یقینی اور معاشی اضطراب اس دور کے اہم محرکات میں سے ہیں مگر شاعر ہر جگہ اپنے اخلاقی شعور کا ثبوت مہیا کرتا ہے جس کا انداز بہت مخلصانہ، غم گسارانہ اور حیات پرور ہے۔

وہ بھی ہیں جو بہ قدر ضرورت نہ پا سکے
ہم نے بہ قدر شوق نہ پایا تو کیا ہوا

اور اسی اجتماعی غم میں شاعر اپنے انفرادی غم کو بھول جاتا ہے اور اس کی تاویل بھی پیش کرتا ہے۔

ایسے بھی ہیں کہ راس نہ آئی جنھیں حیات
ہم کو شباب راس نہ آیا تو کیا ہوا

جب کہ تعمیری اور تخریبی قوتوں میں شدید پیکار جاری ہے تو وہ واضح طور پر اپنے اور اپنے ہم خیال نوجوانوں کے مؤقف کا اعلان کرتا ہے۔

اک معرکہ بہار و خزاں میں ہے آج کل
ہم سب جواں مذاق بہاروں کے ساتھ ہیں

جون کو زمانے کی حق ناشناسی کا بے حد احساس ہے۔ طرز و بیان کی رعنائی اور رنگینی کو دیکھیے اور شعر پڑھیے۔

نادیدہ راہ لوگ ہوئے محملوں پہ بار
منزل شناس لوگ قطاروں کے ساتھ ہیں

جون بالکل ہی عنفوانِ شباب میں اسلام اور اسلامیات کا سرگرم مبلغ تھا۔ اس کے بعد الحاد و لامذہبیت کا دہشت انگیز اور بغاوت کوش دور شروع ہوا مگر آج کل عناصرِ فکر میں اعتدال ہے لیکن مستقبل کے لیے کسی قسم کی پیشین گوئی قبل از وقت ہوگی چوں کہ نہیں معلوم کہ اس متلون مزاج شاعر کے احساسات اور خیالات میں آگے چل کر کتنے اور انقلابات رونما ہوں۔

گوئٹے نے لکھا ہے کہ ایک شاعر کے لیے 'نیم لامذہبیت' ضروری ہے۔ جون کی اس لامذہبیت سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ شاعر میں وسعتِ نظر اور کائناتی شہرت کی صلاحیت

پیدا ہو گئی اور وہ ایک انسان ہے اور اس وسیع کائنات کا شہری اور اس طرح اسے مذہب کا صحیح عرفان پیدا ہو گیا۔

اس شیوہ نظر کی بھلا کس سے داد لیں
گلشن بھی ہیں عزیز بیاباں بھی ہیں عزیز
یوں ہو کہ ہندو پاک کی سرحد پہ جابسیں
ہندو بھی ہیں عزیز مسلماں بھی ہیں عزیز

یہی وہ اعلیٰ زاویہ نگاہ ہے جس پر ایک انسانیت پرور شاعر کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔

جون کی زود گوئی کے متعلق کچھ نہ کہنے سے اس کی شاعری کا تصور ہی نامکمل رہ جائے گا۔ زود گوئی ایک ایسا فنی امتیاز ہے جو بہت ہی کم شاعروں کو حاصل ہوا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ زود گوئی شدّتِ احساس، بالغ النظری، وسعتِ علمی، غیر معمولی ذہانت اور قادرالکلامی کے بغیر ممکن نہیں۔ جون ایک منٹ میں تین شعر کہنے پر قدرت رکھتا ہے اور اس کی بہت سی گراں قدر نظمیں اسی رفتار سے لکھی گئی ہیں۔ ایک بار امتحاناً ایک مصرعہ دیا گیا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

جون نے ایک منٹ میں تین شعر کی رفتار سے غزل کہی۔ مجھے ایک شعر یاد ہے۔

غلط راستے پر چلی جا رہی ہے
ذرا بڑھ کے دنیا کو آواز دینا

یقیناً جون مستقبل کا ایک عظیم سرمایہ ہے جس کی امانت داری کا شرف ہمارے زمانے اور ہماری قوم کو حاصل ہوا۔

جون ایک نیا شاعر

قمر رئیس

میں جون ایلیا کی شاعری سن کر، پڑھ کر اکثر سوچا کرتا ہوں آخر وہ کہاں کھڑا ہے؟ کس بلندی کے کس زاویے سے کائنات کو دیکھ رہا ہے؟ آفاق کے کس منطقے سے اس کی آواز آرہی ہے؟ آواز جو اجنبی ہے، اُداس ہے، بہت تیکھی ہے، بہت گہری ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ جون اس مقام پر اِستادہ ہے جہاں اس کے اردگرد کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی معاصر اس کا ہم آواز نہیں۔ تخلیقی محویت اسے زمان و مکان کے ایسے نقطے پر اُٹھا لے جاتی ہے جہاں وہ انسانی تہذیب کے بکھرنے اور تاریخ کے پگھلنے کا نظارہ بہ ظاہر قلندرانہ بے نیازی سے کرتا ہے لیکن اس عمل میں اس کی روح کا لاوا اس طرح بہتا ہے کہ انا کا بکتر توڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔ اس کا اپنا وجود ہر الم ناک منظر کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس کی شاعری میں ماضی اس سے لمحہ حال کی طرح ہم کلام ہے۔ کلاسیکی شعری روایت اس کے لہجے کی تازگی میں رچی بسی لگتی ہے۔ اس میں زمینیں اور ردیفیں اس کے اندر کے اشتعال اور برہمی کے اسرار کھولتی ہیں اور اظہارِ ذات کو تخلیقی سطح پر ایک نیا آہنگ، نئی شناخت دیتی ہیں۔

ایک طرف ماضی کی سبک سیر یادیں جو اس کی اپنی تلاش اور تکمیل کا ایک حصہ ہیں دبے پاؤں اس کے اشعار میں دَر آتی ہیں تو دوسری طرف سیاسی جبر و بے داد کے خلاف احتجاج جو اس کا بشری فریضہ ہے اس کے شعروں میں تڑپ اور توانائی بھر دیتا ہے۔ وہ غمِ جہاں کا حساب ضرور کرتا ہے لیکن اسے بھی حدیثِ دل کی جھولی میں ڈال دیتا ہے کہ تازہ لہو کا رنگ اس کی تاب کم نہ ہونے دے۔

جون کی تخلیقی ذہانت نے ایک ایسا شعری اسلوب تراشا ہے جو حرف و معنی کے ارتباط اور احساس و تخیل کے اختلاط سے مالا مال ہے۔ جہاں غریب الفاظ بھی شعر کے معنوی آہنگ کا رکن بن کر جمالیاتی قدر زائی کا سبب ہوتے ہیں اور اپنے خالق کی اجتہادی کاوشوں کی شہادت دیتے ہیں۔

اب جب کہ جون نے ہم دوستوں کے پیہم اصرار پر اپنے بکھرے ہوئے پھیلے ہوئے کلام کو یک جا کیا ہے تو ہم امید کرتے ہیں کہ اس کے شکستہ وجود کی شیرازہ بندی کے دن بھی دُور نہیں ہیں۔

جون بے مثل

مبشر علی زیدی

پتا نہیں وہ کون لوگ ہوتے ہیں جنھیں پنگھوڑے میں شعر سمجھ میں آجاتے ہیں۔ میں اچھا خاصا میٹرک میں پہنچ چکا تھا لیکن شعر سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ امتحان میں پاس ہونے کے لیے اشعار کی تشریح کا رٹا لگاتا تھا۔ اتفاق سے، جیسا کہ ہر میٹرک کے طالب علم کے ساتھ ہوتا ہے، مجھے ایک کلاس فیلو سے محبت ہوگئی۔ اس کا نام نور جہاں تھا۔ میں نے کئی بار اپنا نام بدل کر جہانگیر رکھنے کے بارے میں سوچا۔ کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ میرا ایک دوست بھی اُسی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس لڑکے پر غصہ نہیں آیا بل کہ خوشی ہوئی۔ انھیں دنوں میں نے کسی کتاب میں یہ شعر پڑھا۔

دو ہی باذوق آدمی ہیں عدم
میں ہوا یا مرا رقیب ہوا

ایسا لگا کہ جیسے بند تالا اچانک کھل گیا۔ شعر میری سمجھ میں آنے لگے۔ بہت سے لوگ موزوں طبیعت ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ سخن فہم ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی شعر دل کو تبھی چھوتا ہے، جب آپ پر بھی وہی واردات گزری ہو جو شاعر پر بیت چکی ہو۔

بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو حضرت جون ایلیا کے اشعار کے ساتھ خود کو ان کی طرح ریلیٹ کرسکیں۔ اس کی وجہ یہ کہ جون صاحب عام شاعر نہیں تھے۔ ان کی طبیعت دوسروں سے مختلف تھی۔ ان کی کیفیات، ان کی حسیات دوسروں سے الگ تھیں۔ ان کے عشق، ان کی کامیابیاں اور ناکامیاں، ان کا دوسروں کے ساتھ سلوک اور دوسروں کا ان کے ساتھ برتاؤ بھی جدا تھا۔

ہمیں جون صاحب کے شعر اچھے لگتے ہیں۔ ہم ان کے انوکھے خیال اور شعریت کی وجہ سے ان کا لطف اُٹھاتے ہیں لیکن جس طرح عدم یا کسی اور شاعر کی کیفیت یا احساس میں شریک ہو جاتے ہیں، ویسے جون صاحب کے ساتھ شریک نہیں ہو پاتے۔ اتنا احساس، اس قدر رزو درنج، ایسا خودکش، اس انتہا کا کڑوا ہونا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ نثر میں منٹو اور شاعری میں جون ایلیا ایک طرح کے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جون صاحب کی نثر ان کی شاعری سے کم تر تھی۔ ہرگز نہیں۔ ان کی نثر مجھے اتنی ہی پسند ہے، جتنی ان کی شاعری۔ لیکن جون صاحب کی نثر، کم از کم وہ نثر جو انھوں نے انشائیہ کے عنوان سے سسپنس ڈائجسٹ کے لیے لکھی، شاعری جیسی ہی تھی۔ منٹو کی نثر، خاص طور پر مضامین اور خاکوں والی نثر ایسی ہے جیسے وہ اس نے قلم سے نہیں، استرے سے لکھی ہو۔ فرشتوں کو گنجا کرنے کے لیے استرا ہی درکار ہوتا ہے۔ ہمارے گیسو دراز جون صاحب کے پاس اسی استرے کا جڑواں ہوگا۔ وہ بھی اپنوں پرایوں کا مونڈن کرتے تھے لیکن چوں کہ منٹو کے مقابلے میں وضع دار آدمی تھے، اس لیے واقف کاروں کا نثر کے بجائے شاعری میں تمسخر اُڑاتے تھے۔

جون صاحب خود تو دھان پان سے تھے لیکن ان کی کمان کا تیر بہت دُور تک جاتا تھا۔ وہ دنیا سے پردہ کر چکے ہیں لیکن ان کے ناوک آج تک بہت سوں کے سینے میں چبھے ہوئے ہیں۔ محبوب، دوست، رقیب، شعرا، حاکم، علما حد یہ کہ انھوں نے خدا تک کو نہیں بخشا۔ ایسے ایسے زہر میں بجھے ہوئے طنز کیے ہیں کہ کوئی مسجد میں تڑپ رہا ہے اور کوئی مقبرے میں۔

جون صاحب نے سچ مچ خدا کا خوب مذاق اُڑایا ہے۔ اگر روزِ قیامت واقعی کوئی عربی داں، موٹی توند والا، دڑھیل اور غصیلا خدا نکل آیا تو پھر جون صاحب کی خیر نہیں لیکن اگر وہ کوئی متحمل مزاج، بذلہ سنج، قدر دان اور سخن فہم خدا ہوا تو اب تک ان کی قبر کو روشن موتیوں سے بھر چکا ہوگا۔ ایسے لطیف طنز پر کون داد نہیں دے گا۔

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

بود تو اک تکان ہے سو خدا
تیری بھی کیا تکان میں گزری

دہر آشوب ہے سوالوں کا
اور خدا لاجواب ہے، سو ہے

لیکن پھر جون صاحب کو طیش آیا تو انھوں نے خدا کی ذات ہی کو مسترد کر ڈالا اور خدا پرستوں کا منھ چڑایا۔

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تُو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

ہے خدا ہی پہ منحصر ہر بات
اور آفت یہ ہے خدا ہی نہیں

جون صاحب کو مذہب پرستوں سے خاص شکایتیں تھیں اور انھوں نے نثر میں بھی ان کی کافی 'عزت افزائی' کی ہے لیکن شاعری میں تو دشنام طرازی پر اُتر آئے۔

رکھو دیر و حرم کو اب مقفل
کئی پاگل یہاں سے بھاگ نکلے

نسبتِ علم ہے بہت حاکمِ وقت کو عزیز
اس نے تو کارِ جہل بھی بے علما نہیں کیا

ہم نے اس شہرِ دین و دولت میں
مسخروں کو جناب ہی لکھا

اس جناب کو رواروی میں نہ دیکھیے۔ جون صاحب بتا چکے ہیں کہ کسی زمانے میں مجتہد کو جناب کہا جاتا تھا۔

محبوبہ کے حسن کی تعریف اور عشق کے دعوے کون نہیں کرتا۔ اکثر شعرا مبالغے کی

انتہا پر چلے جاتے ہیں۔ کم ہی شاعر ہیں جنھوں نے اپنے محبوب پر جملے بازی کی ہے۔ غالب نے ضرور کہیں کہیں اپنے محبوب کا مذاق اُڑایا ہے لیکن جون صاحب تو باقاعدہ ذلیل کرنے پر اُتر آتے ہیں۔

جل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ
مجھ کو یک سر بھلا چکی ہو کیا

نہ کرو بحث ہار جاؤ گی
حسن اتنی بڑی دلیل نہیں

تم اپنی کج کلاہی ہار بیٹھیں
بدن کو بے لبادہ کرلیا کیا

تُو ہے پہلو میں پھر تری خوش بو
ہو کے باسی کہاں سے آتی ہے

پہلو میں ہے جو میرے کہیں اور ہے وہ شخص
یعنی وفائے عہد کا بستر بھی کچھ نہیں

اور

کاسہ گداگری کا ہے ناف پیالہ یار کا
بھوک ہے وہ بدن تمام وصل تمام رنج ہے

اُردو شاعری ناصح کی شکایتوں سے بھری پڑی ہے لیکن جون صاحب نے ناصح کو جس طرح خوار کیا ہے، اس کا جواب نہیں۔

ٹھیک ہے خود کو ہم بدلتے ہیں
شکریہ مشورت کا چلتے ہیں

جہل واعظ کا اُس کو راس آئے
صاحبو! میری آگہی ہے شراب

مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا

اگر آپ کسی سے واقف نہ ہوں تو اس کا مذاق نہیں اُڑا سکتے۔ اُڑا تو سکتے ہیں لیکن بات نہیں بنتی۔ جس قدر واقفیت ہوگی، جتنی زیادہ جان کاری ہوگی، اتنا زور کا وار ہوگا۔ لیکن جون صاحب نے اجنبیوں کا بھی مضحکہ اُڑایا ہے۔

اِک شخص کر رہا ہے ابھی تک وفا کا ذکر
کاش اس زباں دراز کا منہ نوچ لے کوئی

اپنا شہر، اپنی بستی جون صاحب سے کیسے بچتی۔ انھوں نے اسے بھی نشانہ بنایا۔

یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

برہنہ ہیں سرِ بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم

اچھا طنز نگار وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتا اور جون صاحب تو خود سے بہت خفا تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنی ذات پر بڑھ چڑھ کر حملے کیے۔

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اسے خفا کیجے

کیا تکلف کریں یہ کہنے میں
جو بھی خوش ہے ہم اس سے جلتے ہیں

اک ہنر ہے جو کر گیا ہوں میں
سب کے دل سے اُتر گیا ہوں میں

علاج یہ ہے کہ مجبور کر دیا جاؤں
وگرنہ یوں تو کسی کی نہیں سنی میں نے

شاعر ہیں آپ یعنی کہ سستے لطیفہ گو
رشتوں کو دل سے روئیے، سب کو ہنسائیے

میں ان اشعار کو پڑھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ انھیں انکسار قرار نہیں دیا جاسکتا، انھیں خود شناسی بھی قرار دینا مناسب نہیں۔ انھیں کوئی شخص اپنے دل کا حال بھی نہیں کہہ سکتا۔ تو پھر یہ کیا ہے، اسے کیا کہا جائے۔

جون صاحب آخری عمر میں کافی تنہا ہو گئے تھے۔ کراچی کے حالات اچھے نہیں تھے۔ ان کا مشاعروں میں جانا بند ہوا۔ محفلیں چھوٹ گئیں، بیوی بچے روٹھ گئے، بہن بھائیوں سے قطع تعلق ہو گیا۔ چند دوست تھے جو ان کی خبر گیری کرتے تھے۔ وہ جون صاحب کے طنز سے کیسے بچ پاتے؟ حرفِ آخر اُن کے اعزاز میں کہا۔

کچھ تو رشتہ ہے تم سے کم بختو
کچھ نہیں کوئی بد دعا بھیجو

ہم کو یاروں نے یاد بھی نہ رکھا
جون یاروں کے یار تھے ہم تو

اور

میں اب ہر شخص سے اُکتا چکا ہوں
فقط کچھ دوست ہیں اور دوست بھی کیا

سادہ و پرکار

مجروح سلطان پوری

جون ایلیا کا طرزِ سخن سلیس، نازک اور اس درجے سادہ و پرکار ہے کہ اس سہلِ ممتنع کی نثر کریں تو تاثر و تہ داری دونوں غارت ہو جائیں۔ ہندو پاک کے حصارِ شعر میں یہ وہ منفرد اسلوب ہے جو عہد تا عہد کسی کسی کو ودیعت ہوتا ہے۔ اس کا رنگ پختگی کے باوجود چھونے والے سے احتیاط کا متقاضی ہے۔ خواہ مخواہ جی دھڑکنے لگتا ہے کہ تجزیہ کرتے وقت کہیں رنگ نہ چھوٹ جائے۔ نظم میں مگر بیش از بیش غزل میں ان کی شاعری کا چہرہ بہ ظاہر ایک عاشق کا سا ہے مگر تامل سے دیکھیں تو زندگی کا ہر غم، غمِ جاناں کی ردا اوڑھے ہوئے ملے گا۔ نظریاتی طور پر یہ اسی کارواں کے ہم سفروں میں ہیں جسے ترقی پسندوں کا وہ گروہ کہا جاتا ہے جس کی نوا منبر سے دَر تک، زنداں سے چمن تک ایک ہے۔ جمالیات کا وہ پہلو جسے جسمانیت یا 'بدنیت' کہیے ہماری اُردو غزل میں کم کم ملے گا۔ ترقی پسندوں نے اور یقیناً انھی کی ہم نوائی کرتے ہوئے فراق گورکھپوری جیسے شعرا کے ہاں حسن کا خارجی و جسمانی تصور آزادی کے ساتھ نظم کی طرح غزل میں بھی دَر آیا ہے جس کی مثالیں جون ایلیا کے یہاں بھی آسانی سے دیکھی جاتی ہیں۔ غرض جون ایلیا اس ہشت پہلو نگینے کا نام ہے جس میں زندگی کا ہر وہ جان دار رنگ پھوٹتا نظر آئے گا جس کی ضرورت ایک زندہ معاشرے کو دانش و جمال کی نسبت سے ہے۔

ساٹھ دن جون ایلیا کے ساتھ

محسن بھوپالی

جون ایلیا سے میرا پہلا تعارف 1957ء کے لگ بھگ رئیس امروہوی کے یہاں ہوا تھا۔ اس کے بعد مختلف محفلوں اور مشاعروں میں اکثر و بیش تر ملاقاتوں کا سلسلہ رہا، جو اَب بھی جاری ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ دوست کی پہچان سفر میں ہوتی ہے تو قارئینِ کرام! قدرت نے ہمیں یہ موقع امریکا اور کینیڈا میں 1990ء میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں عطا کیا تھا۔ سفر اور حضر میں بھائی جون کا اور میرا تقریباً ساٹھ دن کا ساتھ رہا۔ جس کی تفصیل بہ شمول دیگر واقعات اور تفصیلات میرے سفر نامے 'حیرتوں کی سرزمیں' میں درج ہے میں نے مناسب جانا کہ اس سفر میں جہاں بھائی جون کا ذکر آیا ہے اسے یک جا کر دیا جائے۔

سفر نامے کے مندرجہ ذیل اقتباسات ممکن ہے بہ ظاہر بے ربط لگیں لیکن ان میں ادا کیے جون کے فقروں اور جملوں میں سادگی، معصومیت اور ذہانت کی ایسی جھلکیاں ضرور نظر آئیں گی جن سے ان کے معمولات اور جذبات و احساسات سے آپ کو آگاہی حاصل ہوگی۔ (م۔ب)

بھائی جون اور ہم جب دوسرے دن امریکی قونصل خانے گئے تو معلوم ہوا کہ 29 ستمبر کو ویزا کی درخواستیں آخری بار وصول کر کے 27 دسمبر تک کے ٹوکن جاری کیے جا چکے ہیں۔ یہ خبرِ دل پذیر نروس کر دینے کے لیے کافی تھی لیکن خیال آیا ہم تو شاعر ہیں، گرین کارڈ کے چکر میں نہیں بل کہ مشاعرے کے سلسلے میں جا رہے ہیں تو کیوں نہ کلچرل اتاشی سے مدد لی جائے، کلچرل اتاشی کا خیال آتے ہی برادرِ عزیز ممتاز سعید کا نام نامی یاد آیا۔ گاڑی کو 'ایڑ' لگائی اور چند لمحوں میں ہم کلفٹن کے پل کے اس طرف نیشنل بینک کے

تربیتی انسٹیٹیوٹ کے احاطے میں تھے۔ ممتاز سعید نے (جو اکثر ایسے گمبھیر معاملات میں کہا کرتے ہیں 'بھائی محسن کوئی مسئلہ نہیں ہے'۔ جب ہماری رُوداد سن کر انھوں نے خالص امریکی انداز میں کہا 'نو پرابلم' تو ہمیں اسی وقت یقین آ گیا کہ یہ امریکی کلچرل اتاشی سے کام لے لیں گے، اسی وقت فون ملوایا اور چند مکالموں کے لین دین کے بعد فون رکھتے ہوئے کہا...... 'بھائی کام ہو گیا'۔

اب میں بھائی جون کو بھی (واضح رہے کہ ان کے ماموں ہیں) بتا دوں کہ وہ کاغذات تیار کر کے کل آ جائیں اور دونوں حضرات کلچرل اتاشی سے کل ایک بجے مل لیں۔

دوسرے دن جون نے وقتِ مقررہ پر پہنچ کر حیرت زدہ کر دیا، چھوٹتے ہی انھوں نے کہا کہ 'تمھیں اس کام کے سلسلے میں ثمن کا خیال کیسے آیا (یہ ممتاز سعید کا گھریلو نام ہے) جب کہ یہ نام میرے ذہن میں آنا چاہیے تھا'۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوگ متعلقہ افسر سے اپنے دوست خواجہ بدر الحسن صاحب ڈائریکٹر لائبریری کی رہ نمائی میں ملے۔ انھوں نے رسماً کچھ باتیں کیں اور دوسرے دن آنے کے لیے کہا۔

دوسرے دن سب سے پہلے تو ہم نے جون کو ٹھیک وقت پر پہنچنے پر بغیر فارسی کے مصرعے کا سہارا لیتے ہوئے داد دی، پھر ویزا افسر کی کھڑکی کے سامنے کی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ ہم دونوں آپس میں وقت گزاری کے لیے نہ جانے کس موضوع پر بات کر رہے تھے یا شاید کوئی موضوع ہی نہیں تھا کہ ایک لڑکی نے کہا، 'آپ لوگ شاعر ہیں؟ معاف کیجیے آپ کو پہلے دیکھ چکی ہوں'، نام بتانے پر اسے نام یاد آ گئے، پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بھی ویزا لینے آئی ہے، انتیس کو نیویارک جانا ہے۔ جب اس نے بتایا کہ وہ کرکٹ کے کھلاڑی اور کالم نگار منیر حسین کی بیٹی ہے تو بھائی جون نے بے ساختہ کہا۔ 'بھئی تم تو ہماری بھتیجی ہو'۔ ہم نے موقع غنیمت جانتے ہوئے فوراً اپنی پہچان جتانے کے لیے کہا۔ 'منیر بھائی جب ملتے ہیں، پتا لے لیتے ہیں لیکن پرچہ نہیں بھیجتے'۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ کاؤنٹر پر پہلے جون کو بلایا پھر ہمیں۔ تھوڑی دیر بعد پاسپورٹ ہمارے ہاتھ میں تھے۔ ویزا کی مہر پڑھ کر دونوں کو حیرت ہوئی۔ وزٹ (Visit) کے خانے میں ہم دونوں نے صرف ایک (Once) لکھا تھا لیکن ہم دونوں کو ملٹی پل ویزا دیا گیا تھا۔

لاؤنج میں سکون تھا، کوئی خاص چہل پہل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم تینوں میں سے جون نے سکوت توڑا،'یارو! آج قومی اسمبلی کا الیکشن ہے اور ہمیں جانا پڑ رہا ہے۔'ہم نے پوچھا۔
'پچھلی مرتبہ ووٹ ڈالا تھا؟'

'کوئی لے جانے والا ملا نہیں۔' اس سادگی پر ہنسی تو آئی لیکن بات کا رُخ بدلتے ہوئے ہم نے کہا، بھائی پروگرام ہی ایسا بنایا ہے، امریکا والوں نے 27 اکتوبر کو مشاعرہ رکھا ہے۔ وہ رسک لینا نہیں چاہتے تھے اس لیے وہیں سے ریزرویشن وغیرہ کروانے کے بعد ٹکٹ بھیجے تھے۔ حمایت اپنے تجربے کی روشنی میں بتانے لگے کہ بعض ٹکٹ گروپ کے نام پر خریدے جاتے ہیں، اس میں شرط ہوتی ہے کہ ریزرویشن کی تاریخ نہیں بدلی جائے گی اور نہ نام، ورنہ رعایت واپس لے لی جائے گی۔ جون نے لاؤنج کے ایک گوشے میں ذرا بلندی پر نظریں جما کر نہایت سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔
'یار محسن سفر کا ابھی آغاز ہے اور کم از کم دو مہینے ساتھ رہنا ہے۔ اس لیے ابھی سے وفد کا سربراہ منتخب کر لینا چاہیے۔' میں نے کہا 'حمایت بھائی سے بہتر کون سربراہ ہوسکتا ہے۔' جون نے فوراً تائید کی اور حمایت بھائی صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

....

اُس وقت ہماری گھڑی کے مطابق پاکستان میں رات کے دو بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔ برابر کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بھائی جون نے آنکھوں پر دونوں ہاتھوں کا چھجا بناتے ہوئے دو تین بار آنکھیں کھولنے اور بند کرنے کا عمل دہرایا اور پھر نہایت بے پروائی سے پوچھا 'یار محسن اب کتنا سفر باقی ہے؟ گویا نیویارک ......؟ ان شاء اللہ کب ......!'
(جون کو جاننے والے جانتے ہیں کہ گفت گو میں اکثر پورا جملہ ادا نہیں کرتے بل کہ اس کے خاص الفاظ ہی پر اکتفا کرتے ہیں بقیہ کام وہ گردن کی جنبش سے لیتے ہیں۔)

....

امیگریشن سے با آسانی گزرنے کے بعد کسٹم کا سامنا تھا۔ کسٹم آفیسر نے اشارہ کرتے ہوئے سامان کے بارے میں پوچھا، ہم نے ایک فقرہ ادا کیا

'No Food, No Fruit?' اُس نے پھر سوال داغ دیا 'Books and Clothing Please' ہم نے ترت جواب دیا 'No Please' اب جون کی باری تھی۔ ان سے بھی کسٹم آفیسر نے یہی دوسوال کیے اور بھائی جون نے ترتیب سے وہی جواب دیے جو ہم دے چکے تھے بل کہ انھوں نے اپنے دونوں طرف ہاتھ کر کے مزید کہا۔ '!We are poets' اس پر کسٹم آفیسر نے مسکرا کر ہم تینوں کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ یار لوگوں سے سن رکھا تھا کہ پاکستان سے آنے والوں کو امریکا میں کسٹم والے بہت پریشان کرتے ہیں۔ سوٹ کیس پھاڑ دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس بھلے مانس نے سوٹ کیس کھولنے تک کے لیے نہیں کہا جب کہ خود ہمارے ملک میں یہ رسم تو پوری کرنا ہی ہوتی ہے۔

....

ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کا شمار ہر چند کہ اب دُنیا کی تیسری یا چوتھی بلند ترین عمارتوں میں ہوتا ہے لیکن اس کا شکوہ بل کہ نئی نسل کی زبان میں گریجر اور ہی کچھ ہے۔ پہلے فاصلے پر کھڑے رہ کر اس بلند و بالا عمارت کو دیکھا۔ دل نے کہا یہی وہ عمارت ہے جسے معلوماتِ عامہ کے ایک سوال کے طور پر پڑھنے کے بعد دیکھنے کی اُمنگ پیدا ہوئی تھی کہ کیسی ہوگی، بلندی پر پہنچنے کے بعد چاروں طرف کا منظر کیسا نظر آتا ہوگا؟ قریب سے دیکھتے ہوئے جون بولے اس علاقے کی تو ساری ہی عمارتیں اتنی بلند ہیں کہ کھڑے رہ کر تو دیکھا نہیں جا سکتا۔ پھر کہنے لگے پچھلے سال اقبال مہدی نے نیویارک سے واپس آ کر بتایا تھا کہ بھائی وہاں کی عمارتوں کو لیٹ کر ہی پورا دیکھا جا سکتا ہے۔

لوٹتے ہوئے باتھ روم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یاسین نے بتایا کہ یہاں اسے ریسٹ روم کہتے ہیں۔ تھوڑی دور پر گیس اسٹیشن (پٹرول پمپ) ہے، وہاں انتظام ہے۔ ریسٹ روم کی طرف میں اور جون بڑھے ہی تھے کہ گیس اسٹیشن کے لڑکے نے جون کو مخاطب کر کے کہا 'Ladies other side please' (خواتین کے لیے دوسری جانب انتظام ہے) اس ہدایت کا ہمارے علاوہ جون نے خود بھی لطف لیا۔ غالباً جون کے کلین شیو اور لمبے بالوں سے اسے دھوکا ہوا۔ دوسرا سبب اس وقت دریافت ہوا جب ایک جگہ اور اس غلط فہمی کا اعادہ ہوا تھا۔ اس دفعہ یاسین اور حمایت نے جون کے اوور کوٹ کا معائنہ کر کے فیصلہ دیا تھا کہ یہ

لیڈیز کوٹ ہے۔

باتوں باتوں میں Chain ذکر بھی آ گیا۔ یاسین نے بتایا کہ کل شام شکاگو سے نقی اختر صاحب کا فون آیا تھا، وہ سولہ نومبر کو مشاعرہ رکھ رہے ہیں اور وہاں سے نیویارک بیس تاریخ کو واپسی ہوگی۔ جون نے کہا' تو یوں کہو یاسین میاں کہ ہماری چین بیسویں نومبر کو ختم ہو جائے گی اور ہم آزاد ہو جائیں گے! مگر ہم تو گویا اور رہنا چاہتے ہیں، یہی کوئی مہینے دو مہینے۔ بھائی محسن کیوں نہ ایک بینجو خرید لیں اور ہم سب مل کر ایک منڈلی بنالیں۔' نسیم سیّد نے سہارا دیا۔' ہاں! یہ ممکن ہے۔ یہاں کے مختلف شہروں میں ایسے گروپ گھومتے رہتے ہیں گروپ کا کوئی نام ہونا چاہیے!' جون بولے مثلاً' کھسکے ہوئے لوگ' ہم نے فوراً تائید کی بہت اچھا نام رہے گا، اس کا مخفف بھی اچھا بنے گا۔ کے ایچ ایل (K.H.L) بروزن ڈی ایچ ایل! یاسین کے عزیز نے یاد دلایا گروپ تو بنتا رہے گا۔ آج کا دن کیوں برباد کر رہے ہیں۔ نیوجرسی چلیں وہاں سے مین ہٹن کا علاقہ قابلِ دید ہے بل کہ قابلِ کشید بھی۔ وہاں بہت عمدہ فوٹوگرافی کی جاسکتی ہے۔ جون بولے' یعنی عقب میں ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ آنا چاہیے' ہم نے کہا' تاکہ ہم لوگ ثابت کرسکیں ہم لوگ بہ نفسِ نفیس نیویارک میں موجود تھے۔'

تقریباً تین گھنٹے کے سیر سپاٹے اور فوٹوگرافی کے سیشن کے بعد تھک کر چور ہو چکے تھے۔ جیسے ہی اپارٹمنٹ میں پہنچے بستروں پر ڈھیر ہو گئے۔ جون نے کروٹ لیتے ہوئے کہا کسی استاد نے شاید اسی موقع کے لیے کہا تھا۔

پڑی رہنے دو دیوانوں کی لاشیں

ہم نے فوراً دوسرا مصرع پہنچایا۔

کبھی اُٹھی ہیں پروانوں کی لاشیں

بھائی جون نے بستر سے تقریباً اُچھلتے ہوئے کہا' بھئی کمال ہو گیا، کیا برابر کا مصرع دیا ہے۔'

ڈنر کے بعد رفیع خان ایک ریسٹورنٹ نما کلب میں کافی پلانے کا کہہ کر لے گئے۔ خواتین و حضرات کولڈ ڈرنک اور ہاٹ ڈرنک کے شغل میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر میں ہال کی روشنیاں مدھم ہو گئیں اور اسٹیج کی روشنیاں اور زیادہ تیز...... ہمیں جوانی کے زمانے

کی دیکھی ہوئی ہالی وڈ کی بعض فلموں کے مناظر یاد آ گئے۔ تین چار رقص کے بعد بھائی جون نے نہایت سادگی سے اپنی رائے دی'یار یک سانی بہت ہے!' اس ریمارک کا ہم سب نے لطف لیا۔ باہر آتے ہوئے رفیع خان صاحب نے کہا کہ مغرب کی اس زندگی کی جھلک بھی ضروری تھی۔ راستے میں حمایت صاحب نے خمار بارہ بنکوی کے حوالے سے بتایا کہ پچھلی دفعہ ان سے کسی نے امریکا کے بارے میں پوچھا کہ آپ کو کیسا لگا۔ تو انھوں نے ایک جملے میں اپنی رائے یوں دی تھی'میں بہت صحیح جگہ پر بہت غلط وقت میں آیا ہوں!'

ان کے ہاں ایک اور تہوار منایا جاتا ہے Halloween۔ اس مخصوص رات کو یہ لوگ طرح طرح کے میک اپ سے اپنی شکلیں بدل لیتے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ اس رات جو خاندان کے مردہ افراد ہیں ان کی روحیں Visit کرنے آتی ہیں۔ انھیں ڈرانے اور دُور رکھنے کے لیے یہ لوگ شکلیں بدل لیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح وہ روحیں انھیں پہچان نہیں سکیں گی۔ جون بولے! یہ لوگ شکلیں کیوں بدل لیتے ہیں یار وہ تو ملنے آتی ہیں۔ اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ عروج نے فوراً جواب دیا ہاں کوئی امریکی ہی شاید جواب دے سکے۔

نذر جب ہماری تصویر بنا رہے تھے تو غیر ملکی طالبات نے بھی دل چسپی کا اظہار کیا۔ انھیں گروپ فوٹو میں شامل ہونے کی دعوت دی'Oh! Thank You' کہہ کر شامل ہو گئیں۔ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ ہالینڈ کی رہنے والی ہیں اور ساوتھ ایسٹ اوکلوہاما یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں۔ یونی ورسٹی کا نام سن کر حمایت نے کہا میرے بیٹے کا بھی اسی یونی ورسٹی کا 20-1 آیا ہے۔ وہ بھی ایک دو ماہ بعد پاکستان سے آنے والا ہے۔ 'Oh!Most Welcome' کہہ کر ان دونوں نے خوشی کا اظہار کیا اور ایک سمت کو مڑ گئیں۔ اسی منزل پر جہاں ہم سیر کر رہے تھے درمیان میں مربع نما کمروں میں باقاعدہ ریڈیو اور وائرلیس اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں جن سے ٹریفک کا نظام کنٹرول کرنے کے ساتھ ساتھ پولیس کی انتظامی ضروریات کے مطابق ہدایات بھی نشر کی جاتی ہیں۔ بعد میں جب ہم لفٹ سے اُتر رہے تھے تو بھائی جون نے کہا'یار اُن طالبات سے نام اور پتا تو پوچھا ہی نہیں۔' ہم نے کہا'واقعی! مگر سیاحوں کے کیا نام اور کیا پتے!' نذر بولے.....'ایک طریقہ

ہے۔ گروپ میں تصویر موجود ہے اس کے ذریعے یونی ورسٹی میں دوبارہ ملاقات ہوسکتی ہے!"
اس تقریباً ناممکن تجویز پر ہم سب ہنس پڑے!۔

....

جب ہماری باری آئی تو یہاں بھی ہمیں چند قطعات اور دو غزلیں سنانے کے بعد حمایت صاحب نے سہارا دیا اور اپنے مخصوص تحت اللفظ کے انداز میں یکے بعد دیگرے ہماری دو نظمیں سنائیں۔ حاضرین نے توقع سے زیادہ پذیرائی کی اور کھڑے ہوکر دیر تک تالیاں بجاتے رہے...... ! جون ایلیا کو جب بلایا گیا تو انھوں نے مائیک پر آکر ایک ایسا انکشاف کیا جسے سبھی ادیبوں اور شاعروں نے سراہا...... ہوا یوں کہ ہال میں ممتاز و معروف افسانہ نویس و ناول نگار رضیہ فصیح احمد بھی موجود تھیں۔ وہ ہم سب سے مل چکی تھیں اور اس وقت اگلی صف میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جون نے اپنا کلام سنانے سے پہلے مختصر سی تقریر کی اور حاضرین کو بتایا کہ آج کی اس شعری محفل میں اُردو ادب کی اہم ناول نگار اور ممتاز افسانہ نگار رضیہ فصیح احمد بھی موجود ہیں۔ آپ لوگ ان کا استقبال کیجیے۔ وہ یہ اعلان سن کر اپنی نشست پر کھڑی ہوئیں تو حاضرین نے تالیاں بجا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ دوسرے ہی لمحے جون ایلیا نے انھیں مائیک پر بلایا۔ رضیہ فصیح احمد نے اظہارِ تشکر کے بعد کہا کہ ہر چند کہ یہ موقع نہیں تھا لیکن جون بھائی اور آپ حضرات و خواتین کی ممنون ہوں کہ مجھے یہ خوش گوار فرض ادا کرنے کا موقع دیا۔

....

جہاں ہم لوگ کھڑے تھے اس سے ذرا فاصلے پر ہپیوں کا گروپ بھی کھڑا تھا۔ حالاں کہ ہمیں اس ملک میں ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا لیکن ہپی پہلی مرتبہ نظر آئے۔ جب حیرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کیا تو نقی اختر نے بتایا بھائی یہ ہر شہر میں موجود ہیں بس ان کے ٹھکانے ذرا مختلف ہیں۔ ایک صاحبہ نے اپنی اچھی خاصی پینٹ کو بلیڈ سے کاٹ کر مدکی شکل کے کھانچے بنائے تھے۔ اس عجیب و غریب فیشن کے مظاہرے کو تقریباً سبھی نے ایک بار دیکھا۔ بھائی جون کو اس کی جانب متوجہ دیکھ کر حمایت صاحب نے کہا 'آؤ جون میں تمھیں قریب سے دکھالاؤں۔' ہم نے فوراً فقرہ لگایا 'میں تو آنکھیں

بند کیے رہوں گا!' بھائی جون نے واپس آ کر بتایا کہ انھوں نے اس خاتون سے کہا 'You are Beautiful' تو اس خاتون نے جواباً کہا 'Thank You'۔

....

ہمارے قیام کی جگہ یعنی ہالیڈے اِن آ چکی تھی۔ کمرا خاصا کشادہ تھا۔ ڈبل بیڈ کے علاوہ بھی خاصی جگہ تھی۔ جون بولے میں اس کمرے میں رہوں گا۔ مرزا صاحب نے ایک اور بیڈ کا کہا لیکن جون نے منع کرتے ہوئے کہا میری عادت فرش پر سونے کی ہے۔ پلنگ پر تو قطعی نیند نہیں آتی۔

....

تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہماری گاڑی بیچ کے برابر برابر کشادہ سڑک کی Slow lane میں خراماں خراماں چلی جارہی تھی۔ بائیں جانب خوب صورت مکانات اور ملٹی اسٹوری اپارٹمنٹ کی قطار تھی اور دائیں طرف میامی کا بیچ Fort Lauderdale۔ اقبال ناظر بتارہے تھے میامی کے بیچ کی تفریح گاہ کا یہ سلسلہ اسی طرح سیکڑوں میل تک چلا گیا ہے۔ اس کے مختلف نام ہیں۔ میامی بیچ، لانگ بیچ، فورٹ بیچ، ڈیل بیچ وغیرہ اور اس وقت ہم اسی لارڈرڈیل بیچ پر ہیں۔ کنارے کنارے تاحدِ نظر منظر نہیں بل کہ مناظر ہی مناظر، سیکڑوں مرد اور عورتیں اور پکنک پر آئے ہوئے مختلف گروپ۔ یہ سب تکنیکی بل کہ مکینکل پروسیس میں ڈھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بھائی جون نے ایک بار پھر مانٹریال والا جملہ دہرایا۔ 'یارو! یک سانی بہت ہے......'

....

عمارت کے تفصیلی معائنے کے بعد ہم لوگ باغ کی کھلی فضا میں آ چکے تھے، یہاں کچھ تصویریں بنوائیں۔ اسی دوران ایک نئی دلہن اپنی والدہ اور کیمرا مین کے ساتھ آئی۔ سفید براق گاؤن، دلہن کا سفید روایتی ہیٹ اور ایک ہاتھ میں نہایت خوب صورت گل دستہ۔ باغ کے مختلف گوشوں اور محرابوں میں مختلف پوز کے ساتھ اس نے وڈیو بھی بنوائی اور تصویریں بھی کھینچوائیں۔ بھائی جون نے کہا 'محسن سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دلہن بغیر دولھا کے کیوں ہے؟' واقعی سوال برمحل تھا۔ ہمیں بھی تشویش ہوئی۔ شاہدہ صاحبہ نے کہا 'کیابا تیں

ہو رہی ہیں۔' ہم نے بھائی جون کا سوال دہرایا تو انھوں نے بغیر کسی تردد کے جواب دیا جو نہایت معقول تھا۔ انھوں نے جواب دیا تھا' دراصل یہ ٹی وی کا کمرشل بنا رہے ہیں۔'

....

جون بولے یار محسن! یہاں کھانے کے بعد گانا تو نہیں ہوگا۔' ہم نے کہا کہ اندازہ تو نہیں ڈاکٹر صاحب خود شاعر ہیں اور کل مشاعرہ ہے اس میں یقیناً شریک ہوں گے پھر بھی پال باندھ لینا چاہیے۔' انھوں نے بائیں جانب بیٹھے ہوئے حمایت صاحب سے کچھ کہا اور پھر جون بھی گفت گو میں شامل ہو گئے، جیسے ہی جون کے موضوع سے مطابقت رکھنے والا جملہ آیا انھوں نے اُچک لیا اور پھر مطلب کے جملے ٹانکتے چلے گئے۔' ڈاکٹر صاحب اب عام لوگوں کو تو جانے دو، اہلِ سخن حضرات کے ہاں شعروشاعری کی گت بننے لگی ہے۔ ایسی محفلیں عام ہو گئیں ہیں کہ شعرا کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ شعر سنائیں۔ ہمیں کھانے اور گانے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔' ڈاکٹر صاحب نے جون کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ' بہت صحیح کہا ہے آپ نے۔' شوکت مرزا نے بھی گرہ لگائی..... 'آج یہاں ایسا نہیں ہوگا۔'

....

اب بھی تقریباً دو گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ کچھ لوگ نیند طاری کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ زیادہ تر مسافر کچھ نہ کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ اتنے میں اسٹیورڈ نے متوجہ کرتے ہوئے کھانے کے بارے میں دریافت کیا۔ ہم نے صرف دو لفظ ادا کیے.....'Fish please. Ok!' کہہ کر اس نے بھائی جون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا 'Same for Madam' (یہی خاتون کے لیے ہے) ہم نے ہنسی روکتے ہوئے 'Yes please' کہا۔ بھائی جون نے ایک مرتبہ پھر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا..... 'گویا یہاں بھی؟' 'ہاں! یہاں بھی یہ خبر پہنچ گئی۔' ہم نے جملہ پورا کر دیا۔ حمایت ذرا فاصلے پر تھے۔ وہیں سے بلند آواز میں بولے کہ 'کیا ماجرا ہے؟' ہم نے کہا 'وہ غلط فہمی میں اسٹیورڈ انھیں میڈم سمجھ رہا تھا۔' ٹرالی آ چکی تھی۔ اسٹیورڈ نے ٹرے نکال کر سیٹ کے کاؤنٹر پر بڑے احتیاط سے رکھی ہی تھی کہ ہم نے اس کے کان کے قریب ہو کر کہا 'He is Man'۔

اس نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا 'I'm Sorry'، لیکن دو قدم آگے جا کر اس نے
پھر مڑ کر دیکھا جیسے اپنے آپ کو یقین دلا رہا ہو۔

....

رات پاکستانی احباب سے گفت گو میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ سویرے کیا بل کر
دو پہر کے وقت آنکھ کھلی۔ کئی دنوں سے معمول سا ہو گیا تھا کہ حمایت اور ہم پہلے اُٹھ جاتے
اور بھائی جون خاصی دیر بعد لیکن آج سب ہی ساتھ اُٹھے۔ جون نے ہمارے پلنگ پر نظر
ڈالی، تکیہ سرہانے سے کچھ زیادہ ہی سرک گیا تھا اور لحاف تو نیچے پڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر
بھائی جون بولے 'یار اس صورتِ حال پر ایک شعر یاد آ گیا جو بھائی تقی نے بہت پہلے سنایا تھا۔

جوانی سب پہ آتی ہے کبھی سوتے ہیں دنیا میں
ارے او بے خبر تکیے گرے جاتے ہیں بستر سے!'

ہم نے کہا 'زبان کا اچھا شعر ہے۔' یہ داد تو خیر شعر کی تھی۔ 'ویسے بھائی جون خدا خیر
کرے آج صبح سے ہی چاق و چوبند نظر آ رہے ہیں۔' کہنے لگے 'میں وعدہ کر کے آیا تھا کہ
دسویں دسمبر تک سسپنس ڈائجسٹ کا پہلا صفحہ لکھ کر فیکس کر دوں گا اور رات تک ایک حرف
نہیں لکھا بس آج ہی آخری دن ہے۔' ہم نے ان کا ساتھ دیتے ہوئے کہا 'عجیب اتفاق
ہے آج ہمارا بھی لکھنے کا ارادہ ہے۔ ڈائری کا بہت سا میٹریل اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے۔'
لکھنے لکھانے میں دن گزر جانے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

....

ڈائمنڈ بار سے تقریباً ساڑھے بارہ بجے واپسی ہوئی۔ راستے میں شمیم نے ہندوستانی
فلم کا کیسٹ لگا دیا۔ دو ایک گیتوں کے بعد جب 'رات رنگیلی مست نظارے' والا گیت آیا تو
جون نے چونکتے ہوئے کہا۔ 'یہ تھا وہ نغمہ!' ہم نے کہا 'گویا'، جون نے چھت کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا 'بھائی محسن (جون کے تخاطب کا انداز مُوڈ کا تابع ہے کبھی محسن، کبھی یار محسن اور کبھی
بھائی محسن!) یہی کوئی بیس برس پہلے میرا اور ایک اور شخص کا محبوب گیت تھا۔ ہم اکثر گنگناتے
تھے۔' چناں چہ شمیم کو کئی بار پلٹنا پڑا۔ اس وقت یہ گیت سبھی کو حسب حال لگا۔

....

ہم یہ بتانا بھول گئے کہ تاج محل میں داخل ہونے سے پہلے یاسین نے چند ہدایات بھی دی تھی۔ پہلی یہ تھی کہ کوئی صاحب بھی ان مقدر کے کھیلوں کو Serious نہ لے بل کہ محض تفریح اور اپنی معلومات کے طور پر کھیلیں اور دوسری ہدایت یہ تھی کہ جس کا بھی جیک پاٹ لگ جائے وہ پھر مشین کے قریب بھی نہ جائے یعنی پھر وہ ایک ڈالر بھی مشین میں نہ ڈالے۔ ہم سب کیسینو کے پہلے سیکشن میں ہی رہے جو 25 سینٹ، 50 سینٹ اور ایک ڈالر کی مشینوں پر مشتمل تھا، اس کا سمجھنا اور کھیلنا آسان تھا۔ اس کے علاوہ آٹھ دس سیکشن اور بھی تھے جہاں گھومنے والے چکر، اعداد اور تاش کے مختلف کھیل کھیلے جارہے تھے۔ ہم نے 25 سینٹ کے آٹھ دس سکے ہی ضائع کیے تھے۔ ایک سکہ ڈالنے کے بعد مشین کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور ایک بڑے سے شگاف میں سے سکے لگا تار گرنے لگے۔ گھنٹیوں اور سکوں کے گرنے کی ملی جلی آواز سے اطراف کے لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔ حمایت صاحب اور جون جو قریب ہی تھے لپک کر آئے اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے 'یار تم نے کارنامہ کر دکھایا۔ اب انھیں پلاسٹک کی ٹوکری میں رکھ کر کاؤنٹر پر چلو اور ان کے ڈالر بنوالو اور ہاں ہدایات کے مطابق اب صرف دوسروں کو کھیلتا دیکھو' ہم نے اسی طرح عمل بھی کیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے صاحب نے ایک مشین کی بکٹ میں ہماری ٹوکری اُلٹ دی اور مشین پر کھٹا کھٹ نمبر بدلنے لگے بالآخر وہ 50 کے ہندسے پر آکر رک گئی۔ چناں چہ اس شخص نے ہمیں 50 ڈالر ادا کر دیے اور یہ سب صرف آدھے منٹ کے عرصے میں ہوا۔ ہم پھر مشینوں کے درمیان تھے جلد ہی ہم نے ایک بات نوٹ کر لی کہ جون یاسین اور حمایت کو کھیلتے دیکھ رہیں ہیں لیکن خود پہل نہیں کر رہے۔ حمایت اور یاسین کے کہنے پر بھی وہ کھیلنے کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ جب ہم نے بھی اصرار کیا تو بڑی دانش مندی کی بات کی جس کا ہمیں بھی قائل ہونا پڑا ان کا جملہ بالکل اسی طرح تھا۔ 'یہ عقل مندوں کا کام نہیں! آپ کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، سب کچھ مشین کے بس میں ہے۔'

....

باتوں باتوں میں ہم نے آغا صاحب کو بتایا کہ 'ہمارے نانا امیر صاحب اس زمانے میں پولیس اسکول میں انسٹرکٹر تھے جب تاج الدین بابا بھی پولیس ملازم تھے۔ لیکن بعد میں

بابا سے بعض ان ہونی باتیں ہوئیں تو کپتان صاحب نے ان سے معافی مانگی اور پھر بابا کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا۔' نانا جان مرحوم کے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے۔

'ہماری والدہ صاحبہ نے بچپن میں بابا کو دیکھا ہے۔' ان کلمات کا ادا ہونا تھا کہ آغا صاحب نے نہایت محبت سے کہا 'تو پھر آپ بھی اپنے ہوئے۔ بابا ذہین شاہ تاجی سے اکثر شرفِ ملاقات حاصل ہوا ہے۔ ہم ان کے بیش تر مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں۔ ہاں میں نے وہاں آپ کو بھائی رئیس اور جون وغیرہ کے ساتھ دیکھا ہے۔' یہ کہتے ہوئے وہ جون سے مخاطب ہوگئے۔ جون نے بھائی رئیس کے ہاں ان سے دو ایک ملاقاتوں کا ذکر کیا تو آغا صاحب نے کہا 'اچھی طرح یاد ہے وہاں آپ سے بھی ملاقاتیں رہی ہیں۔ بھائی رئیس کے بچھڑنے کا بہت دکھ ہوا۔' تھوڑی دیر بعد فرشی دستر خوان پر قورمہ اور نان آچکے تھے۔ یہ ایک ڈش کی دعوت واقعی مزہ دے گئی۔ قورمہ اس قدر لذیذ تھا کہ سبھی نے تعریف کی۔ میٹھے اور چائے کے بعد آغا صاحب نے کہا 'ہماری خواہش ہے کہ بابا ذہین شاہ کے کلام سے آغاز کیا جائے۔ پھر آپ حضرات اپنا کلام مرحمت فرمائیں۔ اس طرح یہ صحبت یادگار ہوجائے گی۔' جون نے بڑے انہماک کے ساتھ آیاتِ جمال سے بابا کی دو غزلیں سنائیں۔ بعد میں ہمارے علاوہ جون، حمایت اور حنیف اخگر صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں آغا صاحب نے سب شعرا کو تحفے دیے اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

نام ہی کیا، نشان ہی کیا، خواب وخیال ہو گئے

ڈاکٹر محمد خورشید عبداللہ

سیّد قمر رضی صاحب کا حکم ہے کہ جون ایلیا کے بارے میں کچھ یادیں جمع کی جائیں اور ان کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں لکھنے کے فن سے قطعاً نابلد ہوں۔ لکھنا، اُردو زبان میں لکھنا اور وہ بھی جون ایلیا کے بارے میں جن سے تعلقات کا عرصہ تقریباً ربع صدی پر محیط ہے میرے لیے ایک انتہائی تکلیف دہ عمل ہے۔

میری یادوں کے نہاں خانے سے ایک عکس اُبھرتا ہے، سولہ دسمبر 1971ء رات کا وقت، ہماری تاریخ کا ایک خوں چکاں باب اپنے اختتام پر ہے۔ سقوطِ ڈھاکا کا اعلان ہو چکا ہے۔ لوگوں کی زبانیں گنگ ہیں مگر آنکھیں اشک بار ہیں۔ یکا یک ٹی وی پر ایک نحیف ونزار شخص جس کے گیسو کندھے تک آتے ہیں، انتہائی جلال اور غیظ کے عالم میں نظم پڑھتا ہوا دکھائی دیا۔

ظالمو جواب دو خون کا حساب دو...... کیا اس قدر حقیر تھا اس قوم کا وقار......
جس نے ہمیں ذلیل کیا وہ کون ہے۔

یہ چند مصرعے اور جون ایلیا کا غصہ، ان کے بارے میں میری پہلی یاد ہے۔ ایک دہائی کا عرصہ مزید گزرتا ہے۔ عبیداللہ علیم کا حجرہ، شام کا سماں، سرشاری کا وقت، میں نے عبیداللہ علیم سے کہا کہ 'آپ اپنے پسندیدہ اشعار سنائیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ آپ کے اپنے نہ ہوں۔' کہنے لگے 'یوں تو مجھے ہزاروں شعر یاد ہیں مگر میں تمھیں جون ایلیا کے دو شعر سناؤں گا جو میرے خیال میں اُردو کی شعری روایت میں یقیناً اضافہ ہے۔

ہم نے خدا کا رَد لکھا نفی بہ نفی لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نئیں

آپ یقین جانیں یہ دونوں شعر سن کر میری جو کیفیت ہوئی وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ میں نے علیم صاحب سے پوچھا کہ ان کا کوئی مجموعۂ کلام ہے؟ انھوں نے مجید امجد کا مصرعہ جواب میں پڑھ دیا۔

یہ کہانی بڑی طولانی ہے

آج اتنے سال گزرنے کے بعد بھی مجھے اس جواب پر کوئی حیرت نہیں ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ کہانی کتنی طولانی ہے۔

میرے پاس جون ایلیا کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر موجود ہے، لکھتے ہیں کہ 'یہ کہنا کہ شاعری جزاست از پیغمبری ایک گستاخانہ بات ہے۔ شاعری کم از کم پیغمبری ہے، شاعری دوسروں کے خلاف ایک لڑائی ہے جو اپنے آپ سے لڑی جاتی ہے، میں نے اپنی زندگی میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا سوائے شاعری کے فیصلے کے'۔

جون کا یہ اقتباس بلا تبصرہ نقل ہے۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ جہاں تک جون ایلیا کا تعلق ہے یہ سخن برائے سخن نہیں ہے، انھیں واقعی اس پر حق الیقین حاصل تھا۔

میں نے علیم صاحب سے کہا کہ 'ان سے ملنے کی کوئی صورت ہے؟ کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟' کہنے لگے 'آپ میرے یار کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ کیا میں اپنے یار کو جانتا ہوں۔' میں نے درخواست کی کہ 'مجھے ان سے ملوا دیجیے۔' کہنے لگے 'یہ ممکن نہیں ہے آپ خود ان سے مل لیں وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔' میں نے اصرار کیا کہ 'آخر آپ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟' کہنے لگے 'یہ کہانی بھی طولانی ہے' پھر اپنا ایک شعر پڑھا اور خاموش ہو گئے، حجرے کی فضا میں دکھ تیرنے لگا۔

یار ہمارا ایلیا، ہم سے اُٹھا لیا گیا
بیٹھے اب اپنی ذات میں ایلیا ایلیا کرو

میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں نم ناک ہیں اور وہ کسی گہرے رنج میں مبتلا ہیں۔ میں نے کریدنا مناسب نہ سمجھا مگر اس دن سے یہ فکر لاحق ہوگئی کہ اتنا اچھا شاعر اپنا مجموعہ کیوں نہیں چھپواتا، یہ دونوں دوست آپس میں ملتے کیوں نہیں، جون صاحب کا مطبوعہ کلام کہاں ہے اور ان سے ملاقات کیسے ہوگی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ بلا کے منہ پھٹ، زود رنج اور اپنے علم کے تکبر میں مبتلا بدتمیز قسم کے دہریہ ہیں۔

بیس سال کی رسم وراہ کے بعد صرف اتنا کہہ سکتا ہوں ان سے ملنا اور ملتے رہنا یقیناً ایک نہایت پُر خطر کام تھا مگر کسی اور معنی میں۔ باقی باتیں جو اُن کے بارے میں تیقن سے دہرائی جاتی تھیں وہ محض باتیں تھیں۔ ہاں ایک الزام کے بارے میں کہ وہ نہایت بدتمیز قسم کے دہریہ ہیں کچھ کہنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کے عقائد کے بارے میں کچھ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ تھے کیا مگر ایک بات پوری ذمے داری سے کہہ سکتا ہوں کہ خدا کا وجود یا عدم وجود ان کے لیے ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ تھا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جون کے خیال میں یہ کائنات اور اس کا پورا نظام ویسا نہیں ہے جیسا ہونا چاہیے تھا، کیسا ہونا چاہیے تھا اس کا جواب خود اُن کے پاس بھی نہیں تھا اور یہی ان کا المیہ تھا وہ موجودہ زندگی کے کسی بھی مظہر سے انتہائی غیر مطمئن تھے۔

میرے اور ان کے درمیان گفت گو کا سب سے بڑا موضوع تاریخِ مذاہب ہوتا تھا یا پھر ان کی اپنی بیماری۔ دیگر موضوعات میں شاعری، عربی صرف ونحو، فردوسی کا شاہ نامہ، مرزا شوق کی مثنوی، کلیاتِ میرؔ، امروہہ اور اس کی یادیں، غرض کہ ایک دنیا تھی جس میں ہم رہتے تھے، ان کے جانے کے بعد دنیا ختم ہو چکی ہے۔

تھے عجب دھیان کے در و دیوار
گرتے گرتے بھی اپنے دھیان میں تھے

جون موت کے فلسفے پر بے تکان گفت گو کرتے تھے مگر اپنی ممکنہ موت کے تصور کو بھی اپنے ذہن میں پھٹکنے نہیں دیتے تھے کیوں کہ ان کے خیال میں انسانی موت کائنات

کے نظام کے ناقص ہونے کی ایک دلیل تھی۔ جب ان کے بہنوئی کے انتقال کی خبر آئی تو کہنے لگے' لیجیے صاحب وہ مر گئے، یار کوئی بات بھی ہو آخر کیوں مر گئے، یہاں کوئی چیز تو درست ہوتی' میں نے عرض کیا کہ' جون صاحب صبر کیجیے، مجھے اور آپ کو بھی اس منزل سے گزرنا ہے۔' کہنے لگے' ڈاکٹر یہ بات مجھ سے مت کرو۔'

میں ان سے جان بوجھ کر زندگی کی مہلت اور اس کے غیر یقینی ہونے کی باتیں کیا کرتا تھا کہ وہ اپنا کلام مجھے فوٹو کاپی کرنے کی اجازت دیں تا کہ کم از کم وہ محفوظ ہو جائے مگر یہ افسوس میرے ساتھ قبر تک جائے گا کہ میں اپنے مطالبے میں زیادہ متشدد کیوں نہیں ہوا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کیا نظم اور کیا نثر ان کے مسودوں کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ جون، دوسروں پر زیادتی کرنے کے لیے بدنام تھے مگر میرے خیال میں یہ سب سے بڑا ظلم انھوں نے اپنی ذات پر روا رکھا۔

جون ایلیا اور عبیداللہ علیم سے زیادہ اس بات کا حق دار کوئی نہیں کہ میں ایک مبسوط کتاب ان کے اور اپنے روابط کے بارے میں لکھوں کہ ان دونوں ہی سے میری یادوں میں چراغاں ہے۔

یہ کوئی باقاعدہ مضمون نہیں ہے چند منتشر یادوں کا عکس ہے۔ کوئی دس دن قبل کا ذکر ہے میں جون صاحب کی قبر پر گیا، صحیح معنوں میں گورِ غریباں کا منظر تھا نہ کوئی کتبہ، نہ قطعہ تاریخ، نہ نام، نہ نشان!

نام ہی کیا نشان ہی کیا، خواب و خیال ہو گئے

خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق جس چیز سے پڑتا ہے وہ ان کی شاعری ہے جو میرے علم کے مطابق 75% غیر مطبوعہ ہے۔ جون صاحب کی قبر پختہ ہو یا نہ ہو، اس سے کم از کم جون ایلیا کو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ان کا کلام بین الدفتین جمع نہ ہوا تو یہ ان کے 'عشاق' کے لیے شرمندگی کا مقام ہوگا۔

آشوبِ آگہی کا شاعر

محمد علی صدیقی

جون ایلیا کے فن کے بارے میں مدرسانہ گفت گو ممکن نہیں ہے لیکن جب اس کے فن کو اس کی ذات کی روشنی میں سمجھنے کی بات ہو گی تو غیر جذباتی مطالعے کی مطلوبہ شرائط خود بہ خود اہم قرار پائیں گی۔ جون ایلیا نہ فارمولا قسم کی شخصیت ہیں اور نہ وہ کسی فارمولے پر پورا اُترنے والی گفت گو ممکن بنا پاتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ مندرجہ بالا بات متعدد فن کاروں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے تو پھر جون ایلیا کا اختصاص کیا ہے؟ میرے خیال میں اس اختصاص کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ جس طرح اپنی سادگی بل کہ اپنے ہاتھوں اور زمانے کے ہاتھوں تباہ برباد ہوئے ہیں، شاید ہی کوئی اور شاعر اس قدر تباہ و برباد ہوا ہو۔ جون اور دوسرے برباد شدگاں میں فرق یہ ہے کہ وہ اپنی بربادی کو تواتر کے ساتھ موضوعِ بحث بناتے ہیں، اس بربادی پر نوحہ کناں ہونے کے بجائے اس کا مذاق اُڑاتے ہیں اور پھر انسان، ذات اور کائنات کی ساخت تک کو چیلنج کرنے لگتے ہیں۔

خوب ہے شوق کا یہ پہلو بھی
میں بھی برباد ہو گیا تُو بھی

چبالیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

کیا سحر ہو گئی دلِ بے خواب
اک دھواں اُٹھ رہا ہے بستر سے

ہم کو سودا تھا سر کے مان میں تھے
پاؤں پھسلا تو آسمان میں تھے

حجرۂ صد بلا ہے باطنِ ذات
خود کو تُو کھینچیو نہ باہر سے

میرا خیال ہے کہ بعض بدیہی طور پر درست باتیں بھی اپنے دعوے میں درست اور اپنے دعوے کے ثبوت میں نادرست ثابت ہو جاتی ہیں لیکن جون کی زندگی پر جب لکھا جائے گا تب تک یہ کلیّہ درست ثابت ہوتا رہے گا کہ وہ آشوبِ آگہی اور آشوبِ دل کے یک ساں قتیل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کج کلاہی کی روایت کے رسیا ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو وہ نقصان اور زیاں کی جتنی بھی روایتیں اور حکایتیں ہیں، ان کے بے دریغ خراج ہیں۔

آغازِ مضمون ہی میں عرض کرتا چلوں کہ میرے خاندان اور جون ایلیا کے خاندان نے برصغیر میں دو ہجرتیں کیں۔ پہلے ملتان سے اور پھر امروہے سے۔ ان ہجرتوں کے درمیان صدیوں کا طویل دورانیہ ہے۔ میں جون ایلیا کے بارے میں کلی طور پر غیر جانب دار رہنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن مجھے امید ہے کہ جون ایلیا بے رحمانہ تنقید اور فیاضانہ تحسین کے بہ یک وقت حق دار ہیں۔ جس شخص کو کافی قریب سے دیکھنے کا دعویٰ کیا جائے اور جس کے ساتھ ایک عمر گزاری گئی ہو اس کے بارے میں ایمان داری کے ساتھ 'طرف داری' بھی کی جا سکتی ہے۔ ہمارے یہاں سخن فہمی اور غالب کی طرف داری میں جبری بُعد تسلیم کر لیا گیا ہے۔ زوالِ مشرق کی ایک وجہ شاید یہ مجبوری ہو لیکن عروجِ مغرب کا ایک وصف قابلِ تقلید ہے کہ دلیل کے ساتھ چلا جائے اور اگر اس کوشش میں ناکام یابی ہو تو اسے عجزِ ادراک مان لیا جائے۔

جون ایلیا اگر وہ بے مثال شاعر نہ بھی ہوتے جو وہ ہیں تب بھی وہ ایک عالم، فلسفی،

محقق، ماہرِ لغت، مترجم اور اچھے قاری بہ ہر طور ہوتے اور اس بنیاد پر بھی وہ اپنے شہر کے درجنوں نقصوں بل کہ Legends کے کردار ہوتے۔ اگر جون ایلیا کی ساری شاعری تلف بھی ہو جائے اور وہ اپنے علم، ذکاوت، ذہانت اور ڈرامائی اندازِ زیست کے ساتھ باقی رہ پائیں تب بھی وہ ہمارے دور کے ایک ایسے فرد بہ ہر طور شمار ہوں گے جسے فرسودہ ماضی سے بے پناہ کد ہے لیکن وہ کچھ سحر رخانِ شبستاں کی وجہ سے اس پر شب خوں نہ مار سکیں گے۔

شب خوں ہی اب نبردِ کہن کا علاج ہے
پر کچھ سحر رخانِ شبستاں بھی ہیں عزیز

صرف یہی نہیں جون ایلیا کے وجود میں ایک ٹائم مشین (Time Machine) نصب ہے جس کے ذریعے وہ اپنے دوستوں کو صرف عالمِ اسلام کے ماضی ہی میں نہیں بل کہ قدیم تہذیبوں کے مرکزی علاقوں کے ماضی میں جب چاہتے ہیں، سفر کراتے ہیں، جتنی دیر چاہیں قیام کرتے ہیں، تاریخی شخصیات کی محفلوں میں باریاب ہوتے ہیں، اور نہ بے مزہ ہوتے ہیں اور نہ کرتے ہیں۔ وہ دیو مالائی ادب کے اس قدر رسیا ہیں کہ شاید وہ کبھی کبھی عالمی صنمیات (Mythology) کے اہم سلسلوں کی دیوزاد شخصیات سے روحی تعلق (Claim) کر سکیں۔ انھوں نے اپنے تکلم سے بارہا ایک ماہر فوٹو گرافر کی طرح عکاسی کی ہے۔ کبھی کبھی وہ چلتے چلتے رک جاتے ہیں اور کبھی کبھی تا دیر معطل اور مبہوت کھڑے رہنے کے بعد پھر چل پڑتے ہیں۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے اور وہ کیوں کر کبھی ہمارے ہم عصر اور کبھی ہمارے پیش رو اور وہ بھی بہت قدیم پیش رو کا روپ دھار لیتے ہیں۔ میں نے سب سے پہلے جون ایلیا کو آج سے چالیس سال قبل امروہے میں دیمک زدہ کتابوں اور کہن سال علما کی صحبتوں میں دیکھا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھے اس وقت بڑے مصنوعی (Unreal) وجود معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس زمانے میں ہمارے قصبے کی بعض حسیناؤں سے اپنے شعروں کے ذریعے جمیل بن معمر، عمر ابن ابی ربیعہ، ابن زیدون، بشار اور ابوالعتاہیہ کے انداز میں ہم کلام ہوتے نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ وادیٔ گنگ و جمن میں قریشی شاعر عمر ابن ابی ربیعہ کی طرح 'بطورِ خاص' اپنی شاعری کے صلے میں بے جا رعایتیں اور خراج چاہ رہے ہوں۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ امروہے میں اس قریشی شاعر کے لیے سپردگی اور شیفتگی کا وہ

تاریخی تناظر موجود نہ تھا جس کے باعث 100 تو کیا ایک خون بھی معاف ہو سکے۔ ان کے خاندان کو عمر بن ابی ربیعہ کے خاندان کے برخلاف اپنے علمی و ادبی ماضی پر فخر و مباہات کے سارے حقوق حاصل تھے۔ جون ایلیا اس زمانے میں بھی سنیوں کو حقیقی سنی، شیعوں کو حقیقی شیعہ اور ہندوؤں کو حقیقی ہندو ہونے کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب وہاں کے جنگلوں سے کرشن اور گوپیاں بھی رخصت ہو چکی تھیں۔ شرقِ اوسط کی الف لیلوی فضا معرضِ تخلیق میں تو آ سکتی تھی لیکن کوئی وجود نہ رکھ سکتی تھی۔ ان کی مادری زبان کی اساس شورسینی پراکرت تھی جس میں پراچینی پالی کے توسط سے اشوک کے کتبات کی زبان سراسر ینگ (Ying) یعنی مادری اصولِ ہیئت کے مطابق تھی اور عربی و فارسی لارڈ میکالے کے تاریخی (Minutes) کے خلاف ایک ضرورت سے زیادہ ردِعمل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

سو، جون ایلیا اگر شاعر نہ بھی ہوتے تب بھی وہ برطانوی سامراج کے ردِعمل کے ایک ایسے پیکر ضرور ہوتے جو اپنے بزرگوں کی نسل اور اس نسل کے لسانی اور ثقافتی ماضی میں سانس لینے کے لیے ہمہ وقت مصروف رہا کرتے۔ اگرچہ ہماری اور ان کی نسل کے لیے یہ سارا کھیل ایک پراز زیاں Acrobatics سے کم نہ تھا۔ انگریز آ چکا تھا اور اسے اسی کے ہتھیاروں کے ذریعے باہر نکالا جا سکتا تھا۔ ہماری نسل کے پیچھے 1857ء کی جنگِ آزادی کی شکستِ فاش اور غالب کی مثنوی یا ز دہم تھی مگر جون ایلیا اپنی افتادِ طبع اور علمی پس منظر کے باوصف ذہنی طور پر اس نسل سے متاثر رہے ہیں جو مجذوبانہ انداز میں انگریزی اقتدار کی شمع کو اپنی پھونکوں سے بھی گل کر سکتی تھی (بہ شرطے کہ وہ ایسا چاہتی!)۔ ظاہر ہے کہ اس غیر حقیقت پسندی میں جو خود رائی تھی وہ مجاہدانہ اور مجنونانہ طرزِ فکر، جس مکمل انہدام کی متقاضی تھی وہ ان کے لیے ناقابلِ ادراک تھا۔ جون ایلیا نے اس وقت ہمیں پاگل یا خودسر جانا تھا اور آپ سے کیا پردہ کہ ہم بھی انھیں ایک ایسا کردار سمجھتے تھے جو اپنی شکست پر متاسف تو ضرور تھا لیکن نادم نہ تھا۔ ندامت شاید حقیقت پسندی اور پھر حقیقت پسندی کی روشنی میں اس ذہنی اور مادی تیاری سے دور ہو سکتی ہے جو ہمیں (Sancho Panza) بنانے کے بجائے چی گیویرا (Che Guevera) یا یاسر عرفات بنا سکے۔ مؤخرالذکر ہیروز میں ایک کامیاب ہو چکا ہے اور دوسرے کے لیے کامیابی مقدر ہے۔ ظاہر ہے کہ

جمال ناصر پر غیر حقیقت پسندی کا الزام لگانے والے بہادر شاہ ظفر کو کس طرح حقیقت پسند سمجھنے کی غلطی کر سکتے ہیں۔ کاش اس وقت جون ایلیا نے 1857ء کی جنگِ آزادی پر مارکس کی تحریریں پڑھ لی ہوتیں تو ہم سے اختلافِ رائے کی چنداں ضرورت پیش نہ آتی۔
جون ایلیا خاصے رومانوی ہیں وہ مثالیے کی تلاش میں بے حد سرگرداں رہتے ہیں۔ مثالیے کی تلاش ان کی شاعری میں ایک اہم تخلیقی محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اخلاقی اقدار اور جبلتوں کے مابین مبارزہ آرائی نے جون ایلیا کے ذہن کو نئے عہد کا پانی پت بنا رکھا ہے۔
وہ جس قدر شعوری رہ پاتے ہیں، اس کا غالباً ایک ہی مدعا ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنے چہرے پر (Persona) پہننے سے انکار کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد نام ور شعرا کے مقابلے میں جون ایلیا نہ تو اپنی ذات کی اور نہ اپنے کلام کی تدوین میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اگر آپ اس شاعر کے کلام سے اس کے اعلان کردہ ثقافتی ورثے یا نظریاتی داعیوں کے خلاف اشعار منتخب کرنا چاہیں تو شاید ہی کوئی اور شاعر اس طرح کا شرطیہ شکار (Setting Target) کر سکے جس طرح کے جون ایلیا ہیں۔
آیئے ہم سب سے پہلے جون ایلیا کے پس منظر کی جانب نظر دوڑائیں۔
جون ایلیا کے مورثِ اعلیٰ سیّد شرف الدین شاہ ولایت ؒ تغلق سلاطین کے زمانے میں امروہے میں آباد ہوئے۔ یہی وہ دور ہے جب شیخ معین الدین صدیق، سیّد اشرف جہاں گیر، شاہ ولایت ثانی اور حضرت بابا فرید گنج شکر کے خانوادوں کے بزرگ شیخ سالار نے فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں امروہے کا رُخ کیا۔ امروہے کے بارے میں 1340ء/741ھ میں ابنِ بطوطہ کا مشہور تاثر یہ ہے کہ 'پھر ہم امروہہ پہنچے، یہ ایک چھوٹا سا خوب صورت شہر ہے۔' ابنِ بطوطہ نے جن قاضی شہر سیّد امیر علی کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے میری شان دار ضیافت کی، وہ جون ایلیا کے جدّ تھے۔
امروہے میں مسلمان، سلطنتِ دہلی کے قیام سے قبل، راجپوت راجاؤں کے زمانے ہی میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ اختصاص صرف امروہے ہی کو حاصل نہیں ہے بل کہ اجمیر، بنارس، بدایوں اور قنوج کو بھی حاصل ہے۔ ابنِ اثیر اس دعوے کے ایک جزو کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس شہر میں سہروردیہ سلسلے کے بزرگانِ عظام تواتر کے ساتھ آئے۔

جون ایلیا کے مورث اعلیٰ سیّد شرف الدین شاہ ولایت ؒ بھی سہروردیہ سلسلے کے بزرگ ہیں۔ جون ایلیا کے دادا سیّد ابدال محمد، میر تقی میر کے شاگرد سیّد عبدالرسول نثار کو دہلی سے امروہہ لے آئے، جہاں مصحفی ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ جون ایلیا ہی کی برادری کے ایک بزرگ سیّد اسماعیل امروہوی نے شمالی ہند کی پہلی مثنوی 'وفات نامہ بی بی فاطمہ' لکھی۔ جون ایلیا کو اپنے مولد کے حوالے سے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ مصحفی امروہے ہی کے باشندے تھے۔ (یہ اور بات ہے کہ وہ امروہے میں نہ پیدا ہوئے اور نہ وہاں آسودہ خاک ہوئے)۔ میر انیس کے والد میر خلیق بھی مصحفی کے شاگرد تھے اور اس طرح امروہہ اُردو شاعری کی ایک اہم 'جنم بھومی' قرار دیا جا سکتا ہے۔

جون ایلیا کے پردادا سیّد امیر حسن بھی شاعر اور ادیب تھے۔ امیر حسن امیر کے دادا سلطان احمد سیّد عبدالرسول نثار کے شاگرد تھے۔ اس طرح جون ایلیا سلسلہ میر کے شاعر ہیں۔ جون ایلیا کے والد گرامی علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا، عربی، فارسی، عبرانی، انگریزی اور سنسکرت کے عالم اور شاعر تھے۔ علامہ ایلیا کی صرف چند کتابیں ہی شایع ہو سکی ہیں اور درجنوں کتابوں کے مسوّدات تا ہنوز طباعت کے منتظر ہیں۔ یہ برصغیر کے واحد ماہرِ علم ہیئت تھے، جو گرینچ رصدگاہ (Greenwich Observatory) کی دریافتوں سے بذریعہ خط کتابت براہِ راست متمتع ہوا کرتے تھے۔ جون ایلیا کی برادری اور خاندان نے جنگِ آزادی 1857ء میں بہادر شاہ ظفر کا ساتھ دیا تھا اور یہی وہ مشترکہ تاریخی ورثہ اور تاریخی رشتہ ہے جس کی وجہ سے وہ سامراج دشمن علما سے گہری عقیدت اور علمائے دیوبند سے خاص شیفتگی رکھتے ہیں۔

میں نے اپنی تحریر کے آغاز میں لکھا تھا کہ جون کی شاعری کی فہم ان کے پس منظر کے مطالعے کے بغیر ادھوری سی رہے گی۔ ہر چند کہ مندرجہ بالا پس منظر قدرے طویل ہے لیکن اس کا ذکر ضروری ہے کیوں کہ جون ایلیا کی شعری لغت، علوم کی متعدد شاخوں سے اخذ کردہ ہے اور وہ مشرقی علم بیان اور صنائع و بدائع میں غیر معمولی درک رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان جیسے شاعر ہمارے درمیان چند ایک ہی ہوں گے۔

جون ایلیا میرے بعد پاکستان آئے۔ جیسے ہی وہ کراچی آئے ملاقات ہوئی اور پھر

ایک ایسا دور بھی آیا کہ شاید ہی کوئی شام ایسی گزرتی تھی جب ممتاز سعید، حسن عابد، راحت سعید میں اور بعض دوسرے دوست، دفتر 'شیراز' پنجابی کلب کھارادر کے فلیٹ، کھوڑی گارڈن میں ماہ نامہ 'انشا' کے دفتر، 129۔الف مانک جی اسٹریٹ کے سبزہ زار یا پھر جون ایلیا کے 'حجرے' میں جو اس مکان کے عقبی حصے میں واقع تھا، اکٹھے نہ ہوتے ہوں۔ جون کی ہم نشینی میں وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ دن، مہینے، سال بل کہ قرنیں اس طرح گزر گئیں کہ ہم دوستوں میں سے شاید ہر فرد ابھی تک اپنا ایک قدم ملاقات کے پہلے لمحے میں مضبوطی کے ساتھ گڑ دئے ہوئے ہے۔ اس عرصے میں کیا کچھ نہیں سنا اور نہیں دیکھا۔ جون ایلیا کی وہ کون سی غزل یا نظم ہے جس کی شانِ نزول، محرک، پس از تخلیق تجزیے کی صحبتیں، اُفقِ ذہن پر اُبھر نہ آتی ہوں۔ بہت سے پردہ نشینوں کے چہرے بھی اپنی طرف بلاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا ہم تمھیں، جون ایلیا، کے حوالے سے اب بھی یاد ہیں؟ میں گزرتے ہوئے وقت کی خوش گوار یادوں کو اپنی متاعِ عزیز سمجھتا ہوں۔ اس وقت میں عالمِ خیال میں ہوں۔ ایک ہجوم ہے جو ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ جون ایلیا کے ان متوسلین، ان شاعروں کا ہجوم ہے جس نے جون ایلیا کی گل افشانی گفتار، ان کے فنِ محفل آرائی اور ان کے خطباتِ شام گاہی (بل کہ مشائی طریقہ تعلیم) سے اس قدر کچھ سیکھا ہے اور پھر اس قدر ناشکر گزاری سے کام لیا ہے کہ جون ایلیا جیسے بامروّت آدمی کو 'درہجو ہم نشینانِ خود' جیسی نظم لکھنی پڑی۔ مجھے ان کی غزل کا ایک شعر بھی خاص طور پر یاد آرہا ہے، جو بہ یک وقت ان کی مخصوص زہرناک طنز پردازی اور مہذب ترین 'کاری گری' کی بہترین مثال ہے۔

ساری ردیفیں بھی حاضر ہیں، پھر ساری ترکیبیں بھی
اور تمھیں کیا چاہیے یارو، حاصل میری داد بھی ہے

جون ایلیا جب سے کراچی آئے ہیں اس وقت سے لے کر اب تک مئی 1989ء انتہائی محفل آرا شخص رہے ہیں۔ انھوں نے بیسیوں شاعروں کو متاثر کیا ہے۔ اس شہر میں اور اس شہر کے باہر لکھنے والوں کا ایک انبوہ ہے جس نے ان کی شاعری کے علاوہ ان کی نثر سے، جو ماہ نامہ 'انشا' کی جان تھی، پوری مستعدی سے استفادہ کیا ہے۔

اب میں جون کی شاعری کی طرف آتا ہوں۔ زیرِ نظر مجموعے میں شامل 1957ء تک کی نظموں میں آسایشِ امروز، خواب، مفروضہ، دو آوازیں، وقت، تعظیمِ محبت، عیدِ زنداں، حسن اتنی بڑی دلیل نہیں، اہم ہیں۔ یہ نظمیں بہ ظاہر رومانی ہیں لیکن جون کی رومانیت عام رومان پسندوں کی ڈگر سے ہٹی ہوئی ہے۔ ان نظموں میں تعقل پسندی، خودسوزی اور فرد سوزی اور فرد و سماج اور فرد و کائنات کے حوالے سے شکوے شکایتیں ہیں لیکن لطیف اور بے ساختہ رومانی انداز بھی۔ ان نظموں میں آج کی دگرگونی بھی ہے اور مثالی معاشرے کی خیال افروز جنت کا سحر بھی۔ ان نظموں میں جون ایلیا کی نادرہ جوئی کی اعلیٰ مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ مثلاً وہ 'آسایشِ امروز' کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ گزر جائیں یہ لمحاتِ نشاط
اس سے پہلے کہ یہ کلیاں بھی فسردہ ہو جائیں
اس سے پہلے کہ بدل جائے مزاجِ احساس
اس سے پہلے کہ یہ حالات بھی مردہ ہو جائیں

یہ نظم چار چار اور دو دو مصرعوں (Stanzas) کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ ایک مونولاگ (Monologue) ہے جو پیہم جاری ہے اور مندرجہ ذیل بند پر ختم ہو جاتا ہے۔

سازِ ہستی ہمہ تن سوز ہے اور کچھ بھی نہیں
ہر سحر، شامِ غم اندوز ہے اور کچھ بھی نہیں
صنعت و فلسفہ و فن و تخیل کا مآل
شاید آسایشِ امروز ہے اور کچھ بھی نہیں

جون ایلیا نے اس نظم میں اپنا فن اور اپنی بوطیقا...... جو سراسر دانشِ عصر کی کشائش سے عبارت ہے، بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کر دی ہے۔
اب ہم ایک اور نظم 'خواب' کی طرف آتے ہیں، جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

کبھی اک خواب سا دیکھا تھا میں نے
کہ تم میری ہو اور میرے لیے ہو
تمھاری دل کشی میرے لیے ہے
میں جو کچھ ہوں تمھارے ہی لیے ہوں
تمھاری ہر خوشی میرے لیے ہے

یہ نظم بھی 'آسایشِ امروز' کی تکنیک میں لکھی گئی ہے اور اس نظم کا آخری بند 14 سطروں پر مشتمل ہے۔ ہر سطر آگے کی جانب بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔ محض زبان و بیان کے طمطراق کا اظہار مطلوب نہیں ہے بل کہ ہر سطر ایک Argument ہے جس نے الفاظ کا موزوں ترین پیکر اپنایا ہے۔ آخری بند یہ ہے۔

سلا کر حال کی تاریکیوں میں
مجھے ماضی میں چونکاتے ہیں یہ خواب
مری پلکوں کو بوجھل دیکھتے ہی
سمٹ جاتے ہیں شرماتے ہیں یہ خواب
میں ان خوابوں سے جب بھی رُوٹھتا ہوں
تو پہروں اشک برساتے ہیں یہ خواب
مجھے بانہوں کے حلقے میں جکڑ کر
مرے سر کی قسم کھاتے ہیں یہ خواب
مرا آغوش اپنانے کی خاطر
زمانے بھر کو ٹھکراتے ہیں یہ خواب
شفق پر روکتے ہیں اپنا آنچل
اُفق میں جا کے چھپ جاتے ہیں یہ خواب
جہاں کچھ بھی نہیں تنہا خلا ہے
نظر کا سارا سرمایہ خلا ہے

اس نظم کے آخری دو مصرعوں میں 'تنہا خلا' اور 'نظر کا سارا سرمایہ خلا' کے مفہوم پر غور کیجیے تو یوں محسوس ہوگا کہ خلا کو تنہا کہنے والے اور نظر کے سارے سرمائے کو خلا کہنے والے جون ایلیا تخیلی و ذہنی قوت کے لحاظ سے کس قدر بھرے پڑے ہیں۔

مجموعے کے اس حصے کی ایک اور نظم 'عید زنداں' لائق توجہ ہے۔

اہلِ زنداں، عیدِ زنداں آئی ہے
نکہتِ صحنِ گلستاں آئی ہے
مژدہ باد اے حسرتِ شب زندہ دار
آرزوئے صبح خیزاں آئی ہے

اس نظم میں حسرتِ شبِ زندہ دار، آرزوئے صبح خیزاں، خس و خاشاکِ راہِ نازکاں، ساعتِ تقریبِ مژگاں، منزلِ جنازہ راناں، نازشِ مژگاں رازاں، خوش نگاہِ خوش نگاہاں، جانِ نادرماں پذیراں، ارجمندِ ارجمنداں، کجِ کلاہِ کشورِ جاں، جیسی تراکیب جون ایلیا کے فنِ تعمیر کے ایسے کنگرے ہیں جن کو ہلانا مشکل ہی نہیں بل کہ ناممکن ہے اور خاص طور پر اس نظم کا آخری شعر۔

موج خیزِ جبر میں ہم تہ نشیں
انتخابِ موج پر قادر نہیں

جون ایلیا شعوری طور پر نظریاتی شاعر ہونے کے باوجود سارتر کے انداز میں اپنے بہترین اثاثے کو بھی 'جبر' سے تشبیہ دینا چاہتے ہیں۔ اس سے مثالی نظریے کی تحقیر کا پہلو نہیں نکلتا بل کہ انتخاب کی ناگزیریت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

'دو آوازیں' اس حصے کی ایک اور اہم نظم ہے۔ میں نے اس نظم کو کراچی کے متعدد مزدوروں کے جلسوں، شاعروں اور طلبہ و طالبات کے اجتماعات میں سنا ہے۔

اور میں اس نظم کے مؤثر اور خوب صورت Crescendo کا ہمیشہ ہی سے قائل رہا ہوں۔ 'دو آوازیں' دو معروف تاریخی قوتوں کی نمائندہ آوازوں پر مشتمل ہے۔ ایک تاریخ کی منطقی طور پر درست جدلیاتی حرکت کی آواز ہے اور دوسری ڈوبتی اور کراہتی ہوئی آواز جو اپنی شکست کو آسانی سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

دو آوازیں

ہمارے سرکار کہہ رہے تھے یہ لوگ پاگل نہیں تو کیا ہیں
کہ فرقِ افلاس و زر مٹا کر نظامِ فطرت سے لڑ رہے ہیں
ہمارے سرکار کہہ رہے تھے اگر سبھی مال دار ہوتے
تو پھر ذلیل و حقیر پیشے ہر ایک کو ناگوار ہوتے
اگر سبھی مالدار ہوتے

تو مسجد و مندر و کلیسا میں کون صنعت گری دکھاتا
ہمارے راجوں کی اور شاہوں کی عظمتیں کون پھر جگاتا
حسین تاج اور جلیل اہرام ڈھال کر کون داد پاتا
ہماری تاریخ کو فروغِ ہنر سے پھر کون جگمگاتا

دوسری آواز

تم اپنے سرکار سے یہ کہنا یہ لوگ پاگل نہیں ہوئے ہیں
یہ لوگ سب کچھ سمجھ رہے ہیں یہ لوگ سب کچھ سمجھ چکے ہیں
یہ زرد رُو نوجوان فن کار جن کی رگ رگ میں ولولے ہیں
یہ ناتوان و نحیف و ناچار جن کے قدموں پہ زلزلے ہیں
یہ جن کو تم نے کچل دیا ہے یہ جن میں جینے کے حوصلے ہیں
دیا ہے فاقوں نے جنم جن کو جو بھوک کی گود میں پلے ہیں
یہ لوگ پاگل نہیں ہوئے ہیں

نظم آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے۔ دوسری آواز یوں گویا ہوتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔

تم اپنے سرکار سے یہ کہنا، نظامِ زر کے وظیفہ خوارو
نظامِ کہنہ کی ہڈیوں کے مجاورو اور فروش کارو
تمھاری خواہش کے برخلاف اک نیا تمدن طلوع ہوگا
نیا فسانہ، نیا ترانہ نیا زمانہ شروع ہوگا

اس حصے میں 'وقت' جیسی نظم ہے۔ یہ نظم جدید اُردو شاعری میں وقت کی موت پر پہلا نوحہ ہے۔ یہ نوحہ ایک ایسی بوطیقا ماننے والوں کے لیے ہے جو وقت پر کمند پھینکنے کو تاریخی فریضہ سمجھتے ہیں۔ وقت بہ ذاتِ خود انسانیت کی ترقی اور قوانین سائنس کی فزوں تر عمل داری کی علامت ہے۔

نظم اس طرح شروع ہوتی ہے جیسے کسی نے بیچ سے کہانی سنانی شروع کی ہو۔ یہ وصف جون ایلیا کے ساتھ اس قدر مخصوص ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر کسی اور شاعر کے یہاں اس نوع کی ابتدا نظر سے گزرتی ہے تو معاً جون ایلیا کی طرزِ تعمیر اور بہ طورِ خاص اختتام کی طرف توجہ مرکوز ہو جاتی ہے کہ یہی وہ موڑ ہے جہاں شعرا حضرات ٹھوکر کھاتے ہیں اور وہ یا تو بے جا ڈرامائیت پیدا کرنے کے شوق میں تن آسانی کا مظاہرہ کرتے ہیں یا پھر ایک قرین قیاس اختتامیے کا وتیرہ اختیار کرتے ہیں۔ جون ایلیا اس میدان میں بھی نادرہ جو ہیں۔

نظم کا پہلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے۔

بام اور یہ منظرِ سرِ شام
ہے کتنا حسین و عبرت انجام
مغرب کا اُفق دہک رہا ہے
دامانِ شفق بھڑک رہا ہے
تنور دُھنے ہوئے ہوں جیسے
شعلے سے چنے ہوئے ہوں جیسے

اور پھر آخری حصہ۔

نادیدہ فضا میں کھو گیا ہوں
آپ اپنا خیال ہو گیا ہوں
ہے ذہن میں بے کراں زمانہ
بے جسم خرامِ جاودانہ
اقوام و ملل کی عمر ہی کیا
ایک پل ہے سو پل کی عمر ہی کیا

ہم تھے یہ کسی قدر بجا ہے
ہم ہیں یہ خیال ہو گیا ہے
وقت آپ ہی اپنی جاں کنی ہے
آنات کی روح کھنچ رہی ہے
ہستی کا شہود ہی فنا ہے
جو ہے وہ تمام ہو چکا ہے
جو لمحہ ہے وہ گزر رہا ہے
فریاد کہ وقت مر رہا ہے

ایک اور نظم بھی توجہ چاہتی ہے۔ اس کا عنوان 'مفروضہ' ہے۔ یہ اس خیال کے بطلان کے لیے کافی ہے کہ جون ایلیا کی رومان پسندی اختر شیرانی کے قبیل کی ہے۔ اختر شیرانی کے یہاں مشاہدہ تو ملتا ہے، محاکمہ نہیں۔ غور و فکر کی وہ یورش جو جون ایلیا کے یہاں فکری غنائیت بن جاتی ہے، اختر شیرانی کا خاصہ نہیں ہے۔ نظم کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے۔

آرزو کے کنول کھلے ہی نہ تھے
فرض کر لو کہ ہم ملے ہی نہ تھے

مندرجہ ذیل دو شعروں میں پہلا شعر عجیب و غریب انداز کا مطالبہ کر کے آہستہ آہستہ Fade out ہوتے ہوئے ایک عاشق کی روداد ہے۔

گلِ حسرت کھلا نہ سمجھو تم
مجھ کو اپنا صلہ نہ سمجھو تم
ہر نفس جاں کنی ہے جینے میں
اک جہنم ہے میرے سینے میں

پہلے حصے کی آخری دو نظمیں 'تعظیمِ محبت' اور 'حسن اتنی بڑی دلیل نہیں' جون ایلیا کو سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ ان نظموں کے جون ایلیا جدید اُردو شاعری کے پہلے باضابطہ Anti Hero ہیں۔ وہ وجودی ہیں، خود پر ہنسنے اور رہنسوا سکنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انگریزی کے میٹا فزیکل شعرا

(Metaphysical Poets) کی ذکاوت کی مخصوص چمک نمایاں طور پر ملتی ہے۔

تعظیمِ محبت

ہے مجھ پر طعنہ زن خود میرا احساس
تمنا اپنی قیمت کھو رہی ہے
کہوں کیا، ہر پلک اس بے خبر کی
مری آنکھوں میں کانٹے بو رہی ہے
عرق آلود چہرے کی ہر اک بوند
نہ جانے کتنے خاکے دھو رہی ہے
خوشا یہ طرزِ تعظیمِ محبت
یہ تعظیمِ محبت ہو رہی ہے
غمِ فرقت کا شکوہ کرنے والی
مری موجودگی میں سو رہی ہے

اس نظم سے جون ایلیا کی محبوبہ کا مطالعہ ہو پائے یا نہ ہو پائے بہ ہر حال جون ایلیا کا مطالعہ ضرور آسان ہو جاتا ہے۔ شاید ہی اُردو کے کسی شاعر نے اپنی محبوبہ سے اس نوع کے شکوے کیے ہوں۔ غمِ فرقت کا شکوہ کرنے والی پر نیند کا غلبہ کم از کم جون ایلیا کے لیے ایک اسکینڈل سے کم نہیں ہے۔

اب ہم جون ایلیا کی 1957ء کے بعد کی نظموں کی طرف آتے ہیں۔ ان نظموں میں سوفسطا، اذیت کی یادداشت، برجِ بابل، رمزِ ہمیشہ، تعاقب، اجنبی شام، سلسلہ تمنا کا، جشن کا آسیب، وصال، سرزمینِ خواب و خیال، مگر یہ زخم یہ مرہم، رمز، بے اثبات، سزا، نوائے دروتی، دریچہ ہائے خیال، معمول، بس ایک اندازہ، شاید، اعلانِ رنگ، شہرآشوب، اس رائگانی میں اور دوئی شامل ہیں۔

جون ایلیا ان نظموں میں شاعری کی مشرقی و مغربی بوطیقا سے مفید مطلب طور پر استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مشرقی علوم خصوصاً مذہب، ادب، منطق اور فلسفے

ہیں کامل دست گاہ کی منزل سے گزرتے ہوئے مغربی شعریات اور فلسفے کے میدان میں سفر کیا ہے۔ عربی اور فارسی کے منتہی ہونے کے باعث وہ مغرب کی امہات کتب سے زیادہ دقتِ نظری کے ساتھ گزرے ہیں۔

یہ آمیزہ ایک لحاظ سے اب نادر الوجود ہے۔ وہ جہاں مشرقی شعریات کے نظام فصاحت و بلاغت کا خاص خیال رکھتے ہیں وہاں وہ ترکیب سازی میں اتنے مشاق ہیں کہ جدید اُردو شاعروں میں شاید ہی کوئی ان کا حریف ہو۔

اس مجموعے میں جون ایلیا کی ایسی بہت سی نظمیں شاملِ اشاعت نہیں ہیں جنھیں وہ ایوبی آمریت کے دور میں کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کراچی کے سیاسی جلسوں میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ دورِ آمریت میں منعقد شدہ ادیبوں کی کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت تو درکنار ریڈیو اور ٹیلی وژن کے مشاعروں تک میں شریک نہیں ہوئے۔ انھوں نے بدترین معاشی دن گزارے اور بے خوابی کے موذی ترین مرض میں گرفتار ہو گئے۔ وہ نصف النہار تک اذیت ناک دردِ سر سے پیہم جنگ کرتے رہے (اور تاہنوز اسی عالم میں ہیں) یہاں تک نوبت پہنچی کہ مجلس آرا جون ایلیا عزلت نشیں ہو گیا اور کئی سال تک ایک مصرع بھی نہ کہہ سکا۔

تا ایں دم جون کی شاعری Psychobabble سے زیادہ رومان، انقلاب اور عذاب ناک کیفیات کی شاعری ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنی ناقابلِ علاج اذیت کے طبعی احساس سے نیم مردہ ہو کر بھی شاعری کے ساتھ یعنی زندگی کے ساتھ یعنی اپنے Commitment کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

شاید کے پہلے حصے کی نظموں میں برجِ بابل، اذیت کی یادداشت، شاید، جشن کا آسیب، سلسلہ تمنا کا، رمزِ ہمیشہ، تعاقب اور اجنبی شام بہ طورِ خاص قابلِ توجہ ہیں۔ ان نظموں کی مختلف جہتیں ہیں، مختلف فضائیں ہیں۔ جون ایلیا حقیقت سے قریب تر جمالیات اور احساسات کے بیان پر اس درجہ قادر ہیں کہ قاری ان نظموں کی شعریت اور مضمون آفرینی پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جون ایلیا فیشن ایبل رومانیت

کے شاعر نہیں ہیں۔ جون ایلیا نے جب آنکھ کھولی تو برصغیر میں ترقی پسند تحریک کا دور دورہ تھا۔ وہ فطری طور پر روشن خیالی کی اس تحریک سے شدید متاثر ہوئے جو برصغیر میں علم اور تاریخ کے نئے تصورات کو عام کرنے میں مصروف تھی۔ ان کی شاعری کا آغاز برصغیر کی تقسیم سے ذرا پہلے ہوا۔ تقسیم کے بعد ان کا خاندان دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جس آزادی کی تحریک سے ان کا خاندان متعلق رہا تھا، وہ آزادی محض انگریز حکم رانوں کی طرف سے اپنے گماشتوں کو اقتدار کی منتقلی کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہی سیاسی اشرافیہ جس نے آزادی کی جنگ لڑی تھی اپنے عوام کی سیاسی و معاشی آزادی کی راہ میں اس درجہ حائل ہو گئی کہ نو آبادیاتی دور کے ہتھکنڈے بھی ماند پڑ گئے۔ جون ایلیا نے آزادی کی موہومیت پر ماتم کیا اور وہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ اگر آزادی یہی ہے کہ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کی جان و آبرو کے دشمن ہو جائیں تو پھر غلامی کیا ہوتی ہے۔

ان کی نظم 'آزادی' اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اپنے ہاتھوں اُجڑ رہا ہے چمن
دلِ ما شاد و چشمِ ما روشن
بڑھ گئی اور چاک دامانی
جب سے حاصل ہیں رشتہ و سوزن
نہیں ہر گز مآلِ فصلِ بہار
گل کی بے جا ہنسی کا پھیکا پن
اب خزاں کو نہ دے کوئی الزام
جل رہا ہے بہار میں گلشن
نظمِ فطرت، یہ کیا قیامت ہے
چاندنی رات اور چاند گہن

ایک اور نظم 'چشمک انجم' (جشنِ آزادی کے موقع پر) سے اقتباس۔

حیاتِ نو، تری جیبِ اجل دریدہ میں
کیا تھا رشتۂ انفاس سے رفو ہم نے

ہو صرف چشمکِ انجم نصیب خوش نظری
یوں ہی تو کی تھی شعاعوں کی جست جو ہم نے
یہی کہو، ہمیں لب تشنگی ہی راس آئے
پیا ہے زہرِ ملامت کنار جو ہم نے
خود اپنے آپ کو الجھا لیا، یہی تو کیا
سنوار کر تری زلفوں کو مو بہ مو ہم نے
نگاہ میں کوئی صورت، بہ جز غبار نہیں
یہ وہ بہار نہیں ہے یہ وہ بہار نہیں

یہ وہ پس منظر ہے جس نے جون کے نظریات کو حتیٰ کہ تصورِ محبت کو بھی متاثر کیا ہے۔ 1947ء سے 1957ء تک کی نظموں میں انسانی رشتوں کی اتھل پتھل نے انھیں روایتی طرزِ فکر اور روایتی اقدار کی بوسیدگی کا قائل کر دیا تھا اور وہ 1957ء تک اس خیال کے حامی ہو گئے تھے کہ قبائے انسانی کے ساتھ ساتھ خود تصورِ انسان میں انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

'اذیت کی یادداشت' کی ابتدائی سطروں پر غور کیجیے۔ آپ 'منظروں کی نگاہوں میں وہ ناشناسی' دیکھ پائیں گے جس سے ہونے یا نہ ہونے کی بابت بھی وسوسے پیدا ہو جاتے ہیں۔

موسمِ جسم و جاں، رائگاں
دل زمستاں زدہ طائرِ بے اماں
جس میں اب گرمیِ خوابِ پرواز تک بھی نہیں
دم بہ دم اس گزشتہ میں برباد جانے کا احساس
جو ناگزشتہ کی سعیِ تلافی سے نومید ہے

اس نظم کی ہر سطر میں، دل زمستاں زدہ طائرِ بے اماں، گرمیِ خوابِ پرواز، گزشتہ میں برباد اور ناگزشتہ کی سعیِ تلافی جیسی تراکیب کی تمنائیں جس کرب و احساس کی قابلِ ادراک کیفیات ہیں وہ جون ایلیا کے یہاں بہت حقیقی ہیں۔ یہ محض بے خوابی کا استعارہ نہیں بل کہ محض بے خوابی ہے۔ غالباً بہت ہی فعال ذہن کی ناآسودگی کا کرب ہے۔ جون ایلیا جاننے کی حد تک سب کچھ جانتا ہے لیکن محض اپنی آگہی کی بنیاد پر تاریخ کی عنان

اپنے ہاتھ میں نہیں لے پاتا۔

'برجِ بابل' بنو اسرائیل کے دورِ اسیری کے بعد یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کے بیان سے ایک ایسا استفادہ ہے کہ جاں کنی کی اذیت میں زندہ رکھے جانے والے لوگوں کی صورتِ حال کا سفاکانہ انداز میں مرقع پیش کرتا ہے۔ اسے حیرت ہے کہ خداوند اس صورتِ حال میں کس طور آسودہ رہ سکتا ہے۔

'سوفسطا' بھی جون ایلیا کے وسیع و بسیط علمی پس منظر کی نشان دہی کرتی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب سب کچھ ثابت کیا جا سکتا ہو، وہ کہتا ہے کہ۔

لفظ معنی سے برتر ہیں
میں قبلِ سقراط کے سب زباں ور حکیموں
کے سر کی قسم
کھا کے کہتا ہوں
یہ میری اغلوطہ زائی نہیں
ژاژ خائی نہیں
لفظ برتر ہیں، معنی سے معنائے ذی جاہ سے
اور وہ یوں کہ معنی تو پہلے سے موجود تھے
سُن رہے ہو! میں واہی تباہی نہیں بک رہا
اپنی بستی کا سر شور، بے ہودہ گفتار دیوانہ 'جوداگرم'
اپنے ہیجانِ معنی کی حالت میں
علامہ ایلیا سے کسی طور بھی کم نہ تھا

اس نظم میں اغلوطہ زائی، معنائے ذی جاہ۔ ہیجان معنی، اجتہادِ تکلم کی تراکیب جون ایلیا کے فنِ ترکیب سازی کا کمال ہیں۔

جون ایلیا ایک ایسے شاعر ہیں جو کائنات اور انسان کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کی سوچ میں بے پناہ سریت دَر آتی ہے، یوں لگتا ہے کہ وہ وجودِ انسانی اور خود کائنات کے کسی بھی متعین معنی سے روگرداں ہیں لیکن جب وہ انسان اور سماج کے حوالے سے سوچتے

ہیں تو وہ جدلیاتی مادیت کے تاریخی تصور سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور اشتراکیت کے مبلغ ہو جاتے ہیں جون ایلیا کے یہاں وہ سارے تضادات اور لہریں موجود ہیں جو صرف اس دانش ورکا خاصہ ہیں جو شعور کی رو پر بندشیں باندھتا ہے۔اس کی فکر کا مجموعی دھارا بل کہ زیادہ حاوی دھارا، انسان دوستی کے خمیر میں گندھا ہوا ہے۔وہ ناگزیر حد تک انسان دوست ہے لیکن اسے اس دنیا میں جہاں جہاں انسان پابۂ زنجیر نظر آتا ہے وہ اس کا ایک سبب انسانی استحصال کے ساتھ ساتھ اس کائناتی جبر میں بھی دیکھتا ہے جس نے انسانی کرّے کو بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا ہے۔اس کی نظم 'اعلانِ رنگ' یکم مئی کے موضوع پر ہے۔وہ کہتا ہے کہ خواب صرف خوشیوں ہی کے حصے میں نہیں آتے بل کہ غموں کے بطن سے بھی پھوٹتے ہیں۔

الم نصیبو! بہادری سے، ستم نصیبو! بہادری سے
صفوں کو اپنی درست کر لو کہ جنگ آغاز ہو چکی ہے
یہ زندگی خون کا سفر ہے اور ابتلا اس کی رہ گزر ہے
جو خون اس سیلِ خوں کی موجوں کو تند کر دے وہ نام ور ہے
یہ خون ہے خون سرزنندہ، یہ خون زندہ ہے خونِ زندہ
وہ خون پرچم فراز ہوگا جو خونِ زندہ کا ہم سفر ہے

'جشن کا آسیب' بھی اس حصہ نظم کی اہم تخلیق ہے۔

سکوتِ بے کراں میں سہ پہر کا چوک ویراں ہے
دکانیں بند ہیں
سارے دریچے بے تنفس ہیں
در و دیوار کہتے ہیں
یہاں سے ایک سیلِ شعلہ ہائے تند گزرا ہے
پھر اس کے بعد کوئی بھی نہیں آیا
خموشی کوچہ و برزن میں فریادی ہے
کوئی تو گزر جائے
کوئی آوازِ پا آئے

'سلسلہ تمنا کا' 'شاید' 'رمزِ ہمیشہ' اور شہرآشوب کا مطالعہ کیجیے۔ حق تو یہ ہے کہ جن احساسات سے پیکر لفظی نے ان نظموں کو تراشا ہے وہ اس قدر اچھوتے ہیں کہ سطر کے بعد سطر پڑھتے چلے جایئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان نیم کائناتی، نیم سیاسی اور نیم سماجی نظموں کے لیے ایک ایسا ڈکشن وضع کیا گیا ہے جو نامانوس طرزِ ادا کی راہ میں رکاوٹیں دُور کر دے۔ کاش ان نظموں کے ساتھ راموز (نئی آگ کا عہدنامہ) بھی شاملِ اشاعت ہوتی (جو تاہنوز) دو تین ہزار سطروں کے باوجود نامکمل ہے) تو جون ایلیا، کی نظم گوئی کا ایک مہتم بالشان حصہ آپ کے سامنے ہوتا۔ یہ نظم ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شایع ہونی چاہیے[1] اگر آپ 1958ء سے 1988ء تک کی نظموں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہوگا کہ 'راموز' کا جون ایلیا اس مجموعے میں شامل نظموں میں بکھر گیا ہے لیکن اس مجموعۂ کلام میں جون ایلیا کی فکر اور مخصوص شعری لغت پوری طرح محفوظ ہے۔

جون نے اس حصے میں ایک غیر رومان پسند بل کہ ملامتی Anti Hero شاعر کی حیثیت سے بعض بہت ہی خوب صورت اور دل نشین مختصر نظمیں بھی پیش کی ہیں۔ 'دوئی' اس طرح شروع ہوئی ہے۔

بوئے خوش ہو، دمک رہی ہو تم
رنگ ہو اور مہک رہی ہو تم
بوئے خوش! خود کو رو بہ رو تو کرو
رنگ! تم مجھ سے گفت گو تو کرو
میری جاں! ایک دوسرے کے لیے
جانے ہم ناگزیر ہیں کہ نہیں
تم جو ہو تم ہو، میں جو ہوں میں ہوں
دل ہوا ہے سکوں پذیر کہیں

'تعاقب' بھی محبت کی سرشاریوں کے حوالے سے عجیب قسم کی بازگشتوں کی نشان دہی کرتی ہے۔

---

[1] یہ نظم ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شایع ہو چکی ہے۔

مجھ سے پہلے کے دن
اب بہت یاد آنے لگے ہیں تمھیں
خواب و تعبیر کے گم شدہ سلسلے
بار بار اب ستانے لگے ہیں تمھیں
دکھ جو پہنچے تھے تم سے کسی کو کبھی
دیر تک اب جگانے لگے ہیں تمھیں
اب بہت یاد آنے لگے ہیں تمھیں
اپنے وہ عہد و پیماں جو مجھ سے نہ تھے
کیا تمھیں مجھ سے اب کچھ بھی کہنا نہیں؟

ایک تین سطری نظم 'بے اثبات' کا تاثر ملاحظہ فرمایئے۔

کس کو فرصت کہ مجھ سے بحث کرے
اور ثابت کرے کہ میرا وجود
زندگی کے لیے ضروری ہے

'اجنبی شام' 'اس رائگانی میں' 'مگر یہ زخم یہ مرہم' 'سزا' 'نوائے درونی' 'دریچہ ہائے خیال' اور 'معمول' جون ایلیا کی بہت مقبول نظمیں ہیں۔ ان پر داد و تحسین کے اس قدر ڈونگرے برس چکے ہیں کہ بہت سے وہ قارئین جو ایک زمانے میں ان نظموں کے براہِ راست سامعین تھے ان نظموں سے ایک بار پھر متاثر ہوں گے۔ یہ نظمیں جذباتی ضرور ہیں لیکن خیال کی رعنائی اور لہجے کی بلوغت نے انھیں محض جذباتی ہونے سے بچالیا ہے۔ جب ہم جون ایلیا کی نظم 'بس ایک اندازہ' پڑھتے ہیں تو ایک عجیب سی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں، پہلے نظم ملاحظہ کیجیے۔

برس گزرے تمھیں سوئے ہوئے
اُٹھ جاؤ، سنتی ہو، اب اُٹھ جاؤ
میں آیا ہوں
میں اندازے سے سمجھا ہوں

یہاں سوئی ہوئی ہو تم
یہاں، روے زمیں کے اس مقامِ آسمانی تر کی حد میں
بادہائے تند نے
میرے لیے بس ایک اندازہ ہی چھوڑا ہے

اس نظم سے فوری طور پر ایک ہی تاثر اُبھرتا ہے کہ کسی بہت ہی عزیز رشتے کی تڑپ ہے۔ آسمانی تر کی ترکیب اُردو شاعری میں پہلی بار استعمال ہوئی ہے اور روئے زمین پر آسمانی تر وجود سے رشتے کی نوعیت طے ہو جاتی ہے۔ میرے علم میں ہے کہ اس نظم میں مقامِ آسمانی تر میں آسودہ خاک وجود جون ایلیا کی والدہ محترمہ ہیں۔

یہ تھا حصہ نظم، اب میں حصہ غزل کی طرف آتا ہوں۔ مبسوط جائزہ ممکن نہیں ہے۔ ہر غزل ایک ایک شعر کی تشریح چاہتی ہے اور خصوصیات کے ساتھ جب یہ کہنا مقصود ہو کہ جون نے اُردو غزل میں جن مضامین کو برتا ہے، وہ قدیم تو قدیم بیش تر جدید غزل گو حضرات کے فکری پندار کے لیے بھی شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر جون کا مطالعہ صرف اس زاویۂ نظر سے کیا جائے کہ وہ کون کون سے مضامین اور ان کے بھی تہ در تہ زاویے ہیں جو صرف جون ایلیا کے یہاں شاعری بنے ہیں تب بھی جون ایلیا ایک غیر معمولی وژن اور طاقت کے لطیف شاعر قرار پائیں گے۔ حصہ غزل جون ایلیا کی شاعری کا اسی قدر طاقت ور حصہ ہے جتنا کہ حصہ نظم۔ ان کی غزل گوئی دو واضح حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتداء 1957ء تک اور 1957ء سے تا حال۔ جون ایلیا کی غزل اور نظم کے مضامین میں کافی حد تک یک سانی ہے۔ ایک بے آرام، انتہائی حساس، انسان دوست ادیب جو جگہ جگہ انسان کو پابندِ رسوم و قیود دیکھتا ہے۔ وہ انقلاب آفرینی کی طرف مائل افراد میں بھی ایک غیر فکری اور غیر تخلیقی بل کہ غیر سائنسی رویہ دیکھتا ہے اور پھر یہ کہتا ہوا ملتا ہے کہ جس قافلے کے جرس کا شور سنتے سنتے ایک مدت گزر گئی اس قافلے ہی میں وہ 'رہ زن' تو نہیں جنھوں نے صبحِ انقلاب کو صبحِ قیامت کا طول دے دیا ہے اور وہ محض قوم پرستی کے لیے عذرِ معقول کی تلاش میں بین الاقوامیت پسند نظر آنے کے لیے تگ و دو کرتے رہتے ہیں۔ جون کا رویہ سائنسی ہے اور اس لیے وہ ترقی پسندی کے عقل و فکر سے عاری ملاؤں کے ادراک سے باہر ہے۔

جون ایلیا کی غزل مندرج اہم مضامین کے گرد گھومتی ہے۔

'شوق' کے حق میں فیصلے ہی کی صورت یہ ہے کہ جون کے یہاں تشکیک،

-2 انکار (مشروط اقرار) اور واحد متکلم کی شاعری کا آغاز کیا گیا ہے۔ ایک نظام فکر کے تتبع میں، جون کے یہاں 'میں' اسٹیفن اسپنڈر کے یہاں 'جدید' کی تعریف کے تحت آتا ہے۔ جون کے یہاں اس واحد متکلم کی پہلی غزل کا مطلع یہ ہے۔

ایذا دہی کی داد جو پاتا رہا ہوں
ہر ناز آفریں کو ستاتا رہا ہوں

-3 جون نے واحد متکلم کے لیے درکار فکری جھکاؤ کے تحت انتہائی کھردرے لہجے میں شاعری کی ہے۔ جون کی غزل کی گائیکی تو در کنار اس کی غزل کا گنگنانا تک مشکل ہے۔ وہ مانوس فکری Structures کی نفی کرتے ہیں۔ غالب سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی میر کے اثر میں زیادہ ہیں۔ بسا اوقات کوئی شاعر فکری طور پر نزدیک شعرا سے زیادہ مختلف فکر کے شاعر سے زیادہ قریب ہو سکتا ہے۔ جون ایلیا کے یہاں Negative Capability سب سے زیادہ ہے۔ خیر و شر، خوب و زشت، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ اور اول و آخر کے مباحث جس انداز میں ان کی شاعری میں گتھے ہوئے ہیں وہ جدید اُردو شاعری کی حد تک بالکل منفرد شعری رویہ ہے لیکن فکری طور پر وہ صرف ترقی پسند نہیں بل کہ انقلاب پسند ہیں۔

-4 جون نے شعری زبان کی محدودات کو اپنی فکر کی محدودات بنانے سے شعوری اجتناب کیا ہے۔ ان کے یہاں شعری زبان کی خلاقیت اعلیٰ درجے کی ہے۔ جون ایلیا کی غزل ہیئت کی حد تک، غزل ہی ہوتی ہے۔ ان کے یہاں تو 'دوغزلہ' بھی نظر آتا ہے لیکن وہ ان غزلوں میں عموماً جس ذہنی کرب سے گزرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں وہ خالصتاً فکری شاعری کا خاصہ ہے۔ 1957ء تک کی غزلوں میں جون ایلیا کے یہاں ایک عاشق خود آگاہ بل کہ ایک روشن خیال عاشق کا عشق کارفرما تھا جو عشق کی مختاری کے ساتھ ساتھ حسن کی مجبوریوں کو نظم کرتا ہوا ملتا ہے۔ ان غزلوں میں 'خود آگاہی' کی منزل ہے، آشوبِ آگہی کا معاملہ نہیں ہے۔ میری دانست میں جون کی شاعری کا بنیادی مطالعہ میر اور غالب کے مابین

فرق سے پھوٹتا ہے۔ جون غالب پر میر کو فوقیت دیتے ہیں۔ میر، ان کے خیال میں، کسری (Fractional) شاعر نہیں ہے۔ وہ پوری زندگی کی کلیت کا شاعر ہے۔ یہ کہہ لیجیے کہ میر کے یہاں وہ سب کچھ ہے جو زندگی سے عبارت ہے، غیر مدوّن طریقے پر۔ میر اُردو زبان کے امکانات کو کھنگالتے نظر آتے ہیں۔ جون نے امکانات کھنگالنے سے زیادہ نئے در اور راستے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس کا لب لباب یہی ہے کہ وہ بیان کے لیے وسعت سے زیادہ وسعتیں چاہتے ہیں لیکن جون ایلیا کے ساتھ مجبوری یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کی پیش کش میں اس درجہ سرد مہر بل کہ لاتعلق رہے کہ وہ متعدد مجموعوں کے بہ قدرِ کلام تخلیق کرنے کے باوجود 53-1952ء کے بجائے 1990ء میں اپنا پہلا مجموعہ لا پار ہے ہیں اور اسی لیے اس مجموعے میں اوائلی اور درمیانی ادوار کی شاعری کا کچھ حصہ موجود ہے تاکہ قارئین جون ایلیا کے ذہن کی ارتقائی منزلوں سے آگاہ ہو سکیں 1987ء تک کے انتہائی اہم دور کی صرف 17 غزلیں شاملِ اشاعت ہیں۔ ان غزلوں کے مطلعے ملاحظہ فرمایے۔ آپ ان غزلوں میں وہ تمام خصوصیات پائیں گے جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔

ستم شعار، نشانے تلاش کرتے ہیں
کرو گلہ تو بہانے تلاش کرتے ہیں

ذکرِ گل ہو خار کی باتیں کریں
لذت و آزار کی باتیں کریں

دھرم کی بانسری سے راگ نکلے
وہ سوراخوں سے کالے ناگ نکلے

مہک اُٹھا ہے آنگن اس خبر سے
وہ خوش بو لوٹ آئی ہے سفر سے

مستیٔ حال کبھی تھی کہ نہ تھی بھول گئے
یاد اپنی کوئی حالت نہ رہی، بھول گئے

اب جنوں کب کسی کے بس میں ہے
اس کی خوش بو نفس نفس میں ہے

کچھ دشت اہلِ دل کے حوالے ہوئے تو ہیں
ہم راہ کچھ جنوں کے رسالے ہوئے تو ہیں

دل کے ارمان مرتے جاتے ہیں
سب گھروندے بکھرتے جاتے ہیں

ساری دنیا کے غم ہمارے ہیں
اور ستم یہ کہ ہم تمھارے ہیں

ہم غزال اک ختن زمیں کے ہیں
زخم خوردہ کسی حسیں کے ہیں

ترے بغیر بھی فطرت نے لی ہے انگڑائی
چمن میں تیرے نہ ہونے پہ بھی بہار آئی

کبھی جب مدتوں کے بعد اس کا سامنا ہوگا
سوائے پاسِ آدابِ تکلف اور کیا ہوگا

دستِ جنوں کو کارِ نمایاں بھی ہیں عزیز
یاروں کو شہر بھر کے گریباں بھی ہیں عزیز

غم ہائے روز گار میں الجھا ہوا ہوں میں
اس پر ستم یہ ہے اسے یاد آرہا ہوں میں

یہ تلخیاں یہ زخم یہ ناکامیاں یہ غم
ہے کیا ستم کہ اب بھی ترا مدعا ہوں میں

کیا ہے جو غیر وقت کے دھاروں کے ساتھ ہیں
وہ آئے ہم تو اس کے اشاروں کے ساتھ ہیں

ہو بزمِ راز تو آشوب کار میں کیا ہے
شراب تلخ سہی ایک بار میں کیا ہے

ان غزلوں میں ندرتِ خیال بھی ہے اور نئی نئی تراکیب وضع کرنے کا رجحان بھی۔
ان غزلوں میں کسی قدر نادرہ کاری ہے، مندرجہ ذیل تراکیب یا Expressions
ملاحظہ کیجیے۔

ختنِ زمیں، شکنجِ غمِ جہاں
خوش اندیشگانِ عیشِ یقین، برگشتگانِ جادۂ عرفاں، سرگشتگانِ جادۂ عرفان،
نبردکہن، سحررخانِ شبستاں، شہرِ شاروشور، وغیرہ۔
مجموعے میں شامل غزلوں کی تراکیب کا ایک اپنا فنِ تعمیر ہے یہاں Approximation
کے بجائے ایک Defination ہے۔ فکر اور اظہار کا فرق زبان پر قدرت ہی کے

ذریعے کم کیا جا سکتا ہے ورنہ ہم اپنی تمام تر کاوشوں کے باوجود صرف اپنے مافی الضمیر سے قریب تر ہونے کی سعی کر سکتے ہیں اور بس۔ میں نے جون ایلیا کے یہاں 'عشق' اور 'شوق' کے حوالے سے شعری زبان کے ساتھ مخصوص برتاؤ کا ذکر کیا تھا؟ پہلے ہم میر کے چند اشعار لیتے ہیں۔

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

عشق کیا کیا ہمیں سکھاتا ہے
آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو

عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

کیا بلا چیز ہے یہ کوچۂ عشق
تم بھی یاں میر ایک گھر لے لو

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

میر نے عشق کے ساتھ ادب کی شرط لگائی تھی۔ جون ایلیا نے فکری گنجائشیں نکالنے کے لیے 'شوق' کے تصور کا انتخاب کیا ہے۔ عشق فنا ہے، سپردگی ہے، گریہ ہے، ماتم ہے اور شوق وجود ہے۔ عشق اور شوق میں 'فنا' اور 'وجود' کا فرق ہے اور وجود بھی کرب ناک اور اذیت ناک۔ جون ہر Formulation کو چیلنج کرتے ہیں سوائے ایک Formulation کے۔ شرفِ انسانیت کے لیے کام کرنا اور شرفِ انسانیت کو خیر اور حسن بنانا اور سمجھنا ہی سب سے بڑا کام ہے۔ جون کے یہاں 'شوق' کوئی تاثراتی Trigger نہیں ہے بل کہ اس تبدیلی کے پسِ پشت عصرِ حاضر کا وہ شعور ہے جو

جنگِ عظیم دوم کے بعد سے اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ مغربی تہذیب کی ناقابلِ تسخیر پوزیشن نے پرانی ثقافتوں اور تہذیبوں میں پس پائی کے جس عمل کو فروغ دیا ہے، جون اس کے خلاف شعوری طور پر مدافعت کرتے ہیں۔

جون ذہناً جدید تہذیبی ترجیحات کے لحاظ سے قابلِ داد، عرب و ایرانی ماضی کے حدی خواں اور تشکیک و انکار کے نغمہ گر ہیں۔ ہر چند کہ تشکیک و انکار کا رجحان ہماری شعری لغت میں پیدائشِ نغمہ سے محروم رہا ہے لیکن جون ایلیا نے فکر کی نغمگی پر بہت زور دیا ہے۔ اس عہد کے افکار کی سانسیں اور خراشیں اکھڑی اکھڑی ہیں۔ مانوس نغمہ مر چکا ہے اور متبادل نغمہ ابھی تک معرضِ تخلیق میں نہیں آسکا ہے۔ اگر مغرب سے درآمد شدہ نغمے کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو اب ہم اپنی شاعری کی مانوس بحروں اور اوزان کے ساتھ مانوس موسیقی سے بھی ہاتھ دھو چکے ہیں۔ تبدیلی کا عمل نامانوس کو آہستہ آہستہ مانوس بناتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی روایتی دشمن اپنے ارتقا کے Impetus میں ہمارا دوست بن چکا ہوتا ہے اور ہمیں اس تبدیلی کا احساس بہت دیر میں ہو پاتا ہے۔ وہ اپنے باطن کے تناؤ اور کشمکش کو 'شوق' ہی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ ماورائی عشق کے مقابلے میں مادی شوق ہی بہت سے سچ سامنے لاتا ہے اور جون کی شاعری میں شوق کی پہلی منزل یہ ہے کہ۔

کرتا ہے ہا ہو مجھ میں
کون ہے بے قابو مجھ میں
یادیں ہیں یا بلوا ہے
چلتے ہیں چاقو مجھ میں
آدم، ابلیس اور خدا
کوئی نہیں یک سو مجھ میں

ان کے یہاں 'شوق' کی عمل داری کے کچھ اور نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

کتنے ہی نشہ ہائے ذوق، کتنے ہی جذبہ ہائے شوق
رسمِ تپاکِ یار سے رُوبہ زوال ہو گئے

جادۂ شوق میں پڑا قحط غبار کارواں
واں کے شجر تو سر بہ سر دست سوال ہو گئے

شکل بھی اک رنگ کی ہو، رنگ کی شب، ہم نفسو
شوق کا وہ رنگِ بدن آئے گا کب، ہم نفسو

خیرہ سرانِ شوق کا کوئی نہیں ہے جنبہ دار
شہر میں اس گروہ نے کس کو خفا نہیں کیا

اے شجرِ حیاتِ شوق، ایسی خزاں رسیدگی
پوششِ برگ و گل تو کیا جسم پہ چھال بھی نہیں

اے مرے شوق کی اُمنگ، میرے شباب کی ترنگ
تجھ پہ شفق کا سایباں، شام بخیر، شب بخیر

گزار اے شوق اب خلوت کی راتیں
گزارش بن، گلہ بن، گفت گو بن

دشت میں رقصِ شوقِ بہار اب کہاں باد پیمائی دیوانہ وار اب کہاں
بس گزرنے کو ہے موسمِ ہائے و ہو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

خوب ہے شوق کا یہ پہلو بھی
میں بھی برباد ہو گیا تو بھی

شوق کا تہ در تہ استعمال آپ کے سامنے ہے، اب آپ ان کے یہاں عشق کے بارے میں جو روّیہ ہے، ذرا اسے دیکھیے۔

عشق کو درمیاں نہ لاؤ کہ میں
چیختا ہوں بدن کی عسرت میں
روح نے عشق کا فریب دیا
جسم کو جسم کی عداوت میں

جون ایلیا عشق کے اس روایتی تصور کے خلاف ہیں جس میں ماورائیت کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ وہ جسم بل کہ ناف تک کے بارے میں اس طرح سوچتے ہیں جیسے ناف ہی کے گرد اجرامِ علوی گردش کر رہے ہوں۔ جون خالصتاً جسمانی عشق کے لیے شوق استعمال کرتے ہیں۔ اپنے منفرد تصورات کے لیے مطلوبہ شعری زبان کی تخلیق جان جوکھم کا کام ہے۔ بڑی شاعری کا سب سے بڑا امتحان ہی یہ ہے کہ اس نے زبان کو کیا کچھ دیا ہے۔ اگر میں جون ایلیا کی تراشیدہ تراکیب کی ایک مختصر فہرست پیش کروں اور وہ بھی صرف 1958ء کے بعد کی غزل کے حوالے سے تو یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکے گی کہ جون ایلیا نے ہم عصر شاعروں میں غالباً سب سے زیادہ تراکیب تخلیق کی ہیں اور یہ محض تخلیق برائے تخلیق والا معاملہ نہیں ہے جون ایلیا اول و آخر ایک فکری شاعر ہیں اور ان کی فکر Establishment سے اس قدر متصادم ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کے ہوا خواہ جون ایلیا کے فکری نظام کا اثبات اس لیے بھی نہیں کرتے کہ اس 'ایمان دارانہ' رویے کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی۔

چند تراکیب ملاحظہ فرمائیے۔

سبز ملال، راہ گریز پائی، شگافِ رنگ، ماجرا فروش، رنگِ بدن، شعلۂ لب، معنی بالائے سخن، سخن سوز، تمنا نفسی، گامِ سفر، پائے سیر، زخمِ ساماناں، سرکوئے درازِ مژگاناں، انبوہِ نار پستاناں، صندلیں راناں، لمحہ مہماناں، خراباتیانِ خرد باختہ، زیرِ محرابِ ابرواں، زخم کے خرمن، زخم انگیز، خراشِ امید، عمدہ خوانِ میزباں، رنگ مست، پرتوِ زخمِ خوں چکاں، بے داغ داماناں، حسابِ رفتہ و آئندہ گماں، خونیں دلانِ مرحلہ امتحاں، مستیِ حال، حالتِ گفت گو، دکانِ دید، مژگاں شماراں، تارتاراں، خوش گزرانِ شہرِ غم، خوش نفسانِ تلخ جام، وادیِ غم کے خوش خرام، صرصرِ بے اماں، زہر بہ جام ریختہ،

زخم بہ کام بیختہ، عشرتیانِ رزقِ غم، خودنگرانِ دل زدہ، دل زدگان خودنگر، کوچۂ التفات، فردِ حساب ماہ وسال، زخمِ تازہ داراں، وجہِ معاش بے دلاں، بانو شہر جسم وجاں، ہجر حیات شوق، خیمہ گہہِ نگاہ، حضرت زلفِ غالیہ افشاں، زخمِ داران رہ دار، متاع بردہ کم نظراں، شب فتنہ، خیرہ سرانِ شوق، تذکرۂ نجستہ، آب وہوا، فرطِ حفاظت، ناداریٔ نگاہ، زرد منظری، طغیان رنگ، رسم تپاکِ یار، گردِ ملال، ورزشِ فرضِ محال اور قحطِ غبار کارواں وغیرہ۔

اب میں جون ایلیا کے چند اشعار بہ طور خاص نقل کروں گا۔ ان میں مضوعات کے اعتبار سے ان کا اسلوبِ فکر بہت واضح طور پر دوسروں سے جدا ہے۔ ان کی تخلیقی بالیدگی اور لسانی قدرت ایک دوسرے سے پوری طرح پیوست ہیں۔

1- سب سے پہلے جون ایلیا کا مخصوص Vision وہ مظاہر کی درستی اور نادرستی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

فی زمانہ مظاہر کے درست نظر آنے ہی میں بدی اور بدصورتی کے ہاتھ فکری سمجھوتا، شروع ہوجاتا ہے۔

وہ کار گاہ ہوں جو عجب نادرست ہے
جو کچھ یہاں درست ہے، بے جا درست ہے
میں کیوں بھلا قضا و قدر سے برا بنوں
ہے جو بھی انتظام خدایا درست ہے
ہے نیم منکروں کی معاش اس سوال پر
جب کچھ نہیں درست تو پھر کیا درست ہے

اس شہر کی حفاظت کرنی تھی ہم کو جس میں
آندھی کی تھیں فصلیں اور گرد کا مکاں تھا

2- جون ایلیا، منزل سے دوری کے بارے میں بہت کچھ سوچتے ہیں اور کہتے ہیں۔ وہ خود تنقیدی سے بھی نہیں چوکتے۔

مجنوں پسِ مجنوں ہے بے شورِ فغاں اے وا
محمل پسِ محمل ہے بے لیلیٰ محملہا
گردابِ عبث میں ہم اُس موج پہ مائل ہیں
جو موج کہ یاراں ہے دور افگن ساحلہا

گامِ سفر نے خوار کیا پائے سیر کو
منزل نہ درمیاں ہو تو رستہ درست ہے

کیسے پہنچے غنیم تک یہ خبر
گھر گیا ہوں میں اپنے لشکر میں

اے بہارِ انتظارِ فصلِ گل
وہ گریباں تار تاراں کیا ہوئے
سو رہا ہے شام ہی سے شہرِ دل
شہر کے شب زندہ داراں کیا ہوئے
اب تو اپنوں میں سے کوئی بھی نہیں
وہ پریشاں روزگاراں کیا ہوئے

3- اور فراق کے موضوع پر یہ عجیب و غریب شعر۔

وصل تو کیا نہیں نصیب ہمیں
اب تمھارا فراق تک جاناں

4- خود تنقیدی کے بعد خود تضحیکی بھی جون ایلیا کا ایک مخصوص وصف ہے۔

میں تو ایک جہنم ہوں
کیوں رہتا ہے تُو مجھ میں

ہمارا عمر بھر کا ساتھ ٹھہرا
سو میرے ساتھ تُو دن بھر نہ رہیو

دشتِ گماں میں ناقہ لیلیٰ تھا گرم خیز
شہرِ زیاں میں قیس اسیرِ عیاں تھا

میں اور پاس وضعِ خرد کیا ہوا مجھے
میری تو آن ہی مرے دیوانہ پن میں تھی

ہر دم اپنی زد پہ ہوں
جائے اماں ہوں میں یا میں
میری دوئی ہے میرا زیاں
اپنا زیاں ہوں میں یا میں

جب ڈوبتا چلا میں تاریکیوں کی تہ میں
تہ میں تھا اک دریچہ اور اس میں آسماں تھا

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا نئیں

گزر آیا میں چل کے خود پر سے
اک بلا تو ٹلی مرے سر سے
نہیں بد تر کہ بدترین ہوں میں
ہوں خجل اپنے نصف بہتر سے

ایک جہانِ نامعلوم

محمود شام

جون ایلیا۔ اس عہد کے نہیں تھے جس میں وہ اُتارے گئے۔
جگر مراد آبادی، ساغر صدیقی، جوش ملیح آبادی، مجروح سلطانپوری، فراق گورکھپوری، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، اختر شیرانی، فارغ بخاری، اصغر گونڈوی، ریاض خیر آبادی، اُن کے ہم عصر ہو سکتے تھے۔ اُن کی بدقسمتی۔ ہماری خوش قسمتی کہ وہ ہمارے زمانے میں سانس لیتے رہے۔ ان کا دل زخم زخم رہا۔ ذہن میں طوفان برپا رہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو 'جون' سے صحبت نہ رہی

'میر' سے دست بستہ معذرت۔ میر صاحب میں یہ اچھی عادت ہے کہ وہ ہمارا اعتذار قبول کر لیتے ہیں۔ ایک دنیا اُن کی ارادت مند ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ جون، میر کے دَور میں ہوتے تو دونوں میں کتنی قربتیں ہوتیں۔

اس سے کہیو کہ دل کی گلیوں میں
رات دن تیری انتظاری ہے

یہ دو مصرعے سُن کر میر یقیناً والہانہ داد دیتے۔
جون کو ہم ناقدروں کا عہد ملا۔ ہم تو زر، زمین اور زن کی خواہش میں بھاگ رہے ہیں۔ کبھی کبھی بھگدڑ مچ جاتی ہے۔

وہ ڈھونڈتے ہیں سرِ جادہ وُامید کیسے
وہاں تو قافلے والوں کی گرد بھی نہ رہی

کتنے ،اکادمی ادبیات پاکستان کی مسند کے لیے بے چین رہتے ہیں۔زندگی کے کتنے قیمتی دن رات اس اضطراب کی نذر کردیتے ہیں۔جن میں وہ کچھ باقی رہ جانے والی غزلیں لکھ سکتے ہیں۔ کچھ ادارہ فروغ قومی زبان کی لیلیٰ کے لیے مجنوں بنے پھرتے ہیں۔ محمل نظر سے نہاں ہوجاتا ہے۔ کچھ اُردو لغت بورڈ کے تخت کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔

نہ تو دل کا نہ جاں کا دفتر ہے
زندگی اک زیاں کا دفتر ہے

ہم ان کی صحبت میں بیٹھتے تھے۔ان کے اشعار سننے کا شرف بھی حاصل کرتے تھے۔اور حالاتِ حاضرہ پر برجستہ جملے۔وہ جو انگریزی میں One liner کہلاتے ہیں۔ محظوظ ہوتے تھے۔ Cheers کہہ کر ایک دو جام اور گھبرا کر پی جاتے تھے۔لیکن ہم میں سے بہت کم ہوں گے جنھوں نے جون کے طلسم کدے میں جھانکنے کی اور اس ہستی کے مختلف پرت کھولنے کی کوشش کی ہوگی۔ ہم میں سے اکثر نے ان کی بے ساختگی، جرأتِ رندانہ پرتو کا ضرور ہوگا۔لیکن اس جذبے کی تہہ تک پہنچنے کی ہمت نہیں کی ہوگی۔جس کا اظہار وہ تخت نشینوں اور نخوت گروں کے خلاف کرلیتے تھے۔ذرا سی کوئی تند لہر آجائے تو ہم اپنے ضمیر۔دماغ اور پندار کے سوئچ آف کردیتے ہیں۔(معاف کیجیے یہاں مجھے ان انگریزی الفاظ میں ہی معانی آفرینی محسوس ہورہی ہے) خوش ہوتے ہیں کہ ہم اس طوفان کی زد میں نہیں آئے۔ حالاں کہ ہم محفوظ رہتے ہیں۔ جون اور ان جیسے بلا نوشوں کی مزاحمت کے باوصف۔

میں بھی اعتراف کرتا ہوں۔اپنی مصلحت کوشیوں کا۔اپنی بے ہمتی کا۔زیادہ کھلے الفاظ میں ابن الوقتی کا۔

جون۔ایک جہانِ نا معلوم تھے اور نا معلوم کی طرف چلے گئے۔اس سیارے کے بارے میں ہمیں وہی کچھ معلوم ہے۔جو مولانا طارق جمیل بتاتے ہیں۔لیکن ہم نے تو جون کے آس پاس ہوتے ہوئے بھی اس جہانِ نا معلوم کو معلوم کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔

شاید، یعنی، گمان، لیکن، گویا، فرنود، تو ان کے اظہار کا صرف ایک پہلو ہے۔ اصل جون تو ان سے ماورا ہے۔ پرانے زمانوں کے پتھروں پر کندہ لکیروں سے ہم اُن میں زندگی بسر کرتے لوگوں کے اطوار و عادات جاننے کو سائنس کہتے ہیں۔ یہ حروف جو شاعری کے ضبط میں شمار کیے جاتے ہیں یہ ان طوفانوں تک لے جاسکتے ہیں جو اس منفرد اور یکتائے روزگار کے ذہن میں اُمڈے رہتے تھے۔ غور کرنے والے اگر فرصت پائیں اور سوچنے کی زحمت کریں تو اس 'شاید' کے پیچھے اثبات۔ 'یعنی' کے عقب میں حروف۔ 'گمان' کے بھیس میں یقین۔ 'لیکن' کے پس پردہ ایقان۔ 'گویا' کے پس منظر میں ایجاد۔ 'فرنود' کے دھندلکوں میں روشنی مل سکتی ہے۔ مگر کوئی قدم تو بڑھائے۔

یہ آواز آپ سن رہے ہیں۔ ''ہم ایک ہزار برس سے تاریخ کے دستر خوان پر حرام خوری کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے۔''

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا

ہم ایسے رندوں کی جلوت میں تو محض لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی خلوت سے خوف زدہ رہتے ہیں ان سے اصل ملاقات تو تنہائی میں ہی ہوسکتی ہے۔ کچھ محفلیں یاد آتی ہیں۔ حفیظ با حلیم بہت سخن شناس اور ادب دوست۔ جون کے گرویدہ۔ ایک دو بار اس مجلس میں شرکت کی خوش نصیبی میسر آئی۔ سب کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ جون بھائی کو جی بھر کے سنا جائے۔

کتنی دل کش ہو تم کتنا دل جو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

ہمارے ہم عصروں میں کسی نے بھی بہ یک وقت کئی نسلوں کو جون کی طرح متاثر نہیں کیا ہے۔ جون کے مداحین میں وہ بھی تھے جو ہندوستان کے بھرے شہروں میں اپنے گھربار خود چھوڑ کر آئے۔ وہ بھی جو اُن ستم زدگان کی اولادیں ہیں اور وہ بھی جنھوں نے ان بے خانماؤں کا خیر مقدم کیا۔ مختلف نسلیں زبانیں بولنے والے مختلف درس گاہوں کے فارغ التحصیل۔ پرنٹ میڈیا والے۔ الیکٹرانک میڈیا اور اب سوشل میڈیا پر بھی جون

چھائے ہوئے ہیں۔ ہر نسل کو۔ ہر عمر کے لوگوں کو اُن کی بات سمجھ میں آتی ہے کیوں کہ وہ اُن ہی کی بات کرتے ہیں۔

دن تمہارے کبھی نہیں آئی
کیا مری نیند بھی تمہاری ہے

یہ تجربہ تو ہر ایک کو ہی ہوتا ہے وہ کوئی زبان بولتا ہو۔ دنیا کے کسی بھی علاقے کا مکین ہو۔

اس گلی نے یہ سُن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

کوئی حادثہ ہو جائے، کوئی بم دھماکا، بھگدڑ، زلزلہ، ہمیں صرف اپنوں کی فکر ہوتی ہے۔ کوئی ہمارا عزیز تو اس وقت وہاں نہیں تھا۔ اپنے سب جاننے والوں کو فون کر کے ان کی آواز سن کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ جو اُن حادثوں، دھماکوں سے جان سے گزر گئے۔ ان کا دُکھ ہمیں نہیں ہوتا وہ بھی کسی کے پیارے ہوں گے۔ کسی ماں کے راج دلارے۔ کسی باپ کی آنکھ کے تارے۔

وہ جو بات کرتے۔ شعر عطا کرتے بالوں کو جھٹکا دے کر پیچھے کرتے تھے۔ ہمیں تو ان کی محض ایک ادا لگتی تھی وہ بھی غیر ضروری۔ لیکن اس وقت وہ کتنے غبار، کتنی دھند، اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹانے کی تگ ودو میں ہوتے تھے۔ یہ ہم نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا۔

جون ایلیا اور ہم سب کی عمریں کئی کئی صدیوں کی ہیں۔ ہم میں سے کوئی پانچ ہزار سال سے سانس لے رہا ہے کوئی آٹھ ہزار سال سے۔ موہنجودڑو، مہر گڑھ، ہڑپہ میں ہم اور آپ ہی رہتے تھے۔ یہ صدیاں ہماری رَگ رَگ میں دوڑتی ہیں۔ ہماری سوچوں میں رنگ بھرتی ہیں۔ بہت سے واعظ، زاہد، ان صدیوں کو ہم سے اور ہمیں ان صدیوں سے الگ رکھنے کی شعوری مہم چلاتے ہیں۔ ہمارے 72 سال کو ان صدیوں سے لڑوانے کے لیے دھرنے دیتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر پوسٹیں ڈالتے ہیں۔ ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ ہم صرف آج کے آج ہیں۔ ہمارا کوئی ماضی نہیں۔ ماضی نہیں تو مستقبل بھی نہیں۔

لازم ہے اپنے آپ کی امداد کچھ کروں
سینے میں وہ خلا ہے کہ ایجاد کچھ کروں

ایجاد کی خواہش جون ایلیا کو مختلف صدیوں میں لیے پھری۔ اب بھی ایجاد ہی مطلوب و مقصود ہونا چاہیے۔ ایجاد تحقیق کا نتیجہ ہوتی ہے جون پر تحقیق نئے انداز سے، نئے زاویوں سے وقت کا تقاضا ہے۔ شعبۂ اُردو کے ڈھلے ڈھلائے سانچوں میں نہیں۔ فارمولا تھیسسوں میں نہیں۔ بل کہ اُن آفاق کے تناظر میں جو دنیا بھر میں تسخیر کیے جا چکے ہیں۔ اُردو تنقید کے فرسودہ پیمانوں سے نہیں۔ آج کے جواں سال ذہنوں میں تڑپتے سوالوں کے ساتھ۔

ہے جو بود و نبود کا دفتر
آخرش یہ کہاں کا دفتر ہے

اور سوچنے کا یہ زاویہ۔

ایک ہی مژدہ صبح لاتی ہے
دھوپ آنگن میں پھیل جاتی ہے

دھوپ کو عرب، ایران ہندوستان کے قدیم تناظر میں ایک ستم ایجاد کی بجائے آج کے شمسی توانائی کے حوالے سے دیکھیے تو جون کے جہانِ نامعلوم میں ہم معلوم کی طرف سفر کر پائیں گے۔

جون بھائی

مشتاق احمد یوسفی

عرض ہے کہ پانچ دن قبل ڈاکٹر فاطمہ حسن نے دعوتِ کلام قبل از طعام دی تو میں نے اپنا وہی پرانا عذر دہرایا۔ جو کثرتِ استعمال کے باعث اب عذر تک نہیں رہا۔ میرا مطلب ہے اب دونوں ٹانگوں میں لنگ نظر آتا ہے۔ وہ عذر یہ تھا کہ بی بی میں گوشہ نشین بل کہ پردہ نشین ہوں، ایک مدت سے حجرۂ اعتکاف میں ہوں۔ بولیں اعتکاف تو مسجد میں ہوتا ہے حجرے میں نہیں، اپنے حجرے کو مسجد سمجھنا چھوڑ دیجیے اور باہر آئیے۔ ایک اور بے تکلف دوست نے پوچھا کہ تم نے اپنا یہ حال کیوں بنا رکھا ہے؟ عرض کیا کہ وجہ پردہ نشینی یہ ہے کہ اس قوم پر ڈکٹیٹر، آمر، جابر ایوب خان، ضیاء الحق، اور پرویز مشرف کیے بعد دیگرے نازل ہوتے رہے ہیں۔ ہر شریف مرد پر ان سے پردہ اور پناہ لازم ہے۔ منیر نیازی نے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

صورتِ حال کو اور بھی واضح کرنے کی غرض سے میں نے اس شعر میں تحریف کردی اور وہ یہ کہ ایک اور چیتے کا سامنا تھا منیر مجھ کو...... میں ایک چیتے کے منہ سے نکلا تو میں نے دیکھا۔ معاف کیجیے بات کچھ اور ہو رہی تھی چیتے بیچ میں کود پڑے۔ وہ بھی اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ فاطمہ کہنے لگیں...... کہ جون ایلیا پر ایک مختصری تقریر آپ کو کرنی ہوگی۔ عرض کیا میں اتنے مختصر نوٹس پر مختصر تقریر نہیں کر سکتا۔ امریکا کے نامور صدر روڈ وولسن سے کسی نے پوچھا کہ دس منٹ تقریر کرنی ہو تو آپ کو تیاری کے لیے کتنی مدت درکار ہے؟ اس نے

جواب دیا دو ہفتے۔ اس نے پوچھا کہ ایک گھنٹے کی تقریر کے لیے کتنا وقت چاہیے؟ ولسن نے کہا ایک ہفتہ۔ پوچھنے والے نے پھر پوچھا کہ اگر دو گھنٹے تقریر کرنی ہو تو تیاری کے لیے کتنا وقت چاہیے؟ فرمایا اسی وقت کر سکتا ہوں۔ بندہ اسی فارمولے کے مطابق آپ سے مخاطب ہے: فاطمہ حسن کنزفیمینسٹ اور ضد کی پکی ہیں۔ اُردو، عربی، فارسی، پنجابی کسی بھی زبان میں ناں سننے کی عادی نہیں۔ ایسی خواتین کے بارے میں میں اکثر کہتا ہوں...... کہ انھیں تو نکاح خواں قاضی ہونا چاہیے جو ساری عمر صرف قبول ہے قبول ہے سنتا رہتا ہے اور قبول کرنے والوں کے انجام پر مسکراتا بھی رہتا ہے۔ تفصیلات سے آگاہی بخشتے ہوئے فاطمہ نے بتایا کہ آرٹس کونسل میں بڑے پیمانے پر 27 نومبر سے اُردو کانفرنس ہو رہی ہے۔ جون ایلیا کی یاد میں جو تقریب ایک دن پیش تر ہوگی وہ دراصل کانفرنس کی ہی سونٹ اوپننگ ہوگی۔ اب کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگا کہ مجھے کس آزمایشی مرحلے کے لیے گرمایا اور نرمایا جا رہا ہے۔ ناسازیٔ طبیعت کے علاوہ مجھے اس تقریب میں کچھ پڑھنے میں اس لیے بھی تامل تھا کہ اس کے بعد مشاعرے کا اہتمام ہے۔ مشاعرے کی خصوصیت اور خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی صورت، نسل کے دخل اور ملاوٹ کا متحمل نہیں ہوتا۔ انگریزی محاورہ استعمال کرنے کی اجازت ہو تو کہہ سکتے کہ مشاعرہ بلا کی JealousMistress ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ سامعین تو شعر سننے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اور شعرا کے درمیان کسی کے بھی حائل ہونے کے روادار نہیں۔ تقریر خواہ مشاعرے سے پہلے ہو یا بعد میں باعثِ سمع خراشی اور محرکِ فی البدیہہ ہوٹنگ ہوتی ہے۔ مشاعرے سے پہلے تقریر سامعین کو اتنی ہی ناگوار گزرتی ہے جتنا طویل خطبۂ نکاح دولھا پر گراں گزرتا ہے، اسے جلد از جلد رخصتی کی پڑی ہوتی ہے۔ اور عافیت نا اندیش مشاعرے کے اختتام پر خطبۂ صدارت کے لیے کھڑا ہو تو اس کی مثال اس میزبان کی سی ہے جو مہمانوں کو انور رٹول آم کھلانے کے بعد یہ کہے کہ اب آپ کراچی کے پپیتے اور لاہور کی گنڈیریوں سے شوق فرمائیں۔ غرض یہ کہ بہ قول مرزا تقریر مشاعرے سے پہلے ہو یا بعد میں اپنی بے عزتی خراب کرانے کی باعزت صورت ہے۔ اس وقت میں اس اندیشے سے اور آپ اسی آزمایش سے گزر رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہمیں تو خود جون ایلیا کے معنی معلوم نہیں، ایک زمانے میں

جب ہم جوان تھے اگر اس بات پر آپ کو یقین آئے تو اور جون ایلیا ایسے ہی تھے جیسے کہ اب ہیں تو ہم رسالوں میں ان کی غزلیں یہ سمجھ کر بڑے شوق اور بے تابی سے پڑھتے تھے کہ یہ کسی آوارہ اینگلوانڈین لڑکی کا کلام ہے۔ پھر ان سے اچانک مسلم کمرشل بینک میں ملاقات ہوگئی جہاں میں کام کرتا تھا۔ رمضان کا مہینا تھا اور اس دن میں حسب معمول روزے سے نہیں تھا۔ مجھے السر کی شکایت تھی اور جون ایلیا کی صحت بھی اتنی خراب تھی کہ پانی تک سے پرہیز کرتے تھے۔ فرماتے تھے غسل کے لیے پانی کارآمد شے ہے بہ شرطے کہ ہفتے میں ایک بار سے زیادہ نہ ہو۔ اس واسطے کہ راحتیں اور بھی ہیں غسل کی راحت کے سوا۔ چناں چہ ان کو اس زمانے میں بھی روزے ہی نہیں اور بہت سے فرائضِ دینی و دنیاوی معاف اور لذائذ حلال تھے۔ تواضع کی غرض سے میں انھیں ایسی محفوظ جگہ لے گیا جہاں ہمارے اور مسلح گارڈ کے علاوہ کوئی قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ یعنی بینک کے لوہا پلائی ہوئی دیواروں اور آہنی سلاخوں والے اسٹرانگ روم میں جس میں چار تجوریاں اور ایک چوہے دان رکھا تھا۔ چوہے دان کو بار بار شک اور خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے تین چار دفعہ مجھ سے پوچھا یہ یہاں کیوں رکھا ہے؟ وہاں ہم دونوں نے چوری چھپے جو چائے پی اس کا مزہ مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا انھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ چائے میں گناہ کی آمیزش ہو جائے تو شراب کا مزہ دیتی ہے۔ اس دوران میں ہم نے جون ایلیا سے ان کے نام کے معنی پوچھے، وہ سمجھے ہم طنز کر رہے ہیں۔ کہنے لگے۔ آپ کو عبرانی آتی ہے؟ میں نے جواب دیا نہیں۔ پھر پوچھا۔ عربی آتی ہے؟ ہم نے سر جھکا کر کہا نہیں۔ بولے مجھے دونوں آتی ہیں۔ یہ عبرانی اور عربی نام ہے۔ اس ناک آؤٹ ضرب کے بعد ہمیں کچھ ہوش آیا تو ہم نے شرارتاً پوچھا کہ Charles Lamb نے اپنے انشائیوں کا نام ایسیز آف ایلیا رکھا تھا، کیا آپ کو اس سے بھی کچھ نسبت ہے؟ اپنی ذہین خمار آلود آنکھوں سے مسکرا چکے تو فرمایا۔ اسے خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ گویا، ان کا اور رئیس امروہوی کا بہت ہی فیورٹ لفظ تھا اور یہ اسے ہر معنی میں بہت جامع طریقے سے استعمال کرتے تھے۔ مرزا کا بیان ہے کہ اب جون ایلیا اتنے کم زور ہو گئے ہیں کہ چلنا پھرنا دوبھر ہے، ان کی چھڑی بھی ایک شاگرد اُٹھائے پیچھے چلتا ہے۔ بالا خانے کے زینے سے صرف

اُتر سکتے ہیں۔ فون بھی ٹھیک سے نہیں ملا سکتے۔ ایک دفعہ کسی ڈنر پر گئے بل کہ لے جائے گئے تھے۔ وہاں سے رات کے بارہ بجے بیگم کو فون کیا تو ادھر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ السلام علیکم آپ کو مطلوبہ سہولت فراہم نہیں کی جا سکتی۔ خود بیان کرتے ہیں کہ میرا ایک میجر عشق اس لیے ناکام ہوا کہ میں اس زمانے میں امرود تک افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ رقیب روسیاہ نے امروہہ میں ہماری مشترکہ محبوبہ کو ایک دن ڈیڑھ سیر امرود پیش کیے۔ اور وہ اس مردود کے ساتھ چلی گئی۔ ایک دن جمال احسانی سے کہنے لگے کہ جانی شاعری کرنا دنیا میں سب سے آسان کام ہے۔ پوچھا استاد کیسے؟؟ بولے مثلاً آپ اسمگلنگ کرنے لگیں تو قوی امکان ہے کہ آپ کو ایک نہ ایک دن گولی ماردی جائے گی لیکن شاعری آپ کتنی بھی خراب کریں کوئی بھی محض شاعری کی وجہ سے آپ پر پونے چار روپے کی گولی ضائع نہیں کرے گا۔ کچھ دن ہوئے گفت گو کے دوران جب انھوں نے کہا کہ میرا پہلا عشق آٹھ سال کی عمر میں ایک قتالۂ عالم سے ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بڑے ادب سے پوچھا کہ ان کی یعنی موصوفہ کی کیا عمر تھی؟ فرمایا چھ سال۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو انگلیوں سے بالوں میں اس طور کنگھی کی کہ وہ اور اُلجھ جائیں پھر فرمایا بلوغت کا عمر سے کوئی تعلق نہیں۔ آب وہوا کا بھی تو کچھ دخل ہوتا ہے۔ آپ نے امروہہ نہیں دیکھا۔ عرض کیا کہ آپ نے بھی تو آٹھ برس کی عمر میں شعر کہا تھا۔ سنِ بلوغت کو پہنچنے سے پہلے سنِ بلاغت کو پہنچ گئے۔ بولے جی نہیں۔ دونوں حادثے ایک ساتھ ہوئے۔ اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں آٹھ برس کا ہوں۔ 23 برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر پاکستان آ گیا تھا۔ عرض کیا آج بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ 77 برس کے ہیں، پونے 77 کے لگتے ہیں۔ میں نے فرمایش کی کہ اپنا پہلا شعر سنائیے۔ فرمایا ملاحظہ ہو۔ شعریت کے بجائے لونڈھار پن ٹپکتا ہے۔ شعر ہے۔ چاہ میں اس کی تمانچے کھائے ہیں...... دیکھ لو سرخی میرے رخسار کی...... اسی نشست میں بھائی جون نے اظہارِ محبت کے طریقے میں وہی جملے دہرائے، جو اپنے مجموعہ 'شاید' کے دیباچے میں لکھ چکے ہیں۔ وہ طریقہ یہ کہ محبوبہ اگر سامنے سے آ رہی ہوتی تو میں اس کی طرف سے منھ پھیر لیتا اس کا مطلب یہ تھا کہ اے لڑکی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ انھوں نے گردن موڑ کر اور دائیں ہاتھ سے بائیں آنکھ ڈھک کر بتایا کہ وہ منھ پھیر کر

کس طرح محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ فرمایا کہ شریف مرد اور باعصمت بیویاں اسی طرح اعلانِ محبت کرتی ہیں۔ اظہارِ محبت کا یہ طریقۂ کار معلوم کر کے مجھے جو مسرت ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا، ساری بدگمانیاں دور ہوگئیں۔ میں صبح سویرے ساحلِ سمندر پر ٹہلنے جاتا ہوں۔ میں بھی تو کہوں کہ یہ خوش شکل خواتین مجھے آتا دیکھ کر کبھی پلو کھینچ کر اور کبھی منہ پھیر کر دوسری طرف کیوں دیکھنے لگتی ہیں۔ اب بات سمجھ میں آئی۔ گویا......روہڑی جنکشن کی خوبی اور خرابی یہ ہے کہ کراچی سے آپ کہیں بھی جائیں روہڑی راستے میں ضرور پڑے گا......

ہر رہ کہیں بھی جاتی ہے۔ روہڑی سے گزر کر جاتی ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ تو یہاں تک پیشین گوئی کرتے ہیں کہ جب صور پھونکا جائے گا تو اہلِ کراچی میدانِ حشر میں وایا روہڑی جائیں گے۔ خیر یہ فقرہ تو یوں ہی بیچ میں آ گیا میں کہہ یہ رہا تھا کہ جون ایلیا انگلینڈ کی سیاحت کے بعد لوٹے تو برٹش ریلوے کی تعریفوں کے پل باندھتے آئے۔ محترمہ زہرہ نگاہ نے ان سے کہا کہ جون بھائی انگلینڈ میں سفر تو ہم نے بھی کیا ہے۔ ہمیں تو ان کی ریلوے میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ فرمایا بہن آپ نے نوٹس نہیں کیا۔ آپ انگلینڈ میں کہیں بھی جائیں راہ میں روہڑی نہیں پڑے گا۔ شاہد رسام جون ایلیا کے خلوتیانِ خاص میں ہیں۔ گھر کے بھیدی تو بہت ہوتے ہیں۔ یہ بے گھر نگر کے بھیدی ہیں۔ وہ جون ایلیا کے معتمد، مشیر، میزبان، ہم راز، مونس و غم گسار، میرِ سامان، ساقی اور محتسب، مختصر یہ کہ سبھی کچھ رہے ہیں۔ وہ ذرا ہمت و موقلم کے بجائے قلم سے کام لیں تو جون ایلیا شاعر و شخص کے بازو بھی بن سکتے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ جون بھائی لیاقت نیشنل ہسپتال کے ٹوائیلٹ میں یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے کہ ابھی ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔ وہاں سے وہ دس منٹ بعد پسینے میں شرابور برآمد ہوئے تو انھوں نے پوچھا کہ آپ تو ایک منٹ کے لیے گئے تھے۔ فرمایا جانی کام تو ایک ہی منٹ والا تھا مگر ادھر دو قدمچے دیکھ کر احتراماً بیٹھ گیا۔ جون ایلیا ایک صبح اذانوں کے وقت مشاعرہ پڑھ کے اپنے دو شاگرد یا مداحوں کے کاندھے پر اپنے ہاتھ اور شیروانی رکھے لوٹ رہے تھے کہ ایک شاگرد نے عالم تاب تشنہ کا جو بہت بڑے عہدے پر فائز تھے اور مشاعروں میں مرسڈیز کار میں آتے تھے نام لے کر کہا کہ استاد آپ نے ملاحظہ فرمایا، اس شخص کو مشاعروں میں بالکل

داد نہیں ملتی پھر بھی خوش اور مطمئن نظر آتا ہے۔ اگر ہمیں داد نہ ملے تو ہماری تو ہفتوں نیند حرام ہو جائے۔ جون ایلیا بولے کہ جانی! (وہ ہر ایک کو اسی طرح مخاطب کرتے ہیں سوائے اپنی بیگم کے)...... کہنے لگے کہ جانی کہ تمھیں معلوم نہیں اس کے پاس اٹھارہ لاکھ روپے ہیں وہ کاہے کو ڈیپرس ہونے لگا۔ اس پر دوسرا شاگرد بولا، استاد آپ کیا فرمارہے ہیں وہ تو بہت مال دار ہے اٹھارہ لاکھ روپے کی تو صرف اس کی کار ہی ہوگی۔ فرمایا، ہوگی میں تو بس یہیں تک سوچ سکتا ہوں۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا غیر معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ عن قریب دوبارہ سہرا باندھنے والے ہیں۔ غیر معتبر ذرائع سے مراد وہ خود ہیں۔ ان کے بارے میں جتنی بھی تہمتیں، قابلِ یقین اور ناقابلِ اشاعت خبریں سننے میں آتی ہیں ان کے محرک، مستری اور پھیلانے والے وہ خود ہیں۔ منیر نیازی کا بیان ہے کہ جون ایلیا نے انھیں چائے کے لیے اپنے گھر بلایا۔ وہ وہاں پہنچے تو جون ایلیا انھیں دیکھتے ہی درخت پر چڑھ گئے۔ جون ایلیا کے ایک ہم دم اور ہم راز بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کے ڈھائی بجے ان کے پھاٹک پر گھنٹی بجی، وہ آنکھیں ملتے ہوئے پہنچے تو جون ایلیا کھڑے تھے...... فرمایا، 'جانی میں اس وقت پیے ہوئے نہیں ہوں...... میں اس وقت رینجر بن کر بڑے بھائی کو فون کرنا چاہتا ہوں کہ یا تو جائیداد کی تقسیم میں جون کے ساتھ زیادتی بند کرو ورنہ'...... ان دنوں کراچی میں قتل و غارت کا زور تھا اور شہر میں رینجرز گشت کر رہے تھے۔ لوگ قتل و غارت سے اتنے خوف زدہ نہیں تھے جتنے رینجرز سے۔ دوست انھیں اپنے فون تک لے گیا ان کے ہاتھ میں حسبِ معمول بے حد رعشہ تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈائل کے سوراخ یکے بعد دیگرے غلط گھمائے...... انھیں نمبر بھی یاد نہیں تھا۔ کہنے لگے' جانی! تمھارے فون کے سوراخ غلط جگہ بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے سب ٹرائی کر کے دیکھ لیے ذرا تم فون ملا دو'...... دوست نے فون ملایا...... جب بڑے بھائی صاحب فون پر آ گئے تو جون نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور پکڑ کے مہکتے ہوئے ہونٹ اس پر رکھ کر کہا' بھیا میں رینجر بول رہا ہوں...... ' بھائی صاحب قبلہ نے جواب میں جون سے جو کچھ کہا اسے خواتین کی موجودگی میں دہرانا مناسب نہیں۔ فون پھینک کر جون ایلیا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹتے جاتے اور کہتے جاتے تھے کہ 'اس تہذیب نے ہمیں تباہ کر دیا۔ اس

تہذیب نے کہیں کا نہ رکھا۔ اماں خفگی اور خصومت میں بھی تہذیب کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا...... امروہہ کی تہذیب نے مجھے تباہ کر دیا...... امروہہ تہذیب کا مرکز تھا'۔ کچھ دن بعد ایک منہ چڑھے نے ان سے کہا کہ ایک صاحب گزشتہ سال امروہہ گئے تھے وہ کہتے تھے کہ ہمیں تو وہاں مرکز ورکز کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ فرمایا' جانی مرکز تو ہم خود تھے۔ سو ہم کراچی آ گئے۔'تو اس نے کہا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب امروہہ تہذیب کا مرکز نہیں رہا...... فرمایا...... 'گویا'...... ایک اتوار کو کراچی کلب میں ان کے ساتھ ایک شان دار شام منائی گئی...... کلام عطا کرنے سے پہلے انھوں نے مائیک پر اعلان کیا...... میں عن قریب مرنے والا ہوں، پرسوں مجھے گلے کا کینسر ہو گیا تھا جو آج صبح شہتوت کی گولی کھانے سے بالکل دُور ہو گیا...... انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے...... خانہ بدوشوں سے بھی بد تر تنہا زندگی گزار رہا ہوں...... وہ اسٹیج پر آب دیدہ ہو گئے...... مشاعروں میں ان کی ادائیگی اور پڑھت ایسی تھی کہ سارے مشاعرے پر چھا جاتے تھے...... ڈوب کر لکھتے...... اور اسی طور پڑھتے تھے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ بڑا یا اچھا شاعر اچھا شعر خواں بھی ہو۔ فیض صاحب اپنا بے مثال کلام اس طرح پڑھتے تھے وہ جیسے کسی دشمن کا کلام پڑھ رہے ہوں۔ محترمہ کشور زہرہ کے ہاں ایک مختصر سی شعری نشست تھی جس میں ڈاکٹر پیرزادہ قاسم وائس چانسلر کراچی یونی ورسٹی اور فاطمہ حسن کے علاوہ میں بھی موجود تھا۔ جون ایلیا سرشاری کے عالم میں لہک لہک کر اپنا کلام سنا رہے تھے۔ ان کے بائیں پہلو میں پیرزادہ قاسم بیٹھے دائیں بائیں جھوم جھوم کے بے تحاشا داد دے رہے تھے۔ ایک مصرعے پر انھوں نے ایسی بے قراری سے داد دی کہ ان کا سر جون ایلیا کے سینے سے جا لگا...... انھوں نے ہاتھ کی قینچی بنا کر پیرزادہ صاحب کے سر کو جکڑ لیا اور بغل بیچ دبا کر بیٹھ گئے۔ پیرزادہ صاحب کچھ دیر اس قینچی سے منہ نکالے واہ وا، سبحان اللہ، مکرر ارشاد ہو کہتے رہے۔ مگر ذرا دیر بعد کسمسانے لگے تو جون ایلیا نے گرفت اور تنگ کر دی۔ یہاں تک کہ پیرزادہ صاحب کی داد اور سانس دونوں بند ہو گئے، دم گھٹنے کا اندیشہ ہونے لگا۔ مادہ کینگرو کے پاؤچ سے سر نکالے پیرزادہ صاحب بڑی بے کسی سے سامعین کو دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب نے جون کے ایک نسبتاً کم زور سے مصرعے کی داد جہانگیر خان کی طرح دی۔

مشاعرے میں کچھ لوگ زبان سے داد دیتے ہیں، کچھ ہاتھ سے، کچھ تبسم زیر لب سے، بعض آنکھوں ہی آنکھوں میں...... جہانگیر خان اپنے سارے بدن سے کم زور اور غلط مصرعے کی داد دیتے ہیں، کسی ایک عضو کو تنہا گناہ گار ہونے نہیں دیتے...... بعضے بعضے مصرعے پر تو ہم نے انھیں اس طرح تڑپتے پھڑکتے اور تلملاتے دیکھا ہے کہ اگر کوئی مزاج نا آشنا دیکھ لے تو سمجھے بچھونے کاٹا ہے۔ جہانگیر خان دنیا میں واحد صاحبِ حال وقال ہیں جنھیں قوالی کے بغیر بھی حال آجاتا ہے۔ تو ان صاحب نے ایک مصرعے کی داد جہانگیر خان کی طرح دی۔ مطلب یہ کہ مصرعہ سنتے ہی بجلی کا سا شاک لگ گیا ہے۔ جون بھی آخر بندہ بشر تھے۔ غیر معمولی داد سے بے حد خوش ہوئے اور کیوں نہ ہوتے شاعر کو کم زور مصرعے کی داد سے جتنی خوشی ہوتی ہے اتنی اچھے شعر کی داد سے نہیں ہوتی۔ انھی کا ایک شعر ہے۔

بول کر داد کے فقط دو بول
خون تھکوا لو شعبدہ گر سے

وہ اتنے خوش ہوئے کہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر آداب کیا۔ ان کا ہاتھ اُٹھانا تھا کہ پیرزادہ صاحب نے جھٹ اپنی گردن چھڑالی۔ اور خود کو مزید داد سے باز رکھا۔ مگر جون ایلیا بالکل اسی طرح ہاتھ کی قینچی بنائے بیٹھے رہے مگر کوئی تازہ آمادۂ شکنجہ نہ ملا۔ انتقال سے چند ماہ پیش تر انھیں دھن سمائی کہ میری شادی کرا دیجیے۔ ان کا اصرار بڑھا تو میں نے ایک دن پوچھا، کہ آپ کے نکاح میں آنے کے لیے دلہن کی کیا کوالیفیکیشن ہونی چاہیے؟ بولے' آج آپ نے معقول بات کی ہے۔' میں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد پوچھا کہ رنگ تو ظاہر ہے کہ سفید ہی ہوگا مگر مولی اور شلغم کی طرح سفید یا دانے دار قلاقند کی مانند آف وائٹ، فرمایا سفید ضرور ہو مگر ایسا ہو کہ اسے دیکھ کر مولی شلغم یا سسرے دانے دار قلاقند کا خیال نہ آئے۔ مجھے ان چاروں سے قے آتی ہے۔ میں نے کہا مگر یہ تو تین ہیں، بولے، قے عدد اور گنتی دیکھ کر تھوڑی آتی ہے۔ میں نے پوچھا اور فگر کیسا ہو؟ غالباً کیا یقیناً آپ چھریری پسند فرمائیں گے۔ بولے چلے گی۔ مگر آپ کی طرح چھریری نہ ہو۔ جسے دیکھ کر ہی پھریری آئے۔ میں نے کہا کہ آپ جس کو شرف زوجیت بخشیں گے اس کی تعلیمی کوالفیکیشن کیا ہوگی؟ فرمایا بی اے ہو۔ ایم اے تک پہنچتے پہنچتے تو بے چاری لڑکیاں بوڑھی خرانٹ ہو جاتی ہیں۔ مردوں کے

کان کترنے لگتی ہیں۔ بی اے کے اختیاری مضامین فلسفہ، تاریخ اور انگلش لٹریچر ہونے چاہییں۔ میں نے کہا کہ معاف کیجیے کہ دلہن کی شرائط پر تو میں پورا اُتر رہا ہوں۔ آپ کو کس نے بتایا کہ بی اے میں یہ میرے اختیاری مضامین تھے وہ منھ سے تو کچھ نہ بولے، بس انگلی آسمان کی طرف اُٹھالی۔ آخر میں میں نے پوچھا اور خاندان کیسا ہو؟ فرمایا سیّدانی ہونا ضروری نہیں۔ دلہن کی عمر میں نے عمداً نہیں پوچھی اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ ان کی گنتی اٹھارہ سے آگے نہیں جاتی۔ ایک دفعہ میں نے اشارتاً کہا کہ اگر شوہر اور بیوی کی عمر میں 55 سال کا فرق ہو تو گھر بہت جلد بگڑ جائے گا۔ بولے اس وقت کون سا بسا ہوا ہے۔ اس ڈائیلاگ سے پہلے وہ ہمیں مطلع کر چکے تھے کہ ان کا معاشقہ ایک بیاہی تہاہی اور بال بچے والی خاتون سے چل رہا ہے۔ جسے ہم یہاں صبیحہ کے فرضی نام سے یاد کریں گے۔ کہتے تھے کہ ہماری اسٹریٹجی یہ ہے کہ صبیحہ کی جوان بیٹی کی شادی ہو جائے تو وہ اپنے شوہر نابکار سے طلاق لے کر ہماری ہو جائے گی۔ مگر اس کی لونڈیا کی شادی کسی طرح ہو کے ہی نہیں دے رہی۔ اس پر میں نے شاہد رسام سے کہا کہ عزیزم تم اس لڑکی سے شادی کرلو تا کہ کم از کم ایک ازدواجی رکاوٹ تو خدا خدا کر کے دُور ہو۔ مگر وہ ظالم تیار نہ ہوا۔ کہنے لگا بغیر بیوی کے میرا اچھا خاصا گزارا ہو رہا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہونا ہوانا کچھ نہیں یہ سب بھائی جون کی Fantasy ہے۔ مجھے دل لگی سوجھی۔ ایک دن میں نے جون ایلیا، ان کی مبینہ محبوبہ صبیحہ اور شاہد رسام کو ہائی ٹی پر بلایا۔ ان کے علاوہ دو دوستوں یعنی ڈاکٹر افشاں اور عذرا کو بھی مدعو کیا۔ دیکھنا اور دوستوں کو دکھانا یہ تھا کہ حضرت ہماری موجودگی میں صبیحہ سے کیا کہتے سنتے ہیں۔ لیکن خلافِ توقع وہ خود ہم سے وہ باتیں کرنے لگے جو صبیحہ سے کرنی چاہیے تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر افشاں آگئیں۔ ان سے تعارف کرایا تو چھوٹتے ہی بولے کہ مجھے تو ان سے عشق ہو گیا ہے۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ عذرا آگئیں جو بہت اسمارٹ خاتون ہیں۔ تعارف ہوتے ہی جون بھائی یہ جانے بوجھے بغیر کے یہ خاتون کون ہیں انھوں نے فی الفور اعلان کر دیا کہ شادی تو میں ان سے کروں گا، علاج البتہ ڈاکٹر افشاں سے کراؤں گا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ میرا مطلب ہے کہ ہمارے نزدیک آئی گئی ہوگئی۔ مگر جون ایلیا لگے رہے۔ کسی ذریعے سے عذرا کا فون نمبر حاصل کرلیا اور روزانہ رات کو دو تین بجے فون کرنے لگے جو عذرا کے لیے باعثِ تکلیف و پریشانی تھا۔ عذرا کی ایک بزرگ کا انتقال ہوا تو بہ قول

شاہد رسام دھاڑیں مار کے بچ مچ اتنا روئے کہ مرحومہ کے تمام اعزا بھی مجموعی طور پر اتنا نہ روئے ہوں گے۔ جون ایلیا نے اب یہ کہنا شروع کر دیا کہ عذرا میں ہر وہ خوبی ہے جو اسے ان کی زوجیت میں لانے کا اہل بناتی ہے۔ بی اے ہے گو کہ فلسفہ نہیں پڑھا لیکن میری صحبت میں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جوان العمر ہے، خوش شکل ہے، ہم مسلک ہے۔ بڑی بات یہ کہ میرے اشعار پر سر دھنتی ہے مگر جادوگر اجازت نہیں دیتا۔ وہ مجھے پتا نہیں کس وجہ سے جادوگر کہتے تھے ہمیشہ میرا نام نہیں لیتے تھے۔ جادوگر میرا گھر آباد ہونے نہیں دیتا۔ راستے میں رکاوٹ بنا کھڑا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک Fantasy تھی۔ وہ برابر فون کرتے رہے۔ ان کی زندگی کی آخری فون کال بھی عذرا ہی کے لیے تھی۔ بعض اقدامات جن کا میں نے ذکر کیا ہے بہ ظاہر مہذب اور پر تفنن معلوم ہوتے ہیں مگر وہ اصلاً ان کی Fantasy کا حصہ ہیں۔ Fantasize کرنا جونا کام آدمی اور کام یاب فن کار کا حق ہی نہیں اس کے مزاج اور تخلیقی نہج کا تقاضا ہے۔ شاید کے دیباچے اور یعنی کی آخری درختِ زرد والی نظم کو صحیح معنی میں ان کی وصیت اور عہد نامہ کہا جا سکتا ہے۔ 1943ء میں جب ان کی عمر 12 برس کی تھی، تو اپنی ایک خیالی محبوبہ صوفیہ کے نام خط لکھا کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مجھے تپ دِق کی بیماری بہت جمالیاتی، شاعرانہ اور انقلابی محسوس ہوتی ہے۔ حسنِ اتفاق ہے کہ پاکستان آنے کے بعد مجھے دِق میں مبتلا ہونے کی لذت نصیب ہو گئی۔ اسی طرح ایک زمانے میں ہر واقف کار سے کہتے تھے کہ میں اٹھارہ سال سے بالکل نہیں سویا۔ ایک دن ترنگ میں آئے تو اپنی تنہائی، بے گھری اور دوسرے مسائل و شدائد کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا کہ جسے سن کر ہمیں منیر نیازی کا شعر یاد آ گیا کہ۔

کج شہر دے لوگ وی ظالم سن
کج سانوں مرن دا شوق وی سی

پھر کہنے لگے کہ میرے پاس اب 35 کرتے اور ایک پاجامہ رہ گیا ہے..... عرض کیا یہ بھی کسی نہ کسی کو بخش دیجیے تاکہ ایک طرف سے تو یک سوئی ہو۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ ایسی باتیں دوسروں کا جی خوش کرنے کے لیے بھی کرتے تھے۔ ہر وہ شخص جو ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی شاد و مسرور کرتا ہے۔ ہمارا محسن ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ انھیں اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے اور اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے۔

دیوانوں کا شاعر

معراج رسول

جون بھائی نوجوان نسل کے مقبول ترین شاعر ہیں اور وہ میرے بھی پسندیدہ شاعر ہیں حالاں کہ نہ میں جوان ہوں اور نہ جون بھائی، پتا چلا ہے کہ وہ جوان جذبوں کے شاعر ہیں۔ انھوں نے جذبات کو زبان دی اور ان کے شعر سیدھے دل میں اُترتے محسوس ہوئے کیوں کہ جون ایک سچے شاعر اور کھرے انسان ہیں۔ منافقت سے کوسوں دُور۔ سب کے دوست، سب کے بھائی، دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دوست، اجنبیوں کے دوست اور نوجوانوں کے دوست اور معاشرے کے ستائے ہوئے لوگوں کے دوست۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ شاعر ہیں، دانش ور نہیں۔ حالاں کہ ان کی دانش میں نہ کوئی کلام ہے اور نہ دو رائے۔ وہ ترقی پسند ہیں مگر ایسے نہیں جو عوام کی باتیں کریں اور خواص کے درمیان رہیں۔ غالباً جون بھائی مستقبل کی تاریخ میں اپنے نام اور مقام کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں اسی لیے انھوں نے کبھی جائز فائدہ اُٹھانے کے متعلق بھی نہیں سوچا کیوں کہ اس طرح ان کی فن کارانہ دیانت داری مشکوک ٹھیرتی اور درویشی غیر معتبر۔ وہ جس مقام اور مقبولیت پر آج ہیں وہاں ان کے لیے سب کچھ ممکن ہے مگر وہ درباروں کے نہیں، دیوانوں کے شاعر ہیں اور یہی ان کا امتیازی وصف ہے۔

جون بھائی کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ غالباً وہ پینتالیس پچاس سال سے کہہ رہے ہیں۔ ان کے بعد کے بھی تقریباً سارے ہی شاعروں کے مجموعے آ گئے لیکن جون سے جب بھی مجموعے کے لیے کہا گیا، انھوں نے اپنی مخصوص منکسرانہ مسکراہٹ کے ساتھ ٹال دیا۔ خیر اُن کا پہلا مجموعہ دیر آید درست آید کے مصداق آ رہا ہے اور ان کے سارے دوست، بھائی اور پرستار بھی اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ جب کہ میں اور جون اس کا جشن منانے کے لیے۔

جون! یاروں کے یار تھے ہم تو

منصور زبیری

خالد انصاری صاحب کا حکم نامہ آیا کہ بھائی جون کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی کچھ یادیں قلم بند کرنی ہیں۔ تو بہتر جانا کہ دورانِ سفر ریل گاڑی ہی میں کچھ قلم بند کرلیا جائے۔ راول پنڈی سے کراچی تک کا سفر تقریباً 30 گھنٹے کا ہوتا ہے اور کوئی آنے جانے والا ہوتا ہے نہ ہی موبائل فون کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو لکھ ہی پاؤں گا۔

بھائی جون سے میری ملاقات 1983ء میں سرفراز احمد خاں (مرحوم) کے ذریعے ہوئی اور یوں ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور وہ آہستہ آہستہ مجھے سمجھ میں آنے لگے۔ یوں تو بے شمار واقعات ہیں لیکن کچھ ایسے کہ بھلائے نہیں جا سکتے۔

بھائی جون انتہائی حسن پرست تھے۔ کہتے تھے۔ ''میاں عورت کی عقل نہیں، زاویے دیکھے جاتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''مثلاً۔''

کہنے لگے۔ ''سنو، عالمی ڈائجسٹ میں ایک سانولی سی لڑکی آئی جو میری مداح تھی۔ نوکری کے لیے آئی تھی میں نے اس سے کہا کہ ذرا یہ جو اُوپر والی ریک میں کتابیں رکھی ہیں، اس میں سے فلاں کتاب نکالو۔ ریک اُوپر تھی۔ اُس نے اسٹول رکھا اور جیسے ہی وہ اس پر چڑھی، ایک زاویے پر نگاہ پڑ گئی اور مجھے اس سے عشق ہو گیا۔''

بڑی ہی مصورانہ بات تھی۔ خالد بھائی، آپ سمجھتے ہوں گے، اس بات میں کتنی مصوری پنہاں تھی۔

مصوری سے یاد آیا کہ آرٹس کونسل میں میری تصاویر کی نمائش تھی۔ بھائی جون سے پوچھا کہ کارڈ پر کیا لکھوں؟ ایک لمحے خاموش ہوئے، قلم جیب سے نکالا، قریب ہی پڑی ہوئی کاپی اُٹھائی اور اس پر ایک شعر لکھ دیا کہ دیکھو، یہ ہے دعوت نامہ۔ شعر یہ تھا۔

جہاں کی خیر خواہی دیکھنے آ
ذرا میری تباہی دیکھنے آ

صرف اسی تقریب کے لیے یہ شعر تخلیق کیا گیا تھا لہٰذا کسی مجموعے میں اس کا تذکرہ نہیں ملے گا۔ یہ شعر دعوتی کارڈ پر چھاپا گیا۔ کارڈ کے لیے میرا اسکیچ آفتاب ظفر صاحب نے بنایا تھا۔ میری تصاویر سے زیادہ دعوت نامہ پسند کیا گیا۔ مصوری و شاعری دونوں حوالوں سے۔

....

ایک دن صبح 7 بجے آ گئے۔ میرے بیٹے نے مجھے اُٹھایا کہ جون انکل آئے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''انھیں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔''

بیٹے نے آ کر کہا کہ ''بہت جلدی میں ہیں، کہہ رہے ہیں، اسے باہر ہی بھیج دو۔''

میں نے سوچا خدا خیر کرے، ماجرا کیا ہے، میں جلدی سے باہر گیا۔ دیکھا کہ رکشا کھڑا ہوا تھا اور ڈرائیور کو تاکید کی گئی تھی کہ اسٹارٹ رہنے دے، کہ اگر بند کر دیا تو معلوم نہیں دوبارہ اسٹارٹ ہو یا نہ ہو۔ لفظ 'معلوم' مجھے بھائی جون ہی نے سکھایا۔ ان کا کہنا تھا کہ پتا تو گھروں کا ہوتا ہے۔ یہاں پر لفظ معلوم کہا کرو۔ ورنہ شاید میں یہ لکھتا 'پتا نہیں دوبارہ اسٹارٹ ہو یا نہ ہو'

بہ ہر حال میں نے پوچھا۔ ''بھائی جون خیریت، صبح 7 بجے آئے ہیں اور رکشا بھی اسٹارٹ ہے۔''

کہنے لگے۔ ''باتوں کا وقت نہیں، رکشے میں بیٹھو، اچکن اور سلیم شاہی خریدنے جانا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''خیریت تو ہے۔''

کہنے لگے۔ ''ہاں، سب خیریت ہے، 9 بجے میرا نکاح ہے۔ ایک گواہ تم ہو اور ایک سرفراز کو لے لیتے ہیں۔ لڑکی سُنّی ہے اس لیے اس کے عقیدے کے مطابق

نکاح ہونا ہے۔"

میں صورتِ حال بھانپ گیا۔ رکشے والے کو کرایہ دے کر چلتا کیا۔

پوچھنے لگے۔ "کیوں بھیج دیا؟"

میں نے کہا۔ "میں اپنی گاڑی سجا کر لے جاؤں گا، اچھا لگے گا۔"

تو کود کر میرے اُوپر لٹک گئے اور بولے۔ "یہ تم نے بہت اچھا کام کیا۔"

میں انھیں ڈرائنگ روم میں لے آیا اور فون ان کے سامنے رکھا۔ "ذرا اپنی ہونے والی دلہن کو ملائیں تا کہ میں جان سکوں کہ کیا کیا سامان مزید لینا ہے، وہ چیزیں بھی لیتے ہوئے جائیں۔" میں نے عرض کیا۔

انھوں نے فوراً ڈائل کیا، تقریباً 15 منٹ بعد دوسری جانب سے فون اُٹھایا گیا تو اُس خاتون سے کہا۔ "یہ لو، بات کرو، ہماری شادی کے ایک گواہ سے، یہ بہت اچھا مصور ہے۔" ریسیور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں نے خاتون سے پوچھا۔ "کیا معاملہ ہے؟"

وہ کہنے لگی۔ "رات بہ ضد تھے کہ شادی کرو مجھ سے، تم میری فارہہ ہو۔ تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ کل کریں گے۔ وقت پوچھنے لگے تو میں نے کہہ دیا کہ 9 بجے، کیوں کیا ہوا......؟"

میں نے اس سے کہا۔ "یہ پوچھ رہی ہو، کیا ہوا؟ تمھیں شرم آنی چاہیے کہ تم نے کس شخص سے یہ بات کی۔ بھائی جون شاعری میں جتنے طاقت ور ہیں، رشتوں میں اس سے کہیں زیادہ کم زور بھی۔"

بہ ہر حال میرے منھ میں جو بھی آیا، میں نے خاتون کو سنا دیا اور پہلی مرتبہ میں نے بھائی جون کی آنکھوں میں معصوم آنسو چھلکتے دیکھے۔

....

ایک مرتبہ رمضان کے دنوں میں، میں اور وہ کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے، گپ شپ ہو رہی تھی، انور شعور بھی تھے۔ اچانک بھائی جون بڑی حیرت سے ایک جانب دیکھنے لگے اور ان کے منھ سے اچانک نکلا۔ اوہ......واہ...... میں نے اور بھائی انور شعور نے

پوچھا کہ کیا ہوا؟ کہنے لگے۔ "ذرا ادھر دیکھو۔"
ہم نے دیکھا تو ایک نسبتاً بھاری بدن کی لڑکی جا رہی تھی۔ شعور بھائی بولے۔
"ہاں لڑکی ہے، تو کیا ہوا؟"
کہنے لگے۔ "کیا روزہ شکن کولھے ہیں۔" ہمارا قہقہہ نکل گیا۔

....

جون بھائی ایک مشاعرے میں امریکا (نیویارک) آئے۔ میں ان دنوں اپنی تصاویر کی نمایش کے سلسلے میں پہلے سے وہاں موجود تھا۔ شام ہوئی، نمایش کے اخراجات کی وجہ سے جیب میں صرف 15 ڈالر موجود تھے۔ نمایش دوسرے دن ہونی تھی اور چند لوگوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کچھ تصاویر وہ لے لیں گے۔ یوں اگلے ہفتے تو ہم بادشاہ بننے والے تھے لیکن آج کیا کیا جائے، دیارِ غیر ہے، بہ ہر حال میں 10 ڈالر کی ایک چھوٹی بوتل Chivas Regal کی لے آیا۔
کہنے لگے۔ "اپنا بھی پیگ بناؤ۔"
میں نے کہا۔ "بھائی جون، میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں تو نہیں پیوں گا۔"
کہنے لگے۔ "تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو، پاکستان میں تو تم بوتلوں کے ڈھیر رکھتے تھے اور جہاں اس کی افراط ہے وہاں یہ آدھا انگریزی ادھا...... پیو تم بھی...... ہم کوئی شراب تھوڑی پیتے ہیں، یہ تو دوا ہے...... آج خوراک کم ہی سہی۔"
غالباً 1991ء تھا، نیویارک میں ایک ادبی تنظیم تھی جس کا نام تھا، حلقۂ فن و ادب۔ اس کے صدر جناب حنیف اُخگر تھے اور جنرل سیکریٹری محمد یاسین۔ بھائی حمایت علی شاعر کے ہاتھ میں تمام انتظامات تھے۔ اِن میں پاکستان سے شعرا کو بھی بلانا تھا لیکن جون ایلیا کا نام کہیں نہیں تھا۔ میں نے یاسین سے کہا کہ "بھائی جون کو ضرور بلاؤ۔" یاسین نے کہا۔ "حنیف اُخگر آمادہ نہیں ہو رہے۔ کہتے ہیں، جون شراب پی کر مشاعرہ خراب کر دے گا۔"
مجھے شدید غصہ آیا۔ میں نے یاسین سے کہا کہ اگر بھائی جون نے مشاعرہ خراب کیا تو ان کا ٹکٹ میں ادا کروں گا ورنہ میرا ٹکٹ بھی تم دو گے۔ معاملہ طے پا گیا۔
آگے اس مشاعرے کا احوال ہے، مشاعرہ بھائی جون نے جیتا اور شرط میں نے۔

نیو یارک کے ہوٹل روز ویلٹ میں یہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ بھائی جون کے چاہنے والے نیو یارک میں کم نہیں۔ کچھ میرے جاننے والے بھی وہاں خاصے ہیں۔ ہم دونوں کے مشترکہ دوست یاسین ہمیں ہوٹل کے مے کدے میں لے گئے۔ یہ سُن کے مشاعرے کے منتظم اعلیٰ حنیف اخگر صاحب بہت برہم ہو رہے تھے بل کہ خوف زدہ بھی تھے کہ جون بھائی کی بدمستی کی وجہ سے مشاعرہ خراب نہ ہو جائے۔ میں نے مؤدبانہ اُن سے کہا کہ دیکھیے گا، مشاعرہ تو اُٹھے گا ہی جون بھائی کی وجہ سے۔ اُن کی ذمّے داری میں لیتا ہوں، آپ قطعاً نہ گھبرائیں۔

جمیل الدین عالی کی صدارت تھی۔ جس خُم خانے میں ہم بیٹھے تھے، اُس کے سامنے ہی مشاعرے کا ہال تھا۔ ہم بہ خوبی آواز سُن سکتے تھے۔ محسن بھوپالی کا نام آیا تو میں نے بھائی جون سے کہا کہ اب بس کریں۔ محسن بھائی کے بعد آپ کو بلایا جائے گا۔ ترتیب کا مجھے علم تھا۔ ہم تینوں، یاسین، میں اور بھائی جون ہال میں پہنچے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بھائی جون کو مدعو کیا گیا تو وہ اسٹیج پر چلے گئے اور اس غزل سے ابتدا کی۔

کرتا ہے ہا ہو مجھ میں
کون ہے بے قابو مجھ میں

ایک تو اُن کے پرستار بہت، پھر اُن کے پڑھنے کا منفرد انداز، ایسے چھائے، ایسے چھائے کہ کیا عرض کروں۔ ایک کے بعد ایک غزل۔ وہ مشاعرہ پڑھنے کا فن جانتے تھے۔ بھانپ لیتے تھے کہ سامعین کس مزاج کے ہیں۔ سامعین انھیں سننا اور سننا چاہتے تھے لیکن ابھی کینیڈا میں مقیم نام ور شاعرہ نسیم سیّد، حمایت علی شاعر اور اپنے دوہوں کے ترنم سے سحر طاری کر دینے والے جمیل الدین عالی باقی رہ گئے تھے۔ نسیم سیّد صاحبہ کا اعلان کر دیا گیا اور بھائی جون اسٹیج سے اُتر کے ہمارے پاس کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے اُٹھ چکے تھے کہ اُن سے اسٹیج ہی پر بیٹھے رہنے کی درخواست کی گئی۔ حنیف اخگر صاحب سے میرے دل میں کدورت بھی بھری ہوئی تھی کہ وہ جون بھائی کو امریکا بلانے سے مسلسل انکار کرتے رہے تھے۔ مجھے شرارت سوجھی یا کوئی انتقامی جذبہ تھا۔ میں نے کہا۔ ”جون بھائی اسٹیج پر بیٹھیں گے تو صدارت بھی یہی کریں گے۔“

بہ ہر حال تھوڑی سی بحث، رَد و کد کے بعد بھائی جون نے کہا کہ وہ نیچے کرسیوں پر ہم لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھیں گے۔ ہماری کرسیاں پیچھے لگی تھیں۔ جیسے ہی بھائی جون پیچھے آ کر بیٹھے، تمام افراد نے کرسیوں کا رُخ اُن کی جانب کر لیا۔ اب مشاعرے کا جو حال ہونا چاہیے تھا، اُس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی طور مشاعرے کا دوبارہ آغاز ہوا۔ اسٹیج پر دو ایک شعرا ہی رہ گئے تھے۔ نام لینا مناسب نہیں اور مشاعرے کے منتظمین سامعین کی توجہ کے منتظر تھے۔

مشاعرے سے واپسی پر اصرار کرنے لگے کہ اسٹور پر گاڑی روکو۔ یہاں تو بہت اسٹور ہوں گے اور کھلے بھی ہوں گے۔

میں نے کہا۔ ''بالکل''

شدّ و مد سے بولے۔ ''بس کسی اسٹور پر چلو۔''

میں نے کہا۔ ''بھائی جون، آپ نے اچھی خاصی پی لی ہے، کل لے لیں گے۔''

کہنے لگے۔ ''کل اتوار ہے۔ اسٹور بند ہوں گے۔''

بات درست تھی۔ اتوار کو پَب تو کُھلے ہوتے ہیں، اسٹور نہیں۔ خیر، ہم اسٹور پر گئے۔ بھائی جون کو مشاعرے سے ڈیڑھ سو ڈالر ملے تھے۔ سارے نکال کر دکان دار کے ہاتھ میں رکھے اور فرمایا۔ ''سب کی شراب دے دو۔'' پھر مجھ سے بولے۔ ''اس سے کہہ دو کہ سب لال دے، سفید نہیں۔ ہم سفید پوش ہیں، سفید نوش نہیں، اور ابھی تو بہت مشاعرے ہیں، سب کی شراب لے کر پاکستان جائیں گے۔

....

ایک مرتبہ کسٹم ہاؤس کراچی میں صادقین صاحب کی پینٹنگ خراب ہوگئی تھی۔ اس وقت کے کلکٹر کسٹم خلیل احمد نے مجھے بلوایا کہ اسے ٹھیک کروں۔ پینٹنگ کا سائز بہت بڑا تھا اور اسے وہیں ٹھیک کرنا تھا۔ کسٹم کا ادارہ تھا، ظاہر ہے تمام لوازمات موجود تھے۔ جہاں میں کام کر رہا تھا، وہاں ایک عمدہ قسم کا کریٹ لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ ایک روز بھائی جون بھی وہاں آ گئے۔

میں سیڑھی پر چڑھا کام کر رہا تھا۔ کہنے لگے۔ ''ذرا نیچے آؤ۔''

میں نے کہا۔ ''بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، مکمل کر کے نیچے آتا ہوں''
کہنے لگے۔ ''تم پہلے نیچے آ کر بات سنو، انتہائی سنجیدہ اور تمھارے کام ہی سے متعلق ہے۔'' میں نیچے اُتر کے ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگے۔ ''کتنے روز کا کام ہے؟''
میں نے کہا۔ ''تقریباً 15 روز تو اور لگ جائیں گے۔''
شراب کے کریٹ کی جانب دیکھا، کہنے لگے۔ ''اس پینٹنگ میں اتنی رنگریزی کرو کہ کم از کم ایک سال تو یہاں رہ سکیں۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ کہنے لگے۔ ''ہنسنے کی کیا بات ہے، ان کا کام خاصا وقت طلب اور دقت طلب ہے۔'' یہ کہہ کر خود بھی خوب ہنسے۔

....

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ سن لیں خالد بھائی، آپ تو مجھ سے خاصے چھوٹے ہیں، تو کیا خالد میاں کہہ سکتا ہوں، دیکھیں کتنے واقعات ہیں۔ یہ مختصر سا واقعہ ہے لیکن میرے دماغ پر نقش ہے۔ ایک دن کہنے لگے۔ ''میرا مجسمہ بنانا، تم نے آرنلڈ کی تو تصاویر دیکھی ہیں نا؟''
میں نے کہا۔ ''جی، دیکھی ہیں۔''
کہنے لگے۔ ''جو مجسمہ اس کا امریکا میں لگا ہے بس وہی بنانا صرف چہرہ میرا ہو اور اگر دکھا سکو تو سر میں سے دماغ جھانکتا ہوا دکھانا۔''
میں نے کہا۔ ''بالکل بھائی جون، ایسا ہی ہوگا۔'' میں وعدہ کر بیٹھا۔
کہنے لگے۔ ''اس کے نیچے یہ شعر لکھ دینا۔

نکل آیا میں اپنے اندر سے
اب کوئی ڈر نہیں ہے باہر سے''

وہ چلے گئے۔ جانے کیوں، انھیں اتنی جلدی کیوں تھی۔ میں تمام تر صدقِ نیت کے باوجود اپنا وعدہ وفا نہ کر سکا۔ لیکن یہ مجسّمہ مجھے بنانا ہے۔ ایک ایسا مجسّمہ جو میں نے پہلے نہ بنایا ہو اور آگے بھی شاید نہ بنا سکوں۔
اِن شاءاللہ
اور میری کوشش ہوگی کہ بھائی جون کا مجسّمہ اُردو باغ میں نصب ہو۔

پر تیرے بعد ہم کہاں

یادوں اور ملاقاتوں کا احوال

نذیر لغاری

جون ایلیا سے میں پہلے پہل کب ملا، سال سن یاد نہیں اور یوں بھی جون ایلیا سے جو بھی ملا اور جب بھی ملا اسے یہ احساس ضرور ہوا کہ وہ جون کو اس ملاقات سے پہلے سے بھی جانتا ہے۔ یوں تو میں انھیں ستر کی دہائی کے اواخر میں عالمی ڈائجسٹ کے دفتر میں ملا اور اسی ملاقات میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں جون کو پہلی بار نہیں مل رہا بل کہ یہ ملاقات گزشتہ کئی ملاقاتوں کا تسلسل ہے۔ میں انھیں احتراماً جون بھائی کہتا مگر وہ ہمیشہ اس بات پر اُکساتے کہ ان کے ساتھ گفت گو میں آپ جناب کا تکلف نہ برتا جائے بل کہ معاملہ تُو تڑاک تک کھینچ لیا جائے۔ ہزاروں کے مجمعے میں مشاعرے کے دوران کسی پچھلی صف میں بیٹھے دیکھ کر نظر پڑ جاتی تو وہیں سے سلسلۂ کلام شروع کر دیتے۔ ''نذیر تُو بیٹھا ہے ناں اچھا تو سُن یہ شعر خاص تیرے لیے ہے۔'' ان کا یہ اندازِ تکلم محض میرے یا چند دیگر افراد کے لیے مخصوص نہ تھا، کبھی کبھار ایک ایک غزل کے دوران ایک ساتھ کئی دوستوں سے حال احوال پوچھ لیتے اور مجمعے کو اپنے احباب کی موجودگی کی اطلاع بھی دے دیتے، جون کا مجھے یا کسی کو بھی تُو کہہ کر کے مخاطب کرنا قرب اور بے تکلفی کا اعلان ہوتا۔ وہ ہمیشہ جمال احسانی، عبیداللہ علیم، نصیر ترابی اور دیگر کئی احباب کو بھی تُو سے مخاطب کرتے۔ جون ایلیا کے تینوں بڑے بھائی رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی اور سیّد محمد عباس اور ان کے عالم فاضل بھانجے ممتاز سعید سے بھی میرے بہت قریبی مراسم تھے اور ان سب پر تو

الگ الگ مضمون لکھے جانے چاہئیں۔

غالباً 1981ء کی بات ہے، سرائیکی کے اب تک کے چند صفِ اوّل کے نثرنگاروں میں سے ایک بہترین نثر نگار محمد اسمٰعیل احمدانی کی کتاب ''پیت دے پندھ'' (محبتوں کے سفر) نے ملک بھر کے سرائیکی حلقوں میں دھوم مچادی۔ ضیاء الحق کے عہدِ جبر میں کوئی بھی اچھی نثر یا کوئی بھی ایک مزاحمتی شعر اُداس لوگوں کے ویران دلوں میں بے پناہ توانائیاں بھر دیتا۔ احمدانی صاحب کی اس دور کی سرائیکی نثر کے کئی اُردو تراجم میں نے ہفت روزہ 'الفتح' میں شائع کرائے تھے۔ یہ 1981ء کا ذکر ہے، محمد اسمٰعیل احمدانی کی کراچی آمد کے موقع پر نارتھ ناظم آباد بلاک ایف میں واقع ڈاکٹر محمد شفیع بوئی خان کے گھر پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں جون ایلیا، انور سن رائے کے علاوہ ادب اور صحافت کی دنیا کے کئی اور احباب بھی شریک ہوئے۔ اس تقریب میں جون اپنی خوش گفتاری سے چھا گئے۔ انھوں نے اپنے رواں جملوں اور سادہ گفت گو سے ایک سماں باندھ دیا۔

سرائیکی کے حوالے سے جون ایلیا کا پہلا تعلق اور تعارف انیس شاہ جیلانی سے تھا۔ انیس شاہ جیلانی کا رئیس امروہوی، جون ایلیا، زاہدہ حنا، شکیل عادل زادہ سے بہت شخصی تعلق تھا۔ کراچی آمد پر انیس شاہ جیلانی ان تمام لوگوں سے ملتے، انھیں سنجر پور آنے کی دعوت دیتے مگر وہ زندگی بھر اپنے گھر ان کی آمد کے منتظر ہی رہے۔ محمد اسمٰعیل احمدانی کی کتاب کی پذیرائی کی تقریب میں جون ایلیا نے سرائیکی خطے کی تاریخ اور ادب پر بات کی۔ جون نے کہا کہ ''ملتان، ایتھنز، روم، طوس اور شیراز سے زیادہ قدیم شہر ہے۔ ملتان کے علاوہ اُچ بھی اتنا ہی قدیم شہر ہے۔ ملتان کا اور اُچ کا المیہ یہ ہے کہ اس کا لاطینی، یونانی اور فارسی ادب کا ہم عصر اور ہم پلہ ادب محفوظ نہیں رہا، یوں مکانوں کا، دیواروں کا، قلعوں کا، معبدوں کا تسلسل تو قائم رہا مگر دانش کا، فکر کا، تفکر کا، شاعری کا، ادب کا تسلسل قائم نہیں رہا۔ یونان کو سقراط ملا، روم کو سیسرو ملا، ایران کو فردوسی ملا، مگر ملتان کا سقراط، سیسرو اور فردوسی لاپتا ہو گئے۔ اسمٰعیل احمدانی ملتان اور اُچ کے قدیم سقراط، سیسرو اور فردوسی کی بازگشت ہیں، اسمٰعیل احمدانی نے کیرگی کارڈ، ڈان کوئزوئٹ اور نطشے کی آوازوں کو سنا، وہ ذرا کان لگا کر سنیں،

انھیں ملتان اور اُچ کی قدیم عمارتوں کی پرانی دیواروں سے بھی آوازیں سنائی دیں گی۔"

جون ایلیا سے میری زیادہ تر ملاقاتیں ان کے اپنے گھر، عبیداللہ علیم کے گھر، اُن کے دفتر، سب رنگ کے دفتر، کراچی پریس کلب، آرٹس کونسل یا مختلف تقریبات میں ہوتیں۔ وہ جن سے شناسا تھے، ان سب کے محبتی تھے۔ میں ناموں کی اوّلیت وثانویت کی بحث میں نہیں پڑتا مگر وہ عبیداللہ علیم، شکیل بھائی (شکیل عادل زادہ) جمال احسانی، نصیر ترابی، علامہ کرار نقوی، معراج رسول اور بعض دیگر صاحبان سے بڑی محبت کرتے مگر ان کی کسی بھی محبت یا اظہارِ محبت کو حتمی، مکمل اور لامتناہی نہ سمجھا جائے۔ ان میں سے میں نے چند ایک احباب کے گلے، ایک آدھ کے شکوے اور بُرائی کے کلمات بھی سنے مگر وہ سب کچھ معروضی ہوتا۔ تبدیل شدہ حالات میں ان کی رائے تبدیل شدہ ہوتی۔

احباب نوازی میں غلو اور کھلی جانب داری سے کام لیتے۔ ایک بار سسپنس ڈائجسٹ کے اداریے میں شوکت صدیقی، شفیع عقیل، مطیع اللہ ناشاد اور عثمان بلوچ جیسے بڑے آدمیوں کے ناموں کے ساتھ میرا نام لکھا اور اس بات پر ملال کا اظہار کیا کہ کراچی شہر میں ان لوگوں کے ہوتے ہوئے خون ریزی کی وارداتیں ہمارے تہذیبی زوال کی علامتیں ہیں۔ اتنے بڑے لوگوں کے ناموں کے ساتھ میرا نام لکھ کر انھوں نے احباب نوازی کی حد کر دی۔

میں دو سال پہلے بغداد میں تھا۔ وہاں ایک ہی دن میں، میں نے اپنی بیگم کے ہم راہ حضرت موسیٰ کے پوتے اور پیغمبر خدا حضرت یوشع، حضرت امام موسیٰ کاظم، امام اعظم حضرت ابو حنیفہ، جنید بغدادی، ان کے استاد اور مرشد سری سقطی، حضرت بہلول اور معروف کرخی کے مزارات پر حاضری دی۔ آخر میں مجھے لرزیدہ قدموں کے ساتھ حسین بن منصور الحلاج کے مزار پر جانا تھا۔ مجھے جون ایلیا یاد آ رہے تھے۔ جون بتاتے تھے کہ انھوں نے پندرہ برس تک حسین بن منصور کے بارے میں سوچا اور انھوں نے منصور کی زندگی پر کتاب "مسیحِ بغداد حلاج" لکھی۔ انھوں نے یہ کتاب فارسی، اُردو، انگریزی اور عربی میں لکھی تھی انھیں یہ شکوہ تھا کہ ان کی پندرہ برس کی سوچ، فکر اور ریاضت سے لکھی جانے والی کتاب ان کی ایک عزیز ترین ہستی نے ضائع کر دی۔ جون عزیز ترین ہستی کا نام لینے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ جون نے منصور کی اپنی تصنیف "کتاب طواسین" کا ترجمہ کیا

اور تشریح لکھی مگر ہماری تو اس کتاب کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ معروف کرخی کے پُرشکوہ اور بلند و بالا مزار کے دیدار کے بعد میں نے حسین بن منصور الحلاج کے مزار کا راستہ معلوم کیا۔ میرے ہم راہ چلنے والا ڈرائیور مجھے بھٹکانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ منصور کے پاس تو ہم صبح گئے تھے جب ہم نے شیخ عبدالقادر گیلانی کے مزار پر حاضری دی تھی۔ جب میں نے یہ اعلان کیا کہ منصور کا مزار بغداد کے کسی بھی کونے میں ہو، ہم تو جائیں گے۔ اس پر ڈرائیور نے ہار مان لی اور وہ معروف کرخی کے مزار سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر ہمیں نچلے متوسط طبقے کی آبادی کے ایک علاقے میں لے گیا، جہاں دس بارہ فٹ کی گلیاں تھیں۔ ان گلیوں میں ایک ایک سو یا ایک سو بیس مربع گز کے رقبے پر زیادہ تر ایک منزلہ چھوٹے چھوٹے مکانات بنے تھے۔ ایک گلی کے سامنے ڈرائیور نے گاڑی روک دی کیوں کہ گلی میں گاڑی پارک کرنے کی صورت میں دوسری گاڑی نہیں آسکتی تھی۔ اب میں اور بیگم گاڑی سے اُتر کر پیدل چل دیے۔ اس محلے میں کسی مزار کی موجودگی کے آثار نہیں تھے مگر منصور کے مزار کا پتا پوچھنے پر یہی بتایا گیا تھا کہ وہ مزار اسی گلی میں ہے جس میں ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ نچلے متوسط طبقے کے چھوٹے چھوٹے گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ دائیں اور بائیں جانب بے ترتیب کمروں میں کھیلتے چھوٹے بڑے بچے اور امورِ خانہ داری انجام دیتی عورتیں نظر آرہی تھیں۔ اِکا دُکا سال خوردہ مرد بھی نظر آئے، جوان غالباً کام کاج پر گئے ہوئے ہوں گے۔ گلی میں کوئی چہل پہل نہ تھی۔ کوئی بڑا ہجوم یا رش بھی نہیں تھا۔ گلی میں چند گھڑی چلنے کے بعد ہم ایک بند گھر کے دروازے پر پہنچے۔ دو طاقوں کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جسے تالا لگا ہوا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ حسین بن منصور کا مزار ہے۔ میں نے سوچا کہ ہماری رہ نمائی کرنے والا ہمیں آج کے کسی منصور کے گھر لایا ہے اور شاید اب کہے گا کہ اس کے گھر پر تالا لگا ہے، وہ تو گھر پر نہیں ہے۔ مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کہا، وہ برابر کے ایک گھر سے ایک آدمی کو ساتھ لے آیا۔ اس نے بنیان اور ڈھیلی ڈھالی پینٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چابی تھی۔ اس نے پرانی وضع کے تالے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول دیا۔ اندر دائیں جانب کو چھوٹا سا صحن تھا۔ جہاں کپڑے سُوکھ رہے تھے۔ مکان کے اندر بھی مزار کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس شخص نے سامنے والے

کمرے کا دروازہ کھولا، یہ ایک کھلا کمرا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے سامنے ایک قبر پر نظر پڑی جس پر حسین بن منصور الحلاج لکھا تھا۔ مجھے یکایک لمحہ بھر کو گمان ہوا کہ یہ جون ایلیا کی قبر ہے مگر یہ منصور کا مزار تھا جس پر کتبہ بھی لگا تھا۔ مجھے اس محلے میں وہ چوک کہیں نظر نہیں آیا جہاں مصلوب منصور پر سنگ باری کی گئی۔ سنگ باری کا منظر میرے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ مجھے منصور کی شباہتوں میں جون ایلیا نظر آئے۔ وہ ہر پتھر مارنے والے کو دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے تصور میں قاضی کا مکروہ اطمینان دیکھ رہا تھا۔ مجھے ضیاء الحق یاد آرہا تھا۔ مجھے جون ایلیا کا غصہ یاد آرہا تھا۔ "جانی وہ حرام الدہر کر گزرا ہے۔۔۔ کیا اس نے لمحہ بھر کو بھی نہ سوچا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔۔ بھلا ہر بار منصور ہی کیوں سولی پر چڑھتا ہے۔۔ وہ یروشلم ہو، بغداد ہو۔۔ پنڈی ہو۔۔ منصور کی جان ہی کیوں لی جاتی ہے۔"

جون بھائی زندگی کے آخری دنوں میں اپنی بے گھری کے بہت شاکی رہے۔ ان کا گھر تھا مگر گھر کے ہوتے بے گھر ہوئے، در بدر ہوئے۔ انھیں شکوہ تھا کہ ان کے کہیں پہ ہوتے ہوئے، کہیں اُداس ہو جانے پر، کہیں سے بیزار ہو جانے پر، کہیں سے اُٹھتے ہوئے، کہیں سے پلٹتے ہوئے واپسی کا کوئی مقام نہیں۔

"میں جب کسی اور شہر سے اس شہر میں واپس آؤں تو میں کہاں جاؤں۔ ایسا نہیں ہے میرا گھر نہیں تھا، میرا گھر تھا، تم وہاں آئے، میرے پاس بیٹھے، مجھ سے باتیں کیں، مجھ سے شعر سنے، مجھے داد دی۔ جانی! میرا گھر میرا گھر نہیں رہا، یہ سب کچھ تمھارے سامنے ہوا، تمھارے رو بہ رو ہوا۔ مجھے برتی ہوئی بوسیدہ شے سمجھ کر گھر سے نکال کر پھینک دیا گیا۔ مجھے رایگاں کر دیا گیا۔ جانی! مجھے مسل دیا گیا، مجھے کچل دیا گیا۔ اس دنیا میں، اس شہر میں کوئی میرا انتظار نہیں کرتا، کوئی میری غیر موجودگی کو محسوس نہیں کرتا، جانی! مجھے تباہ کر دیا گیا، مجھے برباد کر دیا گیا، مجھے اُجاڑ دیا گیا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ میں تہی دست ہو کر رہ گیا ہوں۔"

جون بھائی! یہ میں میں، یہ میری میری کی تکرار کیا ہے۔ آپ ہمیشہ ملکیت پرستی کے خلاف رہے، آپ نجی ملکیت کے خلاف دلائل لیے دنیا بھر کے نابغۂ روزگار دانش وروں کا مجمع لگا لیا کرتے تھے۔ کارل مارکس کے حوالے دیتے تھے، قصے سناتے تھے، اب آپ

خالص ملکیتی محرومیوں کا رونا رو رہے ہیں۔

"دیکھ جانی! میں اب بھی وہی ہوں، وہی جون ایلیا، کیا میں جون ایلیا کے نام سے دست بردار ہو جاؤں، میں نیستی ہو جانے سے پہلے بہ ہر حال ایک ہستی ہوں، میرے مر جانے سے پہلے بہ ہر حال میری ایک زندگی ہے، یہی نامراد زندگی میری ملکیت ہے، جب میں وجود سے عدم میں چلا جاؤں گا، میں اس ملکیت سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ جانی! ہر انسان نہیں بل کہ ہر ذی روح، ہر جان دار محبت کرتا ہے، میں بھی محبت کرتا ہوں، محبت بہت ذاتی ہوتی ہے، ہر ذاتی شے ملکیت ہوتی ہے، تو کیا محبت سے دست بردار ہو جاؤں۔ جانی! جانوروں کے محض طاقت پر اُستوار "غیر طبقاتی" معاشرے میں پرندوں کا گھونسلہ ہوتا ہے، سانپ اور رینگنے والے جانور اپنی اپنی بلوں میں رہتے ہیں، شیر کچھار میں رہتا ہے، سب جان دار گروہوں کی شکل میں اپنی اپنی پناہ گاہ میں رہتے ہیں، میری کوئی پناہ گاہ نہیں ہے، کیا پناہ گاہ نہ ہونے کی بات کرنا ملکیت پرستی کا دکھڑا ہے۔"

آج کے بعد عشرتِ مجلسِ شامِ غم کہاں
دل نہ لگے گا تیرے بعد پر تیرے بعد ہم کہاں

جون بھائی ہمیشگی کی سند کوئی نہیں دے سکتا، شاعری اپنی طاقت سے آگے جاتی ہے۔ ظاہر ہے آپ نے بھی بڑی شاعری کی ہے۔ کیا کبھی کوئی بات کہہ جانے، کوئی شعر لکھ جانے یا کسی غزل کے ہو جانے پر آپ نے یہ سوچا کہ آپ نے اپنے حصے کا بڑا کام کر لیا؟

"نہیں ایسا نہیں ہے، میرا اطمینان بہت عارضی، بہت وقتی، بہت لمحاتی ہوتا ہے، میں ابھی ایک شعر کہہ کر، ایک غزل لکھ کر آسودہ ہوا ہوں، اگلے ہی لمحے یا کچھ دیر بعد، یا کئی روز بعد، یا چند ماہ بعد مجھے اپنے اطمینان پر غصہ آ جاتا ہے۔ مجھے اپنی کہی ہوئی باتوں میں کیڑے کلبلاتے نظر آتے ہیں۔ مجھے اپنے لکھے ہوئے شعروں میں ترامیم کرنا پڑتی ہیں۔ میں کاملیت کی جست جو میں ہوتا ہوں، میرے تخلیقی اطمینان کے لمحے بہت عارضی ہوتے ہیں۔ مجھے اپنی ہی جراحت کرنی پڑ جاتی ہے۔ میں اپنے چھپے ہوئے اور غیر مطبوعہ اشعار میں ترامیم کرتا رہتا ہوں۔"

یہ کیا بات ہوئی کہ آپ اپنی آمد کی واردات میں ہونے والی تخلیق کی آورد کی

قینچیوں سے کانٹ چھانٹ کریں۔ایک خاص لمحے میں،ایک خاص موسم میں،ایک خاص معروض میں،ایک خاص کیفیت میں،ایک خاص حالت میں ایک شعر،ایک نظم،ایک غزل، ایک بیت،ایک رباعی کی تخلیق ہوئی،آپ نے ایک دوسرے ماحول، دوسرے معروض، دوسری کیفیت، دوسرے موسم، دوسرے زمانے اور ایک دوسری شعری لہر میں آورد کے ہتھیاروں سے آمد کی حالت میں تخلیق کی مرمت شروع کردی؟

''جانی!وہ بھی میں تھا اور یہ بھی میں ہوں۔میری تخلیق کی شعوری حالت نیم خوابیدگی میں بھی مجھ سے جدا نہیں ہوتی،تُو کیا سمجھ رہا ہے،جس نے شعر تخلیق کیا،وہ کوئی اور تھا،اور جو ترمیم کررہا ہے،وہ کوئی اور ہے،تم کیا یہ سوچ رہے ہو جس نے پہلی بار شعر لکھا،وہ جون ایلیا تخلیق کار تھا اور یہ دوسرا جون ایلیا جو ترمیم کررہا ہے یہ تخریب کار ہے۔

میں تخلیق کے لمحے میں جون ایلیا ہوتا ہوں اور ترمیم کے لمحے میں بھی جون ایلیا ہی ہوتا ہوں۔تخلیق اور ترمیم کے لمحوں میں میری کیفیات یک ساں ہوتی ہوں۔

جانی! میں کاملیت پسند ہوں، نامکمل چیزیں، ادھورے جذبے، ادھوری خوشیاں، ادھوری راحتیں،ادھوری زیب و زینت،ادھوری کیفیات،ادھوری سوچیں،ادھورے افکار، ادھورے لوگ، یہ سب مجھے پریشان کردیتے ہیں۔میں کم از کم اپنی ادھوری چیزوں کو تو مکمل کرنے کی کوشش کرسکتا ہوں۔ مجھے اگر اپنے کسی شعر میں ادھوراپن نظر آجائے تو کیا میں اُسے یوں ہی چھوڑ دوں، میں دوسروں کی غلطیاں ٹھیک نہیں کرسکتا،کم از کم اپنی غلطیاں تو ٹھیک کرسکتا ہوں۔میری تخلیق میری تخلیقی ریاضت سے جنم لیتی ہے،میری ترمیم بھی میری تخلیقی ریاضت کے نتیجے میں ہی جنم لیتی ہے ۔یہ نظریاتی ترمیم پسندی نہیں،یہ تخلیقی ترمیم پسندی ہے۔''

جون بھائی کے بارے میں،ان کی یادوں کے بارے میں،ان کی باتوں بارے میں،ان کے مشاعروں، مباحثوں، مناظروں، مجلسوں، محفلوں، جھگڑوں، کج بحثوں کے بارے میں الگ الگ دفتر درکار ہیں۔جون ایلیا ہمارے عہد کے اعلیٰ ترین انسان دوست شعور کا نہ صرف فہم رکھتے تھے، بل کہ اس شعور کے فکری نمائندہ بھی تھے۔ جون ایلیا، جمال کے جویا تھے۔اسی لیے وہ جمالیات کی پیکر تراشی کو ایک صنعت کے طور پر لیتے تھے،

وہ نئی نئی جمالیاتی تخلیقی اختراعات سے حُسن کی نئی جہتیں بیان کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں پیالۂ ناف ایک مستقل موضوع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

جون بھائی! آپ کو حُسن کیسے متاثر کرتا ہے؟ آپ حسن کو کیسے محسوس کرتے ہیں، آپ کو حُسن کا ابلاغ کیسے ہوتا ہے، کیا حُسن محض ظاہری ظہور کرتا ہے، یا پھر حُسن کا باطنی ابلاغ یا باطنی ظہور بھی ہوتا ہے؟ جون بھائی حُسن شاہد ہے؟ مشہود ہے یا مشاہدہ ہے؟

''جانی! حُسن قیامت ہے، بلائے ناگہانی ہے، حُسن جنگل میں ناچتا مور ہے، حُسن صحرا کی ہرنی ہے، حُسن ندی کا بہتا پانی ہے، حُسن پہاڑ سے گرتی آبشار ہے، حُسن ہریالی ہے، حُسن قوسِ قزح کا ہر رنگ ہے، سب رنگ ہے، اچھا تو کیا حُسن مُونالیزا میں ہے یا اس کی مسکراہٹ میں ہے، جانی! میں تو یہ کہتا ہوں کہ حُسن لیونارڈو ڈاونچی کی انگلیوں میں ہے، میں نے حُسن بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے، میری ماں بہت حسین عورت تھی، اتنی حسین کہ میں اُسے محویت سے دیکھتا رہتا، تم مجھ سے پوچھو کہ حُسن کہاں نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ ظالم کے ظلم میں حُسن نہیں ہے، ناانصافی میں حُسن نہیں ہے۔ عدم توازن میں حُسن نہیں ہے، دیکھنے والی آنکھوں کی بے حسی کی بے نوری اور بے بصارتی میں حُسن نہیں ہے، جانی! حُسن ہمہ پہلو، ہمہ جہت، ہمہ رنگ حُسن ہوتا ہے، حُسن شاہد بھی ہے، مشہود بھی ہے اور مشاہدہ بھی ہے، حُسن کے بارے میں یہ طے سمجھو، یا تو حُسن ہوتا ہے یا حُسن نہیں ہوتا ہے۔ حُسن گومگو، حُسن چُون و چرا نہیں ہوتا، حُسن مجہولیت نہیں ہوتا، حُسن عبثیت نہیں ہوتا، حُسن لایعنی نہیں ہوتا۔''

جون بھائی، سیاست اور سیاسی عمل کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ وہ سماج کے بنیادی سوالات اور گنجلک مسائل کے حل کے لیے سیاسی عمل، سیاسی تحرک اور سیاسی سرگرمی کو لازمی تصور کرتے تھے۔

جون بھائی! آپ سیاست کو سماج کے لیے کیوں ضروری سمجھتے ہیں۔ سماج آرٹ، شاعری، مصوری، خطاطی، موسیقی اور فنِ تعمیر کی جدّتوں سے بھی تو نہ صرف قائم رہ سکتا ہے بل کہ آگے بھی بڑھ سکتا ہے۔ سیاسی عمل سماج کو بانٹ دیتا ہے، منقسم سماج کیسے آگے بڑھے گا؟

''سیاست اس لیے ضروری ہے کہ سماج کسی قطعی اور مطلق آمریت کے آگے ہتھیار
نہ ڈال دے۔ سماج میں طاقت کی خودکاریت طبقات پیدا کرتی ہے اور اسے ہر صورت میں
اس طبقاتی تقسیم کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ طاقت کا بنیادی جوہر اور بنیادی خمیر۔۔۔ ناانصافی
سے اُٹھتا ہے۔ سیاست اور سیاسی عمل کا بنیادی وظیفہ اس بے مہار طاقت کے آگے
بند باندھنا اور انفرادی طبقاتی طاقت اور اقتدار کو عوام کی خواہشوں کے تابع بنانا ہوتا ہے۔''

''دیکھو جانی! ہمارے سماج کے ہر طرح کے معاشی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل
آمروں اور امیروں کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ وہ ریاست کی ادارہ جاتی مطلق طاقت کے
ذریعے اسٹیٹس کو، کو زیادہ سے زیادہ پائیدار بنانے کے لیے ہر عمل کو جائز سمجھتے ہیں۔ وہ
فتوے باز جو کر خرید لیتے ہیں، وہ خوش الحان گائیک خرید لیتے ہیں، وہ اپنے مجسمے بنوانے اور
ان کی چوراہوں پر نمایش کرانے کے لیے سنگ تراش خرید لیتے ہیں۔ وہ اپنی طاقت اور
اقتدار اور خواہشات کو الہامی، آفاقی اور منجانب اللہ قرار دے کر اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ
اور بھگوان کا اوتار قرار دیتے ہیں اور اپنے حق میں مذہبی پیشواؤں سے فتوے جاری کراتے
ہیں۔ جانی! بے چارے انسان کے ساتھ بڑا دھوکا ہوتا آیا ہے۔ اسے خواب آور بے طاقتی
اور نامردی کا مشروب پلا کر طاقت ور کے آگے سُلا دیا جاتا ہے۔ اسے صرف اتنے تخلیقی عمل
کی اجازت ہوتی ہے جو حکم ران طبقہ کے لیے ضروری ہے، اگر کوئی تخلیق، کوئی سیاسی
عمل، کوئی پیداواری حکمت عملی حکم رانوں کے مفاد کے تابع نہ ہوگی وہ مطلق حرام اور مردار
قرار پائے گی۔ سیاست اور سیاسی عمل ان ساری بدکاریوں کی مزاحمت کرتا ہے۔''

''جانی! انسانی سماج بھیڑ بکریوں کا ریوڑ نہیں ہوتا، انسانی معاشروں میں تنوع ہوتا
ہے، ہمہ رنگی ہوتی ہے۔ آپ انسانوں کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانک سکتے، انسانی معاشروں
کی ساری جدوجہد ہی ہانکے جانے کے عمل کے خلاف رہی ہے، انسان نے سیاسی عمل اور
سیاست کے ذریعے ہانکے جانے کے عمل کی مزاحمت کی۔ انسان کی ساری جدوجہد
آزادیوں کے لیے رہی ہے۔ انسان جینے کا حق چاہتا ہے، انسان نقل و حرکت کی آزادی
چاہتا ہے، انسان آزادانہ طور پر سوچنے اور اپنے حق میں بہتر نتائج اخذ کرنے کی آزادی
چاہتا ہے۔ انسان اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے کی آزادی چاہتا ہے، مگر ریاستی اتھارٹی

چاہتی ہے کہ لوگ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر نقل وحرکت نہ کریں، ریاستی اتھارٹی چاہتی ہے کہ ہر انسان صرف ویسا سوچے اور اس قدر سوچے جیسے جس قدر اتھارٹی کی اجازت اور ضرورت ہو۔ ریاست کی اس مطلق العنانیت اور قطعیت پر مبنی فیصلہ سازی کا راستہ سیاست اور سیاسی عمل روکتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطلق العنان اتھارٹی سیاست اور سیاسی عمل پر بھی قبضہ جما لیتی ہے، اتھارٹی کے اس قبضہ کے خلاف مزاحمت بھی سیاسی عمل اور سیاست کے ذریعے کی جاتی ہے۔ میں ہر انسانی معاشرے کے لیے سیاست اور سیاسی عمل کو ازبس ضروری سمجھتا ہوں۔''

جون بھائی سیاست میں فاشزم کے شدید مخالف تھے۔ وہ مختلف گروہوں کی نسل پرستانہ سیاسی اپروچ کو برداشت کرنے کے روادار نہ تھے۔ وہ ادب اور سیاست کے بارے میں لگی لپٹی کے بغیر کھلی بات کرتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے بحران کے ایام وہ جو باتیں کر رہے تھے، وہ ہماری مقتدرہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ بہت سے لوگوں کو تو وہ باتیں آج بھی سمجھ نہیں آ رہیں۔

جون بھائی، کیا ہوا؟ بنگال نے علیحدگی کی راہ کیوں اختیار کر لی تھی۔ برصغیر کے تمام خطوں میں سے بنگال وہ پہلا علاقہ تھا جہاں انگریزوں کو چیلنج کیا گیا۔ پلاسی میں لارڈ کلائیو کے ساتھ اہلِ بنگال کی جنگ ہندوستان کی جنگِ آزادی سے ایک سو سال قبل 1757ء میں لڑی گئی۔ پھر بنگال تحریکِ آزادی میں پیش پیش رہا۔ قراردادِ لاہور بنگال کے لیڈر اے کے فضل الحق نے پیش کی۔ پھر بنگال میں غصہ پیدا کیوں ہوا۔ بنگالی ناراض کیوں ہوئے؟

''یار دل دُکھتا ہے، اذیت محسوس ہوتی ہے، سینہ بوجھل ہو جاتا ہے۔ ہماری حکم ران اشرافیہ نے، ہمارے منصب داروں نے، ہماری صنعتی اور مالیاتی لوٹ مار مافیا نے بنگال کو اپنی چراگاہ سمجھ لیا تھا۔ انھیں بنگال کی چیخیں سنائی نہ دیں، وہ بنگال کا درد جاننا نہیں چاہتے تھے بل کہ وہ تو بنگال کو درد دینا چاہتے تھے۔ وہ بنگال کی موسیقی، وہاں کی زبان، وہاں کی شاعری، وہاں کے ادب، وہاں کی دانش کا اقرار نہیں کرتے تھے بل کہ انکار کرتے تھے۔ بنگالیوں کے خلاف فتویٰ فروشی کا دھندا ہوا، یہاں کے کلمہ فروشوں نے دین کو دھندہ بنا لیا۔ یہاں کے بلوانوں کو بنگالیوں کی نسل کشی کے ساتھ اُن کی نسل تبدیل کرنے کا خیال آیا اور وہ

اُن کی نسلیں بدلنے کے کام پر لگ گئے۔آپ نے پاکستان بنانے والی نسل کی بنگالی قیادت کو غدار کہا، چور کہا، اس قیادت کو رُسوا کیا گیا۔آپ کا مفلوج، اپاہج اور فاتر العقل، عقلِ کل قرار پایا اور وہاں کی اجتماعی دانش مکمل جہالت قرار پائی۔ جانی، آپ نے جو بویا وہ کاٹا۔ آپ نے طاقت کو کُلی حقیقت اور مکمل سچ مان لیا، آپ نے سازش کو ذہانت سمجھ لیا، آپ بنگال کو صرف غلام بنے رہنے کی شرط پر ساتھ رکھنا چاہتے تھے، کیا اُن پر انسانوں نے راج کیا؟ نہیں وہاں پر بدکاروں اور لفنگوں نے راج کیا، وہاں پر طوائفوں نے حکم رانی کی۔ وہاں دھگڑے اور دلال حکم رانی کرتے رہے اور اُس پر رہی سہی کسر فوجی آپریشن نے پوری کر دی، وہاں انسان مارے جا رہے تھے اور آپ گنتی میں مصروف تھے۔ اگر ایک یہ کہتا کہ فوجی آپریشن میں دو لاکھ بنگالی مارے گئے تو دوسرا جوش میں آ کر اس کی تردید کرتے ہوئے کہتا کہ نہیں دس لاکھ غدار بنگالیوں کو واصلِ جہنم کیا گیا۔ اس بیان پر بیان دینے والوں کی باچھیں کھل جاتیں، اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا، وہ بنگالیوں کی نسلیں تبدیل کرنے کی کہانیاں خوش ہو ہو کر سناتے، کیا لوگوں کو ساتھ رکھنے کے یہی طریقے ہوتے ہیں۔ جب کسی بھی خطے میں ایسی صورتِ حال ہوتی ہے تو بیرونی مداخلت کے دروازے کُھل جاتے ہیں، پھر اس کے بعد جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ قسمت کا لکھا بن جاتا ہے حالاں کہ اسے ہم نے ہی لکھا ہوتا ہے۔ بنگال میں جو کچھ ہوا، وہ ہماری حکم ران اشرافیہ کے اعمال، افعال اور وحشیانہ کارروائیوں کا نتیجہ تھا، یہ ہونی تھی اَن ہونی نہیں تھی۔"

جون ایلیا کی پہچان شاعری، انشا پردازی، ان کے بھائی رئیس امروہوی، سید محمد تقی اور کراچی شہر رہے، کراچی سے ان کی خاص وابستگی تھی۔ زندگی کی آخری تباہ کن اور اذیت ناک عذابوں سے قطع نظر کراچی ان کا سب سے معتبر حوالہ تھا، کوئی گھر نہ ہونے کے بعد بہ ہر حال ہر سفر کے بعد بالآخر پلٹنا تو کراچی میں ہی ہوتا تھا۔

جون بھائی کراچی نے آپ کو بہت دُکھ دیے، سُکھ بھی بہت دیے، آپ کو سب سے زیادہ محبتیں اور نفرتیں بھی یہاں پر ملیں۔ آپ کو اچھی نیند یہاں پر آئی اور آپ کو دائمی بے خوابیاں بھی اسی شہر میں ملیں، آپ کراچی کو کیسے دیکھتے ہیں؟ کراچی کے شب و روز آپ پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟

"کراچی وہ شہر ہے جہاں مجھے سب سے زیادہ چاہا گیا، اسی شہر میں میری زندگی کی متاعِ عزیز چھنی گئی۔ دنیا کے کئی شہروں میں، میں اس شہر کی پہچان بنا اور یہ شہر جگہ جگہ اور ہر جگہ میری پہچان بنا۔ میں اس شہر کے ہجر میں اپنی محبوبہ کے ہجر کی طرح رویا ہوں۔ اس شہر میں میرے بھائی کا قتل ہوا۔ اس شہر میں میرے نکاح کی نسبتیں ہوئیں، اسی شہر میں بڑی جان لیوا سرد مہری کے ساتھ مجھ سے تحریری طلاق کا مطالبہ ہوا۔ اس شہر میں جگہ جگہ میرا خیر مقدم ہوا، اسی شہر میں مجھ سے بے مہری برتی گئی۔ اس شہر میں رات رات بھر میرے شعر سُنے گئے، اسی شہر میں میرے اردگرد مجمع لگتا رہا، اور اسی شہر میں، میں کئی کئی راتوں تک تنہا رہا، بے یار و مددگار ہو جانے کا احساس مجھے اسی شہر میں ہوا۔ اسی شہر میں مجھ سے والہانہ وارفتگی کے ساتھ عشق کیا گیا اور اسی شہر میں مجھ سے حقارت آمیز سلوک کیا گیا، میری زندگی کی عزیز ترین ہستی اسی شہر میں ہے، مجھے برباد کر دینے والی ہستی بھی یہاں پر ہی ہے۔ نذیر! تجھے یاد ہے، ہم اس شہر میں کتنا پیدل چلے، ہم نے کتنا سفر رکشا میں کیا اور یہی وہ شہر ہے جہاں ہم گلی کے باہر بھی نہیں جھانک سکتے تھے۔ جانی! یہ بڑا عجیب و غریب شہر ہے، میں نے اس شہر میں لہو تھوکا ہے، میں کبھی اس شہر میں شاد کام بھی ہوا اور تباہ بھی یہاں پر ہی ہوا۔"

جون ایلیا نے شاعری کی۔ ہر شاعر کی اپنی ایک معروضیت، اپنی ایک خارجی زندگی، اپنی ہی ایک داخلی کائنات، اپنا مطالعہ، اپنا مشاہدہ، اپنا اکتسابی اور وجدانی فکری نظام، اپنا زاویۂ نگاہ، اپنے مخصوص اور غیر مخصوص احباب اور اشیا، عوامل اور محرکات سے نتائج اخذ کرنے اور ان نتائج کو شعری قالب میں ڈھالنے کا اپنا اپنا نظام ہوتا ہے۔ ہر روز ہزاروں شاعر، لاکھوں شعر کہتے ہیں، مگر زندہ وہ شعر رہ جاتا ہے جس میں اپنے عہد کی اور آگے چل کر ہر عہد کی اعلیٰ ترین ذہنی ریاضت سے عمدہ ترین پیرائیہ میں سب سے بڑا عقدہ بیان کیا گیا ہو یا اس کا حل پیش کیا گیا ہو یا اس شعر کو اپنے عہد کی معتبر ترین فکری لہر سے جوڑ دیا گیا ہو۔ ہر عہد کی ایک مخصوص معروضیت میں ایک سے زیادہ شاعروں کا داخلی فکری نظام الگ الگ سطح کا ہوتا ہے، اس لیے ان کی شعری تخلیق بھی مختلف سطح کی ہوتی ہے۔ میر کا، غالب کا، آتش کا، ناسخ کا، ذوق کا، مومن کا، جون کا داخلی فکری نظام الگ الگ ہے، اس لیے ان کی تخلیقات کی سطحیں بھی جدا جدا ہیں۔ مگر اپنے عہد کی سب سے نمائندہ فکری لہر سے مربوط ہو

جانے پر ہی ان کے اشعار کو زندگی ملی۔

جون بھائی! آپ جون ایلیا کو شاعروں کی صف میں کس مقام پر پاتے ہیں؟

''میں نے کوئی بڑی شاعری نہیں کی۔ اپنی شاعری کے بارے میں میرا کوئی بھی دعویٰ برہانِ قاطع نہیں ہوسکتا۔ میں نے کچھ ایسے اشعار لکھے ہیں جنھیں میر اور غالب کے بڑے شعروں کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ میں میر کے شعری خاندان کا شاعر ہوں۔ شاید کی اشاعت کے بعد میں اپنے اس مجموعے کی شاعری کو دوبارہ لکھے جانے کے قابل سمجھتا ہوں، اب تک شاید کے جتنے ایڈیشن آئے، میں نے ہر ایڈیشن میں اپنے بہت سے شعروں کو دوبارہ لکھا ہے۔''

جون ایلیا پر لکھنا میرا منصب نہیں، میں محض ادب اور شاعری کا ایک نالائق قاری ہوں۔ میں نے 45 سال تک صحافت کی مگر اب تک صحافی نہ بن سکا، جون ایلیا کی زندگی کے آخری دنوں کی کچھ یادوں اور کچھ نوٹس کے باعث میں شکیل عادل زادہ اور خالد انصاری کے حکم کی تعمیل میں جون بھائی کے بارے یہ چند منتشر خیالات پیش کرنے کے قابل ہوسکا۔

یار زندہ صحبت باقی۔

ناکام آدمی۔ کام یاب شاعر

پروفیسر نجمی صدیقی

جون ایلیا نے اپنی شاعری کو ناکام آدمی کی شاعری کہہ کر قاری کو جس طرح چونکایا ہے اس طرح بڑی سے بڑی جان لیوا خبر بھی کسی شخص کو چونکا نہیں سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ جسے رایگاں جانا چاہیے اگر وہ رایگاں چلا جائے تو اس میں ناکامی کیسی؟ مثال یہ ہے کہ اگر کوئی رئیس زادہ جو منھ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہو اور دولت و تموّل سے مزیّن سونے کی سِل پر بیٹھ کر ابھی تک ساری وراثت اور دولت ضائع نہیں کر سکا اور بہت کچھ اُس کے پاس باقی ہے تو یقیناً وہ شخص ناکام ہے۔ اگر کوئی قلاش و نادار شخص اپنی زندگی کا نصب العین مقرر کر لے کہ میں اپنی محنت سے غربت کو دُور کروں گا اور موت کے ہنگام تک ہزاروں مکانات، زمینیں اور باغات حاصل کر لوں گا اور موت کے وقت اُس کے پاس اگر ہزاروں کے بجائے سیکڑوں زمینیں اور باغات بھی ہوں تو وہ کام یاب انسان نہیں کہلا سکتا۔ اوّل الذکر شخص اپنے آپ کو پوری طرح برباد نہیں کر سکا، ناکام گیا اور موخر الذکر اپنے آپ کو کام یابی کے اُس زینے تک نہیں پہنچا سکا جو اُس کا مقصود تھا، ظاہر ہے دونوں اپنے مقاصد میں ناکام رہے اور رایگاں گئے۔ مگر جون ایلیا جسے رایگاں جانا چاہیے تھا اور وہ رایگاں چلا گیا تو یہ ناکامی نہیں، کام یابی ہے۔

جون ایلیا کا گھر شاعری، تاریخ، مذاہب، علمِ ہیئت اور فلسفے کی دہکتی آگ پر رکھی کٹھالی کی طرح تھا جس میں اتنی حدت ہر وقت موجود رہتی تھی جو مِس خام کو بھی کندن میں تبدیل کر سکتی تھی۔ جن راستوں سے کبھی دریا گزرتا ہے، اپنے پیچھے نمی ضرور چھوڑ جاتا ہے۔

جون ایلیا اُن خوش بخت شاعروں میں سے ہیں جنھیں علمی اور ادبی دُنیا میں اپنے طلوع کے لیے من پسند اُفق تلاش کرنے کی زحمت نہیں اُٹھانی پڑی۔ عطارد، مریخ، زہرہ اور مشتری جیسے سیارگان جس کے افرادِ خانہ کی طرح ہر وقت زیرِ بحث رہیں، اسے روشنی کے لیے کہیں اور جانے کی ضرورت کیا؟

بہ ہر حال جون ایلیا نے اپنے گھرانے اور زمانے سے جو کچھ لیا، نہایت فیاضانہ انداز سے تحقیقی سطح پر لوٹایا بھی ہے۔ اُن کے قلم سے تراجم و تصنیفات کی صورت میں بہت کچھ منظرِ عام پر آچکا ہے۔ جس سے جون ایلیا کے قد کاٹھ کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں رہا۔ ان کے کیے ہوئے تراجم اور تصنیفات کی فہرست طویل ہے۔ جہاں تک اُن کی شاعری کا تعلق ہے، جون ایلیا نے پہلا شعر ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو کر ہی کہا تھا، جسے انھوں نے اپنی تحریروں میں غزالہ کے بجائے قتالہ لکھا ہے۔

چاہ میں اُس کی تمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

جون ایلیا کے فن اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جون ایلیا نہ ایک دن میں جون ایلیا بنے ہیں اور نہ کسی ایک تحریر میں اُن سے انصاف کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنے لیے آسانی اس میں دیکھی ہے کہ جون ایلیا کے ایسے پہلو پر بات کروں جسے میں اپنے لیے پسندیدہ خیال کرتا ہوں۔ اگر کہیں ریت، چکنی مٹی اور چینی ڈھیر کی ہوئی ہو تو اُس میں ریت کسی معمار کا حصہ ہے، مٹی ماہر کوزہ گر کی ضرورت اور اس ڈھیر میں جو چینی بچ رہے گی اُسے چیونٹیاں دانہ دانہ کر کے لے جائیں گی۔ ضرورت اپنی اپنی اور پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ میں جون ایلیا کی شاعری کے بارے میں اتنا ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اُردو نظم اور غزل دونوں اصناف پر جون ایلیا کی گرفت قابلِ رشک حد تک مضبوط ہے۔ غزل میں اُن کا ذاتی اور منفرد لہجہ ہے جب کہ زبان کا چٹخارا الگ جمالیاتی حظ کا ذریعہ بنتا ہے۔ غزل کے نقار خانے میں کسی کا اپنی آواز کو لائقِ سماعت بنا لینا، فطری صلاحیت کے بغیر کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کسی ہیرے کو بھی پالش کرنے اور چمکانے کے لیے رگڑنا پڑتا ہے جب کہ عام پتھر یا کوئلے کو گھسنے اور

رگڑنے سے بھی کوئی اسپارک پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ کہتے ہیں کوئی بڑے سے بڑا کاری گر بھی ناقص لوہے سے اعلیٰ تلوار نہیں بنا سکتا۔ شاعری کے لیے شاعرانہ جینیکس کا موجود ہونا بنیادی شرط ہے۔ نہ صرف شاعر کے لیے، شاعری کے سنجیدہ قاری کے لیے بھی شعری ذوق کی تہذیب ضروری ہے ورنہ اچھا شعر کہنے کی حد تک تو جمالیاتی خوب صورتیوں سے مزین ہو سکتا ہے، سماعتوں کو متاثر نہیں کر پاتا۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی فاتر الحس شخص جس طرح اچھے ذائقوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اسی طرح اندھا رنگوں کی آمیزش سے پیدا ہونے والے حسن کے ادراک سے محروم رہتا ہے۔ آگ اپنی لپیٹ میں تو ہر شے کو لے سکتی ہے مگر وہ صرف سوختنی چیزوں ہی کو جلا سکتی ہے۔

اچھے شعر کی شعریت سے صرف صاحبانِ ذوق ہی لطف اُٹھانے کے لائق ہوتے ہیں۔ بہ ہر حال جون ایلیا کی شاعری سے ان کا قاری کئی ایک سطحوں پر لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ الفاظ سے تصویریں بناتے ہیں۔ مفہوم کو فکری گہرائی اور تحقیقی آنچ کے ایسے زاویوں سے گزارتے ہیں کہ اُن کا شعر سنار کی جنتری سے کھنچا خالص سونے کا نرم و نازک تار لگتا ہے۔ الفاظ کی مزاج دانی جون ایلیا کو عام بیانیۂ اظہار کی سطح سے اُوپر اُٹھا کر ابلاغ کی اُن بلندیوں تک پہنچاتی ہے جہاں سے معنی کے ایسے آفاق پر بھی نظر پڑتی ہے جو عام طور پر آنکھ سے اوجھل رہتے ہیں اور جن پر عمومیت کی دبیز دھند چھائی ہوتی ہے، جس طرح اونچے کہساروں کی برف پوش چوٹیوں پر۔

جون ایلیا کی شاعری نظم کی شکل میں ہو یا غزل کی صورت میں پڑھ اور سُن کر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ بہ حیثیت غزل گو شاعر دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، اسے داخلی ذہنی فضا میں مقید رہ کر ہی نہیں دیکھتے بل کہ اپنے اندر باہر، آگے اور پیچھے، چاروں طرف کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا ذوق رکھتے ہیں اور زندگی کے گرم و سرد کو جھیلنے کا جگر بھی۔ اُن کی نظر کائنات کے جمال ہی تک محدود نہیں رہتی، انھیں جلال میں بھی پراسرار کیفیات کا جہانِ نو دکھائی دیتا ہے۔ جون ایلیا درد سے لطف اندوز ہونے کا ملکہ رکھتے ہیں اور خوب صورتیوں سے بھی حظ اُٹھاتے ہیں۔ سیاست، معاشرت، مذہب، معیشت سبھی کچھ جون ایلیا کے فنِ شعر گوئی کے لیے ہموار اور وسیع کینوس فراہم کرتا ہے جس پر وہ اپنے مطالب و مفاہیم کے نقش ہائے

رنگارنگ سجاتے چلے جاتے ہیں۔ جون ایلیا کی شاعری کھلی آنکھ سے دیکھنے اور کشادہ دلی سے محسوس کرنے کے بعد وجود میں آتی ہے۔ نظم اور غزل جون ایلیا کے لیے ایسے آفاق ہیں جن پر وہ روشن ستارے کی طرح چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی فنا و بقا دونوں پر برابر نظر پڑتی ہے۔ زندگی کا ست اور تاراجی عمل ہو کہ بساط کے اُلٹنے کا تیز رفتار منظر، تخلیقی سطح پر جون ایلیا کے لیے دونوں اہم ہیں۔

ہے بکھرنے کو یہ محفلِ رنگ و بو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے
ہر طرف ہو رہی ہے یہی گفت گو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے
کوئی حاصل نہ تھا آرزو کا مگر، سانحہ یہ ہے اب آرزو بھی نہیں
وقت کی اس مسافت میں بے آرزو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

غزل تو غزل ہے، جون ایلیا کی نظم کے اکثر اشعار کو جو کسی مضمون کے تواتر و تسلسل کے رشتے میں پرو کر پیش کرنے کا منشور لیے ہوتے ہیں اگر الگ الگ پڑھا جائے تو وہ غزل کے اشعار کا سا ہمہ جہتی تاثر بناتے ہیں۔ جون ایلیا گھسے پٹے مضامین کو بھی اس فنی مہارت سے اشعار کی زینت بناتے ہیں کہ وہ تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ دُنیا سے وفا اُٹھ گئی ہے، جب وفا رہی ہی نہیں تو اُس کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے۔ شعر دیکھیے۔

اِک شخص کر رہا ہے ابھی تک وفا کا ذکر
کاش اس زباں دراز کا منھ نوچ لے کوئی

اس شعر کو تازگی سے نوازتے ہوئے الفاظ صرف دو ہیں۔ 'ابھی تک'۔ جن کے گرد شعری جمالیات کا جادو تاثیر میں ڈھل گیا ہے۔ یعنی اس امر کے انکشاف کے بعد کہ دُنیا سے وفا اُٹھ چکی ہے، وفا کا ذکر بھی مجرمانہ جسارت نہیں تو اور کیا ہے۔

جون ایلیا نے فنِ شعر گوئی تک رسائی کے لیے جو کچھ بھی سیکھا ہے اپنے گھر کے در و دیوار اور صحن کی منطق اور فلسفے کی کشادہ علمی اور ادبی فضاؤں سے سیکھا ہے۔ جون ایلیا کا سیاسی شعور بھائی نازش کی عطا ہے۔ نہ صرف یہ بل کہ کمیونزم سے جون ایلیا کی وابستگی بھی

انھی کی دین ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سارے اثرات کسی نہ کسی صورت جون ایلیا کی غزلوں اور نظموں میں بنیادی عناصر کے طور پر موجود ہیں۔ اس کے باوصف وہ کسی بھی فلسفے یا ازم سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے۔ تشکیک، تحقیق اور تلاش انھیں کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔ گویا جون ایلیا کے لیے گرد و پیش میں جو کچھ بھی موجود ہے اجنبی ہے اور ہمہ وقت یہ جاننے کی کوشش میں رہتے ہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہے۔ سوال پوچھنا وہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اگر کہیں بدنظمی یا بے نظامی ہے تو کیوں ہے؟ کہیں کوئی نظام ہے تو وہ کیوں ہے؟

تھی اک عجب فضا سی امکانِ خال و خد کی
تھا اک عجب مصور اور وہ مرا گماں تھا
عمریں گزر گئی تھیں ہم کو یقیں سے بچھڑے
اور لمحہ اک گماں کا صدیوں میں بے اماں تھا

جون ایلیا فکر و فلسفہ کے شاعر ہیں مگر رومانی جذبے انھیں تغزل کے لیے ناگزیر لگتے ہیں۔ ہجر و وصال، امید و بیم، وفا و بے وفائی، جون ایلیا کی غزل میں لطیف جذبات کے اظہار کے لیے نادر تلازموں کا حکم رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں خالص زبان کے اشعار بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

بولتے کیوں نہیں مرے حق میں
آبلے پڑ گئے زبان میں کیا
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

میں تو سودا لیے پھرا سر میں
خاک اُڑتی رہی مرے گھر میں

جون ایلیا کی غزل کلاسیکی چہرے پر جدید حسیات کا غازہ مل کر نکلی ہے۔ جس میں شرمانا، لجانا کم اور بے باکی زیادہ ہے۔

کیا ہے گر زندگی کا بس نہ چلا
زندگی کب کسی کے بس میں ہے

ذات ہے اعتبارِ ذات نہیں
اب تو میں خود بھی اپنے سات نہیں

جون ایلیا کی نظم سے لیے گئے چند اشعار۔

تم بہت جاذب و جمیل سہی
زندگی جاذب و جمیل نہیں
نہ کرو بحث ہار جاؤ گی
حسن اتنی بڑی دلیل نہیں

جون ایلیا بلا کا حسّاس شاعر ہے۔ کثیر المطالعہ ہونے کی وجہ سے اُن کی فکر گہرائی اور گیرائی میں ڈوب کر یک سر نئے جمالیاتی اسلوب میں ڈھل گئی ہے جس میں نفسیاتی قلق لازمی عنصر کا درجہ رکھتا ہے۔

کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے
کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

میرے ماموں

ہما رضوی

بان ندی کے پاس امروہے میں جو لڑکا رہتا تھا
اب وہ کہاں ہے، میں تو وہیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی

میرے ماموں جون ایلیا یعنی امروہے کا وہ لڑکا آج اس دنیا میں نہیں ہے۔ ہر مرتبہ کراچی واپس جانے کے بعد امروہہ پھر آنے کی خواہش اور تڑپ جون ماموں کو زندگی بھر رہی لیکن اس بار یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اکثر جون ماموں مجھ سے کہتے تھے کہ 'بالی میرے بارے میں تُو بھی کچھ لکھ۔' میں ان سے یہ کہہ دیتی تھی کہ آپ کے بارے میں تو بہت کچھ لکھا جاتا رہتا ہے اور چھپتا رہتا ہے تو ان کا یہ جواب ہوتا کہ 'اپنے ماموں پر تو تُو ہی لکھ سکتی ہے۔'

امیؔ کے چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے جون ماموں تھے۔ بچپن میں رات کو لیٹ کر امیؔ ہمیں ماموؤں کی باتیں لوری کی جگہ سنایا کرتی تھیں۔ جو ہم سے دُور تو تھے لیکن امیؔ کی آنکھوں میں ہر وقت سمائے رہتے تھے۔ ان کی یادیں اور باتیں سنانے کے بعد امیؔ ایک شعر پڑھا کرتی تھیں۔

اچھن چھبن بچھن جون
ان چاروں میں اچھا کون؟

اور ہم سب ساتھ کہتی تھیں۔ 'جون'۔ جون ماموں امیؔ سے تین سال بڑے تھے لیکن امیؔ ان کا نام لیتی تھیں اور وہ بھی امیؔ سے ایسے ناز نخرے کرتے تھے جیسے چھوٹا بھائی ہو۔ امیؔ بھی ان کو بڑی بہن کی طرح رعب میں رکھتی تھیں۔ اکثر ہم بہنوں سے شکایت کرتے تھے کہ یہ تمھاری ماں جو ہے بہت اتراتی ہے اور ہم سب کو ڈانٹتی ہے، سمجھتی ہے کہ وہ ہماری اکلوتی اور چہیتی بہن ہے۔

جون ایلیا کا فن، ان کی شاعری اوران کے انداز اوران کے مزاج میں جو برجستگی اور بے ساختگی کا پہلو تھا اس کے پس منظر میں امروہہ کی گلیاں، وہاں کے محلے، مساجد، امام باڑے، وہاں کا محرم، مجالس، جلسے، محفلیں، میلے ٹھیلے، ان کی یادوں میں رچے بسے تھے۔ درگاہ حضرت شاہ ولایت شرف الدین نقوی میں پہروں بیٹھ کر مطالعہ کرتے تھے اور روحانی فیض حاصل کرتے تھے۔ انھی فضاؤں میں ان کے فکروفن کی دنیا آباد ہوتی تھی اور سوچ کو نئے زاویے ملتے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں 'جون ایلیا' فرزانگی سے دیوانگی کی طرف دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہے تھے اوران کا خمیر تیار ہو رہا تھا اور 'جون ایلیا' کی شخصیت تشکیل پارہی تھی۔ جب وہ امروہہ آتے تو اپنے یاروں اور پیاروں کو ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ محلہ دربارِ شاہ ولایت (لکڑوں) میں ہمارا ننھیال کا گھر اب اپنے مکینوں کے بغیر سونا ہی رہتا ہے، جہاں اب نہ کمال امروہوی، نہ سیّد محمد تقی اور نہ جون واپس آئیں گے۔ یہ وہ گھر ہے جہاں یہ چاروں پیدا ہوئے، پلے بڑھے۔ آج وہ گھر بھی ان کی یاد میں سوگ وار ہے۔

ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں
دھوپ تھے سائباں کے تھے ہی نہیں
اب ہمارا مکان کس کا ہے
ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

جون ماموں اپنے ان اشعار کو جب پڑھتے تھے تو بہت روتے اور بے تاب ہو جاتے تھے۔ وہ جب سے امروہہ کے گھر سے بچھڑے، مکانوں میں تو رہے لیکن انھیں گھر نہیں ملا۔ امیّ سناتی تھیں کہ بچپن میں جون ماموں اسکول جانے سے بہت جی چراتے تھے اور اکثر ہماری نانی اماں پیڑ سے باندھ کر ان کی پٹائی بھی کیا کرتی تھیں۔ امیّ پر یہ وقت بہت سخت گزرتا تھا لیکن جیسے جیسے وہ بڑے ہونے لگے، عمر بڑھتی گئی جون ماموں کتابوں میں غرق ہوتے چلے گئے۔ جب ہم کراچی گئے تھے اس وقت ان کے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اکثر ہم بہنیں ان کے کمرے کی صفائی کرتی تھیں تو انھیں غصہ آجاتا تھا۔ امیّ سے کہتے تھے 'نجفی تیری بچیاں صفائی کر کے مجھے پریشان کردیتی ہیں ہماری دھول جھاڑ دی، یہاں میری ضروری یادداشتیں اور شعر بکھرے ہوئے ہیں۔' جب ہم ان کی ڈانٹ پر روٹھ جاتے تو مضطرب ہو جاتے اور کہتے 'تم باؤلی ہو، بھلا میں تمھیں ڈانٹ سکتا

ہوں کیا، تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔ وہ تو میرے اُوپر ایک جن آ جاتا ہے اور وہ غصہ کرتا ہے'
جن کی بات پر ہم اپنا غصہ بھول کر ان سے 'جن' کے بارے میں طرح طرح کے
سوالات کرتے۔

وہ بتاتے تھے کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو میں نے بہت زور دار قہقہہ لگایا تھا اور وہ
میری زندگی کا پہلا اور آخری قہقہہ تھا، اس کے بعد میں دل کھول کر ہنسا نہیں۔ وہ اپنے
عزیزوں کی خواہشات کا بہت احترام کرتے تھے اس لیے جب امروہہ میں رہتے تھے تو
شادیوں کے موقع پر سہاگ اور سہرے فرمائش پر لکھ کر دیتے جو امروہہ میں شادیوں کے
موقعوں پر آج بھی گائے جاتے ہیں۔

دو سال پہلے انھوں نے امروہے کا محرم کیا تھا۔ وہ امروہے کی عزاداری پر بہت کچھ
لکھ کر لے گئے تھے، پتا نہیں وہ اس کام کو ترتیب دے بھی پائے اور پورا کر سکے یا نہیں۔ وہ
اپنی جڑوں کی حفاظت کرنا چاہتے تھے اور بزرگوں کی لکھی ہوئی کتابوں اور یادداشتوں کو
محفوظ کرنے کو کہتے تھے۔ وہ جب یہاں ہوتے تو سب کو تقسیم سے پہلے کے واقعات اور
ماحول کا بتاتے تھے تاکہ نئی نسل اپنے ماضی کو جان سکے۔ اپنے بزرگوں کے قصے، پرانی یادیں
ان کو ہر وقت گھیرے رہتی تھیں۔ وہ ہر بار جب کراچی سے آتے تھے بے حد تنہا اور اُداس
ہوتے تھے۔ بار بار یہی کہتے تھے کہ میں بہت ٹوٹ گیا ہوں اور بکھر گیا ہوں۔ بے خوابی کا
شکار تھے، ہمیشہ راتوں کو دیر تک جاگتے رہتے تھے۔ ان کی تنہائی، اُداسی اور مزاج کی تلخی
بڑھتی جا رہی تھی، ان کا ایک شعر تھا کہ۔

مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی
آپ مجھ کو منا لیا کیجیے

لیکن افسوس ان کو کوئی منانے والا نہیں تھا۔ وہ سانس کے مریض تھے۔ آخری وقت
میں ان پر جو گزری ہو گی اس کا تصور کر کے دل تڑپ رہا ہے۔ وہ جنھیں دیکھنے کے لیے ان
کی آنکھیں ترس رہی تھیں، ان میں سے کوئی ان کے پاس اس وقت نہیں تھا اور آخر ان کی
سانس ٹوٹ گئی اور کرب ختم ہوا، ان کا خود ہی یہ کہنا تھا کہ۔

آپ میں جون ایلیا، سوچیے اب دھرا ہے کیا
آپ بھی اب سدھاریے، آپ کے چارہ گر گئے

گنگا جمنا کا سنگم

وزیر آغا

جون ایلیا کی شاعری جمنا اور گنگا کا سنگم ہے۔ جمنا کے حوالے سے اس میں بانسری کی لے، بدن کی گرماہٹ، پازیب کی جھنکار اور زرخیز مٹی کی خوش بو...... یہ سب چیزیں باہم آمیز ہو کر ایک ایسی دل ربا کیفیت پر منتج ہو گئی ہیں جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ گنگا کے حوالے سے اس میں گیان دھیان اور جذب واستغراق ہی نہیں، وقت کی روانی کا شعور اور نیرنگِ جہاں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے کا وہ رویہ بھی موجود ہے جو گیانیوں اور صوفیوں کو ہمیشہ سے عزیز رہا ہے۔ اسی حوالے سے جون ایلیا نے اپنے اندر کے مکان کا احوال بھی رقم کیا ہے اور یہ مکان بھی عجب ہے جو بہ یک وقت پردہ بھی ہے اور پسِ پردہ بھی، آباد بھی ہے اور خالی بھی، جہاں ہر روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے، جہاں اپنے آپ سے بات کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کا نام ہے۔ اسی لیے سانس ناہموار ہو جاتی ہے۔ شاعر کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس بے کراں ذات کے رُو بہ رُو آ کھڑا ہوا ہے جو غیر ذات کو منہدم کر دیتی ہے۔ مگر وہ بے کہ ذاتِ بے کراں کی تمازت میں پگھلنے کے باوجود باقی ہے۔ تب اسے یوں لگتا ہے جیسے دائیں بائیں اور درمیان وہ خود ہی موجود ہے۔ جون ایلیا نے اپنے بدن کے پاتال میں اُتر کر اپنی روح کے اوج کا منظر دیکھا ہے۔ گنگا اور جمنا کے اتصال کا اس سے بہتر روپ شاید ممکن نہیں ہے۔ اس کے شعری اسلوب میں یہی گنگا جمنی انداز موجود ہے۔ یعنی کلاسیکی رچاؤ اور روانی، اپنی کوکھ میں جدید لہجے کی تیزی، سفاکی اور کاٹ چھپائے ہوئے ہے۔ جس

سے شعری اسلوب میں تازگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے۔ جون ایلیا کے اشعار میں آدھے مصرعے کی تکرار نے رقص کی کیفیت کو بھی خوب اُبھارا ہے۔ اس کے لہجے کی انفرادیت اس شعبدہ گری ہی کی دین نظر آتی ہے۔ شکر کرنا چاہیے کہ جون ایلیا کو آخرش اپنی ذات کے بکھرے ہوئے ریزوں کو مرتب کرنے کا خیال تو آیا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو جس کسی نے جون کو اس شبھ کام کی طرف راغب کیا ہے وہ ساری اُردو دنیا کے شکریے کا مستحق ہے۔

چلے جانے پہ اس کے جانے کیا نئیں

وسعت اللہ خان

چکا چوند سے بڑا کوئی دھوکا نہیں۔ میری نانی کہتی تھیں کسی کے گھر کی صفائی دیکھنی ہو تو بیٹھک میں کرسیوں اور صوفوں کی ترتیب، پلاسٹک کے پھولوں اور جھکا جھک میز پوش سے دھوکا مت کھانا۔ کسی بہانے بیت الخلا کا چکر لگانا یا پھر گزرتے گزرتے باورچی خانے میں جھانکی مار لینا۔ پتا چل جائے گا کہ یہ گھرانا کتنا نفیس یا گنوار ہے۔

کوئی لڑکی بھلے خالہ خالہ کہہ کر کیسے بھی لپٹی جا رہی ہو ایک پھِسلتی نگاہ پیروں پر بھی ڈال لینا، موزہ یا ایڑی پھٹے ہوں تو سمجھ لو ملاوٹی اداکاری کر رہی ہے اندر پھوہڑ پن بھرا ہوا ہے۔

خبردار جو کبھی کسی لڑکی یا لڑکے کو بہو یا داماد بنانے کے خیال سے کسی شادی یا سال گرہ میں دیکھا۔ ایسی تقریبات میں تو نصیبن بھی ہیما مالنی اور چھبن بھی دلیپ کمار لگے ہے۔ شکل صورت پر ہی معاملہ طے کرنا ہے تو کسی سوگ کے موقع پر دیکھو اور دھیان سے دیکھو۔ سب کھوٹا کھرا کھل جائے گا۔

اور ہاں کبھی چوڑیاں یا زیور خریدنا ہو تو جو بھی بھلا لگے اسے دکان میں لٹکے ہزار ہزار واٹوں کے بیس بلبوں سے ذرا ہٹ کے پسند کرنا۔ تیز روشنی موئی سو عیب چھپا دیتی ہے۔

نانی اماں تو نہ رہیں پر باتیں رہ گئیں۔ اور یہ باتیں تو زندگی کے ہر شعبے پر لاگو ہو سکتی ہیں۔ گھر خریدنے سے لے کر ادب پسندی تک ہر شے کو نانی اماں کے معیاری ترازو

میں تولا جا سکتا ہے۔

میں ایسے کتنے لکھاریوں کو جانتا ہوں جن کے نثر پاروں اور مصرعوں میں جب ان کا عہدہ، گاڑی، لق و دق دیوان خانہ، دیوان خانے کی دیواروں پر آویزاں بزرگوں کی نوآبادیاتی دور کی بلیک اینڈ وائٹ تصاویر، از قسمِ گل جی، احمد پرویز اور صادقین کی پینٹنگز، ساگوان کی دفتری میز کے پیچھے کے شوکیس پر دھرے اعزازات وفریم شدہ اسناد، نسلی اصلی چمڑے کا برانڈڈ بریف کیس، بلوریں جام میں پیش کیا جانے والا تازہ جوس، عربی کھانے بنانے والا تھائی باورچی اور صدر دروازے پر مجھ جیسے رکشے سے اُترنے والے جینز و چپل و پسینہ زدہ کنگلوں کا بہ نفسِ نفیس استقبال شامل ہو جاتا ہے تو اعلیٰ حضرت جگلول پاشا کی لکھی ایک ایک لائن رنگِ الہام میں ڈوبی نظر آتی ہے اور ان کا ایک ایک مصرعہ میر صاحب کو ٹکر دیتا محسوس ہوتا ہے۔

یہی وقت ہوتا ہے جب شکاری صفت اعلیٰ حضرت وار کرتے ہیں اور شکار کو قلم اور کاغذ دے کر اس پر یہ رائے لکھوا لیتے ہیں کہ جگلول پاشا دورِ حاضر کے شیکسپیئر ہیں یا غزل کی جدید آبرو ہیں۔ مگر یہ آبرو اعلیٰ حضرت کی عہدے پر برقراری، سماجی حیثیت کے عروج اور آنکھیں کھلی رہنے تک ہی بچی رہتی ہے۔ آنکھ بند ہوئی نہیں کہ عظمت، شہرت اور دبنگیت کا پہاڑ بنجر ٹیلے میں بدلا نہیں۔

یاد کریں کہ کتنے نثر نگار اور شاعر ہیں جو اپنی زندگی میں ناقابلِ تسخیر اور قلم توڑ گردانے جاتے ہیں۔ وہ اپنی صداکاری کے زور پہ مجمع کو ایڑیوں پر کھڑا کر دیتے ہیں اور لفظی نشست و برخاست اور ادائی کے چمتکار سے مشاعرہ لوٹ کر چلتے بنتے ہیں۔ آگے پیچھے کورنش بجالانے والے مغ بچوں اور ضرورت مندوں کا جلوس چھٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ لیکن آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہوتے ساتھ ہی کچھ ایسا معاملہ ہو جاتا ہے کہ "کیا ستم ہے کہ اب تیری صورت غور کرنے پہ یاد آتی ہے۔"

اگر میں نانی اماں کے ترازو میں تول کے دیکھوں تو لگتا ہے کہ نثر یا شعر کو صرف بھرے مجمع یا نشست میں سُن کے اس کے معیار کے بارے میں فوراً حتمی رائے تک پہنچنا خسارے کا سودا ہے۔ ممکن ہے کہ لمحاتی ماحول، واہ وا، سماجی دباؤ، اندر کی مروّت اور بزرگی کا

ادب یا کم عمری کا لحاظ یا پھر تخلیق کار کا دل رکھنے کا خیال ہمیں کسی غلط یا ادھورے نتیجے پر پہنچا دے اور پھر ہم اپنی ہی رائے پر نظرِ ثانی کی شرمندگی کا سوچ کر اسی ناقص رائے کو درست سمجھ کے تاحیات اس پہ جمے رہیں۔

اگر میں صرف شعر کی ہی بات کروں تو اپنے بڑوں سے یہی سنا ہے کہ اچھا شعر وہ ہے جو ایک آدھ بار میں خیال کے بہاؤ کے زور پر دل میں گھر کر لے اور اتنا گھر کر لے کہ لاشعور کا حصہ بن جائے۔ صرف سُن کے اچھا نہ لگے بل کہ کاغذ پر بھی اتنا ہی اچھا لگے اور اسے جب بھی پڑھا جائے تو ہر بار پہلی بار کی طرح نہ صرف تازہ لگے بل کہ اس کے اندر سے کوئی نئی جہت، کوئی نیا معنی بھی مسکراتے ہوئے آپ کو دعوتِ فکر دے۔ اور نئے پن کی دریافت کا یہ سفر مسلسل رہے۔

اکثریت ایسے شاعروں کی ہے جو خام مال کے بان سے مصرعہ بٹ کے ردیف کی بلیوں پر قافیے کے سیروے ٹھوک کر ادائی کی ادوائن سے کس غزل کی کھاٹ کھڑی کر دیتے ہیں اور پھر اسی کھاٹ پر سور گباش ہو جاتے ہیں۔ ان کے تیجے کے ساتھ ان کے کلام کا بھی تیجا ہو جاتا ہے۔

کچھ وہ شاعر ہوتے ہیں جو محض صنعتِ قافیہ پیمائی پر تکیہ نہیں کرتے بل کہ مصرعے کی خوش گواریت کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور ہلکے پھلکے اظہاریے کے پردے میں بڑے بڑے تصورات فنی چابک دستی سے باندھ دیتے ہیں۔ یوں اشعار اور شخصیت مل ملا کے مقبولیت کے پائیدان پر ٹکے رہتے ہیں۔

تیسرے وہ شاعر ہوتے ہیں کہ جن کا خیال ہے کہ خیال کے بانجھ پن کا ازالہ شکوہِ الفاظ، لہجے کی گھن گھرج اور پرپیچت کے بگھار سے ممکن ہے۔ یہ روغنی شاعری دیکھنے میں تو بھاری لگتی ہے مگر سمجھنے اور دل میں اُترنے کے لیے جو زود ہضمی درکار ہے اس سے عاری ہوتی ہے۔

چوتھے وہ لُغتی شاعر ہیں جو کلاسیکی لفظیات سے غالبؔ و میرؔ و سوداؔ و انیسؔ جیسی سواری کا چیسز تو تیار کر لیتے ہیں مگر اس میں تخلیقی اُپج و ندرت کا انجن ڈالنا ان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔

پانچویں شاعر وہ ہوتے ہیں جن کا خیال ہے کہ خیالات کی جدّت ظاہر کرنے کے لیے جدید الفاظ کا جامہ ازبس ضروری ہے۔ایسی شاعری ایک آدھ بار سننے میں تو بھلی لگتی ہے مگر اس کے بعد وہ ڈسپوز ایبلیت کا شکار ہو کے کوڑے کے موافق ہو جاتی ہے۔

چھٹے وہ ہوتے ہیں جو شاعر ہونے کی ہر تعریف پر پورے اُترتے ہیں۔ان پر پہلے خیال کے آسمان سے شعریت اُترتی ہے پھر یہی شعریت اپنے لیے ایک موزوں پیرہن سیتی ہے۔کلام اپنے جوہر میں سہل بھی ہو سکتا ہے اور ادق بھی مگر اس کا ظاہری ابلاغ نیزے کی اَنی کی طرح دل کا نشانہ باندھتا ہے۔

سننے میں جتنی بھلی لگتی ہے پڑھنے میں اس سے کئی گنا بھلی لگتی ہے۔جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی شیلف لائف بڑھتی چلی جاتی ہے، پرانی شراب کی طرح۔اسی لیے نسل در نسل ہر پیڑھی اس کے شیشے میں خود کو دیکھتی ہے، پیتی ہے اور پھر یہ شیشہ آنے والوں کے حوالے کر دیتی ہے۔

گویا ثوابِ جاریہ ہے، داتا صاحب کا لنگر ہے جو چلے چلا جا رہا ہے بڑھے چلا جا رہا ہے۔یقین نہ آئے تو جون ایلیا کا پھیلاؤ دیکھ لیں۔ان کی زندگی سے بھی زیادہ زندگی کے بعد کی زندگی میں۔

یہی سب کچھ تھا جس دَم وہ یہاں تھا
چلے جانے پہ اس کے جانے کیا نئیں

ملاقاتیں

بچپن میں پڑھنے سے وحشت ہوتی تھی

ابنِ آس

سوال: کچھ پس منظر بتائیں، والدین...... جدِامجد...... کون تھے، کیا کرتے تھے، شاعری کس طرح ذات میں نمودار ہوئی؟

جون ایلیا: شاعری مجھے ورثے میں ملی ہے، میرے بھائی رئیس امروہوی بہت کمال کے شاعر تھے تمام زمانہ انھیں جانتا ہے۔ والد علامہ شفیق حسن ایلیا بھی شاعر تھے، وہ عربی فارسی، سنسکرت، عبرانی، انگریزی تمام زبانیں جانتے تھے۔ تاریخ مذاہبِ عالم اور علمِ ہیئت کے سلسلے میں ان کی لندن کے سائنس دانوں اور محققین سے خط کتابت بھی ہوتی رہتی تھی، وہ تاریخِ مذاہبِ عالم، تاریخِ انسان، علمِ ہیئت کا بہت علم جانتے تھے۔ عربی اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ انھوں نے عربی میں خاصی نثر بھی لکھی۔ ان کے والد سیّد نصیر حسن بھی شاعر تھے، ان کے دادا بھی شاعر تھے، ان کے دادا یعنی میرے پردادا، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہوا پیچھے کی طرف جاتا ہے۔ ہمارے جدِامجد سیّد عبدالرسول نثار کے شاگرد تھے۔ وہ میر تقی میر کے شاگرد تھے، اس طرح میں میر تقی میر کے خاندانِ معنوی کا واحد وارث ہوں۔ رئیس صاحب تھے اور میں تھا، رئیس صاحب کا انتقال ہوگیا، اب میں واحد وارث بچا ہوں۔ تو یوں سمجھ لیں کہ ہمارے پورے خاندان کا تعلق لکھنے پڑھنے سے تھا، ہمارے بابا صاحب تین بھائی تھے، وہ تینوں شاعر اور ادیب تھے ہم چار بھائی رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی، سیّد محمد عباس، ان کے فرزند سوائے سیّد محمد عباس کے

سب شاعر یا ادیب ہیں، اس کے علاوہ ہمارے چچا کے لڑکے کمال امروہوی
پاکیزہ، رضیہ سلطان، محل وغیرہ وغیرہ کے خالق...... یعنی ہمارا سلسلہ...... ہمارا
خاندان اور ارد گرد کا تمام ماحول اور تمام ماضی ادبی اور شاعرانہ تھا۔

سوال: کس علاقے کی بات ہے، کہاں پیدا ہوئے؟

جون ایلیا: امروہہ میں پیدا ہوا، وہیں تعلیم حاصل کی بچپن بھی وہیں گزرا۔

سوال: بچپن کیسا رہا؟

جون ایلیا: بچپن کے شروع میں بہت شوخ تھا، پڑھنے سے انتہائی وحشت ہوتی تھی جو
پڑھنے کے شوقین تھے میں انھیں برا بھلا کہتا تھا، مثلاً بے وقوف، احمق، انسان دشمن
اور مردم بیزار وغیرہ وغیرہ...... بھئی وہ پڑھنے کے شوقین تھے نا اس لیے، مجھے
پڑھنے سے چڑ تھی۔ میں پڑھنا تو چاہتا تھا مگر اس طرح نہیں جیسے نصاب پڑھایا
جاتا ہے۔ میرا انداز یوں تھا کہ ایک کتاب ہے جو نصاب کا حصہ ہے۔ بس میں وہ
نہیں پڑھوں گا، اس سے مجھے بیر تھا، ہاں اسی موضوع پر دوسری ساری کتابیں
پڑھوں گا، بس یہ طریقہ تھا، یعنی پڑھتا تو تھا اسی لیے اسکول سے بھاگتا تھا، کبھی
یہاں پڑھ رہا ہوں، کبھی وہاں پڑھ رہا ہوں مگر دائرے میں رہ کر مثلاً مدرسہ
اسکول وغیرہ...... دائرے میں رہ کر نہیں پڑھنا چاہتا تھا، مجھے لگتا تھا کہ ادارے
میں رہ کر پڑھنا سزا ہے۔ تعلیم کے ادارے، جیل خانے ہیں اور میں بلا کا آزاد
واقع ہوا تھا۔ بل کہ بلا کا آزاد ہوں۔ میں پابندی برداشت کر ہی نہیں سکتا۔

سوال: بچپن میں آپ ڈراما بھی کرتے رہے؟

جون ایلیا: ہاں! اس زمانے میں تاریخی اسلامی طرز کے ڈرامے پیش کرنے والا ایک ڈراما
کلب 'بزمِ جہاں نما' تھا۔ یہ امروہہ میں ہماری برادری کا ہی ڈراما کلب تھا۔ یہ
ڈراما کلب پارسیوں کی تھیٹریکل کمپنیوں کی طرح منظم تھا۔ اس زمانے میں کلکتہ اور
بمبئی وغیرہ میں پارسیوں کی تھیٹریکل کمپنیاں تھیں۔ انھی کی طرح کی سرگرمیاں
تھیں، بچپن سے ہی ان سرگرمیوں کو دیکھتے آئے تھے۔ بس! یہ سب دیکھ کر مجھے
ڈراموں کا شوق ہوگیا۔ صبح سے شام تک میں اسی میں لگا رہتا، میں ڈائریکٹر کا

تھا، ڈراما لکھتا بھی تھا، اداکاری بھی کرتا تھا۔ اس زمانے میں امروہہ میں یہ میری شناخت بن گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے، بھئی یہ ہے جون، اداکار ہے۔ لکھا تو خیر میں نے ایک ہی ڈراما تھا۔ زیادہ تر وہی ڈرامے کرتے تھے جو ہمارے بڑے کرتے آئے تھے، ایکٹر کے طور پر میں چاروں طرف مشہور تھا، میری آواز بھی بڑی پاٹ دار اور بڑی بھرپور تھی۔ گھر والے میری ان مسلسل مصروفیات سے تنگ تھے۔ چناں چہ میں نے سوچا کہ گھر والوں کو رشوت دی جائے، یہ کہ پڑھنا شروع کر دیا جائے تا کہ یہ ہمیں ان جھمیلوں میں لگے رہنے کی آزادی دے دیں کہ بھئی بچہ پڑھ بھی تو رہا ہے۔ لہٰذا میں نے گھر والوں کو رشوت دینے کے لیے پڑھنا شروع کیا اور پھر مذاق مذاق میں پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ پھر ہم دن بھر پڑھنے لگے۔ ان زمانوں میں ڈراموں کا خاصا حصہ منظوم ہوتا تھا۔ چوں کہ میں لکھتا بھی تھا، اس لیے شاعری بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

سوال: باقاعدہ شعر کس عمر میں کہا؟

جون ایلیا: باقاعدہ شعر یعنی پہلا شعر میں نے کوئی آٹھ برس کی عمر میں کہا۔ بارہا چھپ چکا ہے، وہ یہ تھا۔

چاہ میں اس کی تمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

اس کے کچھ عرصے کے بعد میں نے جو شعر کہا وہ یہ تھا۔

نہ جانے کیا ہے یہ راز اور کیا حقیقت ہے
مجھے تمھی سے محبت اور تمھی سے نفرت ہے

بس یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں مجھے پڑھنے کا شوق ہوا تو شاعری بھی منظم ہونے لگی اور باضابطہ شاعری کرنے لگا۔ اس وقت سے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ میں نے متعدد موضوعات پر لکھا، مختلف زبانوں میں شاعری کی، اُردو میں، فارسی میں اور عربی میں بھی۔ عربی میں آخری نظم اس وقت کہی تھی جب اسرائیل اور مصر میں آخری

جنگ ہوئی تھی۔ جنگ میں چھپی تھی۔ عربی شاعری اس لیے زیادہ نہیں کی کہ بھلا عرب ہمیں اور ہماری شاعری کو کب تسلیم کریں گے، بس پھر فارسی میں کی اور یہی سوچ کر فارسی شاعری بھی چھوڑ دی۔ اُردو کا سلسلہ رہا۔ کچھ عرصے بعد پھر فارسی میں کہنا شروع کیا۔ از سرِ نو، یعنی مختلف موضوعات پر کام کیا ہے۔ مثلاً یہاں آ کر میں نے ایک علمی ادبی پرچہ 'انشا' نکالا اور 'ادارۂ ذہنِ جدید' قائم کیا۔ اسی ادارے سے بڑے بھائی رئیس امروہوی کے قطعات کا انتخاب شائع ہوا۔

سوال: آپ نے اسماعیلیوں کے لیے بھی کام کیا؟

جون ایلیا: ہاں اسی زمانے کی بات ہے۔ 'انشا' شائع ہو رہا تھا کہ اسماعیلیوں کی ایسوسی ایشن نے رابطہ کیا۔ اسماعیلی یعنی آغا خانی اسماعیلیوں کا عالمی ادارہ، یعنی عالمی مرکز پہلے کراچی تھا، ان کا ایک ادارہ تھا جو تحقیق وتصنیف وتالیف وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ اب ان کا مرکز لندن میں منتقل ہو گیا ہے۔ انھوں نے کوشش کی کہ میں ان لوگوں کے ساتھ وابستہ ہو جاؤں۔ میں نے کہا کہ بھئی میں پہلے ہی آپ سے وابستہ لوگوں پر کام کرتا رہا ہوں۔ مثلاً میں نے بوعلی سینا پر کام کیا ہے۔ بوعلی سینا اسماعیلی تھے، بہ ہر طور آغا خان کے ایک نمائندے ہمارے پڑوسی تھے۔ وہ میرے پیچھے پڑ گئے ان کے کہنے پر میں اسماعیلیوں کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ میں نے تاریخِ عرب قبلِ اسلام، تاریخِ مذاہبِ عالم، مسلم فلسفہ۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی تحریک پر کام کرتا رہا۔ میں نے ان کے لیے فلسفے کی متعدد کتابیں ترجمہ کیں۔ فلسفہ اور تاریخ ہمیشہ سے میرا موضوع رہا ہے۔ میں اسماعیلیہ فرقے کی انجمن میں خاصا عرصہ کام کرتا رہا۔ اسی زمانے میں حقی صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ انجمن ترقی اُردو بورڈ میں تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ہاں لغت مرتب ہو رہی ہے آپ یہاں آ جائیں۔ اس پر کام کریں۔ میں نے کہا کہ حقی صاحب میں یہاں اسماعیلیوں کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ وہ بولے 'آپ اڑتالیس انچاس اماموں میں کہاں جا پھنسے، یہاں چار خلیفہ یا بارہ اماموں میں آئیں۔' خیر میں ان کے کہنے پر اس کام میں بھی مصروف ہو گیا۔ اسماعیلیہ فرقے

کا دفتر شام کو بھی کھلتا تھا چناں چہ میں صبح بورڈ میں جانے لگا اور شام کو اسماعیلیہ ایسوسی ایشن جانے لگا۔ بورڈ میں میں نے کوئی آٹھ نو برس کام کیا، یہ سلسلہ 76ء تک جاری رہا۔ پھر اپنا پرچہ بھی کرتا تھا۔ تو قلم ہی میرا روزگار ہے۔ یہی میرا کاروبار ہے۔

سوال: شاعری میں استاد کس کو بنایا، گھریلو ماحول ادبی تھا مگر اصلاح تو لی ہوگی؟

جون ایلیا: والد صاحب سے، اصل میں میرے دو استاد تھے ایک تھے مولانا سید محمد عبادت کلیم امروہوی، وہ امامِ جمعہ و جماعت تھے، وہ میرے استاد تھے۔ میں اکثر انھیں بھی دکھاتا تھا اور بعض کام بابا (والد صاحب) کو دکھاتا تھا۔ میں نے عربی بھی اپنے اُستاد سے پڑھی تھی، فلسفہ بھی انھی سے سیکھا۔ فلسفہ میرا جنون۔ مثلاً یہ کتاب جو میرے سامنے رکھی ہے یہ ہندو فلسفے کی سب سے مستند اور دنیا کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، اسے میں نے کم از کم پچاس مرتبہ پڑھا ہے اور پچاس دفعہ ہی اور پڑھوں گا۔ یہ ہندوستان کے فلسفے کا جوہر ہے اور دنیا کی ممتاز ترین اور مشکل ترین کتاب ہے۔ میں اس کا ترجمہ کرنا چاہتا ہوں، اس سے کچھ استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔

سوال: آپ نے شاعری بھی کی، نثر بھی لکھتے ہیں، فلسفہ بھی، آپ خود ان تمام چیزوں میں کس چیز کو اپنی اصل شناخت سمجھتے ہیں؟

جون ایلیا: بات یہ ہے کہ شاعری تو فطری مسئلہ ہے، آدمی کوشش سے شاعر نہیں بنتا۔ میرا رجحان فلسفے کی طرف ہے۔ شاعری تو یوں ہے کہ جیسے جسم میں خون کی گردش لازمی ہے، دورانِ خون کا معاملہ یا نظامِ تنفس، بس شاعری میرے لیے ایسی ہی فطری اور لازمی چیز ہے جیسے یہ چیزیں۔

سوال: جب آتش جوان تھا تو کیسی گزری؟

جون ایلیا: خاص نہیں بس لکھنے پڑھنے میں جوانی بسر ہوئی البتہ یہ خواہش تھی کہ مجھے چاہا جائے۔ اس لیے شاعری وسیلہ بنی۔ میں اس وقت انتہائی ہنگامہ پسند اور ہر وقت اُداس رہنے والا تھا۔

سوال: اُداسی کی کوئی خاص وجہ بھی تھی؟

جون ایلیا: مجھے معلوم نہیں! مجھے یاد ہے کہ ہمارے محلے میں ایک صاحب رہتے تھے۔ بہت سریلے تھے، میں اکثر ان سے کہتا تھا کہ کوئی غزل سنائیں۔ بے حد اُداس کر دینے والی کوئی غم گین غزل، مجھے غم گین اور اُداس کرنے والی شاعری بہت پسند تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انتہائی ہنگامہ پسند بھی تھا۔ محلے کا کیا بل کہ شہر بھر کا سب سے زیادہ ہنگامہ پسند لڑکا تھا۔ اس دور کے دوست بھی شاعر وغیرہ ہی تھے، ان میں سے کسی کو بھی لوگ نہیں جانتے۔

سوال: شادی آپ نے محبت میں کی، کب کا واقعہ ہے؟

جون ایلیا: ہاں، 70ء میں شادی کی تھی۔ محبت کی تھی، شدید ترین محبت۔ زاہدہ حنا کے ساتھ سات برس محبت کا سلسلہ چلا۔ 68ء میں وہ ہمارے پرچے کے ساتھ وابستہ ہوگئی تھیں۔ ایڈیٹر تھیں وہ انشا کی۔ پھر 70ء میں شادی ہوگئی۔ شکیل عادل زادہ، آپ جانتے ہوں گے انھیں، یہ ہمارے بھتیجے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ہمارے بھائی رئیس امروہوی کے سب سے عزیز دوست عادل ادیب کے لڑکے ہیں۔ ان کا نام تھا محمد شکیل، میں نے رکھا شکیل عادل زادہ۔ اس وقت وہ عالمی ڈائجسٹ میں تھے۔

سوال: اس سے پہلے بھی کسی سے محبت وغیرہ کا سلسلہ رہا تھا یا نہیں؟

جون ایلیا: میرا مسئلہ بڑا عجیب ہے، میں شروع سے انتہائی اُداس رہتا تھا اور ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرتا رہتا تھا۔ جنگِ عظیم میں میرا دل بڑا کرتا تھا کہ جا کر لڑوں۔ اس وقت میرا بڑا جی لگتا تھا، یعنی ہنگامہ ہونا چاہیے۔ اُداس کیوں رہتا تھا، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں اپنے اندر سے ہی اُداس تھا۔

سوال: آپ اپنے رویے اور برتاؤ سے بہت زیادہ خود پسند اور انا پرست نظر نہیں آتے؟

جون ایلیا: ہاں، ایسا ہے۔ اصل میں جب میں دو برس کا تھا تو میں پورے امروہہ میں مشہور ہو چکا تھا۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ کیسے؟ تو اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ ہمارے بابا نے روز نامچے میں لکھا ہے کہ جن صاحب نے مجھے بچپن میں پالا تھا، سیّد غنی حسن، اس زمانے میں ممتاز لوگ اپنے نام کے ساتھ رئیس ضرور لگاتے تھے

مثلاً سیّد محمد احمد رئیس رام پور، سیّد محمد علی رئیس بدایوں۔ اسی طرح ان کا نام تھا
سیّد غنی حسن رئیس امروہوی، ان کے دو گھوڑے تھے ایک ہم دم، ایک رستم، رستم بڑا
سرکش گھوڑا تھا۔ ہم دم سفید تھا اس پر سونے اور چاندی کے زیور لدے ہوئے تھے۔
سیّد غنی حسن کے پاس فورڈ گاڑی تھی، انھوں نے مجھے پالا تھا اور انھوں نے مجھے
یقین دلایا تھا کہ میں دنیا کا سب سے زیادہ ذہین اور سب سے زیادہ طاقت ور
آدمی ہوں اور سب سے زیادہ خوب صورت بھی ہوں۔ ذہین ہونے کی بات تو
یوں غلط ثابت ہوئی کہ میں بدترین طالب علم ثابت ہوا۔ یعنی میں طبعاً ذہین نہیں
تھا۔ استاد جو مجھے پڑھاتے تھے، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میرا دماغ کہیں اور
ہوتا تھا، وہ کچھ اور پڑھاتے تھے غور سے سنتا ہی نہیں تھا، کبھی کبھی تو مجھے ترقی دے
کر پاس کیا جاتا تھا، نہ جانے وہ کیوں مجھے ذہین سمجھتے تھے۔ البتہ خوب صورت
بہت تھا، اپنے ذہین نہ ہونے کا انکشاف صرف مجھ پر ہوا، کسی اور کو نہ ہوا۔
غیر متعلق چیزیں بہت پڑھتا تھا، حساب سے مجھے وحشت تھی، میری سمجھ میں نہیں
آتا تھا کہ میں یہ کیوں پڑھوں۔ ضابطے، بھئی میں کوئی بنیا تھوڑا ہی تھا جو حساب
پڑھتا۔ بھئی میرا حساب سے کیا تعلق تھا۔ تیسرے یہ کہ میں سب سے زیادہ طاقت ور
ہوں، اس کا پول بھی کھل گیا، ایک مرتبہ میں زعم میں محلے کے ایک لڑکے سے بھڑ گیا،
وہ مجھ سے چار پانچ برس بڑا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلا دیا کہ میں طاقت ور نہیں
ہوں۔ مجھ سے کہا کچھ جا رہا تھا اور صورتِ حال کچھ اور تھی۔ بس پھر میں اُداس
رہنے لگا، شاید میری اُداسی کی اصل وجہ یہی ہو کہ مجھے میرے بارے میں جو باور
کرایا جاتا تھا، میں وہ نہیں تھا۔ جنھوں نے مجھے پالا ان کے پاس بہت دولت تھی،
دو تہ خانے روپوں سے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے بچپن ہی میں میرے اندر
فرعونیت پیدا کی مگر میرا انداز عوامی تھا، یعنی نسل پرستی مثلاً یہ کہ میری نسل سب سے
برتر ہے۔ یہ چیز میرے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی، لہٰذا شروع ہی سے
میرے اندر سرکشی، انانیت، فرعونیت تھی اگرچہ بہت بعد میں میں نے ان سب کی
تردید کی۔ ایک بات تھی کہ میں اپنی فرعونیت کے باوجود اندر سے بہت دردمند تھا۔

فرعونیت تو مجھے سکھائی گئی تھی۔ ایک مرتبہ جاڑوں کے موسم میں جب میں اپنی فرعونیت کے انتہائی عروج پر تھا، میں نے محلّے کے ایک لڑکے کو تھپڑ مار دیا بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلطی کی لہٰذا رات کو انتہائی پُر ہول سناٹے میں اُس سے معافی مانگنے چلا گیا، میرے اتالیق مجھے ہر وقت ساتھ لیے پھرتے تھے۔ وہ مجھے جانی کہتے تھے، لوگ اُن کا مذاق اُڑاتے تھے، ان پر طنز کرتے تھے۔ ہماری والدہ کا نام نرجس تھا، لوگ اس زمانے میں ہمارے اتالیق پر پھبتی کستے تھے کہ۔

شفیق و نرجس مزے اُڑائیں
اور بچے پالیں غنی حسن

مجھے وحشت ہونے لگی تھی کہ میں ان کی گود میں بیٹھ کر جا رہا ہوں اور لوگ مجھے دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ اس وقت میری عمر تین برس سے بھی زیادہ تھی، میرا حافظہ بڑا تیز تھا، اب بھی مجھے یاد ہے میرے دل میں گرہ پڑ گئی کہ لوگ مجھے دیکھ کر ہنستے ہیں، کیوں ہنستے ہیں؟ بات کیا ہے؟ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں تھی مگر میں مشہور بہت تھا، نہ تو میں نے شاعری میں کوئی تیر مارا اور نہ مشہور ہونے کی منصوبہ بندی کی۔ 20 مشاعروں میں سے 3 میں جاتا ہوں، میں چھپتا بھی بہت کم ہوں کچھ کیے بغیر بھی لوگ مجھے جانتے تھے یعنی کہ میں گھر میں بیٹھا ہوں، لیٹا ہوں اور گھر سے باہر میرے بارے میں خبریں اُڑ رہی ہیں، تو عجیب زندگی تھی، شاید میری وحشت اور اُداسی کا یہ راز تھا کہ میں مختلف ہوں۔ مگر نہیں تھا، اُداسی کی وجہ سے میں مختلف ہوتا چلا گیا اس پر شعر یاد آ گیا۔

خود کو جانا جدا زمانے سے
آ گیا تھا میرے گمان میں کیا

میرے شوق بھی عجیب تھے۔ سب بچے کھیلتے تھے میں نہیں کھیلتا تھا، دیکھنا پسند کرتا تھا، میں تماشائی تھا، تماشا گر نہیں تھا۔

سوال: ایسا کیوں تھا؟

جون ایلیا: میں اصل میں ہار جیت کی صورتِ حال سے بچنا چاہتا تھا۔ میں اپنے آپ کو امتحان میں ڈالنے سے بچانا چاہتا تھا۔ میری تربیت ہی یہ تھی کہ میں سب سے برتر،

حسین اور طاقت ور وغیرہ وغیرہ ہوں۔ اس زمانے میں دو طرح کے لوگ تھے،
اب بھی ہیں پیشہ ور اور اشراف۔ پیشہ ور وہ تھے دکان دار، رنگ ریز، موچی وغیرہ
وغیرہ اور اشراف وہ تھے، صدیقی، زبیری، عباسی، فاروقی، عثمانی، سیّد۔ یہ سب
اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ طبقۂ برتر اور یہ چلن عام تھا جو صدیقی نہیں، یعنی
عرب النسل نہیں ہے وہ غلام ہے۔ میں ان لوگوں کے درمیان بیٹھ کر خوش ہوتا تھا،
پیشہ وروں کے بچوں کے درمیان، میں نے یہ دائرے توڑے، اپنے دائرے میں
نہیں رہا اور مختلف دائروں میں بیٹھ کر بریلوی، سنی وغیرہ وغیرہ اور ان کو سمجھا۔ میں
انگریزی اسکول کا طالب علم تھا مگر میں نے اپنے طور پر دیو بندی مسلک کے ایک
دار العلوم میں تعلیم حاصل کی۔ اس دار العلوم سے بڑے بڑے بزرگ پیدا ہوئے۔
مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا عبد الرحمٰن میمن، مولانا محمد طاسین، مولانا مفتی محمود،
یہ سب اسی دار العلوم میں تھے۔ شہری طلبہ عربی نہیں پڑھتے تھے۔ عربی مدارس میں
مضافات، بنگال یا سرحد کے لوگ آتے تھے۔ وہی عربی پڑھتے تھے اور انھی طلبہ کی
بنیاد پر یہاں اسکول چلتے تھے۔ میرے بہت سے بریلوی مسلک کے لوگ جو
ہمارے ساتھ خوب ہلا گلا کرتے تھے وہ دیو بندی مسلک کے مدرسوں میں کبھی نہیں
جاتے تھے۔ مجھے عربی فارسی کا بہت شوق تھا۔ میں چلا جاتا تھا۔ میں شہر کا واحد
طالب علم تھا جو عربی دار العلوم میں پڑھا۔ ورنہ سارے مضافات کے ہوتے تھے
اور رزق العلما کہلاتے تھے۔ ان پر ان کا گزارہ تھا اس کی مثال یوں سمجھ لو کہ
کراچی میں جو اُردو بولنے والے شرفا ہیں ان کے لڑکے عربی کو زبان کی طرح
کب پڑھتے ہیں، عام طور پر سرحد کے لوگ، بنگال کے لوگ ہی یہ پڑھتے ہیں۔
میں نے کئی لوگوں کو پڑھایا، مشرقی پاکستان کے ایک عالم فیض الرحمان تھے، انھیں
میں نے فلسفہ پڑھایا، منطق پڑھائی، یوں سمجھ لو کہ مسلکوں سے میں نے بغاوت کی۔
میں تمام مسلکوں میں گھسا، پھر میں ہندوؤں میں بھی بہت اندر تک گیا۔ یہ کتاب جو
آپ کے سامنے رکھی ہے یہ ہندوستانی فلسفے کی سب سے وقیع اور سب سے
مشکل کتاب ہے، شاید چند ہی لوگوں نے پڑھی ہو۔ پھر مختلف جلسوں میں جانا،

جمعیت علمائے ہند، مسلم لیگ، کانگریس، ہر جگہ گیا۔ محض ہنگامہ پسندی اور وحشت کی وجہ سے۔ زندگی کو سمجھنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے دائرے توڑے اور عوام میں رہا۔

سوال: زاہدہ حنا والا قصہ درمیان میں رہ گیا، اس بارے میں بتائیں، محبت کی ابتدا کیوں کر اور کیسے ہوئی؟

جون ایلیا: ہاں! مجھے تقی صاحب نے ایک مضمون دیا کہ کسی اسکول ٹیچر کا مضمون ہے، اسے اپنے رسالے میں چھاپ دو۔ مضمون کا عنوان تھا 'یونان تمدن کا گہوارہ' وہ مجھے بہت اچھا لگا، مضمون پر زاہدہ حنا لکھا تھا۔ میں لڑکیوں کے مضمون ذرا دیر میں چھاپتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ عورتوں کے نام سے لکھتے تھے کہ جلدی چھپ جائے گا۔ جن صاحبہ کے توسط سے مضمون ملا تھا وہ آرٹسٹ بھی تھیں۔ میں اپنے رسالے کے ٹائٹل کے لیے ان کے پاس گیا، استقبالیہ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی میں نے اپنا نام بتایا تو وہ اُچھل کر کھڑی ہوگئی، میں کوٹ پینٹ پہنے ہوا تھا۔ میں نے پوچھا آپ کون ہیں تو بولی، زاہدہ حنا، میں بڑا حیران ہوا کیوں کہ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ مضمون کسی عمر رسیدہ خاتون نے لکھا ہوگا، وہ لڑکی 16 برس کی تھی، ایک عجیب طرح کا جھٹکا لگا، وہ محبت تو نہیں تھی، بس تعارف تھا، اس زمانے میں 63-62ء کی بات ہے لڑکیاں کم لکھتی تھیں، آج تو بہت لکھتی ہیں، خیر آج بھی اچھا نہیں لکھتی ہیں، پھر اس تعارف کے بعد مختلف مراحل پیش آتے رہے۔

سوال: یہ کب پتا چلا کہ آپ کے درمیان محبت پروان چڑھ رہی ہے؟

جون ایلیا: مختلف مراحل تھے، بہ تدریج سلسلے بڑھتے چلے گئے، اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ خیالی افسانے لکھتی تھی، تاریخی اور رومانوی قسم کے، زبان بہت خوب صورت ہوتی تھی، ایک دفعہ میں بہت متاثر ہوا۔ اس میں ایک منظر تھا کہ ایک محبوبہ اور محبوب باغ میں بیٹھے ہیں اس منظر کو کوئی اور لکھتا تو یہی لکھتا کہ وہ بنچ پر بیٹھے ہیں مگر اس نے لکھا تھا 'وہ دونوں سنگی نشست گاہ پر بیٹھے تھے' اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس لڑکی سے میں آج بھی متاثر ہوں، سولہ برس کی لڑکی، قبلِ مسیح کے دور کی منظر کشی کرتے وقت بھی ایک ایک چیز کا خیال رکھتی تھی، اس قسم کی باتیں تھیں جو

دل میں اُترتی گئیں۔

سوال: اظہارِ محبت میں پہل کس نے کی تھی؟

جون ایلیا: ہمارا معاملہ عام قسم کا تھا ہی نہیں، ہم ذہن کے راستے پر چلے تھے، اسے بھی تاریخ کا اور مطالعے کا بہت شوق تھا، ادب کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ ہم میں تمام چیزیں مشترک تھیں، یعنی زندگی کے جتنے بھی زاویے ہو سکتے ہیں، وہ سب مشترک تھے۔ کسی بھی معاملے پر اختلاف نہیں تھا، نہ سیاسی طور پر نہ فکری طور پر نہ نظریاتی طور پر، نہ تحریری طور پر اختلاف تھا۔ ہم روشن خیال تھے، آزاد خیال تھے، انسان دوست تھے، روادار تھے، یعنی ہر بات مشترک تھی۔ یعنی دو آدمی اتنے مشترک ہو نہیں سکتے، ناممکن ہے بس۔

سوال: شادی کے بعد بیوی کے طور پر آپ نے زاہدہ کو کیسا پایا؟

جون ایلیا: وہ بہت جفاکش اور بہت محنتی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ بہتر انداز میں زندگی کو سمجھتی تھی۔ حقیقت پسند اور بے حد عملی انسان تھی۔ اچھا میں ہوں خیال پسند اور وہ رئیلسٹ تھی، میں آئیڈیل پسند شاعر۔ اس کے علاوہ میرے اور بھی ایسے کئی معمولات تھے جو معتدل نہیں تھے۔ میری ہر کیفیت انتہائی تھی۔ میرے اندر اعتدال کا فقدان تھا، وہ تھی اقتدار پسند۔ مثلاً یہ کہ ہماری بھی شہرت ہو۔ وہ گھر کی ذمے دار بھی تھیں، اپنے والدین کی بڑی لڑکی تھیں۔ اس کی تربیت بہت اچھی تھی اور ذہین بھی تھی۔

سوال: شادی کیسے ہوئی؟

جون ایلیا: اصل میں ان کے والد کو رشتہ پسند نہیں تھا، ہمارے گھر سے رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی، سیّد محمد عباس، شکیل عادل زادہ، سیّد ممتاز سعید، محمد علی صدیقی۔ یہ لوگ گئے تھے مگر انھوں نے منع کر دیا۔ زاہدہ نے بغاوت کی اور یہ بغاوت کامیاب ہوئی چناں چہ انھوں نے اس رشتے کو قبول کر لیا۔ وہ گھر کی کفیل بھی تھی، اس لیے اس میں ایک عملی شعور بھی تھا، اعتدال پسندی بھی تھی، شادی کے بعد ہم گھر والوں کے ساتھ رہے، بعد میں ہم یہاں سے کسی وجہ سے ان کے گھر منتقل ہو گئے۔

سوال: بعدازاں آپ کے درمیان علیحدگی ہوگئی، کیا وجوہات تھیں؟

جون ایلیا: ہاں، افسوس ناک بات یہی ہے کہ جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا یعنی کہ ایسے دو افراد جن میں ہر اعتبار سے اتنا اتفاق پایا جاتا ہو، کاش کوئی اختلاف ہوتا تو بعد میں افسوس نہ ہوتا۔ دو آدمی تھے مگر ایک تھے، اسے آپ کچھ بھی کہہ لیں۔

سوال: شادی میں کون کون شریک تھا؟

جون ایلیا: سب ہی دوست تھے۔ اس زمانے میں عبیداللہ علیم تھے، اطہر نفیس تھے۔ اسد محمد خان، شکیل عادل زادہ، محمد علی صدیقی، یعنی جتنے بھی دوست تھے سب شامل تھے۔ شادی کے بعد یہ جو آپ اس گھر میں جھاڑ جھنکار دیکھ رہے ہیں، اس وقت یہاں سامنے درخت کے نیچے سوتا تھا، زاہدہ حنا ہر روز صبح وہاں ناشتا لے کر آیا کرتی تھی، عجب بات ہے۔ آج صبح میں آنکھ بند کیے سوچ رہا تھا کہ زاہدہ میرے لیے سعید منزل سے ناشتا لائی ہے۔

سوال: شادی کے بعد کتنا عرصہ ساتھ رہے؟

جون ایلیا: بہت عرصہ رہے۔ میں زندگی میں کسی کے ساتھ اتنا نہیں رہا، نہ والد کے ساتھ رہا، نہ والدہ کے ساتھ، نہ بہن کے ساتھ، نہ بھائیوں کے ساتھ، اتنے دن رہا۔ اس سے اندازہ لگالیں کہ کتنے دن ساتھ رہا۔ ماہ و سال کی بات یاد نہیں۔ اب یہ کہتے ہوئے کہ شادی رہی نہیں دکھ ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کو لفظ دیتے ہوئے اندر سے دکھی ہو جاتا ہوں۔ جذباتی معاملہ ہے۔

سوال: باقاعدہ طلاق ہوئی تھی؟

جون ایلیا: ہاں، باقاعدہ۔ اصل میں، صورت کو لفظ دیتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ میں بچتا ہوں یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے۔ ظاہر ہے سب کچھ ہوا، سب کچھ، کچھ باقی نہیں رہا۔ میں سوچتا ہوں کہ میں کتنا بہادر آدمی ہوں۔ اپنے آپ کو میں مضبوط کر پایا، خود میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سمیٹ لیا، میں بکھر گیا تھا، پھر بھی میں نے سمیٹ لیا۔ مثلاً پہلے میں دو غزلیں کہتا تھا، اب پانچ غزلیں لکھتا ہوں۔ یہ سب میں کیسے کر پاتا۔ میں 18 برس بے خوابی میں مبتلا رہا، ایک مصرعہ بھی نہیں کہہ پاتا تھا،

ہوش بھول چکا تھا۔ اب از سرِ نو میرا ظہور ہوا...... یعنی 84ء کی بات ہے، میں خود حیران ہوں کہ میں کیسے سنبھل گیا۔ اس واقعے کے بعد مجھے پاگل ہو جانا چاہیے تھا، میں پاگل ہو بھی گیا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ میں 18 برس تک پاگل رہا، 18 سال پاگل پن میں گزارے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں پوری دنیا بھی گیا، افریقہ، کینیڈا، امریکا، ہندوستان وغیرہ وغیرہ۔ سب جگہ گیا لیکن بھٹکتا ہوا جاتا تھا، ایک آدمی جو ٹوٹ پھوٹ گیا ہو، سسکتا رہا ہو۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ میں ہوں، میرے ہاتھ میں قلم ہے، میں لکھ رہا ہوں، میں نے لکھ لیا، یہ کیسے ہو رہا ہے، میں حیران ہوں اور یہ ممکن کیسے ہوگیا۔ میں زاہدہ کا اتنا عادی تھا جتنا انسان جسم کا، آفتاب کا، رات کو ستاروں کا عادی ہوتا ہے۔

سوال: اپنی شاعری پر ناقدانہ طور پر نظر ڈالیں تو کس مقام پر دیکھتے ہیں؟

جون ایلیا: بڑی عجیب بات ہے، کوئی دو برس پہلے تک آغازِ شاعری سے میں اپنی شاعری کا سب سے بڑا منکر تھا۔ مجھے اپنی شاعری انتہائی بری لگتی تھی، کبھی کبھی اچھی لگی مگر میں ہمیشہ اپنے آپ کو برا شاعر سمجھتا تھا۔ میں نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں کتابت کو دینے کے لیے اپنے آپ کو ٹٹولتا رہا اور اپنی شاعری کو پھینکتا رہا اور کہتا رہا لاحول ولاقوۃ...... کیا بکواس شاعری ہے۔ میرا منکر میں خود ہوں۔

سوال: اب اپنی شاعری کو کس مقام پر دیکھتے ہیں؟

جون ایلیا: ہاں، اب چند برسوں سے میں سمجھ رہا ہوں کہ میں بڑا منفرد شاعر ہوں، میں معمولی شاعر نہیں ہوں۔ اُردو شاعری میں صرف دو سیّد پیدا ہوئے یا یوں کہہ لیں کہ اُردو شاعری نے دو سیّد پیدا کیے اور ایک اُمتی۔ ایک سیّد محمد تقی میر اور ایک سیّد جون ایلیا اور اُمتیوں میں غالب۔ صرف تین غزل گو پیدا کیے اُردو شاعری نے، دو سیّد اور ایک اُمتی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مجھے اب بھی اپنی پوری شاعری بہت بری لگتی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب تک میری صرف ایک کتاب چھپی ہے ورنہ شاعری تو اتنی کی ہے کہ بارہ دیوان چھپوالیتا۔ پھر جناب آپ دیکھیں کہ میری کتاب کے کئی ایڈیشن چھپے ہیں مگر ہر ایڈیشن میں تبدیلیاں ہیں۔ کسی ایڈیشن

میں کچھ اور طرح سے ہے تو دوسرے ایڈیشن میں کچھ اور طرح سے۔ یعنی میں اپنی شاعری سے مطمئن ہی نہیں، میں جامعیت چاہتا ہوں۔ میرے اندر اپنے آپ کو ناتمام یا نامکمل سمجھنے کا رجحان بہت زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں اُردو غزل کا منفرد ترین شاعر ہوں۔ جتنی نئی ترکیبیں اُردو شاعری کو میں نے دی ہیں، اتنی شاید ہی کسی اور نے دی ہوں۔

سوال: گویا یہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ اُردو غزل کے سب سے منفرد شاعر ہیں اور آپ جیسا شاعر کوئی اور نہیں؟

جون ایلیا: نہیں! دعویٰ نہیں، یہ میرا خیال ہے اسے میری رائے کہہ لیں! جیسے ہم کسی اور شاعر کے بارے میں بہ حیثیت شاعر ایک رائے رکھتے ہیں اسی طرح بہ حیثیت شاعر اپنے بارے میں میری رائے یہ ہے کوئی اس کو نہ مانے مگر اس کے نہ ماننے سے میری رائے تبدیل تو نہیں ہوگی۔

سوال: آپ کی یہ رائے شادی کی ناکامی سے پہلے بھی تھی یا اس میں تبدیلی آئی ہے؟

جون ایلیا: اصل میں وہ تو ایک میری حالت تھی۔ مجھے تو اس وقت بھی لوگ اسی طرح پسند کرتے تھے اور اب بھی اسی طرح پسند کرتے ہیں۔ میرے ساتھ ہمیشہ ایک سی صورت رہی ہے، مجھے ہمیشہ پسند کیا گیا ہے، میں نے ہمیشہ مشاعرے مارے ہیں مگر میں اپنے آپ کو یقین نہیں دلا پاتا۔ میں اصل میں بے حد شر پسند آدمی ہوں۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر کنٹرول کرتا ہوں۔ شادی سے پہلے بھی میری یہی سوچ تھی، اس کے بعد بھی یہی سوچ رہی۔

سوال: نظم کو سہل پسندی کی علامت سمجھا جاتا ہے آپ غزل گو ہیں مگر نظمیں بھی کہی ہیں، تو اُردو نظم کو کسوٹی پر پرکھتے ہوئے کس مقام پر رکھتے ہیں؟

جون ایلیا: نظم نثر کے مقابلے میں ہے، یہاں نظم سے مراد لی جاتی ہے پوئم، اس کا مقابلہ غزل سے ہرگز نہیں۔

سوال: بعض شعرا اُردو شاعری میں غیر ملکی اصناف پر طبع آزمائی کرنے کو تن آسانی قرار دیتے ہیں اور اسے معتبر شاعری کا سا مقام نہیں دیتے، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جون ایلیا: دیکھیے صاحب، ہماری اپنی تو کوئی صنف ہے ہی نہیں کیوں کہ ہماری تمام اصناف مختلف جگہوں سے آئی ہیں۔ ہماری اصل صنف تو صرف گیت ہے اور وہ بھی تقریباً ہندی سے مستعار لی گئی ہے۔ ہماری زیادہ تر اصناف عربی سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں آئی ہیں۔ ہماری اصل اصناف میں گیت، چوبولے، دوہے ہیں، جو برصغیر میں پیدا ہوئے، یہ چیزیں بھی ہندی سے تعلق رکھتی ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ میرؔ کو بھی ہندی کا ہی شاعر تسلیم کیا جاتا تھا کیوں کہ ہماری زبان ہندی یا ہندوی کہلاتی تھی۔ میں نے ایک کتاب پڑھی تھی، عربی زبان میں جس میں حاشیے پر بہت سی باتیں لکھی تھیں، ان میں ایک یہ تھا کہ اس موقع پر ہندی شاعر داغؔ یہ کہتا ہے۔ یعنی 62ء میں بھی داغؔ کو ہندی شاعر سمجھا جاتا تھا۔ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند نے شایع کی تھی۔

سوال: بعض لوگوں نے تحریک چلائی تھی کہ اُردو کا رسم الخط دیوناگری (جس خط میں ہندی لکھی جاتی ہے) ہونا چاہیے، ان کے بہ قول اُردو کے موجودہ رسم الخط میں بہت زیادہ وسعت نہیں ہے، آپ کیا کہتے ہیں؟

جون ایلیا: میں اس بات سے جزوی طور پر متفق ہوں، جزوی طور پر اس لیے کہ ہمارے ادب کا بہت بڑا سرمایہ جو نستعلیق میں چھپ چکا ہے، اسے دیوناگری میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ دونوں چلنا چاہییں، دیوناگری بھی اور نستعلیق بھی۔ دیکھیں اُردو ہندوستان کی زبان ہے، نستعلیق ہمارا رسم الخط ہے اور دیوناگری ہندوستان کا مگر زبان وہی ہے یعنی اُردو۔ لیکن چوں کہ یہاں کا حکم ران طبقہ جو درہ خیبر کے راستے آیا تھا وہ اپنا رسم الخط لایا تھا جو عربی تھا، انھوں نے یہاں کی زبان بھی اسی میں لکھی، کیوں کہ وہ تو وہی جانتے تھے اس کے علاوہ راجستھان اور دیگر بہت سے علاقوں میں اُردو، ہندی رسم الخط میں لکھی گئی یعنی دیوناگری میں۔

سوال: میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان دونوں میں زیادہ بہتر رسم الخط آپ کے نزدیک کون سا ہے؟

جون ایلیا: میرے نزدیک بہتر خط دیوناگری ہے۔ اُردو میں غلطی ممکن ہے کیوں کہ اس میں

آپ ایک لفظ پر کہاں کہاں اعراب لگائیں گے۔ مثلاً لفظ 'محبت' ہے۔ اس کو اگر ایک ایسا قاری جو اُردو سے نابلد ہے اور پڑھنا چاہ رہا ہے، ہمیشہ غلط پڑھے گا، جب کہ یہ صورتِ حال دیوناگری میں نہیں ہے۔ اسی طرح انگریزی میں بے شمار مسائل ہیں، اُردو میں لفظ ہے 'بالکل'...... اسے کیسے صحیح پڑھا جائے گا؟ کوئی اسے بال کل، کوئی بال، کل اور کوئی 'بال کل' پڑھ سکتا ہے...... لیکن اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس زبان میں اتنا قیمتی سرمایہ رقم کر چکے ہیں کہ اسے کسی اور خط میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہاں اگر ایسا ہوتا کہ دونوں خط رائج رہتے تو زیادہ اچھا ہوتا کیوں کہ اس طرح کسی بھی تحریر شدہ مواد کا دائرۂ کار بھی بڑھ جاتا اور آپ کا پیغام بہت زیادہ لوگوں تک پہنچ جاتا، اب عربی کا معاملہ ہے۔ آپ سوچیں کہ عربی زبان کے ترجمے میں غلطی کیوں ہوتی ہے؟ ایک آیت کا مفہوم مختلف کیوں ہوتا ہے؟ حالاں کہ اس میں اعراب بہت مشکل ہے۔ دیکھیں لفظ ہے 'تعلیم' ہمیں تعلیم ت سے سکھائی جاتی ہے۔ اس لفظ میں ع، ل اور ی کی جو شکلیں ہیں وہ ان شکلوں سے قطعی مختلف ہیں جو بچے کو سکھائی جاتی ہیں۔ بل کہ یہ شکلیں تو سکھائی ہی نہیں جاتیں تختی کچھ اور ہے اور شکلیں آگے چل کر کچھ اور صورت اختیار کر لیتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُردو بہت مشکل سے بچوں کے حلق سے اُترتی ہے اور وہ طویل عرصے تک پڑھنے کے بعد بھی اچھا اُردو داں نہیں بن پاتا۔ محبت میں سوائے 'ت' کے تمام حرفوں کی شکلیں بدلی ہوئی ہیں۔ ح وہ ح نہیں، ب وہ ب نہیں، م، وہ م نہیں۔ جب دیوناگری یا رومن رسم الخط کی تحریک چلی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی اگر چہ اس کے حق میں تھا مگر میں نے کہا تھا کہ ہم اپنا سارا سرمایہ منتقل کر ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا میں نے مخالفت کی تھی آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے تمام اداکار جب ہندی فلم میں کام کرتے ہیں تو انھیں اُردو کے سارے مکالمے یا تو رومن رسم الخط یا دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر دیے جاتے ہیں۔

سوال: ہاں مگر اس سے ان کا لہجہ تبدیل ہو جاتا ہے، وہ خ اور اسی قبیل کے الفاظ حلق سے نہیں نکال پاتے، تو اس میں بھی تو خرابی ہوئی نا؟

جون ایلیا: ہاں یہ خرابی ہوئی مگر اسی خرابی کو لے کر وہ اُردو زبان کو ہندی زبان کہتے ہیں اور ہماری اُردو سے مختلف کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں خون نہیں ہے کھون ہے، قتل نہیں ہے کتل ہے، خرابی نہیں ہے کھرابی ہے، قسمت نہیں کسمت ہے، لتا جی ہیں، وہ سارے اُردو گیت گاتی ہیں مگر سارے گیت انھیں دیوناگری یا رومن انگریزی میں لکھ کر دیے جاتے ہیں۔ شاعر انھیں غ، خ اور ق کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آپ زی ٹی وی اور ہندی ذرائع سے جو اُردو سنتے ہیں اس کا دائرہ آپ کے دائرے سے زیادہ بڑا ہے اور وہ ساری اُردو دیوناگری خط میں ہے اور اُردو کو عالمی زبان ان لوگوں نے ہی، ان کے چینلوں نے ہی بنایا ہے، آپ نے کب بنایا ہے۔ وہی تو آپ کی اُردو کو دیوناگری رسم الخط میں اور اپنی ہندی بولی میں دنیا بھر میں پھیلا رہے ہیں۔

سوال: الطاف حسین نے ہنگامہ کیا تھا پنجابی زبان نہیں بولی ہے آپ کیا کہتے ہیں، زبان اور بولی کی تعریف کیا ہے؟

جون ایلیا: غلط کہتے ہیں، پنجابی زبان بھی ہے اور بولی بھی، اصل میں بولی وہ ہے جو بازاروں میں بولی جاتی ہے، جس سے بات چیت ہوتی ہے، بول چال میں استعمال ہوتی ہے۔ کوئی ادب، حکایت، کہاوت یا شاعری نہ ہو، وہ بولی ہے۔ اصل چیز بولی ہی ہوتی ہے، جب آپ اس میں کام کریں، کوئی رسم الخط طے کر لیں اور اس رسم الخط میں بولی کے لہجے کے لحاظ سے ادب لکھا جانے لگے تو وہ زبان بن جاتی ہے۔ قدیم ترین عرب میں جب لوگ اصل زبان سیکھنا چاہتے تھے تو دیہات میں چلے جاتے تھے، اگر آج بھی اصل زبان سیکھنا چاہتے ہیں تو دیہات میں چلے جائیں، حقیقی اُردو سیکھنا ہو تو ذرا بوڑھوں سے بزرگوں سے بات کریں، آپ کو ٹھیٹھ زبان مل جائے گی۔

سوال: موجودہ دور میں ادب کس ڈگر پر چل رہا ہے؟

جون ایلیا: موجودہ دور میں نثر بہت کچی بل کہ بہت بری لکھی جا رہی ہے۔ آپ جائزہ لیں کہ سب سے بری اُردو لکھنے والا کون ہے؟ ڈاکٹر ہے، وکیل ہے یا انجینئر تو آپ

کو پتا چلے گا کہ سب سے بری اُردو شاعر اور ادیب لکھ رہے ہیں۔ یہ بہت افسوس ناک بات ہے، میں بھی شاعر ہوں اور میری اُردو بھی اتنی ہی خراب ہے جتنی دوسرے شاعروں کی ہے، چند لوگوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر اس زمانے میں بہت بری اُردو لکھی جا رہی ہے۔

سوال: بہ ہر طور کسی کی اُردو تو آپ کو پسند ہوگی؟

جون ایلیا: ہاں چند لوگوں کی اُردو اچھی ہے، میں جن لوگوں کی اُردو پسند کرتا ہوں ان کے نام لوں تو سب سے سرِ فہرست عزیز احمد کا نام ہے۔ انتظار حسین، ان کی صحت اور حسنِ بیان بہت عمدہ ہے۔ اس کے علاوہ قرۃ العین حیدر ہے، اُردو کی بعض غلطیوں کو چھوڑ کر، اس کے علاوہ زاہدہ حنا، نجم الحسن، شکیل عادل زادہ، میں ان کے نام لوں گا، بس یہی لوگ اچھی اُردو لکھتے ہیں، باقی سب بہت بری طرح اُردو کا بیڑا غرق کر رہے ہیں۔ مجھے ان لوگوں کی اُردو پسند ہے کیوں کہ عام طور پر افسانہ نگار بڑی غلط نثر لکھ رہے ہیں۔ ہاں اس کے علاوہ اسد محمد خان، وہ بڑی زندہ نثر لکھتے ہیں، ناول بھی، فکشن بھی، ان کی تحریریں نثری شاعری ہیں، وہ محض نثر نہیں بل کہ نثری شاعری ہے۔

سوال: نثری نظم کی بات کر لیں، آج ہر دوسرا شاعر نثری نظم کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا خیال ہے کیا آگے چل کر یہ صنف کوئی جگہ بنا پائے گی، یعنی نثری نظم کا مستقبل کیا ہے؟

جون ایلیا: میرے نزدیک تو نہ اس صنف کا حال ہے اور نہ مستقبل۔ اصل میں ہوا یہ ہے کہ یہ کام سب سے زیادہ آسان ہے، ہر آدمی اس پر ہی طبع آزمائی کر رہا ہے، جب کہ یہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔

سوال: غزل ایک زندہ صفت ہے، گزشتہ دہائیوں کی غزل پر نظر ڈالیں تو کیسا احساس ہوتا ہے، کیا شاعروں نے غزل سے انصاف کیا اور کیا اب وہ انصاف کر رہے ہیں؟

جون ایلیا: اصل میں بات یہ ہے کہ اس وقت کوئی بڑا غزل گو موجود نہیں ہے۔ وہ ریاضت کسی کے پاس نہیں، وہ تیاری نہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان و بیان تو خیر بعد کی چیزیں ہیں اصل میں کسی کی جذباتی وابستگی ہی نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا کہ

میں موجودہ دور میں سب سے اچھی غزل کہہ رہا ہوں۔آپ یہ بتائیں کہ غالب کے دور میں ان کے پاس شہرت کے وہ ذرائع نہیں تھے جو آج ہمارے پاس ہیں پھر اس کے باوجود ایک بھی بڑا شاعر سامنے نہیں آیا۔اگر ہوتا تو آتا، مشہور ہوتا...... جب کہ اس کے پاس ہر وہ ذریعہ موجود ہے جو ماضی میں کسی کے پاس نہیں تھا۔ میں اپنی شاعری سامنے نہیں لاتا، بہت کم شاعری سامنے لاتا ہوں، چھپواتا بھی نہیں۔

سوال: شاعری اور افسانے کے لحاظ سے پاکستان اور بھارت کا موازنہ کس انداز میں کریں گے؟

جون ایلیا: بھئی اصل میں تمام تر خامیوں کے باوجود قیامِ پاکستان کے بعد شاعری پاکستان میں ہی بہتر ہوئی ہے۔ ہندوستان میں بہتر شاعری نہیں ہوئی۔ البتہ جہاں تک افسانہ اور تنقید کا تعلق ہے تو ہندوستان ہم سے بہت آگے ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ، تنقید و تحقیق، ان میں ہندوستان نے بہت کام کیا ہے۔ شاعر، پاکستان میں بہتر ہیں اور ان کا کام بھارت کے شاعروں سے زیادہ اچھا ہے۔

سوال: آپ نے کہا کہ نثر اچھی نہیں لکھی جارہی، بعض حلقے کہتے ہیں کہ اُردو زبان بگڑ رہی ہے، آپ کا کیا خیال ہے اس کا اصل ذمے دار کون ہے؟

جون ایلیا: اصل میں ہوتا کیا ہے، جس زمانے میں غالب شاعری کر رہے تھے، اس وقت سڑک پر جو زبان بولی جارہی تھی، وہ اس زبان سے مختلف تھی جو غالب استعمال کر رہے تھے۔ اب بھی ہو یہ رہا ہے کہ اُردو مختلف دائروں میں پھیلتی جارہی ہے، جتنا فروغ اس زمانے میں اُردو کو حاصل ہوا ہے، کسی زمانے میں نہیں حاصل ہوا۔ آج سے دس پندرہ یا بیس پچیس سال پہلے اُردو کا دائرہ اتنا وسیع نہیں تھا، پہلے اُردو شاعر نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ لندن جائے گا مشاعرہ پڑھنے، مثلاً غالب کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ انھیں شعر سنانے کے لیے لندن بلایا جائے گا۔ آج اُردو کہاں پہنچ گئی ...... کینیڈا پہنچ گئی، لندن، ڈنمارک، امریکا، عرب ممالک، امارات کہاں کہاں نہیں پہنچ گئی اور خاص طور پر آپ کا زی ٹی وی،

اس نے اُردو کو کتنا پہنچایا، پاکستان کے ٹی وی کے ڈرامے دیکھیں، ڈرامے میں خواہ غلطی کیوں نہ ہو بہ ہر طور وہ اُردو پھیلانے کا سبب بنے ہیں۔

سوال اچھا یہ بتائیں کہ ٹی وی پر پیش ہونے والے ڈرامے کو ادب کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

جون ایلیا آپ نے اچھا سوال کیا۔ آغا حشر نے ڈرامے لکھے، انار کلی تھا، ان کی ادبی حیثیت تھی۔ بات یہ ہے کہ ہم نے ان ڈراموں کے مسودے نہیں دیکھے، ہم نے ڈرامے نے یاد دیکھے ہیں۔ اس کا اندازہ اسی وقت ہوگا جب ہم ان کے مسودوں کو دیکھیں۔ مثلاً ہم فلم دیکھتے ہیں۔ اگر اس کی کہانی کو لکھا جائے تب پتا چلے گا کہ اس کی ادبی حیثیت کیا ہے۔ تو یقیناً فلموں کی اکثریت کی کوئی ادبی قدر نہیں ہوگی۔ بعض بہت مقبول ادبی شہ پاروں پر ڈرامے بنے تو ہم سب ڈراموں کو غیر ادبی یا ادبی نہیں کہہ سکتے۔ ڈراما تو ظاہر ہے فنونِ لطیفہ اور ادب میں شامل ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ یونان میں ڈراما ادبی اصناف میں سرِ فہرست رہا ہے، وہ چھپتا تھوڑی تھا۔ اسٹیج ہوتا تھا بالکل اسی طرح جیسے ٹی وی ڈراما پلے ہوتا ہے، چھپتا نہیں مگر یونانی ڈراموں کی ادبی اہمیت سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔

یک سانی سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے

ڈاکٹر خالد سہیل

سوال: آپ نے کس قسم کے گھرانے میں پرورش پائی؟ کیا وہ ایک ادبی اور مذہبی گھرانا تھا؟

جون ایلیا: ہاں ہمارے گھرانے کا ماحول ادبی بھی تھا اور مذہبی بھی۔ ہمارے والد شاعر تھے، مؤرخ تھے، محقق تھے، مختلف مذاہب کے عالم تھے، مختلف زبانوں پر دست رس رکھتے تھے، اُردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ہمارے دادا بھی شاعر تھے، پردادا بھی شاعر تھے، پردادا کے پردادا میر تقی میرؔ کے شاگرد تھے۔

ہمارے بابا نہایت انسان دوست انسان تھے۔ سب مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ بدھا اور کرشن کو بھی پیغمبر سمجھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لکھا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا تھا۔

ہمارے بابا کو ذاتی ملکیت کی بالکل فکر نہ تھی۔ درویش منش انسان تھے۔ وہ سیاسی انسان نہ تھے اگر سیاسی ہوتے تو کمیونسٹ ہوتے۔

سوال: کیا آپ نوجوانی میں مذہبی تھے؟

جون ایلیا: ہاں ایک وہ زمانہ تھا جب میں نمازیں بھی پڑھتا تھا اور روزے بھی رکھتا تھا۔

سوال: تو پھر آپ نے الحاد کا راستہ کیسے اختیار کیا؟

جون ایلیا: میرے الحاد کی ابتدا میرے احتلام سے ہوئی۔ یہ بات حیران کن ہے لیکن سچی ہے۔ میں نوجوانی میں بہت جذباتی ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے احتلام کی شکایت ہوگئی۔ بار بار ہوتا تھا، ہر رات ہوتا تھا۔ جاڑوں کی صبحوں کو ٹھنڈے پانی

سے نہانا پڑتا تھا۔ بہت بدنامی کا خطرہ تھا۔ میں ایک حکیم سے ملا۔ انھوں نے کہا میں جنسی بیماریوں کا سو فیصد علاج کرتا ہوں۔ میری دوا کھاؤ گے تو احتلام نہ ہوگا۔ اُن کی دوا بھی کھائی لیکن افاقہ نہ ہوا۔ احتلام ہوتا رہا۔ آخر میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا۔ کتابیں پڑھیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر خدا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں نماز پڑھوں تو وہ میرا احتلام بند کیوں نہیں کرتا۔ میں آہستہ آہستہ Skepticism کی طرف مائل ہو گیا جس نے آخر میں الحاد کا روپ دھار لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑی تبدیلیاں بڑے واقعات سے رونما ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ معمولی واقعات بھی ہماری زندگی اور نظریات میں اہم تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔

سوال: جب آپ نے الحاد کا راستہ اختیار کیا تو آپ کے دوستوں اور رشتے داروں کا کیا ردِعمل تھا۔

جون ایلیا: ہماری جوانی میں ہمارے اردگرد بہت سے روشن خیال لوگ موجود تھے امام باڑوں میں ہر طرح کی بحثیں ہوتی تھیں۔ وہاں مذہبی لوگ بھی تھے اور کمیونسٹ بھی۔ مذہبی لوگ میرے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اس نے زیادہ پڑھ لیا ہے اب اسے ہضم نہیں ہو رہا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ میں بڑا ہو کر ایک سرکش طرح بنوں گا۔

سوال: نوجوانی میں آپ کے لڑکیوں سے کیسے تعلقات تھے؟

جون ایلیا: میں بہت شرمیلا تھا۔ ایک لڑکی مجھے پسند تھی۔ جب وہ سامنے آتی تو میں منہ موڑ لیتا۔ آخر ایک دن اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے میں نے اسے ایک پرچہ دیا۔ اس پرچے پر شعر بھی لکھے تھے۔ ایک شعر تھا۔

کیا وہ ناراض ہو گئے ہم سے
اے ستارو یہ برہمی کیوں ہے

غضب یہ ہوا کہ اُس نے وہ پرچہ اوروں کو دکھا دیا۔ اُس کی ماں نے وہ پرچہ بابا کو دکھایا تو بابا نے کہا یہ شعر ضرور جون کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن اُس کی ماں کہنے لگی نہیں

ایسا نہیں ہوسکتا جون تو بہت شریف انسان ہے وہ ایسی حرکت نہیں کرسکتا۔ یہ تو بھلا ہوا میں نے پرچے پر اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ میں اس واقعے سے اتنا متاثر ہوا کہ مجھے کئی دن تک بخار رہا۔

سوال: جوانی میں عورتوں سے تعلقات کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ تھا؟

جون ایلیا: میرے ذہن میں عورت کا تصور ہمیشہ مقدس، پرتمکنت اور حسین رہا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ عورت کی سوچ کی سطح مرد کی سوچ کی سطح سے بہت مختلف ہے۔ مرد خواب دیکھتا رہتا ہے اور عورت معاشی حالات پر توجہ رکھتی ہے۔ اسی لیے میں عورتوں کے سلسلے میں ہمیشہ ناکام رہا۔ وہ عشق کی باتیں سننا چاہتی تھی اور ہم فلسفہ لے بیٹھتے تھے، آفاقی باتیں کرنے لگتے تھے جن میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ Concrete چیزیں چاہتی تھی اور ہم Abstract باتیں کرتے تھے۔ ہم عورتوں سے Communicate کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوئے، ہم Out of tune ہی رہے۔

سوال: آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آپ Depression کا شکار ہو گئے تھے۔ اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔ کیا اس کا تعلق شراب سے بھی تھا۔

جون ایلیا: میں ایک زمانے میں Insomnia کا مریض ہوگیا تھا۔ مجھے نیند بالکل نہ آتی تھی۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ برانڈی پیوں۔ برانڈی پی تو میرے دماغ کو آگ لگ گئی۔ میرا دماغ Overactive ہو گیا۔ میں دن میں ایک غزل لکھتا، پھر دو غزلیں، پھر تین، میں نے ایک دن میں پانچ پانچ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ جب مجھے نیند نہ آتی تو میں Valium کھانے لگ گیا۔

جہاں تک Depression کا تعلق ہے میرے مزاج میں شروع سے ہی اُداسی رہتی تھی اور وہ بھی بے وجہ کی اُداسی اور حزن و ملال۔ لیکن اس اُداسی کے ساتھ میرے مزاج میں ہنگاموں سے لگاؤ بھی تھا۔ میں ہنگامہ پسند قسم کا انسان رہا ہوں کیوں کہ مجھے زندگی کی یک سانی سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے نوجوانی میں مَیں نے اداکاری شروع کر دی تھی اور ایکٹر بن گیا تھا اور اسٹیج پر اپنے

کمالات دکھاتا تھا۔ میری شاعری میں جو آپ کو مکالمے ملتے ہیں وہ بھی اسی دور کا اثر ہے۔

پھر وہ دور آیا کہ میں اتنا Depress ہو گیا کہ میں نے کئی سال تک ایک شعر بھی نہیں کہا۔

سوال: آپ نے جوانی میں اپنا دیوان کیوں نہیں چھپوایا؟

جون ایلیا: وہ ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔ آپ ماہرِ نفسیات ہیں، شاید سمجھ سکیں۔ میں نے اپنے بابا سے وعدہ کیا تھا کہ میں اُن کی کتابیں چھپواؤں گا۔ لیکن میں وہ وعدہ پورا نہ کر سکا۔ اس لیے میں نے اپنا دیوان بھی نہ چھپوایا۔

سوال: سب اُردو کے چاہنے والے آپ کو ایک کام یاب، معتبر اور مقبول شاعر سمجھتے ہیں۔ آپ کا اپنی شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جون ایلیا: میں بالکل ناکام رہا۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ میں رایگاں گیا۔ ہمارے زمانے میں جو شاعر تھے ہمارے بابا، رئیس امروہوی اور علامہ اقبال وہ بڑے شاعر تھے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں جس طرح کی شاعری کرنا چاہتا تھا ویسی شاعری نہ کر سکا۔ میں ایک ناکام آدمی ہوں۔ اب میں تھک گیا ہوں۔

(اس گفت گو کے بعد جون ایلیا لیٹ گئے۔ بہت تھک چکے تھے، بیمار بھی تھے۔ اس لیے میں نے اجازت چاہی۔)

عالمِ سکرات میں بھی شعر کہہ سکتا ہوں میں

عباس نقوی

مئی کا مہینا' گرمیوں کے دن اور سہ پہر کا وقت، علامہ علی کرار نقوی کے دولت کدے پر ایک شاعر، ادیب، مفکر، اُردوداں الغرض نہ جانے کیا کیا، سے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ملنے پہنچا۔ انٹرکام سے آواز آئی...... اندر آجائیے، اندر داخلے کے بعد ایک کمرے تک رہ نمائی کی گئی...... لیکن یہ کیا؟...... کمرے میں چاروں جانب نظر دوڑائی، بیٹھنے کے لیے جگہ ندارد...... کتابوں، قلمی نسخوں، کاغذوں اور الماریوں کے درمیان زمین پر بچھے بستر پر ایک چھوٹی سی گٹھڑی دکھائی دی۔

جیسے جیسے آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں اس گٹھڑی نے انسانی روپ دھارنا شروع کر دیا۔ ایک کم زور شخص، لمبے اُلجھے ہوئے بال، چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی جیسے شیو کرنا بھول گئے ہوں۔ یقین جانیے میں اپنی مطلوبہ ہستی کو اس شکل میں دیکھنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ جی ہاں! یہ جون ایلیا ہیں۔ وہی جون ایلیا جو اپنے مخصوص لہجے اور مکالماتی شاعری کے لیے لوگوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

میری اُن سے یہ دوسری ملاقات تھی، پہلی ملاقات انور سعید صاحب کی والدہ کے سوم میں گلشن اقبال میں واقع امام بارگاہ میں ہوئی تھی اور آج یہ دوسری ملاقات...... آہستہ سے آواز دی...... جون بھائی...... اور انھوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں...... ایک کراہ سی سنائی دی...... کون......؟...... جی میں عباس نقوی...... انھوں نے اُٹھنے کی کوشش کیے بغیر بیٹھنے کا حکم دیا اور موقع غنیمت جان کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا...... اور پھر قریباً 20 منٹ

بعد میں جس جون ایلیا سے نوائے وقت کے لیے گفت گو ریکارڈ کر رہا تھا وہ بالکل مختلف جون ایلیا تھے۔ دورانِ گفت گو نہ جانے مجھے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن...... بہ ہر حال یہ انٹرویو مورخہ 16 مئی 2001ء کو نوائے وقت کے ادبی صفحے پر شائع ہوا، البتہ چند وہ سوالات جو خصوصاً امروہہ اور رثائی ادب کے تعلق سے کیے گئے تھے، نوائے وقت کو نہیں دیے گئے تھے لہٰذا تا حال اسی قدر تازہ ہیں جس قدر جون ایلیا کی یاد قارئین اور جون پسندوں کے لیے۔

سوال: جون بھائی بات کہاں سے شروع کی جائے...... کیوں نہ آپ کے مجموعۂ کلام 'شاید' کے ایک جملے سے بات کا آغاز کیا جائے جس میں ایک جگہ آپ نے ایک کہاوت لکھی ہے کہ 'امروہہ شہرِ تخت ہے، گزران یاں کی سخت ہے، جو چھوڑے وہ کم بخت ہے' آخر اس سے کیا مراد ہے...... آپ نے خود امروہہ چھوڑ کر کیسا محسوس کیا۔ کیا کھویا، کیا پایا......؟

جون ایلیا: 'بدنصیبی' پھر تھوڑے توقف سے بولے...... اصل میں امروہہ سے آ کر ہم یہاں ادبی اعتبار سے پھل پھول ہی نہیں سکے، 1971ء کے بعد مشرقی پاکستان کے سقوط کے پیشِ نظر ٹوٹ پھوٹ گئے۔ آج بھی امروہہ شعر و ادب کا مرکز ہے۔ وہاں ادب اور فن پر کام ہو رہا ہے۔ حالت یہ ہے کہ آج بھی ایشیا کا سب سے بڑا اسٹوڈیو کمال امروہوی کا ہی ہے، جس میں جنگل، پہاڑ، وادیاں، بڑے بڑے فوارے سب کچھ ہے...... لیکن یہاں آنے کے بعد کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں (آخری جملہ ایک طرح سے خود کلامی کی کیفیت میں کہا گیا)۔

سوال: آپ نے ابھی امروہہ میں شعرا سے متعلق بات چھیڑی ہے، قدیم شعرائے امروہہ کے بارے میں کچھ فرمائیے؟

جون ایلیا: دیکھو، امروہہ کے سب سے پہلے شہرت پانے والے شاعر تھے 'سیّد اسمٰعیل امروہوی' جنھوں نے شمالی ہند میں سب سے پہلے مثنوی 'وفات بی بی فاطمہؓ' لکھی، ان کے بعد سعادتؔ امروہوی تھے، یہاں ایک بات ضرور لکھنا کہ ان کے زمانے میں 'خدائے سخن' میر تقی میرؔ جوان تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے، جب میر آگرے

سے دہلی گئے تو سعادت امروہوی کو اپنا فارسی کلام سنایا۔ انھوں نے میر سے کہا 'اے عزیز! فارسی چھوڑو اور ریختہ کہو' اس طرح میر ریختہ یعنی اُردو کی جانب آئے اور خدائے سخن کہلائے۔ ان کے بعد شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا عہد ہے جو دلی اور لکھنؤ اسکول کے 'آدم' کہلائے۔ یعنی میر خلیق (والد میر انیس)، ناسخ و آتش ان کے شاگردوں میں رہے۔

ہمارے محلے دربارشاہ ولایت کے مورث اعلیٰ سیّد ابدال محمد، میر تقی میر کے واحد ممتاز و مشہور شاگرد سیّد عبدالرسول نثار کے دوست تھے۔ سیّد عبدالرسول نثار میر کے شاگرد تھے۔ سیّد سلطان احمد ہمارے دادا جو سیّد ابدال محمد کے پوتے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا 'دیوانِ فیض' بارہا پڑھا ہے۔ اس کے حاشیے پر سیّد سلطان احمد نے اپنے استاد سیّد عبدالرسول نثار کی متعدد غزلیں نقل کی ہیں اور غزلوں کا آغاز اس عبارت سے کیا 'استاذی سیّد عبدالرسول نثار می فرماید دیوان قلمی' جب کہ اس زمانے میں بڑے شعرا اپنا کلام اپنے ہونہار ترین شاگرد سے نقل کراتے تھے۔ شاعروں کا سلسلہ یوں ہی ہمارے خاندان میں چلتا رہا۔ آخر میں میر کے شعری خاندان کے دو وارث بچے، ایک رئیس امروہوی اور دوسرا میں (جون ایلیا)۔ (موجودہ شعرائے امروہہ کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ 'آج کے شعرا میں میرے برادر بزرگ ساقی امروہوی، ڈاکٹر ہلال نقوی اور کوثر نقوی قابلِ ذکر تخلیقی توانائی رکھتے ہیں'۔

سوال: آپ کا گھریلو ماحول ادبی کہلائے گا یا مذہبی؟

جون ایلیا: میرا گھریلو ماحول خالصتاً علمی ماحول تھا۔ میرے بابا شفیق حسن ایلیا ایک علمی شخصیت تھے، انھیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے ہی دیکھا گیا، انھوں نے بہت سی کتب تصنیف کیں، نیز ان کے ہاتھ کے موئے قلم سے بنائے ہوئے چند نقشے جن میں جنت اور واقعہ کربلا کے حوالے سے 'از مدینہ تا مدینہ' یعنی مدینے سے کربلا اور پھر تمام منازل سے گزر کر واپس مدینہ' کے نقشے تھے۔ ہمارے گھر میں گہری وابستگی رکھنے والے ہم پانچ بھائی تھے، سیّد امیر حیدر کمال امروہوی، سیّد محمد مہدی (رئیس امروہوی)، سیّد محمد تقی، سیّد محمد عباس اور...... میں۔

سوال: لیکن آپ کے بابا کی یہ تصنیفات اور نقشے وغیرہ اب کہاں ہیں؟

جون ایلیا: (آب دیدہ ہوتے ہوئے چند لمحے توقف کے بعد گویا ہوئے) میاں عباس...... میری زندگی کی سب سے بڑی بدقسمتی ہی یہی ہے۔ مجموعۂ کلام 'شاید' کے دیر سے آنے میں بھی یہی وجہ مانع رہی کہ بابا سے میں نے اُن کی تصنیفات شایع کرانے کا وعدہ کیا تھا لیکن شومئی قسمت ان کی تصنیفات کچھ تو پاکستان آنے کے دوران ضائع ہوگئیں، کچھ ایک ہستی نے محض مجھ سے کدورت کے پیشِ نظر جلا ڈالیں کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ جون ایلیا کا خاندانی پس منظر بھی علمی و ادبی تھا، بڑے بھائی رئیس امروہوی نے کچھ تصنیفات ایک صاحب کو چھپوانے کی غرض سے دی تھیں لیکن وہ بھی نہ ہوسکا۔ اب میں خود جا کر اُن صاحب سے ان مسوّدات کی کاپی لانا چاہتا ہوں تا کہ انھیں خود چھپوا سکوں۔

سوال: آپ کی اب تک کی کل تصنیفات و تخلیقات کتنی ہیں؟

جون ایلیا: میرا ایک شعری مجموعہ 'شاید' تو تم دیکھ ہی چکے ہو، جب کہ دوسرا 'یعنی' ہے اور چھپنے والا ہے۔ یہ جو رجسٹر میں نے دیا ہے یہ اس کا آدھا ہے جو کمپوز ہو چکا ہے۔ نثر کی دو کتابیں کئی برس قبل شایع ہوئی تھیں جن کا تعلق 'اسماعیلی سیاست اور فلسفہ' سے تھا۔ میرے پاس ان کے علاوہ مزید دس مجموعوں کا مواد مرتب ہے باقی منتشر ہے۔ میں نے تاریخ، تاریخِ تہذیب اور منطق و فلسفہ پر متعدد کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ جتنی کتابیں میں نے لکھی اور ترجمہ کی ہیں اتنی کتابیں گزشتہ 50 برس میں کسی شاعر نے نہ ترجمہ کیں نہ تصنیف۔

اب آئندہ تین حصوں میں میرے انشایئے شایع ہونے والے ہیں جن میں ایک کا نام 'فرنود' ہوگا۔ جو 1958ء سے 2001ء تک شایع ہونے والے انشائیوں پر مشتمل ہیں جو معروف رسالے 'انشا' میں شایع ہوتے رہے۔ بعد میں انشا عالمی ڈائجسٹ ہوگیا اور پھر صرف عالمی ڈائجسٹ کہلایا۔ اس کے بعد سسپنس ڈائجسٹ میں اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

سوال: کیا آپ نے رثائی ادب پر کبھی کچھ کام کیا ہے؟

جون ایلیا: ہاں یقیناً لڑک پن میں نوحے، سلام و منقبتیں وغیرہ کہیں، لیکن وہ سب مسودے میرے ایک شاگرد اقبال مجیدی کے پاس ہیں جو اَب نا ہنجاری اور گستاخی پر اُتر آیا ہے اور میری پہلی بیاض و دیگر اہم کتب و مواد واپس نہیں کر رہا۔

سوال: چند اشعار مرحمت فرمائیے گا؟

جون ایلیا: اب پہلے کے کہے ہوئے اشعار یاد نہیں آتے ...... (ذہن پر از حد زور دیتے ہوئے انھوں نے ایک سلام کے چند اشعار نذر کیے۔)

شہ رگ کے واسطے مری، خنجر بھی کچھ نہیں
مَیں آئی پر جو آؤں تو لشکر بھی کچھ نہیں

تم ہو زبر تو کیا کہ یہ صفین کی ہے جنگ
اس جنگ میں تو مالکِ اشتر بھی کچھ نہیں

اب تو حسینؑ بات زمانے کی مان لو
کیا یہ شگافِ سینۂ اکبر بھی کچھ نہیں

ہو جنگ جیتنا تو سپر بھی ہے قیمتی
تاریخ جیتنا ہو تو اصغرؑ بھی کچھ نہیں

یہ سوقِ شہرِ کوفہ ہے، بازارِ شام ہے
بنتِ رسول یاں تری چادر بھی کچھ نہیں

میں پیش کیا مقدمۂ کرب و بلا کروں
اس باب میں تو داورِ محشر بھی کچھ نہیں

سوال: آپ کا تعلیمی پس منظر؟

جون ایلیا: میں اُردو، فارسی اور فلسفے میں ایم اے ہوں، اس کے علاوہ میں نے الٰہ آباد بورڈ سے فارسی کا سب سے اعلیٰ امتحان 'کامل' کیا، عربی کا دقیق ترین امتحان 'مولوی عالم' کیا، 'دیوبندی دارالعلوم' 'جامعہ مُلّا نہ' سے منطق اور فلسفہ میں فراغت

حاصل کی۔شیعہ دارالعلوم 'سیّد المدارس' سے 'سیّد الافاضل' کیا اور دارالعلوم ناظمیہ لکھنؤ سے 'اعزازی ممتاز الافاضل' ہوں۔ مجھے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں، لیکن چوں کہ میں کاہل آدمی ہوں اس لیے میرے نام کی ہیئت جون ایلیا ہے، اگر میں کاہل نہ ہوتا تو فی الحقیقت 'ڈاکٹر جون ایلیا' ایم اے، پی ایچ ڈی ہوں۔

سوال: پاکستان میں انجمن ساداتِ امروہہ کی علمی و ثقافتی کارروائیوں سے مطمئن ہیں؟

جون ایلیا: فی الوقت تو انجمن میں اوسط طبقے کے افراد کو ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ ایک عرصے سے جو سامنے نظر آرہے ہیں وہ سب اپر کلاس (Upper Class) سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ نیز گولیمار، جعفر طیار وغیرہ کی نمائندگی کی کمی شدّت سے محسوس کی جاتی ہے، اس کے علاوہ یہاں اپنے بابا کا طرزِ عمل بتانا چاہتا ہوں کہ امروہہ میں بابا مجالس پڑھتے تھے لیکن اس سلسلے میں یہ خیال رکھتے تھے کہ اگر ایک وقت میں اگر دو ایسی مجلسوں کو پڑھنے کے لیے کہا گیا ہے ایک جہاں اعلیٰ طبقے کے لوگ آباد ہیں اور دوسری جگہ قدرے کم تر طبقہ آباد ہے تو وہ ہمیشہ وہاں مجلس پڑھتے جہاں پہ کم تر طبقہ آباد تھا۔ اسی لیے وہ میراثیوں کے محلوں اور احمد نگر میں دربارِ کلاں کے مقابلے میں مجلس پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اُن کا نظریہ تھا اُن لوگوں کا زیادہ حق ہے۔

سوال: یہ فرمائیے کہ آپ کے بارے میں ایک تاثر عام ہے کہ آپ 'ملحد' بھی رہے ہیں؟

جون ایلیا: دیکھو! اس بات کے جواب میں مجھے تھوڑا سا پچھلے زمانے سے اپنے نظریات کی وضاحت کرنی ہوگی، میری آغاز کی شاعری رومانوی ہے مگر میرے گردوپیش ترقی پسندانہ فضا تھی۔ بچپن ہی سے میں خواجہ حسن نظامی کی کتابیں پڑھ کر انگریز سامراج سے شدید نفرت کرنے لگا تھا، سو مجھے تحریکِ آزادی کے جاں باز لوگ بہت محبوب تھے۔ میں کبھی مسلم لیگی نہیں رہا، اس لیے کہ مسلم لیگی مسلمانوں نے آزادی کے لیے کوئی قربانی نہیں دی لیکن غیر لیگی مسلمانوں نے قربانیاں دیں، میں شروع ہی میں اپنے مطالعے کے نتیجے میں قوم پرست ہو گیا تھا اور پھر

کمیونسٹ۔ اس سے پہلے شروع میں، میں مذہبی تھا لیکن اپنے فلسفے کے مطالعے کے نتیجے میں اور ان مجلسوں کے منطقی حصے کے زیرِ اثر میں وقتی طور پر ملحد ہو گیا تھا البتہ اب تمھارے سامنے ہوں، گویا۔

سوال: آخری سوال کہ آپ شاعری کیوں کرتے ہیں؟

جون ایلیا: (مسکراتے ہوئے) یہ تو بالکل ایسا ہی سوال ہے جیسے پوچھا جائے کہ 'آپ سانس کیوں لیتے ہیں' میں نے جس طرح زندگی کی ہے اسی طرح شاعری بھی کی ہے۔

ایسے کچھ حالات جب حالات بھی ہوں دم بخود
ایسے کچھ حالات میں بھی شعر کہہ سکتا ہوں میں
شاعرِ فطرت ہوں میرا ہر نفس اِک شعر ہے
عالمِ سکرات میں بھی شعر کہہ سکتا ہوں میں

جون ایلیا سے گفت گو

عقیل عباس جعفری

سوال: آپ طرزِ فکر کے اعتبار سے شاعری کی کس تحریک سے وابستہ ہیں؟

جون ایلیا: (جون صاحب نے سگریٹ کا کش لیا اور بولے۔)

میں نظریاتی اور اجتماعی سماجی شعور کے اعتبار سے ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ رہا ہوں۔ مگر ضروری نہیں کہ میں شاعری کے اعتبار سے بھی اس تحریک سے وابستہ ہوں۔ دراصل شاعری کی اصطلاح ایک بڑا کُل ہے اور یہ سب اس کے مظاہر ہیں۔ شاعری کی اصطلاح ترقی پسندی کی اصطلاح سے وسیع تر ہے میں نے سکہ بند ترقی پسند شاعری بھی کی ہے، یہ فیصلہ کرنا کہ شاعری کے اعتبار سے میرا مسلک کیا ہے، میرا منصب نہیں، یہ دوسروں کا کام ہے کہ وہ تعین کریں کہ میری شاعری کس تحریک سے تعلق رکھتی ہے۔

سوال: جون صاحب! کہا جاتا ہے کہ آپ بیان سے زیادہ زبان کی درستی پر زور دیتے ہیں جب کہ میر سے لے کر اب تک ہر بڑے شاعر نے اپنا لہجہ خود بنایا ہے اور وہ زبان کے مروجہ اصولوں کو توڑتا ہوا آگے بڑھا ہے۔

جون ایلیا: میں زبان کے جمالیاتی اور تخلیقی استعمال پر اصرار کرتا ہوں، جس لفظ سے اچھی شاعری کی جا سکے وہ لفظ برا ہو ہی نہیں سکتا۔ بگاڑ سے اچھائی ممکن نہیں ہے۔ اچھا شاعر لفظوں سے طرح طرح کی معاملت کرتا ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ اس کی معاملت لغت کے اصولوں پر ہو۔ مگر تیسرے درجے کے کسی شاعر کو یہ اجازت نہیں

دی جا سکتی کہ وہ زبان بگاڑے۔ جس طرح کسی بچے کو تلوار سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی یہ کسی فن کار ہی کا کام ہے۔

شاعری کوئی الہامی معاملہ نہیں ہے اس کے لیے ریاضت درکار ہے۔ اس میں لفظیات بھی ہیں اور فکریات بھی۔ یہ بہ ہر حال ایک فن بھی ہے اور ہر فن، فن کے اصولوں پر ہی برتا جانا چاہیے۔ لفظیات سے میری مراد لغت میں چھپا ہوا سیاہ حروف کا مجموعہ نہیں بل کہ لفظ معنیٰ کی محمل ہوتا ہے اور اس محمل کی پیوند کاری نہیں کی جانی چاہیے۔ تاج محل کے معمار کو سلیں تراشنے کا عمل تو آنا چاہیے اور الفاظ شاعری کی سلیں ہیں۔ اگر کوئی شاعر انھیں برتنا نہیں جانتا تو وہ اچھی شاعری نہیں کر سکتا۔

سوال: آپ کی شاعری میں جھنجھلاہٹ کا عنصر بہت ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جون ایلیا: اس کی وجہ ماحول سے میرے احساسِ نا ہم آہنگی میں تلاش کیا جا سکتا ہے اگر خارجی کام یابیوں کو معیار بنایا جائے تو میں مادی اور سماجی کام یابیوں کے حوالے سے خود کو اس معاشرے میں مس فٹ پاتا ہوں۔ یہ جھنجھلاہٹ ایک ایسے معاشرے کے خلاف ردِ عمل ہے۔ جسے ہم بدلنا چاہتے ہیں۔

مگر اس سے بھی بڑا دکھ وہ رجعت پسندی ہے جو روز افزوں ہے۔ ایک بات حیرت یا افسوس کے ساتھ کہوں گا کہ آج کے شاعر عقیدہ پرست ہو گئے ہیں جب کہ پہلے ایسا نہیں تھا حد یہ ہے کہ اب نوجوانوں میں بھی روشن خیالوں کی تعداد کم سے کم ہوتی جا رہی ہے جسے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ آپ کو کوئی شاعر پسند نہیں کیا یہ درست ہے؟

جون ایلیا: یہ بات اس طرح نہیں ہے بل کہ یوں ہے کہ مجھے کوئی شاعر سرتاپا پسند نہیں ہے کسی بھی شاعر کو کلی طور پر پسند کرنا نہ تو اخلاقی طور پر ممکن ہے اور نہ ہی نفسیاتی طور پر۔ مجھے بہت سے شاعر جزوی طور پر پسند ہیں مگر میر، غالب اور انیس مجھے 70، 80 فی صد پسند ہیں۔

سوال: جون صاحب آپ ایک ڈائجسٹ کے ناشر بھی ہیں۔ اور اس حوالے سے میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اپنے ڈائجسٹ کے ذریعے ادب کی کیا خدمت انجام دی ہے۔ کیا ڈائجسٹ، رسالوں نے عوام کو ادب سے دور نہیں کر دیا ہے۔

جون ایلیا: ڈائجسٹ میرا ذریعۂ روزگار ہے۔ برسوں سے ڈائجسٹ میں میری ایک سطر بھی نہیں ہوتی۔ میرا سرمایہ میری چالیس پچاس نثری کتابیں ہیں۔ میرا المیہ یہ ہے کہ میری شناخت ان کتابوں کے حوالے سے نہیں بل کہ میرے ڈائجسٹ کے حوالے سے کی جاتی ہے۔

میں ڈائجسٹ نکالتا ہوں مگر پڑھتا نہیں ہوں مگر ڈائجسٹ پر اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جو انھیں باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ میرا ڈائجسٹ ادبی پرچہ نہیں ہے لیکن ہم نے اُردو کے اعلیٰ افسانوی ادب کو قارئین کے وسیع ترین حلقے تک پہنچایا ہے۔

سوال: مگر کیا وجہ ہے گزشتہ تین چار سال سے آپ کے ڈائجسٹ میں اُردو کا نمائندہ افسانوی ادب شایع نہیں ہو رہا۔ بل کہ اب آپ کے رسالے میں نشہ آور دیومالائی کہانیوں کا زیادہ زور ہے۔

جون ایلیا: اس ضمن میں گزشتہ تین چار سال سے تعطل آ جانے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے قارئین جس قسم کے افسانے پڑھا کرتے تھے وہ لکھے جانے بند ہو گئے ہیں۔ قارئین کی تربیت ایسی نہیں ہے کہ وہ موجودہ دور میں لکھے جانے والے افسانے پسند کر سکیں اور ہم اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ اس قسم کے افسانے شایع کرنے کی ہمت کر سکیں۔ اس کے باوجود ہم نے کافکا تک کے تراجم چھاپے ہیں۔

جہاں تک دیومالائی سلسلوں کا تعلق ہے میں اس سلسلے میں شاعر کی حیثیت سے نہیں بل کہ فکشن کے قاری کی حیثیت سے جواب دہ ہوں۔ کہانی کا نشہ آور ہونا اس کی برائی نہیں ہے۔ بل کہ یہ ایک مثبت کیفیت ہے مثلاً طلسمِ ہوش رُبا، داستانِ امیر حمزہ، کوچک باختر اور بوستانِ خیال ہمارے کلاسیک میں شامل نشہ آور دیومالائی قصے ہیں۔ ڈائجسٹوں کی سیریز میں بھی وہی دیومالائی عنصر موجود ہے اور ڈائجسٹ موجودہ عہد کے طلسمِ ہوش رُبا، داستانِ امیر حمزہ، کوچک باختر اور بوستانِ خیال ہیں۔

ہمیں تعصب سے قطع نظر ہو کر دیکھنا چاہیے۔ ورنہ کلاسیک کا سارا سرمایہ خراب
طے پائے گا۔ ڈائجسٹ کی سیریز کو مقبول کرانے میں برادرم شکیل عادل زادہ کی
تحریر کو بہت دخل ہے۔ ڈائجسٹوں کے ذریعے قاضی عبدالستار، احمد ندیم قاسمی اور
قرۃ العین حیدر ان دور افتادہ علاقوں میں بھی پہنچے ہیں جہاں تصور تک نہیں کیا
جا سکتا تھا۔

اُردو کے ادبی حلقے تخلیقات کے کثیر الاشاعت ہونے سے جھینپتے ہیں۔ یہ ہمارے
معاشرے کا المیہ ہے کہ ڈائجسٹ ادبی رسالوں سے زیادہ مقبول ہیں۔ مگر آگے
جا کر ہم توقع کر سکتے ہیں کہ علمی کتابوں کی اشاعت آج سے کہیں زیادہ ہوگی۔

سوال: آپ نہ تو مشاعروں میں جاتے ہیں نہ رسائل میں چھپنا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی
اب تک آپ نے اپنا مجموعہ چھپوایا ہے۔ کیا آپ اس کی وجہ بتانا پسند کریں گے۔

جون ایلیا: میں اپنے بارے میں بہت زیادہ محتاط ہوں میں اپنے باب میں ایک زمانے سے
حالتِ انکار سے گزر رہا ہوں۔ میں عرصے سے سوختہ دسوزندہ راتیں گزار رہا
ہوں۔ جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے، میں ایک بڑے عرصے تک مشاعروں
میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ مگر شاعری اس طرح سننے سنانے کا عمل نہیں ہے جیسا کہ
مشاعروں میں ہوتا ہے۔ مشاعرہ زبان کی ترویج کے لیے ایک بہت بڑا ادارہ
ہے۔ پاکستان میں اس وقت اُردو کی ترویج کی نہیں، اُردو کی تہذیب کی ضرورت
ہے۔ زبان کی ترویج کے لیے مشاعرے کے ادارے کی ضرورت وہاں زیادہ ہے
جہاں زبان کی ترویج کے دوسرے امکانات معدوم ہیں۔ مثلاً جنوبی ہند، بنگال یا
مشرقِ وسطیٰ وغیرہ۔

جہاں تک میرے مجموعۂ کلام کا تعلق ہے، میں اپنی شاعری کے پیش کش کے لحاظ
سے بہت کم حوصلہ آدمی ہوں۔ میں نے ایک عرصے تک منتشر اور بے ترتیب زندگی
گزاری۔ میں ایک عرصے تک خود کو فراہم نہیں رہا۔ میرا کلام ضائع بھی بہت ہوا
مگر اب بھی میرے پاس تین چار مجموعوں کے بہ قدر مواد ہوگا۔ میری خواہش تو
ہے کہ میرا مجموعہ جلد از جلد چھپ جائے۔ دیکھیے شاید اسی سال آجائے۔

سوال: ابھی آپ نے تذکرہ کیا کہ آپ کی چالیس پچاس نثری کتابیں ہیں ان کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جون ایلیا: ارسطو کی تصنیفات کے بعد رسائل اخوان الصفا ایک ایسا مجموعۂ تصانیف ہے جسے کسی جھجک کے بغیر علوم وفنون کی انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا ہے یہ کل 54 رسالے ہیں۔

میں نے ان میں سے 25 رسالوں کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ میں سب کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس دوران فلسفے کی دوسری کتابوں کے ترجمے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے منصور حلاج کی کتاب ''کتاب الطّواسین'' کا ترجمہ کیا فلسفے پر ناصر خسرو کی ''رہائش و بشائش'' کا اور طوسی کی کتاب تجرید کا ترجمہ کیا۔ ناصر خسرو کی ایک ضخیم کتاب جامع الحکمتین کا ترجمہ بھی کیا۔ تاریخِ عرب قبلِ اسلام پر سات سال کام کیا۔ جو مسوّدات کی شکل میں موجود ہے۔ تاریخ میں فاطمی تاریخ پر بھی دو کتابوں'' فاطمی جزیرۂ عرب و شام میں'' اور'' فاطمی یمن میں'' کا ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں انگریزی سے حسن بن صباح اور جوہرِ صقلی نامی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ جو شایع ہو چکی ہیں آج کل عرب اور یونانی فلسفے پر ایک مبسوط کتاب مرتب کر رہا ہوں۔

انشائیوں کے ایک ضخیم مجموعے کی کتابت ہو چکی ہے جو جلد شایع ہوگا۔ انقلابی صوفی صلاح پر ایک کتاب بالکل تیار ہے۔ ایک اور کتاب بھی اشاعت کے لیے تیار ہے جس کا نام میں نہیں بتاؤں گا۔

میں نے پانچ برس بے خوابی کی کیفیت میں گزارے ہیں جس کی وجہ سے ان کتابوں کی اشاعت میں تعطل ہوتا رہا مگر اب یہ تمام کتابیں جلد شایع ہوں گی۔

سوال: پچھلی ترقی پسند نسل اور موجودہ نسل کی شاعری میں کیا آپ کوئی فرق محسوس کرتے ہیں؟

جون ایلیا: پچھلی ترقی پسند نسل کا دور براہِ راست شاعری کا تھا۔ اب شاعری میں رمز وایمائیت کا عنصر اُبھر آیا ہے اور پچھلی ترقی پسند نسل کا براہِ راست شاعری سے انحراف بہت عام ہے۔

جن شاعروں کے یہاں رمز و ایمائیت کا عنصر زیادہ ملتا ہے ان میں عبیداللہ علیم، ثروت حسین اور جمال احسانی کے نام زیادہ اہم ہیں لیکن نئے شاعروں میں انور شعور نے ایمائیت کا سہارا لیے بغیر اپنی غزل کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ وہ زبان و بیان کے سلیقے کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز ہیں۔ ایمائیت سے ہٹ کر شاعری کرنے والوں میں راشد مفتی اور شریف منور کے نام بھی اہم ہیں۔ جہاں تک فکری مزاج کا تعلق ہے میرے خیال میں نئی نسل میں اس کی نمائندگی صغیر ملال کی غزلوں میں ملتی ہے۔ نئے نظم نگاروں میں حسن اکبر کمال کا موضوعاتی تنوع مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس سلسلے میں انھیں اختصاص حاصل ہے۔

جہاں تک نثری نظم کا تعلق ہے میں نے 1962ء میں نثری شاعری، نثری شاعری کہے بغیر کی تھی۔ میرے خیال میں پاکستان میں نثری شاعری میں سب سے زیادہ اہم نام احمد ہمیش اور اسد محمد خاں کے ہیں جو اس کے پیش روؤں میں شامل ہیں مگر میری سماعت کی حد تک نثری شاعری کا سب سے بڑا جواز افضال احمد سیّد نے پیش کیا ہے۔ یہاں ایک بات میں وضاحت سے کہنا چاہوں گا کہ سہولت کے لیے یہ گفت گو میں نے صرف کراچی کے مشاعروں کی حد تک محدود رکھی ہے۔

مجھے اپنی شاعری پر اعتماد نہیں

فوزیہ شاہین

جون ایلیا پچھلے 43 سال سے لفظ وحرف کی صورت گری میں آئینہ خانے میں قیام کرتے ہیں۔ بے صوت لفظوں کو اذنِ کلام دیتے ہیں، خیال کو ابلاغ سے روشناس کرنے کے لیے آنکھوں کے نور سے قلم کی تراش خراش کرتے ہیں۔ خیال لفظ سے ہم آہنگ ہو جائے تو شعر ڈھالتے ہیں یا نثر لکھتے ہیں اور پھر فکر کے گنبد میں چہار جانب شیشے سجا دیتے ہیں اور ہر شیشے میں شعر کہتے ہیں اور پھر بہت سے شعروں کی گٹھڑی بنا کر اسے شاید کے شک میں رکھ کر بھرے مجمع میں اُچھال دیتے ہیں اگر مجمع قبولِ عام کا اعلان بھی کرے تب بھی جون ایلیا شاید کے شک کی دیواروں کی اوٹ سے خود اپنا تماشا دیکھتے ہیں۔

جون ایلیا حسین بن منصور الحلاج سے بڑی نسبتیں رکھتے ہیں، منصور نے وحدت کے ہزاروں مظاہر میں ایک ہی ذات کا نظارہ کیا۔ اس کے ظرف کے چھلکنے سے پہلے اس کے عہد نے اس پر ملامتوں کی بارش کی اور پھر پتھروں اور کنکروں سے سنگ سار کیا، پھر اسے سولی، صلیب اور پھانسی کے منظروں سے گزارا گیا۔ کیا انھیں بھی جنید نے رسم و راہِ دنیا نبھانے کو پھول سے مضروب کیا۔

ہم نے جون ایلیا سے کلام کیا، جون ایلیا کے کئی رنگ ہیں، رنگوں میں یک سانی نہیں ہوتی۔ جون ایلیا کی گفت گو میں یک رنگی نہیں ملے گی مگر جیسے ڈھیروں رنگ اچھے لگتے ہیں اسی طرح جون ایلیا کی ڈھیروں باتیں اچھی لگتی ہیں، بے شک مجھے، آپ کو یا کسی کو بھی ان کی کسی ایک یا تمام باتوں سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔

سوال: گفت گو کا آغاز حال سے کرتے ہیں، آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں، کیا پڑھ رہے ہیں اور کن کیفیات سے گزر رہے ہیں؟

جون ایلیا: دراصل میری تین حالتیں ہیں، میں اُداس رہتا ہوں، میں پڑھتا ہوں اور میں لکھتا ہوں۔ مزید برآں یہ تینوں صورتیں طے شدہ ہیں، اس کے علاوہ بھی میں کچھ کام کرتا ہوں۔ میں پاکستان کی صورتِ حال کے بارے میں جانتا ہوں تو مشتعل رہتا ہوں۔ میں پاکستان سے بہ طور ملک مشتعل نہیں ہوتا۔ یہ ملک عوام کا ہے مگر یہاں پر لوگوں پر جو جبر کیا گیا جو قتال ہوا وہ میرے لیے نا قابلِ برداشت ہے۔

سوال: بات ہو رہی تھی کہ آپ ان دنوں کیا کر رہے ہیں، پڑھ کیا رہے ہیں، لکھ کیا رہے ہیں؟

جون ایلیا: میں نے آپ کو بتایا نا کہ پڑھنا لکھنا میرے معمولات ہیں، میں اُداس رہنے کے علاوہ پڑھتا اور لکھتا ہوں۔

سوال: جب آپ اُداس ہوتے ہیں تو یہ کیفیت کتنی دیر طاری رہتی ہے؟

جون ایلیا: اُداس ہو جاؤں تو پھر اُداس ہی رہتا ہوں، احساسِ تنہائی بڑھ جاتا ہے، اچھی خبر نہیں آتی، صبح اخبار دیکھتا ہوں تو اور اُداس ہو جاتا ہوں۔ میں اجتماعی زندگی کا عادی رہا ہوں، میرے گھر سے بڑے بڑے اخبارات نکلے، اُردو کے سب سے بڑے اخبار کی ادارت میرے گھر سے کی گئی۔ میں نے شاعری بھی کی، میں شاعری کو معتبر وظیفہ سمجھتا ہوں اور میں نے مارشل لاؤں کے زمانوں میں شاعری کی۔ میرے نزدیک شاعری کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ سچ بولے اور جھوٹ بولنے والے کا منھ توڑ دے۔ میں اس وقت دو تین کام کر رہا ہوں۔ میں اپنا دوسرا مجموعہ مرتب کر رہا ہوں اور اس کا دیباچہ لکھ رہا ہوں، میری شاعری کے 12 مجموعے ہیں، ایک چھپ چکا، اس کے 9 ایڈیشن چھپے، دوسرا پریس میں جانے والا ہے، میں تاریخِ تہذیبِ انسانی پر کام مکمل کر رہا ہوں۔ مزید برآں میں فلسفے پر کام کر رہا ہوں اگر چہ فلسفہ محض فلسفہ ہوتا ہے وہ ہندو یا مسلمان نہیں ہوتا مگر ہندوستان میں فلسفے کے بارے میں مسلمانوں نے جو سوچ بچار کی یہ میرا موضوع ہے۔ علاوہ ازیں تصوف میرا موضوع ہے۔ میں نے 15 برس تک حسین منصور حلاج کے بارے میں سوچا اور میں نے

اس کی زندگی پر کتاب لکھی 'مسیح بغداد حلاج' میں نے یہ کتاب فارسی، اُردو، انگریزی اور عربی میں لکھی تھی۔ میری 15 برس کی سوچ اور فکر سے لکھی جانے والی کتاب میری عزیز ترین ہستی نے ضائع کر دی اور یہ کتاب اس ہستی نے بالارادہ ضائع کی۔

سوال: عزیز ترین ہستی کا نام بتانا پسند کریں گے؟

جون ایلیا: میرے خیال میں نام رہنے دیا جائے۔ وہ مجھے اب بھی عزیز ہے۔ نام لینے سے اس کے اور طرح معانی لیے جائیں گے۔ میں نے حسین بن منصور الحلاج کی سب سے مشہور اور شاہ کار تصنیف 'کتاب طواسین' کو گردشِ ایام سے محفوظ کر رکھا ہے۔ 1968ء میں میں نے اس کا ترجمہ اور تشریح کی۔ وہ چھپ کر آنے والی ہے پھر حلاج کے حالاتِ زندگی پر ایک کتاب آنے والی ہے، پھر میں نے فلسفے پر کتاب مرتب کی۔ میں نے لگ بھگ پچیس تیس کتابوں پر کام کیا۔ میرا موضوع ہے شاعری، فلسفہ، تاریخ تہذیب، انسان اور عوام۔

سوال: اگر آپ پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھیں تو آپ کو اپنی زندگی میں کیا کامیابیاں اور کیا ناکامیاں نظر آتی ہیں۔ آپ کو اپنے ماضی سے کیا بازگشت سنائی دیتی ہے؟

جون ایلیا: ذاتی زندگی میں مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں کوئی بڑا شاعر نہیں ہوں۔ میں اس قابل بھی نہیں تھا کہ مجھے 20 آدمی پہچانتے۔ میں نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ میں کراچی سے باہر دیکھتا ہوں تو میری ایک پہچان ہے۔ کراچی میں تو مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا، اسی شہر میں میرے بھائی کو قتل کیا گیا۔

سوال: ہم آپ سے زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟

جون ایلیا: دیکھیں میں بیمار رہتا ہوں، میرے سینے میں دُکھ ہوتا ہے۔ دراصل ہم نے خواب دیکھے تھے، ہمارے عہد کے لوگوں کا یہ خواب تھا کہ انگریز چلے جائیں گے تو ہن برسے گا مگر ہوا کچھ اور، جو کچھ ہوا وہ ہمارا خواب نہیں تھا مگر میں یہ ضرور کہتا ہوں مجھے پاکستان میں جو کچھ ملا میرے حصے سے زیادہ ملا۔ یقیناً مجھے چار پانچ ہزار افراد جانتے ہیں، یقیناً 50-60 افراد مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے یہ شکایت نہیں ہے کہ میری قدر نہیں کی گئی، مجھے میرے ہنر سے کہیں زیادہ داد ملی۔

یہ وہ سب کچھ ہے جو میں نے حاصل کیا اور جو کچھ میں نے حاصل نہیں کیا وہ یہ ہے کہ میری ذاتی زندگی ایک عذاب ہے، میرا کوئی گھر نہیں ہے، میں نے ایک عمر گزاری گھریلو زندگی میں، میں نے طویل عرصے تک ایک محبت کی، مجھ سے بھی محبت کی گئی، میں نے محبت کی پرورش کی۔ ایک بہت ہی قابل رحم، شریف، اور ذہین خاتون تھی جو بہت پڑھتی تھی، وہ میرے قریب آئی۔ میں نے اس کی سرپرستی کی اور میں نے اسے یقیناً پاکستان کی چند بڑی شخصیتوں کے برابر افسانہ نگار، مضمون نگار بنایا پھر ہماری شادی ہوئی عام طور پر شادی ہونے پر محبت کو پالیا جاتا ہے۔ عام سماجی رویہ یہ ہے کہ جب پالیا جائے تو مرد پر یہ الزام لگتا ہے کہ وہ بھاگ گیا، مگر میں نہیں بھاگا۔ میں نے پوری ذمہ داری نبھائی مگر مجھے تباہ کر دیا گیا۔ میں آج اپنے گھر میں نہیں بیٹھا، میرا اپنا گھر تھا جس میں میرے احباب آتے تھے، اب اس دنیا میں میرے پاس ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔

سوال: میری سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا آپ ملکیت پرستی کی بات نہیں کر رہے ہیں، کیا آپ عدم ملکیت کے غم میں گھل رہے ہیں۔ آپ جیسے آدمی اپنی گفت گو میں جائیداد اور ملکیت الاراضی کے بارے میں 'میری' 'تیری' کے الفاظ کیوں استعمال کر رہے ہیں؟

جون ایلیا: میں بتاتا ہوں، میں نے کہا بھی ہے، میں چوں کہ نجی ملکیت کا قائل نہیں تھا، مجھ سے کہا گیا کہ یہ لے لو اور وہ لے لو، مگر میں نے انکار کیا۔ میں نے کہا کہ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ میں اس کا سب سے بڑا منکر ہوں مگر میری ذاتی زندگی جو ہے کیا میں اس سے دست بردار ہو جاؤں، میں اپنی ذاتی زندگی میں بہت محبت کرنے والا آدمی ہوں، مجھے حسن سے بے پناہ محبت ہے مگر میں جہاں ہوں وہاں میرے گردوپیش میں نہ حسن ہے نہ محبت ہے۔ میرے گردوپیش میں تپاک نہیں ہے، خوش بو نہیں ہے، تڑپ نہیں ہے۔ جب رات کو میں کہیں سے کراچی واپس آکر ائیر پورٹ پر اُترتا ہوں تو میں تنہا ہوتا ہوں۔ ایک دفعہ فہمیدہ ریاض اور میں کہیں جا رہے تھے، میں نے اس سے پوچھا کہ فہمیدہ تمھیں معلوم ہے کہ اس شہر کی آبادی

کیا ہے؟ اس نے کہا کہ یہی کوئی ایک کروڑ، ایک کروڑ 10 لاکھ۔ میں نے کہا کہ فہمیدہ کیا یہ دکھ کی بات نہیں ہے کہ اس ایک کروڑ کے شہر میں کوئی خاتون میرا انتظار نہیں کر رہی ہے۔ یہ میرا دکھ ہے کہ میرا انتظار کوئی نہیں کرتا، مجھے کوئی نہیں مانتا، مجھے کوئی اپنی ملکیت نہیں سمجھتا۔ میرے لیے کوئی نہیں جاگتا۔

سوال: اگر آپ سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ جون ایلیا بہ طور انسان، بہ طور شاعر اور بہ طور عالم ان تین حیثیتوں کا موازنہ کریں تو آپ کیا کہیں گے؟

جون ایلیا: اس میں میری سب سے مضبوط حیثیت انسان کی ہے۔ باقی رہیں شاعر اور عالم کی حیثیتیں تو یہ میری کچھ حیثیتیں ہیں۔ میں وہ شاعری نہیں کر سکا جو کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس 12 مجموعوں کا مواد موجود ہے۔ میرا پہلا مجموعہ 'شاید' برسوں کی تاخیر سے آیا۔ اب اس کے کئی ایڈیشن آ چکے ہیں مگر شاید کا ہر دوسرا ایڈیشن پہلے سے مختلف ہے۔ میں نے ترامیم کیں، تبدیلیاں کیں، اصلاحات کیں۔ میں کاملیت کی تلاش میں تباہ ہو گیا، میں نے 30 برس تک اپنی شاعری اس لیے نہیں چھپوائی کہ میں اس سے مطمئن نہیں تھا۔ مجھے اگر موقع ملے تو میں اپنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ پوری شاعری دوبارہ لکھوں۔ میں نے فلسفے پر اس قدر لکھا کہ میرے کسی معاصر شاعر نے 100 برس تک بھی اتنا نہیں لکھا ہوگا۔ میں نے اہم تراجم کیے مگر میں ابھی تک کوئی ایسی ذاتی کتاب نہیں دے سکا جس پر میں فخر کر سکوں۔ بہ طور شاعر اور بہ طور عالم میں ایک طالب علم ہوں۔ میں ابھی تک شاعر بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہ طور عالم میں ایک مبتدی ہوں۔ ہاں ایک بات کہتا ہوں کہ ایک بڑے عرصے سے میرے ہاتھ میں قلم ہے مگر میں نے کسی انسان کے خلاف نہیں لکھا جب کہ اوروں نے میرے خلاف بہت لکھا، میں نے بھدے ترین انسان کے خلاف بھی نہیں لکھا۔

سوال: یہ کون سی قابلِ فخر بات ہے کہ آپ نے کسی کے خلاف نہیں لکھا۔ کیا ایسے بہت سے لوگ نہیں ہوتے جن کے خلاف لکھا جانا چاہیے، کیا ظلم اور بربریت کرنے والے انسانوں اور دہشت گردی کرنے والوں کے خلاف نہیں لکھنا چاہیے؟

جون ایلیا: میں نے دائرے بنائے ہیں، جو لوگ عوام کی جان کو آ رہے ہیں میں حکم ران طبقے کا مخالف ہوں۔ میں شاعروں اور ادیبوں کے خلاف نہیں لکھتا مگر جانے کیوں میرے خلاف محاذ بنا ہوا ہے۔ میں بُرے شاعروں اور بُرے ادیبوں کے خلاف بھی نہیں لکھتا۔

سوال: آپ نے زندگی بھر شاعری کی، کیا کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے سوچا ہو کہ میں نے اپنا کام پورا کر لیا ہے اور میں نے چند ایسے شعر لکھ لیے ہیں جو آنے والے زمانوں میں سخن کی سلطنت پر راج کریں گے؟

جون ایلیا: مجھے اپنی شاعری پر اعتماد نہیں ہے، میں کاملیت (پرفیکشن) کا آدمی ہوں۔ مجھے سخن میں طمانیت نہیں ملی، میں کاملیت اور تکمیل سے دُور ہوں۔ میرا ہر شعر دوبارہ لکھے جانے کے قابل ہے۔ میں روز شاعری کرتا ہوں، میں روز غزلیں لکھتا ہوں، میں جاگ جاگ کر لکھتا ہوں، میں شاید اپنی زندگی پوری کر چکا ہوں۔ میری صحت تباہ ہو چکی ہے، میری زندگی سے جمال نکل چکا ہے۔ میں حسن کی افلاس میں آ گیا ہوں۔

سوال: آپ نے کہا کہ میں پرفیکشن کی تلاش میں ہوں، میں کاملیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خیال میں کیا کوئی چیز مکمل ہو سکتی ہے۔ کیا کسی شاہ کار میں کاملیت آ سکتی ہے۔ کیا پرفیکشن کا کوئی معیار بنایا جا سکتا ہے؟

جون ایلیا: کاملیت کے لیے میری اپنی سطح تو ہو سکتی ہے۔ میں کچھ تاج محل بنانا چاہتا تھا، میں کچھ عجائبات تخلیق کرنا چاہتا تھا۔ وہ میں نے بنائے بھی ہیں اور میں یہ کہہ بھی سکتا ہوں کہ میں نے اُردو کی صفِ اوّل کی شاعری میں کچھ شعر شامل کیے ہیں۔ میں نے میر و غالب کے شعروں کے ساتھ لکھے جانے والے شعر بھی کہے ہیں مگر جو کاملیت میں چاہتا ہوں، وہ نہ ہو سکی مگر میں بہت اچھا کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُردو، فارسی اور عربی میں شاعری کی۔

سوال: بعض لوگوں کو بعض دوست بہت یاد آتے ہیں، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بہت یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ عرصے تک لوگوں سے نہیں ملتے مگر وہ لوگ آپ کو لحظہ لحظہ یاد رہتے ہیں۔ آپ کا ایسا کون سا شعر ہے جو آپ کو روز یاد آتا ہو لوگوں کی طرح، احباب کی طرح؟

جون ایلیا میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

زندگی کس طرح بسر ہوگی
دل نہیں لگ رہا محبت میں

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

وہ ملے تو یہ پوچھنا ہے مجھے
اب بھی ہوں میں تری امان میں کیا

کیا ستم ہے کہ اب تیری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

(اس شعر کو پڑھنے کے بعد جون ایلیا رو دیے)

سوال: کئی زبانوں پر عالمانہ دست رس رکھنے والے ایک شخص کے طور پر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اُردو زبان میں ابلاغ کے مسائل حل ہو گئے ہیں اور کروڑوں لوگوں کی زبان بن جانے کے بعد اُردو ایک مکمل زبان کا درجہ حاصل کر سکی ہے؟

جون ایلیا: میں بنیادی پر قنوطی ہوں یعنی یاسیت پسند، مگر جو حقائق ہیں وہ حقائق ہیں۔ میں بچہ تھا، میرے بھائی سیّد محمد تقی اور مولانا سیّد سلیمان ندوی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، دوران گفت گو مولانا سلیمان ندوی نے کہا کہ اگر اُردو کا کوئی پرچہ آٹھ ہزار کی تعداد میں چھپنے لگے تو میں اُردو کے مستقبل سے مطمئن ہو جاؤں گا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ کراچی میں لوگ نئے نئے آئے تھے، صبح کا سب سے بڑا اخبار 'انجام' ہوتا تھا اور شام کا اخبار 'جنگ' ہوتا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب جنگ دو تین ہزار چھپتا ہوگا پھر وہی پرچہ لاکھوں میں چھپنے لگا، دہلی میں ایک زمانے میں یہ اخبار بہت کم چھپتا تھا اور

ہفتے میں ایک آدھ بار منظرِ عام پر آتا تھا۔

ایمان داری کی بات یہ ہے کہ اُردو نے کئی شعبوں میں بڑی ترقی کی ہے۔ ایک ترقی دائرے کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اُردو ادب کسی ایک کی زبان نہیں رہی، اس کا مزاج ایسا ہے کہ یہ ایک گروہ کی زبان نہیں بن سکتی۔ اُردو جہاں سے بھی گزری وہاں کی زبان ہوگئی۔ درۂ خیبر سے آکر ملتان تک پہنچنے والوں نے تصوف کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی عام کیا، حکم ران طبقے نے انگریزی سے وابستگی رکھی، باایں ہمہ اُردو نے بڑی ترقی کی۔ اُردو برصغیر کی دوسری بڑی زبان بن چکی ہے۔ رہا اس زبان کا علمی پہلو تو اس میں بڑے تراجم نہیں ہوئے۔ اُردو 1911ء میں بہ طور ذریعۂ تعلیم دُور دُور تک پھیلی۔ اس زبان میں لوگوں نے مختلف علوم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

سوال: ہمارا سوال یہ تھا کہ کیا اُردو مکمل زبان بن چکی ہے؟

جون ایلیا: میں اسی طرف آرہا ہوں۔ اُردو میں جس رفتار سے تراجم ہونے چاہییں، اس رفتار سے ترجمے کا کام نہیں ہوا۔ زبان کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ کوئی زبان اگر ارتقا کے ابتدائی مرحلے میں ہو تو اس کی ترقی کے دو سرچشمے ہوتے ہیں، ایک ترجمہ ہوتا ہے اور دوسرا تخلیقی مواد ہوتا ہے۔ آپ بنگالی کی مثال لیں، یہ کوئی بہت بڑی زبان نہیں ہے لیکن ٹیگور نے اپنی تخلیقات سے بنگالی کو عالمی زبان بنا دیا اور اسے نوبل پرائز کے قابل زبان بنا دیا۔ میں اُردو کے بارے میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ ترجمے کا کام جس پیمانے پر ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ اُردو زبان سے حکم ران طبقے کا کوئی مفاد وابستہ نہیں۔ اُردو پڑھ کر کوئی شخص ٹی وی نہیں خرید سکتا، اُردو میں اچھی فلم بن سکتی ہے چناں چہ آپ دیکھیں برصغیر میں اُردو فلموں نے کس قدر ترقی کی ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادیب اپنی اپنی زبانوں کے ذریعے کماتے ہیں مگر اُردو کا ادیب اپنی زبان کے ذریعے کما نہیں سکتا۔ میں ایک بات اور بھی واضح کرتا چلوں کہ اگرچہ میں ترجمے پر زور دے رہا ہوں مگر زبانیں محض ترجمے سے نہیں چلتیں۔ ایک زمانہ آیا کہ جب لوگوں نے

محسوس کیا، میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ 14 ویں صدی عیسوی میں یورپ نے محسوس کیا کہ فلسفہ، منطق، طبیعات، حیاتیات اور دیگر تمام علوم عربی سے یورپی زبانوں میں ترجمہ ہو کر آ رہے ہیں حتیٰ کہ یونانی فلسفہ بھی یورپ نے عربی تراجم سے پڑھا۔ لوگوں نے سوچا کہ ہم تمام علوم کو اپنی اصل زبان میں کیوں نہ پڑھیں، اس خیال کے آنے پر یورپ میں یہ تحریک چلی کہ یونانی فلسفے کو یونانی زبان سیکھ کر پڑھا جائے پھر یورپ کے لوگوں نے اپنی اپنی زبانوں میں کتابیں لکھنا شروع کیں مگر اُردو میں ابھی وہ وقت نہیں آیا جب سائنسی علوم میں بڑی کتابیں خود اُردو میں ہی لکھی جائیں۔ میں اُردو کی ایک تخلیقی کتاب فلسفہ 'غیب و شہود' سے واقف ہوں مگر یہ بھی کوئی بڑی کتاب نہیں ہے۔ میرے خیال میں اُردو میں ایسا کوئی بڑا آدمی نہیں آیا جس نے اپنا نظامِ فکر دیا ہو۔

میرے بھائی سیّد محمد تقی عالمی فلسفہ کانگریس کے رکن تھے۔ انھوں نے فلسفے پر کتاب لکھی 'تاریخِ کائنات اور میرا نظریہ' انھوں نے بڑی محنت کی، یہ بڑی اچھی کتاب ہے مگر میں اس سے یک سر اختلاف کرتا ہوں، اس میں محض قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کتاب کے ذریعے سیّد محمد تقی نے اپنا نظریہ دینے کی کوشش کی تھی مگر اس کتاب کی قدر نہیں کی گئی، کسی کتاب یا نظریے کی قدر ہونے کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ وہ کتاب یا نظریہ صحیح ہے۔ افلاطون یک سر غلط ہے، وہ زندگی سے ضد کرتا ہے، وہ زندگی سے انکار کرتا ہے مگر افلاطون کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ افلاطون جس سطح کا آدمی تھا، جس سطح پر اس نے کائنات کو سوچا وہ سطح قابلِ ذکر ہے۔ اُردو میں قابلِ ذکر کام نہیں ہوا، سائنس اور دیگر شعبوں میں ایسی کتابیں ہونی چاہیے تھیں جو براہِ راست اُردو میں لکھی گئی ہوں۔

سوال: ایک ایسا شخص جس نے بچپن میں تپِ دِق کو آئیڈیلائز کیا ہو اور جو محبوبہ کے سامنے نوالہ چبانے کو غیر جمالیاتی عمل سمجھتا ہو اس کے موجودہ آئیڈیل کیا ہیں اور اس کا تصورِ جمالیات کیا ہے؟

جون ایلیا: بات یہ ہے کہ ہمارے بچپن میں معاشرے کے اندر موجود ظلم کے خلاف لڑنے

والے تپ دِق کا شکار ہو جاتے تھے۔ مجھے تپ دِق بہ طور بیماری پسند نہیں تھی۔
میں موت پسند یا ہلاکت پسند نہیں ہوں۔ مشکل یہ تھی کہ اس زمانے کے حسّاس،
باشعور اور مسائل پر نظر رکھنے والے نوجوان کا مقدر ٹی بی کا مرض تھا۔ انگریزوں کا
زمانہ تھا اور جاگیر دارانہ سماج تھا، اچھے خاصے نوجوان بجھ جاتے تھے، ان کی محبتیں
ناکام ہوتی تھیں، ان نوجوانوں کی شرافت، دیانت اور ان کی علمیت کو محبت کے
قابل نہیں سمجھا گیا، انھیں محبوبائیں نہیں ملیں۔ محبوبہ کا باپ یہ تقاضا کرتا تھا کہ اس
کی بیٹی کا ہونے والا شوہر کیپٹن ہونا چاہیے، اسے ڈائریکٹر ہونا چاہیے، اسے افسر
ہونا چاہیے تو ایسے میں جب کوئی ذہین ترین اور حسّاس ترین آدمی کسی ناہید کو پانے
میں ناکام ہوتا تھا اسے ٹی بی ہو جاتی تھی، جن لوگوں کو ٹی بی ہوتی تھی وہ میرے
آئیڈیل تھے، وہ محبت کرنے والے تھے، اسی لیے مجھے پسند تھے چناں چہ خود میں
ٹی بی کا شکار ہوا۔

میری ماں بہت خوب صورت خاتون تھیں، میرے دادا میری ماں کو فرنگن کہتے تھے۔
عہد نامۂ قدیم یعنی تورات میں ایک کردار ہے جو اپنے محبوب کے بارے میں
عبرانی نظم کہتی ہے اور اپنے اندر موجود جمالیات، حسیت اور اپنے اندر موجود کشش
کا ذکر کرتی ہے۔ میں نے جب اس حسن کی تفصیل پڑھی تو مجھے یوں لگا کہ یہ تو
میری ماں کا ذکر ہو رہا ہے۔ میں جنس زدہ آدمی نہیں، میں جمالیاتی آدمی ہوں۔
میرا خواب لڑکیوں کی تمکنت ہے، سنجیدگی ہے۔ مجھے کسی قیمت پر نچیا، گویا لڑکی
پسند نہیں ہے، میں مار دھاڑ کرنے والوں اور بالاتر ہونے کا احساس رکھنے والوں کو
پسند نہیں کرتا۔ مجھے پائلٹ کا خواب رکھنے والی لڑکی پسند نہیں ہے۔

سوال: آپ کا کیا خیال ہے کہ جن لوگوں کو آپ پسند نہیں کرتے ان کی شادی نہیں ہونی چاہیے؟

جون ایلیا: عورت بدصورت پسند ہے۔ میرا تجزیہ ہے کہ عورت بدصورتی کو پسند کرتی ہے۔
میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میرا ایک بھتیجا ہے اقبال مہدی جو بڑا آرٹسٹ ہے، مجھ
سے انھوں نے دو افراد ملوائے ایک آدمی بالکل بن مانس جیسا لمبا کالا اور اس کے
ساتھ جو لڑکی تھی وہ قیامت کی خوب صورت تھی، بے پناہ حسین تھی۔ میں نے

اقبال مہدی سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو وہ بولے یہ بہت بڑی سنگر ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کے ساتھ کون ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ یہ اس کا شوہر ہے۔ مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ بن مانس نے انسان سے شادی کر لی پھر میں نے سوچا کہ عورت بہ طورِ خاص بدصورتی کو پسند کرتی ہے، ایسا وہ اس لیے کرتی ہے کہ اسے دولت چاہیے، اسے تحفظ چاہیے اور کچھ نہیں چاہیے۔

سوال: آپ سے اگر یہ کہا جائے کہ آپ میرؔ اور جون ایلیا کی شاعری کا موازنہ کریں تو آپ کیا کہیں گے؟

جون ایلیا: میرا میرؔ سے رشتہ ہے، میر تقی میرؔ کے جو واحد منفرد اور معتبر شاگرد تھے، ان کا نام سیّد عبدالرسول نثار تھا، میرے دادا سیّد داد محمد جنرل تھے اور سیّد عبدالرسول بھی جنرل تھے۔ میرے دادا جب دہلی سے امروہہ آئے تو سیّد عبدالرسول کو ساتھ لیتے آئے۔ غالباً وہ غیر شادی شدہ تھے، وہ ہماری قدیم پرانی حویلی میں رہنے لگے۔ مصحفی نے اپنی کتاب ریاض الفصحاء میں لکھا ہے کہ میں ہفتے عشرے میں سیّد عبدالرسول کے پاس جاتا ہوں اور وہ کوئی 60 برس کے ہیں، آپ یوں سمجھیے کہ جب میرے بھائی رئیس امروہوی زندہ تھے تو وہ میرؔ کے وارث تھے۔ اب میں میرؔ کے خاندانِ معنوی کا واحد وارث ہوں۔ میرؔ کے شاگرد سیّد عبدالرسول میرے جدِ امجد کے ساتھی تھے۔ میرے دادا نے اپنے پوتے کو سیّد عبدالرسول کو ان کی شاگردی میں دیا۔ سیّد سلطان احمد سلطان میرے دادا تھے اور سیّد عبدالرسول کے شاگرد تھے گویا وہ میرؔ کے شاگرد تھے۔ اس وقت دنیا میں میرؔ کے خاندانِ معنوی کا واحد نمائندہ ہوں۔ میں میرؔ سے موازنے کی کیا بات کروں، میں تو ابھی شاعری کر رہا ہوں۔ 'خاک راچہ نسبت بہ عالم پاک۔'

سوال: کیا کبھی یہ خیال آتا ہے کہ میرؔ نے کوئی ایسا شعر لکھا ہے اور آپ سمجھیں کہ ایسا شعر تو میں تو ابھی نہیں لکھ سکا؟

جون ایلیا: ایسا ہوتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں کہتا ہوں میں نے کیا شعر لکھ دیا میرؔ کا ایسا شعر نہیں ہوگا۔ کبھی کبھی ایسے لمحے آتے ہیں۔

سوال: میر کے ایسے شعر کون سے ہیں جو آپ کو اپنے بہت قریب لگے؟

جون ایلیا: لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہ شیشہ گری کا

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

یہ کہنا کہ میں میر سے متاثر ہوں اس لیے صحیح نہیں ہوگا کہ میری تربیت فارسی شاعری میں ہوئی، میں فردوسی سے متاثر ہوں۔

سوال: کمال ہے آپ ایک رزمیہ شاعر، جنگ و جدل کے شاعر فردوسی سے متاثر ہیں۔ آپ کیکاؤس اور ضحاک کے شاعر سے متاثر ہیں، آپ جیسے نفیس آدمی جنگ ناموں کے شاعر کو کیسے پسند کرنے لگے؟

جون ایلیا: فردوسی مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس نے ایک تہذیب کو محفوظ کر لیا۔ مسلمانوں نے ایران کی تہذیب ختم کر دی تھی۔ فردوسی نے اسے محفوظ کیا۔ فردوسی نے محض جنگیں نہیں لکھیں، اس نے اپنے بیٹے کا مرثیہ لکھا، فلسفہ لکھا، فردوسی عجیب و غریب شاعر ہے۔ میں ہومر سے آج تک کے کسی شاعر کو وہ کریڈٹ نہیں دے سکتا جو فردوسی کو دے سکتا ہوں۔ اس نے نظریہ دیا، اس نے شاہ نامہ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے انرجی وجود میں آئی۔ میں فردوسی کو فکری اور فنی سطح پر مانتا ہوں۔ مسلمانوں نے ملتان اور منصورہ کو تباہ کر دیا مگر ان خطوں کو، ان شہروں کو فردوسی نہیں ملا، اس لیے یہاں کی تہذیب کا تسلسل ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ فردوسی نے تاریخ اور تہذیب کو ازسرِ نو لکھا۔ میں رزم آرائی کی بات نہیں کر رہا، اس کا بنیادی کردار یہی ہے کہ اس نے ایران کی تہذیب کو محفوظ کر دیا۔

سوال: آپ کے عہد نے آپ کا کتنا ساتھ دیا اور آپ کو اپنے عہد سے بڑا شکوہ کیا ہے اور خود آپ سے آپ کے عہد کو بڑا شکوہ کیا ہو سکتا ہے؟

جون ایلیا: میرا اپنے عہد سے سب سے بڑا شکوہ یہ ہے کہ میرا عہد ایک طرف تو 20ویں صدی گزار کر 21ویں صدی میں سانس لے رہا ہے، دوسری طرف میرے عہد کے

رویے، میرے عہد کی نفسیات، اس کی کینہ پروری، باہم دشمنی اور نفرتیں آج بھی وہی ہیں جو 10,000 سال پہلے تھیں۔ انسان نے بلند ترین عمارتیں پہلے بھی بنائیں تھیں اب بھی بنا رہا ہے لیکن آپ دیکھیں غاروں میں رہنے والا ظالم ترین انسان اپنے برابر بیٹھے آدمی کو کھا جاتا تھا مگر آج کے جدید ترین انسان کی قوتِ گزند پرانے عہد کے انسان سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔ آج کے انسان کی قوتِ ضرر اور قوتِ ظلم بہت بڑھی ہے۔ قدیم انسان میں ہلاکت کی اتنی طاقت نہیں پائی جاتی تھی۔ آج کے انسان میں ہلاکت اور تباہ کاری کی طاقت بڑھی ہے۔ بھلا یہ کوئی سائنس ہے کہ اس نے ایٹم بم بنا لیا۔ دیکھیں ایٹم بم سائنس دان نے بنایا کسی شاعر نے نہیں بنایا، شاعر تو نفرت پھیلانے کی باتیں نہیں کرتے۔

سوال: سائنس دان خلا میں بھی تو گیا، سائنس دان نے توانائی کا فارمولا بھی تو دیا، سائنس دان نے زندگی کی سختیوں کو سہل بھی تو بنایا، سائنس دان نے انجینئرنگ بنائی، اس نے تاج محل بھی تو بنایا، انسان چاند پر بھی گیا؟

جون ایلیا: جو کچھ کہا ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کیا انسان کو سکون مل گیا، انسان چاند پر جا کر اور خلا میں پہنچ کر اس خوف سے بچ سکتا ہے کہ اگر کسی ایٹم بردار طیارے کے پائلٹ کا دماغ خراب ہو جائے تو پھر دنیا کو بارود کا ڈھیر بن جانے میں کتنی دیر لگے گی۔ فضا میں ایسے طیاروں کے غول گھوم رہے جو ایٹم بم لیے ہوئے ہیں۔ انسان نے سائنس سے غیر انسانی طاقت حاصل کی۔ آخر ہم چاہتے کیا ہیں، ترقی سے ہماری مراد ہے کیا؟ انسان کی ضروریات تو شدید موسموں سے بچاؤ اور بھوک کا علاج اور بقائے نسل انسانی ہیں، اب یہ بتائیں کہ میرے عہد کے انسان نے کون کون سی نئی مسرت حاصل کی؟ قدیم عہد کا انسان بھی اتنا ہی خوش اور ناراض تھا جتنا آج کے عہد کا انسان خوش اور ناراض ہے۔ تناسب میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ میرے عہد کے انسان کی مسرتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، فریج نے کوئی مسرت نہیں دی۔

سوال: گویا انسان کو ترقی نہیں کرنی چاہیے؟

جون ایلیا: میں کب کہہ رہا ہوں کہ ترقی نہیں کرنی چاہیے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ انسان کو

مسرت حاصل نہیں ہوسکتی اگر سائنس کی ذمے داری مسرت دینا تھی تو وہ دے۔ آج ہم کتنے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں اگر کسی بڑی طاقت کا دماغ خراب ہو جائے تو اس کرۂ ارض کو تباہ ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔

سوال: کیا ہمارا یہ مسئلہ نہیں ہے کہ ہم اپنے انفرادی، سماجی تجربات کو پورے عالم پر پھیلا دیتے ہیں۔ ہمارا ذاتی غم اور ہماری ذاتی خوشی کسی اور کے غم اور خوشی کا احاطہ کیسے کرسکتا ہے؟

جون ایلیا: میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ ہمارے اپنے مسائل ہیں اوروں کے اپنے مسائل ہیں۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک عالمی معاشرہ وجود میں نہیں آیا، میں نے اس پر بہت لکھا۔ اب میں یہ سوچتا ہوں کہ عالمی معاشرے کا مطلب یہ ہے کہ کسی تہذیب کا نہ ہونا اگر تہذیبوں کا تنوع باقی نہ رہا تو پھر تہذیب تو باقی نہیں رہے گی۔ لوگ ایک جیسے کپڑے پہنیں گے، ایک جیسا رقص ہوگا۔ واپس آپ کے سوال کی طرف آتے ہیں، میرے عہد کے انسان نے اتنا پایا نہیں ہے بل کہ پایا نہیں کھویا ہی ہے۔

سوال: سوال کا ایک حصہ یہ تھا کہ خود آپ سے آپ کے عہد کو کیا شکایات ہوسکتی ہیں؟

جون ایلیا: میرے عہد کو مجھ سے یہ شکایت ہوسکتی ہے کہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں، میں انجینئر نہیں ہوں، میں باہر جا کر سڑکیں نہیں کھودتا، میں پہاڑ نہیں کاٹتا، میں نہریں نہیں نکالتا مگر میں انسان کو انسانیت سکھاتا ہوں۔ میں وہ کام تو نہیں کرتا جسے ناپا جا سکے مگر وہ کام ضرور کرتا ہوں جو عہدِ جاہلیت میں اسلام کا اثبات کرتا ہے اور یہودیوں کے جابرانہ معاشرے میں عیسیٰ کے ساتھ کھڑے ہونے کی ہمت پیدا کرتا ہے۔

سوال: ذرا ماضی کی طرف چلتے ہیں، آپ کے خیال میں سیاسی عہد میں معتزلہ تحریک فلسفے کا نیا پن تھا یا پھر فقیہ کے استدلال اور استنباط سے بغاوت تھی؟

جون ایلیا: پہلی صدی ہجری میں اسلام میں عجیب وغریب واقعات پیش آئے کہ مفکرین سماجی زندگی سے متنفر ہوگئے۔ ایک طرف امیر المومنین حضرت علیؓ ہیں اور دوسری طرف ام المومنین حضرت عائشہؓ ہیں اور دونوں میں جنگ ہو رہی ہے۔ ہمارے تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کو یرغمال بنا کر قتل کیا گیا۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا

کہ حضرت عثمانؓ کو محمد ابنِ ابو بکر نے قتل کیا۔ خود حضرت نائلہ سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ یہ بتائیے کہ حضرت عثمانؓ کو کس نے قتل کیا؟ تو انھوں نے فرمایا کہ وہ کوئی مصری نوجوان تھا جو پیچھے سے گھر میں کود کر آیا تھا۔ پہلی صدی ہجری میں حضرت عمرؓ کے عہد کا معاشرہ جما ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں معاشرہ بکھرا، حضورِ اکرمؐ کے وصال کے بعد مسلمانوں میں دولت کی ریل پیل ہوگئی، ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ خود حضرت عمرؓ کہہ اُٹھے کہ کاش مسلمانوں میں یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوئی ہوتی۔

سوال: ہمارا سوال معتزلہ کے بارے میں تھا؟

جون ایلیا: میں اسی طرف آرہا ہوں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں یہی اضطرار اور بے یقینی پیدا ہو چکی تھی چناں چہ ترکِ دنیا اور معاشرے سے کٹ جانے کے رویّے پیدا ہوئے، لوگوں نے اپنے لیے پناہ گاہوں کی تلاش شروع کی۔ اب میں ایک واقعے کی طرف آتا ہوں۔ حضرت حسَن بصریؒ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وہاں ایک سوال پیدا ہوا کہ گناہ گار کافر ہوتا ہے یا مومن؟ ایک شخص کھڑا ہوگیا اس نے کہا کہ جو شخص گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو وہ نہ مومن اور نہ کافر ہے۔ المعتزلت ایک حالت ہے جو دو حالتوں کے درمیان کی ہے۔ اس پر حسن بصریؒ نے کہا 'اعتزل عنا واصل' یعنی واصل نے ہم سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اعتزال کا مطلب ہے گوشہ گیری، ترک کر دینا۔ معتزلہ مسلمانوں کی تاریخ کی پہلی عقلی تحریک تھی، معتزلہ کا یہ کہنا تھا کہ شرع عقل کے خلاف نہیں ہو سکتی اور فقہ اور عقل میں تصادم ہو تو عقل کو چھوڑ دینے کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ متشرعین کا یہ کہنا تھا کہ عقل کو شرع کی پیروی کرنی چاہیے۔

جب یہ تحریک شروع ہوئی تو مسلم معاشرے میں یونانی فلسفہ آچکا تھا۔ ایران میں مصر اور عراق کا فلسفہ بھی آچکا تھا۔ اس زمانے کے مفکرین اور ترقی یافتہ اذہان نے یہ کہا کہ قرآن میں جگہ جگہ تفکر اور تدبر کی دعوت دی گئی ہے، تفکر اور تدبر شریعت سے ہٹ کر نہیں تھے۔ معتزلہ کا بھی یہ کہنا تھا کہ عقل کا راستہ اختیار کیا جائے۔ مسلم معاشرے میں نئے علوم آگئے تھے اور ان علوم کی تائید قرآن مجید سے ہوتی تھی۔ خود حضورِ اکرمؐ

نے کہا کہ 'علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔'
ایک حدیث ہے کہ آدم سے کہا گیا کہ 'انھیں عقل چاہیے یا حیا چاہیے' انھوں نے کہا کہ 'مجھے عقل چاہیے۔' خدا نے سب سے پہلے عقل پیدا کی اور قلم پیدا کیا۔

سوال: ہمارا ایسا ہی سوال برامکہ کے بارے میں ہے۔ برامکہ کے مباحث فلسفیانہ تھے، مذہبی تھے، لامذہبی تھے؟

جون ایلیا: برامکہ برمک خاندان سے تھے اور اس خاندان کا روشن خیال نمائندہ جعفر برمکی تھا، یہ اس خاندان کا سرخیل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ برامکہ بہار کے رہنے والے تھے۔ اگر یہ خاندان نہ ہوتا تو ہارون رشید نہ ہوتا اور تاریخ وہ نہ ہوتی جو آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہادی ہارون رشید کو قتل کرانا چاہتا تھا مگر ہارون رشید بچ گیا اور ہادی مارا گیا۔ ہارون رشید نے خاندانِ برامکہ کے کہنے پر باقاعدہ دارالترجمہ قائم کیا، یہاں پر یونانی اور دیگر غیر عربی زبانوں کے علوم کے عربی میں تراجم ہوئے تھے۔ یحییٰ برمکی کے بیٹے فضل اور جعفر برمکی تھے۔ یحییٰ نے ہارون رشید کی جان بچائی تھی۔ جس رات ہارون رشید کو قتل ہونا تھا اور اس کے بھائی کو اسے قتل کروانا تھا، اس رات یحییٰ برمکی خاموشی سے محل میں آیا اور ہارون رشید کو اُٹھا کر لے گیا۔ برامکہ نے جدید علوم کے تراجم کے لیے بڑے ادارے قائم کیے جہاں پر ایک صفحہ ترجمہ کرنے والے کو پانچ پانچ اشرفیاں ملا کرتی تھیں۔ اس خاندان نے علمی تحریک میں بنیادی کام کیا مگر اس کا انجام کیا ہوا، اسی ہارون رشید نے اپنے ساتھ پل بڑھ کر جوان ہونے والے جعفر برمکی کو قتل کروایا، جعفر برمکی وزیراعظم تھا اور ہارون الرشید نے برامکہ کا احسان بالکل اسی انداز میں چکایا جس انداز میں ابو جعفر المنصور نے ابو مسلم خراسانی کا احسان چکایا تھا۔

سوال: ہمارا خیال ہے کہ اسماعیلی تحریک اسلام میں پہلی زیرِ زمین خفیہ سیاسی تحریک تھی۔ کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟

جون ایلیا: میں ایک پرچہ چھاپتا تھا 'انشا' اس پرچے کا نام تھا اور اس پرچے میں داس کیپٹال کا قسط وار ترجمہ چھپتا تھا۔ 1959ء اور 1960ء میں کارل مارکس کی کتاب کا قسط وار

ترجمہ چھپنا کوئی مذاق نہیں تھا۔ ایک مرتبہ کیا ہوا کہ مسلم لیگ کے رہ نما اور کراچی کے سابق میئر جی اے الانہ نے مجھ سے کہا کہ جون میاں تم ہمارے ہاں آ جاؤ اگر آپ اسماعیلی ادارے میں آ جائیں تو بڑا اچھا ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسماعیلیوں کا تصنیفی، تحقیقی اور تاریخی عالمی ادارہ کراچی میں ہے۔ دنیا بھر کے اسماعیلی یہاں آتے ہیں، یہاں پر انھیں لیکچر دیے جاتے ہیں گویا اسماعیلیوں کا عالمی مرکز کراچی ہے۔ جی اے الانہ نے کہا کہ آپ اس ادارے کی سربراہی قبول کریں اور فلسفے پر کام کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ الانہ صاحب میں تو اپنے طور پر اسماعیلی شخصیات پر کام کر رہا ہوں، میں نے پچھلے دنوں ہی بوعلی سینا کی خودنوشت چھاپی ہے۔ بوعلی سینا اسماعیلی تھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ بیٹھیں اور باقاعدہ تنخواہ لے کر کام کریں مگر میں نے ان سے ہامی نہیں بھری۔

دراصل میرے خیالات اس قدر باغیانہ ہیں کہ اہلِ منقولات اس سے دُور بھاگتے ہیں۔ اسماعیلی تحریک بڑی اہم تحریک تھی اور اس نے بڑے بڑے قدآور لوگ پیدا کیے۔ رودکی اسماعیلی تھا، اب رودکی کا کمال دیکھیں اگر رودکی نہ ہوتا تو اُردو شاعری میں غزل نہ ہوتی، دیکھیں میں آغاز کی طرف آتا ہوں۔ حضرت امام جعفر صادقؒ کے دو بیٹے حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ کاظم تھے۔

سوال: آپ نیشاپور کی طرف کیوں نہیں آتے جہاں پر نظام الملک طوسی، عمر خیام اور حسن بن صباح ایک ہی مکتب میں علم حاصل کرتے ہیں؟

جون ایلیا: اس طرح گفت گو میں بڑا خلا پیدا ہو جائے گا۔

سوال: چلیں آپ اسماعیلی فرقے کے آغاز سے اپنا جواب شروع کریں؟

جون ایلیا: اسماعیلی فرقہ امام جعفر صادقؒ کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کو امام مانتا تھا۔ دوسرا فرقہ اثنا عشری تھا جو امام موسیٰ کاظم کو ساتواں امام مانتا تھا، دراصل امام جعفر صادق کے بڑے صاحب زادے حضرت اسماعیل ان کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ تاہم اسماعیلی تحریک کے داعیان نے اسماعیل کے بیٹے محمد کو اپنا امام مان لیا اور تاریخ کی سب سے بڑی خفیہ تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک میں زیرِ زمین کا مطلب یہ

نہیں تھا کہ لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسری جگہوں پر جا کر پناہ لیتے تھے بل کہ زیرِ زمین کا مطلب یہ تھا کہ مصر سے ایک سرنگ کھودی گئی، جو شام تک چلی گئی۔ اس سرنگ کے ذریعے اسماعیلی تحریک کے خفیہ ارکان ایک ایک وقت میں چار چار اونٹ لے کر سرنگ کے اندر چلے جاتے تھے اور کئی دنوں کی زیرِ زمین مسافت کے بعد شام جا پہنچتے تھے۔ اس طرح تنظیمی افراد، تنظیمی وسائل اور تنظیمی پیغامات کی ترسیل کا کام سرنگوں کے ذریعے ہوتا تھا۔

مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ یہ غلط فہمی ہے کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے کیے۔ اس نے دراصل اسماعیلیوں پر حملہ کیا تھا، اس نے ملتان اور منصورہ کے عوام پر حملہ کیا تھا، ان دونوں شہروں میں اسماعیلیوں کی حکومت قائم تھی۔ اسماعیلی ملتان اور منصورہ سے جان بچا کر دوارکا جا پہنچے، محمود غزنوی وہاں جا پہنچا اور کہا کہ ہمارے مجرم ہمارے حوالے کرو۔ وہاں پر سومناتھ والوں نے کہا کہ یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور انھوں نے ہم سے پناہ لی ہے۔ جب سومناتھ کے پجاریوں نے اسماعیلیوں کو محمود غزنوی کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تو محمود غزنوی نے وہاں پر بت توڑ دیے ایک بت سے اشرفیاں بھی نکل آئیں۔

سوال: تصوف نے بہ طور نظریہ، بہ طور فکر، بہ طور فلسفہ اور بہ طور رویہ ہماری معاشرتی زندگی پر کیا اثرات مرتب کیے؟

جون ایلیا: لوگ اس بات پر بحث کریں تو کیا کریں، یہ دوسری بات ہے مگر میرا کہنا یہ ہے کہ تصوف اسماعیلیوں کا شاگردِ رشید ہے۔ اسماعیلی اور اہلِ تصوف انسان دوست تھے، وہ انسان دوستی کی بات کرتے تھے۔ اسماعیلی دینِ کل کے قائل تھے، ان کا کہنا تھا کہ سارے مذہب انسان دوست ہیں، سارے انسان ایک ہیں، وہ مساواتِ انسانی پر یقین رکھتے تھے۔ صوفیوں کے وحدت الوجود کے نظریے کے بانی اسماعیلی تھے۔ بامسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام کی بات وحدتِ ادیان کی بات تھی۔ تصوف نے انسان کو خانوں میں نہیں بانٹا۔ اس نے مظاہر کو تقسیم نہیں کیا۔ ہمارے ہاں اسلام صوفیا لائے، دنیائے عرب کی آبادی تو آٹھ کروڑ بھی نہیں ہوگی مگر یہ برصغیر

میں مسلمان 40 کروڑ ہیں، یہاں مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی پائی جاتی ہے یہاں تصوف کے ذریعے اسلام آیا، یہاں اسلام تلوار سے نہیں محبت سے پھیلا۔

سوال: ہمارے عہد میں مابعد الطبیعات اور جدلیاتی مادیت کے بارے میں ہر طرح کے مباحث ہوتے رہے اگر آپ اس بحث کو آگے بڑھائیں تو کیا کہیں گے؟

جون ایلیا: انسانی معاشرے کی فطرت ہے مساوات، آج سے ہزاروں سال پہلے درجہ بندی نہیں تھی۔ معاشرے میں اشتراکیت رائج تھی۔ معاشرے کے ارتقائی مراحل میں چیزیں بدلتی رہیں، لوگ پہلے مل کر محنت کرتے تھے اور مل بانٹ کر کھاتے تھے۔ اشتراکیت کی روح نجی ملکیت کے تصور کے خلاف ہے۔ دیکھیں ہم اشتراک کو ایک سماجی نظام کے طور پر لیں اگر روس میں اشتراکی نظام نہیں چل سکا اور چین میں پوری طرح رائج نہیں ہے تو مذاہب کون سے رائج ہیں لیکن انسان کا جو خواب ہے کہ سب انسان برابر ہیں، انسانوں کا یہ خواب ہے کہ کوئی بچہ غذا کی وجہ سے نہیں مرے گا اگر کہیں دونوالے موجود ہیں تو ایک زید اور دوسرا بکر کو ملنا چاہیے۔

سوال: ہمارا سوال یہ ہے کہ میٹا فزکس اور ڈائلکٹیل میٹر یل ازم (مابعد الطبیعات اور جدلیاتی مادیت) کے بہ طور فلسفہ ارتقا کے بارے میں ہمیں آگاہ کریں؟

جون ایلیا: دیکھیں مابعد الطبیعات اور جدلیاتی مادیت دو الگ افکار اور دو مختلف اداروں کی سوچیں ہیں۔ یہ دونوں فلسفے اگرچہ ایک دوسرے سے متصادم اور متحارب ہیں مگر تصوف میں آکر یک جا ہو جاتے ہیں۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ معاشرے کو آخر کار لاطبقاتی معاشرہ بننا ہے۔ طبقے حکومت وجود میں لاتی ہے ہمارے عہد میں حکومت سب سے بڑی ایجنٹ ہے سرمایہ داروں کی، حکومت کی عمر بہت کم ہے۔ تاریخ میں حکومت کی تشکیل کو کتنے دن گزرے ہیں، حکومت کی عمر یہی کوئی پانچ ہزار سال رہی ہوگی مگر زمین تو پانچ ارب سال سے موجود ہے گویا حکومت کی عمر تو بہت کم ہے۔ یہ قصہ ختم ہونا ہے، حکومت کو بالآخر ختم ہونا ہے اور لاطبقاتی سماج قائم ہونا ہے۔

سوال: جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں کیا یہ یوٹوپیا نہیں ہے۔ اس طرح کے تصورات تو 18ویں اور 19ویں صدی میں آئے تھے مگر عملی طور پر تو یہ تصورات محض مثالیہ رہے؟

جون ایلیا: یہ یوٹوپیا نہیں ہے حقیقت ہے۔ یہ ہوا، یہ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے، آپ دیکھ نہیں رہے کہ حکومت کتنے اداروں سے دست بردار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اب نئے رویے سامنے آ رہے ہیں بالآخر ایک نظام وجود میں آئے گا جو نظمی طور پر لاطبقاتی ہوگا۔

زر جہاں ہو نہ قیمتِ یوسف
کر لو بازار بے درم تازہ
کفر اہلِ حرم کی سازش ہے
اور خدا بھی صنم صنم تازہ

تاریخ میں اگر آپ دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ حکومت کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ میری ٹوپی، میرا پین، میرا تکیہ اس انداز کے جملوں کی عمر ہی کیا ہے۔ یہی کوئی ڈیڑھ ہزار برس۔ بھائی پہلے اشتراکی جملے رائج تھے یعنی ہماری فلاں چیز، ہماری فلاں شے، سارا قبیلہ دن بھر کی اجتماعی کمائی کو مل بانٹ کر کھاتا تھا۔ مجھے عہدوں سے، منصبوں، منصب داروں سے نفرت ہے۔ وزیراعظم جاہل آدمی ہوتا ہے، وزیراعلیٰ ناقابلِ ذکر آدمی ہوتا ہے۔ یہ لوگ انسان نہیں ہوتے بل کہ لاانسان ہوتے ہیں، یہ جھوٹے لوگ ہوتے ہیں۔

سوال: آپ لاطبقاتی معاشرہ قائم کر رہے ہیں اور باہر یہ دھوم مچی ہے کہ مارکسزم اپنی طبعی عمر پوری کر چکا ہے؟

جون ایلیا: دیکھیں! آپ مارکسزم کی اصطلاح نہ استعمال کریں، یہ سب مغالطے ہیں۔ لوگ کہنے لگے ہیں کہ کمیونزم مارکسزم ہی ہے۔ بھائی کمیونزم کی بہت سی شکلیں ہیں انسان کا تصور یہ ہے کہ وہ تمام رکاوٹوں کو ہٹا دے جو حکومت نے قائم کی ہیں۔ انسانوں کے درمیان جو تقسیم ہے وہ ختم ہونی ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیردار حکومت کے پشت پناہ بنے رہیں مگر ان سب کا ختم ہو جانا دیوار پر لکھا ہوا ہے۔ یہ مر رہے ہیں، انھیں مرنا ہے، انھیں باقاعدہ مر جانا ہے۔

ہم اوسلو میں تھے، ہم نے دیکھا کہ وزیراعظم لائن میں لگا ہوا ہے، اسے لائن میں، میں نے تو نہیں لگایا اور اداروں کا اقتدار عوام کے پاس جا رہا ہے اور یہی نشانیاں

ہوتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ حکومت اپنی جبر کی قوت سے محروم ہوتی جا رہی ہے اور یہی
تو ہم چاہتے ہیں، یہی تو ہمارا خواب ہے۔
کائنات کی فطرت یہ ہے کہ ہر طرف پوری مسرت چھائی ہوئی ہو۔ کہکشائیں دوڑ رہی
ہیں، بگولے پھٹ رہے ہیں۔ انسان کو بالآخر یہ سیکھنا ہے کہ اسے انسانوں کی طرح
رہنا ہے اور مشترکہ وسائل سے فیض یاب ہوتے ہوئے لاطبقاتی سماج میں رہنا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں پاکستان میں ترقی پسند تحریک کی ناکامی کے اسباب کیا تھے؟

جون ایلیا: یہاں پر جو کمیونسٹ تھے وہ سچے نہیں تھے۔ میں نے یہاں پر آ کر دیکھا کہ
قبائلی سردار کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ وہ لیڈر کمیونسٹ نظریے سے
طاقت حاصل کر رہے تھے۔ اس دور میں جاگیردار انقلابی بنے ہوئے تھے۔
جی ایم سیّد بنیادی طور پر جاگیردار تھے، میں ذاتی طور پر ان کا احترام کرتا ہوں مگر ان
کا جھکاؤ اپنے طبقے کی طرف تھا۔

سوال: جی ایم سیّد کمیونسٹ تو نہیں تھے، وہ کمیونزم کے کٹر مخالف تھے؟

جون ایلیا: یہاں پر جو علاقائی تحریکیں چل رہی تھیں ان کا رجحان اشتراکیت کی طرف تھا۔
آپ ولی خان کی مثال لیں۔ ان کی پارٹی تو کمیونسٹوں کی سرائے بنی رہی،
کمیونسٹ ان کی جماعت میں آتے جاتے رہے۔ شروع شروع میں ترقی پسندوں
کے نام سے ہمارا جن لوگوں سے واسطہ ہوا وہ تو وڈیرے دار اور جاگیر دار تھے۔
یہاں کے سب سے بڑے کمیونسٹ کون تھے؟ وہ تو دوسرے ہی تھے اور جاگیر دار تھے۔

سوال: آپ ان فکری دانش وروں کے بارے میں کیا کہیں گے جو بھارت سے آئے تھے؟

جون ایلیا: یہاں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ یہاں پر کمیونزم سکھانے کے لیے یوپی سے
اسکالر بھیجے گئے اگر یہاں پر ترقی پسند فکر اور نظریے کی بات ہوئی تھی تو یہاں کے
عوام کرتے اور نظریاتی اساتذہ کا تعلق یہاں کے عوام سے ہونا چاہیے تھا۔ اب
چیچو کی ملیاں میں جدلیاتی مادیت اور کمیونزم پر لیکچر ہو رہا ہے اور زبان اُردو بولی
جا رہی ہے۔ یہاں پر ان لوگوں کو آگے لایا جانا چاہیے تھا جو یہاں کے لوگوں سے
براہِ راست مکالمہ کر سکتے تھے اب جن لوگوں کو تحریک کو پھیلانا تھا وہ اپنا کام

نہیں کر سکے پھر جس ملک میں بار بار فوجی حکم ران آتے رہے، مارشل لا لگتے رہے،
وہاں تو یہ ہونا ہی تھا۔

سوال: آپ نے ایک سے زیادہ عشق کیے مگر ایک عشق آپ کی ذات سے منسوب ہوا،
زاہدہ حنا سے محبت کیسی رہی؟

جون ایلیا: زاہدہ سے عشق کا قصہ یوں ہے کہ ہمارے گھر گارڈن ایسٹ میں ایک دفعہ ایک صاحبہ آئیں مسز قزلباش۔ انھوں نے تقی صاحب سے کہا کہ تقی صاحب ہمارے ہاں ایک خاتون کام کرتی ہیں انھوں نے یہ مضمون لکھا ہے، آپ یہ مضمون جنگ میں چھاپ دیں۔ سیّد محمد تقی نے کہا کہ یہ مضمون جنگ سے مطابقت نہیں رکھتا، آپ یہ جون کو دے دیں وہ اسے 'انشا' میں چھاپ دیں گے۔ وہ بڑا اچھا مضمون تھا۔ وہ مضمون یونان کے بارے میں تھا، یہ مضمون قدرے دیر سے چھپا مگر میں نے وہ مضمون چھاپ دیا جس کا عنوان تھا 'یونان تمدن کا گہوارہ'۔

ایک دن میں مسز قزلباش کے ہاں گیا، جب میں داخل ہوا تو وہاں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ میں نے سوٹ پہنا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ میں جون ایلیا ہوں مجھے مسز قزلباش سے ملنا ہے۔ اس لڑکی نے چونک کر کہا کہ 'آپ ہیں جون ایلیا؟' میں نے کہا کہ 'جی' اس نے کہا کہ میں زاہدہ حنا ہوں۔ یہ میرا زاہدہ حنا سے پہلا بلاواسطہ رابطہ تھا۔ وہ اس وقت 16 برس کی لڑکی تھی اس سے میرا پہلا تعارف ہوا۔ 7 برس تک ہمارا ملاقاتوں کا سلسلہ رہا پھر شادی ہوئی مگر اب میں خانہ بدوش ہوں نہ میرے ادھر کچھ ہے اور نہ ادھر کچھ ہے کہ میں روز ٹوٹتا ہوں اور شیشے سنبھالتا ہوں مگر ایک بات ہے کہ میں نے زاہدہ کی تحریر میں جو طاقت اور توانائی پائی تھی وہ میری محبت کی بنیاد تھی۔

آج بھی اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آپ زبان کے اعتبار سے صفِ اوّل میں کن لوگوں کو سمجھتے ہیں تو اس میں ایک بڑا نام زاہدہ حنا کا بھی ہوگا۔ یہ ایمان داری کی بات ہے۔ میں انھیں سلام کرتا ہوں، وہ اُردو کی بہترین افسانہ نگار تھیں، انھیں وقت بہت کم ملا وہ اتنی مقدار نہیں دے سکیں کہ جو باقی رہ جانے کے لیے ضروری ہوتا ہے مگر یہ بھی ضروری

نہیں۔ وہ اپنے ایک مجموعے پر بھی زندہ رہ سکتی ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں بہت سی گستاخیاں کی ہیں۔ میں نے محبت، غصے، جھنجھلاہٹ اور اشتعال میں ان سے بہت گستاخیاں کی ہیں مگر وہ اب بھی کہیں کہیں میرے اندر موجود ہیں۔

سوال: محبوب کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے سمجھوتے بھی کرنے پڑتے ہیں آپ دونوں میں سے کس نے سمجھوتا نہیں کیا اور کیا سمجھوتے کی راہیں بند ہو چکی تھیں؟

جون ایلیا: ہم نے سمجھوتے کیے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم میں اختلاف نہیں تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اُردو کی تاریخ کا یہ پہلا رومان ہے جس میں دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ میں اگر جرمنی میں ہوتا اور ایران میں کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو رہا ہوتا اور زاہدہ کراچی میں ہوتیں تو میں وہاں بیٹھ کر اس واقعے کے بارے میں جو سوچ رہا تھا کراچی میں بیٹھ کر زاہدہ بالکل ویسا ہی سوچ رہی ہوتیں، ہم ایک طرح سوچتے تھے، ہم ایک طرح چاہتے تھے۔ ہم انسان دوست تھے۔ ہمارے درمیان شیعہ سنی، دینی لادینی اور ایسا ویسا کوئی اختلاف نہیں تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر ایسی محبت ناکام ہوسکتی ہے تو پھر کوئی محبت کام یاب نہیں ہوسکتی۔

میں یہ کہتا ہوں، میں یہ ضرور کہوں گا، یہ میرا احتجاج ہے کہ انھوں نے میرے ساتھ بے وفائی کی۔

سوال: کیا راہیں الگ کرنے سے پہلے آپ دونوں نے مل بیٹھ کر ایک دوسرے کے ساتھ مسائل پر ڈائیلاگ کیا اور مسائل تھے کیا؟

جون ایلیا: میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ جب 1987ء میں وہ بی بی سی سے واپس آئیں تو میں نے ان سے کہا کہ تم اُداس رہتی ہو...... ایک بات بہت ضروری ہے اور آپ یہ ضرور لکھیے گا کہ ہمارے گھر میں زاہدہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور یہ میری مشکل تھی۔ میرے بڑے بھائی تھے میں ان سے تلخ کلامی نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ زاہدہ مستقل بے کیف، بیزار اور ڈپریس رہتی ہے تو میں نے اس سے باتوں باتوں میں کہا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم یہ سوچتی ہو کہ تم نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی۔ دراصل ہماری شادی سے پہلے بھی گھر میں شادی کی بات

ہوئی تھی کہ 1969ء میں ایک ترقی پسند افسانہ نگار سبط اختر ہندوستان سے آئے ہوئے تھے اور میری بہن کا خط لائے تھے۔ میری اکلوتی بہن شاہ زناں نے خط میں لکھا کہ جون میں نے تیرے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے وہ جسٹس نہال احمد کی بیٹی ہے۔ میں تیری اس سے شادی کرانا چاہتی ہوں، تو اسے دیکھ لے گا تو بہت پسند کرے گا، وہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ خط دوپہر کو آیا تھا، میں نے وہ خط زاہدہ کو پڑھایا تو زاہدہ کا چہرہ فق ہوگیا۔ زاہدہ پریشان تھی، آخر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جون اگر تم پچاس شادیاں بھی کرو تو ایک شادی مجھ سے بھی کرنا۔ میں نے ان سے کہا کہ تم جہنم میں جاؤ، میں نہیں کروں گا پچاس شادیاں اور میں اپنی بہن کی بات نہیں مانوں گا۔ اُس وقت زاہدہ کا یہ حال تھا اور آج میں ایک ٹھکرایا ہوا آدمی ہوں۔ جون ایلیا جس نے زاہدہ کو زاہدہ حنا بنایا اگر کسی کو 16 برس کی لڑکی ملے تو وہ اسے کتنی تربیت دے گا! میں تو دن بھر بولنے والا آدمی ہوں، میں دن بھر میں کم از کم دس الفاظ ایسے بولتا ہوں جس کے معنی اُردو اہلِ زبان کو بھی نہیں معلوم۔ یعنی سات برس محبت کے اور 23 برس شادی کے میں نے انھیں تربیت دی۔

سوال: کیا آپ لوگوں نے مسائل پر ڈائیلاگ کیا تھا؟

جون ایلیا: ہاں میں نے بار بار ڈائیلاگ کیا، علیحدگی سے قبل ایک دن زاہدہ بڑی اُداس تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ تم اُداس ہو کہیں ایسا تو نہیں کہ تم محسوس کرتی ہو کہ تم نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی، تمھیں کوئی پچھتاوا تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس کا علاج ممکن ہے کیوں کہ تم میں وہ ترنگ نہیں، کہیں تمھیں اس شادی کا دکھ تو نہیں؟ انھوں نے مجھے جو جواب دیا اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ شاید ایسا ہی ہو، وہ اُداس ہی بیٹھی رہیں چناں چہ میں لائبریری کے کمرے میں گیا اور میں نے لکھا کہ 'میں سیّد جون ایلیا ابنِ علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا زاہدہ حنا بنت شیخ ابوالخیر کا شوہر ہوں لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری بیوی زاہدہ حنا بہت بیزار کن زندگی گزار رہی ہے۔ میں کبھی اس کی توجیہ کرتا ہوں تو ایک وجہ یہ سامنے آتی ہے کہ ہمارا پرچہ جو کبھی لاکھوں بکتا تھا اب زوال کی طرف جا رہا ہے، اس کی طرف زاہدہ حنا نے زیادہ توجہ

نہیں دی ہے، ممکن ہے کہ ہماری معاشی پریشانیاں اس کی بے کیفی کا سبب ہوں مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شاید وہ مجھ سے شادی کر کے پچھتا رہی ہیں سو میں انتہائی دکھ اور غم کے ساتھ ان کے ذہنی سکون کی خاطر انھیں طلاق دیتا ہوں تا کہ انھیں سکون حاصل ہو جائے اور چوں کہ آج کل میں غربت کے دور سے گزر رہا ہوں اور میں ان کے مہر کی رقم ادا کرنے کے اس وقت قابل نہیں ہوں مگر میں یہ آئندہ ادا کر دوں گا۔
یہ طلاق نامہ ہے مجھے امید ہے کہ وہ اس کے بعد پرسکون ہو جائیں گی اور ان کا پچھتاوا دور ہو جائے گا۔' وہ لے جا کر میں نے ان کو پڑھوا دیا، بات ختم ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے ان سے کہا کہ میں نے تمھیں وہ کاغذ لکھ کر دے دیا ہے اب تمھیں مطمئن ہو جانا چاہیے، تم آزاد ہو اب تم جہاں چاہو رہ سکتی ہو اور اب تم کیوں اُداس اور کیوں بددل ہو؟ کچھ دنوں کے بعد میں نے ان سے کہا کہ اگر تمھاری اُداسی اور بے چینی کا سبب یہ شادی نہیں اور تمھیں اس پر کوئی پچھتاوا نہیں تو تم طلاق نامے کی اس عبارت کو پھاڑ کر پھینک دو۔ اس پر وہ کہنے لگیں ہاں وہ تو میں نے پھاڑ کر پھینک دی اور اسے ضائع کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دن جب میں دفتر پہنچا زاہدہ پہلے ہی جا چکی تھیں تو وہاں علامہ طالب جوہری صاحب یعنی شیعوں کے سب سے بڑے ذاکر وہاں بیٹھے تھے۔ ان کا تعلق بھی بہار سے تھا اور زاہدہ بھی بہار سے ہیں۔ طالب جوہری نے مجھ سے کہا کہ حضرت یہ آپ نے زاہدہ کو کیا لکھ کر دے دیا ہے۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں نے تو ایسا کچھ بھی لکھ کر نہیں دیا، جو لکھ کر دیا تھا وہ انھوں نے پھاڑ کر پھینک دیا۔ یہ بیٹھی ہیں آپ ان سے پوچھ لیجیے۔
اس پر زاہدہ کہنے لگیں کہ طلاق نامہ میں نے پھاڑا نہیں تھا بل کہ وہ کہیں گم ہو گیا تھا یہ ہے کہانی ساری اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ پہلے تو میں نے غیر قانونی طور پر انھیں طلاق نامہ لکھ کر دے دیا تھا اب وہ مجھ سے قانونی طلاق نامے کا مطالبہ کرنے لگیں۔

میں کسی وجہ سے اپنے گھر گلشن سے گارڈن ایسٹ جا رہا تھا تو میں نے زاہدہ سے پوچھا کہ میں کب تک وہاں رہوں؟ انھوں نے جواب دیا کہ چوں کہ وہاں

لائبریری میں تمھارا کام ہے، تم دو ڈھائی مہینے تک رہو، وہ مکمل کر کے آجانا۔ اس کے بعد ہمارا ملنا جلنا اور بات چیت ہوتی رہتی تھی مگر نہ تو اس میں تپاک اور محبت تھی اور نہ لڑائی ہوتی تھی۔ جنوری 1994ء کی بات ہے کہ ایک دن زاہدہ کا فون آیا کہ تم مجھے طلاق دے دو۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس کا مطلب نہیں جانتا اگر چہ میں نے عربوں کو عربی پڑھائی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تم کس زبان میں گفت گو کر رہی ہو، جب میں نے تم سے محبت کی تھی یا تم نے مجھ سے محبت کی تھی تو کیا کسی سے پوچھ کر کی تھی۔ وہ اصرار کرنے لگیں جس پر میں نے انھیں کہا کہ تم کوئی پابند تھوڑی ہو جو چاہو کرو۔ کہنے لگیں مجھے تسکینِ قلب کے لیے طلاق چاہیے۔ میں نے کہا کہ تم وہ ٹرمنالوجی بول رہی ہو جس سے میں نفرت کرتا ہوں۔ میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر میں انھیں طلاق دیتا ہوں تو میں کم زور نہیں ہوں گا بل کہ اس کا برا اثر ہمارے بیٹے اور بیٹیوں پر پڑے گا کیوں کہ ٹوٹے خاندان کے بچے مسکین اور بیمار لگتے ہیں۔ ایسا نہ کرو تم مجھ سے طلاق مت لو اگر طلاق لینا ہے تو اسے اپنے پاس رکھو، اسے قانونی مسئلہ نہ بناؤ مگر وہ بہ ضد رہیں۔ اس کے بعد زاہدہ کے پاس کے ڈی اے کے ڈائریکٹر جنرل محمد حسین سیّد پہنچے اور ان سے کہا کہ ہم آپ کے لیے زمین حاصل کرنے کی کوشش کریں گے آپ ملاپ کر لیں۔ پھر جمیل الدین عالی نے بھی سمجھانے کی کوشش کی مگر ان پر کسی کا اثر نہیں ہوا چناں چہ انھوں نے مجھ سے وہ لی اور باقاعدہ خلع پر قانونی کارروائی ہوئی۔ اب انھوں نے کیوں ایسا کیا یہ کہانی تو وقت بتائے گا میں نہیں۔

سوال: آپ نے بہ طور افسانہ نگار، بہ طور کالم نگار، بہ طور نثر نگار، بہ طور دوست، بہ طور محبوب، بہ طور بیوی زاہدہ حنا کو کیسا پایا؟

جون ایلیا: بہترین، اچھے دنوں میں بہترین پایا۔

سوال: اس گفت گو میں جو سب سے ناپسندیدہ بات رہی ہے وہ آپ کا یہ گمان اور یہ اصرار رہا ہے کہ آپ نے اس کو بنایا، سکھایا، کیا یہ اصرار نازیبا بات نہیں ہے؟

جون ایلیا: اچھی بات نہیں ہے، یہ کہنا اچھی بات نہیں ہے۔ آپ نے صحیح کہا، میں معذرت خواہ ہوں۔

سکوت کو لفظوں میں گنگنانا شاعری ہے

نیاز الدین خاں

سوال: کہا جاتا ہے کہ میرانیس کی طرح آپ نے بھی شاعری میں 'اجدادِ باوقار سے میراث پائی ہے' براہِ کرم مختصراً اپنے خاندانی اور شعری ماحول اور اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے۔

جون ایلیا: برادرِ عزیز! میں سب سے پہلے اپنے ماحول اور اس کے ماضی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے بابا علامہ شفیق حسن ایلیا، چار بھائی تھے اور چاروں شاعر تھے، مجھے بابا پر کبھی کبھی بہت غصہ آتا ہے۔ انھوں نے اپنی جوانی کے آخری دور میں سیکولر شاعری ترک کر کے اپنے مزاج کے یک سر برخلاف ایک ضمنی شے قرار دے کر حصولِ ثواب کی خاطر مذہبی شاعری کو اپنی فکرِ سخن کا معروض قرار دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے ایک غیر امروہوی قدر دان جو ایک افسر کی حیثیت سے امروہہ میں تعینات تھے۔ اُن کی غزلوں کا ضخیم مسوّدہ پڑھنے کے لیے لے گئے۔ اس دوران ان کا اچانک تبادلہ ہو گیا۔ بابا اس زمانے میں جے پور میں تھے۔ مختصر یہ کہ اس طرح ان کا یہ مسوّدہ ضائع ہو گیا جو پانچ ہزار غزلوں پر مشتمل تھا۔ ان کی کتنی ہی غزلیں میری والدہ، حسین ترین اور لالہ فام والدہ کے دل آشوب حسن کی ماجرا پروری کی دین تھیں۔ انھیں اس تخلیقی متاع کے ضائع ہونے کا جس قدر قلق ہوا ہوگا اس کا اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ بابا بلا کے حسن پرست اور صاحبِ دل اور اپنی ذات میں خالص غزل کے شاعر تھے۔ اُن کے دو اشعار یاد

آرہے ہیں۔ جانے یہ اچھے ہیں یا برے۔

غیر تو غیر ہیں کب اپنے ہیں
کوئی اپنا نہیں سب اپنے ہیں

قیامت اور مرے واسطے عیاں ہوگی
جب اُن کے ساتھ مری آرزو جواں ہوگی

عجب بات ہے کہ وہ مقصدی شاعری اور مذہبی شاعری کے نمائندوں کو ناظم اور غزل گو شعرا کو حقیقی معنی میں شاعر سمجھتے تھے۔ یہاں میں یہ کہتا چلوں کہ مولانا روم غزل کے شاعر نہیں تھے مگر وہ انھیں بے حد پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ بھگت کبیر اور تلسی داس کی شاعری کے دل دادہ تھے اور خود بھی ہندی میں شعر کہتے تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ وہ بلا کے حسن پرست اور صاحبِ دل تھے۔ جب محلے کی کوئی حسین لڑکی ہمارے گھر آتی تو وہ اس کی تعظیم میں کھڑے ہو جاتے تھے۔

سوال: یہ تو ہوا بابا کا تذکرہ، اُن کے بزرگوں کا کیا حال تھا؟

جون ایلیا: بابا کے والد نصیر امروہوی، اُن کے والد امیر امروہوی، اُن کے والد شایان امروہوی، ان کے والد سلطان امروہوی اور اُن کے والد عطا امروہوی بھی شاعر تھے۔ عطا امروہوی کے بارے میں ایک روایت سینہ بہ سینہ مجھ تک پہنچی ہے کہ وہ بے حد تنومند اور اوباش قسم کی شے تھے۔ میر کے ارشد تلامذہ عبدالرسول نثار کے شاگرد تھے۔ نثار کو عطا امروہوی کے والد دہلی سے امروہہ لے آئے تھے۔ انھوں نے باقی زندگی ہمارے دیوان خانے میں گزاری۔

سوال: تو گویا شاعری کا تسلسل پشت ہا پشت سے منتقل ہوتا ہوا آپ تک پہنچا۔

جون ایلیا: جی ہاں علامہ ایلیا کے آبا و اجداد ہی نہیں اُن کے بڑے فرزند سیّد محمد مہدی بھی شاعر تھے اور اُن کا تخلص رئیس امروہوی تھا۔ منجھلے فرزند بھی شروع میں شعر کہتے تھے اور صدر امروہوی تخلص کرتے تھے۔ پھر وہ سخن کی وادی ترک کر کے فلسفے

کے ہفت خواں کی طرف نکل گئے۔ علامہ ایلیا کے اس تبحر عالم اور فلسفی فرزند کو
سیّد محمد تقی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ فلسفے کے زیرِ اثر سال ہا سال تک ملحد رہے
بحمد اللہ۔ اب وہ ایمان لے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ اب وہ صبح سے شام تک
افلاطون اور ارسطو کے مقابلے میں مسلمان فلسفیوں اور خاص طور پر میر باقر داماد
اور صدر الدین شیرازی کی برتری ثابت کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔
عربی تہذیب اُن کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ انھیں اس کا
اجر دے گا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں نے اس ماحول میں پرورش نہ پائی ہوتی
تو بھی میں شاعر یا کم سے کم متشاعر ضرور ہوتا۔ بھلا میر اور غالب کے باپ دادا
کب شاعر تھے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اپنے اس ماحول کی وجہ سے اپنی ذات
کے شاعر کو بروقت دریافت کر سکا۔

سوال: شاعری کی وادی میں کس عمر سے کوچہ گردی شروع کر دی تھی؟ کیا کوئی جذباتی حادثہ وغیرہ بھی اس کا محرک ہوا؟

جون ایلیا: جب میں نے شاعری کے کوچے میں قدم رکھا اُس وقت میری عمر سات آٹھ برس کی تھی۔ آپ میری ذاتی زندگی کے کسی حادثے یا واقعے کا پوچھ رہے ہیں تو میں اس آشوب ناک لڑکی کا ذکر ضرور کروں گا جس کا نام 'پری بیگم' تھا۔ ویسے اسے 'پریا' کہا جاتا تھا۔ میرا اور اس کا بچپن ایک ساتھ 'چدّ رچھپّوا' اور کوڑا جمال شاہی، پیچھے دیکھا مار کھائی' کھیلتے گزرا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس کی آنکھیں کتنی بلا خیز تھیں۔ میں کتنے ہی چہروں میں ان جادوگر آنکھوں کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ اور ہاں اس کا سیاراتی لحن۔ اگر فیثا غورس اس کا لحن سن لیتا تو اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا اور عدد (Number) کو کائنات کی اصل ٹھیرانے والا یہ فلسفی گنتی غلط گننے لگتا۔
نہ جانے اب وہ قتالہ کہاں ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ کاش وہ مر گئی ہو۔

سوال: جی! آپ اُس کی موت کے منتظر ہیں؟

جون ایلیا: یہ بات کہتے وقت مجھے وہ دن یاد آ جاتے ہیں جب میرے علاوہ ہمارے محلے کا ایک اور لڑکا بھی اُسے عامیانہ طور پر چاہنے لگا تھا اور اس نے کھل کر پریا سے

اظہارِ محبت کیا تھا۔ جب کہ میں اظہار محبت کو انتہائی چھچھوری اور گھٹیا بات سمجھتا تھا۔
میرا الوفر رقیب امرود لاتا اور پریا کی والدہ کی خدمت میں پیش کرتا جنھیں وہ خالہ جان
کہنے لگا تھا۔ ان امرودوں نے میرے باغ دل کو اُجاڑ دیا۔ پریا اس سے قریب
ہوتی گئی۔ میں حیران تھا کہ آخر کیسی بے ہودگی ہے جو ہو رہی ہے؟ حسن اور عشق کا
بھلا کھانے اور کھلانے سے کیا تعلق ہے؟ محبوبہ چاہے بھوک سے مر بھی رہی ہو تب
بھی میں اُسے کوئی چیز کھاتے اور چباتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ کیا آپ یہ تصور کر
سکتے ہیں کہ عشتار یا وینس امرود چبا رہی اور آم چوس رہی ہوں۔ لاحول ولا قوۃ۔
میں نے ایک دن سوچا کہ میرا رقیب پریا کے جسمانی وجود سے محبت کرتا ہے۔ اگر
پریا کا جسمانی وجود ہی باقی نہ رہے تو میرے رقیب کا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ وہ اس
کے جسمانی وجود یا خارجی وجود کے ختم ہونے کے بعد اُسے یک سر فراموش کر
دے گا کیوں کہ وہ کسی ذہنی وجود سے محبت کرنے کی قطعاً کوئی صلاحیت نہیں رکھتا۔

سوال: تو کیا آپ اُس کا جسمانی وجود ختم کرنے پر تُل گئے تھے؟

جون ایلیا: جی ہاں! میں نے فرطِ محبت میں طے کیا کہ اپنی جانِ جاں پری بیگم کو قتل کر دینا چاہیے۔ اس طرح اس کا ذہنی وجود میرے لیے مخصوص اور محفوظ ہو جائے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی اور میرے ذہن میں اپنے ذہنی وجود کے ساتھ ماجرا پرور رہے گی مگر افسوس میری یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ بہ ہر حال میں نے پہلا شعر جو کہا وہ یہ تھا۔

چاہ میں اُس کی تمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

سوال: شاعری کی تعریف اور ماہیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

جون ایلیا: پہلے میں لفظِ شعر کے بارے میں لسانی اور معنوی اعتبار سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ عام طور پر شعر کو عربی لفظ سمجھا جاتا ہے اور اسے شعور سے ہم رشتہ قرار دیا جاتا ہے۔ میرے حقیر مطالعے کے مطابق شعر عربی لفظ نہیں بل کہ عبرانی 'شیر' کا معرب ہے جس کے معنی ہیں راگ، خوش آوازی اور خوش آہنگی۔ اب سوال

کے دوسرے جزو کی طرف آتا ہوں۔ فارسی کا مشہور مصرع یا مقولہ ہے 'شاعری جزویست از پیغمبری' مگر میرے ماحول میں شاعری کو'جزوے از پیغمبری' نہیں بل کہ مکمل پیغمبری سمجھا جاتا تھا۔ میرے بابا شاعری کو الوہی آہنگ اور 'قدوسی ترسیل' کہا کرتے تھے۔میرے نزدیک ایک بے حد حساس اور تربیت یافتہ ذہن اور ذوق رکھنے والے آدمی کا اپنے روز مرہ کی مصروفیات اور فوری ضرورتوں کی اہمیت کے احساس سے بے نیاز ہوکر اپنے ساتھ تنہا ہو جانا اور اپنے سکوت کو لفظوں میں گنگنانے لگنا شاعری ہے۔اس آدمی کی یہ بے فائدہ محویت اس بات کی مظہر ہوتی ہے کہ خود اُس آدمی ہی نے نہیں بل کہ فطرت نے اپنے آپ سے بلند ہونا چاہا ہے۔

سوال: بہ حیثیت ایک فلسفے کے اسکالر کے آپ شاعری کی فلسفیانہ توجیہ یا تعبیر کیا کریں گے؟

جون ایلیا: شاعر کی ذات میں فطرت کے ارتقاع کا جمالیاتی 'بروز' ہوتا ہے۔یعنی ایسا شخص جس کے نفس میں احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ ہم آہنگ ہوکر ایک تخلیقی وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ تخلیقی وحدت بامعنی صوتی وحدتوں (لفظوں) کی غنائی تالیفات میں صورت پذیر ہوکر شاعری کہلاتی ہے۔

سوال: شاعری کے کچھ تقاضے بھی ہوں گے؟

جون ایلیا: یقیناً شاعری ایک دہرا انسان چاہتی ہے جو حقیقت سے عقل اور جذبے کے ساتھ معاملت کر سکتا ہو۔ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعری ایک واقعے کو چار آنکھوں سے دیکھنے اور دو ذہنوں سے محسوس کرنے کا عمل ہے۔

سوال: اُردو اور فارسی کی روایتی شاعری کی طرح آپ کی شاعری پر بھی معاملاتِ عشق کی بہت گہری چھاپ ہے۔آپ اس لفظ کی ماہیت اور معنویت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ن ایلیا: میرے لیے اس سوال کا جواب دینا بڑا مشکل ہے کیوں کہ مجھے ساری عمر خون تھوکنے کا ہنر تو آگیا لیکن عشق کرنا نہ آیا۔اس لیے کہ میں نرگسیت کا مریض رہا ہوں۔ ویسے آپ کے سوال کا مختصراً جواب یہ ہے کہ عشق کا لفظ 'عشقہ' سے تعلق رکھتا ہے

جو ایک بیل ہوتی ہے۔ اُسے عشق پیچاں بھی کہتے ہیں۔ یہ بیل جس درخت پر چڑھ جائے اُس کی رطوبت کو چوس لیتی ہے اور اُس درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور وہ خشک ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے عشق بھی اپنے گرفتار کا یہی حال کرتا ہے۔

زرد چہرہ ہیں ارغواں کی طرح
ٹکڑے پوشاک ہے کتاں کی طرح

سوال: آپ نے تصوّف کی بعض اہم کتابوں کے ترجمے اور تشریحیں کی ہیں۔ اپنے مطالعے اور تحقیق کے بعد آپ کی تصوّف کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جون ایلیا: تصوّف ایک معنوی طریقہ ہے۔ صوفیہ کا کہنا ہے کہ تصفیۂ باطن اور تزکیۂ نفس کے ذریعے انوارِ حقائق طالب کے قلب پر اشراق کرتے ہیں۔ مروجہ تصوّف اسلامی زہد اور مسیحی، یہودی، مانوی اور ہندوستانی عرفان کے امتزاج سے وقوع پذیر ہوا۔ اگر ہم اسلامی زہد کے عنصر سے قطع نظر کر لیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ تصوّف عرب نژاد نہیں ہے۔ یہاں ایک بات اور بھی کہی جانی چاہیے اور وہ یہ کہ ظہورِ اسلام کے بعد کی ابتدائی چند صدیوں میں عربوں کی جارحانہ قوم پرستی نے تصوّف کے ظہور میں خاص کردار ادا کیا ہے۔

سوال: تصوّف نے فارسی اور اُردو شاعری پر بھی تو بڑے اثرات مرتب کیے ہیں۔

جون ایلیا: جی ہاں، تصوّف نے فارسی غزل اور اس کے زیرِ اثر اُردو غزل میں احساس، فکر اور جذبے کی ایک کلی اور کائناتی جست پیدا کی ہے۔

سوال: آپ کی شاعری پر تشکیک بل کہ انکار والحاد تک کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ فلسفے سے آپ کے بے پناہ شغف کے باعث ہوا؟

جون ایلیا: میرے عزیز بات یہ ہے کہ سعد و مسعود ایمان ہو یا منحوس الحاد، یہ دونوں ہی یقین کا عطیہ ہیں۔ میں ان دونوں عطیوں سے بہرہ اندوز ہوا ہوں۔ یقین وہ سب سے بڑی دولت ہے جو نوعِ انسانی کے کسی فرد کو نصیب ہو سکتی ہے۔ یہ بے حد خوشی کی بات ہے کہ یہ دولت انسانوں کی اکثریت کو نصیب ہوئی ہے۔ دنیا میں کم ہی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اس دولت سے محروم ہیں۔ یقین ذہن کو سب سے

اعلیٰ حالتِ استراحت سے حظ اندوز کرتا ہے۔ فلسفہ پڑھنے سے پہلے میرا ذہن بھی ایمان کی صورت میں یقین کی بخشی ہوئی حالتِ استراحت سے بہرہ مند تھا۔ پھر فلسفے کی تعلیم اور مطالعے کے ایک خاص دور سے میرا ذہن ایمان کے بجائے الحاد کی عطا کردہ حالتِ استراحت سے بہرہ مند ہوا۔

سوال: یعنی ایمان اور الحاد دونوں کیفیات سے آپ یک ساں طور پر لطف اندوز ہوئے۔

جون ایلیا: بات یہ ہے کہ ایمان ہو کہ الحاد، ان دونوں کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ کائنات کے وجود کی کیا توجیہ کرتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ کائنات کی یہ دونوں توجیہیں یعنی ایمان اور الحاد، ناقابلِ بیان حد تک خوش گوار ہیں' خوش گوار ترین۔ مگر میں ان سے زیادہ دن تک بہرہ مند نہ رہ سکا اور آخر کار میرا ذہن اس عذابِ الیم میں مبتلا ہوا جسے تشکیک کہتے ہیں۔ جو انسان شک پسند ہو وہ ہر لمحہ ایک ذہنی جہنم میں جلتا رہتا ہے۔ میں نے اپنی جوانی کے کئی سال، کئی جاں پرور ترین سال اپنے ذہن کی اس عذاب ناک حالت میں گزارے ہیں۔

سوال: اب آپ کن ذہنی کیفیات سے گزر رہے ہیں؟

جون ایلیا: میرے حقیر اور بے حد ناکافی مطالعے نے اب مجھے لاادریت (Agnosticism) تک پہنچا دیا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ جون ایلیا کچھ بھی نہیں جانتا۔ کچھ بھی تو نہیں جانتا۔ مجھے اپنا نام تو ضرور یاد رہ گیا مگر میں یہ جاننے سے قاصر ہو گیا کہ میں کون ہوں اور کیوں ہوں؟ اور یہ کہ آخر مجھے کیوں ہونا چاہیے۔ میں یہ جاننے سے بھی محروم ہو گیا کہ میری محبوبہ کیا ہے اور کیوں ہے اور یہ کہ میرا اس سے آخر کیا رشتہ ہے؟ میں ایک زمانے سے اسی فکری اور ذہنی حالت میں روز و شب گزار رہا ہوں۔ میں حقیقت، حقائق کے علم سے یک سر محروم ہوں اور اس پر مستزاد یہ کہ میں حقیقت، حقائق کو جاننے کی شدید ترین خواہش رکھتا ہوں مگر میرے ذہن کا حاصل جہل کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

قہر ہے ذات کا یہ مضموں بھی
یعنی میں جو ہوں جون، میں ہوں بھی

سوال: شاعری کے علاوہ آپ کی مصروفیات کیا رہیں؟

جون ایلیا: مصروفیات سے غالباً آپ کی مراد کسبِ معاش ہے تو صورت حال یہ ہے کہ میرے کسبِ معاش کا تعلق تصنیف و تالیف ہی سے رہا ہے۔ میں نے 1958ء میں ایک علمی اشاعتی ادارہ قائم کیا جس کا نام 'ادارۂ ذہنِ جدید' ہے۔ اس ادارے نے کئی اہم کتابیں شایع کیں۔ میں نے اس ادارے کی جانب سے ایک علمی ماہ نامہ 'انشا' بھی جاری کیا جو کئی برس تک شایع ہوتا رہا۔ 1963ء سے میرا تعلق آغا خانی اسماعیلیوں کے عالمی مرکز، علمی و تحقیقی مرکز، اسماعیلیہ ایسوسی ایشن سے قائم ہوا اور وہاں میں نے تاریخِ عرب قبلِ اسلام، تاریخِ مذاہبِ عالم، مسلم فلسفہ اور تاریخِ اسلام کی انقلابی تحریکات پر کام کیا۔ یہاں مجھے ایک بات خاص طور پر کہنی ہے وہ یہ کہ غالباً 1968ء کے اوائل میں مجھے ترقی اُردو بورڈ کے اس وقت کے نگرانِ اعلیٰ جناب شان الحق حقی نے اُردو کے سب سے بڑی لغت کی تدوین کے سلسلے میں مدعو کیا۔ میں نے اس دعوت کو قبول کرلیا۔ چناں چہ میں صبح سے ظہر تک ترقی اُردو بورڈ میں کام کرتا تھا اور شام 4 بجے سے 6 بجے تک اسماعیلیہ ایسوسی ایشن میں اپنے فرائض کی بجا آوری کرتا تھا۔ ترقی اُردو بورڈ سے میرا تعلق 1968ء سے 1976ء تک یعنی کم و بیش 8 برس تک قائم رہا لیکن جب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگرانی میں اُردو کے سب سے بڑے لغت کی پہلی جلد شایع ہوئی تو اس میں میری مدتِ کار کو صرف ایک برس قرار دیا گیا۔ میں اپنے برادرِ محترم شان الحق حقی کی خدمت میں استغاثہ پیش کرتا ہوں کہ مجھ پر جو ظلم ہوا ہے اس کی تلافی کی جائے۔

سوال: آپ اپنی زندگی کو ناکام سمجھتے ہیں یا کامیاب؟

جون ایلیا: انتہائی ناکام، میری جذباتی زندگی ایک برباد زندگی رہی۔ میں بری طرح رائگاں ہوگیا۔ میں سال ہا سال سے دربدری کی زندگی گزار رہا ہوں۔ میں گھریلو زندگی سے یک سر محروم ہوں۔ میرا سینہ چھلنی ہو چکا ہے پھر بھی میں اپنے تخلیقی ماحول میں سینہ تانے کھڑا ہوں۔ میری صحت تباہ ہو چکی ہے۔ میں نے گزشتہ 18 برس جاں کنی کے عالم میں گزارے ہیں۔

سوال: اب آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟

جون ایلیا: اس سلسلے میں میں آں حضرتؐ کا ایک ارشاد رقم کرانا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے کسی صحابی کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ مجھے تین چیزیں سب سے زیادہ عزیز ہیں یعنی نماز، خوش بو اور عورت۔ تو مجھے یہاں یہ کہنا ہے کہ مجھے بھی آں حضرتؐ کے قول کے مطابق ان ہی عطیاتِ خداوندی کی خواہش ہے، دائمی خواہش۔

سوال: زندگی میں آپ کو کن شخصیات نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

جون ایلیا: مجھے تین آدمیوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور وہ ہیں، بھگت سنگھ، گاما پہلوان اور سلطانہ ڈاکو۔ بھگت سنگھ سام راجی دور میں ہمارے جذبۂ بغاوت کی یادگار ترین علامت تھے۔ گاما پہلوان کو برصغیر کی اس شکست خوردگی کے دور میں ہماری جسمانی قوت کے مظہر کی حیثیت حاصل تھی اور سلطانہ ڈاکو نے یو پی کی سام راجی انتظامیہ کو ناکوں چنے چبوادیے تھے۔

سوال: اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی تو آپ شعر کہتے ہیں؟

جون ایلیا: ایک زمانے میں عربی اور فارسی میں بھی شاعری کی ہے اور تھوڑا بہت پہلوی میں بھی کہا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاعری اپنی ہی زبان میں کی جا سکتی ہے۔